join eBooks Telegram
سوغات
محمود ایاز کی یاد میں
مریم ایاز

بانی: محمود ایاز

سوغات

(۱۴)

مدیر اعلیٰ:

مریم ایاز

مجلس ادارت:

مغنی تبسم　　خلیل مامون　　عزیز اللہ بیگ

پتہ:

۴۸، تھرڈ مین، ڈیفنس کالونی، اندرا نگر،
بنگلور–۵۶۰۰۳۸
فون: ۵۲۸۱۹۸۶

نومبر ۱۹۹۷ء

قیمت: فی شمارہ ایک سو پچیس روپے

بیرونی ممالک سے (امریکہ، کناڈا، سعودی عرب، پاکستان)
(بذریعہ ہوائی ڈاک) بارہ ڈالر (امریکی) سولہ ڈالر (کینیڈین)
دس پاؤنڈ (یو کے)

کتابت:
رضی الدین اقبال، حیدر آباد
جے۔ جے۔ کمپیوٹرس، مہدی پٹنم، حیدر آباد-۲۸
شارپ کمپیوٹرس، چادر گھاٹ، حیدر آباد-۲۴

طباعت: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر
مریم ایاز

فہرست

نقش اوّل	اداریہ	۷

گوشۂ محمود ایاز

ناسور (محمود ایاز کی یاد میں)	باقر مہدی	۱۲
محمود ایاز کی وفات پر	عرفان صدیقی	۱۳
محمود ایاز کی یاد میں	شکیب رضوی	۱۵
محمود ایاز کی نذر	سردار ایاغ	۱۶
محمود ایاز کے نام	حمید نسیم	۱۷
کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق	آل احمد سرور	۱۸
ایاز صاحب - چند منتشر یادیں	شہریار	۲۲
خراج صوت و صدا	شفیق فاطمہ شعریٰ	۲۴
محمود ایاز - یادوں کی انجمن میں	مغنی تبسم	۲۸
محمود ایاز - چند یادیں	خلیل مامون	۳۸
جمال ہم نشیں	شائستہ یوسف	۴۹
اب اس کے بعد ہماری نوا ہے خاموشی	ماہر منصور	۶۱
بند آنکھوں میں ہیں نادیدہ زمانے پیدا	سیّد منظور احمد	۶۷
محمود ایاز شخصیت اور فن	سیّد حبیب احمد	۷۰
محمود ایاز کے خطوط	نیّر مسعود	۸۹
محمود ایاز اور اختر الایمان	فضیل جعفری	۹۷
"نقش اوّل" میں محمود ایاز کے اشکارے	شمس الحق عثمانی	۱۰۳

زماں، مکاں اور شاعری	محمود ایاز	۲۱۷
آگ کا دریا (تبصرہ)	محمود ایاز	۲۳۳
دو ناول اور آدم جی انعام	محمود ایاز	۲۴۲
علامت پسندی کی روایت - ایک تعارف	سی۔ ایم۔ بورا (ترجمہ: محمود ایاز)	۲۵۴
محمود ایاز کی منتخب نظمیں		۲۶۸ تا ۲۸۵
محمود ایاز کی منتخب غزلیں		۲۸۶ تا ۲۹۲
مطالعہ		
علامہ اقبال، ہمارے عظیم شاعر	آل احمد سرور	۲۹۳
خاکہ		
لذت آشنائے تلخی دوراں	اسلم فرخی	۳۰۳
ہندی افسانے		
سونی گلی	چندر موہن (ترجمہ: قاسم ندیم)	۳۲۶
دھواں دھواں اونچائی - سوچنے	چندر موہن (ترجمہ: قاسم ندیم)	۳۳۷
غزلیں		
ضیا جالندھری، شفیق فاطمہ شعریٰ، احمد جاوید، روشن لال روشن، ذکی بلگرامی، شکیل اعظمی		۳۵۰ تا ۳۵۷
نظمیں		
اس دن	صلاح الدین محمود	۳۵۸
اپنے لیے ایک نظم	جمال اویسی	۳۶۱
ویران گاہ	جمال اویسی	۳۶۲
ہنگام	جمال اویسی	۳۶۲
نزول شعر	جمال اویسی	۳۶۳

نزول	جمالؔ اویسی	۳۶۳
کل آج اور کل	سوہن راہی	۳۶۴
خصوصی مطالعہ		
شفیق الرحمٰن	مرزا حامد بیگ	۳۷۰
شفیق الرحمٰن	نظیر صدیقی	۳۷۳
ایک خوشگوار سفر	محمد خالد اختر	۳۷۷
لوگ جنہوں نے مسکرانا سکھایا	مستنصر حسین تارڑ	۳۹۷
فکاہیہ		
زنانہ اردو خط و کتابت	شفیق الرحمٰن	۴۰۴
خاکہ		
تعارف	شفیق الرحمٰن	۴۱۷
افسانہ		
فاسٹ باؤلر	شفیق الرحمٰن	۴۳۳
پیروڈی		
تزکِ نادری عرف سیاحت نامۂ ہند	شفیق الرحمٰن	۴۴۷
سفر نامے		
نیل	شفیق الرحمٰن	۴۷۷
دُھند	شفیق الرحمٰن	۵۱۰
دجلہ	شفیق الرحمٰن	۵۹۲
بازگشت		
آل احمد سرور، نیر مسعود، مغنی تبسم، شان الحق حقی، حمید نسیم، ضیا جالندھری، مرزا انجم بیگ، آفتاب احمد خاں، شفیق فاطمہ شعریٰ، سید محمد اشرف، انور خاں، عرفان صدیقی، مسعود الحق، چودھری محمد علی ردولوی، جمال اویسی، خالد سعید		۶۷۹ تا ۶۹۶

نقشِ اوّل

سوغات کا یہ شمارہ ہم نہایت دکھے دل کے ساتھ شائع کر رہے ہیں ۔ محمود ایاز مرحوم نے اس شمارے کا بڑا حصہ مرتب کرلیا تھا اور چاہتے تھے کہ جلد سے جلد اسے شائع کردیں ۔ انھیں اپنی قریب المرگی کا احساس ہو چلا تھا ۔ موت نے تعجیل کی اور یہ شمارہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہوسکا ۔ محمود ایاز کی وفات ، اہلِ خاندان ، ادارہ ، سوغات اور ساری ادبی دنیا کے لیے بڑا سانحہ ہے ۔ ہم اس سانحے سے تادیر سنبھل نہ سکیں گے ۔ ایاز صاحب کی وفات سے چند ماہ بعد سوغات کی اشاعت کے بارے میں غور کیا گیا اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ سوغات کو ایاز مرحوم کی یادگار کے طور پر جاری رکھا جائے ۔ بیگم ایاز نے اس تجویز کی حمایت کی ۔ اب انھیں کی ادارت اور سرپرستی میں انشاء اللہ سوغات شائع ہوتا رہے گا ۔

محمود ایاز کی ادبی بصیرت اور ادبی اقدار کے تحفظ اور بازیابی سے گہرا لگاؤ ، کم کم ہی کسی کو مقسوم ہوتا ہے اور اس باب میں ہم کو اپنی کوتاہیوں اور حدود کا اعتراف ہے پھر بھی ہم کوشش کریں گے کہ ان کے نقشِ قدم پر چلیں اور ان مقاصد کو خاطر نشاں رکھیں جن کے تحت سوغات جاری کیا گیا تھا ۔

جب سوغات کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تو یہ طے کیا گیا کہ اس میں ایک گوشہ محمود ایاز کے لیے مختص کیا جائے ۔ مختلف احباب ، ادیبوں اور شاعروں بالخصوص سوغات کے قلم کاروں سے درخواست کی گئی کہ وہ اس گوشے کے لیے اپنے مضامین اور تاثرات ارسال کریں ۔ بعض بزرگوں اور دوستوں نے توجہ دی، بعض نے اپنی مصروفیات یا دیگر وجوہات سے معذرت خواہی کی اور چند اصحاب نے سکوت اختیار کیا ۔ ان سے ہمیں گلہ نہیں ہے ۔ لیکن ہم ان بزرگوں اور دوستوں کے شکر گزار ہیں جنھوں نے ہماری درخواست پر یا خود اپنے طور پر اس گوشے کے لیے اپنی تحریریں روانہ کیں ۔

گوشہ ، محمود ایاز میں بیش تر تحریریں تاثراتی نوعیت کی ہیں ۔ ان سے ایاز مرحوم کی شخصیت کے مختلف رخ سامنے آتے ہیں اور بہ حیثیت ادیب ، شاعر اور مدیر ان کی خدمات پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔ چند شاعر دوستوں نے ایاز مرحوم کی وفات پر نظمیں لکھیں ۔ یہ سب

نظمیں غیر رسمی ہیں اور دلی جذبات اور احساسات کی آئینہ دار ہیں ۔ شمس الحق عثمانی نے اپنے مخصوص غیر روایتی انداز میں محمود ایاز کے اداریوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے ۔ اس مضمون سے محمود ایاز کی اعلیٰ تنقیدی بصیرت ، وسیع مطالعے ، عصری ادبی مسائل سے گہری آگہی کے ساتھ ساتھ موجودہ دور میں ادب کی صورتِ حال پر ان کی بجا تشویش ، ادبی معیارات کو بحال کرنے کی آرزو ، لگن اور منصوبہ بندی ان ساری باتوں کا بڑی تحقیق ، جستجو اور دیدہ ریزی کے ساتھ جائزہ لیا ہے ۔

●

محمود ایاز نے بعض اہلِ نظر نقادوں اور ادیبوں سے مشورہ کرنے کے بعد سوغات میں شفیق الرحمن کا گوشہ شامل کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے لیے بہت سا مواد انھوں نے فراہم کر لیا تھا ۔ ہم نے اپنے طور پر شفیق الرحمن کی شخصیت اور فن پر شائع شدہ چند مضامین اور ان کی چند نمائندہ تحریروں کا اس میں اضافہ کیا ہے ۔ شفیق الرحمن اردو کے ایک بے مثل ، منفرد ، صاحبِ طرز ادیب ہیں جن کی ابھی تک صحیح قدر شناسی نہیں ہوئی ہے ۔ شفیق الرحمن نے ابتدا میں رومانی افسانے لکھے اور ایسے مزاحیہ افسانے اور مضامین تحریر کیے جو خالص تفریحی ادب کی ذیل میں آتے ہیں ۔ شفیق الرحمن کی جہاں گردی نے انھیں زندگی اور انسان کی بوقلمونیوں کے مشاہدے کا موقع عطا کیا ۔ عالمی ثقافتی اور سیاسی تاریخ کا انھوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور تاریخ ، فطرت اور انسان کے رشتے کو اپنی فکر کا محور بنایا ہے ۔ ان کی حالیہ تحریروں اور طویل افسانوی سفر ناموں میں طنـــز و مزاح بڑا معنی خیز ہوگیا ہے ۔ ان کی منظر کشی ، پیکر تراشی اور نفسیات نگاری تفصیلی مطالعے کے موضوع بن سکتے ہیں ۔ مضحک واقعات کے ساتھ وہ زبان کے مخصوص استعمال سے بھی مزاح نگاری کا کام لیتے ہیں اور اس وصف میں وہ رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی کی صف میں نظر آتے ہیں ۔ کبھی وہ محاوروں اور مجازی الفاظ کو لغوی مفہوم میں برتتے ہیں ، کبھی محاوروں کو بے محل چسپاں کرتے ہیں ۔ قولِ متناقض ، کنایہ اور ایمائیت بھی ان کے اسلوب کے اجزائے تعمیر ہیں ۔ انھوں نے اردو ادب کو شیطان اور مقصود گھوڑا جیسے لافانی کردار دیے ۔

زندگی کی معنویت اور لایعنیت کے دونوں پہلو یکے بعد دیگرے یا ساتھ ساتھ ان کی تحریروں میں ہویدا ہوتے ہیں اور اختتام بالعموم ایک حزنیہ کیفیت پر ہوتا ہے ۔ شفیق الرحمن کے خصوصی مطالعے میں ان کی شخصیت اور فن پر جو مضامین شامل ہیں وہ ان کی قدر شناسی کی تحریک دلاتے ہیں ۔

●

" علامہ اقبال ۔ ہمارے عظیم شاعر " حمید نسیم کی تصنیف ہے۔ جس پر پروفیسر آل احمد سرور نے طویل تبصرہ تحریر کیا ہے ۔ تبصرے میں انھوں نے کتاب کے مشمولات اور حمید نسیم کی آرا کا تفصیل سے تعارف کروایا ہے اور بڑی حد تک ان کے خیالات سے اتفاق کیا ہے ۔ لیکن بعض امور پر انھوں نے حمید نسیم سے اختلاف بھی کیا ہے اور اقبال کی شاعری کے ان گوشوں کی نشان دہی کی ہے جن پر حمید نسیم کی نظر نہیں گئی ہے ۔ اقبال بڑے مفکر تھے یا بڑے شاعر؟ تنقید میں یہ متنازع فیہ مسئلہ رہا ہے ۔ حمید نسیم اقبال کی فکر کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور ان کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کرتے ہیں ۔ پروفیسر سرور بھی اقبال کو بہت بڑا مفکر نہیں ملتے لیکن ایلیٹ کے حوالے سے یہ بات درست کہی ہے کہ اقبال کی شاعرانہ عظمت میں ان کی فکر کا بھی دخل ہے ۔ حمید نسیم نے اقبال شناسوں کے بعض مفروضات کو چیلنج کیا ہے اور بحث کا دروازہ کھولا ہے ۔ ۔ ۔ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کی لیے ۔

فہیم اعظمی نے اپنے مضمون " ادب میں آذری " میں اردو کی موجودہ تنقیدی صورتِ حال کے بارے میں اشاروں اور کنایوں میں چند باتیں کہی ہیں ۔ اگر وہ کھل کر بات کرتے تو اس پر بحث و تمحیص کا دوازہ کھل سکتا تھا ۔ اب ہم کو ذاتیات اور ذاتی اختلافات سے بلند ہوکر علمی مسائل پر خالص علمی نقطہ ، نظر سے سنجیدہ گفتگو کرنی چاہیے ۔ محض طنز و تعریض سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے ۔

●

اسلم فرخی کا " لذت آشنائے تلخیِ دوراں " محض ایک خاکہ ہی نہیں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے ۔ اس میں ایک پوری تہذیب سانس لیتی ہوی محسوس ہوتی ہے ۔ یہ خاکہ ایک کہانی بھی ہے جس کا ہیرو شوکت ہے ۔ مولوی صاحب ، منو ، تلن ، احمد ، کے علاوہ ابا میاں ، بھائی جان اور خود مصنف بھی اس کے افرادِ قصہ ہیں ۔ خاکے کے ابتدائی صفحات پڑھتے ہوے ہمارا ذہن پریم چند کی کہانی کفن اور توبۃ النصوح کے کرداروں مرزا ظاہر دار بیگ اور کلیم کی طرف منتقل ہوتا ہے لیکن آگے چل کر شوکت کی کہانی ایک دوسرا ہی موڑ اختیار کرتی ہے ۔ شوکت کا کردار ایک خاص معاشرے کی پیداوار ہے جو اب داستانِ پارینہ بن چکا ہے لیکن ایک علامت کے طور پر یہ کردار آج بھی زندہ ہے اور شاید ہمیشہ زندہ رہے گا ۔ یہ خاکہ ایک المیہ احساس پر ختم ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ " (شوکت) مرتے مرگئے ، مگر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا ، وضع دار تھے ۔ اب دالان میں بالکل سناٹا ہوگیا ہے ۔ اس طرف خاک اڑتی ہے ہم سب بھی ایک دن خاک ہوکر اڑجائیں گے ۔ "

قاسم ندیم نے دو ہندی کہانیوں کے ترجمے بدیہ ۔ ناظرین کیے ہیں جن میں مسلم معاشرے کو خاص زاویے سے دیکھا اور پیش کیا گیا ہے ۔ مترجم نے ان کہانیوں کے بارے میں قارئین کی رائے مانگی ہے ۔ فنی اعتبار سے بھی ان کہانیوں کے حسن و قبح پر اظہارِ خیال کیا جائے تو مناسب ہوگا ۔

شعری حصہ اس بار مختصر ہے ۔ ایاز صاحب نے جو تخلیقات منتخب کی تھیں وہ اس میں شامل ہیں ۔ ان مشمولات کے بارے میں کچھ کہنا نہیں ہے قارئین اپنے تاثرات لکھ بھیجیں ۔

آخر میں ہم قلم کاروں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی تخلیقات سے سوغات کے معیار کو بلند رکھنے اور ان مقاصد کے حصول میں تعاون کریں جن کے لیے سوغات کا اجرا ہوا تھا ۔

مغنی تبسم

گوشۂ محمود ایاز

ناسور (محمود ایاز کی یاد میں)	باقر مہدی
محمود ایاز کی وفات پر	عرفان صدیقی
محمود ایاز کی یاد میں	شکیب رضوی
محمود ایاز کی نذر	سردار ایاغ
محمود ایاز کے نام	حمید نسیم
کون ہوتا ہے حریف مئے مردافگن عشق	آل احمد سرور
ایاز صاحب - چند منتشر یادیں	شہریار
خراج صوت و صدا	شفیق فاطمہ شعریٰ
محمود ایاز - یادوں کی انجمن میں	مغنی تبسم
محمود ایاز - چند یادیں	خلیل مامون
جمال ہم نشیں	شائستہ یوسف
اب اس کے بعد ہماری نوا ہے خاموشی	ماہر منصور
بند آنکھوں میں ہیں نادیدہ زمانے پیدا	سیّد منظور احمد
محمود ایاز شخصیت اور فن	سیّد حبیب احمد
محمود ایاز کے خطوط	نیّر مسعود
محمود ایاز اور اختر الایمان	فضیل جعفری
"نقش اوّل" میں محمود ایاز کے اشکارے	شمس الحق عثمانی
زماں، مکاں اور شاعری	محمود ایاز
آگ کا دریا (تبصرہ)	محمود ایاز
دوناول اور آدم جی انعام	محمود ایاز
علامت پسندی کی روایت - ایک تعارف	سی۔ ایم۔ بورا (ترجمہ: محمود ایاز)
محمود ایاز کی منتخب نظمیں	
محمود ایاز کی منتخب غزلیں	

باقر مہدی

ناسور

(محمود ایاز کی یاد میں)

اک اک کر کے دوست بچھڑتے جاتے ہیں
تم بھی مجھ کو ـــــــــ چھوڑ گئے ؟
برسوں تم سے اچھے ذاتی رشتے تھے
ادبی بحثیں ــــ بیچ بیچ میں آ کر ہم کو ستاتی تھیں !

صبح سویرے، سرد ہوا کے جھونکے کھا کے آتے تھے
قہوہ پی کر بچھڑے سے باتیں کرتے تھے
دنیاوی جھگڑوں کے قصے مزے مزے سے سنتے تھے !

سورج کی کرنوں سے اپنا رشتہ تھا

عرفان صدیقی

محمود ایاز کی وفات پر

غبارِ شام میں صورت نظر نہیں آتی
صدائے ناقہ سواراں ادھر نہیں آتی
سوادِ شب کے اُدھر ہیں ہزار ہا مہتاب
کوئی کرن سرِ دیوار و در نہیں آتی
نگاہ اٹھے تو چاکِ جگر رفو ہو جائے
کسی کو اب یہ ادائے ہنر نہیں آتی
ہمیں عبث ہے سکوتِ گذشتگاں کا ملال
یہاں تو ہم سفروں کی خبر نہیں آتی
شگفتِ غنچہ ہوائے سحر سے ہو کہ نہ ہو
وہ موجِ رفتہ تو اب لوٹ کر نہیں آتی

جیسے جیسے شام کے سائے بڑھتے تھے
ہاتھ ہمارے جام اُٹھا کر ہنستے تھے !

تم مجھ کو سمجھاتے تھے۔" جینا کتنا مشکل ہے
"چوہا دوڑ" میں آخر کیسے تم جیتے تھے ۔!"
میں حیرت سے دیکھ کے تم کو چپ رہتا تھا !
گمنامی کے ٹھنڈے سائے میں
ہم کتنا خوش رہتے تھے ___ !

آج یہ آنسو پوچھ رہے ہیں
"جانے والے نے ___ اپنا زخم تو چھوڑا ہے
جب تک یہ ناسور بنے
یاد وہ تم کو آئے گا۔!"

شکیب رضوی

محمود ایاز کی یاد میں

سمت کا ہر ایک نشاں گم ہوا
سلسلۂ نقشِ رواں گم ہوا
قانعِ تقدیر ہوا حوصلہ
معرکۂ سود و زیاں گم ہوا
تیرگیِ شب ہے سکوت آشنا
شعلۂ فریاد و فغاں گم ہوا
برق روی راس نہ آئی اسے
رہبرِ جولاں قدماں گم ہوا
نرگسِ تخلیق ہوئی اشکبار
تاجورِ دیدہ وراں گم ہوا
دیدۂ مریم سے کب آنسو تھمے
شارقِ عیسیٰ نفساں گم ہوا
جانے کب آئے گا نیا جوہری
حوصلۂ شیشہ گراں گم ہوا

سردار ایاغ

محمود ایاز کے نذر

قریبِ وصل کے موسم میں جی رہا ہوں میں
خوشی کے ساتھ ترے غم میں جی رہا ہوں میں
سماعتیں کہ جو ورثے میں تو نے چھوڑی ہیں
وہ بازگشت وہ سرگم میں جی رہا ہوں میں
مری شکست میں زندہ ہے میرا مستقبل
اُمیدِ فتح کے پرچم میں جی رہا ہوں میں
ہر ایک چہرے پہ تیرا گماں گزرتا ہے
بڑے عجیب سے عالم میں جی رہا ہوں میں
کلی کے لب پہ جو لرزاں ہے آئینہ بن کر
ہر ایسے قطرۂ شبنم میں جی رہا ہوں میں

• حمید سیٹھ (والد محمود ایاز)
• محمود ایاز
• ایک عزیزہ
• بائیں جانب مریم ایاز
• شائستہ یوسف
• محمود ایاز
• مریم ایاز
[جولائی ۸۵ء]

• عوض سعید • نجم الثاقب شحنہ • محمود ایاز • مُغنی تبسم •
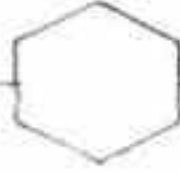
(بائیں سے) مجیب صاحب، اُن کے بھتیجے اور محمود ایاز (۱۹۹۵ء)

• غالب صدی تقاریب کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے (۱۹۶۹ء) •
[بیٹھے ہوئے تابش صاحب]

• راج اُتسو ایوارڈ •
[دائیں سے بائیں] محمود ایاز، عزیز اللہ بیگ، اور خلیل مامون۔

حمید نسیم

محمود ایاز کے نام

یہ اب سے تین چار مہینے پہلے کی بات ہے کہ اذان مغرب سے چند لمحے پہلے ایک صاحب نے ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ انہیں ابھی ابھی بھارت سے ٹیلی گرام ملا ہے کہ محمود ایاز صاحب بہت سخت بیمار ہیں۔ میرے پوچھنے پر کہ بیماری کے بارے میں کوئی اطلاع ملی ہے ان صاحب نے بتایا۔ بلبہ کا سرطان تشخیص ہوا ہے۔

بس یہ خبر سنتے ہی میں پسینے میں ڈوب گیا۔ اور یوں لگا جیسے ہاتھ پاؤں سے جان نکل گئی ہے۔ میرے دل سے بیساختہ یہ دعا زبان پر آگئی کہ مولیٰ تو قادر مطلق ہے۔ تو چاہے تو ان ہونی ہو جاتی ہے۔ تو جانتا ہے کہ محمود ایاز تن تنہا نصف صدی سے بھارت میں اردو زبان اور اس سے متعلق جمالیاتی، معاشرتی اور روحانی روایت کی بقا اور فروغ کے لئے اپنی زندگی وقف کئے ہوئے ہے۔ اس کے سامنے صرف ایک مقصد ہے یہ کہ بھارت میں اردو بولنے والوں کی اکثریت کی روحانی جمالیاتی اور معاشرتی شناخت برقرار رہے۔ مولیٰ یہ کار خیر اس وقت جہاد اکبر سے کم نہیں۔ کہتے ہیں جان کا صدقہ جان ہے۔ مالک محمود ایاز کی جان کے بدلے میری جان کا صدقہ قبول فرما۔ اسے صحت دے۔ کہ اسے کچھ ہو گیا تو اردو ہی نہیں ایک پوری تہذیب ایک پوری ثقافت بے سہارا ہو جائے گی۔ پھر یہ دعا میرے شب و روز کا وظیفہ بن گئی۔ میں ہی نہیں دلی سے بنگلور اور دکن تک لاہور سے پشاور اور کراچی تک لاکھوں بندگان رب دن رات محمود ایاز کی شفایابی کے لئے دعا مانگتے ہوں گے۔

نہ جانے کار ساز مطلق کی مشیت کیا تھی۔ کہ کسی کی دعا قبول نہ ہوئی۔ ایک صبح ٹیلی فون پر یہ کرب انگیز اطلاع ملی کہ محمود ایاز گزر گئے۔ میں زندگی بھر راضی بہ رضا رہا ہوں لیکن یہ خبر میرے لئے بڑی کٹھن آزمائش ثابت ہوئی۔ دل تڑپ تڑپ گیا۔ پھر یکبار یہ فقرہ زبان پر آگیا۔ اچھا۔ مالک۔ جو تو چاہے!

محمود ایاز صاحب سے صرف ۱۹۶۲ء میں آٹھ دس دن روز کی ملاقات رہی۔ ضیا جالندھری بھی ہر ملاقات میں موجود ہوتا تھا۔ پھر وہ بنگلور واپس چلا گیا۔ لیکن وہ ان چند دنوں میں میرے دل سے بہت قریب آگیا تھا۔ روشن مسکراتی سراپا صدق و خلوص آنکھیں۔ تیکھے دلنواز خدوخال والا چہرہ۔ باتوں میں سچائی اور دوستداری کی حلاوت۔ لہجے میں نسلوں کی شائستگی کی رچاوٹ۔ وہ چہرہ میرے دل میرے شعور میں ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اور میرے آخری دم تک رہے گا۔

آل احمد سرور

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق

محمود ایاز کی رحلت ایک ایسا ادبی سانحہ ہے جسے ہماری ادبی دنیا بھلا نہ سکے گی۔ محمود ایاز ہمارے نہایت ممتاز ادیب، نقاد اور شاعر تھے۔ ان کے رسالے "سوغات" کا گراں قدر کارنامہ کسی طرح نظر انداز نہ کیا جاسکے گا۔ میں ان سے صرف دو دفعہ ملا تھا۔ ہاں خط و کتابت خاص طور پر "سوغات" کے سلسلے میں خاصی رہی۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے پہلی دفعہ ان سے ملاقات علی گڑھ میں ہوئی۔ یہ غالباً ۶۵۔ ۶۶۔ کا واقعہ ہوگا۔ ان سے دنیا جہان کی باتیں ہوئی تھیں اور اردو ادب کے نئے میلانات پر خاص طور سے گفتگو رہی تھی۔ ان کا جو خط بعد میں بنگلور سے آیا اس میں انھوں نے یہ لکھا کہ آپ نے اور مجنوں گورکھپوری نے دورانِ گفتگو کسی کی برائی نہیں کی ورنہ علی گڑھ میں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی وہ زیادہ تر کسی نہ کسی کی برائی کرتے رہے۔ دوسری بار ملاقات بنگلور میں ہوئی۔ ساہتیہ اکیڈمی کا ایک ورک شاپ تھا جس میں ہندستانی ادب کے متعلق مختلف ادیبوں کے لیکچر رکھے گئے تھے۔ میرے دو لیکچر تھے ایک لنچ سے پہلے اور ایک لنچ کے وقفے کے بعد۔ میں نے ڈائریکٹر سے کہہ دیا کہ اگر ہوسکے تو دوسرے دن سویرے میری واپسی کی پرواز کا انتظام کردیں۔ اتفاق سے شام کو محمود ایاز کو میرے بنگلور آنے کی خبر ملی اور انھوں نے اصرار کیا کہ آپ یہاں ایک لیکچر کسی موضوع پر ضرور دے دیں۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر کل میری فلائیٹ کا انتظام نہ ہوا تو میں ضرور لیکچر دے دوں گا محمود ایاز نے یہ بھی کہا کہ اگر چوبیس گھنٹے کا نوٹس دیا جائے گا تب بھی آپ کو سننے کے لیے چار سو پانچ سو آدمی تو آجائیں گے۔

جب میں نے شکاگو یونیورسٹی میں جدید اردو شاعری کے نمائندہ شعرا پر تبصرہ اور ان کے کلام کا انتخاب کیا تو اس میں محمود ایاز کی ایک نظم کا اقتباس بھی تھا۔ سوغات کے تیسرے دور میں ان سے ربط ضبط بڑھا۔ ان کے لیے میں نے مشتاق احمد یوسفی کی نئی کتاب "آب گم" پر مضمون لکھا، عزیز احمد کے گوشے کی ترتیب میں مدد کی اور کئی شماروں میں میرے نام رشید صاحب، اثر، حامد حسن قادری، راجندر سنگھ بیدی اور کچھ اور ادیبوں کے خط شائع کیے گئے۔ حمید نسیم کی دو کتابوں پر وہ مجھ سے تبصرہ لکھوانا چاہتے تھے۔ ایک "اقبال ہمارا ایک عظیم شاعر" پر اور دوسرا ان کی خود نوشت "ناممکن کی جستجو" پر۔ میں نے اقبال پر تبصرہ لکھ کر بھیج دیا تھا

اور انھوں نے اس کی رسید بھی بھیج دی تھی اور تبصرہ پسند کیا تھا ۔ محمود ایاز کی علالت کا علم مجھے نیر مسعود اور عرفان صدیقی کے خط سے ہوا ۔ پھر میں نے خلیل مامون کو لکھا تو تفصیل معلوم ہوئی کی کینسر کا شبہ ہے اور رپورٹیں امریکہ اور انگلستان بھیجی گئی ہیں ۔ کچھ دنوں بعد محمود ایاز کا خط آیا اور میں دنگ رہ گیا کہ یہ شخص کیسا بہادر ہے ۔ نہ کوئی مایوسی کا کلمہ ہے ، نہ مشیت سے شکوہ ، نہ فلکِ کج رفتار سے شکایت ۔ ایک خط میں سیماب کا ایک شعر لکھا تھا

گزر گیا گزراں دورِ غم خوشی کی طرح   خزاں بھی ایک ہوا تھی بہار ہی کی طرح

اسی زمانے میں ان کا ایک انٹرویو سہ ماہی " ادب " بنگلور میں شائع ہوا تھا ۔ اس انٹرویو سے معلوم ہوا کہ یہ شخص کتنا کھرا (Authentic) تھا ۔ بچپن میں صحت خراب رہتی تھی اس لیے پڑھنے کا سلسلہ بہت چھوٹی عمر سے شروع ہو گیا بخار رہنے لگا جب وہ ٹھہرا تو باقاعدہ فارسی پڑھی، عروض سیکھی اور مشاہیر کے دواوین کا مطالعہ کیا ۔ یعنی محمود ایاز کے یہاں کوئی چھوٹا راستہ نہیں تھا ۔ انھوں نے جو کام ہاتھ میں لیا اس پر بڑی محنت کی ۔ ادب سے محض واقفیت ہی نہیں حاصل کی ، عشق بھی کیا ۔ واشنگٹن ارونگ نے کہیں لکھا ہے کہ بہت سے ادیب اپنی ایک برادری بنالیتے ہیں اور دوسروں کو گیا گزرا سمجھتے ہیں ۔ میرا ایک شعر ہے :

ہم نہ اس ٹولی میں تھے یارو نہ اس ٹولی میں تھے
نے کسی کی جیب میں تھے نے کسی جھولی میں تھے

محمود ایاز پر بھی یہی شعر صادق آتا ہے ۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ ادب میں ایک نسل کے بعد کچھ نئے میلانات ابھرنے لگتے ہیں ۔ مروجہ افکار و اقدار فرسودہ سے لگنے لگتے ہیں اور نئے افکار و اقدار پر توجہ شروع ہوتی ہے ۔ یہ انحراف یا بغاوت بالآخر ایک نئی روایت کو جنم دیتی ہے یعنی بہ حیثیت مجموعی ادبیات میں ہیگل کے فارمولے تھیسس ، انٹی تھیسس اور سِن تھیسس کا سلسلہ ہوتا ہے ۔ میرے دوست دیا شنکر (راجستھان یونیورسٹی) نے جو فلسفے کے مشہور استاد ہیں ایک دفعہ شملہ میں ایک لیکچر میں اس بات پر زور دیا تھا کہ ادب اور سائنس میں فرق یہ ہے کہ سائنس میں نئی حقیقت پرانی حقیقت کو ناقص قرار دے کر آگے بڑھتی ہے ، ادبیات میں ایسا نہیں ہوتا ۔ یہاں کوئی چیز کسی چیز کی جگہ نہیں لیتی بلکہ نئی اور پرانی حقیقتیں مل کر ایک نئی معنویت ایک نیا تناظر ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا کر لیتے ہیں ۔ اسی لیے میرے نزدیک ترقی پسندی ہو یا جدیدیت یا مابعد جدیدیت ، صرف ان کو حقیقت اور باقی کو افسانہ و افسوں سمجھنا غلط ہے ۔ ترقی پسندی کا اپنے دور میں ایک جواز تھا لیکن اب گنگا میں پانی بہت بہہ گیا ہے نئے مسائل سامنے آرہے ہیں ، زندگی نے نئی کروٹ لی ہے اور اس میں ترقی پسندی کے وہ مسلمات ، سیاہ و سفید کی وہ تقسیم ، کافر و مومن کی وہ حد بندی غلط ہو گئی ہے ۔

میرے نزدیک مابعد جدیدیت کی اصطلاح مغرب کی تقلید میں ہے ۔ اس سے بہتر

"جدید تر" کی اصطلاح ہے گویا ہم ترقی پسندی کے بعد جدید ادب سے اور اس کے بعد اب جدید تر ادب کے میلانات سے گزر رہے ہیں۔ لیکن یہ میرا ذاتی خیال ہے اور میں ادبیات میں کسی فرمان یا فتوے کا قائل نہیں ہوں۔ ادبی دنیا میں جمہوریت ہوتی ہے۔ ہر شخص کو اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہمارا مطالبہ لکھنے والوں سے یہ ہونا چاہیے کہ وہ ادبی اظہار، فن کے اسرار و رموز حسن کاری اور زندگی کی تخیلی تصویر پر زور دیں۔ میں تو ایلیٹ کے اس قول سے متفق ہوں کہ "ادب کو ادب کے معیاروں ہی سے جانچا جائے گا۔ لیکن بڑے ادب کو صرف ادبی معیاروں ہی سے نہیں۔" میرے نزدیک بڑے ادب کے یہ معیار زندگی کے بڑے تصورات ہی سے لیے جا سکتے ہیں۔ بڑے ادب میں بلندی بھی ہوتی ہے، گہرائی بھی، وسعت بھی اور ژرف نگاہی بھی۔ میں اپنی بنیادوں اور اپنے ماحول کے احساس کو ضروری سمجھتا ہوں لیکن آفاقی تناظر کو بھی اہمیت دیتا ہوں۔ ادب میں نظریہ ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی ہوتا ہے۔ ہاں حسن کاری ضروری ہے۔ بعض اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ لوگ نئے پن کے جوش میں ہر نئی چیز کو الہامی یا معیاری قرار دے دیتے ہیں۔ لیکن ہم دردی کے باوجود ہر نئی چیز کو آنکھ بند کر کے مان لینا نہیں چاہیے۔ محمود ایاز کو "عزیز تھی بوتل کا لیبل نہیں۔" ان کو لگاؤ ادب سے تھا، ادیبوں سے یا کسی خاص میلان سے نہیں تھا۔ "سوغات" کے ذریعے انھوں نے گیارہ بارہ شماروں میں جو ادبی سرمایہ پیش کیا اس کی قدر و قیمت مسلم ہے۔ "سوغات" میں نہ صرف نئے لکھنے والوں پر مفصل گفتگو ہوتی تھی بلکہ بعض ادیبوں کی طرف پھر توجہ دلائی جاتی تھی۔ "سوغات" کے گوشے تمام تر محمود ایاز کی پسند، ان کی حسن کاری کے آداب سے واقفیت، ان کی معیاروں کی پیہم جستجو کے آئینہ دار ہیں۔ کچھ لوگوں نے ان کی اس کوشش کو باز گشت کہہ کر اپنے خیال میں دوسرے درجے کی چیز قرار دیا، لیکن عزیز احمد، ضمیرالدین احمد، چودھری محمد علی ردولوی، رفیق حسین، بلونت سنگھ، خالد اختر، ممتاز شیریں وغیرہ پر جو گوشے نکالے گئے وہ ادب میں معیاروں کی یاد دہانی کے نقوش تھے۔ ایلیٹ نے کہیں کہا ہے کہ نقادوں کا کام تجربے اور تجربے میں فرق کرنا اور ذوقِ سلیم کی تخلیق ہے۔ "سوغات" کے مشمولات خصوصاً اس کے ادبی گوشوں میں خوب سے خوب تر کی جستجو، معیاروں کی بازیافت، افکار و اقدار کا گنجینہ۔ معانی محمود ایاز کے ذریعے سے آج کے حیران، پریشان، بوکھلائے ہوئے اور بدحواس قاری کو ملتا رہا ہے۔ اور اس طرح بقول فراسٹ کے اسے مسرت بھی ملتی رہی ہے اور بصیرت بھی۔ ایک شخص کا یہ تنہا کارنامہ واقعی ایسا ہے کہ ہم کو اس کی اہمیت اور معنویت کے آگے نہایت ادب سے سر جھکانا چاہیے اور مظہر جانِ جاناں کا یہ مصرعہ دہرانا چاہیے:

"خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را"

محمود ایاز کینسر کے موذی مرض میں گرفتار ہونے کے بعد بھی ہنستے بولتے رہے۔ انھوں نے

بڑی بے جگری سے اس کا مقابلہ کیا اور بالآخر مالکِ حقیقی سے جا ملے ۔ وہ جسمانی طور پر اب ہمارے درمیان نہیں مگر ذہنی طور پر ہمارے ادبی سفر میں ساتھ ہیں اور رہیں گے ۔ ان کی خوبیاں زندہ ہیں اور ان کی نیکیاں باقی ۔ ان کے اداریے ثابت کرتے ہیں کہ " سوغات " کا معیار بنانے میں ان کا رول کتنا فیصلہ کن تھا ۔ یہ محمود ایاز ہی تھے جو اچھے اچھوں کے مضمون واپس کر سکتے تھے ۔ مجھے انھوں نے دو ایک دفعہ بڑے رنج کے ساتھ لکھا کہ "آج کل یار لوگ سمیناروں میں چلتے ہوئے مضمون پڑھتے ہیں اور پھر انھیں " سوغات " میں اشاعت کے لیے بھیجتے ہیں ۔ میں سوغات کے معیار و منصب کا خیال رکھتا ہوں ۔

ان کے اداریوں کو اب پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ چند جملوں میں جابجا انھوں نے کیسے پتے کی باتیں لکھی ہیں ۔ اس منفرد شاعر، صاحبِ نظر نقاد ، طرح دار ادیب اور رمز شناس مدیر کو ہمارا خراجِ عقیدت کم سے کم اتنا تو ہونا ہی چاہیے کہ " سوغات " کو اسی آب و تاب سے جاری رکھا جائے ۔ دیکھنا ہے " کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق "

oo ooo oo

شہریار

ایاز صاحب۔۔۔چند منتشر یادیں

محمود ایاز اب ہم میں نہیں رہے۔ موت زندگی کی سب سے بڑی پہچان ہے پھر بھی اس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ محمود ایاز کے سلسلے میں تو خاص طور سے۔ اتنے زندہ، فعال، باذوق، وضع دار اور کھرے آدمی ہمارے دور میں خال خال پیدا ہوتے ہیں جو پیدا ہوئے وہ بھی زمانے اور زر کے رزق بن گئے۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ میں آخر الذکر لوگوں سے کچھ بہت مختلف ہوں۔ ایاز صاحب جن کو میں ہمیشہ ایاز بھیا لکھا کرتا سوغات کے ساتھ میری زندگی میں آئے اور پھر میرے وجود کا ایک ناگزیر حصہ بن گئے۔ سوغات کے پہلے دور میں ان سے خط و کتابت باقاعدگی سے ہوتی تھی دوسرے، تیسرے اور آخری دور میں کم ہوتی گئی اس کی ان کو شکایت بھی تھی۔ اب مجھے بہت افسوس اور پشیمانی ہو رہی ہے کہ کاش میں نے انھیں ڈھیر سارے خط لکھے ہوتے کہ ان کی خوشیوں میں تھوڑا بہت اضافے کا سبب میں بھی بن جاتا۔

سوغات کے لیے جب میں نے کلام بھیجا تو انھوں نے مجھے صبر کی تلقین کی اور کچھ مشورے دیے جس سے یہ گمان ہوا کہ کلام ناقابل اشاعت ہے لیکن جب رسالہ آیا تو اس میں میری چیزیں موجود تھیں۔ سوغات کے جدید نظم نمبر میں میرا کلام بھی تھا اور علوی کی نظموں پر میرا تجزیہ بھی۔ سوغات کے خطوط کے حصے میں اکثر میرے خطوط شائع ہوئے ہیں۔ میں نے جب لکھنا شروع کیا تھا تو ادیب خطوط لکھنے کو ادبی سرگرمی کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔ بہت سے ادیبوں سے تعلقات ان خطوط کی وجہ سے قائم ہوئے جو تادیر رہے۔ سوغات کے اداریوں میں ایاز صاحب ہمیشہ کوئی نئی بحث چھیڑتے جو ادب کے بعض گوشوں پر از سرنو غور کرنے کو اکساتی۔ اخترالایمان اور قرۃالعین پر ان کے تبصرے یادگار ہیں۔

بہ حیثیت انسان، ایاز صاحب بہت خوبیوں کے مالک تھے۔ ایک بار علی گڑھ آئے۔ خلیل الرحمن اعظمی کے یہاں قیام کیا۔ میں ان دنوں وہیں رہتا تھا۔ بڑی دل چسپ باتیں رہیں ان کو نئی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا اور دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔ اس ملاقات میں ہمیں کچھ ایسا لگا کہ وہ علم و ادب میں اپنے Up-to-date ہونے کا رعب جمانا چاہتے ہیں لیکن بعد میں احساس ہوا کہ ایسا نہیں تھا۔ انھیں جنون کی حد تک پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ یہ اس زمانے میں بھی باقی رہا جب وہ تجارت میں مصروف و منہمک تھے۔ سیاست اور صحافت میں

بھی انھوں نے اپنے بہت سے نقش چھوڑے ہیں ۔ کرناٹک کی تہذیبی ، ادبی اور سیاسی سرگرمیوں میں وہ پیش پیش رہے لیکن ان سرگرمیوں میں کبھی کوئی چھوٹی بات کی اور نہ کہی ۔

خلیل صاحب کا منجھلا بیٹا سلمان خلیل بنگلور کسی ٹریننگ کے سلسلے میں گیا تو ایاز صاحب سے بھی ملا انھوں نے دوسری شام اس کو گھر بلایا بازار لے گئے مختلف طرح کی شاپنگ کرائی ، بیگم خلیل کے لیے ساڑیاں دیں ، بڑے ہوٹل میں کھانا کھلایا بنگلور کے بازاروں کی سیر کرائی ۔ چند سال قبل میں حیدرآباد گیا ہوا تھا وہاں مغنی تبسم کے ساتھ پروگرام بنا کہ کیوں نہ ہم دونوں بنگلور چلیں چند روز وہاں رک کر میں علی گڑھ چلا جاؤں اور مغنی واپس حیدرآباد آجائیں ۔ سو ہم دونوں چل پڑے ۔ ایاز صاحب کو اطلاع دے دی تھی ۔ ایاز صاحب مع بھابی اسٹیشن پر موجود تھے ۔ دیر تک بغل گیر رہے ۔ میرا اور مغنی کا شمار وہ اپنے خاص لوگوں میں کرتے تھے ۔ گھر پہنچ کر ایسا لگا جیسے اپنا ہی گھر ہو ۔ ہم دونوں کے لیے ایک کمرہ نہایت اہتمام سے تیار تھا نہا دھو کر کھانا کھایا ۔ آرام کیا ۔ کمرے کے باہر لاؤنج تھا V.C.R T.V. بھی تھا چھوٹا لڑکا سامنے کے کمرے میں رہتا تھا ۔ جب جب ضرورت پڑتی وہ V.C.R چلا دیتا کہ میں اور مغنی V.C.R کے رموز سے ناواقف تھے ۔ شام ہوئی ، خلیل ماموں آگئے اور ہم لوگ بے زہد عبادت میں مصروف ہوگئے ۔ بہترین "مشروب" موجود تھا ۔ یہ سلسلہ پابندی سے چار پانچ روز چلا ۔ ان دنوں میں کئی شامیں خلیل ماموں کے گھر یا بنگلور کلب میں گزریں ۔ ہم دونوں چوں کہ اپنے کرائے سے گئے تھے ہماری زیرباری کم کرنے کے لیے کرناٹک اردو اکیڈمی کا ایک جلسہ کرایا گیا اور یوں ہمارے سفر خرچ کا انتظام ہوگیا ۔ ہر شام شعروشاعری ہوتی ۔ میں نے اپنی چیزیں کم سنائیں ، ان کی چیزیں زیادہ سنیں ۔ میری شاعری کے بارے ان کی رائے برابر اچھی رہی البتہ وہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی توقعات رکھتے تھے ۔

سوغات کے آخری دور میں میں اس گرم جوشی کا مظاہرہ نہ کرسکا جس کی انھیں اور مجھے دونوں کو توقع تھی ایک بار تو انھوں نے خفا ہو کے لکھا کہ اگر رسالہ ملنے کے بعد تمھارا خط نہیں آیا تو میں تمھاری طرف سے خود خط لکھ کر چھاپ دوں گا ۔ سوغات آخری دور میں جس آن بان سے نکلا وہ اردو ادب کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا ۔ وہ اپنی شاعری کے سلسلے میں بے نیاز تھے ۔ ان کو یہ زیب دیتا تھا ہم کو نہیں ۔ ان کی شاعری جمع ہونی چاہیے اور اہتمام سے شائع ہونی چاہیے ۔ ایک کتاب اداریوں اور تبصروں کی بھی تیار کی جاسکتی ہے ۔

تو نہیں ہے تو خواب دیکھے کون
کیا تجھے نیند سے جگادوں میں ؟

OO OOO OO

شفیق فاطمہ شعریٰ

خراجِ صوت و صدا

این گل و لالہ تو بینی کہ مقیم اند ہمہ
راہ پیما صفت موجِ نسیم اند ہمہ

سوغات کے دورِ اول میں یہ شعر اپنے کسی خط میں محمود ایاز کو لکھ کر بھیجا تھا۔ اس شعر کی معنویت ایک ایسی ذہنی کیفیت بن گئی تھی جس کے بہاؤ میں خارج کا ماحول بھی ابھرتا ڈوبتا دکھائی دیتا ---- غاروں میں پتھروں پر کندہ تصویریں، ایسا لگتا، تحریروں میں بدل گئی ہیں اور ایک عہد کی مہک کو دوسرے عہد میں پہنچا رہی ہیں ---- دوسری طرف خلد آباد کے آثار، جیسے ایک گونج میں ڈھل گئے تھے ----

خزینۂ بنہ از رنگ و بوئے فصلِ بہار
کہ می رسند پئے رہزنانِ بہمن ودے

وقتِ گزراں سے انسان کے الجھنے کا منظر عجیب ہے ----

جانم در آویخت با روزگاراں
جوئے است نالاں در کوہساراں

یہاں کبھی: "اول و آخر فنا باطن و ظاہر فنا" کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے، کبھی صفت موجِ نسیم راہ پیمائی کا ---- پہلے مرحلے میں دم مارنے کی مجال نہیں۔ دوسرے مرحلے میں، ہم کچھ ڈھارس پاتے ہیں، کہ وقت گزراں میں بہت کچھ ہے جو مٹ رہا ہے۔ بہت کچھ ہے جو بن رہا ہے۔ بہت کچھ ہے جسے بچا لینا اپنے امکان میں ہے۔

ایسے ہی شب و روز تھے جب، آزادی کے تقریباً ایک دہے بعد، محمود ایاز نے "سوغات" نکالا۔ یہ سہ ماہی رسالہ دیکھتے ہی دیکھتے برِ صغیر کے تمام نئے لکھنے والوں کا مرکزِ امید بن گیا۔ سینئر ادیبوں اور شاعروں نے بھی نہ صرف اس کا خیر مقدم کیا بلکہ اس کارواں میں خود بھی شامل ہو گئے جس کی منزل آزادی کے ماحول میں معیاری ادب کی تخلیق تھی۔

آج اتفاق سے "سوغات" کے دورِ اول کا پانچواں شمارہ ہاتھ میں آ گیا۔ اسے دیکھتی ہوں تو دیکھتی رہ جاتی ہوں ---- "نقشِ اول" کی آب و تاب وہی ہے۔ ایک نمونہ تابِ گفتار کا ملاحظہ ہو

"ممتاز شیریں کے میگھ ملہار کی محمد حسن نے اتنی تعریف کی ہے کہ مجھے اپنے مذاق اور معیار پر شبہ ہونے لگا ---- حیرت ہوتی ہے کہ افسانے کی اتنی اچھی پارکھ، خود اتنی بہتدیانہ لغزشوں کا شکار کیسے ہو گئیں۔"

اس وقت تک محمد حسن بھی، جن کا مضمون "جدید اردو افسانے کا جائزہ" شریکِ اشاعت ہے، اور ممتاز شیریں بھی اپنا ایک مقام بنا چکے تھے پھر بھی متانت اور شائستگی کے ساتھ، بڑے بڑوں کی شریکِ اشاعت تخلیقات پر ایسی گرفت، نقشِ اول کی پہچان تھی ---- اس شمارے کے نظم نگار مجید امجد، محبوب خزاں، ساقی فارقی، قاضی سلیم، حبیب تنویر، بلراج کومل، مخمور سعیدی، حمید الماس اور شفیق فاطمہ شعریٰ ہیں۔ جگن ناتھ آزاد کی رباعیات ہیں۔ غزل نگاروں میں آنند نرائن ملا، آلِ احمد سرور، شان الحق حقی، شہرت بخاری، امتیاز علی عرش، غلام ربانی تاباں، محمد علوی، بشیر بدر اور نظیر صدیقی کے نام ہیں۔ کرشن چندر کا ایک افسانہ ہے۔ محمود ایاز نے تبصرے کے لیے آگ کا دریا (قرۃ العین حیدر) کا انتخاب کیا ہے ---- البئیر کامیو پر شہزاد منظر کا تعارفی مضمون ہے۔ ایسے مضامین کی پذیرائی سوغات میں خوب ہوتی تھی۔ یہ مغرب سے آتے ہوئے بادِ ساز گار کے جھونکے تھے ---- مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایاز صاحب نے بادِ مخالف کے جھونکوں کے ساتھ کبھی مفاہمت نہیں کی۔ چاہے وہ مغرب سے آئیں چاہے مشرق سے ---- اس شمارے میں خلیل الرحمٰن اعظمی اپنی دو نظموں کے ساتھ موجود ہیں ---- تذکرۂ شعراء اردو اور نقد نامہ ---- حیرت ہوتی ہے ایسے خندۂ بے ساختہ تک پہنچنے سے پہلے شاعر نے اپنے حساس دل کو کس طرح کڑھنے کے عمل سے گزارا ہوگا۔

یہ دورِ اول کی محفل تھی۔ اس کے اختتام پر محمود ایاز نے "اردو والوں کو "جدید نظم نمبر" جیسا تاریخی تحفہ دیا۔ اس نمبر نے بھی برِ صغیر کی نمائندگی کی روایت کو برقرار رکھا ---- عالمی ادب کے مناظر میں جدید اردو نظم کو مانوس، قابلِ فہم اور درخورِ اعتنا بنانے کی کوشش کی۔

معیاری ادب کے پڑھنے والے کم ہوتے ہیں۔ اس سے اس کی قدر و قیمت متاثر نہیں ہوتی۔ "سوغات" بند ہو گیا مگر اس کا دورِ اول یادداشت میں محفوظ رہا۔ شملہ کانفرنس کے دوران (تقریباً دس سال بعد) ایک خبر نے اپنی طرف متوجہ کیا کہ اراکین وفد میں سے چند ایک نے بنگلور جا کر محمود ایاز سے ملنا اپنے پروگرام میں شامل کیا ہے۔ یقیناً وہ "سوغات" کے قاری رہے ہوں گے۔

"سوغات" کے دوسرے دور میں دو تین شمارے ہی نکل سکے انھیں میں سے ایک میں، میری نظم "شفیع الامم" شائع ہوئی۔

" سوغات " کے موجودہ تیسرے دور کے شمارے آپ کے سامنے ہیں۔ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ قارئین کچھ " تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل " سے ان شماروں میں متعارف ہوئے۔ یورپ، امریکہ اور عرب ملکوں کے ادبی حلقوں میں اس رسالے کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ضخامت دیکھنے پر قیاس ہوتا ہے کہ مالی اعتبار سے یہ رسالہ محمود ایاز کے لیے خسارے کا بزنس ہے۔ یہاں پہنچ کر مریم زمانی کی طرف دھیان جاتا ہے۔ یقیناً ان کے تعاون کے بغیر یہ خسارے کا بزنس نہیں چل سکتا تھا۔ خدا صبرِ جمیل کے ساتھ انھیں اور ان کے بچوں کو اس ایثار کی بہترین جزا دے۔

" سوغات " اپنے ہر دور میں میرے لیے روشنی کا ایک دریچہ رہا ہے۔ بہت سی باتیں ہیں جن کا خلاصہ تیار نہیں کیا جا سکتا۔ میری نظم " حضارت جدید " کو انھوں نے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ خطوط میں نظم کی تراش خراش کا موضوع زیرِ بحث رہا کہ نظم میں ایک دو بند ایسے ہیں جن سے نظم کی وحدت متاثر ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ جب یہ نظم کتابت کے لیے جا چکی تھی تو فون پر بھی یہی تجویز انھوں نے پیش کی کہ کچھ سطریں حذف کر دی جائیں۔ میں نے محسوس کیا کہ تجویز نظم کے مفاد میں ہے۔ اس لیے مان لی۔

کبھی میرے منظوم تراجم کی انھوں نے خوش دلی سے پذیرائی نہیں کی۔ " مترجم مشہور ہو جائیں گی۔ " یہ ان کی وارننگ تھی۔

نثر پارہ کتنا ہی مختصر ہو پڑھ کر خوش ہوتے۔ " اس سے آپ کی مستقبل کی نظموں پر پڑنے والا بوجھ کم ہوگا۔ " یہ ان کی پیشین گوئی تھی ----

۱۹۶۰ء کے آس پاس سلیمان خطیب اورنگ آباد آئے تھے۔ ہمارے گھر بھی آئے۔ اپنی کئی نظمیں سنائیں۔ والدہ اور بہن بھائیوں کو خوب ہنسایا۔ ان کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا ---- دورانِ گفتگو ایاز صاحب کا ذکر آیا کہنے لگے " محمود ایاز ---- واہ ---- کیسا شکیل و جیہہ نوجوان ہے۔ " اور بھی تعریفی کلمات کہے۔ میں نے سوچا اس تعریف کے پیچھے کیسی عالی ظرفی ہے۔ وہ تو " سوغات " میں نہیں چھپتے تھے۔ پھر بھی وہ اس کام کی قدر و قیمت کے منکر نہیں تھے۔ جسے محمود ایاز انجام دے رہے تھے۔

ایاز صاحب، بیماری میں آپ نے بہت تکلیف اٹھائی پھر اپنے کام میں لگے رہے۔ پھر خدا نے آپ کو راحت دی۔ دعا ہے کہ وہ آپ کو رحمتِ بے پایاں سے نوازے اور اپنی خوشنودی سے سرفراز کرے۔

قرآن مجید کی ایک آیت یاد آتی ہے: قد علمنا ما تنقص الارض منهم وعندنا کتاب حفیظ ○ (ق)

ہمارے علم میں ہے جو کچھ زمین ان کے اجزا سے (واپس لیتی اور) کم کرتی ہے۔ اور ہمارے پاس کتابِ حفیظ (محفوظ ریکارڈ) ہے۔

اس مقدس آیۃ کی روشنی انسانی وجود کی سالمیت پر پڑرہی ہے، جسے مٹی میں مل کر مٹی نہیں ہونا ہے۔ اس آیۃ کی روشنی میں پھر اس شعر کی معنویت ایک نئے زاویے سے آشکار ہورہی ہے ---

این گل ولالہ تو بینی کہ مقیم اند ہمہ
راہ پیما صفتِ موجِ نسیم اند ہمہ

○ ○ ○

مغنی تبسم

محمود ایاز

یادوں کی انجمن میں

محمود ایاز کی وفات میرے لیے ایک ذاتی سانحہ ہے ۔ یوں تو رفتگاں کی یاد وظیفۂ حیات بنی رہی لیکن جن دوچار ہستیوں کی جدائی نے میری اپنی شخصیت کے تار و پود بکھیر کے رکھ دیے ان میں ایک ہستی اور شاید آخری ہستی محمود ایاز کی تھی ۔ ان کی رحلت کے بعد اب یوں لگتا ہے جیسے سب کچھ ختم ہو گیا ہے ۔

محمود ایاز نے جب سوغات جاری کیا میری ان سے شناسائی نہیں تھی البتہ سلیمان اریب سے ان کے مراسم تھے اور خط و کتابت کا سلسلہ تھا ۔ اریب کے توسط سے محمود ایاز سے غائبانہ تعارف ہوا ۔ میں صبا سے ہمیشہ رسمی یا غیر رسمی طور پر منسلک رہا ۔ صبا میں اشاعت کے لیے ان کی نظمیں اور غزلیں وصول ہوتیں ۔ صبا کی توسیع اشاعت اور اشتہار کے سلسلے میں وہ مدد کرتے تھے ۔

سوغات کا پہلا شمارہ غالباً اکتوبر ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا ۔ سلیمان اریب کے نام ایک خط میں انھوں نے لکھا تھا ۔ " امکان بھر کوشش کر رہا ہوں کہ اس پرچے کو صرف ایک عام رسالہ نہیں بلکہ ادارے کی شکل دے سکوں ۔ بیسیوں چیزیں ذہن میں موجود ہیں لیکن اس پتھریلی زمین اور ہمت شکن ماحول میں (یہ بات بنگلور کے لیے نہیں بلکہ سارے ہندستان کے لیے لکھ رہا ہوں) اس پودے کو شجرِ سایہ دار بننے میں کافی وقت لگے گا ۔ بہ ہرحال اپنے بس کی بات تو صرف محنت اور کوشش ہے ۔ نتیجہ کب نکلے گا اور کیا نکلے گا اس کی فکر کیوں کریں ۔ " (مورخہ ۱۶ جولائی ۵۹ء)

سوغات نے بہت جلد ادبی دنیا میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا ۔ ہندستان اور پاکستان میں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی ۔ اس کی مقبولیت کو دیکھ کر ارادہ کیا کہ ہندستان کے علاوہ پاکستان سے بھی سوغات شائع کریں اور سوغات کے جدید نظم نمبر کی تیاری شروع کی ۔ جولائی ۱۹۶۱ء میں انھوں نے پاکستان کا سفر کیا ۔ سوغات کا یہ نمبر کراچی سے فروری ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا

اس کے چند ماہ بعد غالباً اکتوبر یا نومبر ۱۹۶۲ء میں وہ بمبئی جاتے ہوئے چند روز کے لیے اریب سے ملاقات کی غرض سے حیدرآباد میں رکے اور مال ؔ اری روڈ (اسٹیشن روڈ) پر پیلیس ہوٹل میں قیام کیا۔ میں، سلیمان اریب اور بعض دوسرے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ان سے ملنے کے لیے ہوٹل گیا۔ یہ محمود ایاز سے میری پہلی ملاقات تھی۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بڑے بدمغ آدمی ہیں لیکن اس ملاقات میں یہ تاثر زائل ہوگیا۔ حیدرآباد میں وہ اگرچہ مہمان تھے لیکن ہمارے لیے میزبان بن گئے۔ محمود ایاز رمی کے شوقین تھے۔ جب تک وہ رہے ہر روز ان کے کمرے پر رمی کی محفل جمتی۔ حیدرآباد سے وہ بمبئی روانہ ہوئے۔ سالار کے لیے پریس یا کوئی مشین انھیں خریدنی تھی۔

بمبئی میں ایک ماہ قیام کے بعد وہ بنگلور لوٹے۔ ۲۷/دسمبر ۱۹۶۲ء کو ان کی شادی ہوی۔ اب وہ سالار کی ادارت کے ساتھ سرگرم سیاست میں بھی حصہ لینے لگے تھے۔ مخالف حکومت سرگرمیوں کی وجہ سے انھیں گرفتار کرکے جیل بھیج دیا گیا۔ چھے ماہ تک انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ مارچ ۶۹ء میں رہا ہوئے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے "محمود ایاز سے ایک گفتگو" مشمولہ ادب ۳ بنگلور)

اس دوران کبھی کبھار ان کے خطوط آجاتے۔ دو ایک بار بنگلور میں بھی ان سے ملاقات ہوی۔ ایک بار انھوں نے سوغات کے لیے نظمیں مانگیں وہ میں نے بھیج دیں اور سوغات کے خاص نمبر جنوری ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئیں۔

غالب صدی تقاریب کے موقع پر ۲۱ مئی ۶۹ء کو ایک کل ہند مشاعرہ بنگلور میں منعقد کیا گیا تھا۔ محمود ایاز اس کے کنوینر تھے۔ انھوں نے حیدرآباد سے مخدوم محی الدین، سلیمان اریب، اور مجھے مدعو کیا تھا۔ بنگلور میں ہم کو ایک نو تعمیر شدہ ہوٹل Stay Longer میں ٹھہرایا گیا تھا جس کا ابھی افتتاح بھی نہیں ہوا تھا۔ باقر مہدی بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرے تھے دیگر شعرا کا قیام کسی اور ہوٹل میں تھا۔ مشاعرے کے صدر مخدوم محی الدین تھے۔ مشاعرے کے بعد ایک کمرے میں ہماری مخصوص محفل جمی۔ وہ بڑی ہنگامہ خیز رات تھی۔ میں کمیونسٹ پارٹی کا رکن رہا تھا۔ مجھے کمیونسٹ پارٹی کی بدلی ہوی پالیسی اور بعض یورپی ملکوں کے خلاف سوویت یونین کے جارحانہ رویے سے اختلاف تھا۔ باقر مہدی بھی پارٹی سے بدظن تھے۔ ہم نے مخدوم محی الدین کو اپنے غم و غصے کا نشانہ بنایا جیسے وہی اس کے ذمہ دار تھے۔ باقر مہدی بار بار کہتے چلو ہم کانو سانیال سے ملیں گے۔ یہ لوگ بالکل ناکارہ ہیں۔ محمود ایاز اور اریب نے محفل کو بدمزہ ہونے سے بچالیا۔ مخدوم محی الدین کو حیدرآباد میں کسی اہم میٹنگ میں شرکت کرنی تھی انھوں نے محمد علی منسٹر سے کہہ کر ہوائی جہاز سے واپسی کا ٹکٹ کرالیا۔ اریب کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔ کوبالٹ ٹریٹمنٹ چل رہا تھا۔ مشاعرے میں شرکت کی وجہ سے علاج میں ناغہ ہوتا تھا

اور ڈاکٹر نے بہ مشکل انھیں بنگلور جانے کی اجازت دی تھی ۔ ہم نے محمود ایاز کو صورت حال سے واقف کرایا تو وہ فوراً محمد علی سے ملے اور اریب کی واپسی کے لیے بھی ہوائی جہاز کا کرایہ منظور کروا لیا ۔ چند ماہ بعد ۲۵ / اگست ۱۹۶۹ء کی رات کو مخدوم محی الدین دہلی میں رحلت کر گئے جہاں وہ یوم آزادی کے مشاعرے میں شرکت کے لیے گئے تھے ۔

کوبالٹ کے علاج سے اریب کی صحت کافی سدھر گئی تھی ۔ ان کے معمولات زندگی پھر سے بحال ہوگئے تھے اور وہ مخدوم نمبر کی تیاری کر رہے تھے (صبا کا ایک مخدوم نمبر وہ مخدوم محی الدین کی زندگی ہی میں دسمبر ۶۶ء میں شائع کر چکے تھے) ۔ ان ہی دنوں میں نے شہریار کے ساتھ مل کر شعروحکمت جاری کیا ۔ یہ رسالہ محمود ایاز کو بہت پسند آیا اور مجھے مبارک باد دی ۔ میری فرمائش پر محمود ایاز نے اپنی کئی غزلیں بھیجیں جو شعروحکمت میں اکٹھے شائع ہوئیں ۔ مئی ۱۹۷۰ء میں اریب کے مرض نے دوبارہ شدت اختیار کر لی ۔ ان کو علاج کے لیے عثمانیہ ہاسپٹل میں شریک کیا گیا ۔ چند روز کے بعد کینسر ہاسپٹل میں منتقل کر دیا گیا ۔ آخری دنوں میں جب وہ بات بھی مشکل سے کر سکتے تھے انھوں نے ایک نظم "کڑوی خوش بو" لکھی اور یہ نظم محمود ایاز کو بھیجی ۔ محمود ایاز اس نظم سے بے حد متاثر ہوے ۔ انھو نے اریب کو لکھا: "تمھاری نظم ملی بڑی دردناک ، بڑی سفاک نظم تم نے لکھ دی ہے ۔ میرولی الدین نے اسلام کے فلسفۂ حزن یا غم پر ایک کتاب بڑی عمدہ لکھی ہے ۔ حیدرآباد میں مل جائے گی ۔ ان دنوں پڑھ ڈالو بلکہ صفیہ سے کہو وہ پڑھ کر سنائیں گی ۔ مرنا جینا بہت معمولی باتیں ہیں ۔ ان کی اہمیت جذباتی اعتبار سے صرف پس ماندگان کے لیے ہوتی ہے ورنہ مرنے والا تو بڑے مزے میں رہتا ہے" ۔ (مکتوب مورخہ ۱۸ / اگست ۱۹۷۰ء) اریب کی حالت جب بہت خراب ہو گئی تو اطلاع پاکر محمود ایاز حیدرآباد آئے ۔ اریب شدید تکلیف میں بتلا تھے ۔ بات بھی نہیں کر سکتے تھے ۔ محمود ایاز دیر تک وہاں رہے ۔ کمرے سے نکل کر ہم لوگوں سے علاج کی تفصیلات معلوم کیں ۔ صفیہ کو دلاسا دیا غالباً اسی روز شام کو وہ بنگلور لوٹ گئے ۔ چند روز بعد اریب وفات پاگئے ۔ اریب کی موت پر محمود ایاز نے ایک پراثر نظم لکھی جس کے چند مصرعے یہ ہیں:

یوں رگ و پے میں اجل اتری ہے
ہاتھ ساکت ہیں دعا کیا مانگیں
آنکھ خاموش ہے کیا دیکھے گی
ہونٹ خوابیدہ ہیں کیا بولیں گے

نکہتِ گل کی طرح آوارہ
بوئے جاں وسعتِ آفاق میں گم
یک کفِ خاک ہے .... وہ بھی کب تک
صبح کی اوس سے آنکھیں دھو لو

اریب کی وفات کے بعد عرصے تک ان سے زیادہ ربط نہیں رہا۔ شعر و حکمت بند ہو گیا سوغات کی اشاعت بھی مسدود ہو گئی ۔ ۱۹۸۲ء میں محمود ایاز اور میں ایک دوسرے سے دور اور بے خبر الم ناک سانحوں سے دوچار ہوے ۔ میری بیوی کا انتقال ہوا، ادھر محمود ایاز کے چھوٹے بھائی نے رحلت کی جس کو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے ۔ بھائی کی وفات کے بعد وہ بالکل ٹوٹ کر رہ گئے تھے ۔

چند سال بعد شہریار اور میں نے دوبارہ شعر و حکمت جاری کیا ۔ انھیں پرچہ بھیجا تو بے طلب انھوں نے شعر و حکمت کے لیے پانسو روپے کا ڈرافٹ روانہ کیا ۔ انھیں دنوں کچھ ایسے سلسلے نکل آئے کہ مجھے سال میں دو ایک بار میسور یا بنگلور جانے کا اتفاق ہونے لگا ۔ بنگلور میں میرے چند عزیز رہتے ہیں ۔ انھیں کے ہاں میں قیام کرتا ۔ بنگلور پہنچ کر میں محمود ایاز کو فون پر اپنی آمد کی اطلاع دیتا ۔ وہ شام کو آجاتے اور مجھے اپنے گھر لے جاتے ۔ اس طرح شامیں انھیں کے ساتھ گزرتیں ۔ پھر محمود ایاز نے اصرار کیا کہ بنگلور آؤں تو انھیں کے ہاں قیام کروں ۔ چناں چہ جب بھی بنگلور جانا ہوتا میں انھیں فون پر اپنے پروگرام سے مطلع کرتا ۔ وہ ایرپورٹ یا ریلوے اسٹیشن آجاتے ۔ میرا میسور جانے کا پروگرام ہوتا تو ایک آدھ روز ان کے گھر میں قیام کر کے میسور چلا جاتا ۔ وہاں سے لوٹ کر بنگلور آتا اور مزید تین چار دن ان کے ساتھ گزارتا ۔ واپسی پر وہ مجھے ایرپورٹ یا اسٹیشن پہنچا دیتے ۔ جب محمود ایاز کے بڑے فرزند جواد ، جن کے کمرے میں مجھے ٹھہرایا جاتا تھا ، اپنی فیملی کے ساتھ امریکہ سے بنگلور منتقل ہو گئے تو خلیل ماموں یا عزیز اللہ بیگ کسی گیسٹ ہاؤس میں میرے قیام کا بندوبست کرنے لگے لیکن میرا زیادہ وقت محمود ایاز کے ساتھ ہی گزرتا ۔

غالباً مئی ۱۹۸۵ء کی بات ہے ایک نئی ابھرتی ہوئی شاعرہ شائستہ یوسف جو بمبئی میں رہتی تھیں شادی کے بعد بنگلور منتقل ہوئیں ۔ وہ نثری نظمیں لکھتی تھیں ۔ اپنا مجموعہ کلام شائع کرنا چاہتی تھیں ۔ انھوں نے محمود ایاز سے خواہش کی کہ وہ پیش لفظ لکھ دیں ۔ محمود ایاز نے یہ کہہ کر انھیں مجھ سے رجوع کر دیا کہ نثری نظمیں میرے پلے نہیں پڑتیں بہتر ہے کہ آپ مغنی تبسم سے پیش لفظ لکھوائیں ، وہ اس سے شغف رکھتے ہیں ۔ میں نے پیش لفظ لکھ دیا اور اسے مضمون کی صورت میں سب رس میں بھی شائع کیا ۔ کچھ دنوں بعد میں ، عوض سعید ، خالد قادری ، میری بہنیں صدیقہ شبنم اور فاطمہ عوض سعید تفریحاً بنگلور گئے ۔ نجم الثاقب شحنہ

بھی آگئے تھے ۔ محمود ایاز کے گھر پر نشست رہی جس میں شائستہ یوسف بھی موجود تھیں ۔ ان سے پہلی بار متعارف ہوا ، یہ ایک یادگار شب تھی ۔

سوغات کے اجرا کے بعد میرا بنگلور آنا جانا زیادہ رہا اور محمود ایاز کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ۔ محمود ایاز کا معمول تھا کہ سویرے گالف کھیلنے چلے جاتے ۔ وہاں سے لوٹ کر نہاتے اور ٹھیک نو بجے ناشتے کے لیے مجھے آواز دیتے ۔ ناشتے کے بعد اخبار پڑھتے ۔ کبھی وہ ڈاکٹر سے ملنے یا کسی اور کام سے چلے جاتے ۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو جاتا یا پھر اپنے کمرے میں جاکر لکھنے پڑھنے میں مشغول ہو جاتا ۔ ٹھیک ایک بجے دوپہر کا کھانا کھاتے ۔ کھانے کے بعد دو ایک گھنٹے آرام کرتے ۔ پھر ان سے چار بجے چاء پر ملاقات ہوتی ۔ چاء پینے کے بعد وہ سوغات کا کام دیکھتے ۔ میں بھی ان کے کام میں مدد کرتا ۔ ساتھ ہی ساتھ مختلف تخلیقات پر گفتگو ہوتی ۔ غروب آفتاب کے ساتھ ہی نائے و نوش کا سلسلہ چلتا ۔ اس دوران مختلف موضوعات پر بات چیت ہوتی ۔ بات چیت کیا ہوتی زیادہ تر انھیں کی گل افشانی گفتار رہتی اس طرح کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی ۔ دو ڈھائی گھنٹے کے بعد ڈنر کھا کر سونے کے لیے چلے جاتے عام طور پر خلیل مامون اور عزیز اللہ بیگ شریک محفل ہوتے ۔ شحنہ جب یادگیر میں تھے ، میں انھیں اپنے پروگرام سے مطلع کرتا وہ بھی بنگلور آجاتے ۔ کبھی شام کو ہم سب کلب چلے جاتے یا خلیل مامون اور کبھی عزیز اللہ بیگ ہم کو اپنے گھر مدعو کرتے ۔ ایک بار بنگلور کے سفر میں شہریار میرے ساتھ تھے ۔ ہم دونوں کا قیام محمود ایاز کے گھر پر تھا ۔ تین چار دن ہم وہاں رہے ۔ محمود ایاز نے مجھے چند نظمیں دیں جن پر شاعر کا نام نہیں تھا اور کہا کہ حیدرآباد لوٹنے سے قبل ان پر تبصرہ لکھ دوں میں نے تبصرے لکھ دیے ان کی نوعیت تجزیاتی مطالعے کی تھی ۔ یہ تجزیے سوغات میں شائع ہوئے ۔ نظمیں خلیل مامون کی تھیں ۔ یہ صحبتیں اور محفلیں میری زندگی کا قیمتی اثاثہ ہیں جو ہمیشہ کے لیے برہم ہو گئیں ۔

میں نے اور شہریار نے شعر و حکمت دوبارہ کتابی سلسلے کے طور پر جاری کیا تھا تو اس کا معیار اچھا خاصا تھا ۔ بڑی محنت اور لگن سے ہم اعلیٰ درجے کی تخلیقات اور تنقیدی مضامین فراہم کرتے ۔ یہ ضرور ہے کہ چند ایک چیزیں محض نام کی شہرت کی بنا پر یا مروتاً ایسی شامل ہو جاتیں جو اوسط یا اوسط سے کم معیار کی ہوتیں ۔ محمود ایاز اس پر سخت تنقید کرتے ۔ کہتے کہ رسالے کو ایک ادبی فورم ہونا چاہیے ۔ تخلیقات اور مسائل پر گفتگو ہونی چاہیے ۔ ورنہ محض چند مضامین ، افسانے ، نظمیں اور غزلیں شائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں ۔ دو ضخیم شماروں کی اشاعت کے بعد مالی خسارے کی وجہ سے شعر و حکمت کو جاری رکھنا ممکن نہیں رہا ۔ ایک بار جب محمود ایاز نے شعر و حکمت کو ہدف تنقید بنایا تو میں نے کہا کہ میں شعر و حکمت بند کرتا ہوں اس شرط پر کہ آپ سوغات جاری کریں ۔ اس کے لیے میں آپ سے پورا تعاون کروں گا ۔

میرے اور بعض دوسرے احباب کے بے حد اصرار اور بار بار توجہ دلانے پر وہ راضی ہوئے۔ اس طرح سوغات کے تیسرے دور کا آغاز ہوا۔ ہم نے شعر و حکمت ۳ کے لیے کافی مواد فراہم کرلیا تھا۔ میں نے اور شہریار نے طے کیا تھا کہ اس بار اخترالایمان کا گوشہ شامل کریں گے۔ میں بمبئی جاکر اخترالایمان سے ملا۔ انھوں نے اپنی نظمیں، "اس آباد خرابے میں" (آپ بیتی) کا پہلا باب اور تصویریں اس شمارے کے لیے دیں۔ اور لوگوں سے اخترالایمان پر مضامین لکھوائے۔ میں نے شعر و حکمت ۳ کے سارے مضامین اور تخلیقات محمود ایاز کو بھیج دیں کہ جو بھی انھیں پسند آئیں سوغات میں شائع کریں۔ انھوں نے بعض چیزیں سوغات میں شامل کیں اور اخترالایمان کا گوشہ بھی مرتب کیا۔

سوغات کا اجرا ہوا تو یوں لگا جیسے اردو کے سارے ادیب اور قاری اس کے منتظر بیٹھے تھے۔ سوغات نیا پرچہ نہیں تھا۔ پہلے اور دوسرے دور میں اس نے شعر و ادب کا جو معیار قائم کیا تھا، تخلیقی فن کاروں، نقادوں اور قارئین کی جس طرح ذہنی تربیت کی تھی، اسے لوگ بھولے نہیں تھے۔ سوغات کے پہلے دور میں محمود ایاز نے جدید مغربی ادب اور تنقید سے اردو والوں کو روشناس کیا۔ میراجی نے یہی کام "ادبی دنیا" کے ذریعے انجام دیا تھا۔ میراجی کے بعد محمود ایاز نے منظم طریقے سے اسے آگے بڑھایا۔ تیسرے دور کے سوغات میں اداریوں اور بازگشت کے صفحات کا وہی انداز برقرار رہا۔ اس بار سوغات میں تھوڑی سے تبدیلی آئی یا اسے اضافہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ وہ اردو کے بعض سینیر یا مرحوم ادیبوں اور نئے فن کاروں کے گوشے تھے۔ پہلے اور دوسرے دور میں بھی ایسے چند گوشے انھوں نے سوغات میں رکھے تھے جیسے بیدی کا مطالعہ۔ لیکن اب انھوں نے ایک خاص مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے سینیر اور مرحوم ادیبوں اور شاعروں کے گوشوں کے لیے سوغات کا تقریباً ایک تہائی حصہ وقف کردیا۔ یہ وہ صاحب طرز ادیب اور شاعر تھے جن کی تحریروں سے نئی نسل کے بہت سے تخلیق کار اور قاری ناآشنا تھے۔ آشنا تھے بھی تو انھیں توجہ سے پڑھا نہیں گیا تھا۔ یہ ادیب اور شاعر منفرد اسلوب کے مالک تھے اور زبان پر خلاقانہ قدرت رکھتے تھے۔ محمود ایاز کو احساس تھا کہ نئی نسل کے بہت سے لکھنے والوں کو زبان اور فن پر قدرت حاصل نہیں ہے۔ یہ احساس انھیں پہلے بھی تھا اور پہلے دور کے سوغات کے اداریوں میں اس کا اظہار کرچکے تھے۔ لیکن اب یہ احساس زیادہ شدید ہوگیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ نئے لکھنے والوں کے سامنے اعلیٰ ادب کے نمونے پیش کریں تاکہ ان کی تربیت ہو.... وہ خود بھی اس معیار کو پانے کی کوشش کریں۔ ادھر گذشتہ برسوں میں ایسا ادب تخلیق پارہا تھا جو قارئین کے ذوق کی تسکین سے قاصر تھا۔ ادب اور قاری کے درمیان خلیج حائل ہوگئی تھی۔ باذوق قارئین ادب سے منحرف ہونے لگے تھے۔ ان گوشوں کی اشاعت کا مقصد اعلیٰ ادبی قدروں کی بازیافت کے ذریعے قارئین کا ادب سے دوبارہ رشتہ

جوڑنا بھی تھا۔

سوغات میں بازگشت کا سلسلہ شروع ہی سے رہا محمود ایاز چاہتے تھے کہ کوئی تخلیق شائع ہو تو اس پر قارئین اور ہم عصر ادیب اپنا ردِ عمل ظاہر کریں۔ بحث و تمحیص ہو۔ ورنہ تخلیق کے شائع ہونے کے بعد تخلیق کار کو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ پڑھنے والوں پر اس نے کیا اثر چھوڑا۔ بازگشت سے ہٹ کر بھی وہ ادبی مسائل کے بارے میں شائع ہونے والے مقالوں پر مختلف نقادوں سے فرمائش بلکہ اصرار کرتے کہ وہ ان پر رائے زنی کریں۔ کبھی یہ ہوتا کہ کوئی مقالہ وصول ہوتا۔ وہ اسے اشاعت سے قبل دوسرے نقاد یا ادیب کے پاس اظہار رائے کے لیے بھیج دیتے پھر اس مقالے کو اس پر کیے گئے تبصرے کے ساتھ سوغات میں شائع کرتے۔ چناں چہ انھوں نے شمس الرحمٰن فاروقی کا مقالہ "ابہام، رعایت اور مناسبت" تبصرے کے لیے مجھے بھیجا۔ میں گریز کرتا رہا۔ ان کا اصرار بڑھا تو میں نے تبصرہ لکھا جو سوغات ۱۱ میں مقالے کے ساتھ شائع ہوا۔ بعض اصحاب نے اس کا برا بھی مانا لیکن محمود ایاز اس معاملے میں پر خلوص تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مختلف نقاطِ نظر پڑھنے والوں کے سامنے آئیں۔ اداریوں میں بھی وہ سوغات کی مشمولات پر اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کرتے اس امید کے ساتھ کہ اگر لکھنے والے ان کی رائے سے متفق نہ ہوں تو کھل کر اظہار خیال کریں۔

محمود ایاز ادب کی تخلیق کی طرح ادبی جریدے کی ادارت کو بھی کل وقتی کام سمجھتے تھے انھوں نے جب بھی سوغات جاری کیا اپنا سارا وقت اور ساری توجہ اس پر صرف کر دی۔ جب انھوں نے محسوس کیا کہ وہ سوغات کے لیے زیادہ وقت نہیں دے سکتے تو انھوں نے اس کی اشاعت مسدود کر دی۔ وہ ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کو بڑی مستعدی کے ساتھ خطوط لکھتے پرانے اور نئے لکھنے والوں کو جن کی تحریروں سے وہ متاثر ہوتے اور جن میں انھیں صلاحیت نظر آتی انھیں خطوط لکھ کر فرمائش کرتے کہ وہ سوغات میں اشاعت کے لیے اپنی تخلیقات بھیجیں۔ وہ صرف اپنے مطالعے پر بھروسا نہیں کرتے بلکہ بعض احباب سے جن کے ذوق پر اعتماد ہوتا، مشورہ طلب کرتے کہ کونسے نئے ادیب شاعر ہیں جن کو سوغات میں لکھنے کی دعوت دی جا سکتی ہے۔ جو بھی تحریریں اشاعت کے لیے وصول ہوتیں وہ ان کا غائر نظر سے مطالعہ کرتے۔ اگر کوئی تحریر سرے سے ناقابل اشاعت ہوتی اپنے اعتراض کے ساتھ لوٹا دیتے۔ اس میں مشہور یا غیر معروف، بڑے یا چھوٹے ادیب کی قید نہیں تھی۔ اگر وہ یہ محسوس کرتے کہ کسی تخلیق میں جان ہے لیکن کچھ خامیاں بھی ہیں تو وہ اپنی رائے سے لکھنے والے کو مطلع کرتے اور خواہش کرتے کہ وہ نظرِ ثانی کرے۔ اکثر یہ ہوتا کہ لکھنے والے ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنی تخلیقات میں مناسب رد و بدل کر دیتے۔ بعض کو ان کی رائے سے اختلاف ہوتا۔ وہ ان کے اعتراض کا جواب دیتے۔ کبھی کسی تخلیق کے بارے میں خط و کتابت کا سلسلہ دراز ہو جاتا۔

غرض کے محمود ایاز ادیبوں، شاعروں سے مراسلت میں کافی وقت صرف کرتے۔ اس کام کو وہ مدیر کے فرائض کا لازمی حصہ سمجھتے تھے اور نہایت سنجیدگی اور مستعدی کے ساتھ اس فریضے کو انجام دیتے تھے۔

محمود ایاز نے ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کی۔ لیکن جب وہ کسی لکھنے والے کے بارے میں یہ محسوس کرتے کہ برسوں گزر جانے کے بعد بھی اس نے کوئی ترقی نہیں کی، اس کا تخلیقی سفر ایک منزل پر پہنچ کر رک گیا ہے تو وہ اس کی تخلیقات کو سوغات میں جگہ دینے سے کتراتے تھے۔

سوغات محمود ایاز کا تفریحی، کاروباری یا محض ادبی مشغلہ نہیں تھا۔ وہ ان کی زندگی تھی۔ سوغات کے ذریعے انھوں نے اپنی ایک دنیا پیدا کر لی تھی اور اسی دنیا میں وہ سانس لیتے تھے۔ لیکن سوغات ہی کی وجہ سے انھوں نے بڑے دکھ جھیلے جس سے ان کی صحت بھی متاثر ہوئی۔ یوں تو وہ بچپن ہی سے مختلف امراض کا شکار رہے۔ بچپن میں وہ دق کے مرض میں مبتلا تھے جس کا معقول علاج ہوا اور وہ شفایاب ہوئے۔ اس کے بعد بھی وہ زندگی بھر کسی نہ کسی عارضے میں مبتلا رہے۔ چھوٹے بھائی کی طویل علالت اور وفات اور بعض عزیز دوستوں کی جدائی کا بھی ان کی صحت پر برا اثر پڑا۔ ایک بار ان کے قلب پر بھی حملہ ہوا۔ دردِ شکم اور دانتوں کا درد آخر تک ان کے ساتھ رہا۔ ایلوپیتھک علاج کے ذیلی مضر اثرات کا بھی ان کی صحت کو بگاڑنے میں حصہ رہا ہوگا۔ ان سب کے باوجود بہ ظاہر وہ بڑے چاق و چوبند نظر آتے تھے۔ صحت کی خاطر انھوں نے اپنی زندگی کے معمولات کو ایک نظام الاوقات کے تابع کر دیا تھا۔ صبح سویرے گالف کھیلتے، وقت پر کھاتے، وقت پر سوتے۔ کبھی رمی سے جی بہلا لیتے۔ باقی وقت مطالعے میں صرف کرتے۔ گھر کا ماحول پر سکون تھا۔ اولاد کی کوئی ذمہ داریاں نہیں رہی تھیں۔ جب وہ اردو اکیڈمی کے چیرمین بنے انھیں مختلف الجھنوں کا سامنا کرنا پڑا جن پر انھوں نے آسانی سے قابو پالیا، چیرمن شپ انھوں نے اس شرط پر قبول کی تھی کے گورننگ باڈی کو وہ نامزد کریں گے۔ اس کی وجہ سے گورننگ باڈی کا انھیں بڑی حد تک تعاون حاصل رہا۔ انھوں نے نجم الثاقب شحنہ کی سرکردگی میں کنزا اردو، اردو کنزڈ کشنری مرتب کروا کے شائع کی، سمینار منعقد کیے۔ ان تمام کاموں میں انھیں کی مرضی کا دخل رہا۔ سوغات کی اشاعت سے ان پر کام کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ چوں کہ کام ان کی اپنی دل چسپی کا تھا اس لیے وہ اس بوجھ کو بہ خوشی برداشت کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے سوغات میں ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کے اظہار رائے کے لیے جو فورم کھول دیا تھا اس سے بعض اصحاب کی انا مجروح ہوئی۔ وہ کسی قسم کے اختلاف رائے کو برداشت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ بات سوغات کے صفحات تک محدود رہتی تو غنیمت تھا لیکن ان اصحاب کے ذاتی جھگڑوں اور رقابتوں سے بعض وقت

محمود ایاز کو سخت ذہنی کوفت ہوتی ۔ محمود ایاز ایک عزلت پسند انسان تھے ۔ جلسوں جلوسوں سے دور بھاگتے تھے ۔ ایک بار میں نے انھیں حیدرآباد آنے کی دعوت دی تو پہلے وہ ٹالتے رہے ، میں بہ ضد ہوا تو اس شرط پر راضی ہوئے کہ انھیں کسی جلسے میں نہ بلایا جائے اور نہ ان کے اعزاز میں کوئی جلسہ ہو ۔ ان کا حلقہ، احباب محدود تھا ۔ وہ کسی ایسے شخص سے ملنا گوارا نہیں کرتے تھے جس سے ان کا مزاج نہ ملتا ہو ۔ کسی سے ایک بار ملاقات کرنے کے بعد اگر وہ محسوس کرتے کہ یہ شخص ان کی ہم نشینی کا اہل نہیں ہے تو اس سے دوبارہ نہیں ملتے ۔ اگر وہ ملنا بھی چاہتا تو کوئی بہانہ بناکر اسے ٹال دیتے ۔ اس کے باوجود بعض اصحاب خود کو ان پر مسلط کردیتے تو انھیں بڑی تکلیف پہنچتی ۔ وہ مجبوراً انگیز کرلیتے اور مروتاً مہمان داری بھی کرتے لیکن کبھی یہ ہوتا کہ کوئی اذاگزیدہ شخص پہنچ جاتا اور اپنے سوا ساری دنیا کی برائی کرنے لگتا تو ایک حد تک وہ اسے برداشت کرلیتے لیکن جب پانی سر سے اونچا ہوجاتا تو برس پڑتے ۔ اس کے بعد کئی راتیں بے خوابی کی نذر ہوجاتیں ۔ ان کے مرض الموت کے آغاز میں بھی ایسے واقعات پیش آئے ۔

محمود ایاز کو اپنے مرض کی نوعیت اور شدت کا علم تھا ۔ انھوں نے بڑی پامردی کے ساتھ موت کا استقبال کیا ۔ وفات سے قبل علاج کے لیے ایک ماہ کے وقفے سے دوبار حیدرآباد آئے ۔ اس طرح انھوں نے حیدرآباد آنے کا وعدہ تو پورا کیا لیکن ایسے کہ بنگلور سے سیدھے ہاسپٹل پہنچے ، ٹریٹمنٹ لیا، ہوٹل میں ایک آدھ دن قیام کرکے بنگلور واپس ہوگئے ۔ پھر میں ان کی عیادت کے لیے بنگلور گیا ۔ حیدرآباد کے علاج سے کچھ فائدہ ہوا تھا لیکن حالت بہت رہ گئی تھی ۔ اس وقت سوغات کی اشاعت کا سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا لیکن وہ سوغات ۱۲ کی ترتیب اور اس کے مشمولات کے بارے میں گفتگو کرتے رہے ۔ حیدرآباد لوٹنے کے بعد ایک دن ڈاک سے مضامین کا پارسل وصول ہوا ۔ انھوں نے لکھا تھا " ازراہ کرم میری طرف سے جو تاخیر ہو رہی ہے اس کی تلافی کردیجیے ۔ میں آدھ پون گھنٹہ کام کرنے بیٹھوں تو آنکھوں کے آگے اندھیرا آجاتا ہے ۔ شاید یہ آخری شمارہ ہو.... " (مکتوب مورخہ ۲۶ / فروری ۱۹۹۷ء)

۲۹ مارچ ۹۷ء کو میں ایک اوارڈ کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کے لیے دہلی گیا ہوا تھا ۔ لوٹنے پر مجھے یہ اندوہناک خبر ملی کہ محمود ایاز اب اس دنیا میں نہیں رہے ۔ محمود ایاز اب اس دنیا میں نہیں رہے لیکن زندگی اور ادب کی شاہ راہ پر ان کے گہرے نقوشِ قدم ہمیشہ ثبت رہیں گے ۔

محمود ایاز ایک حق شناس ، حق پرست حقیقت آگاہ اور انسان دوست آدمی تھے ۔ وہ اخلاقی قدروں میں یقین رکھتے تھے اور اپنی عملی زندگی میں بڑی حد تک ان پر کاربند تھے ۔ وہ گہری مذہبی حسیت اور روحانیت کے حامل صوفی منش اور صاحب کردار انسان تھے ۔ انھوں نے

زندگی میں بہت سے نشیب و فراز دیکھے ۔ انھوں نے ایک خوش حال گھرانے میں آنکھ کھولی تھی بچپن اور جوانی کا کچھ حصہ نازو نعم میں بسر ہوا ۔ پھر ایک زمانہ آیا جب نوبت فاقہ کشی تک پہنچ گئی ۔ یہ دور بھی گزر گیا ۔ دولت کی فراوانی میں ۔ لیکن ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ۔ ان کی کج کلاہی ہر دور میں ویسی ہی رہی ۔ ان کا معاملہ ہمیشہ اپنے خدا کے ساتھ رہا:

اسی سے رشتۂ دل اور اسی سے روگرداں
اسی کو ڈھونڈ رہا ہوں اسی سے جھگڑا ہے

محمود ایاز نے عرصہ پہلے اپنی موت کی یوں پیش گوئی کی تھی:

تمام مرحلے صوت و بیاں کے ختم ہوئے
اب اس کے بعد ہماری نوا ہے خاموشی

اور یہ بھی کہا تھا:

اس خامشی پہ ختم سفر کا گماں نہ کر
آسودگان خاک نئی منزلوں میں ہیں

ان کا سفر، حیات بعد الموت کی ان جانی منزلوں اور ہماری یادوں میں ہمیشہ جاری رہے گا ۔

خلیل مامون

محمود ایاز ۔۔۔ چند یادیں

۱۹۷۲ء میں میں نے اپنی ایک نظم "جلا وطن شہزادگان کا رقص" "شعروحکمت" میں بہ غرضِ اشاعت مغنی تبسم کو روانہ کی تھی۔ کچھ دنوں بعد مغنی تبسم نے یہ کہتے ہوئے یہ نظم لوٹا دی کہ یہ ان کی معیار پر پوری نہیں اترتی۔ اس کے بعد میں نے یہ نظم "سوغات" میں اشاعت کے لیے محمود ایاز کے نام روانہ کی۔ ہفتہ بھر نظم کی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے محمود ایاز کا خط آیا انھوں نے یہ بھی لکھا کہ نظم سوغات کے اگلے شمارہ میں شائع ہو رہی ہے۔ کسی بھی نئے لکھنے والے کو فوری طور پر جواب لکھنے اور اپنی پسند یا ناپسند کا اظہار کرنے میں غالباً محمود ایاز اول و آخر ہیں۔ اس عمل میں وہ کسی نائب یا دوست کا سہارا بھی نہیں لیتے تھے۔ ہر کسی کو خود ہی خط لکھتے۔ یہ سلسلہ آخری دم تک باقی رہا۔

کوئی کتاب ان کے ذریعے سے مجھے بھجوائی جاتی اور میں رسید نہ بھیجتا تو مجھے یاد دلاتے اور ٹوکتے کہ کم از کم رسید تو روانہ کرنا چاہیے۔ میری مذکورہ بالا نظم کی اشاعت کے بعد میں نے دو اور نظمیں اور ہربرٹ ریڈ کا ترجمہ "چاند کی کھیتی" سوغات میں اشاعت کے لیے محمود ایاز کو روانہ کیں۔ یہ تینوں چیزیں بھی انھوں نے پسند کیں اور انھیں سوغات میں شائع کیا۔ اس دوران محمود ہاشمی نے مجھے وحید اختر پر لکھا گیا مضمون "گداگری کا میگنا کاٹا" سوغات میں اشاعت کے لیے دیا تھا۔ میں نے مضمون محمود ایاز کو روانہ کیا لیکن کچھ ہی دنوں میں محمود ایاز نے یہ مضمون لوٹا دیا کہ گو محمود ہاشمی کے نقطہ نظر سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا لیکن اندازِ بیان صحیح نہیں؟ اور یہ کہ وہ "سوغات" کو ادبی تمسخر اور ٹھٹھے بازی کا پلیٹ فارم نہیں بنانا چاہتے۔

اسی دوران میری ملاقات حسن عسکری (اس وقت علی گڑھ میں عمرانیات کے پروفیسر) سے ہوئی انھوں نے مجھے اپنی کچھ نثری نظمیں سنائیں مجھے اچھی لگیں تو میں نے ان سے کچھ نظمیں لے کر "سوغات" کے لیے محمود ایاز کے نام روانہ کیں۔ کچھ دنوں بعد محمود ایاز نے نظمیں لوٹاتے ہوئے یہ لکھا کہ حسن عسکری بہت قابل اور دانش ور آدمی ہیں لیکن جو چیزیں انھوں نے لکھی ہیں انھیں نظمیں نہیں کہا جاسکتا۔

محمود ایاز کے معیار کی یہ کسوٹی کسی ذاتی تعصب اور پسند کا نتیجہ نہیں ہوا کرتی تھی ۔ اردو کا ہر وہ لکھنے والا جس کا محمود ایاز سے سابقہ رہا وہ اسے بہ خوبی جانتا ہے ۔ سوغات میں شائع ہونے والا شاید ہی کوئی ایسا ادیب ہوگا کہ جس کی تخلیقات انھوں نے کہیں نہ کہیں رد نہ کی ہوں یا ان تخلیقات میں ترمیم و تصحیح یا اختصار کرنے کے بعد انھیں شائع نہ کیا ہو ۔ اردو نے شاید ہی محمود ایاز جیسا کوئی مدیر دیکھا ہو ۔

۱۹۷۵ء میں ۰ میں ریڈیو کی ملازمت سے مستعفی ہوکر دہلی سے بنگلور لوٹ آیا ۔ بنگلور واپسی کے کچھ دنوں بعد اپنی بیوی کے مسلسل اصرار پر راشن کارڈ بنانے کے لیے " سالار " کے دفتر کے قریب واقع فوڈ اینڈ سیول سپلائیز کے دفتر جا رہا تھا ۔ راستے میں جب سالار کا دفتر نظر آیا تو سوچا کہ اگر محمود ایاز ہوں تو ان سے مل لیا جائے ۔ دفتر گیا تو اتفاقاً محمودِ ایاز موجود تھے ۔ انھوں نے پوچھا کہ میں بنگلور کب آیا ۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں مستقل طور پر بنگلور آگیا ہوں اور یہ کہ نوکری کی تلاش میں ہوں ۔ میں نے ان سے درخواست بھی کی کہ ہوسکے تو وہ میرے لیے لکچرر شپ کے لیے کوشش کریں ۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ سیاسی صورت حال میں یہ قدرے مشکل ہے البتہ انھوں نے مجھے اپنے طور پر کوشش کیے جانے کی صلاح دی ۔ جب میں چلنے لگا تو انھوں نے کہا کہ وہ عارضی طور پر " سالار " میں مجھے کام دے سکتے ہیں اور کہا کہ دوچار گھنٹے کا کام ہوگا بہ حیثیت " نایب مدیر " کے اور خود انھوں نے تین سو روپے ماہانہ تنخواہ کی پیش کش کی ۔ میں نے دوسرے ہی دن " سالار " میں ملازمت شروع کر دی ۔ بلا ضرورت کسی ضرورت مند کی مدد کرنے کا یہ وصف بغیر کسی اشتہار بازی کے محمود ایاز میں بہ درجۂ اتم موجود تھا ۔ اس سے اردو کے بہت کم لوگ واقف ہیں ۔

" سالار " میں ملازمت کے دوران میری محمود ایاز سے صرف دو ملاقاتیں ہوئیں ۔ ایک نیم ادبی اور ایک دفتر میں ۔ نیم ادبی ملاقات تو یہ تھی جب انھوں نے مجھے زبیر رضوی کی بنگلور آمد پر لنچ پر مدعو کیا ۔ یہ ملاقات شراب و کباب کے باوجود کافی پھس پھسی رہی ۔ یہاں کیا باتیں ہوئیں ۔ مجھے آج یاد نہیں ۔ دوسری ملاقات " سالار " کے دفتر میں تادیبی ملاقات تھی جب انھوں نے مجھے صبح دفتر طلب کرکے یہ کہا تھا کہ میں کافی " جناتی " اردو لکھتا ہوں ۔

" سالار " میں ملازمت کے دوران ہی میں نے کرناٹک پبلک سروس کمیشن کا امتحان دیا تھا ۔ اس زمانے میں عزیز اللہ بیگ بھی الامین کالج کی لکچرر شپ سے دست برداری کے بعد " سالار " میں عارضی طور پر کام کر رہے تھے ۔ محمود ایاز اور پبلک سروس کمیشن کے ممبر حبیب احمد کافی قریبی دوست تھے ۔ عزیز اللہ بیگ نے پبلک سروس کمیشن کے امتحان کے تعلق سے غالباً محمود ایاز سے

کوئی بات چیت کی تھی ۔ میرے انٹرویو کے بعد کسی دن محمود ایاز نے عزیز اللہ بیگ کو بلاکر جب یہ کہا کہ حبیب نے بتایا ہے کہ تمھارا انٹرویو بہت اچھا ہوا ہے اور یہ کہ تم منتخب ہوگئے تو عزیز اللہ بیگ الجھن میں پڑ گئے کیوں کہ ابھی ان کا انٹر ویو بھی نہیں ہوا تھا ۔ پھر جب انھوں نے پوچھا کہ "سالار" سے اور کون انٹر ویو کے لیے گیا تھا تو عزیز اللہ بیگ نے انھیں میرے انٹر ویو کے بارے میں بتایا ۔ اگلے دن محمود ایاز نے مجھ سے پوچھا کہ انٹر ویو کے تعلق سے میں نے انھیں کیوں نہیں بتایا ؟ میں نے جواب دیا کہ مجھے اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی یہ سن کر وہ خاموش ہوگئے ۔ یہاں میں یہ بات اپنی "خود داری" جتانے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں اس تعلق سے محمود ایاز کی ذات سے وابستہ اس کشف کے تعلق سے یہ بات کر رہا ہوں جس سے بہت کم لوگ واقف ہیں ۔ میں نے محمود ایاز کو ایسا اس لیے کہا تھا کیوں کہ پہلی ملاقات میں "سرکاری" ملازمت کے تعلق سے ان کا رویہ حوصلہ افزا نہیں تھا ۔ مذکورہ بالا واقعے کے بہت دنوں بعد جب میں اپنے نسبتی برادر کی شادی میں شمولیت کے بعد دیر گئے گھر لوٹا تو رات کے پچھلے پہر میں نے یہ خواب دیکھا کہ محمود ایاز میرے ہاتھ میں ایک لفافہ تھماتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ میرا نامۂ تقرری ہے ۔ اس کے فوراً بعد کسی نے بڑے زور سے میرے گھر کے دروازے پر دستک دی اور میری آنکھ کھل گئی ۔ جب میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ عزیز اللہ بیگ اور ن ۔ م ۔ سعید دروازے پر کھڑے مجھے مبارک باد دے رہے ہیں ۔ ان کے ہاتھوں میں لڈوؤں کا ایک ڈبہ ہے جس میں سے ایک لڈو انھوں نے میرے منھ میں ٹھوس دیا ہے ۔ ابھی میں نیند سے بوجھل ہوں اور میرے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں ۔ انھیں میں نے برآمدے میں بٹھا کر احوال پوچھا کہ بھئی یہ مبارک باد کیسی ہے تو انھوں نے کہاکہ مبارک باد میری تقرر پر ہے ۔ اور یہ کہ یہ خبر انھوں نے "سالار" میں پی ۔ ٹی ۔ آئی کے خبرنامے میں پڑھی ۔ مجھے فوراً رات کا خواب یاد آیا ۔ پولس کی نوکری میں جانے کے بعد کئی سال بنگلور سے باہر رہا ۔ اس دوران محمود ایاز سے رابطہ نہ ہونے کے برابر تھا ۔ . . . . . تین چار سال بعد جب میری ایک نظم سالار میں چھپی تو کسی واقف کار کے ذریعے انھوں نے یہ کہلا بھیجا کہ مجھے شاعری چھوڑنا نہیں چاہیے ۔

۱۹۸۸ء میں جب بنگلور میں میرا تقرر ہوا تو اس کے بعد محمود ایاز سے زیادہ ملاقاتیں ہونے لگیں ۔ ۱۹۸۹ء میں جب میں اور عزیز اللہ بیگ نے بنگلور میں ایک کل ہند اردو ورکشاپ کا اہتمام کیا تو محمود ایاز کی صلاح پر اس میں اخترالایمان کو بہ طور مہمان خصوصی مدعو کیا گیا ۔ بعد ازاں محمود ایاز کو بھی ورک شاپ کی سرپرستی کے لیے آمادہ کیا ۔ پھراس کے بعد وہ کرناٹک اردو اکادمی کے صدر اور ہم دونوں ممبر بنے اسی دوران ہمارے بارہا اصرار پر وہ "سوغات" کے سہ بارہ

اجرا پر رضامند ہوئے ۔ اس کے لیے ہمیں بڑے پاپڑ بیلنے پڑے ۔ ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے ۔ میں آرام سے ہوں ۔ صبح گالف کھیلنے جاتا ہوں ۔ اس کے بعد تھوڑا بہت مطالعہ کرکے سو رہتا ہوں، پھر شام ڈھلے چراغ جلاتا ہوں ۔ اس جھنجھٹ میں کیوں پھنساتے ہو ۔ بہ ہر حال جب وہ "سوغات" کے اجرا کے لیے رضا مند ہوگئے تو مجھ سے میری نظمیں طلب کیں ان نظموں میں سے انھوں نے "مہاتما گاندھی روڈ پر" "شاعری مت کرو" اور "غزالِ شب کے ساتھ" کا انتخاب کیا ۔ ان نظموں میں انھوں نے دو ایک تبدیلیاں بھی کرائیں ۔ یہ نظمیں میرے ایک نوٹ اور مغنی تبسم کے تجزیے کے ساتھ "سوغات" کے تیسرے دور کے پہلے شمارے میں شامل ہیں ۔

میں ۱۹۶۶ء سے شاعری میں طبع آزمائی کر رہا ہوں ۔ ۱۹۶۶ء سے لے کر اب تک میں نے کئی شاعروں اور ادیبوں سے بے قاعدہ اور باقاعدہ اصلاح لی ہے اور ہدایت پائی ہے ۔ ۱۹۶۵ء میں جب میں نے ریڈیو کی ملازمت اختیار کی تو سلام مچھلی شہری اور رفعت سروش بھی ریڈیو پر تھے ۔ رفعت سروش کو جب کوئی چیز دکھائی تو زبانی صلاح دی اور چپ ہوگئے ۔

جب سلام مچھلی شہری کو دو غزلیں دکھائیں تو انھوں نے وہ دونوں غزلیں کاٹ پھینکیں اور اسی زمین میں دو غزلیں کہہ کے دے دیں اور کہا جاؤ رکھ لو ۔ اسی دوران کسی نے مجھے شمیم کربانی تک پہنچا دیا اور میں ان کا باقاعدہ شاگرد بن گیا ۔ ان دنوں میں اعزاز تبسم کے نام سے لکھا کرتا تھا ۔ یہ نام بسمل سعیدی ٹونکی کا دیا ہوا تھا ۔ شمیم کربانی کی اصلاح کا طریقہ یہ تھا کہ مصرعِ طرح پر غزل کہلوانے اور غزل لکھ کر لے جانے کے بعد ایک آدھ لفظ یہاں وہاں بدل دیتے اور زبان درست کردیتے ۔ ۱۹۶۲ء سے غالباً ۱۹۶۹ء تک میں ان سے اصلاح لیتا رہا ۔ ان کے شاگردوں میں جاوید وششٹ، درشن سنگھ دگل وغیرہ شامل تھے ۔ شمیم کرہانی مجھے دلی کے کئی ایک مقامی مشاعروں میں بھی لے گئے ۔ ان کی اصلاح میں یہ تھا کہ زبان درست کردینے یا اساتذہ کے کلام بہ شمول غالب میں زبان کی غلطیاں نکالنے کے انھوں نے کوئی اور بات نہیں بتائی نہ ہی کبھی کچھ پڑھنے کو کہا ۔ ۱۹۶۹ء میں دہرہ دون جاتے ہوئے نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر میں نے "شب خون" خریدا اور ورق گردانی کی تو پہلی مرتبہ "جدید شاعری" سے آگہی حاصل ہوئی ۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر یہ جدید شاعری ہے تو میں بھی ایسی شاعری کرسکتا ہوں ۔ چند نظریاتی اختلافات کی بنا پر اس کے بعد میں نے شمیم کربانی کے ہاں آنا جانا بند کردیا ۔

۱۹۷۱ء میں جب اپنی دادی کی موت پر لکھی گئی ایک نظم "سانحہ" تحریک میں شائع ہوئی تو محمود ہاشمی جنھوں نے تبھی ریڈیو میں ملازمت اختیار کی تھی مجھے ایک قریبی رستوراں میں لے گئے اور مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ نظم میری ہے ۔ میری یہ نظم خلیل الرحمٰن کے نام سے

شائع ہوئی تھی۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو پھر انھوں نے پوچھا کہ میں اپنی شاعری کو چھپاتا کیوں ہوں۔ تو میں نے اسلوب وغیرہ کی نہ جانے کیا کیا باتیں کیں تو محمود ہاشمی نے کہا کہ اسلوب تو فراق کا بھی نہیں۔ اس کے بعد میں نے باقاعدہ طور پر جدید نظمیں لکھنا شروع کیں جن کی نوک پلک درست کرنے کے بعد محمود ہاشمی نے انھیں "شب خون"۔ "آہنگ" ایسے رسائل میں اشاعت کے لیے روانہ کیا۔ محمود ہاشمی نے اس دوران مجھے اردو اور انگریزی کے کئی شہرہ آفاق ادیبوں اور شاعروں کی کتابیں دیں اور جدید لکھنے والوں سے متعارف بھی کرایا۔

سوغات کے پہلے شمارے کی اشاعت کے بعد محمود ایاز نے میری نظموں کے نجی اسلوب، گنجلک خیالات اور اظہار و بیان کی خامیوں کے تعلق سے کئی نشستوں میں بات چیت کی۔ انھوں نے تمام اساتذہ کے کلام کو دوبارہ پڑھنے کا مشورہ دیا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ جب تک کسی لکھنے والے کے پاس الفاظ کا اچھا خاصا ذخیرہ نہ ہو وہ کامیاب شاعر نہیں بن سکتا۔ وہ شاعری میں ابہام اور ایہام کے قائل نہیں تھے۔ وہ شعری زبان کو خیالات کے اظہار کا وسیلہ ہی سمجھتے تھے۔ اس اعتبار سے اور کئی دیگر وجوہات کی بنا پر میں انھیں عقلیت پسند اور کلاسیک نواز کہنا پسند کروں گا۔

میری نظمیں "نیا جنم"۔ "راستہ کوئی نہیں" اور "آثار" محمود ایاز نے تقریباً دس بارہ مرتبہ دیکھی ہوں گی۔ میں نے نظموں کو ان کے کہنے پر دس بارہ بار دوبارہ لکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ "آخری راستہ" سے پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔ "آثار" کے تعلق سے انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ میں اسے پال میں لگادوں۔ میری نظموں کے ساتھ وہ خاصی سختی برتتے اور جب احباب میری شاعری کی تعریف کرتے تو کہتے تم ان لوگوں کے بہکاوے میں مت آنا۔ اور مجھ سے یہ کہتے کہ میں تمھاری نظموں کے ساتھ سختی اس لیے برتتا ہوں کہ تم اس سے بہتر لکھ سکتے ہو۔ کبھی کبھی تو وہ یہاں تک کہتے کہ مجھے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف شاعری ہی کرنا چاہیے۔ ادب و شعر کے مطالعے، اس کی تفہیم اور اس کی تشریح کے معاملے میں میں نے محمود ایاز جیسا کوئی گہری نظر رکھنے والا دانش ور نہیں دیکھا۔ ان کے ہر کام میں ایک ضابطہ تھا۔ اور یہ ضابطہ ان کی شخصیت کا حصہ تھا۔ لیکن ان کا رویہ اتنا تیکھا اور سیدھا سادہ تھا کہ اکثر اوقات لوگوں کو اس رویے کے زخم کھانے پڑتے تھے اور جس کی وجہ سے ان سے فیض یاب ہونے کے متمنی کئی نئے لکھنے والے ان سے کچھ حاصل نہ کرسکے۔ اس رویے کے تعلق سے استفسار پر محمود ایاز ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ اکثر لوگ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے فروغ اور اصلاح کے خواہاں نہیں ہوتے۔ اکثر لکھنے والے اپنی تصنیفات پر تقاریظ اور پیش لفظ لکھوانے کے چکر میں ان کے پاس آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ محمود ایاز نے ہمارے ایما پر اس

بات پر رضا مند ہوئے کہ ان کے گھر دس پندرہ ایسے لوگ مل بیٹھ سکتے ہیں جو ادب و فن پر تبادلہ ، خیال کر سکیں ۔ لیکن جب ہم ادیبوں کی فہرست بنانے بیٹھے تو ایسے لوگوں کے نام نہ ہونے کے برابر تھے جو اس میں تن دہی سے حصہ لے سکیں ۔ اور تو اور برِ صغیر کے اکثر اہم ادیب و شاعر بھی محمود ایاز کے یہاں محض وقت گزاری یا پھر شکوہ شکایت کے لیے آتے تھے ان میں اختر الایمان ، مغنی تبسم ، فضیل جعفری اور نیر مسعود شامل نہیں ہیں ۔ محمود ایاز ہندستان میں آلِ احمد سرور اور نیر مسعود تو پاکستان میں آفتاب احمد خاں اور مشفق خواجہ کے بہت قائل تھے ۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ محمود ایاز اکثر ادیبوں اور شاعروں سے مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر کتراتے رہتے تھے ۔ جس کسی سے وہ ملنا پسند نہیں کرتے اور انھیں یہ معلوم ہوتا کہ وہ ادیب بنگلور ۔ ۔ ۔ آیا ہوا ہے تو خادموں سے یہ کہہ دیتے کہ اگر مذکورہ ادیب یا شاعر فون کرے تو یہ کہہ دیا جائے کہ وہ گھر پر نہیں ہیں ۔ کبھی کبھی میں جب گھر جاتا تو ہنس کر کہتے " میں آج گھر پر نہیں ہوں " کیوں کہ فلاں صاحب بنگلور آئے ہوئے ہیں ۔ شروع شروع میں ان کی یہ باتیں مجھے ناگوار گزریں لیکن بعد میں لوگوں کے رویے کو دیکھنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ اس تعلق سے محمود ایاز ہی کا رویہ صحیح ہے ۔ محمود ایاز وقت کے بڑے پابند تھے ۔ جب کسی کو مدعو کرتے تو آدھ پون گھنٹہ پہلے ہی تیار ہوکر ان کے انتظار میں بیٹھ جاتے ۔ ۔ ۔ اگر کوئی وقت پر نہ آتا تو چراغ پا ہوجاتے ۔ یہ بات صرف مخصوص مہمانوں تک محدود نہیں تھی ۔ میں اور عزیز اللہ بیگ ہفتے میں ایک دن ضرور ان کے ہاں مدعو ہوتے ۔ اور ہمیں ان کے ہاں شام ساڑھے چھ بجے یا سات بجے پہنچنا ہوتا ۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا کہ میں کسی نہ کسی وجہ سے ایک یا ڈیڑھ گھنٹہ دیر سے پہنچتا ۔ دیکھتے ہی چراغ پا ہوجاتے ۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ میری دیر حاضری کے عادی ہوگئے ۔ میرے عارضہ ، قلب کے بعد وہ میرے لیے خاص طور پر مچھلی وغیرہ کا اہتمام کرتے ۔ ان کے ہاں ہماری دعوت اکثر منگل کو ہوتی کیوں کہ منگل کے ہی دن تازہ مچھلی ملتی ہے ۔ ہمیشہ خریداری خود ہی کیا کرتے تھے ۔

" سوغات " کے تیسرے دور کے پہلے شمارے میں محمد حسن عسکری کے " ہمارا ادبی شعور اور رجحان " سے اخذ جو اقتباسات " پیوستہ رہ شجر سے " اور " فکر کے شہید " کے عنوان کے تحت دیے گئے ہیں وہ محض خالی جگہیں پر کرنے کے لیے نہیں ہیں ۔ لیکن افسوس کہ برِ صغیر کے کسی دانش ور نے اس تعلق سے دبے لفظوں ہی میں سہی کسی مکالمے کی ابتدا نہیں کی ۔ محمود ایاز کو ہمیشہ اس کا قلق رہا ۔ یہی حال دیگر امور کا ہے ۔ محمود ایاز ہمیشہ کہا کرتے تھے ۔ کسی مسئلے پر کوئی نہیں لکھتا ۔ اردو والوں سے بار بار کہ لکھوانا پڑتا ہے ۔ ادب

کے تین شمارے نکلنے کے بعد میرا بھی یہی تجربہ ہے ۔ خیر محمد حسن عسکری کے اقتباسات کا ذکر میں نے محمود ایاز کے روحانی اور مذہبی پس منظر کو ظاہر کرنے کے لیے کیا ہے ۔

محمود ایاز کی ذات اور محمود ایاز کا مذہبی پس منظر ان ڈھکوسلا باز لچر شاعروں سے انقلاب انگیز طور پر مختلف تھا جو چوری چھپے "سوروں" کی طرح شراب پی کر ، محمدؐ کے نام مخطوط اور مدینے کی کالی لڑکیوں کے نام نظمیں لکھتے ہیں اور کہ جنھوں نے محمود ایاز کو فرعون کا خطاب دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ وہ رمضان شریف میں فرعون کی طرح شراب پیتے ہیں ۔ (گویا کہ فرعون کے زمانے میں رمضان شریف کا وجود تھا اور گویا کہ رمضان شریف کے علاوہ دنوں میں شراب جائز ہے) جب میں نے یہ بات محمود ایاز سے کہی تو انھوں نے فوراً کہا "یار یہ بات تو اس نے ٹھیک ہی کہی ۔ میں واقعی بڑا فرعون آدمی ہوں" ۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ دیکھنے والی ریا کار آنکھوں نے تو صرف فرعون کو دو پیگ وھسکی پیتے ہوئے دیکھا ہے ۔ لیکن سیاہ چشمے کے پیچھے ان نم آنکھوں کو نہیں دیکھا کہ جو اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ کی بوالعجبیوں کے ساتھ ساتھ رسول اور آلِ رسول کی تقدیس کی اس قدر قائل تھیں کہ اس کے مالک نے عید میلاد کے جلسے میں اس وجہ سے شرکت نہیں کی کہ وہ شراب کا عادی ہے ۔ دیکھنے والے نے محمود ایاز کی خواب گاہ کی الماری کے اندر چھپی ہوئی جانماز اور بیان القرآن کی جلدیں بھی نہیں دیکھیں کہ جن کا استعمال محمود ایاز کا روز کا مخفی معمول تھا ۔ اور دیکھنے والے نے ان ہاتھوں کو بھی نہیں دیکھا جو چوری چھپے بلا امتیاز مذہب و ملت ہر کس و ناکس کی مدد کرتے تھے ۔

شراب کے تعلق سے بات چل رہی ہے تو ایک دفعہ کسی نے یہ ذکر کیا کہ تاریخ اسلام کی ایک اہم شخصیت شراب کی عادی تھی ۔ میں نے جب یہ بات محمود ایاز سے کہی تھی انھوں نے چپکے سے کہا "اس زمانے میں تو سبھی پیتے تھے" ۔ لیکن تاریخی داستان کا یہ پہلو ان کی مذہبی ادبی و روحانی شخصیت پر کبھی غالب نہیں آیا ۔ وہ شاہ ولی اللہ ، ڈاکٹر اقبال اور مولانا اشرف علی تھانوی کے معنوی مرید تھے ۔ وہ مجھ سے اسلام اور اجتہاد پر باضابطہ طور پر کام کروانا چاہتے تھے ۔ انھیں کے ایما پر میں نے بنگلور یونیورسٹی میں Modernism in Islam کے عنوان کے تحت پی ۔ایچ ڈی کے لیے رجسٹریشن بھی کروایا تھا ۔ مگر کچھ ابتدائی کام کرنے کے بعد میرے لا اوبالی پن کی وجہ سے یہ کام شروع ہی نہ ہوسکا ۔ جس کا مجھ سے زیادہ محمود ایاز کو افسوس تھا ۔ مرنے سے ایک ماہ قبل بھی ۔ انھوں نے افسوس کرتے ہوئے کہا کہ یہ کام ہوجاتا تو اچھا تھا ۔ انھوں نے شائستہ یوسف کو بھی اس کام پر لگانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے ۔

تصوف میں وہ غوث علی شاہ پر گل حسن شاہ کی تصنیف "تذکرہ غوثیہ" کے بڑے

قائل تھے ۔ لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کچے ذہنوں کے لیے یہ کتاب گم راہ کن ثابت ہوسکتی ہے ۔ ۱۹۹۶ء میں انھوں نے مجھے یہ کتاب دی ۔ کتاب پڑھنے کے بعد جب میں یہ کتاب انھیں لوٹانے گیا تو انھوں نے کہا کہ یہ تمھارے مطلب کی ہے تم رکھو ۔

جو آخری کتاب انھوں نے میرے مطالعے کے لیے اپنی موت سے پہلے دی وہ مولانا اشرف علی تھانوی کی " التکشف عن مہمات التصوف " تھی اس کے پندرہ دن بعد ان کا انتقال ہوگیا ۔

محمود ایاز سیاسی سطح پر بھی نہایت نڈر اور بے باک تھے ۔ ایسی شخصیات اردو میں تو کیا ، ہندوپاک کی دیگر زبانوں میں بھی نہ ہونے کے برابر ہیں ۔ ایک دفعہ جب وہ اکادمی کے صدر تھے، میرے ایما پر ان کی صدارت میں ایک وفد اردو ہال کی تعمیر کے لیے جگہ کے الاٹ منٹ کے لیے وزیرِ اعلیٰ ویرپا موئیلی سے ملنے گیا ۔ میں اس وفد میں بعض سرکاری وجوہات کی بنا پر شامل نہیں ہوا۔ وفد میں شامل دیگر اراکین سے یہ پتہ چلا کہ جب محمود ایاز وزیرِ اعلیٰ کو اپنی بات بتا رہے تھے ، کوئی فون آیا اور وزیرِ اعلیٰ فون پر گفتگو میں مصروف ہوگئے تو محمود نے فائل بند کردی اور جب وزیرِ اعلیٰ فون پر گفتگو ختم کرچکے تو محمود ایاز نے دو ٹوک ان سے کہا کہ اگر وہ مصروف ہیں تو ہمیں وقت دینے کی کیا ضرورت تھی اور یہ کہ وہ اسی صورت میں بات کو آگے بڑھانا پسند کریں گے کہ جب بغیر کسی مداخلت کے وہ بات سننے کے لیے تیار ہوں ۔ وزیرِ اعلیٰ نے شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے عملے سے کہا کہ کوئی فون آئے تو کہہ دیا جائے کہ وہ میٹنگ میں ہیں ۔ تب بات کہیں آگے بڑھی ۔ ایک بار جب میں ، محمود ایاز اور عزیز اللہ بیگ ، اردو اکادمی کے جلسے کے بعد یوتھ سنٹر سے باہر آرہے تھے ، سابق وزیرِ اعلیٰ مسٹر بنگارپا اپنے مداحوں کی کثیر تعداد کے نرغے میں یوتھ سنٹر کے اندر داخل ہورہے تھے ۔ محمود ایاز نے دور ہی سے انھیں مسٹر بنگارپا کہہ کر آواز دی اور ان کا حال پوچھا تو بنگارپا اپنے حواریوں کی موجودگی میں جھینپ سے گئے ۔

اردو اکادمی کے چند معاملات میں مداخلت کی وجہ سے اکادمی کی صدارت کے دوران محمود ایاز نے وزیر برائے کنڑا اور کلچر کے خلاف ایک خط وزیرِ اعلیٰ کو لکھا تھا جس میں انھوں نے یہ کہا کہ اکادمی ایسے خود مختار ادارے میں سیاسی مداخلت نہیں ہونی چاہیے ۔ اور اگر مداخلت ہوتی رہے تو وہ مستعفی ہوجائیں گے ۔ اس کے نتیجے میں وزیر چپ ہوگئے اور اکادمی آزادانہ طور پر کام کرنے لگی ۔

محمود ایاز کی اعلیٰ ظرفی یہ بھی تھی کہ کئی با اثر اور برسرِ اقتدار سیاست دانوں کو شخصی طور پر جاننے کے باوجود انھوں نے کبھی انھیں شخصی تو کجا کسی ادبی غرض سے بھی استعمال نہیں کیا ۔ یہی حال سوغات کی اشاعت کا بھی تھا ۔ کبھی انھوں نے سوغات کے لیے چندہ

وصول نہیں کیا۔ اور بہ طور اردو کی خدمت کے رسالے خرید لے والوں کو رسالہ روانہ نہیں کیا۔ یہی نہیں ان کے کئی قریبی رشتہ داروں اور دوستوں سے جو "سوغات" کو اشتہار دینے کے اہل تھے، اشتہار دینے کی درخواست نہیں کی۔ "شب خون" میں امداد کی اپیل کے وہ سخت مخالف تھے۔ کئی بار انھوں نے مجھ سے کہا کہ فاروقی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن جن پرچوں میں اشتہار شامل نہیں ہوتے وہ ان رسالوں کے مدیروں کی صدق دلی کے بارے میں بھی مشکوک تھے۔ ایک دفعہ اجمل کمال کے "آج" کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے کہا "ایک بھی اشتہار نہیں ہے۔ پتہ نہیں، پیسہ کہاں سے آتا ہے؟"

شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں ان کا یہ خیال تھا کہ اچھا لکھنے کے لیے لکھنے والوں کی آزادانہ زندگی بھی بہت ضروری ہے۔ کہتے تھے کہ لکھنے والے کو کبھی جنگل تو کبھی شہر، کبھی پہاڑ تو کبھی ندی اور کبھی شراب کا گلاس لیے کہیں دور جا بیٹھنا چاہیے، تبھی وہ کچھ لکھ سکتا ہے۔ اچھا لکھنے کے لیے اچھا جینا ضروری ہے۔

۱۹۹۳ء میں جب محمود ایاز اکادمی کے صدر تھے تو انھیں کے ایما پر اردو ڈرامے کے فروغ کے لیے ایک ادارہ "اردو تھیٹر ٹرسٹ" وجود میں آیا اور مجھے اس کا سکریٹری بنایا گیا۔ اس کے نتیجے میں ۱۹۹۵ء میں تھیٹر ٹرسٹ نے میری سرپرستی میں حبیب تنویر کا "آگرہ بازار" پیش کیا۔ چند انتظامی امور کی بنا پر محمود ایاز اور دیگر اراکین مجھ سے ناخوش تھے تو میں نے یہ کہہ دیا کہ آئندہ ڈرامے کے تعلق سے میں کبھی کچھ نہیں کرنے والا لہٰذا ایک سال تک اردو تھیٹر ٹرسٹ پر جمود طاری رہا۔

مارچ ۱۹۹۶ء میں محمود ایاز نے مجھ پر پھر کوئی پراجکٹ لینے پر زور دیا۔ تو دیگر تمام باتوں پر گفت و شنید کے بعد میں نے بھیشم ساہنی کے ڈرامے "کبیرا کھڑا بازار میں" پر کام کرنا شروع کیا۔ ایک سال کے اندر ادارہ بکھر گیا تھا۔ اس کی پھر سے شیرازہ بندی کرنے کے لیے میں نے کئی اقدام کیے۔ ان میں فن کاروں کا مستقل طور پر تقرر، بھوپال سے ہدایت کار الکھ نندن کو مدعو کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ تمام تر عملی مشکلات کے باوجود ڈرامہ تین دن کامیابی سے اسٹیج کیا گیا۔ لیکن محمود ایاز اخراجات کے زیادہ ہوجانے سے خوش نہیں تھے۔ لہٰذا ڈرامے کے بعد جب فن کاروں کی ضیافت کا انتظام کیا گیا تو کھانے سے قبل عزیز اللہ بیگ، الکھ نندن، کنڑا ادیب شیو پرکاش اور مجھے لے کر محمود ایاز قریب کے بار اور ریستوراں میں گئے۔ یہاں انھوں نے اخراجات زیادہ ہونے کی بات اٹھائی، تو میں نے یہ کہہ دیا کہ وسکی کے دوچار پیگ پر فیصلہ صادر کرنا آسان ہے بہ نسبت عملی طور پر کام کرنے کے۔ اس پر محمود ایاز چڑ گئے اور ضیافت میں

واپس آکر کھانے کے بعد یہ کہتے ہوئے چل دیے کہ وہ اردو تھیٹر ٹرسٹ سے مستعفی ہو رہے ہیں ۔ اس کے بعد میں بھی ان کے گھر نہیں گیا ۔ یہ واقعہ مئی ۱۹۹۶ ء کا ہے ۔ اس کے بعد میری ان سے ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ اسپتال میں تھے اور ان کا مرض کینسر تشخیص ہوچکا تھا ۔ اور میری ان سے یہ ملاقات خود انھی کے ایما پر ہوئی ۔ انھوں نے عزیز اللہ بیگ سے یہ کہلوا بھیجا " کہاں کا ڈرامہ ، کہاں کی دشمنی انھیں آکر ملنے کو کہو " ۔ میں اسپتال گیا تو بہت ٹوٹ کر ملے اور گلے لگا لیا ۔ پھر ان کے آخری وقت تک گھر اور اسپتال ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا ۔

بیماری کے عالم میں ان کی مستقل مزاجی کو کبھی دھکا نہیں لگا ، حالاں کہ ستمبر ۱۹۹۶ ء تا ۲۹ مارچ ۱۹۹۷ ء ان کی جسمانی حالت میں انقلاب انگیز انحطاط آگیا تھا ۔ شروع شروع میں وہ صوفے پر آکر بیٹھتے تھے ۔ پھر ڈائننگ ٹیبل پر انھیں طوعا و کرہا اپنی مرغوب غذائیں کھاتے دیکھا ، پھر ایسا دور بھی آیا جب وہ کھانے پینے سے بالکل ہی محروم ہوگئے ۔ آخری پندرہ دنوں میں تو وہ بالکل ہی بستر کے ہو رہے تھے ۔ لیکن کبھی انھوں نے اپنے مرض کی شکایت نہیں کی ۔ میں نے کسی مریض کو آج تک اتنا صابر نہیں پایا ۔ ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے کہ " اتنے دن نکل گئے باقی کے بھی نکل جائیں گے ۔ " اپنی بیماری کے عالم میں بھی اپنی بیگم مریم ایاز کو شام اکثر کلب بھیج دیتے تھے اور میرے پوچھنے پر کہ بھابی کہاں ہیں کہتے کہ " میں نے خود کلب بھیج دیا ہے تاکہ اس کی وقت گزاری ہوجائے ۔ دن بھر میری دیکھ بھال میں گھر میں پڑی رہتی ہے " ۔

ایک دفعہ جب حسبِ معمول ان کے پیٹ میں شدید درد تھا ، بھابی نے انھیں گولیاں دیں تو مسکرا کر کہا ۔ " وہ جو تم عورتوں کے بارے میں اردو شاعری میں کہا گیا ہے کہ عشوہ و ناز و ادا سے مار ڈالتی ہیں ایسا کچھ کیوں نہیں کرتیں " ۔ یہ کہہ کر ہنسنے لگے ۔

پہلی دفعہ جب اسپتال میں داخل ہوئے تھے اور Check up ہو رہے تھے تو ان کے نسبتی برادر کی بیوی طاہرہ ملنے آئیں ۔ وہ اس وقت عمرہ کے لیے نکلنے والی تھیں تو ان سے کہا کہ " ان کے لیے دعا کریں " جب وہ چلنے لگیں تو ان سے پوچھا کہ " کیا دعا کروگی " تو انھوں نے کہا " یہ دعا کروں گی کہ جلد صحت یاب ہو جائیں ۔ " محمود ایاز نے کہا " نہیں یہ دعا کرو کہ معاملہ بہ خیروعافیت تمام ہو اور ایمان پر خاتمہ ہو ۔ "

ان کے مجموعہ ، کلام کا مسودہ کتابت کے بعد ان کے پاس کئی دنوں سے پڑا ہوا تھا ۔ کئی بار اصرار کرنے کے باوجود انھوں نے یہ مسودہ مجھے نہیں دیا ۔ کیوں کہ ان کا اصرار تھا کہ انتخاب ان کے بعد ہی شائع ہو ۔ ۱۲ مارچ کو میرے اصرار پر انھوں نے مسودہ میرے حوالے کیا ۔ اس کے دوسرے ہی دن ان کی حالت ابتر ہوگئی اور انھیں آخری مرتبہ پہلے ملیا اور اس کے بعد

سی پال اسپتال میں داخل کرایا گیا ۔ مجموعہ لینے کے بعد جب میں نے ان سے کہا کہ وہ مجموعے کے تعلق سے اور اپنی شاعری کے بارے میں کچھ لکھ دیں تو منع کردیا ۔ کہ دیا - جو کچھ تھا وہ لکھ دیا ہے ۔ اب لوگ پڑھ لیں ۔ "

ادب ۳ میں شامل ان کا انٹرویو اتفاق سے اس وقت منظرِ عام پر آیا جب انھیں کینسر تشخیص ہوچکا تھا ۔ انٹرویو لینے کے بعد مختلف لوگوں نے اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا ۔ ۔ ۔ میں جب کبھی ان کے یہاں جاتا تو خطوط پڑھ کے سناتے ۔ جب سرور صاحب کا خط آیا تو میں نے لے جاکر دکھایا ۔ پڑھ کر بے انتہا خوش ہوئے ۔ اس کی ایک نقل بنا کر اپنی فائل میں رکھ لی حتیٰ کہ انھوں نے اسے سوغات کے زیرِ نظر شمارے کی بازگشت میں بھی خود شامل کیا ہے ۔

ادب ۳ میں شامل ان کے انٹرویو کی خود انھوں نے کافی کانٹ چھانٹ کی ہے ۔ اور کئی باتیں (جو دوستوں اور دشمنوں کے خلاف جاتی ہیں) انھیں انھوں نے وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے کی بنیاد پر خود ہی نکال دیا ۔ اصل انٹر ویو میں بعض ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں انھوں نے کافی سخت سست باتیں کہی تھیں ۔

محمود ایاز کاروباری معاملات میں بہت تیز تھے اور خود اس بات کا اعلانیہ طور پر اظہار بھی کرتے تھے ۔ کہتے تھے - میں شاعر و ادیب آدمی نہیں ہوں ۔ میں کچھی میمن خالص ماروارڑی آدمی ہوں اور پیسے کی پکڑ کے بارے میں مجھے علم ہے " تاہم دوستوں اور ضرورت مندوں کی دل کھول کر مدد کرتے تھے ۔ جب اخترالایمان کو DIALYSIS کی نوبت آگئی تھی اردو اکاڈمی سے انھیں دس ہزار روپے اور اردو تھیئٹر ٹرسٹ سے چھ ہزار دلوائے ۔ نہ صرف یہ بلکہ زبیر رضوی کے ذریعے دلی اردو اکاڈمی سے بھی انھوں نے اخترالایمان کو امداد بہم پہنچائی ۔

محمود ایاز میں چھٹی حس اور قیافہ شناسی بہ درجہ اتم موجود تھی ۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ میں ان کے پاس گیا ہوں اور میری طبیعت ٹھیک نہ رہی ہو ۔ جیسے ہی میں ان کے گھر میں داخل ہوتا تو یہ کہہ دیتے تھے - تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے " ۔ جب فروری ۱۹۹۳ ۔ میں مجھے قلب کا دورہ پڑا اور ایک دن قبل میں ان کے یہاں گیا تھا ، جب بھی انھوں نے مجھ سے یہی بات کہی تھی ۔ خود ان کی موت کا گویا انھیں تقریبا ایک سال پہلے سے علم ہوچکا تھا ۔ فروری مارچ ۱۹۹۶ ۔ میں ہر دوسرے دن مجھے اور عزیز اللہ بیگ کو بلا لیتے تھے اور اس کا اظہار کرتے تھے کہ ان کا وقت اب قریب آگیا ہے ۔ اس وقت ہمیں آنے والے بھیانک دنوں کا خواب میں بھی اشارہ نہیں ملا تھا ۔

OO.OOO.OO

شائستہ یوسف

جمالِ ہم نشیں

محمود ایاز سے ملاقات سے پہلے میں جس ادبی حلقے سے واقف تھی اس حلقے کے شاعروں اور ادیبوں کا روپ عام لوگوں سے کچھ الگ ہی طرح کا تھا۔ کسی کے لمبے بال، کسی کے منھ میں پان، بناوٹی لہجہ وغیرہ۔ ایاز بھائی مجھے شاعر یا ادیب بالکل نہیں لگے۔ سلیقے کا کرتہ پائجامہ، کالا چشمہ گھر کا ماحول ماڈرن، لہجے میں شان، شاہانہ انداز، اپنی ہر بات ہر عمل میں پُر اعتمادی کی مکمل چھاپ۔ میں نے اپنے محسن، اپنے استاد کے ساتھ زندگی کے پندرہ برس گزارے ہیں۔ ان پندرہ برسوں میں دس برس تو ہماری ملاقات تقریباً روزانہ ہوتی تھی۔ میں نے انھیں کئی روپ میں دیکھا ہے ادیب، شاعر، تنقید نگار، مدیر اور نہ جانے کیا کیا۔

میں ان سے پہلی بار آغا عباس علی روڈ والے گھر میں ملی۔ اور پہلی ہی ملاقات میں اسکول کی بچی کی طرح میں نے انھیں اپنی کئی غزلیں، نظمیں فرفر سنا ڈالیں۔ انھوں نے مریم بھابی کو آواز دی اور کہا "یہاں آؤ، اس لڑکی کی باتیں سنو، یہ اگر اپنے اظہار کی بے ساختگی کو صحیح ڈھنگ سے پیش کرے تو ہندستان کی بہترین شاعرات میں سے ہوگی۔" اس وقت میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بس ان کی بات اچھی لگی۔ پھر انھوں نے کہا "سادگی اور بے ساختگی اظہار کا بہترین ذریعہ ہیں۔ لیکن ایک بات یاد رکھو تمھاری طاقت تمھاری کمزوری ہے۔"

"مجھے آپ اپنی شاگردی میں لے لیجیے۔" میں نے جو دل میں آیا وہ کہہ دیا۔

"ہوں، کیا کروگی؟ میں سٹپٹا گئی۔

"وہ آپ ۔۔۔ طاقت" ۔۔۔ "جلد ہی احساس ہوا کہ میں اوٹ پٹانگ بک رہی ہوں۔

ایاز بھائی نے قہقہہ لگایا "مریم یہ مجھے پہلوان سمجھتی ہے۔ استاد وغیرہ نہیں ہوتا کچھ۔"

مریم بھابی مسکراتی رہیں "لو چائے پیو" ایاز بھائی بولے "میرا فون نمبر لے جاؤ، جب بھی آنا چاہو فون کر کے آجانا۔"

میں نے پوچھا "اپائنٹمنٹ لینا پڑتا ہے؟" جلدی سے بولے "نہیں ایسی کوئی بات نہیں، میں یہ نہیں چاہتا کہ لوگ اپنی مصروف زندگی سے وقت چرا کر مجھ سے ملنے آئیں اور میں ان کا وقت ضائع کروں۔"

لوٹتے ہوئے راستہ بھر سوچتی رہی۔ "یہ شخص مغرور ہے یا مستغنی۔ سمندر ہے یا

دیا ۔ ایسا کوئی نہیں ہوگا جو ان سے ملا ہو اور ان کی شخصیت سے مرعوب نہ ہوا ہو ۔

میں نے انھیں اپنا استاد مانا لیکن انھوں نے کبھی اس بات کو جتایا نہیں ۔ حالاں کہ ان کا پہلا سبق پہلے ہی دن سے شروع ہوچکا تھا ۔ جبلّتِ شعری اور مہارتِ فن کے معنی سمجھنا آسان کام نہیں تھا ۔ بہت دنوں بعد احساس ہوا ، بے ساختگی ، روانی ، لفظوں کا انتخاب اظہار کا وسیلہ ہیں ۔ تخیل کو رنگوں کی آمیزش کا صحیح توازن نہ ملے تو وہی رنگ ، وہی خیال ، وہی کینوس جو فن کاری کا بہترین نمونہ بن پاتا ہے ، بکواس بن جاتا ہے ۔ فن کی مہارت کا کوئی مخصوص نسخہ نہیں ہوتا ۔ ہر ذہن اپنی پناہیں خود تلاش کرتا ہے ۔

دوسری بار جب میں ملنے گئی تو جو وقت طے تھا اس سے پندرہ منٹ دیر سے پہنچی ۔ ان کے چہرے پر ناراضگی کی ہلکی سی لہر دوڑی مگر وہ خاموش رہے ۔ صرف گھڑی دیکھی ۔ میں نے ٹرافک میں پھنس جانے کا بہانہ بنایا ۔ جواب ملا کہ " آئندہ آدھے گھنٹے پہلے نکلو تاکہ راستے میں جلوس بھی مل جائے تو ٹھیک وقت پر پہنچ سکو ۔ بچوں کو نرسری سے ایس ایس سی تک روزانہ Punctuality کے معنی دہرائے جاتے ہیں جو کچھ لے Disciplined ہوجاتا ہے ۔ میری تعلیم شروع ہوچکی تھی اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا ۔ مجھ سے خاندان کے بارے میں سوال کیا گیا میں نے کہا - اب میں فری ہوں ، کچھ بھی پڑھ سکتی ہوں ، کام کرسکتی ہوں ، بچے بڑے ہوگئے ہیں ۔"

انھوں نے تیوری چڑھا کر تعجب سے پوچھا - اچھا کتنے بڑے بچے ہیں ؟ " بڑا نویں جماعت میں آگیا ہے اور چھوٹا ماشاء اللہ چلنے لگا ہے ، آرام سے گھومتا پھرتا ہے ، کسی کو ستاتا نہیں ، کہیں بھی ٹک جاتا ہے ۔ پہلے واقعی مشکل ہوتی تھی اب کہیں بھی آ ، جا سکتی ہوں ۔ " ایاز بھائی نے سنجیدگی سے کہا ۔ " واقعی ؟ لوگ خواہ مخواہ بچوں کو بڑا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور پریشان رہتے ہیں ۔ "

مریم بھابی سے رہا نہیں گیا وہ ہنسنے لگیں ۔ پھر ہر ملاقات پر یہی کچھ ہوتا ۔ میرے احمقانہ جواب ان کے لیے ایک چیلینج تھے ۔ گویا میری تربیت ان کے ذمے ہے ۔ کچھ عرصے بعد یہ سب کچھ کم ہوگیا ۔ اگر کبھی کبھار کوئی الٹی سیدھی ہانکتی (لوگوں کے سامنے) تو ان کے جانے کے بعد بہت ڈانٹتے - " تم کبھی نہیں سدھروگی ، میری بلی تم سے زیادہ سمجھ دار ہے ۔ " اکثر ہم لوگ ڈنر پر باہر کسی نہ کسی ریستوران میں جاتے ، گھر پر کوئی پارٹی ہوتی تو بھی مجھے ضرور بلالیا جاتا ۔ ایک روز ہم ہوٹل جارہے تھے ۔ میں اپنی ساری کا پلو کھینچ کھینچ کر دوسرے کندھے پر اوڑھنے کی کوشش کیے جارہی تھی یا یوں سمجھ لیں کہ پلو میں الجھی جارہی تھی ۔ بھلا استاد کی نظروں سے

کوئی چیز چھپ سکتی تھی ۔ قریب آکر بولے ۔ " بار بار پلو کو تکلیف دینے کی بجائے اگر میچنگ کا بلاؤز پہن لیا جائے تو ٹھیک رہتا ہے کیوں شائستہ ؟ "

" جی !!! میں اتنا ہی کہہ پائی ۔ میری زندگی کا یہ پہلا اور انوکھا تجربہ تھا کہ کوئی شخص ان باتوں کا بھی نوٹس لے سکتا ہے ۔ ہوٹل میں کھانے کے ٹیبل پر ڈری ڈری سی اکڑی ہوئی بیٹھی دیکھ کر بڑے آرام سے کہا ۔ " شائستہ یہاں اپنے پیسے خرچ کر کے کھانا کھاتے ہیں ۔ لطف اٹھاؤ ۔ سمدھن کے گھر نہیں آئی ہو ۔ لپ اسٹک کھانے سے احتراز کرو ۔ بات کرنے سے ڈرتی ہو ۔ کسی بھی معاملے میں نارمل نہیں رہنے کی قسم کھائی ہے کیا ؟ " اس کے بعد ہم اطمینان سے باتیں کرتے اور کھاتے رہے ۔ کسی کی موت کا ذکر چلا ۔ میں نے کہا اس کے والد کی Death ہوگئی ہم سب نے جانا تھا ۔ " فوراً پکڑلیا ۔ " اس طرح کی زبان تمھاری نہیں ہے ۔ ۔ نہ جانے کیسے لوگوں میں اٹھتی بیٹھتی ہو اور شان سے غلط جملوں کو فیشن کی طرح اپنا لیتی ہو ۔ یا تو صرف انگریزی بولو یا پنجابی ۔ اس کھچڑی کو بمبئی ہی میں استعمال کرنا ۔ "

اس طرح کی کئی باتیں کئی جھگڑے ہوئے ۔ آہستہ آہستہ میری عادتیں ، صحبتیں ، پہننا ، اوڑھنا ، کھانا پینا سب تبدیل ہوتا چلا گیا ۔ میں جانے ان جانے میں استاد کے رنگ میں رنگتی چلی گئی ۔ اب کتب پڑھنے کی باری آئی ۔ ہر طرح کی کتاب میں لے جاتی اور واپس لے آتی ۔ کتاب لے جانے سے پہلے اس پر بحث ہوتی ۔ کتاب لوٹاتے وقت بھی کچھ باتیں بتا دیتی ۔ سلسلہ چلتارہا ۔ ان دنوں میں اردو میں ایم ۔ اے کر رہی تھی ۔ اپنے نصاب کی کتابوں کے نام اور کچھ سوالات میں نے ایاز بھائی کو لکھ کر دیے ۔ انھوں نے کاغذ پر ایک نگاہ ڈالی اور پاس کے ٹیبل پر رکھ دیا ۔ کہا ، ٹھیک ہے آج ڈنر پر تمھارے سوالوں کے جواب دوں گا ۔ پھر یہ ہوا کہ ہر دن پرانے شاعروں اور ادیبوں پر باتیں ہونے لگیں ۔ کھڑی بولی سے لے کر " سوغات " کے نظم نمبر تک " روزانہ کئی واقعات وہ سناتے ۔ فارسی کے لیے " آمدن نامہ " دیا گیا ۔

اس کے بعد نتیجہ آیا اور میں نے امتحان فرسٹ کلاس میں پاس کیا ۔ اس روز ہم لوگ بہت خوش تھے ، ویسٹ اینڈ ہوٹل کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے ۔ ایاز بھائی اتنے مسرور تھے گویا یہ امتحان انھوں نے پاس کیا ہو ۔ پہلی بار یہ کھل کر بات کی کہ ۔ " اکثر مجھے یہ بات ستاتی تھی کہ اکیڈمک لیول پر کبھی کوئی امتحان نہیں دیا ، کوئی ڈگری نہیں لی ، کئی لوگوں نے امتحان دینے کا مشورہ دیا مگر دل نہیں مانا ۔ آج جیسے وہ خلش نکل گئی ۔ "

تھوڑی دیر کے بعد انھیں کوئی خیال آیا ۔ پوچھا ؛ تم نے آزاد ، اقبال ، میر ، کی کتابیں کہاں سے خریدیں ؟ "

میں نے گردن ہلا کر کہہ دیا "کچھ بھی نہیں خریدا ۔"
پوچھنے لگے ۔ "امتحان کیسے دیا ؟"
"آپ نے تو سب پڑھا دیا تھا ۔" میں سمجھی وہ اس جواب سے بہت خوش ہوجائیں گے ۔ غصے سے ان کے کان سرخ ہوگئے ۔ "بے وقوف اس کا مطلب تم نے خودی بے خودی کو کھیل سمجھا ۔ یہ لوگ جنھوں نے ادب کے لیے اپنی زندگی وقف کردی ۔ تم نے گھنٹوں میں سمجھ لیا اور فرسٹ کلاس بھی لے لیا ۔"
مریم بھابی سمجھانے لگیں "چھوڑو بھی کلاسس اٹینڈ کرکے نوٹس لے لیے ہوں گے "
"کلاسس ؟ کیا بات کی ہو مریم ؟ اس کا کوئی دن ہم سے چھپا نہیں ہے ۔ ڈریس استری کرکے پہننے کا وقت اس کے پاس نہیں ہے ۔ بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے دن گزارتی ہے ۔ میں سمجھ رہا تھا رات میں پڑھائی ہوتی ہوگی ۔ افسوس ۔ افسوس ۔ سارا قصور میرا ہے ۔ تضیع اوقات ۔"
میں اپنا قصور سمجھ نہیں پائی ۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے ۔ "میں نے نقل نہیں کی تھی ۔"
"شٹ اپ ! بے وقوف عقل کا غلط استعمال انسان کو کتنا کھوکھلا اور کم زور کردیتا ہے اندازہ ہے ؟"
"اچھا آئندہ نہیں کروں گی ۔ آپ غصہ مت کیجیے ۔" میں ان کے غصے سے بہت ڈرتی تھی اور ان کے غصے نے بہت کچھ سکھایا بھی ہے ۔
"کیا آئندہ نہیں ؟ تمھارے پاس عقل ہے کہاں ؟ چلو مریم اس کو گھر چھوڑ دیتے ہیں ۔ یہ آرام سے گھر میں بیٹھ کر فلمیں دیکھے صبح دس بجے تک ۔ یہی اس کے لیے ٹھیک ہے ۔ اس کے بعد دو ہفتوں تک میری کسی نے کوئی خبر نہیں لی ۔ اتفاق سے مریم بھابی کی سال گرہ آگئی اور میں پھر ایک بار اس خاندان کا ایک حصہ بن گئی ۔ مجھے وارننگ دی گئی ۔ کھانا کھاؤ آئس کریم کھاؤ ۔ پان کھاؤ اور بس ۔ کسی طرح کی بحث کرنے کی کوشش مت کرنا ۔"
اس روز ان کے بیٹے وصی ساتھ تھے ۔ کافکا کا ذکر چلا ۔ وصی نے پوچھا بابو آپ نے شائستہ کو "کاسل" پڑھنے کے لیے دی ہے ۔" وہ بولے "نہیں بیٹا شائستہ پڑھے بغیر سب کچھ سمجھ لیتی ہے ۔" اب اس طرح سے تبادلہ ۔ خیال ہوتا رہا تو یہ انگریزی میں بھی ایم ۔ اے کرلیں گی ۔"

اس جملے نے میرے ہوش ٹھکانے لگا دیے ۔ دوسرے ہی دن میں نے مریم بھابی سے "کاسل" مانگ لی اور دس دن بعد لوٹی ۔ میری سمجھ میں جو آیا اسی طرح تجزیہ کر کے مضمون بھی ساتھ لیتی گئی ۔ انھوں نے مریم بھابی سے کہا تم نے اس لڑکی کو بہت چھوٹ دے رکھی

ہے ۔کیوں دی تھی یہ کتاب ۔ ۔ ۔ ؟ " میں نے لوٹتے وقت کتاب کے ساتھ مضمون رکھ دیا اور کہا ۔کچھ لکھا ہے ۔ "

" اوہو ! احسان کیا ہے ہم لوگوں پر ۔ پڑھنے کے ساتھ لکھنے کا وقت بھی ملا ۔ نہ معلوم آپ کی کتنی اہم دعوتیں چھوٹ گئی ہوں گی ۔ عقیقے کی ۔ چلے کی ۔ کان چھیدائی ۔ بسم اللہ ۔ برتھ ڈیز وغیرہ ۔ " میں چپ چاپ چلی آئی ۔ ایسی مشکل میں تھی کہ وہاں گئے بغیر رہ نہیں سکتی تھی اور اپنے آپ کو صرف ادبی کاموں کے لیے وقف بھی نہیں کر پاتی تھی ۔ تیسرے ہی روز فون آیا ۔ " فوراً چلی آؤ ! جلدی آنا دیر سے لوٹنے کے بارے میں کہہ کر آؤ ۔ " میں بہت خوش ہوگئی ۔ دو ہفتوں کے بعد ایاز بھائی نے خود فون کیا تھا ۔ ہشاش بشاش اور نارمل لہجے میں ۔ تنقید کی ایک کتاب نکال کر رکھی تھی اور میرے مضمون میں کئی جگہ انڈر لائین کیا ہوا تھا ۔ بتایا " دیکھو یہ کافکا پر بہترین مضمون لکھا گیا تھا اور تم نے کتنی باتیں پوائنٹ آؤٹ کی ہیں ۔ اب کم از کم سمجھو کہ تم کیا کر سکتی ہو ۔ حالاں کہ یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میرے کہنے کا اثر کچھ نہیں ہوگا ۔ کسی نہ کسی طرح کی خرافات میں گم رہو گی ۔ اگر تم نے بہت کچھ پڑھا ہوتا ۔ تنقیدیں دیکھنے کے بعد کتاب پڑھتیں تو شاید تمھارے مضمون کا اتنا لطف نہ آتا ۔ کبھی کبھی لا علمی مبارک ثابت ہوتی ہے ۔ " بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اس روز ایاز بھائی کی سال گرہ تھی ۔

ہم اشوکا ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے ۔ میں نے پھر جو دل میں آیا کہہ دیا ۔ " ارے اسی مہینے مریم بھابی کی سال گرہ بھی تو تھی ۔ "

ایاز بھائی ہنستے ہوئے بولے ۔ " پہلے معلوم ہوتا تو شاید کچھ مہینے آگے پیچھے کرلیتے ۔ "
میں نے کہا ۔ " آپ کا Sense of Humour بہت اچھا ہے " ۔ " سنا مریم ! لتنے بڑے بڑے جملے بولنے لگی ہے نظر لگ جائے گی ! " اس روز مزاح پر باتیں چلتی رہیں ۔ شوکت تھانوی کی سودیشی ریل کے بعد جب مشتاق احمد یوسفی کا ذکر آیا تو پوری شام ان کی نذر ہوگئی ۔ پھر مجھے وہیں ہوٹل میں بیٹھے بیٹھے ماڈرن پبلیشرز کا پتہ لکھوایا اور کہا ۔ کچھ کتابیں فوراً منگواؤ ۔ اپنے پیسے کتابوں پر خرچ کرنا ہر قاری کا فرض ہے ۔ "

مشتاق احمد یوسفی کی باتیں سننے کے بعد میرا دل بے اختیار چاہا کہ فوراً ان کی ساری کتابیں پڑھ ڈالوں ۔ ایاز بھائی کو کئی جملے ۔ کئی واقعات یاد تھے ۔ لتنے موڈ میں سنا رہے تھے گویا وہ سب ان کے سامنے کی باتیں ہوں ۔ ہم لوگ مسلسل ہنستے رہے جیسے دنیا میں ہمارے علاوہ کوئی نہیں تھا ۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چلتا رہا ۔ کتابیں کچھ منگوائی گئیں ۔ کچھ گھر سے لے کر پڑھیں ۔ کچھ لائبریری سے آئیں ۔ اس میں راشد الخیری ۔ علامہ شبلی ۔ مولانا محمد حسین آزاد ۔ امیر خسرو ۔

رشید احمد صدیقی ۰ محمد ہادی رسوا ۰ عزیز احمد ۰راجندر سنگھ بیدی ۰ اختر الایمان ۔ فلسفہ ۰ مذہب ۰ اردو زبان کی درسی کتابیں ۰ انگریزی مقالے ۰ شاعری ۰ ناول ۰ تنقیدیں ۔ کیا کچھ خزانہ تھا گھر میں ۰ اور ان کے دل میں بھی ۔ ڈاکٹر محمد اقبال کے لکچرز مجھے پڑھنے کو دیے ۔ ان دنوں ان کے ماموں آئے ہوئے تھے وہ اپنے ماموں کو بہت چاہتے تھے ۔ انھیں دل کی ہر بات بتاتے تھے ۔ میں نے ایاز بھائی سے کہاں کہ " مجھے ڈاکٹر اقبال کی باتوں میں بڑا مزہ آیا ۔ تصور بہت اچھا ہے روح کی پائیداری والا ۔ جو پاک اور ہلکی پھلکی ہوگی وہ پائیدار ہوگی اور دائمی ۰ بد عملی وزنی ہوکر خود ہی تباہ ہو جائے گی ۔ " پھر میں ہنستی ہوئی کئی لوگوں کے بارے میں کہتی رہی کہ فلاں تو معمولی پٹاخے کی طرح " چھوٹتے ہی بجھ جائیں گے ۔ فلاں کچھ دور اڑیں گے ۔ " اتنے میں ماموں داخل ہوئے ۔ "کیا باتیں ہورہی ہیں ؟ " میں نے ماموں کو دیکھتے ہی کہا ۔ " یہ پٹاخہ ہیں یا میزائیل ؟ " ایاز بھائی نے زور دار قہقہہ لگایا اور انھیں بات بتائی ۔

ماموں بولے " مذاق تک ٹھیک ہے بھائی ؛ یہ لڑکی گم راہ ہوسکتی ہے ۔ " ایاز بھائی بولے " یہ سب ان کا فلسفہ بولتا ہے ۔ میں نے جناب سید سلیمان ندوی" کے خطبات نکال کر رکھے ہیں ۔ پڑھنے کے بعد پتہ چلے گا زندگی حقیقت میں کیا ہے ۰ اس کے بعد پوچھوں گا جب میں پانی لینے کے لیے گئی تو دونوں کی باتیں میرے کانوں میں پڑیں ۔

ایاز بھائی کہہ رہے تھے " یہ بہت کچھ دیکھ سکتی ہے جو اچھے اچھے دیکھ نہیں پاتے ۔ کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ ساری کتابیں اس کو گھول کر پلا دوں ۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہر وقت کئی گھوڑوں پر سوار رہتی ہے ۔ " ماموں نے پوچھا ۔ " اس کے خاندان میں کوئی شاعر یا ادیب ہے یا پھر کوئی ادبی ماحول ؟ "

ایاز بھائی بولے ۔ " یہ گلِ خودرو " ہے ۔ میں بہت خوش ہوگئی کیوں کہ ایاز بھائی کی زبانی پہلی بار تعریفی جملے اپنے بارے میں سنے تھے ۔ ورنہ روزانہ سوائے ڈانٹ ڈپٹ کے کچھ نہ ملتا ۔ اور پھر بہت دنوں کے بعد میری کتاب کو انھوں نے " گلِ خودرو " کا نام دیا ۔ میری ان سے ملاقات کو ابھی کچھ مہینے ہی گزرے تھے کہ مجھے کئی فون کالس آنے لگے جن میں کہا جاتا کہ " میں نے غلط انسان کا انتخاب کیا ہے وہ شخص کسی کا دوست اور استاد نہیں ہو سکتا ۰ وہ آپ کو کبھی ترقی کرنے نہیں دے گا ۔ آپ کسی پروگرام میں حصہ نہیں لے پائیں گی ۔ آپ کی نظمیں ردی کی نذر ہوتی رہیں گی اور بہت مایوسی ہوگی ۰ آپ جس کے سائے میں ہیں وہ دراصل "برگد کا پیڑ " ہے ۔ خود پھیل کر سایہ دار ہوجائے گا لیکن کسی پودے کو پناہ اور زندگی نہیں دے گا کوئی پھل پروان نہیں چڑھے گا ۔" جب بھی جھگڑے ہوتے یا کچھ لوگ اصلاح کے لیے کلام بھیجتے اور ایاز بھائی

لوٹا دیتے ملنا چاہیں تو ملنے سے انکار کر دیتے ، تخلیقات ردی کی نذر کر دیتے تو مجھے بولنے والوں کی باتیں سچ نظر آتیں ۔ لیکن جوں جوں وقت گزرا ، زندگی کو میں نے جاناتو اس حقیقت کا احساس ہوا کہ کوئی جملہ ، کوئی نصیحت ، کوئی بات فضول اور معمولی نہیں تھی ۔ اس عظیم شخصیت کو کاش کہ میں بہت پہلے سمجھ لیتی ۔ اکثرکہتے " تم سنجیدگی اختیار کروگی ضرور ، شاید میری موت کے بعد " ۔

مجھے ان کے ساتھ وقت گزار نے میں جہاں خوش نصیبی کا احساس ہے وہیں اپنی کم عقلی اور نادانی پر میں ماتم کناں بھی ہوں کہ بہت کچھ سمیٹ سکتی تھی ۔ وہ ایک بہت اچھے دوست بھی تھے اور استاد بھی ۔ کوئی بھی کام ادھورا نہیں کرتے تھے اور بے دلی سے نہیں کرتے تھے ۔ بہت کم لوگ ان کے اس پہلو سے واقف تھے ۔ جو ان کی پناہ میں آجاتا وہ گویا اس کا مکمل ذمہ لے لیتے ۔ اس کی شادمانی ، غم ، صحت ، بیماری ہر ضمن میں ہر طرح کی مدد پر آمادہ رہتے ۔ اسی لیے کسی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے ڈرتے تھے اور اپنی طبیعت سے بھی واقف تھے کہ معمولی سا جھوٹ یا غلطی ہو جانے پر کس طرح برس سکتے ہیں کہ سیکھنے والے کے لیے بھی ان کے غصّے کو برداشت کرنا معمولی کام نہیں تھا ۔ لیکن یہ امتحان پاس کر لو تو شاگرد کی زندگی گویا ان کی ہو جاتی ۔ ان کی طبیعت میں جتنا غصہ اور ضد تھی اتنا ہی دل صاف اور مزاج میں نرمی بھری تھی ۔ کسی کی غلطی کو معاف کر دینا کوئی ان سے سیکھے ۔ لیکن کسی کو چھوڑ دیتے تو بالکل ایسے جیسے کبھی جان پہچان ہی نہ تھی چاہے وہ برسوں کا ملاقاتی کیوں نہ ہو ۔ پہلے یہ رویہ غیر انسانی معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقتاً یہی راستہ سیدھا اور سچا ہوتا ہے ۔ ادھورے دل سے کوئی کام صحیح نہیں ہو سکتا ، کوئی رشتہ پنپ نہیں سکتا ۔ سہارا مکمل ہو ورنہ آپ ہٹ جائیں ۔ یہ ہٹ جانے کا عمل یک طرفہ نہیں ہوتا ۔ دوسرا شخص بھی آپ سے دور ہوتے ہوئے یہ آسانی سے محسوس کرتا ہے ورنہ اس طرح کی صورتِ حال پیدا ہی نہیں ہو سکتی ۔

میں نے ایاز بھائی کے دونوں روپ دیکھے ۔ طبیب اور وکیل ۔ شیرز کا معاملہ ہو یا پھر زمین کے کاغذات ۔ سارے کاغذات اسٹڈی کرتے اور جرح کر کے اچھے اچھے وکیلوں کے چھکے چھڑا دیتے ۔ ڈاکٹر چاہے جو نسخہ لکھ دے ہر دوا کے کمپوزیشن سے واقف تھے ۔ اس پر غور کرتے پھر علاج کرواتے اور احتیاط ہر طرح کی برتتے ۔ اپنی ہی بیماری نہیں بلکہ کسی کی بیماری پر بھی تڑپ اٹھتے ۔ کھانے اور کھلانے کے شوقین تھے ۔ بلکہ اچھا کھلانے کے شوقین تھے ۔ باروچی ہو یا گھر کا مالی ، ساتھ بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتے ۔ کبھی پودوں اور پتوں پر اور کبھی مسالوں اور سبزیوں پر ۔ وکیل ، ادیب ، طبیب ، مالی یا باروچی خواہ کسی پر بھی بحث ہو اسی وقت بحث کرتے جب اس مضمون پر اتھارٹی ہو اور اپنے پاس کوئی ثبوت رکھتے ہوں ۔ اس کے

برعکس اگر کوئی معمولی سی بات بھی صحیح طور پر نہیں جانتے ہوں تو آسانی سے کہہ دیتے کہ وہ لاعلم ہیں۔ ہر بات کا صحیح اور کھرا جواب ہوتا ان کے پاس۔ تجزیہ کرتے اور منصفانہ طور پر کرتے ادب کا معاملہ ہو یا تعلقات کا۔ گڑبڑ، گڈمڈ یا ادھوری بات نہیں ہوتی۔ خیال جب تک موتیوں کی طرح صاف اور بہترین نہ ہو زبان سے نہیں نکلتا تھا۔ بیوی بچوں سے بے انتہا محبت کرتے تھے، محفل کی جان تھے اور گھر کی رونق۔ ان کے ساتھ زندگی گزارنے والا ہمیشہ اپنے آپ کو خوش نصیب قرار دے گا۔ انسانی نفسیات کو بڑی ہی گہرائی سے جانا، پرکھا اور برتا تھا۔ برتا کہنا اس لیے بجا ہوگا کہ اطراف رہنے والوں کی ہر چال اور ہر عمل سے قبل از وقت آگاہ کردیتے۔ سامنے والے کو بہت کم موقع دیتے کہ وہ کوئی حق جتائے یا حکم دے۔ ایسا رویہ اختیار کرتے کہ آدمی خود بہ خود ان کے دام میں گرفتار ہوجاتا لیکن جب تک وہ ان کی قید میں رہتا اسے سونے کے دانے کھلاکر پرورش کرتے۔ جب بھی معلوم ہوتا کہ اڑنے کو پرتول رہا ہے تو اڑا دیتے، آزاد کر دیتے۔ اخبار یا رسالہ نکالنے کا فن ہو یا گولف کھیلنے کا طریقہ ہر کام میں ایک لگن اور گہری نظر ہوتی اکثر ایک شعر دہرایا کرتے تھے۔

سر سری ہم جہان سے گزرے

ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا،

نظمیں کہنا اور پڑھنا کاش ہر کوئی ان سے سیکھتا۔ کبھی جب یہ بات سنتے کہ "شاعری کیا ہے موڈ آگیا، شاعری کرلی، بس ہوگیا۔" اس کے جواب میں کہتے کہ۔ "یہ کیا ضرورت سے فراغت کی طرح شاعری کرلی۔ پہلی مرتبہ چاہے انسان غیبی مضامین کی طرح، ولی کی طرح کچھ بھی کہہ جائے لیکن اس کو پلٹ کر دیکھے، انتخاب اور رد دونوں کی صلاحیت رکھے۔ اس صلاحیت کو پیدا کرنے کے لیے علم ہو، عقل ہو، تجربہ ہو، زبان پر قابو ہو، جب غالب اپنے انتخاب سے نہیں شرمائے تو ہم اور آپ کیا چیز ہیں؟" ہر شعر پر ہر لفظ پر گھنٹوں غور کرتے۔ اچھی شاعری کسی کی بھی ہو اتنا لطف اٹھاتے کہ دن بھر جو ساتھ ہوتا اسے شعر یاد ہو جاتا۔ پسندیدہ اشعار کا ہر طرح سے مزہ لیتے۔ کسی شعر میں روانی پسند ہوتی تو کسی میں الفاظ کا استعمال، کسی میں فلسفہ، کسی میں خیال، جس میں ساری باتیں یکجا ہوں تو کہتے آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے طبیعت سیراب ہوگئی۔ ن۔ م۔ راشد کی "حسن کوزہ گر" انھیں بہت پسند تھی۔ کئی بار سنا چکے تھے۔ اختر الایمان کی نظمیں بہت شوق سے سناتے۔ جب بھی ان کے اشعار سنانے پر اصرار ہوتا اکثر گریز کرتے، کہہ دیتے بہت سے لوگوں نے بہت اچھی طرح اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ میں اس کی قدر کرتا ہوں۔ اپنی شاعری ہماری ذاتی ملکیت ہے جو ماضی کے دریچوں کو کھول کر ہمارے

جذبات اور گزرے ہوئے لمحات کی گواہ بنتی ہے۔" بنگلور چھوڑ کر جانا انھیں پسند نہیں تھا۔ طبیعت میں جو آسائش پسندی تھی اس کی وجہ سے نہ خود ہی پریشانی اٹھانا پسند کرتے اور نہ ہی کسی کو تکلیف دینا۔ مجھ سے اکثر کہتے ۔ " کیا لندن، کیا امریکہ ، اچھے ادب کا مطالعہ فلک کی سیر کرادیتا ہے۔ میڈم باوری کو پڑھو ، فلابیئر فرانس لیے لیے گھومتا ہے۔ تصور کی ان آنکھوں نے کیا کچھ نہیں دیکھا۔ ایران ، جدہ ، مدینے کی گلیاں ، اس طرح تصور کے ساتھ سیر کرو تو نقش گہرا ہوتا ہے۔ آنکھوں میں بھرلینے کے بعد ذہن آسانی سے فراموش کردیتا ہے ، لاپروا رہتا ہے۔"

ایک بار ہم لوگ اکیڈمی جارہے تھے۔ میں کار میں سر پر اوڑھے راستے میں کچھ پڑھ رہی تھی۔ انھوں نے سفر کی دعا پڑھی میں حیران رہ گئی۔ اس وقت پہلی بار معلوم ہوا کہ وہ روزانہ قرآن کی تفسیر پڑھتے ہیں اور تلاوت کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے حد محبت تھی۔ مومن کے معنی مکمل طور پر جان چکے تھے۔ حتی الامکان کوشش کرتے کہ کوئی غلط عمل جو ان کے علم میں ہو سرزد نہ ہوجائے۔ گناہ کبیرہ سے گھبراتے۔ امانتوں کا تصور اتنا گہرا تھا کہ خون بن کر رگوں میں دوڑتا۔ امانت کسی بھی شکل میں ہو کوئی جاگیر ، بچوں کی دولت ، بیوی کی محبت ، قرض ہو یا معمولی سا پین بھی ہو۔ اکثر اپنے صبر ، خواہشات کی تشنگی اور مومن کے عمل وغیرہ کو مدِ نظر رکھ کر ایک شعر پڑھا کرتے۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

مذہب اور دانش وری کے بارے میں لوگوں کے عجیب و غریب نظریے ہیں جو اپنے آپ کو دانش ور کہتے ہیں وہ خدا کے منکر ہونے کو ذہانت کا ثبوت مانتے ہیں۔ لوگوں نے مذہب کو اصولوں کو ضرورتوں ، لذتوں اور سہولتوں کے زاویوں میں ڈھال لیا ہے۔ سچا آدمی خود ہی سچا ہوتا ہے بغیر کسی بیساکھی کے اور ذہنِ انسانی کبھی اعلیٰ باتوں کو ماننے سے انکار نہیں کرسکتا۔ فخر کرتا ہے۔ ایک روز میں نے بتایا کہ کسی پارے کا ترجمہ پڑھتے ہوئے میرے دل نے بے اختیار چاہا کہ رسول اللہ صلعم کی ہر بات جانوں اللہ کو کئی بار سجدہ کروں۔ اس قدر بے چین ہو اٹھے کہ بار بار پوچھتے رہے " وہ کب محسوس ہوا ؟ کیسے پڑھا ؟ کون سی آیت تھی۔" اس کے بعد ایمان کے معنی اور کئی صفتیں سمجھا ڈالیں ، نفس کی آفتوں میں لذت طعام ، لذتِ نظر اور لذت کلام تینوں کو مانتے اور احتیاط برتتے تھے۔ مجھے بھی اگر حد سے گزرتے دیکھتے تو آگ بگولہ ہوجاتے۔ پھر وہ گھر ہو یا بازار ، دفتر ہو ، ادب کا کام ہو ، دین کا کام ہو کہتے کہ اگر سو فیصد دل اس طرف راغب ہوتو کام کیا جائے ورنہ دنیا کے بہت سارے سود مند کام ہیں جو

دنیاوی اعتبار سے بہت کچھ دے سکتے ہیں ۔ کسی بھی کام کے سلسلے میں ان کا خیال تھا کہ کوئی بہانہ کوئی رکاوٹ کام اگر کرنا چاہو تو نہیں ہوتی ۔ مشکلات کبھی راستہ مکمل بند نہیں کرتیں "چاہنا" یا "وِل" (Will) بہت ضروری ہے ۔ راستے بنے اور بنائے جاسکتے ہیں ۔ "ایک بار مجھ سے بولے ۔ "پائندگی کا شوق انسان کو زندہ رکھتا ہے اور موت کا خوف دلاتا ہے ۔ جو ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے اسے بہت سارے دلوں میں دھڑکنے والے کام کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ کسی ایک کا اس طرح ہوجائے کہ کوئی الگ نہ کرسکے ۔ پھر صدیوں تک ایک خیال سے دوسرے خیال کی طرح ایک ذہن سے دوسرے ذہن میں منتقل ہوتا رہے گا ۔ وقت کی طرح یہ سلسلہ بھی جاری رہے گا ۔ "

مجھے اچانک خیال آیا اور پوچھا ۔ "یہ خیال" اونا مونو کی اس کہانی کی طرح تو نہیں جہاں دور چوٹی پر وقت کی دیوی موسیقی چھیڑتی ہے ۔ پادری دریا کے کنارے کھڑا موت کے بعد زندگی کے موضوع پر باتیں کرتا رہتا ہے اور ۔ ۔ ۔ " پھر میں رک گئی یہ سوچ کر کہ ان کو غصہ نہ آجائے ۔ لیکن وہ مسکرائے اور بولے ۔ "محبت کرنے والا دل کے ذریعہ سوچتا ہے ، منطق ، داؤ پیچ تو فلسفیوں کا شیوہ ہے ۔ اس آسمان کے نیچے کوئی بات نئی نہیں ہے اور کوئی بات یا خیال پرانا بھی نہیں ہے ۔ اس بات کو فلسفے والوں سے زیادہ کون جانتا ہے ۔ "

اشارہ میری طرف تھا ۔

علم را برتن زنی مارے شود
علم را بردل زنی یارے شود

جہاں تک اس ناچیز کی سمجھ میں آتا ہے ۔ انسان اگر خود سے شرمندہ ہوئے بغیر اطمینان بخش زندگی گزار لے وہی منزل ہے ۔ یہ منزل ایک نہر ہے ۔ خاموش مسلسل بہنے والی نہر ۔ ذہانت ، علم ، تجربہ ، تجزیہ ، ان تمام سے گزرنے والا فلسفی ، شاعر ، عالم یا پھر ولی کہلاتا ہے ۔ بہت کم خوش قسمت انسان ایمان کو اپنی سانسوں میں محسوس کرتے ہیں ۔ زندگی ختم ہوجاتی ہے تلاش ختم نہیں ہوتی ، کوئی نتیجہ نہیں نکلتا ، ہمیشہ الجھے رہتے ہیں ۔ ایاز بھائی تقدیر والے تھے ۔ انھوں نے زندگی کی اہمیت جانی اور بتلائی بھی ۔

وہ ایک نتیجے پر پہنچ چکے تھے ۔ جب انسانی عقل کا ارتقا ہوتا ہے اور عقل و آگہی کی منزل اپنی انتہا کو پہنچتی ہے ۔ یہ وقت کسی انسان کی زندگی میں چالیس برس میں آتا ہے ، کہیں ستر برس میں ۔ ارتقا کی چوٹی کی اونچائی ہر انسان کی اپنی سوچ ، فطرت ، طبیعت ، تجربے اور تجزیے کے مطابق مختلف ہوتی ہے ۔ اس کا مطلب عظمت ، ذلت ، چھوٹے پن یا بڑائی سے نہیں ہوتا

بلکہ استطاعت کے مطابق وہ اس کا اپنا ہوتا ہے اور اپنی طرح کے ایک بڑے طبقے کو متاثر کرتا ہے ، منزل تک پہنچنے کے راستے ہموار کرتا ہے ۔ ایاز بھائی کا نظریہ بھی بن چکا تھا ۔ وہ روح اور ذہن کو ایک مانتے ہوئے بھی درمیانی راہ پر یقین رکھتے تھے ۔ اس طرح ہر معاملے میں کچھ دیر چلتے ، سمجھتے ، محسوس کرتے لیکن اس میں کھو کر فرائض کی فراموشی کے سخت خلاف تھے ۔ اپنی کم زوریوں سے بھی واقف تھے لیکن کبھی غلط کام کو صحیح نہیں بتایا ۔ مثلاً شراب پی کر بھی ہوش میں رہتے ۔ نشہ کے عالم میں کبھی کوئی نازیبا حرکت نہیں کی اور نہ ندامت اور پچھتاوے کا شکار ہوئے ۔ ہمیشہ سمجھاتے کہ کم زوری ، کم زوری ہے اور شراب ، شراب چاہے ہم ہوں یا کوئی اور کسی کے ذاتی شغل سے کوئی " حرام " عمل حلال نہیں ہوسکتا ۔ اور جائز کام کبھی ناجائز نہیں ہوتا ۔ بچوں کے راہ بر تھے ، دوست تھے ، لیکن سختی برتتے تھے ۔ یہی حال بیوی اور دوستوں سے تعلقات کا تھا ۔ کام چاہے کچھ بھی ہو اگر ہاتھ میں لے لیا تو مشکل سے مشکل کام بھی محنت اور محبت سے کرنا اور مکمل کرنا ان کا وطیرہ تھا ۔

انسانی ذہن کو سب سے بڑا عطیہ مانتے تھے ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم الجھنے نہ لگیں تو ان برقی تاروں کو جو ہر ذہن کو اس کی منزل تک پہنچنے سے روکتی ہیں الگ کردینا مشکل کام نہیں ہے ۔ وحدانیت کے تصور کو مکمل طور پر مانتے تھے بلکہ یہ ان کی شخصیت کا ایک حصہ تھا ۔ خدا کی باتیں ہمیشہ ایک ہی رہی ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ۔ اللہ کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو اپنے آپ کو سمجھنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا ۔ ہر ایک ہستی منفرد ہے لیکن وحدانیت کی لاعلمی کی وجہ سے بچھڑی ہوئی ہے اسی وجہ سے اصل کی طرف لوٹنے کو بے قرار اور بے چین ہے ۔ اور علم وسیلہ ہے منزل نہیں۔ عشق منزل کو قریب لاتا ہی نہیں بلکہ اصل میں روح بن جاتا ہے ۔

عقل کو کچھ نہ ملا علم میں حیرت کے سوا
دل کو بھایا نہ کوئی رنگ محبت کے سوا

ان کو اپنے آپ سے بے حد محبت تھی ۔ ان کا نظریہ تھا کہ جو خود سے محبت نہیں کرسکتا وہ کبھی کسی کا بھی نہیں ہوسکتا ۔ اپنے آپ سے بے انتہا محبت کرنے کے باوجود وہ خود کو زمین سے جوڑے رکھنے کے طریقے سے بھی خوب واقف تھے ۔ چھ مہینے پہلے مجھ سے کہا ۔ " ہم چاہے کسی کو گرنے سے کتنا ہی بچانا چاہیں ، لاکھ اصول بنادیں ، سہارے دیں ، ہر انسان خود اپنے تجربے کو اولین درجہ دیتا ہے ۔

خوب و ناخوب عمل کی ہو گرہ وا کیوں کر
گر حیات آپ نہ ہو شارحِ اسرارِ حیات

مغرور سمندر کی طرح پرشور، قلعے کی طرح مضبوط نظر آنے والا یہ شخص ایک گداز دل رکھتا تھا۔ کبھی کسی کو مایوس نہیں دیکھ سکنے والا، محبت کرنے والا، اور محبت کیے جانے والا ایک دریا تھا۔ ایسا دریا جو وقت اور دھڑکن بن کر کئی ذہنوں میں بہہ رہا ہے۔ عزیز احمد کی کتاب "جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" میں ایک جملہ ہے "اب سب کی یاد داشت شاہ کے ذہن کا ایک حصہ تھی"۔ مجھے بھی لگتا ہے وہ تمام لوگ، وہ تمام فن کار میرے ذہن میں زندہ ہیں جو ان کی یاد داشت کا حصہ تھے۔

جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہمہ خاکم کہ ہستم

oooooooo

ماہر منصور

اب اس کے بعد ہماری نوا ہے خاموشی

ایاز صاحب سے قریب ہونے کا موقع مجھے اس وقت ملا جب محمود ایاز کرناٹک اردو اکیڈمی کے صدر نام زد ہوئے ۔ اس وقت مجھے بھی اکیڈمی کا رکن بننے کا شرف حاصل ہوا ۔ اکیڈمی کا قیام در اصل ایاز صاحب کے ایما اور کوششوں سے ہی ہوا ۔ ان دنوں ان کے عزیز دوست آں جہانی دیوراج ارس کرناٹک کے وزیرِ اعلیٰ تھے ۔ ایاز صاحب نے ہی صدارت کے لیے حبیب تنویر کا نام تجویز کیا تھا ۔ وہ چاہتے تو پہلے صدر وہی بن سکتے تھے ۔ مگر "کچھ طبیعت ادھر نہیں آتی ہے" والا معاملہ تھا اور وہ منصب کے طلب گار بھی نہیں تھے ۔ جب اکیڈمی کا دستور بنانے کی تجویز ہوئی تو ایاز صاحب نے ہی دستور بنایا جو اتنا جامع ہے کہ آج تک اس میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ۔ سیاسی اتھل پتھل کے پیشِ نظر جب دیوراج ارس وزیرِ اعلیٰ کے عہدے سے مستعفی ہوگئے تو ایاز صاحب نے بھی اخلاقی طور پر اکیڈمی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا ۔ استعفیٰ دوسرے ہی دن دیا حالاں کہ دوسری اکیڈمیوں کے صدر اپنی کرسیوں سے چپکے ہوئے تھے ۔ صدارت پر بنے رہنے کی اپیل بھی کی گئی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے ۔ پھر سے جب صدارت کا عہدہ سنبھالنے کی پرزور درخواست کی گئی تو صدارت کی کرسی سنبھالی اور بہت سارے کارنامے انجام دیے ۔ ایاز صاحب پر یہ الزام تھا کہ اکیڈمی کی آڑ لے کر انھوں نے پبلیشروں سے ایسی قیمتی کتابیں خریدی ہیں جن کا کوئی خریدار نہیں اور وہ اتنی معیاری ہیں کہ عام قاری انھیں ہضم نہیں کرسکتا اور اس طرح اپنے ہی احباب کی کتابوں کی نکاسی اکیڈمی کی آڑ میں کروا رہے ہیں ۔ جب اکیڈمی کے اراکین نے ایاز صاحب سے گذارش کی کہ اخبارات میں ان الزامات کی تردید کی جائے اور مختلف منصوبوں کی تشہیر کروائی جائے تو اس کو سرے سے رد کردیا کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں ۔ اور یہ کہ خطوط بازی ایک گھٹیا حرکت ہے ۔

ایاز صاحب اکیڈمی کی کارکردگی میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے ۔ بہت سے وزیروں نے کئی بار روڑے اٹکانے کی بھر پور کوششیں کیں مگر ایاز صاحب چٹان کی طرح

ڈٹے رہے اور کہا کہ اکیڈمی کے دستور کے خالق ہونے کی حیثیت سے انھیں بہ خوبی اندازہ ہے کہ خود مختار اکیڈمی کے کیا اختیارات ہیں۔

جب ایاز صاحب اکیڈمی کے صدر بنائے گئے تو حکومت کی طرف سے ہر اکیڈمی کے صدر کو آمد و رفت کے لیے ماہانہ دو سو روپے منظور کیے گئے تھے۔ مگر ایاز صاحب نے یہ رقم کبھی نہیں لی۔ وہ اپنی کار میں آتے۔ تیزی سے فائلیں نپٹاکر تیر کی طرح نکل جاتے۔ جب بھی اکیڈمی کی میٹنگ ہوتی وقت سے پہلے پہنچ جاتے اور ٹھیک وقت پر میٹنگ کا آغاز ہوجاتا۔ کچھ ایسی حکمت عملی تھی ان کی کہ جن امور پر اختلافِ رائے کا امکان ہوتا یا جہاں بھی ان کی بات یا تجویز پر بحث کا امکان ہوتا ان امور کو ایجنڈا کے ابتدا میں رکھتے اور جو اراکین تھوڑی دیر سے آتے کفِ افسوس مل کر رہ جاتے تھے۔ مزید اصرار پر بھی کہ ان کے طے شدہ امور پر پھر سے گفتگو ہو اجازت نہیں دیتے تھے کہ "اب اس کا موقع نہیں رہا بحث اس قدر ضروری تھی تو وقت پر آنا چاہیے تھا۔" ایسی باتوں سے چند ایک اراکین ناراض تھے۔ مگر ایاز صاحب کو اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

پابندیِ وقت ان کی فطرت میں شامل تھی۔ اکثر کہتے کہ "خدا جانے لوگ کب وقت کی پابندی کرنا سیکھیں گے۔" جناب مظہر امید کی دختر اور جناب خلیل مامون کے برادر کی شادی کی دعوت پر وہ ٹھیک وقت پر محفلِ نکاح میں پہنچ گئے مگر ٹھیک بارہ بجے مجھ سے یہ کہہ کر نکل گئے کہ وہ مزید انتظار نہیں کرسکتے۔ نکاح خوانی میں ابھی تاخیر نظر آتی ہے میں چلوں گا ماہر یہ بند لفافہ میری طرف سے ان کو دے دینا۔

اشاعت کے لیے معیاری مسودات پر مالی اعانت دینے کے لیے جو ذیلی کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اس میں ، اور پروفیسر عبدالشکور تھے۔ ایک اہم میٹنگ میں شکور صاحب نہیں آئے۔ اب فیصلہ ہم دونوں کو مل کر کرنا تھا۔ ایاز صاحب نے مجھ سے پوچھا "ماہر تم نے مسودے پڑھ لیے ہوں تو اپنا انتخاب بتا دو۔" میں نے خلیل مامون ، اکرام باگ ، خالد سعید اور خلیل خاور کے نام لیے تو وہ فوراً مان گئے اور کہا کہ لو بھئی میرا انتخاب یہ ہے اور پھر انھوں نے نفیس بنگلوری ، فنِ خطاطی اور مولانا آزاد کے دو تین مسودے سامنے رکھے۔ اس طرح میٹنگ دس منٹ میں ختم ہوگئی۔ منتخب مسودوں کا اعلان ہوا تو اعتراضات کی بوچھار ہوگئی اور کہا گیا کہ "ایاز صاحب نے مسودے پڑھے ہی نہیں" یہ پڑھ کر ایاز صاحب چراغ پا ہوگئے کہ "ان جاہلوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم لوگوں نے ایک ایک لفظ پر توجہ دی ہے۔" وہ میرے انتخاب سے بے حد مطمئن تھے۔ مسودات پر مالی اعانت کے لیے یہ شرط تھی کہ

مسودے کے ساتھ کسی بھی پریس سے لیا ہوا تخمینہ منسلک کیا جائے ۔ چند ایک تخلیق کار ذاتی غرض کے پیشِ نظر تخمینے میں زیادہ رقم لکھوا کر لائے ۔ ایاز صاحب کو اس کا بہ خوبی علم تھا ۔ خود ہی کتابت ، کاغذ کی قیمت ، طباعت کے اخراجات ، جلد بندی کے اخراجات وغیرہ کا تخمینہ لگا کر اتنی ہی رقم منظور کرتے جس کا مسودہ مستحق ہوتا ۔ اس پر بھی کافی لے دے ہوئی اور یہ اعتراض کہ یہاں بھی ایاز صاحب اقربا پروری کا ثبوت دے رہے ہیں ۔ مگر ایاز صاحب نے کبھی اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی نہیں کی ۔ مشاعرے منعقد کروانا بالکل پسند نہیں تھا ۔ وہ لکھتے بھی کم کم ہی تھی ۔ میرے ایک سوال کے جواب میں کہ وہ آج کل لکھ کیوں نہیں رہے ہیں جواب دیا تھا کہ ماہر جس شخص کو پڑھنے کا شوق ہو وہ لکھنا چھوڑ دیتا ہے ۔ چلو اب بتاؤ میں لکھوں تو کس کے لیے لکھوں ، قاری کہاں سے لاؤں ۔ کوشش اس بات کی ہونی چاہیے کہ اردو کے قارئین کی تعداد بڑھے ۔ اس کے لیے تعلیمِ بالغان کا اہتمام جگہ جگہ ، ہر ضلع ، ہر گلی کوچے میں کرو ۔ میں اس کے لیے فنڈس مختص کروں گا ۔ "

انھوں نے کاتبوں کی قلت کے پیشِ نظر کتابت کے مراکز بنگلور ، گلبرگہ وغیرہ میں قائم کرائے ۔ نتیجتاً کچھ کاتبوں کی تربیت ہوئی اور آج وہ برسرِ روزگار ہیں ۔ اس سے ریاست میں کاتبوں کی ضرورت بھی کسی حد تک پوری ہوگئی ۔

اردو ڈرامہ کی طرف ان کی خاصی نظر تھی ۔ چاہتے تھے کہ ایک ڈرامہ ٹروپ تیار کیا جائے ۔ اردو کو عام سطح پر پہنچانے کے لیے موثر ذریعہ ڈرامے ہی ہیں ۔ اور ان کا یہ خواب اس وقت شرمندہ ، تعبیر ہوا جب ۱۹۹۴ ، میں اردو تھیٹر ٹرسٹ کا قیام عمل میں آیا ۔ اس ٹرسٹ میں ایاز صاحب کے ساتھ جناب خلیل مامون ، جناب عزیز اللہ بیگ ، مسٹر انل ٹھکر اور اندرا کدم تھیں ۔ اس ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام حبیب تنویر کا " آگرہ بازار " اسٹیج کیا گیا جو بے حد مقبول ہوا ۔

ریاستی اکیڈمیوں کے دیگر صدور کے ساتھ ان کے تعلقات برائے نام تھے ۔ کسی سے ملنا ، تبادلہ ، خیال کرنا وغیرہ پسند نہیں تھا ۔ ایک بار میری موجودگی میں ایک صدر اکیڈمی نے ایاز صاحب سے پوچھا :

Where are you Mr. Ayaz, You are not to be seen at all!!

تو ایاز صاحب نے فوراً جواب دیا :

"How can we meet we are moving in different orbits"

یہ سن کر موصوف اور میں بری طرح چونک پڑے تھے ۔ ایک بار ڈائرکٹر کنڑا اور کلچر نے تمام اکاڈمیوں کے صدور کی ایک میٹنگ بلائی ۔ ایاز صاحب اس میں نہیں گئے ۔

میں نے پوچھا تو کہا کہ - ڈائرکٹر کون ہوتا ہے مجھے بلانے والا - ہاں منسٹر بلائے تو میں جاؤں گا ۔
اور یوں بھی ہوا کہ جب منسٹر نے بھی بلایا تو ایاز صاحب نہیں گئے اور کہا کہ - مزید رقم
الاٹ کرنی ہو تو دوسری اکاڈمیوں کے برابر اردو اکاڈی کو بھی پورا پورا حق ملے کشکول لے کر جانا
مجھے پسند نہیں ۔"

ایاز صاحب چاہتے تھے کہ اردو اکادی کی الگ سے بلڈنگ ہو اس سلسلے میں ایک
وفد لے کر وہ اس وقت کے وزیر اعلیٰ شری ویرپا موئیلی سے ملنے گئے ۔ میں بھی ساتھ تھا ۔
جس ڈھنگ سے گفتگو کا آغاز ہوا ۔ وہ میرے دل پر نقش ہوگیا ۔ آغاز اس طرح سے کیا گیا ۔
- مسٹر موئیلی ، آپ کو اقلیتوں اور ان کی زبانوں کا محافظ کہا جاتا ہے ۔ اگر یہ سچ ہے
تو اردو اکادی کے ساتھ یہ زیادتی کیوں ؟ اس میں غیر متعلقہ لوگوں کی بے جا مداخلت ہو رہی ہے
اور آپ کو اس کی خبر بھی نہیں ہے ۔ خیر ۔ دو چار اہم باتیں ہیں آپ فوراً اس پر دھیان دیں " ۔
پھر آپ نے اردو اکادی کی ایک علاحدہ بلڈنگ یعنی اردو ہال کے لیے ایک خط ، اراضی کی
درخواست کی ۔ اس سلسلے میں دارالسلام کے پاس ایک سائٹ کی نشان دہی کی گئی ۔ باتیں ہی اس
ڈھنگ سے کیں ایاز صاحب نے کہ وزیر اعلیٰ نے فورا حامی بھری ۔ اور فوراً احکامات صادر کر
دیے کہ مذکورہ خط ، اراضی اردو ہال کے لیے منظور کرتا ہوں " ۔ مگر افسوس کہ بات آگے
نہیں بڑھی گو کہ اس ضمن میں خلیل مامون نے کافی ہاتھ پیر مارے ۔

اردو اکادی میں نایاب و کم یاب معیاری ادبی کتابیں اکٹھا کرنے کی تجویز ایاز صاحب
ہی کی تھی ۔ کہتے تھے - پوری ریاست میں بالخصوص بنگلور شہر میں حوالے کے لیے کوئی قابلِ
اعتماد لائبریری نہیں ہے ۔ اگر اردو اکادی بھی اس ضرورت کو محسوس نہ کرے اور ضرورت
مندوں کی پیاس نہ بجھائے تو اور کس سے رجوع کیا جاسکتا ہے ۔ "

اس کے بعد بہت سی کتابیں منگوائی گئیں جو اکادی کے کتب خانے میں آج بھی
موجود ہیں ۔ ایاز صاحب کو ریڈیو اور ٹی ۔ وی پروگرام دینا پسند نہیں تھا ، کہتے تھے کہ - مجھے
تشہیر یا نام و نمود کی خواہش نہیں ہے - اسی لیے انھوں نے اپنا مجموعہ ، کلام بھی شائع کرانا
پسند نہیں کیا ۔ کوئی تیس سال پہلے - سالار کے دفتر میں انھوں نے کہا تھا کہ - ماہر دیکھو میرے
پاس پریس ہے ۔ کراچی والوں نے بھی بار بار خواہش ظاہر کی ہے پھر بھی مجھے پسند نہیں کہ
مجموعہ ، کلام چھپے ۔ ویسے آپ جیسے لوگ اچھا کام کر رہے ہیں ۔ کرو ۔ میری دعائیں آپ لوگوں
کے ساتھ ہیں ۔ تمہارا مجموعہ ، کلام منظرِ عام پر آئے گا ۔ مجھے زیادہ خوشی ہوگی ۔ میں سمجھوں گا میرا
مجموعہ ، کلام چھپا ہے ۔ ایاز صاحب ہر دن اپنی ڈاک لینے اندرا نگر ڈاک خانے پر صبح نو بجے

تشریف لایا کرتے تھے ۔ اس کی اطلاع مجھے ایک دن پوسٹ ماسٹر نے دی ۔ میں ایک دن اس ڈاک خانے کے معائینے کے لیے گیا ہوا تھا ۔ اتنے میں ایاز صاحب تشریف لائے ۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی اور محکمہ ۔ ڈاک کی کار کردگی کی باتیں ہوئیں ۔ فاروقی صاحب کے بارے میں بھی پوچھا ۔ ڈاک خانے کے ملازمین ان کی بارعب شخصیت سے بے حد متاثر تھے ۔ بڑا ادب کرتے تھے ایاز صاحب کا ۔ "سوغات" کی کاپیاں وہ یہیں سے پوسٹ کرتے تھے اور میری کاپی پوسٹ ماسٹر کو دے کر چلے جاتے تھے ۔ اور میں رقم ڈاکیے کے ذریعے گھر پر بھجوا دیتا تھا ۔ "سوغات" کے آخری شمارے کی جلد پر ایاز صاحب نے پہلی بار میرا پورا پتہ لکھا ۔ وہ جلد انشاء اللہ میرے پاس ان کی یادگار بن کر رہے گی ۔ ایک ملاقات میں ایاز صاحب نے کہا تھا کہ انھیں "ایسا کوئی دن یاد نہیں جس میں انھوں نے پانچوں وقت کی نمازیں ادا کی ہوں ۔ " لیکن حضرت سلیمان ندوی کے انتقال پر ان کی جو ریڈیائی تقریر بنگلور سے نشر ہوئی تھی وہ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے ۔

کہا تھا کہ "وہ جب بھی مایوس اور پریشان ہوجاتے ہیں تو "سیرۃ النبی" کا مطالعہ شروع کردیتے ہیں تو دل کو تسلی ملتی ہے ۔ جب وہ بیمار ہوئے تو غالباً ۱۳ مارچ کو میں ان کے گھر گیا ۔ دوپہر کا وقت تھا ۔ نوکرانی نے بتایا کہ صاحب نے ابھی ابھی انجکشن لیا ہے ۔ میں لوٹنے ہی والا تھا کیا دیکھتا ہوں کہ صدر دروازے پر ایاز صاحب کھڑے ہیں ۔ "کیسے ہو ماہر ؟" (ہمیشہ ایسے ہی مخاطب ہوتے تھے) میں نے انھیں دیکھا تو حیران رہ گیا ۔ میرے سامنے ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا اور بس میں خود کو سنبھال ہی رہا تھا کہ ایاز صاحب نے مصافے کے لیے حسبِ عادت ہاتھ بڑھایا اور کہاکہ ڈاکٹر صاحب نے ابھی ابھی انجکشن دیا ہے اور انھیں فوراً لیٹ جانا ہے اور کہا ۔

I am feeling bad, I can not stay with you, you come in the evening

میری آنکھیں ڈبڈبانے لگی تھیں ۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا اور انشاء اللہ کہہ کر چلا آیا ۔ اور وہ شام پھر کبھی نہیں آئی ۔ ایاز صاحب کے انتقال کی خبر خلیل ماموں صاحب نے مجھے گھر پر دی ۔ کوئی ساڑھے تین کے قریب ۔ میں گھر پر نہیں تھا ۔ کوئی پانچ بجے کے قریب مجھے پتہ چلا تو میں فوراً ایاز صاحب کے گھر گیا ۔ اسی وقت ان کی میت منی پال ہسپتال سے گھر لائی گئی تھی ۔ تھوڑی دیر کے بعد اندر آنے کی اجازت ملی تو سب سے پہلے ایاز صاحب کو دیکھنے کا موقع مجھ بدنصیب کو ملا ۔ خواب گاہ میں لیٹے ہوئے ان گنت کتابوں کے درمیان ایک پراسرار مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے ہوئے ۔ اس رات ان کی نمازِ جنازہ میں شریک

ہونے کا شرف بہت کم احباب کو ملا ۔ اکثر لوگوں کو ان کے انتقال کی خبر دوسرے دن ملی ۔ ان کی تدفین قدوس صاحب قبرستان میں عمل میں آئی ۔ ان کے عزیز دوستوں میں خلیل مامون ، حبیب احمد ، منظور احمد ، ضیامیر ، علی حفیظ ، مظہر امید اور عزیز اللہ بیگ کے علاوہ کچھ اردو صحافی اور افرادِ خاندان اور میمن برادری کے کچھ لوگ موجود تھے ۔ اس عظیم شخصیت کو سپردِ خاک کر کے لوٹتے وقت بار بار میرے ذہن میں ان کے یہ اشعار گونج رہے تھے :

تمام مرحلے صوت و بیاں کے ختم ہوئے
اب اس کے بعد ہماری نوا ہے خاموشی

☆ ☆ ☆

جلالِ شامِ ابد ، اے جمالِ صبحِ ظہور
ترے ہی پرتوِ روشن سے مہر و ماہ میں نور

☆ ☆ ☆

تجھی کو ڈھونڈنے نکلا تھا شوقِ آوارہ
تجھی پہ ختم ہوئی آرزوئے نظارہ

☆ ☆ ☆

یاد رکھو تو دل کے پاس ہیں ہم
بھول جاؤ تو فاصلہ ہے بہت

ان کی قبر پر جو کتبہ لگا ہے اس میں سورہ ۔ فجر کی آیت کندہ ہے جو ایاز صاحب کے نفسِ مطمئنہ اور ان کی زندگی کے بارے میں ہر ایک کو سوچتے رہنے پر اکساتی رہتی ہے ۔

○○ ○○○ ○○

سید منظور احمد

بند آنکھوں میں ہیں نادیدہ زمانے پیدا

عہدوں اور منصبوں سے اعزاز وہ حضرات حاصل کرتے ہیں جن کے پاس اپنی کوئی ذاتی قابلیت اور صلاحیتیں نہیں ہوتیں ۔ محمود ایاز صاحب کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن سے وابستہ ہوکر عہدے اور منصب معزز اور معتبر ہوجاتے ہیں اور ان سے دور ہوکر اپنا وقار کھودیتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ محمود ایاز صاحب کو حکومت کرناٹک نے تین مرتبہ اردو اکادمی کا صدر نامزد کیا ۔

ایاز صاحب تیسری بار اکادمی کے صدر مقرر کیے جارہے تھے تو میں نے اس ضمن میں اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ بنگلور اور گلبرگہ کے اردو اساتذہ ماضی میں اکادمی کے صدر رہ چکے ہیں لہذا محمود ایاز کی بجائے ریاست کرناٹک کی سب سے قدیم یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو اور پروفیسر کو اکادمی کا صدر نامزد کیا جانا چاہیے ۔ اس ضمن میں اخباری بیان بھی جاری کیا گیا وزیر برائے کلچر اور وزیراعلیٰ کو خطوط بھی لکھے گئے مگر محمود ایاز صاحب کی شرافت اور اعلیٰ ظرفی دیکھیے کہ اس قدر مخالفت کے باوجود انھوں نے میرا نام اراکین کی فہرست سے خارج نہیں کیا جب متعلقہ وزیر نے تمام اراکین کو بدلنے پر زور دیا تو مرحوم نے میرے حق میں ایک پر زور سفارشی خط لکھا اور نہ صرف میری رکنیت بحال رکھی بلکہ اکادمی کی کئی اہم کمیٹیوں میں نام زد بھی کیا، نیز میرے مشوروں کو اکادمی میں شرف قبولیت بھی بخشا ۔

مشاعروں کی اہمیت اور افادیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا مگر ایاز صاحب مشاعروں کے مخالف تھے ۔ معلوم نہیں کیا بات تھی ۔ جب اکادمی میں مختلف پروگرام زیر بحث ہوتے تو کہا کرتے تھے کہ مشاعرے کے علاوہ کوئی بھی پروگرام بنائیے ۔ اور خود بھی بڑے بڑے مشاعروں کے دعوت ناموں کو رد کر دیتے ۔ تقاریب میں بھی شاذو نادر ہی شریک ہوتے تھے ۔ ۱۹۸۹ء میں ریاستی حکومت نے آپ کو راج اتسو ایوارڈ کے لیے منتخب کیا ۔ تقریب میں ایوارڈ ریاستی گورنر پیش کرنے والے تھے ۔ حسن اتفاق سے میں بھی اس تقریب میں شریک تھا مگر ایاز صاحب کو تقریب میں آکر ایوارڈ لینا منظور نہیں تھا ۔ وہ نہیں آئے ۔ بعد میں خلیل مامون نے بتایا کہ ایاز صاحب نے تقریب میں شرکت کرنے سے انکار کردیا ہے کیوں کہ انھیں گوارا نہیں کہ وہ ایوارڈ حاصل کرنے ہال میں پہلے سے جاکر بیٹھے رہیں اور بعد میں کوئی مہمان

خصوصی آکر ایوارڈ دے ۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ مہمان خصوصی پہلے آئے اور ایوارڈ لینے والے کا استقبال کرے ۔ اطلاعاً عرض ہے کہ بعد میں خود محکمہ کنڑا اور کلچر کے ڈائیرکٹر نے یہ ایوارڈ محمود ایاز صاحب کو ان کے دولت خانے پر جاکر پیش کیا ۔ میرے خیال میں اس طرح ایوارڈ لینے والے ادیبوں اور مشاہرین میں محمود ایاز اول و آخر ہیں ۔

ماریشس میں پہلی اردو کانفرنس منعقد ہوئی تو ایک سرکاری وفد ہندوستان سے گیا اس وفد میں شمولیت کے لیے بعض ادیبوں نے جس طرح کی دوڑ دھوپ کی اس کا اندازہ بہت کم لوگوں کو ہوگا ۔ کانفرنس کے میزبان ایاز صاحب کے دوستوں اور قدردانوں میں تھے ۔ ان کا اصرار تھا کہ ایاز صاحب اس یادگار کانفرنس میں ضرور شرکت کریں ۔ اس تعلق سے ایاز صاحب کو خطوط لکھے گئے ۔ اس وقت آپ اکادمی کے صدر تھے ۔ حکومت کرناٹک کی طرف سے بھی درخواست کی گئی تھی کہ آپ کانفرنس میں ضرور شرکت کریں اور ریاست کی نمائندگی کریں ۔ سکریٹری برائے کلچر کی طرف سے تمام ضروری کاغذات اور باقاعدہ دعوت نامہ رجسٹرار کے ذریعے روانہ کیا گیا لیکن جب کاغذات آپ کے پاس آئے تو آپ نے ان پر لکھا ۔ "File and forget" ان کا یہ رویہ دیکھ کر افسرانِ اعلیٰ لاجواب رہ گئے ۔ اکادمی کے خلاف کبھی معترضانہ مراسلے اخبارات میں شائع ہوتے تو ان کے تراشے رجسٹرار اکادمی ایاز صاحب کو روانہ کردیتے اور آپ بڑی شانِ بے نیازی سے ان پر لکھ دیتے تھے کہ "Throw it in the nearest dust bin"

اردو ادب میں عزیز احمد بڑی ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں ۔ ناول ، افسانے شاعری ، تاریخ ، تنقید ، تراجم آپ نے کیا کیا نہیں لکھا ۔ اسی طرح ن ۔ م ۔ راشد اہم ترین جدید شاعر ہیں ۔ ایاز صاحب کی سرپرستی میں اردو اکادمی کے زیرِ اہتمام عزیز احمد اور راشد پر ایک سمینار بنگلور میں منعقد ہوا ۔ اس یادگار اور تاریخی سمینار کی مخالفت بڑے زور و شور سے ہوئی

اس تعلق سے ان قوتوں نے مقامی غنڈوں کو سمینار میں گڑبڑ پیدا کرنے کے لیے نہ صرف اکسایا بلکہ اردو کے مقامی ادیبوں ، شاعروں اور کنڑی دانوں کو بھی اس کے خلاف بھڑکایا نیز انٹلی جنس انکوائیریاں بھی کروائیں ۔ مگر ایاز صاحب نے اس کی پروانہ کی ۔ ان مفاد پرست عناصر نے اس سیمینار کی مخالفت محض اس بنیاد پر کروائی کہ عزیز احمد اور راشد پاکستانی ادیب ہیں ۔ شاعروں اور ادیبوں میں عالمانہ انکساری و بے نیازی ہونی چاہیے ۔ دورِ حاضر میں اس کا بڑا فقدان ہے ۔ مرحوم میں یہ دونوں صفات بہ درجہ اتم موجود تھیں ۔ مگر ایسی وضع دار شخصیت ، کے بارے میں اکثر عجیب و غریب حملے ہوتے تھے ۔ "عجب لوگ ہیں جیتے جی مرگئے ہیں بڑے مغرور ہیں ، کسی سے ملنا پسند نہیں کرتے" "اپنے آگے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے" وغیرہ

میرا خیال ہے کہ ان باتوں میں صداقت کم اور مبالغہ زیادہ ہے ۔ ایاز صاحب ، گھر پر جو مہمان آتا اس کا استقبال کرتے اور بہ وقت روانگی صدر دروازے تک پہنچ کر الوداع کہتے ۔ دوستوں کے دکھ درد میں برابر کے شریک ہوتے ، ان کی دل نوازی اور مہمان نوازی کو اپنا فرض سمجھتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جمال بھی تھا اور جلال بھی ۔ محمود ایاز ، اگر کسی پر بگڑتے تو ایسا بگڑتے کہ اللہ کی پناہ لیکن کبھی کسی کو نقصان نہ پہنچاتے ۔ ان کے دوست ان کو بارہا دلی ، بمبئی ، علی گڑھ ، لکھنؤ وغیرہ مدعو کرتے تو کہتے " میرا شہر آپ کے شہر سے زیادہ خوب صورت اور دل کش ہے میں کیوں باہر جاؤں ؟ سفر شاذ و نادر ہی کرتے ۔ ایاز صاحب ادب کے رسیا اور اچھی کتابوں کے عاشق تھے ۔ اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی پر بھی عبور تھا ۔ ان کو نثر و نظم دونوں پر قدرت حاصل تھی ۔ ان کی شاعری ہمارے کئی اہم شاعروں کی تخلیقات کی ہم پلہ ہے ۔ وہ جذبی اور مجروح کی طرح کم سخن ، کم گو اور کم آمیز شاعر تھے ۔ ملک کے نام ور ناشروں نے ان کا شعری مجموعہ شائع کرنے کی پیش کش کی مگر مسودہ حاصل کرنے میں ناکام رہے ۔ شاہد علی خاں صاحب نے مجھ سے کہا کہ اگر آپ کسی طرح ان کا شعری مجموعہ مجھے حاصل کرکے روانہ کردیں تو مکتبہ ، جامعہ سے شائع کروادیں گے ۔ مگر محمود ایاز صاحب نے کبھی اسے قبول نہیں کیا اور یہی کہتے رہے بہ طور صدر اکادمی میں مکتبہ ، جامعہ اور دیگر مکتبوں سے کتابیں خریدتا ہوں ایسی صورت میں انھیں اپنا مسودہ نہیں دے سکتا ۔

خلیل مامون صاحب سے معلوم ہوا کہ ایاز صاحب نے اپنی وفات سے پندرہ دن قبل اپنے مجموعہ ، کلام کا مسودہ انھیں اس وقت دیا جب انھیں یہ یقین ہو چلا تھا کہ وہ اب صرف کچھ ہی دنوں کے مہمان ہیں ۔ بالآخر ان کی یہ ضد پوری ہو گئی کہ ان کی زندگی میں ان کا مجموعہ ، کلام نہیں چھپے گا ۔ اور محمود ایاز بند آنکھوں میں نادیدہ زمانے لیے ہوئے کھلی آنکھوں والے اس جہاں سے کوچ کر گئے ۔

OO OOO OO

سید حبیب احمد

محمود ایاز ـــــ شخصیت اور فن

ایاز کو پہلی بار میں نے مجلسِ ادب بنگلور کے ماہانہ جلسے میں دیکھا اور سنا۔ ۱۹۵۷ء کی بات ہے میری ملازمت بنگلور میں تھی۔ کسی اتوار کی صبح میر ضیاء اللہ مجھے جلسے میں لے گئے، وہی میر ضیاء اللہ جو ضیامیر کے نام سے برسوں روزنامہ "سالار" کے ادبی ایڈیٹر رہے۔ جلسے میں مقامی نوجوانوں نے اپنا اپنا شعری و نثری کلام پیش کیا جسے سامعین نے طوعاً و کرہاً پسند کیا۔ وہی عصرِ حاضر کے چالو فقرے تھے۔ ثقیل الفاظ کے ناموزوں استعمال سے سامعین پر رعب گانٹھنے کی کوششیں تھیں۔ اقتصادیات سے بے بہرہ مگر مزدور، سرمایہ دار، تقسیم زر پر رائے زنی تھی۔ کوئی صاحب خدا سے بھی دست و گریباں تھے۔ ایاز نے ایک غزل سنائی جو مسالے دار تو نہیں تھی لیکن ویسی متاثر کن بھی نہیں تھی۔ حاصل جلسہ میر ضیاء اللہ کا فراق گورکھپوری پر مضمون تھا۔ مضمون محمود ایاز کو پسند آگیا تو دوسرے دن میر ضیاء اللہ سے واقفیت پیدا کی، ملتے رہنے کا وعدہ لیا اور دو ملاقاتوں میں ضیامیر کے ان دوستوں سے بھی ملنے کا اشتیاق ہوا جنھیں ادب سے تھوڑی بہت دل چسپی تھی۔ یہ راکھ میں دبی چنگاریاں ڈھونڈنے کا شوق بچپن سے ہے ذہن کی کوئی جودت، شخصیت کا کوئی پہلو دل کو پسند آگیا تو ان سے اٹوٹ رفاقت، ان کی ضرورتوں کا خیال، ان کے دکھ سکھ میں شرکت، ان کی بیماریوں کا علاج اور یہ سب ایسی لگن اور انہماک سے گویا دوست نہ ہوئے خون کے رشتے سے بندھے اقربا ہوئے۔ اور پھر ان میں سے کوئی رخصت ہوگیا تو اس پر نوحہ کناں ہونے، اس کے ساتھ بتائی ہوئی خوشی اور غم کی گھڑیوں کی یاد کو دل سے لگائے رکھنا گویا جانے والے کے ساتھ زندگی کا وہ حصہ بھی مر گیا ہو جو اس کی رفاقت میں گزرا۔ یہ ہے وہ اسوہ جس نے ایاز کو درد بھرا دل دیا، دل پر زخم کھانے کی صلاحیت دی، زخم کو ہرا رکھنے کا حوصلہ دیا، اس خوش فہمی کے ساتھ زخم کے بھرنے تلک ناخن بڑھ بھی آتے ہیں۔ کچھ دن بعد ایک شام ضیامیر مجھے ایاز کے یہاں لے گئے کہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میرے متعلق کہا گیا تھا کہ علامہ اقبال کا مداح ہوں۔ رسمی باتوں کے بعد اقبال پر رائے زنی ہوئی جو میری عقیدت کو مجروح کرنے والی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ہماری طبیعتوں میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی بلکہ بعد المشرقین تھا۔ میں خاموش اور کم گو، ایاز میں اپنی بات کو منوانے کی قدرت، میرے عقائد ٹھوس تقلیدی، ایاز میں آزاد خیالی جو جدو کرشن مورتی کی دین تھی۔

لتنے میں اندر سے ایک صاحب سینی میں چائے کی پیالیاں سجا لائے ۔ شرعی کاٹ کا سفید کجلایا ہوا پاجامہ ، بسکٹ رنگ کی بند گلے والی پورٹ آستینوں کی قمیض ، کاندھے پر سفید تولیہ جو جھاڑن کی طرح استعمال ہوا تھا ، سر پر کالی مرزا ٹوپی ، کمالِ ادب سے تپائی پر سینی رکھی جہاں ایش ٹرے میں ہمارے ادھ جلے سگریٹ دھرے تھے اور نیچی نظروں کے ساتھ پلٹ کر چلتے بنے ۔ بعد میں ضیامیر سے معلوم ہوا کہ وہ حمید سیٹھ تھے محمود ایاز کے والد بزرگوار ، جو ان کی والدہ کے انتقال کے بعد ان کے سب کچھ تھے ۔

اس برادری کا فرد بن جانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ حمید سیٹھ سے زیادہ پیاری اور قابلِ احترام شخصیت اور کوئی نہیں تھی ۔ ایاز انھیں سیٹھ پکارتے اور برادری کا ہر فرد انھیں سیٹھ ہی کہتا تھا ۔ شفیق باپ ، ناصح بزرگ اور بے تکلف دوست کسی ایک ہستی میں جمع ہو سکتے ہیں تو وہ اعجاز کم از کم میرے تجربے میں حمید سیٹھ کی ذات میں اپنے کمال کو پہنچ کر ختم ہو گیا تھا ان کی شفقت اپنے بیٹے سے کہیں زیادہ اس کے دوستوں کے لیے تھی بلا اس تفریق کے کہ کون ملاقاتی ہے ، کون شناسا ہے اور کون گہرا دوست ہے ۔ ان کے حضور ہر کوئی اپنے آپ کو اس شفقتِ محیط سے نہال اور مامون پاتا تھا ۔ دشمنی تو بعید از قیاس شاید ہی وہ کسی پر غصہ ہوتے ہوں ان کے ساتھ رہ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم سب سادہ اور پاکیزہ زندگی سے معصوم بچوں کی طرح چھوٹی چھوٹی خوشیاں بٹورنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں ۔ کبھی کسی کو نصیحت کرنا ہوتا تو لگتا گویا اتفاقِ رائے سے کوئی قرار داد پیش کر رہے ہوں ۔ محبت کی فراوانی اور بے تکلفی کی انتہا کے باوجود کسی سے ان کی بزرگی کی ارزانی نہیں ہو سکتی تھی ۔ سب کا ان سے لاڈ پیار کا رشتہ تھا ۔ والد اللہ تعالیٰ کی دین اور اولاد کا مقسوم ہوتے ہیں ۔ کتنے خوش نصیب ہوں گے وہ بچے جن کے باپ حمید سیٹھ جیسے ہوں ۔

ایاز کی زبانی ان کی جباری و قہاری کے قصے سن کر یقین کرنے کو جی نہیں مانتا ۔ کاٹھیواڑ سے ہجرت کر آئے ہوئے کچھی میمن سیٹھوں کے فرد ، تقسیمِ ہند کی ۱۹۴۷ء والی قیامت صغریٰ سے گھبرا کر نقلِ مکانی کی ناکام کوشش میں لٹ پٹ کر اپنی تمام امیدوں آرزوؤں کو نذر قیامت کر کے صرف ایک تمنا کو دل میں لیے جیے جا رہے تھے کہ ان کے دو لڑکے کچھ تو تجارت کے گُر حاصل کر لیں ، ہم چشموں میں کسی کے دست نگر نہ ہوں بلکہ بہ فضلِ الٰہی برادری میں وہی ساکھ قائم کریں جو خاندان میں قیامت صغریٰ سے پہلے کیش بازار کے نام سے مشہور تھی ۔ چھوٹے صاحب زادے غلام حسین تو ابھی تعلیم حاصل کر رہے تھے ۔ بڑے محمود سیٹھ کو حصول تعلیم سے ہٹا کر دکان میں بٹھاؤ تو ان کا من بہی کھاتوں میں لگنے کے بجائے گئے گزرے شعرا کے دواوین میں کھویا رہتا ۔ بیوپار کے وقت صاحب زادے ادبی کتابوں کی ورق گردانی میں خود فراموشی کی منزلوں میں ہوتے ۔ تاجر قوم کے لیے تو یہ زہرِ ہلاہل ہے ۔ لاکھوں جتن سے سنبھالی

ہوئی تمنا کا خون ہوتے ہوئے کون دیکھ سکتا ہے۔ کتابیں اٹھا کر راستے پر اس طرح پھینکیں کہ اوراق پارہ پارہ ہو جائیں یہ سینہ کا ہاتھ لگنا دشوار ہو گیا۔ یہ استبداد، جباریت و قہاریت نہیں تو کیا ہے۔ دراصل یہ تو خول تھا جو ایاز کی والدہ کے رہنے تک چڑھا رہا اور ان کی رحلت پر ٹوٹ کر پارہ پارہ ہو گیا اور اندر سے وہ شخصیت نکھر آئی جو سراپا رحمت و شفقت تھی اور اس شدت کے ساتھ کہ اولاد کو بھی یہ محسوس ہو گیا کہ اصلیت نقلی خول کے گھٹن کی تلافی کر رہی ہے۔ اور شاید حمید سیٹھ صاحب نے بھی محسوس کر لیا ہو کہ ان کے صاحب زادے میں وہ قدر موجود ہے جس کے بل پر کوئی بھی شخص کامیاب زندگی بسر کر سکتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی سے کسی نے پوچھا کہ اتنے اچھے افسانے کیوں کر لکھ لیتے ہو تو ان کا جواب تھا کہ یہ پنجاب کی دین ہے۔ اکثر پنجابی اچھے کاریگر ہوتے ہیں۔ زندگی کا کوئی بھی کام کیوں نہ ہو پنجابی کے خون میں یہ بات ہوتی ہے کہ چاروں کونوں کے پیچ مضبوطی سے کس لیتا ہے۔ محمود ایاز کو بھی ایک زریں اصول شاید کچھی میمن تاجر قوم سے ورثے میں ملا ہے وہ یہ کہ جیسے ہر کھیل کے چند قوانین اور کھیلنے کے طریقے ہوتے ہیں ویسے ہی زندگی کے ہر کام کے کرنے کے بھی چند ضوابط ہوتے ہیں۔ کامیابی شرط ہے تو چاہیے کہ آدمی ماہر کھلاڑی کی طرح ان قوانین اور ضابطوں پر سختی سے کاربند رہے۔ شاید یہ جان کر ہی حمید سیٹھ اپنے آخری دنوں میں ایاز سے بالکل مطمئن تھے۔

میری اور ایاز کی ملاقات کے دوسرے ہفتے میر ضیاء اللہ ایاز کو لے کر شیموگہ ڈسٹرکٹ میں ہنالی گئے، عبدالحمید خاں سے ملانے۔ حمید خاں، ضیامیر کے ہم سبق اور میرے کالج کے ساتھی تھے۔ ہنالی میں اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر تھے، بسیار پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ اچھے استاد، کھرے آفیسر، اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے اور اچھے شعر فہم تھے؛ اچھی آواز کے مالک اور موسیقی کی جان کاری رکھتے تھے۔ موسم خوش گوار ہو یا حالات ساز گار ہوں، بغیر درخواست کے اور بلا موقع و محل گانے لگتے ان کے شوق کی تسکین ہونے تک۔ سامعین اس قدر محظوظ ہوتے کہ لامحالہ مزید سنانے کی درخواست کرتے اور وہ کبھی مایوس نہ کرتے تھے۔ ان تمام پہلوؤں سے بالا ان کی شخصیت کا ایک ہمہ گیر پہلو یہ تھا کہ اچھے دوست تھے۔ ایسے دوست جس پر دوستی کو ناز ہو۔ یار باش آدمی تھے۔ دوست ہی ان کے لیے سب کچھ تھا؛ دوست کے آگے دنیا کی ہر چیز ہیچ تھی۔ بھانت بھانت کے لوگوں سے دوستی تھی۔ کبھی دوستی میں درجے مقرر نہیں کیے۔ ہنالی میں تھے تو ہنالی کو جانے والی موٹر میں بیٹھے ہوئے کسی بھی شخص سے ذکر کریں تو کہتا "ہاں! وہ تو میرے دوست ہیں؟"

کہاوت ہے کہ "دوست ملتے نہیں بنائے جاتے ہیں" لیکن ایاز کا یہ اعتراف ہے کہ حمید خاں انھیں بنے بنائے مل گئے۔ پہلی ہی ملاقات میں علیک سلیک کے بعد دوسری بات جو آپس میں ہوئی وہ ایسی تھی گویا دونوں لنگوٹی یار اور دانت کاٹے روٹی میں مشترک ہیں۔ ایک

دوسرے کے لیے جاں سپاری کا جو جذبہ تھا قابلِ دید احساس تھا ۔ بعض معاملات میں یہ کہنا مشکل ہوجاتا ہے کہ دونوں میں کون محمود اور کون ایاز ہے جو بھی اپنے آپ کو ان دونوں میں سے کسی ایک کے محبوبِ نظر ہونے کے مستحق و مجاز سمجھتے تھے ان کا حسد و جلن کا شکار ہوجانا بعید از قیاس تجربہ نہ تھا ۔ ہر دوسرے، تیسرے ہفتے حمید خاں صاحب ہنالی سے تقریباً دو سو میل کا سفر طے کر کے بنگلور چلے آرہے ہیں کہ بھئی ایاز سے ملنے کا من ہوا، یا کسی انجانے شاعر کا بالکل اچھوتے خیال کا شعر پسند آگیا اور اسے محمود ایاز کو سنانا چاہا ۔

ایاز کے ایک پرانے دوست محمود شریف پہلے سے موجود تھے ۔ معلوم ہوا کہ ان کی شناسائی اور دوستی بھی اسی طریقے سے ہوئی تھی ۔ ایاز نے انھیں شعر کہنے پر اکسایا ۔ شعر کہتے تھے اور مشاعروں میں کافی داد پاتے تھے ۔ اکثر مشاعروں میں اپنی شاہ کار نظم "ماں" کے عنوان سے پڑھتے تھے جو

"ماں! ترے خواب کی تعبیر ہی الٹی نکلی ۔ ۔ ۔

کے الفاظ سے شروع ہوتی تھی ۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے مشاعرے میں شعر سنانے وہ ڈائس پر آتے سامعین آواز دیتے "ماں" ۔ بنگلور کے مقیم ہونے کی حیثیت سے انھیں ایاز کی ان صحبتوں میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا جو ہند و پاک کے مشاہیر قلم کاروں کے ساتھ گزری تھیں ۔ اس بنا پر وہ محمود ایاز کے سوانح لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے ۔ شروعات بھی کی تھی لیکن حیات نے مزید مہلت نہ دی ۔ کوئی انھیں مستند شاعر گردانے یا نہ گردانے طبیعت شاعرانہ پائی تھی ۔ زندگی کے ہر بڑے چھوٹے فعل و عمل یا حادثے میں شعریت کا عنصر انھیں ضرور نظر آتا ۔ غم و الم کے واقعات میں ظرافت کا پہلو، دل لگی میں انتہائی سنجیدہ کام کی بات، معمولی انسانوں کے روز مرہ کی حرکات و سکنات میں تعجب، حیرت اور ضبطِ غم و غیض کے بھاؤ انھیں بغیر سعیِ غور و خوض مل جاتے ۔ اہلِ نظر کئی حالات، واقعات و شخصیتوں کے نزدیک سے بغیر دیکھے گزر جاتے ہیں ویسی ناقابلِ نظر و قابلِ فراموش چیزوں میں نکتہ ۔ نظر پاجانا اور ان پر منطبق پھبتی کسنا یا پھڑکتی ہوئی تشبیہہ دینا محمود شریف ہی کا حصہ تھا ۔ مجھے اس کا افسوس نہیں کہ انھوں نے ایاز کے سوانح نہیں لکھے بلکہ ان معمولی اور غیر اہم باتوں کے کھوجانے کا قلق ہے جو صرف ان ہی کے مشاہدے سے اہمیت پاتیں ۔

۱۹۵۸ء میں میرا تبادلہ ٹمکور کا ہوگیا اور حمید خاں صاحب کا ہنالی سے میسور ۔ میں نہ تین میں نہ تیرہ میں پتہ نہیں کیوں کر اس زمرے میں شمار ہونے لگا ۔ لمحہ بھر کے لیے بھی مجھے یہ احساس ہوتا کہ ہر کوئی جبراً مجھے برداشت کر رہا ہے تو شاید میں کنارہ کش ہوجاتا ۔ یہ ان کی فراخ دلی ہی تھی کہ کبھی مجھے یہ احساس ہونے نہیں دیا ۔ بلکہ ہر نشست، ہر محفل اور ہر معاملے میں میری حاضری ناگزیر سمجھی جانے لگی ۔ وجہ ؟ کسی کو خبر نہیں ۔ محمود شریف کا مشاہدہ تھا کہ

جب کسی شعر پر بحث ہوتی ہے تو اس کے حسن و قبح کا اظہار کرتے ہوئے اوروں کی طرح مجھ پر بھی بے سبب نشہ سا طاری رہتا ہے ۔ اوروں نے بھی حامی بھری شاید اسی سبب میں بھی اس برادری کا فرد بن گیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب کبھی چھٹیوں میں بنگلور آنا ہوتا تو کشاں کشاں نمبر ۲۷ کلائن روڈ پر جہاں ان دنوں ایاز کا گھر تھا پہنچ جاتا اور وہاں بلا ناغہ ساری برادری کو موجود پاتا چھٹیاں ختم ہونے تک وہیں محبوس ۔ پتہ نہیں ہر کسی کی چھٹی ہوتی تھی یا نہیں ۔ یوں لگتا تھا چھٹی ملازمت ہی سے نہیں دنیا کے ہر کام سے مل گئی ہو ۔ مجبوراً آنگن میں نکل کر سورج بھی دیکھنا پڑتا تھا کیوں کہ بیت الخلاء آنگن کے ایک کونے میں تھا ۔ سیٹھ ایک خادمہ کی مدد سے کھانا تیار کرتے ۔ ان کے مچھلی پلاؤ اور حلیم کا جواب نہیں ۔ ہم کھاتے اور محفل پر محفل جماتے ۔ کبھی کبھی بے وقت سونا بھی پڑتا تھا اس لیے کہ نیند تو سولی پر بھی پیچھا نہیں چھوڑتی ۔

ایسی ہی ایک چھٹی میں بنگلور آیا تو ہمیشہ کی طرح ساری برادری کو موجود پایا ۔ دو افراد زیادہ بھی تھے ۔ وہ تھے کولار کے منیر نقشبندی اور ہرپور کے ڈاکٹر سید غوث عرشی ۔ معلوم ہوا کہ کچھی میمن جماعت کا سالانہ جلسہ ہے جس میں مشاعرہ بھی ہوگا ۔ ظاہر ہے مشاعرے کا انتظام ایاز کے سوا اور کس کے ذمے ہوتا ۔ مقامی شعرا کو دعوت بھجوائی گئی ۔ دستور العمل کے مطابق جلسے کا اختتام شب میں مشاعرے پر ہوتا ۔ کوئی چار بجے شام معلوم ہوا کہ اسی شب بنگلور میں ایک اور مشاعرہ بھی مقرر ہے جہاں شہر کے تمام شعرا پہلے سے مدعو ہیں اور میمن جماعت کے مشاعرے میں شریک ہونے سے معذور ہیں ۔ لیکن جماعت کا مشاعرہ بھی کسی صورت منسوخ نہیں کیا جا سکتا تھا اور یہاں لے دے کے صرف چار شعرا رہ گئے تھے ۔ ایاز ، محمود شریف ، منیر نقشبندی اور عرشی ۔ طئے پایا کہ برادری کا ہر فرد غزل پڑھے گا اور غزلیں ایاز فراہم کریں گے ۔

پہلی بار میں نے شعر سازی کے عجیب و غریب عمل کو دیکھا ۔ ایاز اپنے جوتوں پر پالش ڈالتے بیٹھے تھے ۔ ضیا میر سے کاغذ قلم سنبھالنے کے لیے کہا اور اس شعر ساز مشین میں اشعار ڈھلنے لگے ۔ فی گھنٹہ بیس کی شرح سے شعر بننے لگے ۔ بعض اوقات تواتر اتنا سبک ہو جاتا تھا جیسے بیاض سے پڑھ رہے ہوں ۔ شعر کے ختم ہونے پر داد کا غل غپاڑہ ہوتا اور ایاز کو ٹوکنا پڑتا کہ ان کی فکرِ سخن میں خلل ہوگا ۔ مکرر کی فرمائش پر ضیا میر کاغذ سے پڑھ کر سناتے ، منیر اور عرشی جیسے معمر کہنہ مشق اور عروض کے ماہر شعرا محو حیرت کہ یہ کیا کرشمہ ہے ۔ ہر شعر موزوں ، ہر شعر مرصع اور عروض پر کھرا ، نازک خیالی ایسی کہ بیش تر اشعار پر گمان ہوتا تھا کہ یقیناً مشاعرہ لے اڑیں گے ۔

مجھے تو معاف کر دیا گیا کہ میں رعشہ براندام وجود مشہور تھا ۔ ضیا میر نے معذرت کی کہ انھیں مشاعرے میں شعر پڑھنا نہیں آتا ۔ حمید صاحب کو تو گنگنانے کا موقع چاہیے تھا ۔ فیکٹری سے نکلے ہوئے بیس پچیس اشعار سے چھ یا آٹھ اشعار چھانٹے گئے ۔ خیال کی موزونیت کے لحاظ

سے مقطع کہا گیا۔ حمید خاں کے لیے "عالم تخلص تجویز ہوا اور یہ طے پایا کہ حمید خاں کے ساتھ منیر صاحب بھی ترنم سے سنائیں گے تاکہ مشاعرہ کم از کم ایک گھنٹے کا ہو سکے۔ منیر صاحب جو اپنی جوانی میں میسور کے شاہی گویے علی جان صاحب کے جوابی رہ چکے تھے اپنی غزل گا کر سنانے پر آمادہ ہو گئے۔ مشاعرہ تقریباً گیارہ بجے شروع ہوا۔ خواتین کے لیے پردے کے پیچھے نشست تھی۔ سیٹھوں میں دو چار علم دوست احباب کے سوا داد دینے والا بھی نہیں تھا۔ ہر شعر پر بے تحاشا داد پڑی۔ میں جو بے داد کا ماہر ہوں مجھے اپنی تسکین کا موقع بھی نہ ملا۔ منیر صاحب نے راگ درباری میں اپنی غزل سنائی اور ان کے بعد حمید خان نے راگ بھیرویں میں۔ یہ تمیز کرنا مشکل ہو گیا کہ یہ محفلِ مشاعرہ ہے کہ محفلِ سماع۔ حمید خاں صاحب عالم کو ایاز صاحب کی صنعت پر اس قدر داد ملی کہ ان کے بعد خود ایاز کی غزل گہنا کر رہ گئی کیوں کہ یہ بات مانی ہوئی ہے کہ ایاز کا پڑھنے کا انداز فیض احمد فیض کے بعد دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ مشاعرے کے بعد گھر لوٹے تو نیند کوسوں دور تھی۔ بحث شروع ہوئی کہ خواتین میں کس کی غزل کو زیادہ داد ملی ہوگی۔ حمید خاں کو زعم تھا کہ انھیں راگ اور غزل دونوں پر داد ملی ہے۔ ایاز کو یہ ضد کہ سیٹھانیوں کی نئی پود اہلِ خرد پر مشتمل ہے اور انہی کی غزل پسند کی گئی ہوگی۔ بہ ہر حال دوسری صبح کا انتظار تھا جب رپورٹ ملنے والی تھی۔ رپورٹ دینے والی "آلویس نیوز" کے رشید و عباس کی بہن مریم تھیں۔ یہی مریم ہیں جو بعد میں مریم ایاز بنیں اور ہماری چہیتی بھابھی۔ اب یہ یاد نہیں رہا اس رات ہم سوئے بھی یا منھ دھو کر اپنی اپنی ملازمتوں پر حاضری دینے چل کھڑے ہوئے۔ انھیں محفلوں میں سہ ماہی "سوغات" نکالنے کا منصوبہ بنا محمود شریف اور ضیامیر نے اپنی ان تھک کوششوں سے اسے عملی جامہ پہنایا۔ اور ادبی دنیا کو ایک ایسا صحیفہ ملا جو اسم با مسمیٰ تھا۔ برِ صغیر میں جب بھی ادبی صحافت کا احتساب ہوتا ہے تو "سوغات" کا ذکر لامحالہ ہوتا ہے۔ اس کے نسخے آج بھی قدر دانوں کے پاس دستاویز کی حیثیت سے محفوظ ہیں۔ اس میں ایاز کے شعری ادب کے علاوہ اداریے، تراجم اور تنقیدی جائزے ناقابلِ فراموش ہیں۔ ان میدانوں میں ایاز کے قلم کی مہارت کا اعتراف تو سوغات کے ہر قاری کو ہوگا۔ اہلِ نظر و مشاہیر قلم کاروں نے جن تلمیحات سے انھیں سراہا ان سے غزنوی اور سومنات کی یاد تازہ ہو گئی۔ نہ صرف برِ صغیر کے لیے یہ معیاری ادب کی سوغات تھی بلکہ اس کا بھی اظہار ہو گیا کہ معیار کی کسوٹی پر کھرا کیا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی نام ور قلم کاروں کو جو اپنی نام آوری کے بل بوتے کھوٹے سکے چلانے کا دھندا کر رہے تھے آئینہ دکھلایا گیا کہ اپنے صحیح قد و خال کا جائزہ لے سکیں اور کئی گم نام اور ابھرتے ہوئے فن کاروں کو جن کے پاس واقعی کچھ کہنے کے لیے تھا اور ان کی آواز اس آئینہ خانے میں ابھر نہیں رہی تھی ڈنکے کی چوٹ سنوایا گیا۔ "سوغات" فراعینِ ادب کے حق میں خطِ معزولی تھا جنھیں عوامی داد کی ہائے و ہو نے اچھال کر غلط سنگھا سنوں پر

بٹھا دیا تھا اور ان شعلہ بداماں چنگاریوں کو جوالا مکھی بننے کا موقع تھا جو رائے عامہ کی راکھ تلے دبی سسک رہی تھیں ۔ ضربِ غزنوی سے تلملاتے ہوئے مشاہیر کا زود پشیماں ہونا کسی نے نہیں دیکھا مگر ادبی دنیا کے ہر معیاری جریدے کو سوغات کے فن کاروں کا حوالہ دیتے ہوئے سب نے دیکھا اور صاحب سوغات اس بات سے بے پروا کہ اس کسوٹی نے کتنے دوست بخشے اور کتنے دشمن ، صرف اس بات سے مطمئن کہ رائے عامہ کو کھرے کھوٹے کی پہچان تو ہوئی ۔ آج بھی قومی سطح پر ادبی کارناموں پر انعامات دیے جاتے ہیں تو انھیں لاٹری کی سی اہمیت دی جاتی ہے اور کوئی ابھی شاعر کا خیال انگیز شعر پڑھ کر بے اختیار داد دی جاتی ہے کہ اس خیال کا اظہار تو عرصہ پہلے ایاز کو کرنا چاہیے تھا ۔

ایک بار کا ذکر ہے ۔ اتوار کی چھٹی تھی ۔ " سوغات " کا پہلا شمارہ نکالنے کی فکر ہو رہی تھی ۔ ملک بھر کے قلم کاروں سے مواد آچکا تھا ۔ ایک ایک چیز کو اتنے انہماک سے کسوٹی پر گھسا جارہا تھا کہ شاید ہی کسی کو خبر ہوئی ہو کہ کوئی نو وارد داخل ہوا ہے ۔ ایک کرسی خالی تھی میں سمجھا کہ کوئی صاحب یہاں سے اٹھ کر گئے ہیں شاید انھی کی واپسی کے گمان سے مجھے نظر انداز کیا جارہا ہے ۔ پوچھا کہ یہ جگہ کس کے لیے خالی ہے ؟ سب کی توجہ مبذول ہوئی ۔ دوبارہ سلام کا جواب دیا گیا ۔ میرے سوال کا جواب حذف کر کے ایاز نے کہا کہ ذرا اختر الایمان کی نظم انھیں سناؤ لیکن پانچ دس منٹ کی مکرر تلاش کے باوجود وہ لفافہ نہیں ملا جس میں نظم آئی تھی ۔ کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ روزنامہ " آزاد " کے مدیر عبدالہادی رفعت تشریف لائے تھے جن کی خالی کردہ کرسی مجھے ملی تھی ۔ گمان اغلب ہوا کہ اختر الایمان کی نظم کا لفافہ بے خیالی میں انھوں نے ہی جیب میں رکھ لیا ہوگا ۔ فون پر بات ہوئی تو انھوں نے اعتراف کیا کہ لفافہ ان کی جیب میں ہے جو بے خیالی میں نہیں بلکہ روزنامہ آزاد میں شائع کرنے کی نیت سے لے گئے ہیں ۔ ایاز برہم کہ مدیر صاحب کو یہ تک نہیں معلوم کہ کون سی چیز " آزاد " اور کون سی " سوغات " کی زینت بننے کے قابل ہے ۔ فوراً کسی ہرکارے کے ذریعے واپس بھجوانے کے لیے کہا ۔ ایک آدھ منٹ اضطراب میں گزرا ۔ پتہ نہیں وہ بھجوائیں گے بھی یا نہیں جب تک یاد ہے لکھ لو ۔ اور ضیا میر نے کاغذ قلم سنبھالا ۔ لفافہ چاک کرتے ہی ایاز نے ایک بار اسے خط کی طرح پڑھا تھا اور دوسری بار مزے لے لے کر محفل کو پڑھ کر سنایا تھا ۔ کتابت شروع ہوئی تو یادداشت سے مصرعے پر مصرع بالترتیب لکھوایا ضیا میر کو تو بس مصرع لکھ لینے کی مہلت دی جاتی تھی ادھر کتابت ختم ہوئی تو ادھر رفعت کا ہرکارہ بھی لفافہ لے کر آگیا ۔ موازنہ کرنے پر من و عن نقل مطابق اصل تھی ۔

پتہ نہیں ! شاید اسی اتوار کو معلوم ہوا کہ آئندہ ہفتے کراچی سے دادا آنے والے ہیں ۔ دادا ایاز کے چھوٹے بھائی تھے ۔ نام غلام حسین ، شبیہہ ایاز کے دادا ہارون سیٹھ پر گئی تھی تو

دادا بھی پکارتے تھے ۔ جاننے والوں میں دادا کے عرف سے اس قدر معروف تھے کہ قریبی رشتہ داروں کے سوا شاید ہی کسی کو ان کا اصلی نام معلوم ہو ۔

حلقے کے ہر فرد کو سیٹھ کی خصوصی تاکید تھی کہ جب دادا آئیں تو سب ضرور آئیں ۔ بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات تھی ۔ سیٹھ نہ بھی کہتے تو بھی یار لوگ آئندہ اتوار حاضر ہونے والے ہی تھے ۔ پھر بھی ضیاء اللہ کے خط سے مجھے اطلاع مل گئی کہ دادا آئے ہوئے ہیں ۔ اتوار کی صبح گھر میں داخل ہوا تو نچی میمن سیٹھوں کا ایک لڑکا ایاز سے محو گفتگو کراچی میں مقیم بنگلور کے مہاجرین کا حال سنا رہا ہے ۔ تعارف ہوا ۔ مجھے تو رسمی کلمات آتے ہی نہیں ۔ میں نے کہا "اچھا ؟ ہاتھ ملاتے ہوئے دادا کے چہرے پر کھسیانی سی ہنسی آگئی ۔ گویا کوئی بچہ اپنی ہنسی کے ذریعے یہ کہنا چاہتا ہو "ذرہ نوازی ہے ۔ میں بھلا کس قابل ہوں ۔"

دادا تمام احباب میں گھل مل تو گئے ۔ لگتا تھا احتیاط کے ساتھ کہ بھائی جان کے دوستوں میں اپنا کوئی فعل صغر پن کے حدود سے تجاوز نہ کر جائے ۔ بالکل ویسے ہی تعلقات جیسے ہمارے سیٹھ کے ساتھ تھے ۔ باتوں باتوں میں مجھ سے پوچھا "آپ کے چھوٹے بھائی آپ کو کیا پکارتے ہیں ؟ " میں نے کہا " میرا کوئی بھائی ہے ہی نہیں ؟ " " رشتے کے تو ہوں گے ؟ "

"ہاں ! ویسے خاندان کے چھوٹوں میں چاند بھائی مشہور ہوں "

تو اس کے بعد سے تادم زیست میں ان کا چاند بھائی رہا ۔

دادا کی گفتگو نشست و برخواست ، پسند و ناپسند غرض کہ ہر پہلو سے بچپن ٹپکتا تھا ۔ جس کسی کے ایسے ایسے جگر پارے پیوند خاک بن گئے ہوں اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا کہ بتاتا پھرے کے یہاں غنچہ ، یہاں گل تھا لیکن ہر غم کا مداوا ہے ۔۔۔۔۔

۔۔۔ وقت علاج !

حساس دل شاعر کا یہی علاج ہے کہ یادِ رفتگاں اٹوٹ حصہ بن جائے ۔ ظاہری کرب و آسودگی کی تہوں کے نیچے ایک بے نشان زخم ، دل کے نہاں خانوں میں ایسا گہرا ہو کہ اس سے رسنے والا خون سرِ مژگاں آکر تازگیِ زخم کی غمازی کرنے کی بجائے دستِ عروسِ سخن کی حناکاری کرے :

ہوائے دشتِ فنا چن کے لے گئی جن کو
انھیں کا ذکر بہت ہے مرے فسانوں میں

سیلِ زماں کے ساتھ ساتھ تڑپ تڑپ کر کہے :

مرا دل کہ ماتم گرِ رفتگاں ہے
تجھے ڈھونڈتا ہے

ایسی صورت میں وقت علاج نہیں بلکہ فصیلِ آہن بن جاتا ہے جس کے ایک طرف

شاعر اپنی بے مائگی پہ مبہوت بس ہر ایک پیش رو کے نقشِ پا کو دیکھتا رہ جاتا ہے:

رفیقِ راہ جو تھے گردِ راہ میں گم ہیں
ہر ایک لمحہ۔ حائل فصیلِ آہن ہے
بس ایک ایک کفِ پا کا نقش دیکھتا ہوں

"ناتمام" (محمود ایاز کے مجموعہ کلام کا مجوزہ نام) شروع ہوتی ہے "آخری منزل" سے جو ایاز کی والدہ کی موت پر ان کی رحلت کے تقریباً تین سال بعد کہی گئی۔

عظیم بیگ چغتائی کی رحلت پر عصمت آپا نے "دوزخی" لکھا جسے پڑھ کر سعادت حسن منٹو کے گھر کی خواتین نے مذمت کی کہ کم بخت نے اپنے بھائی کو بھی نہیں چھوڑا۔ سن کر منٹو نے یہ پیش کش کی تھی کہ اگر میری رحلت پر تم میں سے کوئی ایسا مضمون لکھ سکو تو میں آج مرنے کے لیے تیار ہوں۔ "آخری منزل" پڑھنے کے بعد یار لوگ کچھ ایسی ہی پیش کش کی سوچ رہے تھے کہ ابھی دنوں حمید خاں کے نسبتی برادر کا انتقال ہوگیا۔ یہ سانحہ ساری برادری کے لیے باعثِ الم تھا۔ حمید خاں نے چپکے سے آخری منزل کا کتبہ بنایا۔ اپنے نسبتی برادر کے مزار پر استادہ کردیا جو میسور کے بڑے مکان میں سرِمزار گزرنے والے ہر شخص کو ایک لمحہ رکنے پر مجبور کرتا ہے اور کہتا ہے:

ہزاروں حسرتیں مشتِ غبار میں ڈھل کر
کچھ ایسے سوئی ہیں خاموشیوں کے مرقد میں
کہ تا ابد کوئی آواز پا جگا نہ سکے

○

سارے کلام میں بکھرے ہوئے جگر پاروں کو گنا جاسکتا ہے لیکن ایاز کی شاعری کو ذاتی شاعری نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ جذبات و اظہار دونوں اس قدر ہمہ گیر ہیں کہ رنگِ تعمیم غالب رہتا ہے اور قاری کے لیے ہمیشہ اس بات کی گنجائش رہتی ہے کہ وہ اپنی ذاتی واردات کے مطابق تخصیص کرلے چاہے اس کا قیاس شاعر کے تجربات سے مطابقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ چناں چہ قربت و دوری یاس و امید، ملنے کی تمنا بچھڑنے کا غم یہ سارے جذبات جو محبت کی دین ہیں۔ سب کے لیے یکساں ہیں؛ ماں، باپ، بھائی بہن، دوست و محبوب ان سب کے ساتھ ایک ہی محبت ہے۔ اس میں قسمیں نہیں۔ اظہار ان لطیف جذبات سے عاری ہے جو مابہ الامتیاز ہوسکتے ہیں مثلاً تقدیس و احترام، دلار و لاڈ، لطف و کرم یا رحمت و مؤدت، اے روئے یار، یا رخِ زیبائے خیال یا راحتِ جاں، راحتِ زیست کے مخاطب سے شاعر واقف ہے۔ قاری کے لیے اس تخصیص کی قید نہیں۔ کہیں ایک تصویر کا ذکر ہے۔ کہیں چہرے کی شبیہہ کا ذکر

ہے۔ کس کی تصویر ہے۔ کس کا چہرہ ہے؟ شاعر کہتا ہے سب دل کو بھی خبر ہے۔ قاری پھڑک اٹھتا ہے کہ اس کے دل کو بھی خبر ہے حالاں کہ یہ اسے بالکل خبر نہیں کہ شاعر کے دل کو کیا خبر ہے۔

شب چراغ، نیا سی فس تو خیر ذاتی شاعری میں شمار ہو ہی نہیں سکتے ویسے ہر نظم و غزل جس میں کہیں کہیں انداز تخاطب سے ہو یا جنسِ فعل سے ذاتی شاعری کا شائبہ ملتا ہے اس میں بھی بھرپور رنگِ تعمیم ہی جھلکتا ہے۔

رنگِ تعمیم کی فراوانی اس لیے بھی پائی جاتی ہے کہ تحریک سخن، بشری احساسات سے ہوتی ہے۔ شعر میں سموئے ہوئے الفاظ و خیالات کھلتے پھول، چہکتی چڑیاں، سنسناتی ہوئی ہوائیں، سمندر کی موجیں، رات کا سناٹا، ستاروں کی آنکھیں یا مختلف نہاں وعیاں کر د بیاں دے جاتے ہوں تو ہوں لیکن شاعر کے پاؤں اس زمین پر جمے ہوئے ہیں جس میں وہ پیدا ہوا، پلا، بڑھا، چاہا، جھگڑا، لغزشیں کیں، کامیاب ہوا، گناہ کا حسن دیکھا، نیکیوں پر اطمینانِ قلب پایا۔ خیال اسے صحائف، اساطیر، تواریخ یا دانش وروں کے مکتوبات سے نہیں بلکہ گوشت پوست میں جی ہوئی زندگی اور انھیں روایات سے حاصل ہوتا ہے جس کا وہ حصہ ہے۔ خیال کو شعر کی شکل اختیار کرنے تک جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے وہ شاعر کے لیے جاں کنی ہی نہیں بلکہ خراج طلب بھی ہیں۔ حسیات کی بھٹی میں تپتا ہے، ہڈیوں کو رگڑتا ہے، گوشت میں چبھتا ہے، دل میں دھڑکتا ہے، شریانوں میں دوڑتا ہے خوں بن کر نہیں شعلہ، سوزاں بن کر۔ جب بجتے گنگناتے ہوئے الفاظ میں بن کر شعر ہو پیدا ہوتا ہے تو شاعر کو یہ یاد نہیں رہتا کہ قطرے کو گہر ہونے تک صدف پر کیا بیتی؟ وہ تو یوں محسوس کرتا ہے جیسے اڑتی چڑیا اس کے کان میں یہ الفاظ ڈال گئی ہے۔ قاری یوں محسوس کرتا ہے جیسے اس تان سے اس کے کان بھی واقف ہیں، اس لیے پر اس کا دل بھی دھڑکتا ہے۔ گویا یہ شعر اس نے بھی جیا ہے۔

شاعر سوال کرتا ہے:

نقوشِ کفِ پا کی منزل کہاں ہے؟
ترا دل کہ ماتم گر رفتگاں ہے
کسے ڈھونڈتا ہے؟

o

یہ کس کی یاد کا ٹوٹا ہوا ستارہ ہے؟
کس کا نغمہ ہے دل کی دھڑکن میں
کس کی آواز پا سکوت بنی؟
اپنی ہی ذات کے آئینے میں اک چہرہ، بے شکل

تو قاری کو یک گونہ خوشی ہوتی ہے کہ ان کے جوابات سے وہ واقف ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بار پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس شاعری نے ہماری ہی زندگی سے جنم لیا ہے اور ہماری ہی زندگی کا حصہ ہے ۔ یہ تجربات میرے تیرے ہیں ۔ ان خیالات کا آہنگ ہمارے کانوں میں بھی ارتعاش پذیر رہا ہے ۔ اس کا رنگ ہماری آنکھوں میں بھی جلوہ آرا رہا ہے بلکہ ہمارے دماغ کی اپج ہے ، شاعر نے تو بس الفاظ دیے ہیں ۔

الفاظ ملکوتی یا جناتی نہیں اور نہ ہی اصطلاحی معنی سے ہٹے ہوئے ۔ کہیں بھی ابہام یا علامت کا سہارا نہیں لیا گیا ۔ ہر لفظ اپنی جگہ موزوں و مرصع ، اپنے انہی معنی میں استعمال ہوا ہے جن معنی میں کسی بھی بیانیہ نثری مضمون میں استعمال ہوتا ہے ۔ جن معنی میں حکماء و دانش ور استعمال کرتے ہیں ، جن معنی کو عام اردو داں بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں ، مجھ جیسے ہیچ مداں بھی اس کا کلام کو پڑھ کر محظوظ ہوتے ہیں ۔ اہلِ فن کی بات اور ہے وہ تو افہام و تفہیم کی منزلوں سے گزرتے ہیں ۔ گھائل لوگوں کے زخم پامندمل ہرے ہو جاتے ہیں ۔

کسی بنگلور کے مشاعرے میں نخشب موجود تھے ایاز نے غزل سنائی :

ان سے پیمانِ وفا جن سے تعلق نہ لگن
ہم نے کیا کیا نہ کیے تجھ کو بھلانے کے جتن

نخشب بسملِ تازہ کی طرح تڑپ اٹھے اور سرِ محفل دھائیں دھائیں رونے لگے ۔

" بازیافت " جب شائع ہوئی تو ایک عمر رسیدہ بزرگ نے راستے میں مل کر کہا " روتے روتے ڈاڑھی بھیگ گئی ۔ کاتب سے نظم کا طغرا بنوایا ، فریم کروا کے اپنے کمرے میں آویزاں کیا جب کہیں تسلی ہوئی ہائے کیا بات کہی ہے :

اب ترکِ دعا کی منزلیں ہیں
دامانِ طلب سمٹ چکا ہے

اور ان کی آنکھیں بھیگ چلیں :

رفیق و یار کہاں اے حجابِ تنہائی
بس اپنے چہرے کو تکتا ہوں آئینہ رکھ کے

جب یہ غزل شائع ہوئی تو تین دن بعد راجندر سنگھ بیدی کا خط آیا کہ تین دن سے اس شعر پر رکا پڑا ہوں ، جب بھی یاد کرتا ہوں آنسو رکنے کا نام نہیں لیتے ۔ خط لکھ رہا ہوں کہ شاید طبیعت کچھ ہلکی ہو ۔

ایک محترمہ کو میں جانتا ہوں جن کا مطالعہ افسانوی ادب سے آگے نہیں بڑھا ۔ البتہ اپنی زچگیوں کے سلسلے میں ہسپتال میں داخلہ لے چکی ہیں " ہسپتال کا کمرہ " پڑھ کر کہا " شاعری

اسے کہتے ہیں :

ایک آنکھ جو سب دیکھتی ہے
ہنستی ہے ۔ ۔ ۔
ہنستی رہے ۔ ۔ ۔
جنھیں تجربہ ہے وہی جانیں کہ اس میں کتنی حقیقت ہے "
"مرنے والے کے کمرے میں "جب میں نے سنی ۔
ایسے مصروفِ تگ و تاز ہیں سب
جیسے کل میرے مقدر میں نہیں

بے اختیار میرے ذہن میں سترھویں جزو کی پہلی آیت آئی ۔

اقترب للناس حسابهم وهم فی غفلته معرضون ہ

تخلیقِ شعر کا جو عمل اوپر بیان کیا گیا ہے ضروری نہیں کہ ہر بار ایسا ہی ہوا ہو ۔ بار ہا ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض تجربات سے خیال پیدا ہوا ۔ جانے حسیات کی بھٹی پر کیا گزری ۔ آن کی آن میں قطرہ گہر بن گیا اور دھماکے کے ساتھ صدف پھٹ پڑا ۔ "یہی لمحہ ۔ کل ہے "کی تخلیق کچھ ایسے ہی ہوئی تھی ۔

اس دن برادری کا ہر فرد بنگلور میں موجود تھا ۔ دوپہر میں جب محفل برخواست ہوئی تو طئے پایا کہ شام کے شو میں "صاب بی بی اور غلام" دیکھی جائے جو اس وقت میجسٹک کے کسی سنیما گھر میں چل رہی تھی ۔ حسبِ وعدہ سنیما گھر کے پاس میں گیا حمید خاں و ضیامیر ساتھ تھے ۔ پھر محمود شریف آئے اور ایاز کا انتظار ہونے لگا ۔ آخری وقت میں ایاز سے مایوس ہو کر ٹکٹ خریدنے کے لیے اندر جانے ہی والے تھے کہ ایاز آٹو سے اترے اور کہا ۔ "کہاں کی پکچر ہے ، خلا میں اڑنے والے پہلے آدمی نے تحفہ بھیجا ہے پہلے وہ ملاحظہ کر لو " صبح اخبار میں یہ خبر چھپی تھی کہ خلا میں اڑنے والے پہلے انسان نے یہ کہا ہے کہ وقت رک گیا ہے اور خلا میں تیرنے والا ہر ذرہ درخشاں ہے ۔ بیٹھ کر سننے کے لیے موزوں جگہ کی تلاش ہوئی ۔ میجسٹک سرکل کی بھیڑ بھاڑ اس کے لیے ناموزوں تھی ۔ چلتے چلتے ہوٹل پیراڈائیز میں آکر فروکش ہوئے جو سلور جوبلی پارک کے سرے پر تھا ۔ نظم پہلے ایاز نے پڑھی ، پھر ضیامیر نے پڑھی مکرر ایاز سے سنی گئی ۔ میں نے سورۃ النور کی وہ آیات پڑھیں اللہ نور السموت والارض ۔ ۔ ۔
اس نظم کا طرزِ بیان قابلِ غور ہے ۔ ہر مصرع حتمی ہے ، کوئی استعارہ نہیں نہ ہی کوئی صنعت کلام نہ کوئی قیاس نہ ظن ۔ زبان کسی صوفی یا فلسفی کی نہیں عینی شاہد کا چشم دید بیان ہے کہ یہ ایسا ہی ہے ۔ کسی سائنس داں کے تجربات پر مبنی کلیہ ہے لیکن ہر مصرع ہر لفظ سے شعریت

ٹپکتی ہوئی۔

ایاز کے کلام میں صوفیوں کے پھڑکنے کے لیے اور فلسفیوں کے سر دھننے کے لیے کافی مواد مل جائے گا۔ دراصل وہ روح کی گہرائیوں میں پورے شعور کے ساتھ محسوس کی ہوئی ٹھوس حقیقت کے اظہار کے سوا کچھ نہیں جس میں "دوزخ" سے بچ دھج اور آن بان کے ساتھ جلوہ فرما ہے۔ اکثر شعرا کا وطیرہ ہے کہ اپنے بنتے بگڑتے ادھورے تجربات کو علامات و غنا کے سہارے شاعری کی زبان میں زندگی کے فلسفے کا رنگ دیں جن سے کہیں تصوف کہیں مذہبیات یا کہیں سماجی اصلاحات ہویدا ہوتے ہوں۔ ایاز کی شاعری جسے وہ زلیخا کا نام دیتے ہیں بڑی غیور ہے۔ وہ سوتنوں کو ایک پل برداشت نہیں کر سکتی، روٹھ جاتی ہے، ناکوں چنے چبواتی ہے اور جب تک یہ نہیں دیکھتی کہ اس کا معمول "شاعر" اپنا سب کچھ برباد کر کے اس کی مشاطگی پر آمادہ ہے نظرِ التفات سے نہیں نوازتی ہے۔

ایک لمحہ جو تری یاد سے غفلت میں کٹا
ایک عمر روٹھی رہی مجھ سے زلیخائے سخن
میری آسودگی یک دو نفس کا کیا غم
میری بربادی کے عنوان ابھی باقی ہیں

ooo

عمر بھر اپنی ہی تخئیل کے پیکر پوجے
رگ احساس میں خود زہر کا نشتر رکھا
جن کے شعلوں میں جلی راحت عالم کی طلب
میں نے جاں دے کے اس اک آگ کو روشن رکھا

ooo

ہمیں سے روٹھ کے بیٹھی ہے اے عروس سخن
ہمیں نے تیری تمنا کے سارے ناز سہے

لفظ سوتن سے ایک یاد وابستہ ہے سوچتا ہوں کہ کہہ دوں۔ ۱۹۷۶ء کی بات ہے بورنگ ہسپتال میں ایاز کا بواسیر کا آپریشن ہونا تھا۔ ایاز بستر پر مارفیا کے اثر سے نیم غنودگی کی حالت میں تھے۔ میں کمرے سے باہر ورانڈے میں بیٹھا تھا۔ مریم بھابی اندر کے کمرے میں محو تھیں۔ ایک محترمہ مسیحائی کے لیے آئیں ان کو دیکھ کر شاید ایاز کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ انھوں نے جاننا کہ "بیمار کا حال اچھا ہے" اور چلتی بنیں۔ ایاز نے بھابی سے پکار کر کہا۔ "مریم تیری سوت آئی تھی۔" اندر سے بھابی نے پوچھا۔ "کون سی؟"

بات یہ ہے کہ ایاز کو خواتین سے بات کرنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ سنیما گھر، ریلوے

پلاٹ فارم، ائیرپورٹ، ہسپتال کا ملاقاتی کمرہ یا مچھلی فروش کی دوکان جہاں کہیں بھی خواتین سے کام بنانا ہو، ایاز منٹوں میں بنالیتے ہیں۔ خواتین اجنبی ہوں یا جانی پہچانی۔ جس سے ایک ملاقات کے بعد پھر ملنے کی امید ہے نہ ضرورت، جس سے ملاقات پیہم کا امکان ہے غرض کس سے کیسی بات کرنا ہے ایاز کو آتا ہے۔ کس سے سرسری بات ہو، کس سے خوش اخلاقی، کس سے اپنائیت یا لگاوٹ ایاز کو معلوم ہے۔ خواتین پہلی ہی ملاقات میں تسیج جاتی ہیں کہ یہ شخص پریدہ رنگ و رمیدہ بو کی باتیں، کاجل و لپ اسٹک کی باتیں، حسن و صحت کی باتیں، پوشاک و سج دھج کی باتیں، کچھ ایسے انداز میں کرتا ہے جیسے کوئی رازداں سہیلی یا کوئی اپنا۔ بس پھر کیا ہے۔ اپنی پرائی، جوان بوڑھی، کنواری شادی شدہ، تعلیم یافتہ، ناخواندہ غرض کہ ہر قسم کی خواتین، ذات پات، رشتہ داری و عمر کی چھوٹی موٹی دیواریں پھاند کر، توڑنے گرانے کے لیے وقت درکار ہے، ایاز کی طرف کھنچی آتی ہیں۔ اب تو قطار کافی لمبی ہو چکی ہے اور بھابی غریب کو ان سے ہنس کر ملنے کی عادت ہو گئی ہے۔

انگریزی ادب میں دو ایک اہلِ قلم ہیں جنھوں نے اپنی بیویوں کی بے وفائی کے نوحوں کو کلاسک بنادیا۔ زن مریدی جن میں عین تہذیب ہے وہ اپنی بیویوں کے علم میں کسی غیر عورت سے ہنس کر بات کرنے کی بھی سوچ نہیں سکتے۔ بھابی تو ہندستانی گائے ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ کسی قسم کی حق تلفی یا دل شکنی ہوتی ہے۔ بھابی کی دانست میں شاعر کو یہ حق ہونا چاہیے کہ اپنی طبیعت کے مطابق جس سے جیسے بھی تعلقات رکھے، اپنا مذہب تو محبت کیے جانا ہے آخر محبت کے جواب میں یہ کھلنڈرا شخص محبت کے سوا کیا دے سکتا ہے۔

ایاز کی شاعری کو تصوف یا فلسفے کا رنگ دینے والے دراصل اس کے موضوعات ہیں۔ محبت، موت و حیات اور سیلِ زماں جو زندگی کی صدیوں سے محسوس کی ہوئی ٹھوس حقیقتیں ہیں، وہ عظیم موضوعات ہیں جن کی سچائی کے سوتے شاعر کے قلم سے خود بہ خود پھوٹ نکلتے ہیں بہ شرطیکہ شاعر حق گو ہو نہ کہ الفاظ کا جادوگر یا اظہار و بیان کا شعبدہ باز۔ مجھے شاعری پر رائے زنی کا کوئی حق نہیں لیکن مجھ جیسا ہیچ مداں اتنا تو جانتا ہے کہ اردو شاعری نے شاذ ہی محبت کے موضوع سے آگے قدم بڑھایا ہے۔ اس بیان کی تردید میں مثالیں پیش کی جاتی ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اتنا تو ضرور یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ سیلِ زماں کے موضوع پر ایاز کے سوا کسی اور اردو کے شاعر نے اتنی گیرائی سے نہیں کہا ہے۔

محبت، موت و حیات کا بھرپور شعور ہو سکتا ہے۔ وقت ایک ایسی حقیقت ہے جو ان سب پر محیط ہے جس سے لاشعور بھی آزاد نہیں۔ ازل و ابد سیلِ زماں کے دو سرے ہیں ان میں امتیاز کیوں کر ہو سکتا ہے جب کہ یہ تک متعین کرنا محال ہے کہ حیاتِ انسانی کی میعاد قلیل

اس سیلِ طویل میں کب اور کہاں شروع ہوئی اور کہاں ختم ۔ اسی حقیقت کی تلاش میں محبت ، موت و حیات جیسے میدانِ ادب میں شاعری کو جنم دینے والے گراں قدر موضوعات بھی اپنی اہمیت کھو جاتے ہیں:

تعلقات کا افسوں کدورتوں کا غبار

- - - - - - -

یہ اختتامِ سفر ہے کہ ابتدائے سفر ۔ ۔ ۔

وقت سے آزادی کی تگ و دو لا حاصل ہے جیسے نالی میں گھرے ہوئے کیڑے کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ اپنی آزادی کے لیے کس سمت دوڑنا ہو گا وہ تو اپنی عافیت اسی میں سمجھتا ہے کہ نالی میں بہتے ہوئے پانی کے بہاؤ کا ساتھ دے اور آنے والے کل سے امید وابستہ کر لے ۔ اس میں بھی مایوس ہو کر خاموشی اختیار کرے جو ہر کلام کے بعد لازمی ہے:

تمام مرحلے صوت و بیاں کے ختم ہوئے
اب اس کے بعد ، ہماری نوا ہے خاموشی

وقت سے آزادی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اپنے آپ کو ہر آرزو و تمنا سے مبرا کر لیں ۔ " ترغیب " کے بعد " بازیافت " سیلِ زماں کے ادراک کی کوشش فلسفیوں اور سائنس دانوں نے اپنے اپنے طور پر کی ہے ۔ بعض تو کہتے ہیں کہ ماضی مستقبل کا پیش رو ہے اور وہ لمحہ جسے " اب " کہا جا سکتا ہے تصوراتی ہے ۔ ایاز کا تجربہ اس تصور کو اپناتا ہے جس میں ماضی موجود میں اور مستقبل عقلِ کل میں جاگتا ہے اور ازل تا ابد ایک مستقل " اب " ہے ۔ " ایک نوحہ " کے بعد " یہی لمحہ کل ہے " ۔

" ناتمام " میں موت کے ذکر کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ، اس کی ابتدا ہی آخری منزل سے ہے " منجمد آنکھیں " اور " مرنے والے کے کمرے میں " کے علاوہ " سیلِ زماں " کے عنوان میں بھی اس کا ذکر ناگزیر ہے ۔ زندگی اور موت کا تصور ، سمندر اور ساحل کا سا ہے ۔ زندگی ریگ زار کی طرح ٹھوس اور جامد جانی پہچانی حقیقت ہے ، دن ہو کہ رات ۔ دن میں آفتاب کی شعاعوں سے ریگ کا ذرہ ذرہ دمک اٹھتا ہے تو شب میں ماہ تاب کی چاندنی آسودہ زندگی کی علامت ہے ۔ سطحِ آب پر آفتاب یا ماہ تاب کی تشبیہہ دیکھی جا سکتی ہے ۔ یہ عکس ہے جو ابھرتی موجوں میں بکھر کر گم ہو جاتا ہے ، ہمیشہ کے لیے مٹ نہیں جاتا ۔ سطحِ آب میں ٹھہراؤ آنے کی دیر ہے ، ماہ تاب پھر سے عکس کناں ہوتا ہے جو نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا ۔ چاندنی کا فیض ، فروشاں سمندر اور ریگ پر یکساں ہے ۔ دونوں کے درمیان لکیر نہیں کھینچی جا سکتی ۔ یہ بہ خوبی معلوم ہے کہ یہ ریگ ہے اور یہ سمندر ہے لیکن بپھری موجوں کی وجہ سے اس کا تعین محال ہے کہ ریگ زار کی حد کہاں تک ہے اور سمندر کہاں سے شروع ہوتا ہے ۔

یہ تماشا ازل سے ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ جانے کتنے چاند طلوع ہوئے اور ڈوب گئے ان کا شمار ہماری حیاتِ یک دو نفس کے لیے مشکل ہے۔ ہماری چاندنی جو آج ریگ زار پر آسودہ ہے نہ جانے کب سمندر میں گھل مل جائے گی کیوں کہ سمندر ہی اصل حقیقت ہے:

شعلہ رو امواج کی آغوش میں
ڈوبتے سورج کا چہرہ کھو گیا

- - - - - - - - - - -

یہ مناظر میری عمرِ یک نفس سے بے نیاز
وقت کی وسعت میں سرگرمِ سفر

حیات بعد ممات کا تصور ہر دور، ہر قوم اور ہر مذہب میں الگ الگ ہے جو پانے کھونے کے تقاضوں کی دین ہے، ایاز کے لیے رفتگاں کی دین ہے:

اس خامشی پہ ختمِ سفر کا گماں نہ کر
آسودگانِ خواب نئی منزلوں میں ہیں

- - - - - - - -

میں بھی سرگرمِ سفر ہوں تو بھی سرگرمِ سفر
موت سے منزل بدلتی ہے، سفر رکتا نہیں

- - - - - - - -

رات پھر کل رفتگاں سے گفتگو ہوتی رہی
جانے والوں سے دلوں کا سلسلہ جاتا نہیں

- - - - - - - -

طلوعِ صبحِ قیامت کی منتظر دونوں
وہ آنکھ خوابِ عدم میں یہ آنکھ ادھر بیدار

- - - - - - - -

یہ بند آنکھیں کھلیں گی نئے زمانوں میں
پرانے دوست ملیں گے نئے مکانوں میں

ooo

یہ تصورِ حیات بعد ممات ان مذہبی روایات سے مطابقت رکھتا ہے جن کا شاعر ایک حصہ ہے۔ حق کا متلاشی اس تصور کو مفروضے کے طور پر نہیں اپناتا پہلے تو توہم کا نام دیتا ہے۔

توہمات نے کچھ سہل کر دیا جینا
وگر نہ تابِ حیات اور ناتوانوں میں

یہ مال و دانش و دنیا بہائے عمر نہیں
میں خود کو ڈھونڈ رہا ہوں گئے زمانوں میں

- - - - - - -

میں گھر کے رہ گیا ہوں حدودِ تلاش میں
سب اس کے نقش تابہ فلک وسعتوں میں ہیں

- - - - - - -

خامشی کس نے نقشِ پا پہ مٹی
راستے کس کو ڈھونڈنے نکلے

- - - - - -

برگ آوارہ سے کوئی پوچھے　　بوئے گل کس کی جستجو میں گئی
کس کا نغمہ ہے دل کی دھڑکن میں　　کس کی آوازِ پا سکوت بنی

اپنی کم مائگی کا عجز سر چشمہ ، رشد ہدایت سے رجوع کرنے پر مجبور کرتا ہے ۔

فراقِ دیدہ و جاں دل کچھ نہیں پاتا　　قرارِ دیدہ و دل تو ہی اب تسلی دے

دادا کے انتقال کے ٹھیک ایک سال بعد انکشاف ہوتا ہے ۔

کوئی یہ کہتا ہے ، دیوانے　　روح کا شعلہ تابندہ ہے
روح تو ہر رت سے بے گانی　　روح تو ہر رت میں زندہ ہے

تلاش ایک صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ انکار و اقرار ، شک و یقین کے درمیان مجادلہ شروع ہو جاتا ہے :

کوئی نہ دوست نہ دشمن ہے خلوتِ دل میں　　بس اپنی ذات سے رہتا ہوں برسرِ پیکار

اسی سے رشتہ ، دل بھی اسی سے رو گرداں　　اسی کو ڈھونڈ رہا ہوں اسی سے جھگڑا ہے

پھر انکشاف ہوتا ہے :

تو مجھ سے دور کہاں اے قرارِ دیدہ و جاں
میں تیرے قرب کا لمحہ میں تیرے ہجر کی رات

پلک جھپکنے میں کٹتے ہیں روز و شب مہہ و سال
جو فاصلے تھے من و تو کے درمیاں نہ رہے

اپنی بے مائگی کا شعور سر چشمہ ، رشد و ہدایت کے آگے جبیں سائی پر مجبور کرتا ہے " یا خدا " کا پہلا حصہ **لا الہ** کی منزل ہے پھر تکبیرِ تحریمہ ہوتی ہے ۔ یا خدا ! اس کے بعد صراط مستقیم کی طلب نہیں ہوتی اور نہ **صراط الذین انعمت علیھم** بلکہ براہِ راست اس انعام کی درخواست ہوتی ہے جس پر شہداء ، صدیقین اور صالحین کو ناز ہو ۔

کوئی غم ایسا کہ ہر غم کو سبک سار کرے
کوئی آگ ایسی کہ ہر آگ کو خاشاک کرے
کوئی مفہوم کوئی نقش تمنا کہ جسے
اپنے دل و جاں کا لہو نذر کروں
سرخ رو ہو کے کہوں
زیست کی یہ مہلتِ دو ایک نفس
اتنی بے رنگ نہ تھی ۔

اتنی فرومایہ نہ تھی ۔

- - - - - -

اس کے بعد " دعا " بھی سعیِ مثانی کا انداز لیے ہوئے ہے ۔ اقرار ہی میں طمانیتِ قلب ہے:

حیرتِ جلوہ مقدر ہے تو جلوہ کیا ہے

- - - - - - - - -

ہم تو آسودہء منزل ہیں ہمارا کیا ہے

ooo

شاعر تین قسم کے دیکھے ہیں ۔ ایک وہ جو بہ قول شوکت تھانوی جن کا نام بھی کنیت کی وجہ سے خطرے میں پڑا ہوا تھا صاحبِ تخلص ہوگئے اور قہرِالٰہی کی طرح خواندہ مخلوق پر مسلط ہیں ۔ بہ زعم خود اپنی تخلیقات تصویر کے ساتھ لیے اردو روزناموں کے دفتروں کے لیے باعث پریشانی ہیں ۔ دوسرے وہ جو پھر بہ قول شوکت تھانوی اپنے نام کے ساتھ تخلص رکھتے ضرور ہیں لیکن کبھی شعر لکھتے یا پڑھتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے نہیں گئے ۔ تیسری قسم ایاز کی ہے جو شعر کہتے ہیں لیکن تخلص کو شعر کی زینت کا شرف نہیں دیتے ۔ تخلیقِ سخن ان کا مشغلہ نہیں ہے پھر بھی میرے کہنے کی ضرورت نہیں کہ اردو ادب میں ان کا مستند مقام ہے ۔

بے ضرر اردو جریدے کے مدیر ہونے کے گناہ میں ایک بار جیل ہوئی ۔ دھاڑ دھاڑ جیل میں دو غزلیں کہی گئیں لیکن سیاست کو کبھی اپنا موضوع نہیں بنایا ۔ نہ شاعر کے ناتے اور نہ مدیر ہونے کے ناتے ۔ نہ کبھی صنفِ سخن کی بدلتی ہوئی روایات پر دھیان دیا اور نہ ناقدانِ سخن کی آرا پر ۔

پیشہ ور شعرا اپنے بے معنی پیغام کو چغادری الفاظ کا جامہ پہنا کر ابہام اور علامات کے سہارے بحرو عروض کی قید میں بند کر کے اشعار موزوں کرلیتے ہیں ۔ کہنا چاہتے کچھ ہیں اور کہتے کچھ اور اپنی دانست میں اسی کو فن سمجھتے ہیں ۔ ایاز کے مشینی عمل شعر سازی کا ذکر میں نے کیا ہے ۔ وہ اشعار کم از کم بامعنی اور مرصع ہوتے ہیں اس کے باوجود ایاز کی دانست میں " ناتمام " میں جگہ پانے قابل نہیں ۔

غزل ہو کہ نظم ایاز کے کلام کی ایک ہی لے ہے ۔ الفاظ کے استعمال میں خاص آہنگ ہے جو بلا کوشش ہے ۔ گویا چمن بندی خود رو ہے جو کیاریوں اور گملوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو لامحالہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ غنا دراصل ان کے تخیل کی رنگینی میں مضمر ہے ۔ وہ ارسالِ پیغام پر کامیابی سے قادر ہیں ، کہیں سمجھانے کی کوشش نہیں کی ۔ ان کے کلام کو سمجھنے کا کوئی سہل الاختیار راستہ نہیں حتیٰ کہ پورے کلام کو مصرع بہ مصرع سطر بہ سطر مکرر پڑھا جائے

جب کہیں جاکر معلوم ہوتا ہے کہ عنوانات چاہے کچھ بھی ہوں ۔ موضوعات جن کا اوپر ذکر ہوا ہے ، کے ذریعے شاعر نے خود ہمارے ہی شب و روز کے تجربات کی ترجمانی کی ہے ۔

o ooo o

(یہ مضمون محمود ایاز کی زندگی میں تحریر کیا گیا تھا)

نیر مسعود

محمود ایاز کے خطوط

(بہ نام نیر مسعود)

[اقتباسات]

۱۔ (۱۹ اگست ۹۱ء) تصویر ارسال ہے۔ فاروقی کو بھی آج خط لکھا ہے۔ آپ لوگ بغیر کسی تکلف کے تشریف لائیے۔ انشاء اللہ میرے ساتھ کوئی ادبی گفتگو نہیں ہو پائے گی۔ میرا پروگرام حسبِ ذیل ہے:

صبح ساڑھے چھ اور سات کے درمیان گالف کو چلا جاتا ہوں۔ نو کے قریب واپسی، ناشتہ، انگریزی کے دو اخبارات کا اول تا آخر مطالعہ۔ پھر دو ایک گھنٹے کے لیے باہر چھوٹے موٹے کاموں پر نکل جاتا ہوں۔ بارہ بجے تک واپسی، ساڑھے بارہ بجے کھانا، ایک سے تین بجے تک کچھ آرام، کچھ نیند، چار بجے کے بعد رات کے ساڑھے دس گیارہ تک دوستوں کے ساتھ (جو بہت کم ہیں) کلب، وہسکی، مطالعہ، سب ان چھ سات گھنٹوں میں۔ اب بتائیے ادیب شاعر حضرات میرا کیا بگاڑ پائیں گے؟ جو بھی میرے احباب یہاں آتے ہیں، میں نہ ان کے پروگرام میں مخل ہوتا ہوں، نہ ان کو اپنے پروگرام میں مخل ہونے دیتا ہوں، لہٰذا دونوں خوش رہتے ہیں۔

۲۔ (۲۵ ستمبر ۹۱ء) بھائی، مجھے آپ سے سوغات پر "ت ف ص ی ل ی" تبصرہ چاہیے۔ مروت (میری یا دوسروں کی) نہیں ہونی چاہیے۔ اور جب تک کھل کر بات چیت نہیں ہوگی تب تک کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ کتنے اِشوز کو اداریے میں چھیڑا ہے، اقتباسات سے کچھ اشارے کیے ہیں۔ کسی پر تو کچھ کہیے۔ اتفاق نہیں اختلاف کیجیے۔ اپنے دوست احباب سے بھی کہیے ---- اب اسی سوال پر زرا غور فرمائیے جو آپ نے اٹھایا ہے کہ "آخر ہمارا قاری چاہتا کیا ہے؟" آپ کو پتہ ہے اردو کے لکھنے والوں کو قاری سے رشتہ توڑے ہوئے کتنا عرصہ گزرا ہے؟

ترقی پسندی سے نکلے تو جدیدیت، اس سے نکلے تو ساختیات پس ساختیات۔ علم و دانش کے موتی بے دریغ "کوروں" کے سامنے لگائے جا رہے ہیں۔ کیسی کیسی بنیادی باتیں نظر انداز ہوئی ہیں ان دہائیوں میں۔ کیسی منافقت، مصلحت کے نام پر سمجھوتہ بازی، کیا کیا نہیں ہوا اور ہو رہا ہے۔ جامی نے صرف عشق میں ترکِ نسب کا مشورہ دیا تھا، یہاں لکھنے والوں نے جس طرح

اور جن معنوں میں ترک نسب کیا ہے اس پر بھی تو کبھی کوئی کچھ کہے۔ بھائی، سوغات صرف پچاس غزلوں نظموں، چار چھ افسانوں اور کچھ مضامین چھاپنے کے لیے نہیں نکالا ہے۔ آہستہ آہستہ دو ایک شماروں میں اس کا کردار ظاہر ہوگا۔۔۔۔ فاروقی صاحب کو بھی یہ خط دکھائیے۔

۳۔ (۹ دسمبر ۹۱ء) میرا مطلب یہ تھا کہ قاری ادب سے ایک طرح سے بے تعلق ہو گیا ہے تو اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ خود لکھنے والے قاری سے، یعنی اپنے معاشرے سے، اپنی moorings سے، تہذیب اور روایات سے، معاشرے کے دکھ درد سے ایسے کٹ گئے کہ رفتہ رفتہ معاشرہ بھی لکھنے والوں سے بے خبر ہوتا گیا۔ خیر، اس پر پھر کبھی بحثیں گے۔۔۔۔

ابوالکلام قاسمی کو لکھا۔ ان کا جواب بھی آیا۔ خورشید احمد کو رسالہ بھجوایا ہے۔ دوسرے حضرات کو کل رسالہ بھجواؤں گا اور خطوط بھی لکھوں گا۔۔۔۔ قمر احسن کو آج ہی لکھوں گا۔ دراصل ان لوگوں کو میں خود لکھنا چاہتا تھا، مگر پتے نہیں تھے میرے پاس۔۔۔۔ عرفان صدیقی سے کہیے کہ وہ بہت عقل مند نہ بنیں اور "برائے مہربانی" جتنی غزلیں بھیج سکتے ہوں بہ واپسی ڈاک بھجوائیں "staying power" والا ایک غزل گو تو اپنے ہاں پیدا ہوا ہے۔ انیس اشفاق نے کچھ نہیں لکھا؟ ان کا پتا بھی عنایت فرمائیے۔

آپ نے آج تک میری بد خطی کی شکایت نہیں کی۔ حیرت ہے۔ سب کرتے ہیں۔

۴۔ (۹ دسمبر ۹۱ء) نصوح اور کتاب سوزی [از: آصف فرخی] پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ کہاں سے کیا بات نکالی ہے۔ اللہ میاں اس نوجوان کی عمر دراز کریں۔ یہ تو بالکل میرے مطلب کے آدمی نکلے۔ میں نے کل ہی ان کو خط لکھ دیا۔ جی چاہا کہ خوشی میں آپ کو بھی شریک کر لوں۔ اس لیے یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔

۵۔ (۲۳ جنوری ۹۲ء) میں نے عرفان صاحب کی غزلوں کی رسید بھی آپ کو بھجوائی تھی اور یہ بھی دریافت کیا تھا کہ اگر اختر الایمان والا شعر ان کی غزل سے نکل جائے تو وہ برا تو نہیں مانیں گے؟ میں جن لوگوں کو پسند کرتا ہوں ان سے ڈرتا بھی ہوں۔

(قاضی) افضال حسین نے لکھا تھا کہ وہ دو تین ماہ مصروف ہیں لیکن اگر میں کوئی خاص موضوع پر چاہوں تو وہ لکھنے کی کوشش کریں گے۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ ان کے میلانات کس طرف ہیں۔ میری طرف سے کوئی موضوع وغیرہ کی قید فی الوقت میں نے مناسب نہیں سمجھی اور ان سے کہا کہ وہ اپنے طور پر کچھ بھی لکھیں۔

خورشید احمد پتہ نہیں کون سی داستانِ امیر حمزہ لکھ رہے ہیں کہ ہر طرف سے مستقل چار مہینوں سے یہی خبر آ رہی ہے کہ "وہ سوغات کے لیے لکھ رہے ہیں۔" دیکھیں کیا لکھتے ہیں اور کب لکھ پاتے ہیں۔ شافع صاحب نے وسط جنوری تک۔۔۔۔ مضمون بھجوانے کا وعدہ کیا تھا۔ منتظر ہوں۔

۶جمل [کمال] صاحب نے آج کے سارے شمارے بھجوائے تھے۔ شکریے کا خط لکھا۔ رسالے کی تعریف کی اور ضمناً یہ بھی لکھا کہ اگر ممکن ہو تو ایک شمارے میں ایک سے زیادہ ترجے نہ دیں کہ اردو والوں کی قوتِ ہاضمہ کم زور ہے ۔۔۔۔ تو جناب اس کے جواب میں آپ کے ۶جمل صاحب نے مجھے وہ ڈانٹ ڈپٹ کے خط لکھا ہے کہ طبیعت خوش ہو گئی۔ نوجوان آدمی ہوں گے۔ مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے اور غصے میں آگئے ہیں۔ میں نے قطعاً برا نہیں مانا اور ایک ٹھنڈا سا خط لکھ دیا اور کہا کہ "آپ کے خط میں برافروختگی کی جو گرمی ہے اس کی بھی قدر کرتا ہوں۔ خدا کرے آپ اسے تادیر برقرار رکھ سکیں۔" وہ یہ سمجھے مجھے ترجموں سے کوئی پرخاش ہے، حالاں کہ چن چن کے ترجمے میں نے سوغات میں چھاپے ہیں۔ نظم نمبر تو آدھے سے زیادہ ترجموں پر مشتمل تھا۔ بہ ہر حال، مزہ آیا۔

۔۔۔۔ یہ خوش خبری بھی سن لیجیے۔ سوغات کی صرف فائل کاپیاں باقی رہی ہیں۔ ۱۵۰ اعزازی گئیں فاروقی کو بھی سنا دیجیے۔

۶۔ (۱۰ فروری ۹۲ء) بھائی، آپ کے علاقے میں کوئی اچھے افسانہ نگار نہیں ہیں؟ یہ انیس اشفاق اور محسن خاں صاحبان کیا کرتے رہتے ہیں؟

۷۔ (۱۲ مئی ۹۲ء) مجھے سلام بن رزاق کا مضمون بہت پسند آیا۔ مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایسی نظر رکھتے ہیں اور ایسا مضمون لکھ سکتے ہیں۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ مجھے پسند تھے لیکن ان کا نیا روپ میں نے دیکھا۔

۸۔ (۶ جون ۹۲ء) مدیر کی مداخلت کا مجھے بھی احساس ہوتا ہے لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ میں بہ قول مشفق خواجہ ڈاکیے کا کام نہیں کر سکتا لیکن اس "مداخلت" میں اس بات کی کوشش ضرور کرتا ہوں کہ دوسروں کے حقِ اظہار اور آزادیِ اظہار پر کوئی قدغن میری طرف سے نہ لگے اور لکھنے والوں سے بھی توقع رکھتا ہوں کہ وہ بھی مجھے اس حق سے محروم نہ کریں۔ مدیر صرف اداریے میں اظہارِ خیال کرے، فٹ نوٹ نہ دے، جہاں جہاں لکھنے والوں سے اختلافِ خیال کا اظہار نہ کرے، ان سب کے بارے میں کوئی manual آج تک کسی زبان میں مرتب نہیں ہوا ہے امر و نہی کا۔ ساری باتیں اداریے میں ضرور آسکتی ہیں لیکن بر موقع نوٹ کی بات ہی الگ ہوتی ہے۔ اب آپ مجھے تکلف بر طرف صاف بتائیے کہ میرے اس رویے میں اصولی، اخلاقی، صحافتی نقطۂ نظر سے کیا بات قابلِ اعتراض ہے؟ ۔۔۔۔ دراصل سارا مسئلہ بنیادی طور پر یہ ہے کہ لکھنے والے بیش تر اندر سے بہت insecure ہیں، ورنہ یہ کوئی بات ہی نہیں ہے کہ ہزاروں الفاظ کا مضمون تو ان کا آئے اور جہاں مدیر نے دس بیس جملے لکھ دیے، قیامت آگئی۔

۹۔ (۲۰ جون ۹۲ء) میں ایک ایک کو یہ بتا بھی نہیں سکتا کہ میرے پیشِ نظر کیا مقصد رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سوغات کے صفحات پر لکھنے پڑھنے والوں کا ایک forum قائم ہو۔

ایک دوسرے سے بات چیت، بحث مباحثہ، اختلاف، اتفاق اور اس کے ساتھ تھوڑی بہت "گپ شپ" بھی ہوتی رہے تو کیا مضائقہ ہے؟ ۔۔۔۔ ہمارے لکھنے والے بہت زود حس ہیں، لیکن میں ان باتوں سے پریشان نہیں ہوں۔ بالآخر یہی ہوگا کہ کچھ لوگ سوغات میں نہیں لکھیں گے، اور یہ ایسے لوگ نہیں ہوں گے جن کی کمی سے میری یا کسی کی نیندیں خراب ہوں۔ سوغات کو میں کچھ بنانا چاہتا ہوں اگر اس میں کامیاب ہو جاؤں تو پھر یہ سارے "عیوب" خوبیوں میں شمار ہونے لگیں گے۔

۱۰۔ اجمل کمال صاحب نے خالد اختر صاحب کا پتہ بھجوایا ہے اور لکھا ہے کہ اگر سوغات سو سوا سو صفحات دے سکے تو وہ خالد اختر صاحب پر مواد مہیا کرنے کی ذمے داری قبول کرنے پر تیار ہیں۔ اندھا کیا چاہے۔ میں نے فوراً جواب دیا ہے کہ انھوں نے بالکل میرے دل کی بات کہی ہے اور سو سوا کیا، دو سو صفحات ان کے لیے رکھے جا سکتے ہیں۔

۱۱۔ (۲۸ فروری ۹۳ء) خلیل [مامون] دس دن اسپتال میں رہے۔ دو دن Intensive care میں تھے۔ اب پچھلے آٹھ دس دن سے گھر میں ہیں۔ قلب کی شکایت تھی۔ ہلکا سا دورہ پڑا تھا۔ بہت پریشانی رہی۔ ان سے بڑا قلبی تعلق ہے۔ بڑا ہیرا آدمی ہے۔ ہر ایک کی مدد کے لیے تیار، سب کے کام آنے والا، بے غرض، بے ریا۔ دعا کیجیے۔

۱۲۔ (۲۲/ اکتوبر ۹۳ء) تبصروں کا دکھ مجھے پہلے شمارے سے ہے، لیکن علاج؟ ۔۔۔۔ آپ جانتے ہیں۔ میں "پیشہ ور" لکھنے والا نہیں ہوں۔ جب تک کوئی کتاب یا کوئی بات provoke نہ کرے لکھنے کی خواہش ہی پیدا نہیں ہوتی، اور پھر اپنی حدود سے بھی آگاہ ہوں ۔۔۔۔ بہرحال یہ طے شدہ ہے کہ تبصروں کے سلسلے میں آپ کے ساتھ میں بھی بہت دل برداشتہ ہوں۔ آپ ہی کوئی صورت بتائیے اس مسئلے کو حل کرنے کی۔

روٹ کینال ٹریٹمنٹ کے سلسلے میں ضمناً یہ بھی بتا دوں کہ علاج ایک محترمہ نے کیا تھا، بالکل ویسی ہی جیسی وہ خاتون تھیں جن کو غالب چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے تاکتے تھے اور طریقہ علاج کی مجبوریاں ایسی تھیں کہ زیادہ وقت "تھا جو کچھ" درد " کے سوا آغوش ہی آغوش تھا!" یقین نہیں آتا تھا کہ یہی وہ سر ہے جو وبال دوش تھا (ہے)۔ انھیں باتوں سے تو اللہ میاں کے قانون تلافی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

۱۳۔ (۱۵ دسمبر ۹۳ء) دوسرے ہفتے میں جواد بیوی اور بچی کے ساتھ آ گئے، اور جناب اس بچی، سکینہ، نے ایسا جادو کیا کہ کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔ اب تفصیل کیا لکھوں۔

صوفیانہ سلوک کے سلسلے میں جو اشعار آپ نے نقل کیے ہیں انھیں پڑھ کر عجیب کیفیت طاری رہی۔ "مردگاں را چو زندگاں انگار" پر وجد کرتا رہا۔ فارسی شاعری کے سامنے ہر زبان کی شاعری پر لعنت بھیجنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک شعر اب یاد نہیں کس کا ہے ۔۔۔۔ ہمیشہ وردِ زبان

رہتا تھا، ملا صاحب کے بعد اس کا سحر ٹوٹ گیا۔

مرا از روز قیامت اگر غم است این است   کہ روئے مردم عالم دو بارہ باید دید

۱۴۔ (۱۲ مئی ۹۴ء) ---- کے اسلوب پر آپ کو کوئی "خاص اعتراض" نہیں۔ مجھے ہے ----
تنقیدی مضامین میں رنگین بیانی، داستان کہنے کا انداز، اصل موضوع سے بار بار ہٹ کر، بھٹک کر دور دراز کی "بادہ پیمائیاں" اشعار کا استعمال، بے تکلف انداز گفتگو تحریر میں پیدا کرنے کی پر تکلف کوششیں، کچھ حملہ، کچھ جارحیت۔ یہ سب ----کی تحریر میں آپ کو ملے گا۔ کہیں کم، کہیں زیادہ۔ طوالت بہ نفسہٖ نہ خوبی ہے نہ خامی، سوال یہ ہے کہ آپ موضوع کو کس طرح برتتے ہیں۔ بات کو پڑھنے والے تک پہنچانا ہر تحریر کا پہلا مقصد ہوتا ہے۔ الجھاوے پیدا کرنے سے گریز بہت ضروری ہے اور پھر بلاوجہ کے الجھاوے۔ تو یہ سب باتیں ایسی نہیں ہیں کہ ان کے بارے میں آپ یہ فرمائیں کہ ان کے اسلوب پر آپ کو کوئی "خاص اعتراض" نہیں ہے ---۔ تقریباً یہ سب باتیں ایک سے زیادہ بار میں ان کو لکھ چکا ہوں۔ بھائی، ان لوگوں سے ایک قلبی تعلق ہے۔ ان کی صلاحیتوں سے بڑی توقعات ہیں، اسی وجہ سے ان کی کمزوریاں دکھ بھی پہنچاتی ہیں۔ کمزوریاں تو ہوتی ہیں لیکن نشان دہی کے باوجود اگر لکھنے والے خود احتسابی، دروں بینی سے کام نہ لیں اور ان کوتاہیوں کو دور کرنے کی سعی نہ کریں تو پھر "نوا را تلخ تری زن" پر عمل کرتا ہوں اور شاید یہیں سے آپ اور ہم الگ راستوں پر ہو جاتے ہیں۔

۱۵۔ (۳۰ مئی ۹۴ء) خدا کرے عرفان صاحب کا کام ہو گیا ہو۔ منقبت [از: عرفان صدیقی] کئی بار اب تک پڑھ چکا ہوں۔ عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ کیا عجب کہ اس کی برکت اس بار بھی اپنا کام کر جائے۔

۱۶۔ (۲۰ جون ۹۴ء) عرفان صاحب کا بھی دو ایک دن پہلے خط آیا۔ بڑی مسرت ہوئی کہ ان کا کام بن گیا۔ آپ نے بالکل صحیح لکھا تھا کہ منقبت اور سلام سے توقع لگی ہوئی ہے۔ سچ ہے:

کریں دل جو ان کے حوالے ہی۔ تو کرم پھر ان کا سنبھالے ہی۔ کہ ہیں وصف ان کے نرالے ہی

۱۷۔ (۲۲ جولائی ۹۴ء) یہ تضمین حامد حسین قادری مرحوم و مغفور کی ہے ---۔ کوئی پچاس سال پہلے دیکھی تھی ----۔ کسی نے کہا کہ "بلغ العلیٰ بکمالہ" کے قافیے اردو میں نہیں مل سکیں گے۔ مولانا نے وہ مصرعے لکھ دیے جو میں نے آپ کے خط میں لکھے تھے۔ شاید اور بھی کچھ تھا لیکن اب یاد نہیں۔ وہ تین مصرعے اس وقت بھی تیر کی طرح دل میں لگے تھے اور آج بھی دل پر نقش ہیں۔ لکھنے والے کتنے بد نصیب ہیں، یہ سارا پس منظر ان کے لیے "اجنبی" ہے۔

۱۸۔ (۳ ستمبر ۹۴ء) افضال حسین، جمال حسین، خورشید احمد اور محمد عقیل صاحبان کو برابر سوغات بھجواتا رہا۔ خطوط لکھے لیکن کوئی جواب نہیں۔ افضال حسین صاحب نے نارنگ کے پہلے شمارے میں شائع شدہ، مضمون کے تعلق سے ایک مضمون بھیجا، اس وقت جب تیسرا شمارہ

بھی شائع ہو چکا تھا۔ میں نے معذرت کی کہ اب بہت دیر ہو گئی۔ اس کے بعد کسی کی طرف سے کوئی مضمون نہ خط ---- اب بتایئے میں کیا کروں؟ میں خود چاہتا ہوں کہ نئے لکھنے والے ملیں، لیکن کیسے اور کہاں سے؟ مجھے "عالموں" کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو ایسے لوگوں کی تلاش میں ہوں جن کے لیے ادب کا پڑھنا اور لکھنا ایک passion ہو، آصف کی طرح ---- صاحب شاعری پر لکھتے ہیں تو سوائے ---- اور ---- کے اور کسی کا کلام ان کو نہیں ملتا اور ایک صاحب ہیں، مضمون بھیجتے ہیں اور اس میں ---- کے نام کے ساتھ "استاذی" کی گردان کرتے ہیں۔ مجھے تو ---- ادیبوں اور شاعروں سے الرجی ہونے لگی ہے اور ان سے محفوظ رہنے کی ایک ہی صورت نظر آتی ہے اور وہ ہے، پہلے کی طرح، اپنے بے مصرف اور بے معنی مشاغل کی طرف لوٹ جاؤں۔

۱۹۔ (۱۳ مارچ ۹۶ء) "اہلِ قلم حضرات" کی داستان تو اسی وقت بیان ہو سکے گی جب مل بیٹھنے کی کوئی صورت پیدا ہو ---- آئے ہوئے تھے۔ فون پر بات ہوئی۔ میں ٹالنا چاہتا تھا۔ دو تین دن کے بعد پھر "نیاز مند ہوں۔ آپ نہ بلائیں تب بھی دروازہ کھٹکھٹانے آجاؤں گا۔" آئے۔ تین چار گھنٹے جہاں بیٹھے تھے اس کمرے کی فضا متعفن ہو گئی۔ ہر ایک کا ذکر تحقیر کے ساتھ۔ استہزا غیبت غیبت غیبت۔ اگر غیبت نہیں تو اپنی کارگزاریاں ---- اسفل السافلین انھیں لوگوں کے لیے آیا ہے۔

یہ اشرف خوب آدمی نکلے۔ اب تک تو صرف خطوط کی تبادلہ رہا ہے لیکن ملاقات کے بغیر ہی ان سے ایک تعلق پیدا ہو گیا ہے۔

عرفان صاحب کے خط کا بھی انتظار تھا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ "زمینی" پریشانیوں کا شکار ہیں۔ اللہ میاں کم از کم دو ایک سال اور ان کو اپنی "بازیافتہ فردوس" میں رہنے دیں۔

۲۰۔ (۱۲ مئی ۹۶ء) بھائی، اگر صرف "مزاج کی لہر" عرفان صاحب سے یہ غزلیں لکھوا رہی ہے تو اللہ مبارک کرے، بڑے سستے داموں یہ دولت ان کو مل گئی۔ جی ہاں، یہ بات اہم ہے کہ یہ "واردات" ان کے ساتھ کیا سلوک کر جاتی ہے۔ عرفان صاحب جس رفتار سے لکھ رہے ہیں اس سے ایک ڈر کم از کم مجھے یہ ہوتا ہے کہ یہ شاید اندر ہی اندر جل کر کوئلے کو ہیرا بنانے والی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ تجربے ضائع ہو جاتے ہیں۔ عمر کی اس میں قید ہے نہ حالات کی۔ عرفان صاحب خوش نصیب ہیں۔ دل کے گداز اور دردمندی کا جو عالم اس زمانے میں رہتا ہے وہ خود کیسی بڑی نعمت ہے۔ صرف مزاج کی لہر سے غزلیں تو ہو جائیں گی لیکن یہ دولت کیسے ملے گی۔

---- کے افسانوں کی کمزوریوں کے سلسلے میں ---- دو ایک باتیں میں نے عرض کی تھیں ---- طوالت ان کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ دوسری خامیاں اس کی وجہ سے بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ افسانے کو compact بنانے میں وہ کمزور ہیں، گو ہمیشہ نہیں۔ نئے لکھنے

والوں کی ہمت افزائی، قدر شناسی بہت ضروری ہے، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ان کی کم زوریوں کی بھی نشان دہی ہوتی رہے ورنہ اکثر لکھنے والے کافی باصلاحیت، ان خامیوں پر "راسخ" ہو جاتے

۲۱۔ (۱۲ جون ۹۶ء) بھائی صاحب کی وفات کا جو صدمہ آپ کو ہوا ہے اس کا کچھ اندازہ میں کر سکتا ہوں۔ چودہ سال ہوئے اس جاں کاہ تجربے سے گزر چکا ہوں۔ چھوٹا بھائی، دوست، بھائی، بیٹا، میرے لیے سب وہی تھا۔ ایسا تعلق تھا کہ جاننے والے کہتے تھے یہ محبت نہیں عشق ہے۔ پاکستان میں تھا، اس کے بعد دبئی آگیا تھا۔ بنگلہ دیش کی قیامت سے بچ کر نکلا لیکن High B.P. کا روگ ایسا تھا کہ جان لے کر ٹلا۔ اس کی موت کے بعد پورا ایک سال میں B.P. کا شکار رہا۔ کوئی دوا کارگر نہیں ہوتی تھی۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ جب تک اس trauma سے آپ نہیں نکلیں گے ہماری دوائیاں کچھ نہیں کر سکیں گی۔ ہم صرف آپ کے قلب کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بہ ہر حال اب کیا بتاؤں برسوں کیا حال رہا۔ میرے گھر میں آپ نے اس کی تصویر دیکھی ہوگی۔ کئی لوگ سمجھتے ہیں میری تصویر ہے۔ وہ بنگلور آتا تو میری عید ہو جاتی تھی۔ پڑھائی کے زمانے میں جواد امریکہ سے آتا تھا تو جب میں اسے لینے ایرپورٹ جاتا تھا تو بے اختیار بچوں کی طرح رو پڑتا تھا۔ ساتھ والے سمجھتے بیٹے کی آمد پر خوشی کے آنسو ہیں، لیکن مجھے وہ دن یاد آجاتے تھے جب میں چھوٹے بھائی کو لینے اسی ایرپورٹ پر آتا تھا۔ وقت نے اس شدت میں یقیناً کمی کر دی ہے لیکن کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب اس سے دو باتیں نہیں ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ کی باتیں سمجھ نہیں آتیں۔ کیا کریں۔ بہت مجبور، بہت بے بس ہیں، ہم سب۔

وضاحتیں

پہلے خیال تھا کہ محمود ایاز کے خطوط کے یہ اقتباس موضوع وار نقل کیے جائیں، لیکن اس صورت میں ان کی حیثیت کچھ فرمودات کی سی ہو جاتی، اس لیے مناسب یہی معلوم ہوا کہ انھیں تاریخ وار درج کیا جائے۔ خطوں میں بعض افراد کے شخصی کردار اور انھیں کے ادبی اسلوب پر محمود ایاز نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ نقل میں ان افراد کے ناموں کی جگہ نقطے لگا دیے گئے ہیں۔

خط ۴: آصف فرخی کا مضمون "نصوح۔ بیضے سے کتاب سوزی تک" ان کے خصوصی مطالعے (سوغات شمارہ ۲۔ مارچ ۱۹۹۲ء) میں شامل ہے۔

خط ۵: اس سلسلے میں اجمل کمال کے ایک خط (۲۵/ مئی ۹۲ء) کا اقتباس درج ذیل ہے:

"آپ کے خط میں محمود ایاز صاحب کا ردِ عمل پڑھ کر مجھے بھی بہت لطف آیا۔ خاص طور پر اس بات سے بھی بہت محظوظ ہوا کہ انھوں نے میرے خط کو نوجوانی کا شاخسانہ قرار دیا (مجھے ان کی اس بات کی قدر کرنی چاہیے) لیکن اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ

میں نے ان کے خط کا جواب کسی غصے یا اشتعال کی کیفیت میں لکھا تھا۔ ایسا نہیں ہے۔ ہاں میں نے خوش دلی اور (غالباً کچھ ناروا) بے تکلفی سے خط لکھا تھا۔ ناکام مزاح سے زیادہ افسوسناک کوئی چیز نہیں ہو سکتی، اور یہ حادثہ مجھے بارہا پیش آیا ہے۔"

خط ۱۲ : محمود ایاز دانتوں کی تکلیف میں مبتلا ہو گئے تھے اور Root Canal treatment کرا رہے تھے۔ جس میں زیادہ دن لگتے ہیں۔

خط ۱۳: جواد: محمود ایاز کے فرزند مقیم امریکہ۔

اس خط میں "ملا صاحب" سے مراد جہانگیری دور کا فارسی شاعر ملا محمد صوفی مازندرانی ہے۔

خطوط ۱۹، ۲۰: عرفان صدیقی نے عشقیہ غزلوں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ "عشق نامہ" کے عنوان سے اس سلسلے کی ۱۸ غزلیں "شب خون" میں اور ۱۲ غزلیں "سوغات" (شمارہ ۱۰، مارچ ۱۹۹۶ء) میں چھپی تھیں (ان غزلوں کے مجموعے کا نام بھی "عشق نامہ" ہے)۔

(نیر مسعود)

○ ○ ○

فضیل جعفری

محمود ایاز اور اختر الایمان

(ایک سرسری تاثر)

علم و ادب سے متعلق مباحث میں کلیشیز سے دامن بچانا ضروری بھی ہوتا ہے اور مستحسن بھی، لیکن: بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
کے مصداق کبھی کبھی آپ اپنی بات کو آگے بڑھانے کے لیے کسی نہ کسی کلیشے کا سہارا لینے پر مجبور ہوجاتے ہیں، مثال کے طور پر محمود ایاز کی شخصیت اور ادبی خدمات کے بارے میں خواہ کسی بھی زاویے سے لکھیں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ وہ ایک بے حد پڑھے لکھے آدمی تھے۔ ہمارے درمیان ایسے کئی ادیب اور شاعر موجود ہیں جن کے مطالعے کی " وسعت " افسانوی شہرت حاصل کرچکی ہے مگر ان کی تحریروں سے وسعت مطالعہ یا کثرت مطالعہ کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی تو یہ شک ہوتا ہے کہ شاید ان لوگوں نے کتابیں کم پڑھی ہیں۔ کتابوں پر تبصرے زیادہ پڑھے ہیں۔

محمود ایاز کا معاملہ یہ نہیں تھا۔ وہ لفظی طور پر بے حد پڑھے لکھے آدمی تھے۔ سیکڑوں برسوں پر محیط اردو کے تمام خم و پیچ سے یوں آگاہ تھے گویا ہر زمانے میں اور ہر راستے سے وہ بہ نفس نفیس گزرے ہوں۔ برطانوی، امریکی، روسی اور فرانسیسی ادب (خصوصاً فکشن) کے ایک بڑے حصے سے وہ بہ خوبی آگاہ تھے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ پڑھا تھا اسے ہضم بھی کیا تھا۔ ان کی یاد داشت بھی غضب کی تھی۔ بقول نیر مسعود " ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کچھ انھوں نے ابھی ابھی پڑھا ہے۔ "

اگر چہ محمود ایاز " سوغات کے مدیر کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوئے لیکن شاعر اور مترجم کی حیثیت سے بھی وہ کم پایہ نہیں تھے۔ جہاں تک تنقید کا سوال ہے یقیناً وہ پیشہ ور ناقد نہیں تھے۔ ایاز صاحب نے چند مضامین اور مبسوط تبصرے ضرور لکھے لیکن وہ سب " سوغات " کے صفحات تک ہی محدود رہے۔ شاعری کی طرح انھوں نے اپنے مضامین، تبصروں کا بھی کوئی مجموعہ شائع نہیں کرایا۔ ان کی زندگی کا واحد نہ سہی تو بھی سب سے بڑا مقصد اردو کے بچے کھچے قارئین کو سوغات کے ذریعے بہتر سے بہتر ادب سے متعارف کرانا تھا۔ ماضی قریب و بعید کے

بعض عہد ساز اور مایۂ ناز ادیبوں نیز ان کے تخلیق کردہ ادب کی بازیافت بھی ایاز صاحب کے اسی منصوبے کا حصہ تھی۔

ایاز صاحب کا کہنا تھا کہ بسا اوقات قاری کی رائے پیشہ ور نقادوں کی رائے کے مقابلے میں کہیں زیادہ صائب ہوتی ہے۔ وہ بہ طورِ اصول خود کو ادب کا قاری سمجھتے تھے۔ عام طور سے ادبی رسائل کے اداریے خاصے مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔ مضحکہ خیز نہ بھی ہوں تو بھی بے رنگ ضرور ہوتے ہیں۔ سوغات کے اداریے زندگی سے بھرپور (Lively) ہوتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ محمود ایاز سوغات کے ہر شمارے کے مشمولات (خصوصاً اہم تنقیدی مضامین اور افسانوں) سے متعلق اپنے اداریے میں کھل کر لکھتے اور نگارشات کے حسن و قبح سے بحث کرتے۔ بعض لوگوں کو ان کا یہ رویہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس طرح ایاز صاحب قاری کے ذہن کو Prejudice کر دیتے ہیں۔ ایاز صاحب کی دلیل یہ تھی کہ مدیر کو بھی اپنی بات کہنے کا حق ہوتا ہے۔ چوں کہ مدیر خطوط کے کالم میں حصہ نہیں لے سکتا اس لیے اداریہ ہی ایک ایسا فورم ہے جس کے توسط سے وہ قارئین سے براہِ راست مخاطب ہو سکتا ہے۔

ہم عصر شاعروں میں، محمود ایاز کو اخترالایمان کی شخصیت اور شاعری دونوں سے غیر معمولی شغف تھا۔ وہ اخترالایمان کی شاعری کے زبردست مداح تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کی کم زوریوں کی نشان دہی کرنے میں بھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ ستمبر ۱۹۹۱ء میں جب انھوں نے تیسری بار سوغات کا اجرا کیا تو پہلے شمارے میں ہی اخترالایمان پر ایک مبسوط گوشہ شامل تھا ان کے اداریتی نوٹ میں یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اخترالایمان اب اردو کے بڑے شاعر کی حیثیت سے تسلیم اور قبول کیے جا چکے ہیں۔ فیض سے قطعِ نظر کریں تو اردو کے جدید شاعروں میں شاید ہی کسی اور شاعر کو صرف شاعری کی بنیاد پر اخترالایمان سے زیادہ داد و تحسین ملی ہو۔ اخترالایمان بجا طور سے اس کے مستحق ہیں اور برسوں سے ان کی شاعری سے جو بے اعتنائی برتی گئی تھی اس کی تلافی بھی ضروری تھی۔ لیکن ہم لوگ افراط و تفریط سے نہیں بچ سکتے۔ اگر ایک عرصے تک اخترالایمان کی شاعری کو نظر انداز کیا جاتا رہا تو اب کوئی یہ کہنے والا نظر نہیں آتا کہ آج کل اخترالایمان بہت کم زور شاعری کرنے لگے ہیں۔"

ہم میں سے کتنے لوگ اپنے سب سے زیادہ پسندیدہ اور اپنے عہد کے اہم ترین شاعر کے بارے میں اتنے بے لاگ اور منھ پھٹ انداز میں بات کرنے کی جراءت کر سکتے ہیں؟ ایاز صاحب کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی تنقیدی اور ذہنی دیانت داری پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ چوں کہ ایاز کو اختر صاحب سے غیر معمولی انس تھا اس لیے ان کی خواہش تھی

کہ ان کا محبوب شاعر جو کچھ بھی لکھے وہ قدرِ اول کی چیز ہو۔ اب یہ الگ بات ہے عملاً ایسا ہونا کم و بیش ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذاتی طور پر مجھے ایاز صاحب کے نقطہ نظر سے پہلے بھی اختلاف تھا اور اب بھی ہے۔

بڑے سے بڑے شاعر کے تخلیقی سفر میں ایسے موڑ آتے ہیں جب اس کی رفتار سست پڑجاتی ہے۔ کبھی کبھی تو ہمت اس حد تک جواب دے جاتی ہے کہ قدموں کو گھسیٹ گھسیٹ کر آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ بہتیرے شاعر تو منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی ڈھیر ہوجاتے ہیں۔ اخترالایمان کے خلاقانہ ذہن کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ وہ اپنی طویل اور شدید بیماری کے باوجود نہ صرف متواتر لکھتے رہے بلکہ اچھا لکھتے رہے۔ "زمستان سرد مہری کا" جو اختر صاحب کی شاید آخری مطبوعہ نظم تھی اتنی متاثر کرنے والی تھی کہ محمود ایاز نے اختر صاحب کی موت کے بعد اسے سوغات کے دسویں شمارے میں "شب خون" سے نقل ہی نہیں کیا بلکہ اسے اخترالایمان کی بہترین نظموں میں بھی شمار کیا۔ محمود ایاز کو اس بات سے یقیناً بڑی ذہنی طمانیت حاصل ہوئی ہوگی کہ ان کے پسندیدہ شاعر نے اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں بھی انھیں ناامید اور مایوس نہیں کیا۔

محمود ایاز نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "اخترالایمان کی شاعری چونکاتی نہیں۔ دھیرے دھیرے سحر کرتی ہے اور جادو جگاتی ہے" خود محمود ایاز کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ انھیں اخترالایمان کی شاعرانہ عظمت کا احساس کافی تاخیر سے ہوا۔ "سوغات" کا تاریخ ساز جدید نظم نمبر ۱۹۶۵ء کے آس پاس شائع ہوا تھا۔ اس وقت تک اخترالایمان کے کئی مجموعے: تاریک سیارہ، گرداب، آب جو اور سب رنگ شائع ہوچکے تھے۔ یادیں، (جس پر اختر صاحب کو ساہتیہ اکادمی انعام ملا) طباعت کے مراحل سے گزر رہا تھا لیکن اس میں شامل کئی اہم نظمیں مثلاً "ایک لڑکا" اور "یادیں" وغیرہ رسائل کے صفحات کی زینت بن کر قارئین کے ہر طبقے سے داد و تحسین وصول کرچکی تھیں لیکن جدید نظم نمبر کی اشاعت تک محمود ایاز کے نزدیک راشد اور میراجی ہی نہیں عزیز حامد مدنی اور ضیا جالندھری بھی اخترالایمان سے زیادہ اہم اور مستند شاعر تھے۔ اخترالایمان ان پندرہ شاعروں میں سے ایک تھے جن کی نظموں پر شعرا کے نام مخفی رکھتے ہوئے تبصرے کرائے گئے تھے۔ پندرہ شاعروں کی اس فہرست میں شہریار، ساقی فاروقی اور جلیل حشمی وغیرہ کے علاوہ خود محمود ایاز بھی شامل تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جدید نظم نمبر تک ایاز صاحب کے لیے اخترالایمان محض ایک ابھرتے ہوئے جدید شاعر تھے۔

جیسے جیسے محمود ایاز کی تنقیدی نظر تیز اور توانا ہوتی گئی، ان کے اور اخترالایمان کے درمیان فاصلے بھی مٹتے گئے۔ سوغات کے تیسرے دور میں تو اخترالایمان اور محمود ایاز لازم و ملزوم بن گئے تھے۔ حالاں کہ اس دور میں بھی محمود ایاز نے اخترالایمان کی غیر مشروط تعریف

کبھی نہیں کی۔ اختر صاحب اپنی شاعری کے سلسلے میں بہت ہی حساس، زود حس اور زود رنج تھے۔ وہ معمولی سی تنقید بھی برداشت نہیں کر پاتے تھے۔ وقتاً فوقتاً نقاد کے وجود سے ہی منکر ہو جاتے تھے لیکن انھوں نے محمود ایاز کی تنقید کا کبھی برا نہیں مانا۔ انھیں ایاز صاحب کے خیالات سے خواہ اتفاق نہ ہو لیکن ان کی نیک نیتی پر پورا اعتماد تھا۔ نیک نیتی کے علاوہ محمود ایاز میں ایک اور بہت اہم خوبی بھی تھی جو غالباً ان کے وسیع مطالعے اور مختلف قسم کی کڑی آزمائشوں سے گزرنے کا نتیجہ تھی۔ مرحوم نازک سے نازک موقعوں پر بھی جذباتیت کو خود پر غالب نہیں ہونے دیتے تھے۔ اخترالایمان کا انتقال ۹ مارچ ۱۹۹۶ء کو ہوا۔ سوغات کا دسواں شمارہ نہ صرف تیار تھا بلکہ ابتدائی چند صفحات کے علاوہ پورا پرچہ پریس کے حوالے کیا جا چکا تھا محمود ایاز کے لیے اختر صاحب کا انتقال ایک عظیم ادبی سانحہ ہی نہیں ذاتی سانحہ بھی تھا۔ لیکن انھوں نے اس وقت بھی خود کو رقیق القلبی کا شکار نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے زیرِ تذکرہ سانحے کے صرف دو دنوں بعد یعنی ۱۱ مارچ کو اپنے ادارتی نوٹ میں جہاں یہ لکھا کہ "اخترالایمان کی موت سے جدید شاعری کے قبیلے کا آخری سردار اٹھ گیا" وہیں یہ بھی لکھا کہ:

> "وقت اور جگہ کی کمی کی وجہ سے اخترالایمان کی بہت کم نظمیں دی جا رہی ہیں ...... ویسے میری ناقص رائے میں یہ چند نظمیں بھی (محبت، آخرِ شب، اندوختہ، بند کمرہ اور زمستان سرد مہری کا) اخترالایمان کی شاعری کی بنیادی خصوصیات اور خوبیوں کی آئینہ دار ہیں۔ ان نظموں میں جو شاعری ہوئی ہے وہ "ایک لڑکا" کی خطیبانہ بلند آہنگی سے آگے کی چیز ہے .... اخترالایمان کی اصل شاعری ایک دائرے کے اندر ہے۔ وہ اس دائرے میں مقید نہیں تھے باہر بھی بہت نکلتے رہے لیکن ان کی ارفع تر، دلوں کو چھونے والی سچی اور زندہ شاعری اس دائرے کے اندر ہی ملے گی اور اسی سے ان کا نام اردو کے ناقابلِ فراموش شاعروں میں ہوگا......"

محمود ایاز کو اس بات کا احساس تھا کہ بہت سے لوگ اخترالایمان کی شاعری کے بارے میں ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں کریں گے۔ انھوں نے کھلے دل سے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ خود اخترالایمان کو ان کی رائے سے اتفاق نہیں تھا لیکن محمود ایاز اپنے ایقان کا بے محابا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اتفاق رائے اور اختلاف رائے سے قطعِ نظر، حقیقت یہ ہے کہ محمود ایاز نے اخترالایمان کی بعض بے حد اہم بلکہ شاہ کار نظموں مثلاً ایک لڑکا، یادیں، ڈاسنہ اسٹیشن کا مسافر اور بنتِ لمحات وغیرہ کے مقابلے میں محبت اور بند کمرہ جیسی نظموں کو ترجیح دے کر اخترالایمان کے نقادوں کو ایک مشکل اور پے چیدہ صورتِ حال سے دوچار کر دیا ہے۔ کیا اخترالایمان کی شاعری واقعی دائرے کے اندر کی شاعری ہے اور کیا اخترالایمان کے بنیادی

سرد کار اور شعر کے حوالے ۹۶-۱۹۹۵ء میں وہی تھے جو ۴۶-۱۹۴۵ء میں تھے؟ جیسے غور طلب سوالات محمود ایاز سے پہلے کسی نے نہیں اٹھائے تھے۔

ایاز صاحب، اخترالایمان کی بے پناہ عزت کرنے کے باوجود، جن معاملات میں ان سے اختلافات رکھتے تھے ان کے اظہار میں کبھی تکلف سے کام نہیں لیتے تھے۔ ترقی پسند شاعروں سے اختر صاحب کی نوک جھونک کا سلسلہ کافی پرانا تھا۔ ۱۹۹۰ء میں انھوں نے کراچی میں کسی کو انٹرویو دیتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی جینوئن شاعر نہیں ہیں۔ سردار جعفری کو زیادہ سے زیادہ موزوں طبع کہا جاسکتا ہے جب کہ کیفی اعظمی شاعر نہیں صرف شعرساز (Versifier) ہیں۔ اخترالایمان کے الزام کی نوعیت شدید تھی۔ انھوں نے اپنے دو مشہور ہم عصروں کو سرے سے شاعر تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا تھا لیکن اردو والوں نے اس سلسلے میں کسی قابلِ ذکر ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ اسی دوران جب ایاز صاحب نے اخترالایمان کا بنگلور دوردرشن کے لیے انٹرویو کیا تو انھیں اس مسئلے پر چاروں طرف سے اور بار بار گھیرا۔ آخر میں یہاں تک کہہ دیا کہ خود اخترالایمان کی حالیہ نظمیں شاعری کے نہیں بلکہ محض شعرسازی کے نمونے ہیں۔

" ایمانیات " کے سلسلے میں محمود ایاز کا اہم ترین عطیہ اخترالایمان سے ان کی خود نوشت کا لکھوانا تھا۔ اختر صاحب نے اپنی زندگی میں صدہا ریڈیو فیچرز، فلموں کے منظر نامے اور مکالے لکھے، متعدد کامیاب فلموں کی کہانیاں لکھیں۔ تخیل کی رنگارنگی اور بلند پروازی کے علاوہ زبان و بیان پر قابلِ رشک قدرت ان کی اہم خصوصیات تھیں لیکن وہ طبعاً ادبی نثر نگاری کی طرف مائل نہیں تھے۔ ان کی نثرنگاری مجموعہ ہائے کلام کے دیباچوں تک محدود تھی۔ ہاں انھوں نے اپنی سرگزشت کے نام پر چند صفحات ضرور لکھے تھے جن کا تعلق ان کے خاندانی پس منظر اور ابتدائی مصائب و مشکلات سے تھا۔

محمود ایاز نے ضد کرکے اخترالایمان سے ان کے سوانح حیات لکھوائے۔ اگر ایاز صاحب نہ ہوتے اور وہ کم و بیش تین دہائیوں بعد ایک بار پھر " سوغات کے اجرا کا فیصلہ نہ کرتے تو اختر صاحب کے ساتھ ہی ان کی یادوں، زندگی کے نشیب و فراز اور متنوع تجربات کا ان مول خزانہ بھی دفن ہوجاتا۔ اردو ادب " اس آباد خرابے میں " جیسی اہم اور دل چسپ کتاب سے محروم رہ جاتا۔

اخترالایمان کو جاننے پہچاننے والے اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ان کا مزاج غیر معمولی نفاست، شائستگی اور اعلیٰ ظرفی سے عبارت تھا۔ وہ خود نوشت کے بہانے نہ تو دوسروں کو ننگا کرنے کے اہل تھے اور نہ ہی ان کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ خود کو قاری کے سامنے برہنہ کر سکیں اس کے باوجود " اس آباد خرابے میں " انھوں نے اس دور کی پوری تاریخ رقم کر دی ہے جس کا

وہ خود ایک اہم حصہ اور کردار تھے " اس آباد خرابے میں " اختر صاحب نے اپنی ادبی، ثقافتی اور فلمی زندگی سے متعلق جو واقعات بیان کیے ہیں وہ اتنے دل چسپ ہیں کہ اگر ان کی بنیاد پر کوئی دستاویزی فلم بنائی جائے تو اسے وہ لوگ بھی یقینی طور سے پسند کریں گے جو اختر صاحب اور اردو ادب سے یکسر ناواقف ہیں۔

آخر میں ہم اتنا اور عرض کر دیں کہ اگرچہ محمود ایاز نہ تو اختر صاحب کے سوانح نگار تھے اور نہ ہی انھوں نے ان کے بارے میں کوئی تنقیدی کتاب لکھی لیکن بقول شفیق فاطمہ شعریٰ، انھوں نے نئے " سوغات " کے ذریعے اختر صاحب کو اتنا چاہا کہ لوگ باگ ان سے رشک کرنے لگے۔ مستقبل میں جب کبھی کوئی اسکالر اخترالایمان کی زندگی اور شاعری کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھے گا اس کے لیے محمود ایاز کا ذکر بھی ناگزیر ہوگا۔

00 000 00

زماں، مکاں اور شاعری

[اس نامکمل مضمون کا مسودہ محمود ایاز کے کاغذات میں دست یاب ہوا۔ غالباً ترجمہ ہے]

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ دوسرے علوم کی طرح طبعیات بھی شکوک اور بے یقینی کی وادیوں میں پہنچ گیا۔ نظریہ۔ اضافیت کوانٹم تھیوری اور الیکٹرون کے ساتھ ہم دوبارہ ایک غیر دریافت شدہ دنیا میں سفر کر رہے تھے۔ اگر خدا ریاضی داں ہے تو پھر ریاضی داں حضرات کو ہمیں خدا تک واپس لے جانا چاہیے۔

ہم دیکھ رہے تھے کہ جدید انسان وقت کو ایک گھڑی کے چہرے اور کیلنڈر کے صفحات کے ذریعے منضبط کرنے پر تقریباً مجبور ہو گیا ہے۔

معینہ اوقات کے اس دور میں وقت کو لمحوں، گھنٹوں اور ماہ و سال کی زنجیروں میں جکڑنے کا یہ طریقہ ناگزیر ہی لیکن یہ طریقہ انسان کے اپنے ذہن کے اندر گزرنے والی کیفیتوں کے تصور کو ممکن نہیں کرتا۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے یا اس سے اس نکائت کی تائید ہوتی ہے کہ زندگی اک مسلسل مگر واضح لمحات کا تسلسل اور فوری واقعات کی استمراری پیدائش کا نام ہے گو اس کے مقابلے میں تمام تخیل اور فنی تجربات کا اصرار اس بات پر ہے کہ زندگی جہاں تک ہمارے مشاہدے کا تعلق ہے، ایک وقفہ ہے۔ مثال کے طور پر ساز کے پہلے پردے سے نکلی ہوئی آواز اس وقت موجود ہوتی ہے جب ساز کے آخری پردے سے آواز نکل رہی ہو۔ ایک اچھے ڈرامے کا پہلا منظر ہمارے ذہن سے اتنا ہی قریب ہوتا ہے جتنا کہ انتہائی منظر۔ تمام زندگی اتصال ہی سے اور بہاؤ ہی سے ماضی حال میں مدغم ہو کر مستقبل کے خاکے کی تعمیر کرتی ہے۔ بعض صاحبان کشف کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ وقت کے لواحق سے آزاد ہو کر مستقبل میں ہونے والے واقعات کے مشاہد ہو سکتے ہیں، ایسے خیالات کو خوش آرزومندانہ فکر کا نام دے کر نظرانداز کیا جا سکتا ہے بلکہ عموماً یہی کیا جاتا ہے۔ گو ابدیت کو مان لینے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمام حقائق کی ابدی موجودگی کو قبول کر لیا جائے۔ لیکن اب سائنس یہ اشارہ کر رہی تھی کہ وقت کا عمل ہمارے وجود میں وقوع پذیر ہوتا ہے اور اس طرح نئے دور کی فکر و تجسس ہمیں دوبارہ قدیم مشرقی سریت اور ازمنہ وسطیٰ کی دینیات کی طرف لے جا رہی ہے۔"

(H.V.Routh : English literature and idea in the 20th Century)

جوائس کے یولیسس کی فکر کے سراغ میں ہمیں زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں

پڑتی کیوں کہ تھوڑے ہی فاصلے پر ہم سائنس کے چند ایسے نئے نظریات سے دوچار ہوتے ہیں جو وقت کے تصور پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ان نظریات کا پرتو اس نئے ادبی اسلوب میں ملتا ہے جو ہمارے دور کی مخصوص چیز ہے۔ مادہ پرستوں میں خارج اور داخل ایک دوسرے سے کٹے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مادہ خواہ کتنا بھی اسے توڑا جائے نیوٹن کی Mechahnics سے ارتقاشدہ نظریہ۔ کمیت مادہ سے مطابقت رکھے گا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ مادہ غالباً اپنی آخری شکل میں خواہ وہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو ایک ٹھوس شے ہوگا جسے ناپا اور تولا جاسکے گا اور جیسے ہی مادے کو ترکیب دینے والے قوانین سمجھ میں آجائیں گے، کائنات کا سارا معمہ حل ہوجائے گا۔

سائنس تخیلی ترتیب کا آرٹ ہے اور چوں کہ تجربے سے حاصل کردہ حقیقت اس کا خام مواد ہے اس لیے بہت جلد ایسی نام نہاد حقیقتوں کا انبار جمع ہوگیا جو پرانے طریقہ فکر (کائنات کے میکانیکی نظریے) کے لیے قابل قبول نہیں تھیں۔

۱۸۹۸ء میں پہلی تاب کار اشیا کی دریافت کے ساتھ سائنس دانوں کے دماغ میں یہ الجھنیں پیدا ہوئیں اور وہ ان کا حل تلاش کرنے کی طرف مصروف ہوگئے کہ تاب کاری کے خواص کی جانچ پر تفصیلات شائع کرائیں۔ اس سلسلے میں پہلے پلانک کا ذکر ضروری ہے۔ پلانک یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ تاب کار اشیا سے خارج ہونے والی توانائی ان اشیا کو مکمل طور پر Radiation میں کیوں نہیں بدل دیتی۔ اپنے خیالات کو اطمینان بخش طور پر ترتیب دینے کے لیے وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ وقت اور عملیت کے ان دو فلسفیانہ نظریات کو مسترد کردیا جائے جنھیں کائنات کو سمجھنے کی کوشش میں اس وقت تک بنیادی حیثیت دی جاتی تھی۔ ظاہر ہے یہ بال کی کھال نکالنا تھا۔ 1803ء میں روتھ فورڈ اور نکاڈی نے تاب کاریت کے بنیادی قوانین متعین کرنے کی کوشش میں ایک ایسے حیرت خیز نتیجے پر پہنچے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ فطرت کے بنیادی قوانین دراصل علتی نوعیت کے تھے ہی نہیں۔ اس کے بعد یہ کام آئن اسٹائن کے لیے رہ گیا تھا کہ وہ ان دو دریافتوں کو اپنے نظریہ۔ اضافیت سے جوڑے اور اس نظریہ۔ اضافیت کی اصطلاحات میں نئے زمان و مکاں ہمارے سامنے آئے۔

شاید آپ یہ سوچ رہے ہوں کہ میں اصل موضوع سے بہت دور بھٹک چلا ہوں ورنہ بھلا نظریہ۔ اضافیت کا ایلیٹ کے اسلوب سے کیا خاک تعلق ہوسکتا ہے؟ میں یقیناً یہ عرض نہیں کررہا ہوں کہ جدید شاعری کوانٹم تھیوری کو سمجھانے کے لیے لکھی جارہی ہے لیکن میں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ جدید شاعری الفاظ اور تراکیب کا جس طرح استعمال کررہی ہے اور جس طرح اس کی ترتیب آگے کی طرف بڑھتی ہوئی ہونے کے بجائے دائرے کی شکل اختیار کررہی ہے اس سے وہ لاشعوری طور پر "تسلسل زمان و مکاں" (Space Time Continuam) کی طرح کی

کوئی چیز پیش کر رہی ہے۔ ناول اور شاعری دونوں میں وقت نے ایک نیا زاویہ لے لیا ہے۔ مثال کے طور پر اسکاٹ کا کوئی ناول اٹھالیجیے اور دیکھیے کہ ناول کے کرداروں کے بارے میں تاریخی عمل کے ساتھ تفصیلات دی گئی ہیں یا نہیں۔ ہیرو پیدا ہوتا، پڑھتا ہے، کام کرتا ہے اور مرجاتا ہے یا شادی کرلیتا ہے۔ جوائس سے پہلے ناول کی اور بالعموم نظم کی تعمیر Lenghth wise ہوتی تھی لیکن وقت پر اصرار کرنے والا اس صدی کا نیا شعور ایک دوسرا معیار لے آیا تھا۔ فطرت پسندوں کا مکتبہ ۔فکر آندرے ژید نے بتایا ہے کہ Slice of Life کی بات کرتا تھا"۔ اس کے بارے میں آندرے ژید ایک کردار کی زبانی کہتا ہے۔ "اس مکتبہ ۔فکر ۔کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے روئی کا سلیس ہمیشہ ایک ہی طرف کاٹا ہمیشہ کی طرف وقت کی سمت میں۔ کیوں نہ اوپر نیچے یا درمیان سے کاٹا جائے؟ آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے میں اپنے ناول میں ہر ایک چیز شامل کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے مواد میں کہیں کوئی کتر بیونت کرنا نہیں چاہتا"۔ "شعور کی لہر" ناول کے لیے یقیناً بہت اچھا بنیادی عقیدہ تھا۔

وقت کا نیا تصور کیا تھا اور مادے کے بارے میں کونسا نیا رویہ اختیار کیا گیا تھا اس کا ایک طائرانہ جائزہ لیتے ہوئے چلیے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے، سائنسی مادہ پرست نے اپنی خود مرکزی نظر کی وجہ سے ساری دنیا کو اپنے آپ پر بند کر رکھا تھا۔ یہاں اس بات کو سمجھنا اہم ہے کہ آئن اسٹائن کے نظریہ نے علت اور معلول کو جس طریقے سے جوڑا تھا تقریباً اسی طریقے سے زمان ومکاں کو متحد کر دیا تھا (اگر ہم اسے سمجھ بھی پائیں)۔ اس نظریے کا ریاضیاتی پہلو نہیں بلکہ جدا چیزوں کو ملانے کا علامتی عمل زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اشیا کے میکانیکی تصور میں جو ہمارے اجداد کو نیوٹن سے ورثے میں ملا تھا مادہ، زمان ومکاں کے تصورات کو قطعیت کا درجہ حاصل تھا لیکن جب سائنس دانوں نے مادے کو ٹکڑوں میں منتشر کرنا شروع کیا اور دیکھا کہ اس کا عمل کبھی لہر کی صورت میں تھا اور کبھی ذرے کی شکل میں تو بہت تیزی کے ساتھ یہ احساس ہونے لگا کہ ان تمام پریشان کن مسائل کو حل کر کے کائنات کی ایک واضح اور مربوط تصویر پیش کرنے کے لیے ایک نیا تصور ناگزیر تھا۔

ایک طرف تو یہ ہو رہا تھا اور ۔۔۔ دوسری طرف ماہرینِ فلکیات اجرام کی نقل و حرکت کے بارے میں نئی معلومات کا ذخیرہ جمع کیے دے رہے تھے اور کائنات کے نئے تصور میں ان کا بھی لحاظ ضروری تھا لیکن یہ مطابقت کیسے پیدا کی جائے؟ سائنس کی دنیا دراصل ایک نرسری ہوتی ہے جہاں مختلف قسم کے کھلونے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ سائنس داں زمین پر بیٹھا ہوا ایک اصول یا قاعدہ دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اطمینان بخش طور پر ان تمام کھلونوں کا مصرف عمل سمجھاسکے۔ آخر کار وہ ان سب کا مصرف دریافت کرلیتا ہے کہ کھیلنے کے لیے بنائے گئے ہیں لیکن یہ امر بہت مشکوک ہے کہ وہ ان کھلونوں کے اس ذخیرے سے کھلونے جمع کرنے والے بچے کے

وجود کا پتہ نکال سکے۔ مادہ پرستوں کے خیال میں یہ بات ممکن تھی۔ جدید سائنس داں اس حد تک اپنے آپ پر اعتماد گنوا چکا ہے کہ وہ اس کوشش سے ہی باز آگیا ہے اور ایک قطعی تصور کی بجائے عارضی اور وقتی تصور پر ہی قانع ہو گیا ہے۔ مثلاً یہ بات معلوم تھی کہ مادے کے ایک ٹکڑے میں برقی رو داخل ہوئی تو وہ اس طرح کام کرتا ہے جیسے اس کی کمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہو۔ صرف تفنن طبع کے لیے یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی کہ ایک الیکٹران کی کمیت کا کتنا حصہ اس کا الگ تھا اور کتنا برقی مدار کا اور جب حساب کیا گیا تو یہ مبہوت کن علم ہوا کہ الیکٹرون کی ساری کمیت کا انحصار اس کی برقی مقدار پر تھا لہٰذا الیکٹرون محض ایک معمولی مادے کا ٹکڑا نہیں تھا، ایک مقدار تھا۔ یہ پہلا اشارہ تھا اس بات کی طرف کہ مادی دنیا حقیقت میں ٹھوس اور خارجی شے نہیں تھی جو کہ عام طور پر لوگ سمجھ رہے تھے۔ پھر حقیقت کیا تھی؟ ایک سائنس دان کہتا ہے "یہ بات کہ برقی قوت عام مادے سے الگ اپنا آزادانہ وجود رکھتی ہے اس کا ذکر بہت سے اذہان کے لیے ناقابل قبول معلوم ہوتا تھا۔ کسی چیز کے بغیر حرکت کو تسلیم کرنا، در حقیقت یہ دریافت اس وقت سمجھ میں نہیں آسکی جب تک مادے کے بارے میں ہمارے نظریات زیادہ تجریدی شکل اختیار نہیں کر گئے اور جوہر کے تصور کو "حرکت" کے تصور سے نہیں بدلا گیا۔

اس کے بعد ٹھوس اور مستند کائنات ہمارے ہاتھوں میں پگھل گئی۔ مادہ سایہ بن گیا۔ سائنس کی اس حیران کن کائنات کو ایک مربوط شکل دینے کے لیے آئن اسٹائن نے ایک نظریے کی تشکیل کی جس کے نام سے تقریباً سبھی آشنا ہیں لیکن جس کا مطلب بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے اس نظریے سے ہماری دل چسپی اس کے وقت اور Subject Object relationship سے تعلق کی حد تک محدود ہے۔ مادہ پرستوں کا مفروضہ تھا کہ دیکھنے والا اشیا کو ان کی خالص شکل میں دیکھ سکتا تھا۔ نظریہ اضافیت نے اس مفروضے کی تردید کر دی اور بتایا کہ ہر دیکھنے والا اس کائنات کی جو تصویر بناتا ہے وہ کسی نہ کسی درجے میں داخلی نوعیت کی ہوتی ہے۔ اگر مختلف دیکھنے والے بھی کسی ایک جگہ سے بہ یک وقت کائنات کی تصویریں لیں بھی تو یہ تمام تصویریں یکساں نہیں ہوں گی تا آں وقتیکہ تصویر لینے والے بھی اسی رفتار سے حرکت نہ کریں۔ اسی صورت میں تصویریں یکساں ہو سکیں گی۔

اس نظریے کو ایک شکل دینے کی کوشش میں آئن اسٹائن نے دیکھا کہ زماں و مکاں کے بارے میں ہم جن تصورات سے کام لے رہے تھے ان میں یہ گنجائش نہیں تھی کہ اس نئے نظریے کا ساتھ دے سکیں۔ اس نے اس مشکل کا حل یوں نکالا کہ زماں اور مکاں کو ایک چہار ابعادی Volume میں داخل کر دیا جائے جس کا نام اس نے Continuam "دور تسلسل" رکھا۔ اس طرح وقت کے ذمے ایک نیا کام تفویض ہو گیا تھا۔ "وقت" اب پرانے مادہ پرستوں کا قدیم وسیع و بسیط وقت نہیں رہا تھا بلکہ زمان و مکاں کے اتصال سے پیدا ہونے والا "مخلوط النسل"

تھا۔ زمان و مکاں اس طریقے سے مربوط ہو جانے کے بعد "حقیقت" کی نوعیت کے بارے میں ایک بالکل ہی نیا تصور پیش کر رہے تھے۔ مادہ پرستوں کا خیال تھا کہ کسی شئے کو اپنا وجود رکھنے کے لیے مکان کے تین ابعاد کی ضرورت تھی اب اس میں وقت کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ اضافہ بالکل اسی طرح تھا جس طرح فلموں میں آواز شامل کی گئی تھی جو اداکار کے ہونٹوں کی جنبش کے ساتھ وقوع پذیر ہوتی ہے۔ لیکن آئن اسٹائن کا "وقت" اس طرح کا ماضی، حال، مستقبل کا سلسلہ نہیں تھا۔ یہ تو ایسا وقت تھا جس کے ہر لمحے میں سارا وقت موجود تھا۔ اس میں شک نہیں اس نظریے کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ سر جیمز نے سائنس پر اپنی مقبول و معروف کتاب "پراسرار کائنات" میں اس نئے وقت کی درج ذیل وضاحت دی ہے:

"ممکن ہے کہ وقت اپنی ابتدا سے لے کر ابدیت کی حد آخر تک ہمارے سامنے تصویر میں پھیلا ہوا ہو لیکن اس کے ساتھ ہمارا تعلق صرف ایک پل کا ہوتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح سائیکل کا پہیہ بہ یک وقت زمین کے صرف ایک نقطے سے تعلق قائم کر پاتا ہے جیسا کہ افلاطون نے تیئیس ۲۳ صدیوں قبل کہا تھا "ماضی اور مستقبل وقت کی تخلیق کردہ انواع ہیں جنھیں ہم لاشعوری طور پر ہی سہی لیکن غلط طور پر ابدی جوہر کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں "تھا" "ہے" "ہوگا" لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ ان تینوں میں صرف "ہے" کا استعمال مناسب ہو سکتا ہے۔

تو اس تسلسل زمان و مکاں میں وقت ایک ہے ایک Oneness ہے۔ گو اس تصور سے یولی سس کا دور ناواقف تھا لیکن وجدانی طور پر چند ایک شعرا اور مجذوب اس سے لاعلم نہ تھے۔

نظریہ۔ اضافیت کا ایک اور پہلو اس کا علیت سے دامن بچا کر نکل جانے کا طریقہ ہے۔ علیت میں ہمارا اعتقاد بہت مضبوطی سے قائم ہے اور اسی نظریے کی جڑیں ہماری زندگی میں اتری ہوئی ہیں۔ پشت باپشت سے اس نظریے کو فلسفے کا بنیادی پتھر سمجھا گیا ہے۔ آج سے پہلے صرف مجذوب قسم کے لوگوں نے کائنات کو مادے کے عمل کا نتیجہ ماننے سے انکار کی جرأت کی تھی اور اسے "مایا" قرار دیا تھا لیکن کیا قانون علیت کی اصطلاحات سے ہٹ کر سوچنا ممکن ہے؟ میں اگر ایک بیج بو دوں تو اس سے درخت ہی پیدا ہوگا آدمی نہیں۔ آدمی کیوں نہیں۔ اس لیے کہ خیر۔۔۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہیں۔ لیکن بہ ایں ہمہ طبعیات دانوں کا نظریہ ہمیں اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ ہم قانون علیت کی صحت کو نہ بھی جھٹلائیں تو کم از کم اس تصور میں تبدیلی ضرور کریں۔ جہاں تک مظاہر کا تعلق ہے ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہاں فطرت کی یکسانی غائب ہو جاتی ہے۔

Indeterminacy کے اصول کی بنیاد اس نظریے پر قائم ہے کہ ہم فطرت کے عمل کا اس میں مداخلت کیے بغیر جائزہ نہیں لے سکتے۔ یہ نظریہ کزتعینات پرستی کے اس نظریے

سے بالکل متضاد ہے جس کی آج تک سائنس کی دنیا میں حکومت تھی۔ یہ تبدیلی ان عظیم فکری انقلابات میں سے ایک ہے جن سے ہمارا یہ عہد متصف ہے۔

اگر حقیقت کسی طرح ماورا علیت ہے تو پھر افکار کی ایک بالکل نئی شاہ راہ کھل جاتی ہے ایک ایسی شاہ راہ جو اب تک صرف وجدان کے تصرف میں رہی تھی۔ اگر اس تجربے کا نتیجہ فطرت کی یہ حرکات ناگہاں خلاف توقع اور ناقابل اندازہ ہیں تو پھر ہر چیز ہر آن نئی ہے بلکہ اگر آپ اسی طرح سوچنا پسند کریں تو ہر چیز ایک معجزہ ہے۔

اس نئے نظریے کے قوانین کے تحت خارجی دنیا کا مکمل اور قطعی علم ایک ناممکن الحصول شے بن جاتا ہے کیوں کہ ہم اور یہ دنیا مل کر ایک اکائی بنتے ہیں اور اگر ہم ایک وحدت کا جزو ہیں تو پھر ہمارے لیے اس وحدت کے ساتھ معروضیت برتنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

سر جیمز نے Physics & Philosphy میں کہا ہے "اگر ہم آج بھی سوچنے کے خواہش مند ہیں کہ مظاہر کی دنیا میں ہونے والے واقعات قانون علیت کے ماتحت ہیں تو ہمیں یہ فرض کرنا پڑے گا کہ ان واقعات کا "سبب" دنیا کی کسی ایسی تاریک اور نامعلوم تہہ سے کام کر رہا ہے جو اس مظاہر کی دنیا سے پرے کہیں اور واقع ہے اور ہماری دست رس سے بعید ہے"۔

اس کتاب میں آگے چل کر "نئے وقت" پر گفتگو کرتے ہوئے سر جیمز کہتے ہیں" یہ بات کم از کم قابل قیاس ہے کہ جو بات منظور (Perceived) اشیا کے بارے میں صحیح ہو وہی بات ناظر (Perceiving) اذہان کے بارے میں بھی صحیح ہو سکتی ہے۔ بجلی اور روشنی کی لہری تصویروں کی طرح ہمارے شعور کی بھی ان سے ملتی جلتی تصویر ہو سکتی ہے۔ جس وقت ہم اپنے آپ کو زمان و مکاں میں دیکھتے ہیں اس وقت واضح طور پر ہمارے شعور میں ایک (Particle Picture) ذراتی تصویر کے الگ الگ افراد ہوتے ہیں۔ جب ہم زمان و مکاں سے آگے غالباً دونوں کے امتزاج سے تشکیل پانے والے تسلسل زمان و مکاں میں پہنچ جائیں تب شاید ہمارے شعورِ زندگی کے ایک واحد مسلسل بنتے ہوئے دھارے کے اجزائے ترکیبی بن جاتے ہیں۔ بجلی اور روشنی کی طرح زندگی کے متعلق بھی یہ بات صحیح ہو سکتی ہے۔ تمام مظاہر فطرت زمان و مکاں میں اپنے اپنے الگ وجود کے مالک ہو سکتے ہیں لیکن اصل حقیقت میں زمان و مکاں سے آگے ہم سب ایک کل کے اجزا ہیں۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ طبیعیات ہیگلین (Hegelian) قسم کی داخلی عینیت پرستی کی مخالف اور حریف نہیں رہی۔

نتیجۃً صورت حال یہ ہے کہ اگر ایک طرف سائنس داں کی تصوری صلاحیت اس کے "تسلسل" کے چار خانے میں محصور ہو گئی ہے تو دوسری طرف مادی ذخائر بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ سائنسی معلومات کو استعمال کرنے کے زیادہ سے زیادہ طریقے دریافت ہو رہے ہیں لیکن "حقیقت کائنات" کیا ہے اس بارے میں ہمارا علم جہاں تھا وہیں ہے۔ وقت مسیحی نغمات کا وہ

تیزرو چشمہ نہیں رہا جو یہاں سے وہاں سلسلہ وار معینہ منزلوں سے بہتا جاتا ہے بلکہ مکاں سے جڑا ہوا دبیز غیر شفاف شیشہ بن گیا ہے۔ وقت ہمیشہ موجود بھی ہے اور اس کا وجود تواتر پذیر بھی۔ آپ محسوس کر رہے ہوں گے کہ اضافیت کے خطوط پر غور و فکر کرنے کے لیے ذہن کو ایک غیر معمولی کاوش، دو متضاد نظریات کو بہ یک وقت صحیح اور درست ماننے کے لیے خاص طور پر تیار کرنا پڑتا ہے۔ میرے خیال میں یہ ادعا بہت دور از کار نہیں ہوگا کہ جوائس اور پروست کی تحریروں اور ایلیٹ اور ان کی شاعری میں اس امر کی کوشش ہوئی ہے کہ انسانی اور مافوق الفطری مسائل کے مواد کو ایک ایسے شعری تسلسل کی شکل میں پیش کیا جائے جس میں نہ صرف نظر آنے والی اشیا بلکہ زبان و اسلوب تک وقت کے نئے تصور سے معمور ہوں۔ ڈکنس اور دستاوسکی کے ہاں ملاپ کا فطری ارتقا ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک واضح اور معینہ خطوط پر طے ہوتا ہے لیکن پروست اور جوائس کے ہاں آہستہ رو Slow motion کیمرے کے قسم کا عمل نظر آتا ہے۔ ان کی کتابیں ایک خطِ مستقیم پر نہیں بڑھتیں بلکہ کبھی پیچ در پیچ اور کبھی کھلتی ہوئی دائرہ وار ایک ہمیشہ تغیر پذیر لیکن بہ ایں ہمہ ہمیشہ یکساں اسلوب کے سست مدو جزر سے مربوط چلتی ہیں۔ ان کے کرداروں کی معنویت کا ان کے افعال سے الگ اپنا آزادانہ وجود ہوتا ہے۔ یہ کردار پیدائش سے عمل اور عمل سے موت تک کا سفر طے کرنے والی وقت کی رہ گزار کے اوپر معلق ہیں۔ وقت کو اس طرح بسیط بنا دینا ان کرداروں سے متعلق ہر چیز میں ایک معنویت پیدا کر دیتا ہے جن میں کردار کے لباس کا ایک حصہ بھی اتنا ہی اہم اور وقیع ہو جاتا ہے جتنا اس کی کوئی حرکت یا عمل۔ ان ناولوں میں اگر کوئی حرکت ہے بھی تو وہ دائرہ وار متواتر صرف اپنے تواتر کی بنا پر وقیع اور اہم ہے۔ پروست نے ایک معاشرے کی پوری زندگی کو اپنا موضوع بنایا تھا لیکن کینوس کی اس وسعت کے باوجود اس کی کتاب میں تقریباً ساکت زندگی ملتی ہے۔ جوائس نے یولی سس میں اپنے آپ کو صرف ایک دن کے واقعات تک محدود رکھا اور ان واقعات کو نئے تصور وقت کے پردے پر اجاگر کر دیا جوائس کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ وقت کو اس طرح برت کر وہ اپنے فن میں بے ترتیبی اور انتشار کو جگہ دے رہا ہے اور اسی احساس کے تحت اس نے احتیاطاً اپنے ناول کو The Odyssey کے خاکے پر تعمیر کرنے کی عقل مندی کی۔ اوڈیسی سے جوائس کے ناول کی مماثلت کا رشتہ بہت سطحی ہے اور یولی سس میں اگر کوئی ترتیب اس لفظ کے عام مفہوم میں نظر آتی ہے تو ہمیں اس کے لیے ہومر کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اوڈیسی سے یولی سس کی مماثلت معنیٰ خیز ضرور ہے۔ طبعیات داں زمان و مکاں کے مسائل پر گفتگو میں استعاروں کے استعمال کی مذمت کرے گا کیوں کہ اس کا دعویٰ ہے کہ اضافیت ایک خالص نظریہ ہے اور اسے صرف ریاضیات کے ماہر سمجھ سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود کئی ایک ممتاز سائنس دانوں نے نظریہ اضافیت کو غیر سائنٹفک اصطلاحات میں بیان کرنے کی

کوشش کی ہے گو ان میں سے کوئی بھی کوشش میں نہیں سمجھتا زیادہ کامیاب رہی ہے۔ الگزینڈر تو یہ کوشش بھی کر گزرا کہ زماں مکاں کے نظریے کے گرد ایک مذہبی نظام کی چادر کھڑی کر دی جائے۔ زمان و مکاں کو الوہیت سے وابستہ کرنے کی اس نے جو کوشش کی وہ اس اعتبار سے دل چسپ ہے کہ کم از کم اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہوا کس رخ پر چل رہی ہے الگزینڈر نے اپنی کتاب Space Time Deity میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ زمان و مکاں جس مواد سے بنے ہیں دراصل وہی اساسی اور اولین حقیقت ہے اور دوسری تمام چیزوں نے اسی سے ارتقا پایا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ کائنات کی ہر شئے اسی زماں مکاں کے مواد سے بنی ہے اور مادے کی تدریجی تقسیم و تفریق کے ساتھ زندگی نمودار ہوئی جو آہستہ آہستہ شعور میں اور شعور سے الوہیت میں بدل رہی ہے۔ زماں و مکاں کو عام طور پر لوگ انسانی ذہن کی تخلیق سمجھنے کے عادی تھے لیکن الگزینڈر نے اس نظریے کو الٹ کر یوں پیش کیا کہ زماں مکاں مواد کے الوہیت کی طرف اپنے تدریجی ارتقا کے سفر میں انسانی ذہن صرف (ایک درمیانی منزل) ایک آلہ ۔ کار کی حیثیت رکھتا ہے۔

گذشتہ دس پندرہ سال کے ادب میں سریت اور تصوف سے خصوصیت کے ساتھ مشرقی مذاہب سے بڑھتی ہوئی دل چسپی کا رجحان نمایاں رہا ہے۔ اس صدی کے اوائل میں چین اور ہندستان کے اولین مذہبی کلاسیکس کے ترجمے کیے گئے۔ ۱۸۰۳ء میں تھیوسافیکل سوسائٹی کی بنیاد ڈالی گئی۔ ایٹس اور دوسرے کئی ایک لکھنے والوں کے ابتدائی افکار پر تھیوسافی کی چھاپ نمایاں تھی۔ اس کے بعد یہ رجحان خستہ ہو چلا تھا۔ لیکن اب پھر چند دنوں سے ہکلے، ایلیٹ اور والیری (میں نے ان تین شاعروں کا نام اس لیے لیا ہے کہ یہ تینوں اپنے متصوفانہ نقطہ۔ نظر کی وجہ سے ممتاز سمجھے جاتے ہیں) اور جن کی وجہ سے ان مسائل سے دل چسپی زندہ ہونے لگی۔ یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ یہ مشرقی مذاہب خواہ ہندستانی ہوں یا چینی دو ایک ایسے نظریات پیش کرتے ہیں جو اضافیت سے چند ایک باتوں میں کافی قریب ہیں۔ یہ مذاہب قانون علیت کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ان کے ہاں پیدائش موت اور دوبارہ پیدائش کے چکر سے نکل کر "نروان" حاصل کرنے کا تصور ایک ایسے وقت سے عاری عالم کی طرف اشارہ کرتا ہے جو الفاظ یا عقل اور فکر سے ماورا ہے۔ "حقیقت" ان کے نزدیک "مایا" یا فریب نظر ہے۔

میں نے یہ باتیں اس لیے لکھ دی ہیں کہ آپ اپنے طور پر انھیں پرکھ لیں۔ ان کی سچائی، صحت کا کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کسی دن مذہب اور سائنس اپنے باہمی تضادات کے باوجود کوئی ایسا تصور دریافت کر لیں جو ان دونوں کے لیے نقطہ۔ اتحاد بن جائے۔ اس ضمن میں کام کی ابتدا بھی ہو چکی ہے۔ فرانسیس جے موٹ کی تقریباً غیر معروف کتابوں میں ان خطوط پر بہت شان دار کام ہوا ہے اور موٹ نے فرائیڈ کے نظریات کی حدود کو بے انتہا وسیع کر دیا ہے۔ اس کی کتاب The grand design of Odipus Complex طلبہ اور شعرا

دونوں کے لیے دل چسپی رکھتی ہے اور یہ کتاب اپنی حدود کے باوجود فرائیڈ کی عہد آفریں تصنیف The Interpretation of dreams سے کسی طرح اہمیت میں کم نہیں ہے۔ اور اپنے دور کے ذہنی اور فکری میلانات کی نمائندگی اور نشان دہی کرتی ہے۔ تو خیر اس طویل جملہ معترضہ سے قطع نظر پھر اپنے اصلی موضوع کی طرف لوٹیں گے۔ آئن اسٹائن نے امریکن پریس کو بیان دیتے ہوئے کہا تھا:

"میرا اس بات پر یقین ہے کہ سائنٹفک تحقیق و تجسس کے لیے ایک کائناتی مذہبی احساس Cosmic religous Feeling اعلیٰ اور شریف ترین محرک ہے۔ گہرائی رکھنے والے سائنسی دماغوں میں آپ کو ایک آدھ شخص بھی ایسا نہیں مل سکے گا جو اپنا ایک مخصوص مذہبی احساس نہ رکھتا ہو۔ آدمی، انسانی خواہشات اور مقاصد کی بے بضاعتی اور فطرت اور فکر کی دنیا میں ایک عظیم الشان ضابطے اور تکمیل کا احساس کرتا ہے۔ اسے انفرادی وجود ایک قید خانہ معلوم ہوتا ہے اور وہ اس کائنات کو اپنے تجربے میں ایک مکمل بامعنی اکائی وحدت کی شکل میں محسوس کرنا چاہتا ہے۔"

ظاہر ہے آئن اسٹائن کا یہ بیان وکثورین مادہ پرستوں کی متعین آواز سے بہت دور کی چیز ہے۔ عارضی سچائی جو امکانی حد تک مکمل اور حتی المقدور فکر سے باخبر ہو۔

لیکن نئے نظریہ۔ زمان ومکاں کا مسئلہ کیسے سمجھا جائے؟ ہمارے سامنے ریاضیات کی دیوار کھڑی ہوئی ہے اور ریاضیات دانوں کا کہنا ہے کہ ہم (Equation) کو سمجھے بغیر اضافیت کے اصول کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہاں میں مدد کے لیے نشاۃ ثانیہ کے دور کے ایک پروفیسر سے رجوع کرنا چاہتا ہوں اس کا نام ہے برونو یہ شیکسپیر کا ہم عصر تھا۔ برونو ایک بات میں آئن اسٹائن سے مماثلت رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آئن اسٹائن کی طرح برونو نے بھی ارسطو کے نظریات کا بطلان کیا تھا۔ گو برونو کے پاس نظریات کی تشکیل کے لیے ریاضیات کا ساز وسامان موجود نہیں تھا لیکن کائنات کے بارے میں اس کے پاس اب ایک واضح تصور ضرور تھا۔ جو کئی ایک باتوں میں تصور زمان ومکاں سے میل کھاتا ہے۔ برونو بھی تقریباً ان ہی مشکلات سے دوچار تھا جو آج ہمیں پیش آرہی ہیں۔ اور کائنات سے متعلق اپنے تصور کا اظہار کرنے کے لیے اسے تشبیہات اور استعارات پر تکیہ کرنا پڑا اس کے لیے زمان ومکاں نے (جنھیں ارسطو نے بسیط extent اور دوران (duration) میں محدود لیکن تقسیم کے اعتبار سے لامحدود قرار دیا تھا) اور ہی صورت اختیار کرلی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ زمان ومکاں اپنے ابعاد میں لامحدود ہوتے ہوئے بھی دل چسپ ترین مجرد اجزا پر مشتمل ہیں۔ برونو کے اپنے الفاظ میں وقت کی تشریح دیکھیے:

"دوران کے ہر نقطے میں ابتدا بغیر انتہا کے اور انتہا بغیر ابتدا کے موجود ہے۔ دوران کے آگے بھی لامحدود ہے اور پیچھے بھی۔ اور یہ دونوں بالکل اسی طرح کا مرکز ہے جس طرح ناقابل

پیمائش مکان ایک لامحدود مرکز ہے۔" ایک اور جگہ وہ کہتا ہے:

" خدا ہر کام کسی اہتمام فکر یا تردد کے بغیر کرتا ہے۔ کائنات کی بے شمار مخلوق اور ان گنت افراد کا انتظام کرتا ہے لیکن سلسلہ وار اور یکے بعد دیگرے نہیں بلکہ ایک ساتھ اور بہ یک وقت۔ خدا ایک محدود ہستی کی طرح نہیں ہے جو مختلف کام ایک کے بعد ایک کرے اور جس سے ایک سے زیادہ اعمال، بے انتہا کاموں کے لیے بے انتہا اعمال کرنے پڑیں۔ اس کا ایک منفرد اور سیدھا سادہ عمل ماضی، حال، مستقبل ہر چیز کے لیے کافی ہے۔"

میں نے برونو کے اقتباسات دو وجوہات سے پیش کیے ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ جب مثالوں اور استعاروں کی زبان میں ہی گفتگو کرنی ہے تو کیوں نہ ایسے آدمی کی بات سن لیں جو ایک ریاضیات داں سے بہتر طور پر تصور پیش کرتا ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم سب جانتے ہیں کہ جوائس فینگنس ویک لکھتے وقت برونو کے نظریات سے کس درجہ متاثر تھا۔ میں یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ برونو کے نظریات، اضافیت کے تمام نکتوں کو حل کر دیتے ہیں کیوں کہ اس بارے میں میرا علم محدود ہے لیکن ان دونوں میں کئی ایک ایسی مشابہتیں ضرور ہیں جو توجہ طلب کرتی ہیں۔

آج تک کوئی شخص حتیٰ کہ ارسطو بھی شاعری کی کوئی حتمی تعریف نہ کر سکا۔ عام طور پر ہم سب یہی سمجھتے ہیں کہ ہمارے پاس شاعری کی معقول تعریف موجود ہے لیکن بہت جلد ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ ہمارے تصور نظر سے ماضی کے عظیم نقاد تو دور رہے خود ہمارے معاصرین کو بھی اتفاق خیال نہیں۔ شاعری کی ہر تعریف میں سب سے بڑا نقص یہ ہوتا ہے کہ یا تو اس میں بہت زیادہ چیزیں آجاتی ہیں یا پھر بہت کم۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شاعری کا عمل اور افکار و نظریات عہد بہ عہد بدلتے رہتے ہیں اور یہی تبدیلی شاعری کو نئے معیار اور نئے اسالیب کے ذریعے ہر دور میں نئی زندگی بخشتی ہے۔ ایک دور میں جو شاعری مناسب اور موزوں معلوم ہوتی ہے وہ دوسرے دور کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ بہ نظر غائر دیکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کا تصور ساحری اور موعظت کی حدود کے درمیان جھولتا رہتا ہے۔

ایک طرف "خالص شاعری" کی طرف استہزائی رویہ "جو دو صدیوں کا عام مذاق رہا اور آج بھی کلاسیزم کی ہر شکل میں کارفرما ہے اور دوسری طرف یہ رومانوی نظریہ ہے کہ شاعری اظہار محض یا بیان نہیں ہے بلکہ تخلیق اور تاثر آفرینی کا نام ہے۔ کولرج آرزو کرتا ہے:

COULD I REVIVE WITHIN ME HER SYMPHONY AND SONG TO SUCH A DEEP DELIGHT TWOULD ME THAT WITH MUSIC LOUD AND I WOULD BUILD THAT DOME SUNNY DOME, THOSE CALM

یہی چیز ملارمے کے اس عقیدے میں بھی کارفرما ہے کہ شاعری کائنات میں ایک تبدیلی

پیدا کرتی ہے۔

ان دو انتہاپسند نظریوں کے درمیان کئی سمجھوتوں کے امکانات ہیں۔ ہومر، دانتے، اور شیکسپیر جیسے عظیم شعرا نے موعظت بھی کی ہے اور تخلیق بھی۔ وہ معلم بھی رہے ہیں اور ساحر بھی۔ وہ اس اعتبار سے خوش قسمت تھے کہ ان کے دور میں شاعر کو علم و حکمت کا مخزن اور انسانی زندگی کی بصیرت والا سمجھا جاتا تھا۔ موجودہ زمانے کا شاعر ان لوگوں کے مقابلے میں کم نصیب ہے کیوں کہ آج اس نے بیش تر موروثی فرائض کو اپنی تفویض میں نہیں لیا ہے۔

آج عام طور پر ایک جغرافیہ داں، ہئیت داں اور ماہرِ نفسیات کو شاعر کے مقابلے کہیں زیادہ ان متعلقہ موضوعات پر بات کرنے کا اہل سمجھا جاتا ہے بلکہ اخلاقیات کے دائرے میں بھی شاعر کو عالمِ دین، ماہرِ اخلاقیات اور صحافی سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ آج اس سے نہ یہ توقع ہے کہ وہ اپنے پرانے حقوق مانگے گا اور نہ اسے اس کی اجازت ہے۔ اسے صرف ایک شاعر رہنا ہے اور بس۔ اب اس کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ اس کا عوام کو نہ کوئی علم ہے اور نہ انھیں یہ جاننے کی کوئی پروا ہے۔ ان حالات میں شاعر کو قدرتی طور پر اپنے فن کے قدیم ساحرانہ تصور کی طرف لوٹ جانا پڑا اور وہ دوبارہ ایک ایسا شعبدہ باز بن گیا جس کی کامیابی لوگوں کو مسحور کرنے کی صلاحیت پر منحصر ہوتی ہے۔ ممکن ہے کبھی کبھی وہ انسانی روح کی گہرائیوں سے غواصی کر کے کوئی موتی نکال لائے یا بے شمار لوگوں کے دلوں میں خفتہ احساسات کو اظہار کی شکل دے دے لیکن یہ سب ضمنی باتیں ہوں گی اور اس کا فرضِ منصبی اور خاص کام صرف یہ ہے کہ وہ ایک تاثر ایک کیفیت پیدا کر سکے۔ الفاظ سے ساحری کر سکے اور بس۔

ملارمے کو شاعر کے اس دائرۂ عمل کی حدود کا بخوبی احساس تھا اور اس نے اسی کو اپنا ہتھیار بنالیا اس کے نزدیک یہ بہت بڑا فائدہ تھا کیوں کہ اس طرح اسے مجبوراً صرف شاعر رہنا اور اپنے اصل کام، خالص شاعری کی رچنا کی طرف تن دہی سے متوجہ ہونا پڑتا تھا۔ خود اس کے کلام میں ایک افسوں کی خصوصیت ہے۔ یہ افسوں پہلے اپنا کام کر چکتا ہے تو اس کے بعد آہستہ آہستہ خیال اور معانی نظروں کے سامنے آتے ہیں۔ وہ اپنے قارئین پر ایک ایسی پے چیدہ کیفیت طاری کر دیتا ہے جس میں فہم و ذہن کا بہت کم دخل ہوتا ہے۔ اس کے جانشینوں نے اس کی پیروی تو کی لیکن وہ زیادہ دور نہ جاسکے۔ مجموعی طور پر انھوں نے خالص شاعری کی جستجو کو ترک کر دیا ہے۔ انھیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ عملی طور پر یہ طے کرنا محال ہے کہ کون سے موضوعات شاعرانہ ہیں اور کون سے غیر شاعرانہ۔ انھوں نے اپنی شاعری میں زیادہ سے زیادہ قابلِ فہم مواد کو جگہ دی ہے اور وہ وضاحت اور استدلال تک پر اتر آئے۔ یہ لوگ نہ مثالی شاعری کے عاشق ہیں اور نہ اس سکوت کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو نغمے سے زیادہ "بلیغ" ہوتا ہے۔ انھوں نے اس حقیقت کو قبول کر لیا ہے کہ الفاظ میں معانی بھی ہوتے ہیں اور شاعری کو قابلِ فہم ہونا چاہیے لیکن ساتھ ہی وہ

شاعری کی سحر کاری کے بھی قائل ہیں۔ دلوں کو موہ لینا اور تخیل کو مہمیز کرنا بھی ان کا مقصد رہا۔ اس وقت بھی جب وہ جارج کی طرح معلمانہ اور بلوک کی طرح پیمبرانہ شان اختیار کر لیتے ہیں، ان کے پیغامات کی اساس شاعری کے اس تصور پر قائم ہوتی ہے کہ شاعری ہی دنیا کو بدل سکتی ہے اور نغمہ و موسیقی کی روح سے ہی نئے سماجوں کی تشکیل ہوگی۔ اس طرح انھوں نے اپنی جگہ بنالی ہے اور اختلافات کی اس خلیج کو پاٹ دیا جو اگلے علامت پسند اپنے اور عوام کے مابین محسوس کرتے تھے۔ اب یہ احساس جڑ پکڑتا جارہا ہے کہ شاعر سے جو ممکن ہے وہ دوسروں سے ممکن نہیں۔ وہ اپنے فن کے ذریعے ایک خاص قسم کی زندگی بخش سکتا ہے۔ وہ چیزوں کو ان کے تلازمات اور تعلقات میں پیش کر کے یہ بتا سکتا ہے کہ ان کا اصلی مفہوم کیا ہے۔ وہ احساس اور تخیل کے ذریعے ایک کیفیت پیدا کرتا ہے جو سائنس سے ممکن نہیں۔ سائنس داں محض ایک مفسر ہے اور شاعر باعمل آدمی ہے۔

شاعری کی سحرکاری کے تصور نے مختلف شکلیں بدلی ہیں۔ جب Henri Bermond نے کہا کہ شاعری عبادت ہے تو وہ اس روایت سے قریب تھا جو علامت پسندوں کے قبیل کے لوگوں سے وابستہ ہے کیوں کہ ان کی شاعری نہ صرف پر فسوں ہے بلکہ اس کی تہہ میں یہ عقیدہ کارفرما ہے کہ شاعر کا تعلق ایک ماورائی نظام اشیا سے ہوتا ہے اور اس کا فن ایک ریاضت ہے جس کے ذریعے وہ اس ماورائی دنیا کو اس زمین کے باسیوں تک لے آتا ہے۔

رلکے کا موت اور آواگون کا نظریہ، جارج کا مسلک، بلوک کی روح موسیقی، ایٹس کی روحانیت یہ سب چیزیں اس لیے اختیار کی گئیں کہ اس تخلیقی عمل کو جو شاعری میں پنہاں ہے ایک مذہب کا درجہ دے دیا جائے اور اس تخلیقی عمل کے زندہ اور توانا مظاہر میں اس پر اسرار قوت کو تلاش کیا جا سکے جو کائنات کے پس پشت کارفرما ہے۔ والیری کا یہ عقیدہ کہ شاعری ایک ناقابل تشریح اور منفرد شے ہے اور اس حقیقت پر اس کا مسلسل حیرت کا اظہار اس بات کا اعتراف ہے کہ کہیں نہ کہیں ضرور کوئی اسرار موجود ہے۔ قرون وسطیٰ میں بلکہ ملٹن کے عہد میں بھی عیسوی نظریہ تخلیق نے اور چیزوں کی طرح شاعری کی بھی توضیح کی لیکن یہ تشریحات اب پامال اور فرسودہ ہو گئی تھیں۔

انیسویں صدی کے شعرا کو کسی اور ہی شے کی حاجت تھی جس پر وہ اپنا عقیدہ استوار کر سکیں، کوئی ایسا اصول جو ان کے عقیدے کی تائید اور اس کی وضاحت کر سکے انھوں نے ان مسائل کے اپنے مخصوص حل ڈھونڈ نکالے ہیں اور ان سے انھیں توانائی اور خوداعتمادی ملی ہے انھیں اپنے دائرۂ عمل میں اور آس پاس کی دنیا میں طمانیت کا احساس ہوا۔ لیکن ان کے حل اتنے عجیب و غریب تھے کہ ان کی اجنبیت نے پڑھنے والوں میں ان شعرا کے اثر کو کمزور کر دیا۔ ان کے مرکزی خیال کو قبول کرنا ایک اوسط درجے کے آدمی کو محال معلوم ہوتا ہے ویسے جواز کے لیے یہ

دلیل لائی جا سکتی ہے کہ اگر شاعری ایک طرح کی جادو گری ہے تو پھر اس کے نظریات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا نہیں چاہیے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ممکن ہے کہ ہم نتیجے سے قطعِ نظر کریں اور صرف بنیاد کو تسلیم کر لیں۔ شاعری واقعی پر اسرار چیز ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اسے دوسری غلط اور گمراہ کن باتوں کا جواز بنالیں۔ اس باب میں والیری کا رویہ عام خیال سے میل کھاتا ہے۔ وہ شاعری کو پر اسرار تو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کی بنیاد پر کسی نظریے کی تعمیر نہیں کرتا اور سچی بات تو یہ ہے کہ نئی نسل کے شاعروں نے شاعری سے نہیں بلکہ زیادہ تر عقائد سے ہی بغاوت کی ہے۔ علامت پسندوں کے بعد آنے والوں نے اپنی مخصوص قسم کی سریت میں کوئی جانشین نہیں چھوڑے۔ نئے لکھنے والوں نے اپنے فن کی توضیح اور ہی نظریات سے کی۔

شاعری کی سحر کاری کا تصور شاعر کو ایک خاص مقام عطا کرتا ہے۔ ایک بار پھر اسے پیغمبر کا درجہ ملا ہے جو ان دیکھی قوتوں کے ہاتھوں فوق الانسانی طریقوں سے کام کرتا ہے۔ اس کا شمار دوسرے انسانوں کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ مروجہ اندازِ فکر کا ساتھ دے۔ نتیجتہً اسے اپنی شخصیت کو برقرار رکھنے اور اپنے ذاتی ذوق اور انفرادیت کی نشو و نما کرنے کی اتنی آزادی ہے جو پہلے کبھی اسے میسر نہیں تھی۔ ایٹس اور جارج کے مخصوص اور خود سرانہ میلانات، بلوک کی اپنے جذبات کی غلامی، رلکے کا اپنے آپ کا کسی ملک، تحریک یا مکتبہ فکر سے وابستہ نہ کرنے پر اصرار۔ ان میں اس آزادی کے اثرات واضح طور پر نمایاں ہیں۔ یہ سب متفقہ طور پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ انھیں اپنے اپنے رجحانات کی پیروی کرنی چاہیے۔ اپنی طبیعت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی آزادی ہونی چاہیے ورنہ ان کی صلاحیتیں مجروح ہو جائیں گی۔ یہ آزادی انھیں خاموش رضامندی کے ذریعے حاصل ہو گئی۔ ان کی باتوں کو لوگوں نے اہمیت بھی اسی وجہ سے دی کہ یہ فن کار عام لوگوں سے مختلف تھے اور زندگی کا اپنا ایک ذاتی تصور رکھتے تھے۔ ذات پر یہ اصرار بعض اوقات ان کے فن کے لیے مہلک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن جو چیز اصل اہمیت رکھتی ہے وہ ان کی تخلیقات کی انفرادیت اور نیا پن ہے۔ اپنی مرضی کو دنیا پر مسلط کرنے کی خواہش نے جارج کو غیر شاعرانہ اور پند و نصائح کی پست سطح پر اتار دیا۔ رلکے کی اپنے ذہن و احساس کے ساتھ تنہا گزینی نے اس کے فن کے کچھ حصے کو مریضانہ بنا دیا لیکن ان ساری ناکامیوں کی تلافی کہیں زیادہ عظیم کامیابیوں سے ہو گئی۔ چوں کہ شاعر اپنی شخصیت کو برقرار رکھنے میں آزاد ہے۔ اس لیے وہ رائے عامہ کی خاطر اپنے نظریات کو قربان کیے بغیر اپنے فن کے ساتھ انصاف کر سکتا ہے۔ وہ اپنی صلاحیتوں کی نشو و نما کر سکتا ہے اور تجربات کے ذریعے نئے امکانات تلاش کر سکتا ہے وہ اپنے فن پر اس وقت تک ریاض کر سکتا ہے جب تک اسے اطمینان نہیں ہو جاتا۔ ایک ایسے وقت میں جب بیش تر لکھنے والوں نے عوامی ذہن کی خاطر اپنے ذہنوں کو خراب کر لیا تھا۔ شعرا نے اپنے آپ کو وبائے عام سے محفوظ رکھا۔

اس آزادی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ شاعر ہاتھی دانت کے میناروں میں روپوش ہو گئے تھے۔ Huys man ولیئر دی آدم کے ہاں زندگی کی شدید خواہش اور لگن نے ان کی جمالیاتی عزلت گزینی کی جگہ لے لی تھی۔ ان شاعروں نے ایسے نرم و نازک خوابوں اور نفیس احساسات سے ابتدا کی تھی جو سنگین حقائق سے منھ چھپاتے تھے۔ جارج اور بلوک اپنے دور کے سیاسی مسائل پر دور سے ہی نظر ڈالتے تھے۔ بلوک پوری تن دہی کے ساتھ اپنے مثالی انقلاب میں جٹ گیا۔ رلکے نے جو اپنی ذات کی گہرائیوں میں بہت دور اتر گیا تھا، وہاں کائنات کا ایک ایسا نیا تصور تلاش کر لیا تھا جو بہ ظاہر غیر اہم چیزوں کو بھی وقیع بنا دیتا تھا۔ والیری جیسے معروضی اور تجرباتی ذہن رکھنے والے آدمی نے بھی اپنی بہترین شاعری میں بے حد عام اور معمولی باتوں کو موضوع بنایا۔ جس وقت ان لوگوں نے اپنے موضوعات کے دائرے کو وسیع کیا تو یہ ابتدائی مشق و ریاضت ان کے بہت کام آئی۔ اپنے فن سے بہ خوبی واقف ہونے کی وجہ سے انھیں اپنے ذاتی احساسات کو مبہم عامیانہ جذبات میں ڈھالنے کا احتمال نہیں تھا۔ انھوں نے اپنے ذاتی تصورات کو برقرار رکھا اور سہل انگیزی اور غلط بیانی سے جو عوام کے لیے لکھنے والوں کی خاص کمزوری ہوتی ہے، اپنے آپ کو بچائے رکھا۔ ان لوگوں نے یہ ظاہر کر دیا کہ سیاسی موضوعات شاعری کے لیے اجنبی نہیں ہیں اور اصل چیز ان موضوعات کو برتنے کا طریقہ ہے۔ اگر شاعر اپنے فن کو بہترین طور پر استعمال کر سکتے تو یہی موضوعات شاعرانہ تصور بھی پیدا کر سکتے ہیں۔

ذات کی طرف شاعروں کی اس مراجعت نے قابل ذکر نتائج پیدا کیے۔ ویسے مقتدر رومانویوں نے بھی اپنے بارے میں کافی باتیں کی تھیں لیکن ان لوگوں کے انکشاف ذات میں ایک طرح کا غیر حقیقی پن اور تصنع پایا جاتا ہے۔ ان لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ دنیا کو کس رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی آرا اور اعترافات ہمیشہ مطمئن کن نہیں ہوتے۔

اس وقت بھی جب شیلی کی طرح ان کے خلوص پر شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، ہم یہی سوچتے ہیں کہ یہ لوگ صحیح معنوں میں اپنے آپ کو سمجھ پا رہے ہیں اور کیا واقعی انھیں اپنی ذات سے دل چسپی ہے۔ وکٹر ہیوگو کو اپنی عظمت کا اتنا زیادہ احساس تھا کہ اسے اپنے تصور کے مطابق ایک مثالی شاعر کے معیار پر پورا اترنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا اور نتیجتاً اس نے ایسے خیالات کو بھی اہم اور بھاری بھرکم بنا کر پیش کیا جنھیں قابل ذکر بھی نہیں کہا جا سکتا۔ دوسری طرف پارنےسینس نے اپنے آپ کو معروضی ادب کے چکر میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ان کی شاعری میں ان کی ذاتی واردات اور خیالات کا بہت کم دخل تھا۔ ان کا احساس بھی بالعموم صرف ظاہری اشیا تک محدود ہے۔ ان کے برعکس علامت پسندوں نے اپنے بارے میں بات کہنے کا ایسا طریقہ ڈھونڈ نکالا تھا جو بہ یک وقت مخلصانہ بھی تھا اور متاثر کن بھی۔ اس معاملے میں انھوں نے بادلئیر سے بہت کچھ سیکھا تھا جس آدمی نے یہ کہا تھا: "ریاکار قاری، میرے ہم شکل، میرے بھائی" اسے اپنے یا

اپنے قارئین کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ وہ انھیں اپنا رازدار بنالیتا ہے کیوں کہ وہ اپنی کم زوریوں میں اس کے ساتھ شریک ہیں۔ یہ کھرا پن ایسی چیز تھا جس کا شاعر کے قدم بلند و بالا تصور سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ملارمے نے اس کھرے پن میں بے تکلفی کا ایک نیا آہنگ بھی شامل کردیا۔ وہ اپنی عمیق ترین خواہشات کو مبالغے سے عاری الفاظ میں پیش کرتا ہے اور اپنی نازک فن کاری سے ظاہر کردیتا ہے کہ یہ احساسات و خواہشات اس کے لیے کیا معنی رکھتے ہیں۔ بعد کے لکھنے والوں نے اس چیز کو اور ترقی دی وہ اپنے بارے میں جرأت اور ایمان داری سے لکھتے تھے۔ اکثر اوقات اس جرات اور ایمان داری کے لیے انھیں سخت جد و جہد کرنی پڑتی تھی۔ پہلے تو ابتدائی منزلوں سے گزرنا تھا۔ اپنے جذبات کا بالواسطہ، علامتوں کے ذریعے اظہار کرنے کی خاطر انھیں تاریخی اور اسطوری کرداروں کا رول اختیار کرنا تھا لیکن آخر میں انھیں اپنی مکمل شخصیت کے اظہار کا راستہ مل گیا۔ ہمارے دلوں میں ان کی عزت اس لیے ہے کہ وہ اپنے آپ سے ایمان دار رہے اور اپنے بارے میں انھوں نے صاف گوئی برتی۔ اس کامیابی کا سہرا صرف ان کی شاعری کے سر ہے۔ اہم شخصیت وہ نہیں ہے جو خودنوشتوں، یادداشتوں، مکاتیب اور بکھرے ہوئے جملوں سے شکل پاتی ہے بلکہ وہ جس سے ہم شعر کے ذریعے اپنی اصل اور مکمل شکل میں روشناس ہوتے ہیں۔ یہ شعرا انتہائی صاف گو ہیں گوہر کوئی ایٹس نہیں بن سکتا جو اپنی تمکنت اور ہماری دل چسپی دونوں کو برقرار رکھتے ہوئے یہ لکھ سکے:

I THOUGHT HIM HALF LUNATIC, HALF KNAVE, AND TOLD HIM SO, BUT FRIENDSHIP NEVER ENDS.

لیکن تقریباً تمام شعرا نے اپنے احساسات کی مختلف سمتوں کی مکمل تصویر کشی کی۔ بلوک کے ہاں جذبات کی پھیلی ہوئی دنیا، جارج کا عظیم مسائل کو شخصی سطح پر برتنا، رلکے کا اپنی ناآسودگیوں کا اعصابی تجزیہ، یہ سب شاعری میں ذاتی عنصر کو واپس لانے کی کوششوں کے مختلف مظاہر تھے۔ یہاں تک کہ والیری کا رفیع الشان اور معروضی نظر آنے والا فن بھی اس کی اندرونی کش مکش اور ذاتی احساسات پر مبنی ہے۔ اگر اسے اپنی ذات کا مکمل علم نہ ہوتا تو ان پیچیدہ کیفیات کی ماہیت اور معنویت کو شعر میں پیش کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی۔ اس کے فن کا وجود بھی نہ ہوتا۔ انیسویں صدی کے ناول نگاروں نے جس نفسیاتی دروں بینی سے کام لیا تھا اس نے ان شعرا کو بھی متاثر کیا اور انھیں کم از کم خود کو پہچاننے کے قابل بنایا۔ اس وقت اپنے آپ کو جاننے کا یہ عمل اور زیادہ آسان تھا کیوں کہ جس دور میں یہ لوگ جوان ہوئے تھے اس وقت تک فرد کی اہمیت کو زیادہ خطرہ لاحق نہیں ہوا تھا۔ آنے والے دنوں میں فرد کی اہمیت کو سرے سے ختم کردینے والی تحریکیں ابھی اپنی جگہ نہیں بنا سکی تھیں۔ ابھی شاعر کو اپنے مقام اور اپنے آپ پر پورا اعتماد تھا اور ان کے بارے میں گفتگو کرنا وہ اپنا حق سمجھتا تھا۔ اس کی ذات میں موضوعات کا

لامتناہی سرچشمہ موجود تھا۔ انھیں وہ ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے اور اس کی ذات میں ہم اپنے آپ کو دیکھ سکتے ہیں۔

اس خود آگہی نے شاعری کو نئی وسعتیں عطا کیں جن سے ان اصناف کی تلافی ہو جاتی ہے جو یاتو اپنی دل چسپی کھو چکی تھیں یا پھر نثر کے دائرے میں آگئی تھیں۔ بعض اوقات یہ نیا مواد عجیب وغریب خصوصیات کا حامل ہوتا ہے جیسے ایٹس کی روحانیت یار لکے کی نفسیاتِ ذات سے تعلق ہے لیکن عام طور پر ان شاعروں نے عام تجربات سے ہی اپنے موضوعات حاصل کیے اور ان موضوعات کو برتنے کے لیے صرف جینئیس کی ضرورت تھی۔ مثال کے طور پر ایٹس نے اپنے دوستوں کو بالکل حقیقی شکل میں پیش کرتے ہوئے مختلف تصورات کی تمثیلوں کا روپ بھی دے دیا اور اس طرح ایک بالکل نئی قسم کی شاعری کی۔ ایٹس کے یہ دوست اس کے اولیا اور شہید ہیں اور اس کے لیے بدلتی ہوئی زندگی اور بامرادی و نامرادی کی مختلف النوع مثالیں ہیں۔ جارج نے بھی اپنے طور پر یہی کچھ کیا ہے۔ وہ اپنے دوستوں سے بالکل ذاتی اور ریخی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے انھیں اپنے آپ کو انسان کی روحانی تاریخ کی اہم کڑیاں ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ والیری کے ہاں موضوعات کا دائرہ ہی بالکل نیا ہے۔ اپنی اندرونی کش مکش کی تمثیل کے ذریعہ وہ علم اور جذبہ، ذہن اور جسم کی عام کش مکش کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کش مکش کو انیسویں صدی کے سائنسی نقطہ نظر نے اور بھی شدید بنادیا اور تقریباً ہر متمدن آدمی کو اپنے طور پر اس تضاد کا حل تلاش کرنا پڑا۔ والیری کو نہ صرف اس کش مکش کا علم ہے بلکہ اس نے اس تضاد کا مختلف طریقوں سے سامنا کیا ہے اور کم از کم اپنی شاعری میں اس کا حل ڈھونڈ نکالا ہے۔ (نا تمام) ۱۹۶۱ / ۴ / ۲۸

○○

آگ کا دریا

(تبصرہ)

"آگ کا دریا" اردو ناول نگاری میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے ۔ جدید مغربی ناول کی روایت کا سراغ اردو میں پہلی بار قرۃ العین کے ناولوں میں ملتا ہے ۔ پریم چند کے بعد قرۃ العین کے ناول، اردو ناول نگاری میں اتنی بڑی جست ہیں کہ ان کے فن کا جائزہ لینے کے لیے جدید مغربی ناول کی تشکیل اور ارتقا کا ایک سرسری خاکہ سامنے رکھنا ضروری ہے ۔

ہنری جیمس، پروست اور جوائس نے داخلی حقیقت (INNER REALITY) کی تلاش اور یافت کے لیے اسلوب، اظہار اور طریقہ کار کے جو مختلف تجربے کیے اس کے بیسویں صدی کے افسانوی ادب پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے ۔ ان لوگوں نے خارجی حقیقت سے ناول کا رخ اندرونی حقیقت کی طرف موڑ دیا اور اس طرح جدید نفسیاتی یا داخلی ناول کی بنیاد رکھی ۔

روایتی حقیقت نگار اور نئے داخلی ناول نگار میں بنیادی فرق یہ تھا کہ حقیقت نگار، اشیا، حالات و واقعات اور کرداروں کے افعال و اعمال کی خارجی تصویر کشی کرتا تھا اور داخلی ناول نگار کے لیے کرداروں کی اندرونی ذہنی اور جذباتی زندگی مرکزی اہمیت رکھتی تھی ۔ وہ ذہن و احساس پر مرتسم ہونے والے نقوش اور تاثرات کو گرفت میں لانا چاہتا تھا ۔ حقیقت نگار کسی مکان کی ساخت و تعمیر اس کا محل وقوع کروں کی تعداد، فرنیچر اندرونی تزئین و آرائش اور دیگر جزئیات کی تفصیل اس طرح پیش کرتا تھا کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو مکان کے اندر موجود پانے لگتا تھا لیکن اس کے برعکس داخلی ناول نگاری خارجی اشیا کی ان تفصیلات کی بجائے اس احساس اور تاثر کو قاری کے ذہن میں منتقل کرنے کی کوشش کرتا تھا جو کسی مخصوص ذہن پر ایک مخصوص لمحے میں مکان کے اندر مرتب ہو ۔

خارجی حقیقت سے اندرونی حقیقت کی طرف ناول کی اس ہجرت کے ساتھ ناول نگار کی ساری توجہات کرداروں کے ذہن و شعور پر مرتکز ہو گئیں ۔ اب ناول نگار بیرونی واقعات کا راوی اور خارجی دنیا کا عکاس نہیں رہا بلکہ حواس کے پردے پر منعکس ہونے والی خیال و تاثر کی جھلکیوں کو گرفت میں لانا اس کا کام تھا ۔ اس بنیادی تبدیلی کے بعد اسلوب و اظہار اور زبان میں جو تبدیلیاں آئیں اور روایات سے جو انحراف ہوا وہ لازمی اور لابدی تھا ۔ آواز، رنگ اور بو سے ذہن پر مرتسم ہونے والے نقوش اور حسی کیفیات کی ترسیل اور ذہن سے گزرتے ہوئے گریز پا

اور منتشر خیالات کو ان کے بہاؤ کے عالم میں گرفتار کرنے کی خاطر داخلی ناول لکھنے والوں نے اظہار و بیان کے چند نئے تجربے کیے۔ سب سے پہلے تو ناول کے روایتی ڈھانچے میں تبدیلی پیدا کی گئی۔ روایتی ناول میں مصنف کہانی سناتا تھا اور قاری مصنف کی انگلی تھامے ناول کی گلیوں اور بازاروں میں گھومتا تھا اور یہ ذمہ داری مصنف کی تھی کہ وہ ان گلیوں اور بازاروں کے باسیوں اور واقعات کے بارے میں اپنے قاری کو تمام ضروری اطلاعات بہم پہنچاتا رہے۔ ان ناولوں میں پلاٹ واقعات کی ترتیب، کہانی کا ارتقا اور ایک منطقی تسلسل ہوتا تھا، لیکن نیا ناول ان ضروریات سے بے نیاز تھا۔ نیا ناول نگار قاری کو "کہانی" سنانے کا قطعاً قائل نہیں تھا۔ کہانی کے لیے ایک مرکزی خیال، حالات و واقعات کی ایک ترتیب اور تسلسل ضروری ہوتا ہے۔ لیکن نیا ناول نگار ان چیزوں سے دل چسپی نہیں رکھتا اس کا مقصد صرف ذہن سے گزرتے ہوئے تاثرات اور خیالات کی گرفت اور ترسیل تھا۔ کوئی بھی واقعہ یا صورت حال ہو اس کی توجہ صرف اس بات پر مرکوز رہتی تھی کہ ایک مخصوص صورت حال میں ایک مخصوص ذہن میں خیالات کی جو رو پیدا ہوتی ہے اس کی ایمان دارانہ عکاسی اس طرح کر دے کہ پڑھنے والا اس کو محسوس کر کے خود کردار کے ذہنی تجربے میں شریک رہے۔ اس کا بہترین طریقہ یہ نکالا گیا کہ قاری کو براہ راست کردار کے ذہن میں پہنچا دیا جائے اور ناول نگار یا راوی، قاری اور کرداروں کے محسوسات و تجربات کے درمیان سے ہٹ جائے۔ اس طریقہ کار میں ناول نگار کی مشکلات تو بڑھتی ہی تھیں ساتھ ہی قاری پر بھی دہرا بوجھ آپڑا۔ اس سے پہلے وہ ناول پڑھتا تھا۔ اب پڑھنے کے معنی تھے محسوس کرنا۔ روایتی ناول کے مطالعے میں محسوس کرنے کی پابندی نہیں تھی۔ ناول کی کہانی، اس کے کردار، حادثے اور واقعات ابتدا اور اختتام ہر چیز احساس کے بغیر بھی واضح طور پر اس کے سامنے ہوتی تھی۔ وہ ناول کو پسند یا ناپسند کر سکتا تھا، اس سے لطف اندوز یا بے زار ہو سکتا تھا لیکن ناول کو سمجھنے میں اسے کوئی دشواری نہیں پیش آئی تھی۔ لیکن نئے ناول کی مشکل یہ تھی کہ اگر قاری ناول کے کردار یا کرداروں کے ذہنی تجربات میں شریک نہیں ہو رہا ہے، ان کی ذہنی فضا کو محسوس نہیں کر رہا ہے تو پھر سطریں، جملے، صفحات بلکہ بعض اوقات پورا ناول بے معنی الفاظ کا گورکھ دھندا بن کر رہ جاتا تھا۔

پڑھنے والے کی یہ مشکل بعد کی چیز تھی کیوں کہ پہلے تو ناول نگار کو یہ دریافت کرنا تھا کہ قاری کو کردار کے ذہن تک کیسے پہنچایا جائے؟ اندرونی تجربات، یادوں، رنگ آواز اور بو سے حواس کی سطح پر مرتسم ہونے والے لطیف اور خفیف ترین ارتعاشات کو الفاظ میں کس طرح منتقل کیا جائے؟ خیال کو اس کے بہاؤ اور تسلسل کے عالم میں کیسے پکڑا جائے؟

ان مشکلات کا حل "اندرونی خود کلامی" یا "شعور کی رو" میں تلاش کیا گیا۔ الفاظ کا صفاتی استعمال، تمثیلی استعمال میں تبدیل ہوا۔ نثر سے شاعری، مصوری اور موسیقی کا بھی کام لیا جانے

لگا۔ الفاظ صرف معنی کے ابلاغ کے لیے نہیں بلکہ بصری تجربات شدید مبہم کیفیات اور صوتی تاثرات کی ترسیل کے لیے استعمال ہونے لگے اور اس طرح جدید داخلی ناول وجود میں آیا جسے ادبی تنقید میں مختلف ناموں سے منسوب کیا گیا۔

(Stream of Consciousness Novel, Novel of the silent, Novel of Sensibility, Poetic Novel.وغیرہ)

"آگ کا دریا" مغرب کے داخلی ناول کے اسی قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ مغرب کے ان ادبی تجربات اور میلانات کی پرچھائیاں اور افسانے میں تو کم و بیش مل جاتی ہیں لیکن اردو ناول (جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے) میں اس کے نمایاں اثرات صرف قرۃ العین کے ہاں نظر آتے ہیں۔ اندرونی خود کلامی کا استعمال عزیز احمد کے ناول "ایسی بلندی اور ایسی پستی" میں بھی ہوا ہے لیکن الفاظ سے رنگ اور آواز کے پیکروں کی تخلیق اور نثر کو شاعری میں بدلنے کا تجربہ اردو ناول میں پہلی بار قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں ہوا ہے۔ اسلوب، تکنیک اور مواد کے اعتبار سے قرۃ العین حیدر کے ناول، اردو ناول نگاری میں بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

(۲)

"آگ کا دریا"، "میرے بھی صنم خانے" اور سفینۂ غم دل" کے بعد قرۃ العین کا تیسرا اور تازہ ناول ہے۔

"آگ کا دریا" کا وہ حصہ جو قدیم ہندستان کی تاریخ سے شروع ہو کر سرل ہاورڈ ایشلے کی کہانی پر ختم ہوتا ہے اگر ناول سے ختم کر دیا جائے تو اس ناول اور ابتدائی ناولوں میں بہت کم فرق ملے گا۔ ان ناولوں کا موضوع ایک ہے۔ ناول کے کردار، ان کا ذہنی پس منظر، طرز فکر، ان کے مسائل سب بے زار کن حد تک ایک دوسرے سے مماثل ہیں۔ اسی تکرار اور اعادے کی وجہ سے "آگ کا دریا" کا جائزہ لینا ان لوگوں کے لیے مشکل ہو جاتا ہے جو اس کے پیش رو ناولوں کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ ان تینوں ناولوں کی بنیادی روح ایک ہے۔ یہ دراصل ایک ہی تجربے کے اظہار کی تین الگ الگ کوششیں ہیں اور جن خارجی حالات و واقعات میں یہ تجربہ محسوس یا پیش کیا گیا ہے وہ بھی تینوں ناولوں میں مشترک ہیں، فرق ہے تو بس اتنا کہ پہلے دو ناولوں میں جس تجربے کا اظہار تھا "آگ کا دریا" میں اسی تجربے کو ایک تاریخی تسلسل دے کر معنویت کے دائرے کو وسیع کیا گیا ہے "آگ کا دریا" میں ایک کردار کہتا ہے:

"جس طرح جس تفصیل اور وضاحت سے میں اس زمانے کی یہ کہانی دہرانا چاہتا ہوں اس میں کامیاب نہ ہو سکوں گا۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی سی باتیں ہیں، بادشاہ باغ کا شاہی وقت کلا پھاٹک، جس میں یونیورسٹی پوسٹ آفس تھا، پھولوں کے تختے سڑک پر سے گزرنے والی کہار نیں، وہ بڑھیا جو سرخ لہنگا پہنے دوپہر کو سنسان سڑک پر املیاں چنا کرتی تھی اور جو ایک روز ٹرین کے نیچے آکر

مر گئی ، ان سب چیزوں کی میرے لیے بے اندازہ اہمیت ہے ، تم کو یہ تفصیلات بے معنی اور مضحکہ خیز بھی معلوم ہوں گی ۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا طریقہ ہو کہ جس سے اس فضا، اس ماحول اور اس وقت کا سارا تاثر، ساری خواب آگیں کیفیت دوبارہ لوٹ آئے، کسی طرح تمھارے ذہن میں منتقل ہو جائے ۔ یہ کمیونی کیشن کہلاتا ہے اور بڑی مشکل چیز ہے ۔"

یہ اقتباس قرۃ العین کے فن کی مکمل تعریف پیش کرتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کمیونی کیشن واقعی بڑی مشکل چیز ہے اور قرۃ العین اکثر بڑی کامیابی سے اس مشکل سے عہدہ برآ ہوئی ہیں، لیکن خرابی یہ ہو گئی ہے تینوں ناولوں میں ہر بار ایک ہی فضا، ماحول، تاثر اور کیفیت کا کمیونی کیشن ہوا ہے، نہ صرف تینوں ناولوں میں بلکہ ہر ناول کے تقریباً تمام کردار ایک ہی ذہن اور احساس (Sensibility) کے حامل ہیں۔ یہ ذہن اور احساس (Sensibility) دراصل مصنفہ کے اپنے ہیں۔

داخلی ناول اور خود گذشت میں ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ جہاں خود نوشت میں مصنف کے اپنے ذہن و احساس کی براہِ راست عکاسی ہوتی ہے وہاں داخلی ناول مصنف کے تخلیق کردہ یا منتخب کردہ ذہن و احساس کی عکاسی کرتا ہے ۔ داخلی ناول میں جو تجربات، تاثرات اور خیالات پیش ہوتے ہیں ان کا تعلق اس مخصوص ذہن سے ہوتا ہے جسے مصنف اپنے ناول کے کردار کے لیے منتخب کرتا ہے اور یہ تجربات و تاثرات اس مخصوص کردار کے شعور کی قسم، ذہنی ساخت، طریقہ، فکر اور نقطہ، نظر سے متعین ہوتے ہیں، مصنف کو صرف اتنی آزادی ہوتی ہے کہ وہ اپنے کردار کے لیے کس قسم کے ذہن اور احساس کا انتخاب یا اسے تخلیق کرے ۔ اس کے بعد اس کا کام صرف اس ذہن اور احساس کی عکاسی کرنا ہے ۔ اس میں شک نہیں اس قسم کی معروضیت اپنی مکمل اور خالص شکل میں ناممکن ہوتی ہے ۔ یہ آسان بات نہیں ہے کہ مصنف کا اپنا ذہن اور احساس اپنے منتخب کردہ یا تخلیق کردہ ذہن و احساس پر بالکل ہی عکس انداز نہ ہو لیکن اتنا تو ممکن بھی ہے اور ضروری بھی کہ ناول کے مختلف کردار اپنا اپنا الگ ذہن، شعور اور احساس رکھتے ہوں ۔ قرۃ العین کے ناولوں میں یوں تو درجنوں کردار ملتے ہیں، لیکن وہ کردار جن کے ذہنی تجربات یا جن کی ذہنی فضا سے مصنفہ پڑھنے والوں کو متعارف کراتی ہیں، جنھیں اہم اور مرکزی کردار کہنا چاہیے، ان سب کے ذہن ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں، ان کے احساس اور شعور میں کوئی بنیادی فرق یا ایسی امتیازی خصوصیت نہیں ہے، جو انھیں ایک دوسرے سے علاحدہ کرے، مختلف بنائے اور ایک ایک کو الگ اور منفرد وجود عطا کرے ۔ یہ قرۃ العین حیدر کے ناولوں کی بہت بڑی کمزوری ہے ۔ "شعور کی رو" اور "اندرونی خود کلامی" کے ناول کو عام طور پر بغیر کردار کا ناول کہا جاتا ہے ۔ یہ بات ان معنوں میں صحیح ہے کہ ان ناولوں میں کرداروں کی عمر، صورت، لباس، وضع قطع، عادات وغیرہ کو اہمیت نہیں دی جاتی ۔ یہ کردار گوشت پوست کے چلتے

پھرتے پیکر نہیں ہوتے۔ بعض اوقات کئی کئی صفحات پڑھ جانے کے بعد یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ کردار عورت ہے یا مرد۔ روایتی اور مروجہ معنوں میں یہ ناول یقیناً کرداروں سے خالی ہوتے ہیں لیکن ان کی جگہ نئے ناول میں ذہن اور شعور نے لے لی ہے۔ نیا ناول، ذہن اور احساس کا ناول ہے اور یہ ناول جس ذہن و احساس تک قاری کو پہنچاتا ہے اس ذہن کے خصائص، اس کے طریقہ فکر اور طرزِ احساس سے اس ذہن و احساس کا ایک "کردار" تشکیل پاتا ہے اور اس "کردار" سے داخلی ناول میں بھی مفر نہیں۔ قرۃ العین کے ہاں ایسے کردار نہیں ملتے۔ ان کے ناولوں کے سارے افراد اپنے احساسات اور تاثرات میں سوچنے سمجھنے کے طریقوں میں ایک ہی ذہن اور احساس کی نمائندگی کرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کردار ایک مرکزی کردار کے Offshoots ہیں "میرے بھی صنم خانے" قرۃ العین کا پہلا ناول ہونے کے باوجود بعد کے دو ناولوں کے مقابلے میں بڑی حد تک اس عیب سے پاک ہے۔

قرۃ العین کے ناولوں کی ایک اہم اور نمایاں خصوصیت "وقت" سے ان کی بے پناہ دلچسپی ہے "وقت" ہمیشہ ان کا محبوب موضوع رہا ہے۔ نہ صرف "آگ کا دریا" بلکہ اس سے پہلے کے ناولوں اور اکثر افسانوں میں بھی ان کے ہاں وقت کا بہت شدید احساس ملتا ہے۔ ناول اور افسانے تو کیا وہ رپورتاژ بھی لکھتی ہیں تو ان کی فکر کا انداز یہی ہوتا ہے۔

"وہ ڈچ گورنر جو ۱۷۶۵ء میں اس کمرے میں اس جگہ پر بیٹھا ہوگا جہاں ہماری آپا کا صوفہ رکھا ہوا ہے، اس کی اولاد اس وقت کہاں ہوگی؟ تاریخ نے اسے کس طرح Transform کیا ہوگا۔ تاریخ نے بالکل میرا پیڑا کر دیا"

"ڈھاکہ سو رہا ہے وقت جاگ رہا ہے، ماضی حال میں موجود ہے اس بات کو کوئی نہیں پہچانتا جس طرح مستقبل حال میں موجود ہے اس بات کو بھی کوئی نہیں جانتا" (پدما ندی کے کنارے)

مستقبل کے حال میں موجود ہونے والی بات کوئی اور جانے یا نہ جانے مجھے تو افسوس یہ ہے کہ خود قرۃ العین بھی یہ بات نہیں جانتیں یا اگر جانتی بھی ہیں تو اس کے منطقی نتائج کو قبول نہیں کرنا چاہتیں۔

ان ناولوں کے کردار ماضی کو حال اور مستقبل کو ماضی میں دیکھنے کے عادی ہیں۔ شاید این پورٹر نے کہا تھا کہ چوں کہ مستقبل صرف ایک تصور ہے اور "حال" ایک ثانیہ کا وہ مختصر ترین حصہ ہے جس میں "واقعہ" وقوع پذیر ہوتا ہے۔ لہٰذا وقت کی تین جہتوں میں ماضی ہی ایک ایسا زمانہ ہے جسے ہم اپنے تجربے کی بنا پر حقیقی اور اصلی کہہ سکتے ہیں۔ قرۃ العین کے کرداروں کا وقت کا تصور اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ان ناولوں میں وقت سے یہ گہرا شغف ہندو فلسفے اور ایلیٹ کی شاعری کے اثرات سے آیا ہے۔ ہندو فلسفے کی بازگشت "آگ کا دریا" سے پہلے بھی قرۃ

العین کی تحریروں میں موجود تھی۔ ایلیٹ کی نظموں کے ٹکڑے اور مصرعے کافی تعداد میں ان کے ہاں نثر میں ڈھلے ہوئے ملتے ہیں "آگ کا دریا" کی ابتدا ہی ایلیٹ کی نظم سے ہوی ہے جو The Dry Salvages کی تلخیص شدہ شکل ہے۔ لیکن قرۃ العین کے ناولوں میں "وقت" سے یہ دل بستگی ہمیشہ فکری اور فلسفیانہ سطح پر باقی نہیں رہتی بلکہ ماضی کی یادوں سے خالص رومانوی نگاؤ کی خام کارانہ جذباتیت میں بھی ڈھل جاتی ہے اور یہیں سے ان کی تحریروں میں بلند و پست کا وہ تضاد پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے قرۃ العین کے اکثر ناقدین یا تو افراط و تفریط کا شکار ہوگئے ہیں یا کوئی قطعی رائے دیتے ہوئے جھجک اور ایک Uneasiness محسوس کرتے ہیں۔

وقت کو حادثات کی نقش گری کرنے والا سلسلہ، روز و شب سمجھ کر ماضی کے مطالعے سے ایک تاریخی تصور اور بصیرت بھی حاصل کی جا سکتی ہے اور ماضی کو یادوں کا نگار خانہ بنا کر رومانوی دھند میں غرق ہونا بھی ممکن ہے۔ قرۃ العین کے ہاں دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور بعض اوقات ایک دوسرے میں اس طرح گڈمڈ ہوجاتی ہیں کہ Sublime اور Ridicule کا فرق مشکل ہوجاتا ہے۔ قرۃ العین کی شدید جذباتیت نے جہاں ان کی تحریر کو دل سوزی اور تاثیر کی دولت بخشی ہے وہاں یہ کم زوری بھی اسی جذباتی وفور کی دین ہے اور ان کی یہی کم زوری عام پڑھنے والوں میں ان کی مقبولیت کا سبب بھی بن گئی۔

(۳)

۱۸۵۷ء میں دلی تاراج ہوئی تو اس صدی کی دوسری تیسری دہائی تک بھی اس تباہی کے ماتم اور مرثیوں کی گونج فضا میں باقی تھی۔ حالی اور ناصر نذیر فراق سے اشرف صبوحی اور شاہد احمد تک اس تباہی کی داستانیں رقم کرنے والوں کی تعداد بہت ہے۔ لیکن جب ۱۹۴۷ء میں دلی لٹی اور اس کے ساتھ دوآبے کے علاقے میں تکمیل کو پہنچی ہوئی ہندو مسلمانوں کی پروردہ مشترکہ تہذیب و ثقافت کا جنازہ نکلا تو اردو ادب میں فسادات پر لکھی ہوئی تحریروں کے انبار کے باوجود اس تہذیبی سانحے کو صرف ایک نوحہ گر ملا۔

قرۃ العین حیدر کے تینوں ناول ایک عظیم نوحہ ہیں ان تمام نظریات اور اقدار کا جو ایک خاص معاشرت اور تصورحیات کے پروردہ تھے۔ ہندستان میں ہندوؤں مسلمانوں کی تہذیبی زندگی نے مشترکہ کلچر اور قومیت کے جن تصورات کی تشکیل کی ان کی اساس چند بے حد تابناک انسانی اقدار پر قائم تھی۔ ان تصورات پر سیاسی یا کسی اور نقطہ نظر سے بحث و تمحیص اور ان کے ماننے والوں کی نیت پر حملہ کرنا آسان ہے لیکن جن لوگوں نے ان تصورات و عقائد پر ایمان رکھا اور جن کی زندگیاں اسی مشترکہ تہذیب کے سانچے میں ڈھل کر نکلیں، ان لوگوں کو جب Disillusionment کا سامنا کرنا پڑا تو تاب و تواں کی قوتیں ان کا ساتھ نہ دے سکیں۔ عمر بھر جن نظریات و اقدار کو موت و حیات کا فیصلہ کن معیار سمجھیں وہ اگر ایک لمحے میں نقش برآب

ہوجائیں تو آدمی کی فکری اور جذباتی زندگی کی بنیادیں سرک جاتی ہیں۔ اس حادثے کے اسباب و علل اور اتفاق و اختلاف کی بحثوں سے قطعِ نظر اس میں شک نہیں نظریات و عقائد کی یہ شکست و ریخت ہمارے دور کی ایک بہت بڑی ٹریجڈی تھی اور یہ المیہ اپنے پورے درد و کرب کے ساتھ قرۃ العین کے ناولوں میں ڈھل کر انھیں ایک تاریخی دستاویز کی اہمیت بھی بخش گیا ہے۔ "آگ کا دریا" میں قرۃ العین نے تقسیم کے حادثے کو ڈھائی ہزار سال کی تہذیبی زندگی کے تناظر میں اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ واقعہ صرف ایک ملک اور طبقے کی داستان نہیں بلکہ انسانی تاریخ کا جز بن گیا ہے۔

اس ناول کو سہولت کی غرض سے چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ گوتم نیلمبر کا قدیم ہندستان ابوالمنصور کمال الدین کی آمد۔ سرل بارورڈ ایشلے کا نزول۔ قبل از تقسیم مابعد تقسیم کا دور۔

گوتم نیلمبر کا دور ڈھائی ہزار سال پہلے کے ہندستان سے شروع ہوتا ہے۔ قرۃ العین نے اس دور کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی جھلکیاں بڑی فن کارانہ چابک دستی سے پیش کی ہیں۔ گوتم نیلمبر انسانی زندگی کی معنویت، حیات و کائنات کا مفہوم اور عدم و وجود کے اسرار جاننے کے تجسس میں نکلا ہوا، ذہن و روح کی دنیا کا یولیسس اور قدیم ہندستان کی روح کا نمائندہ ہے۔ دکھ کے فلسفے اور روح کی تنہائی جیسے مسائل پر غور کرنے والے گوتم نیلمبر اور حکومتِ ہند کی طرف سے بدھ جینتی کی پبلسٹی کرانے والے گوتم کے درمیان ڈھائی ہزار سال کا فاصلہ حائل ہے۔ ان ڈھائی ہزار سالوں میں ابوالمنصور کمال الدین بغداد اور نیشاپور سے ہندستان آکر شنکر اچاریہ دلبھ اور رامانند کے ناموں سے آشنا ہوا، ابودھیا کی ایک برہمن زادی سے مل کر ناجیہ اور ام رباب کو بھول گیا گو کھجور اور آم، سرجو اور دجلہ کا فرق اسے ضرور یاد آتا رہا۔ لیکن اس سرزمین نے اسے قبول کر لیا تھا وہ اس کے سحر سے زیادہ دیر محفوظ نہ رہ سکا" ابن خلدون اور فارابی کو پڑھنے والا بغداد اور جون پور کا ابوالمنصور کمال مورخ، محقق، سیاست داں، سپاہی جسے تصوف اور معرفت سے کبھی کوئی سروکار نہ تھا، بالآخر کاشی کے بیچ گنگا گھاٹ پر پہنچ گیا۔" مسلمان صوفیوں، ہندو یوگیوں نے محبت کو ظاہری مذہب سے برتر شے بنا دیا تھا" ہزاروں لاکھوں میل دور سے آیا ہوا مذہب، ہندستان میں اپنے گرد و پیش اپنے ماحول اور پس منظر سے متاثر ہوتا رہا۔ اس کی جڑیں ایک اجنبی سرزمین میں پھیلنے لگیں "اور یوں مشترکہ قومیت اور تہذیب کی تعمیر ہو رہی تھی۔ ناول کا دوسرا حصہ یہاں ختم ہوتا ہے۔

تیسرے حصے میں گوتم نیلمبر ایک کلرک میں اور ابوالمنصور کمال الدین بنگالی کسان میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ہندستان میں انگریزوں کی تجارتی کوٹھیاں تعمیر ہو گئی ہیں۔ سرل بارورڈ ایشلے لندن کی فاقہ زدہ زندگی سے تنگ آکر ہندستان آتا ہے اور چند ہی سالوں میں جان کمپنی کا اہم ستون علی پور روڈ کی عظیم الشان عمارات کا مالک، اودھ کے بادشاہ کا لنگوٹی یار اور نئی اردو نثر کا مربی اور

سرپرست بن جاتا ہے اور ڈھاکے کے کارخانوں میں الو بول رہے تھے۔ سارے ملک میں لوہے کی بھٹیاں مدتیں گزریں سرد ہو چکی تھیں۔ انگلستان کی ملوں سے ایسا دھواں اٹھا تھا جس نے ساری دنیا کو تاریک کر دیا اور اس تاریکی میں ہندستانی جو لاہوں کی ہڈیاں ہندستان کے میدانوں کی دھوپ میں چمک رہی تھیں، ہندستان سے لوٹی ہوئی دولت کی بنیاد پر انگلستان میں صنعتی انقلاب اور نئی سرمایہ کاری کی نیو اٹھائی جاچکی تھی "

" شاہ اودھ کی عمل داری میں اس ملک کا بچہ بچہ، بوڑھا جوان، ہندو مسلمان اپنے بادشاہ پر جان چھڑکتا تھا، یہ سب لوگ اپنے بادشاہوں پر عاشق تھے۔ ہر زبان پر آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کے قصے تھے۔ اودھ کے یہ سارے باشندے فرنگی سے شدید نفرت کرتے تھے۔ یوگیوں اور صوفیوں نے جس مشترکہ تہذیب اور قومیت کی نیو ڈالی تھی اور جسے مسلمان بادشاہوں اور نوابوں نے پروان چڑھایا تھا وہ تہذیب اور قومیت اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔

" ۱۸۵۷ء کے بعد ہندستان باضابطہ طور پر وکٹوریہ کی ایمپائر میں شامل ہو چکا تھا " بغداد سے آئے ہوئے کمال الدین نے اب مٹیا برج کے نواب کمن صاحب کا روپ دھارن کر لیا ہے۔ گوتم نیلمبر، پروفیسر نیلمبر دت بن چکا ہے۔ کمن صاحب کے پاس صرف ماضی ہے، وضع داری ہے۔ گوتم نیلمبر کو اس کی تعلیم نے، رام موہن رائے کے برہمو سماج نے ایک نیا مستقبل عطا کیا ہے۔ یہ فرق بہت بڑا فرق ہے، کیوں کہ اس کے نتائج بہت اہم ہیں۔ یہاں ناول کا تیسرا حصہ ختم ہوتا ہے۔

ناول کے چوتھے حصے میں " میرے بھی صنم خانے " اور " سفینۂ غم دل " کا دور شروع ہوتا ہے۔ پہلے تین حصوں میں اس حصے کی عقبی زمین تیار کی گئی تھی، ابو المنصور کمال الدین اور گوتم نیلمبر یعنی نواب کمن اور پروفیسر نیلمبر دت کی اولاد یو۔پی کے اونچے متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ، ذہین، حساس انٹلکچویل اور سیاسی شعور رکھنے والے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی صورت میں سامنے آئی ہے۔ طلعت، کمال، ہری شنکر، چمپا، گوتم یہ سب حد درجے کے آئیڈیلسٹ ہیں۔ بے حد جذباتی اور تخیل پرست لوگ " اصول پرست، راست باز، تصورات پر مرمٹنے والے۔ وہ حقیقت کو نہیں دیکھنا چاہتے مگر بدقسمتی سے دنیا کا نظام شاعر نہیں سیاست داں چلا رہے ہیں جن کو ان کے وژن سے کوئی دل چسپی نہیں۔ " یہ سب خیال کی سلطنت کے رہنے والے ہیں۔ ان کی انسانیت پرستی، بلند خیالی، خلوص اور نیک نیتی یقیناً بہت اعلیٰ درجہ کی چیزیں ہیں لیکن ان کی ٹریجیڈی یہ ہے کہ انھوں نے عمل کو خیال سے الگ کر دیا ہے۔ یہ لوگ صرف سوچتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ڈرامے اسٹیج کرتے ہیں۔ سوائے چمپا کے باقی سب کٹر قوم پرست ہیں۔ ہندستان کی تہذیب اور روایات سے شدید محبت رکھتے ہیں۔ انسانی برادری اور عالم گیر اخوت پر ان کا ایمان ہے۔ ان کے سینوں میں سارے جہاں کا درد بھرا ہوا ہے۔ ان کا وجود بیسویں صدی میں ہے لیکن

ان کے اندر ڈھائی ہزار سال پرانے گوتم اور کمال الدین کی روح باقی ہے۔
وقت کا تند و تیز لاوا تہذیبوں اور حکومتوں کو پگھلا کر بہا دیتا ہے۔ جینے کے طریقے اور وسائل بنتے اور بگڑتے ہیں لیکن ہر دور میں انسانی روح کے مسائل ازلی ابدی ہیں۔
گوتم نیلمبر پروفیسر نیلمبر دت اور حکومت ہند کا ملازم نیلمبر۔ ابوالمنصور کمال الدین، نواب کمن اور بیسویں صدی کا کمال، گوتم کی چمپک ابوالمنصور کی چمپا، لکھنو کی چمپا بائی اور ہمارے دور کی چمپا احمد، ان کے زمانے الگ الگ تھے، ان کے درمیان ڈھائی ہزار سال کا وقت پھیلا ہوا تھا، لیکن دکھ کا فلسفہ، روح کی تنہائی کا مسئلہ، دل کی وحشت، حافظے کی اذیت اور خاموشی کا سناٹا ان سب نے ہر بار ہر دور میں محسوس کیا۔ سرل ہاورڈ ایشلے بھی اس چکر سے آزاد نہیں۔ اتنی کامیاب اور شان دار زندگی گزارنے والا بھی یہی سوچتا ہے۔ "انسان کس طرح جیتے تھے، کس طرح مرتے تھے، یہ گورکھ دھندا کیوں جاری تھا، گہری ندیا، اگم جل، زور بہت ہے دھار کھیوٹ سے پہلے ملو جو اترا چاہو پار۔ یہ کھیوٹ کہاں تھا اور اس سے ملنے کی فرصت کسے تھی۔ مگر روح کا یہ غم کیسا تھا جو مدتوں سے کھائے جا رہا تھا" دراصل یہ اس ناول کی مرکزی تھیم ہے۔ اس تھیم کو پیش کرنے کے لیے قرۃ العین نے ہندستان کی تہذیبی، معاشرتی، سیاسی اور سماجی زندگی کی تاریخ کا ایک وسیع و عریض چوکھٹا تعمیر کیا ہے۔ ہندستان میں مسلمانوں کی آمد، انگریزوں کا تسلط، آزادی کی جدوجہد، قوم پرست مسلمانوں کی ذہنی اور جذباتی کشمکش، تقسیم کے اثرات، نئی مملکتوں کے مسائل ان سب کو قرۃ العین نے تاریخی شعور، مفکرانہ بصیرت اور نفسیاتی دروں بینی کے ساتھ پیش کیا ہے، لیکن اصل چیز یہ چوکھٹا نہیں ہے۔ اصل چیز تو انسان کی وہ زخمی اور پیاسی روح ہے جو تاریخ کے اس چوکھٹے میں پیش کی گئی ہے جو گہری ندیا اور اگم جل سے پار اترنا چاہتی ہے لیکن جسے کھیوٹ نہیں ملتا۔

ناول کے اختتام پر "میرے بھی صنم خانے" کی رخشندہ کی طرح، کمال، گوتم اور چمپا احمد اپنی روحوں کے زخم چھپائے ہوئے، دنیا کے غموں میں اپنے غموں کو بھول کر یہ دریافت کر لیتے ہیں کہ "وہ خود اور ان کا ذاتی الم کس قدر حقیر شے تھا!! میرے سامنے مسائل کا بہت اونچا پہاڑ کھڑا تھا، تب جانتے ہو کیا ہوا؟ چیونٹی نے کیا کیا۔ اس نے کانوں میں ہاتھی لٹکا کر پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔"

اس ناول میں کمزوریاں اور خامیاں بھی ہیں جن کا ابتدا میں ذکر کیا جا چکا ہے، لیکن ان کمزوریوں کے باوجود "آگ کا دریا" ایک عظیم کوشش ہے۔ اردو ناول نگاری میں یہ ناول ایک سنگِ میل ہے۔ جدید مغربی ناول سے قرۃ العین نے کئی چیزیں لی ہیں، لیکن ان سب کے امتزاج سے انھوں نے اردو میں اسلوب اور اظہار کی جو نئی راہیں نکالی ہیں اور جو تجربے کیے ہیں ان کی قدر و قیمت کو تسلیم نہ کرنا بد دیانتی ہے۔ اردو ناول کے ریگستان میں "آگ کا دریا" ایک سرسبز و شاداب نخلستان ہے۔

دو ناول اور آدم جی انعام

" محمود ایاز صاحب کا یہ مضمون شائع کرتے ہوئے یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اگر چہ ادارہ " ہم قلم " اور آدم جی پرائز کمیٹی دو مختلف ادارے ہیں اور " ایڈیٹر کا مضمون نگار سے متفق ہونا ضروری نہیں " کی رسمی سپر بھی موجود ہے تاہم اس مضمون میں ہمیں وہ تلخی کلام نظر آتی ہے جس سے شکایت کا موقع پیدا ہوتا ہے ۔ اگر محمود ایاز صاحب کی مقابلے میں شامل ہونے والے دوسرے ناولوں اور دیگر اصناف کی کتابوں تک بھی دست رس ہوتی تو یہ مضمون زیادہ معروضی ہوسکتا تھا ۔ ممتاز مفتی اور جمیلہ ہاشمی کے ناولوں کے تقابلی مطالعے تک ہم اس تبصرے کا احترام کرتے ہیں ۔ انعام کا فیصلہ کرنے کے طریق کار پر بھی سب کو اعتراض کا حق ہے لیکن ججوں کے متعلق ان کے اشارے ناروا ہیں ۔ بعض جگہ تو نیت پر حملہ بھی معلوم ہوتا ہے ۔ یہاں اس حقیقت کا اعادہ بھی ضروری ہے کہ اس بار جمیل الدین عالی جج نہیں تھے بلکہ وہ خانوادہ ، آدم جی کے ساتھ انعام کے بانی ہونے کی وجہ سے صرف (بنگلہ اور اردو) ججوں کے بورڈ کے سکریٹری تھے اور یہ کہ وہ اکیلے پورے دس ججوں کی متفقہ ہدایت کے خلاف ضابطہ بدلنے سے انکار کرنے کی حیثیت نہیں رکھتے تھے ۔ اگر محمود ایاز صاحب اپنے اس مضمون کو دیانت دارانہ تنقید کہتے ہیں تو یقین رکھیے ججوں کا فیصلہ بھی دیانت دارانہ تھا ۔ یوں بدگمانی کا وار تو سب پر ہوسکتا ہے ۔۔۔ خود ان پر بھی ۔

(ادارہ)

علی پور کا ایلی

" علی پور کا ایلی " ممتاز مفتی کا پہلا ناول ہے ۔ " فسانہ ، آزاد " کے بعد اردو کا پہلا ضخیم ترین ناول جو بڑے سائز کے تقریباً بارہ سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے ۔ مفتی نے اس تصنیف کو " مسلسل کتاب " کا نام دیا ہے حالاں کہ اسے ہر پہلو سے بلا جھجک ایک کامیاب ناول کہا جاسکتا ہے ۔ یہ ناول روداد ہے ایک ایسے شخص کی ، جس کا تعلیم کچھ نہ بگاڑ سکی ، جس نے تجربے سے

کچھ نہ سیکھا، جس کا ذہن اور دل ایک دوسرے سے اجنبی رہے۔ جو باپ بننے کے باوجود بچہ ہی رہا، جس نے کئی ایک محبتیں کیں لیکن محبت نہ کر سکا، جس نے محبت کی پھلجھڑیاں اپنی انا کی تسکین کے لیے چلائیں لیکن سپردگی کے عظیم جذبے سے بے گانہ رہا، جو زندگی بھر انا کی دھندلی بھول بھلیوں میں کھویا رہا حتیٰ کہ بالآخر نہ جانے کہاں سے ایک کرن چمکی اور اسے نہ جانے کدھر کو لے جانے والا ایک راستہ مل گیا۔

ooo

اپنے عزائم کی شکست میں اپنے رب کو پہچاننے والوں کا دائرۂ عمل الگ ہوتا ہے، لیکن ایک فن کار کے لیے اس کا تخلیقی عمل ہی اپنی یافت اور عرفان کا واحد ذریعہ ہے۔ اسی تخلیقی عمل کے دوران میں وہ اپنی ذات کے بکھرتے ہوئے سروں کی شیرازہ بندی کرتا ہے اور اپنی ذات اور عناصر کے درمیان توازن کا وہ نقطہ دریافت کرتا ہے جہاں اسے نسبتاً چھوٹی سطح پر اور کم تر وقفے کے لیے "نفسِ مطمئنہ" کی منزل مل جاتی ہے۔ "علی پور کا ایلی" ایسے ہی تخلیقی عمل کا آئینہ ہے۔ ایلی کی تخلیق میں مفتی نے اپنے آپ کو پایا ہے۔ یہ ناول تلاشِ ذات کا ناول ہے۔ اسے ایک طرح سے مہماتی ناول بھی کہا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ ذہن اور شخصیت کو مسخ کرنے اور کج رو بنانے والے اور وراثتی اور ماحولی کج رو اثرات، لاشعور کے خوفناک خواب اور نفسیاتی الجھنیں ایک بے آب و گیاہ صحرا کے وہ آسیب اور جنات ہیں جنھوں نے انسانی ارادہ و اختیار کی کنجی کو طلسم بند کر رکھا ہے اور ایلی نے ہولوں سے بھرے اس لق و دق صحرا سے گزر کر ان ہیبت ناک عفریتوں کا مقابلہ کیا اور اپنے خون میں نہا کر اس طلسم کو توڑا اور ارادہ و اختیار کی یہ کنجی حاصل کی ہے۔

ooo

ایلی کی شخصیت کی خشتِ اول کو کج رکھنے والا شخص اس کا باپ علی احمد تھا۔ علی احمد فرائڈین اسکول کے اس "جابر اور حاکمِ مطلق باپ" کی شبیہ ہے جو کافکا کے یہاں اس دنیا کے کسی فرد کی شکل میں نظر نہیں آتا بلکہ پُراسرار، بعید اور آئینی قوت میں تبدیل ہو گیا ہے، جیسے "قانون" "عدالت" اور قلعے (CASTLE) کے اندر رہنے والے افسروں کے "احکام" کافکا کے ہاں باپ جب گوشت پوست کے آدمی کی شکل میں آتا ہے، جیسے METAMORPHOSIS یا JUDGEMENT تو اس باپ میں علی احمد کی پوری جھلک نظر آتی ہے۔ کہانیوں سے قطع نظر

، زندگی میں بھی کافکا کا باپ علی احمد کا ہم زاد تھا ۔ کافکا نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اپنے باپ کو لکھا تھا " میرے لیے آپ میں وہ پر اسرار چیز پیدا ہوگئی ہے جو تمام بادشاہوں میں ہوتی ہے اور جو دلائل کے زور پر نہیں بلکہ صرف اپنی شخصیت کے بل بوتے پر اپنے شوہر کے زیرِ اثر تھی کہ وہ اپنی ساری محبت کے باوجود اپنے بیٹے کے لیے کچھ نہ کرسکتی تھی ۔ کافکا کا باپ دنیوی اعتبار سے کامیاب معزز اور متمول شخص تھا ۔ علی احمد اس اعتبار سے گو بہت گراپڑا آدمی نہیں تھا لیکن اس کی برتری کی سطح الگ تھی ۔ اس نے اپنی جنسی زور آوری کو اپنی برتری ، تفوق اور حاکمیت کا اسم بنا رکھا تھا ۔ احساسِ فتح و تسخیر حاصل کرنے کے لیے علی احمد نے ٹین کے سپاہی کی ترکیب ایجاد کر رکھی تھی ۔ ہر محاذ پر شکست کھانے کے بعد " ٹین کا سپاہی " اپنے محاذ پر حملہ آور ہوجاتا اور اس محاذ سے سرخ رو ہو کر علی احمد فخر و کامیابی کے نشے میں سرشار ہو جاتا ۔

ایلی جب ہوش کی عمر کو آیا تو اس نے " فتح " کی اسی تکنیک کو حصول کا ذریعہ سمجھا اور اسی طریقے سے شہزاد کو تسخیر کرنے کی کوشش کی جو پہلے ہی سے مسخر تھی ۔ لیکن ایلی اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے اپنے پہلے حملے میں ناکام رہا اور اس کے بیمار ذہن میں ایک اور گرہ کا اضافہ ہوگیا ۔ اسے شہزاد سے محبت تھی ۔ شہزاد بھی ایلی سے محبت کرتی تھی لیکن اس کی محبت سمندر کی سطح پر ابھرتی ہوئی موج نہیں تھی بلکہ دور تہ میں کھولتا ہوا طوفان تھی ۔ اس کی محبت ایلی کی محبت سے زیادہ گہری ، شدید اور اصلی تھی لیکن ایلی کو اس کا یقین نہیں تھا کیوں کہ وہ عورت کو جیتنے کے ایک ہی طریقے سے واقف تھا اور اس طریقے میں ناکام ہونے کے بعد وہ یہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ پھر شہزاد اس سے کس طرح محبت کرسکتی تھی ۔

شہزاد اس ناول کا سب سے بڑا کردار ہے ۔ اس ناول میں مفتی نے جتنے کردار پیش کیے ہیں ان میں سب سے زیادہ مسحور کن ، پراثر اور ہمیشہ زندہ رہنے والا کردار شہزاد کا ہے ۔ شہزاد کا کردار مجھے بار بار PREVOST کی مانوں لے کو " کی یاد دلاتا رہا حالاں کہ دونوں کرداروں میں ایسی مطابقت بھی نہیں ہے ۔ اردو ادب کے جو چند ایک کردار افسانوں اور ناولوں کے چوکھٹے سے نکل کر ہمارے دلوں اور ذہنوں میں داخل ہوگئے ہیں ان کی مختصر تعداد میں شہزاد ایک نمایاں اضافہ ہے ۔

شہزاد خوش بوؤں اور رنگوں میں ڈوبی ہوئی عورت ہے ۔ اس کا جسم کسی خوش بو کے بغیر بھی مہکتا رہتا تھا ۔ اس کی بے پناہ شوخی و بے باکی اس کے پھلجھڑیوں کی طرح چھوٹتے ہوئے قہقہے ، شرم وحیا کے تمام مروجہ تصورات سے اس کی بے نیازی ۔ ان تمام باتوں نے اسے دنیا

کے نزدیک شوہر کی عزت کو سرِ بازار بیچ دینے والی آوارہ عورت بنا رکھا تھا۔ لیکن اس کی محرومی اور جلن کا کوئی ہم راز نہ تھا۔ ایلی بھی نہیں جو اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کے کردار اور مزاج کی بظاہر متضاد ومتلون کیفیتوں کی گتھی کھلنے والے تو کیا، ایلی بھی سلجھا نہ سکا اور اسی تذبذب میں مبتلا رہا کہ شہزاد "رانی ہے یا مہترانی"۔ آس کے اندر پیار، وفا اور محبت کی جو آگ روشن تھی اس میں وہ ہنس ہنس کر جلتی رہی۔ شہزاد کے اس اندرونی وجود کو، اس کی محرومی اور درد کو، اس کے کردار کی صلابت اور ارادے کی پختگی کو مفتی نے اس کی بہ ظاہر بے حیائی، خوش مزاجی، آوارگی اور ڈھیٹ پن کے پس منظر میں اس فن کارانہ دل سوزی کے ساتھ ابھارا ہے کہ شہزاد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہوگئی۔ ISHER WOOD کی سیالی PREVOST کی بانوں لے کو GAPOTE کی بالی، ان تینوں کی سرشت میں جو مختلف اور متضاد عناصر تھے ان کی مختلف تناسب سے آمیزش نے شہزاد کے کردار کا خمیر اٹھایا ہے۔

ایلی کی زندگی میں شہزاد طوفانی جھکڑ کی طرح داخل ہوئی اور صبح کی ہوا کے جھونکے کی نرم روی سے اس دنیا سے گزر گئی۔ پہلی ملاقات سے شہزاد کی موت تک ایلی اور شہزاد کے تعلقات وصل و جدائی اور قرب و بے گانگی کے چکر میں متواتر دائرہ وار گھومتے رہے لیکن قرب ہو یا دوری ہر حال میں شہزاد کا وجود اور اس کا تصور ایلی کی شخصیت کو شکست و ریخت کے مرحلوں سے لے کر ترتیب و تکمیل کی منزلوں تک درجہ بہ درجہ بڑھاتا رہا۔ وہ ایلی سے ہمیشہ کہتی تھی "تمہاری زندگی میری موت کے بعد شروع ہوگی" اور یہ بات سچ نکلی۔ شہزاد نے اپنے تلون، لاگ اور لگاؤ، محبت اور گریز کے عمل سے ایلی کی شخصیت کی تعمیر کی۔ اس نے ایلی کو خواہش اور حصول، کامیابی اور نامرادی کے مرحلوں سے اس طرح گزارا اور نکالا کہ ایلی کی شخصیت کی تطہیر ہوگئی۔ شہزاد کی محبت ایلی کے لیے CATHARSIS ثابت ہوئی۔ اور جب وہ مرگئی تو ایلی کی زندگی شروع ہوئی۔

زندگی کے دریا کی بہاؤ کی منجدھار گزر چکی تھی۔ اب وہ پایاب پانی میں چل رہا تھا۔ لیکن پایاب پانی میں پہنچ کر الیاس آصفی (ایلی) نے دفعتاً محسوس کیا کہ وہ آزاد ہے۔ قطعی طور پر آزاد، اپنی انا کی بندشوں سے آزاد۔ اس کی آنکھوں سے ذات کا چشمہ اتر گیا تھا۔ اب وہ دنیا کو دیکھ سکتا تھا۔ دنیا بے حد وسیع تھی مگر وہ بلا کی وسعت اداسی نہیں پیدا کررہی تھی، اس میں ایک عجیب سی عظمت تھی۔ اس نے پہلی بار دوسروں کو دیکھا۔ ایلیؔ میلے سے واپس آرہا تھا، لیکن جو میلے کو جارہے تھے ان پر خندہ زن نہ تھا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ بھرپور شوق سے میلے کو جانا بھی ضروری تھا اور بے لاگ لگاؤ وہاں سے لوٹنا بھی ضروری تھا۔

پاکستان بن گیا ۔ ایلی کا گھر ہندوستان میں رہ گیا تھا ۔ گولیوں کی بوچھاڑ اور قتل و خون کے سیلاب سے گزر کر ایلی " چھوٹے سے کنویں " اور " چھوٹی سی سفید مسجد " کے پاس پہنچ گیا ۔ شہزاد چھم سے سامنے آکر کھڑی ہوگئی اور بولی " راستے کی رکاوٹ تو میں تھی " سفید مسجد اسے اشارے کررہی تھی " حضور مسکرارہے تھے " ۔

زندگی بھر انا کی دھندلی بھول بھلیوں میں گم رہنے والے کی زندگی میں نہ جانے کہاں سے ایک کرن چمکی اور اسے نہ جانے کدھر کو لے جانے والا راستہ مل گیا ۔

یہ وہ ناول ہے جسے آدم پرائز کمیٹی کے باذوق اراکین نے انعام کے قابل نہیں سمجھا ؛ ؛

OOO

پائین باغ میں آرام کرسی پر لیٹ کر دفع الوقتی کی خاطر ادب پڑھنے والے عہدے داروں اور انگریزی ، فرانسیسی ادب پڑھے ہوئے عالم وفاضل نقادوں کے نزدیک (اگر وہ خدانخواستہ اردو ادب پڑھنے لگے ہوں) اس ناول میں کئی خامیاں ہوں گی ۔ لیکن مجھے اس ناول میں صرف ایک کم زوری اور بہت بڑی کم زوری یہ نظر آئی کہ اس میں غیر ضروری اور بے جا DIGRESSIONS سے کام لیا گیا ہے ۔ اس ناول میں درجنوں ایسے کردار ہیں جن کے بغیر بھی یہ ناول اطمینان سے چل سکتا تھا ۔ ناول میں ضمنی اور ذیلی کردار غیر ضروری نہیں ہوتے لیکن اسی وقت جب ان کا ذکر یا عمل ناول کے مرکزی کردار یا خیال کی تعمیر وتفہیم میں مدد دے ۔ ایلی اپنی زندگی میں سیکڑوں لوگوں سے ملا ہوگا لیکن ان میں سے ہر آدمی کا ذکر اور اس کے نفسیاتی مسائل کا اظہار نہ صرف غلط اور غیر ضروری ہے بلکہ اس سے بار بار پڑھنے والے کی توجہ بھٹکنے کا بھی اندیشہ رہتا ہے اور یہ بات قاری کے نقطہ نظر سے قطع نظر ، فنی طور پر بھی قابلِ گرفت ہے ۔ اگر اس طرح کی غیر متعلق ANECDOTES اور غیر ضروری تفصیلات اس ناول سے خارج کردی جائیں تو اس سے ...... ناول کا حجم بھی کم ہوجاتا اور مجموعی تاثر کی کیفیت اور شدت بھی بڑھ جاتی ۔ ہر سامنے آنے والے کردار یا واقعے کو کتاب میں سمیٹنے کی ترغیب خطرناک ہوتی ہے ۔ اور ایک اچھے فنکار کے لیے اس پر غلبہ پانا بہت ضروری ہوتا ہے ۔ اس ایک بڑی خامی سے قطع نظر مفتی کا یہ ناول اردو کے گنے ، چنے دو تین ناولوں کی فہرست میں ایک گراں مایہ اضافہ ہے ۔

پیشہ ور نقادوں اور ادیبوں کی بات میں نہیں جانتا لیکن جن لوگوں پر ادب کے حسن اور تاثر کے دروازے ابھی کھلے ہوئے ہیں وہ ایلی کے نئے سفر کی داستان پڑھنے کے مشتاق رہیں گے ۔ اور مجھے امید ہے مفتی اپنا وعدہ پورا کریں گے ۔

(۲)

تلاشِ بہاراں

جمیلہ ہاشمی کا یہ ناول میں نے بڑے ذوق وشوق اور توقعات کے ساتھ پڑھا۔ ان کے دو افسانوں (" آتشِ رفتہ " اور " بن باس ") سے میں اس طرح متاثر تھا کہ کراچی آنے کے بعد میں نے کتابوں کی دکانوں پر پہلے ان کے اس ناول کی تلاش کی اور پہلی فرصت میں پڑھنے کے لیے وقت نکالا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ابھی اس ناول کو انعام نہیں ملا تھا۔

مجھے اعتراف ہے پہلے تو میں اپنے سارے ذوق و شوق کے باوجود یہ ناول پورا نہ پڑھ سکا اور اس کے بعد دوبارہ سہ بارہ اپنے آپ پر جبر کر کے مجھے یہ ناول ختم کرنا پڑا۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی کردوں کہ مجھے ناول کے دل چسپ ہونے پر ہمیشہ اصرار نہیں ہوتا۔ بعض اوقات لکھنے والے کا اسلوب، فکری عنصر، نئے تجربات کی کوشش، ناول کو کسی حد تک ضرور غیر دل چسپ بنا دیتے ہیں۔ لیکن " تلاشِ بہاراں " کا مسئلہ اور تھا۔ یہ ناول کسی گہرائی، نئے تجربے یا اپنی نوعیت کی وجہ سے کوئی دشواری نہیں پیدا کرتا بلکہ اس کی مشکل یہ ہے کہ یہ ۱۹۳۰ء میں راشد الخیری کے ناول اور اس دور کے " رومانی " افسانوں کے پڑھنے والے ذہن کا مطالبہ کرتا ہے۔

" آتشِ رفتہ " اور " بن باس " کی مصنفہ تلاشِ بہاراں میں کہانی کہنے کے فن سے بھی حیرت ناک حد تک نابلد نظر آتی ہے۔

یہ ناول نہ خود گذشت ہے نہ بیانیہ۔ نہ اندرونی خود کلامی کا ناول ہے، نہ حالات و واقعات کے خم و پیچ سے ترتیب پانے والا روایتی انداز کا ناول۔ باوجود کوشش کے میں " تلاشِ بہاراں " کا CLASSIFICATION کرنے سے قاصر ہوں۔

ناول کی ابتدا میں ایک صاحب کنول رانی ٹھاکر کے بارے میں سوچتے ہوئے ملتے ہیں۔ دوسرے صفحے پر پتہ چلتا ہے کہ کنول رانی دراصل " مرحومہ " ہیں۔ اس کے فوراً بعد معلوم ہوتا ہے کہ مرحومہ " اپنے خوابوں میں ساری عمر نادوسے کے ہیرو ناجیل کا انتظار کرتی رہیں "۔ زندگی میں انھوں نے آزادیِ نسواں اور حقوقِ نسواں کے لیے جدوجہد کی تھی اور اب ان کے مرنے کے بعد شاید چند دنوں اخباروں میں اس کی موت کا چرچا ہوگا۔ سیاہ حاشیوں میں اس کی موت کی خبر چھپے گی، اس کے اقوال، اس کی باتیں ایک خاص نمبر میں شائع ہوں گی۔ بہت ہوا تو لوگ اس کا مجسمہ بنا کر کسی چوراہے میں نصب کر دیں گے اور پھر اس کے پاس سے یوں

گزر جائیں گے جیسے وہ مجسمہ ان کے لیے کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتا۔" اس کے بعد یہ گہرا انکشاف کہ "کنول کے ساتھ وہ سارے نظریے، وہ ساری باتیں بھی ختم ہوگئیں جن کے سہارے وہ زندہ تھی۔ اس کے بعد کوئی اور، کوئی نرالی، بہتر یا بد تر عورت اس کا علم ہاتھ میں لے کر چلے گی مگر وہ کنول تو نہ ہوگی۔"!!

چلیے اجمالاً ہی سہی اتنا تو معلوم ہوگیا کہ کنول رانی کون تھیں، ان کا انجام کیا ہوا اور وہ زندگی میں کیا کرنا چاہتی تھیں۔ اب اس اجمال کی تفصیل کوئی سواسات سو صفحات میں جو مستقل کراہنا اور MOANINGہوتی ہے وہ ناقابلِ برداشت ہے۔ ناول اندازاً کوئی آٹھ دس برس کے عرصے پر محیط ہے اور اس پورے عرصے کو ذہن میں اس طرح گھسیٹا گیا ہے کہ واقعات، عمل اور وقت کی رفتار کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ ہر واقعہ اور ہر عمل "ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے" معلوم ہوتا ہے۔ یہ ناول جست اور حرکت دونوں سے بے نیاز ہے۔

کنول رانی اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ لیکن سارے ناول میں اسے ایک پتھر کی دیوی کی طرح طاق پر بٹھاکر پوجا گیا ہے اور وہ لمحہ بھر کے لیے بھی کہیں زندہ نہیں ہونے پاتی۔ کئی ایک حضرات اس سے محبت کرتے ہیں لیکن وہ آدرش وادی عورت زمینی انسانوں کی سفلی محبت کو لے کر کیا کرتی۔ لہٰذا اس نے ہر ایک کو ٹکاسا جواب دے دیا اور ٹھکرادیے جانے کے بعد یہ سارے حضرات، جن میں ایک دنیادار تاجر، ایک غیر ملکی سیاح، ایک ڈاکٹر اور ایک اخبار نویس بھی شامل ہیں، خاموش کنول رانی کی پرستش کیے جاتے ہیں اور کنول رانی کے آئیڈیلز کے سانچے میں اپنی زندگیاں ڈھلنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ کاش دنیا میں ایسے پیارے اور معصوم لوگ ہوتے اور کاش ذہن و کردار کا بدل جانا اتنا ہی آسان ہوتا۔ سقراط و مسیحا غلط دور میں پیدا ہوئے تھے۔

ناول میں بڑے مبہم ماورائی انداز میں آئیڈیلز اور اقدار کی باتیں مسلسل ہوتی رہتی ہیں۔ کنول رانی کے بلند تصورات، ان کے چاہنے والوں کی قلبِ ماہیت، لیکن اس کے باوجود کہیں کوئی آئیڈیل، کوئی بلند تصور الفاظ سے گزر کر حقیقت کی شکل اختیار نہیں کرتا۔ سب باتیں کررہے ہیں یا خواہ مخواہ "درد ناک" بن کر سوچ رہے ہیں یا پھر کہیں سے کسی کا ایک خط آجاتا ہے جس میں بے حد فلسفیانہ انداز میں "کائناتی مسائل" پر گفتگو کی جاتی ہے۔ کوئی تسلسل، کوئی ربط، کوئی معنویت، کوئی حرکت، کوئی عمل، اس ناول میں بار نہیں پاتا۔ اور تو اور پورے ناول میں کہیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ کنول رانی کے ذہن و احساس کی ساخت کیا تھی، کنول رانی کا اندرونی وجود کیا سوچتا تھا، اس کی شخصیت کی تہہ میں کیا چیزیں کارفرما تھیں۔ جمیلہ ہاشمی نے کنول

رانی کے کردار میں ایک مشین کو عورت کے روپ میں پیش کردیا اور اس کے اردگرد اس کے چاہنے والوں اور مداحوں کی تعریفوں اور تاثرات کا ایک ہالہ تعمیر کردیا۔ یہی سلوک ناول کے تمام کرداروں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ سب شطرنج کے مہرے ہیں۔ مصنفہ ایک مہرہ ہاتھ میں لیتی ہیں اور اس مہرے کی فکر، احساس اور عمل کے بارے میں دس پندرہ صفحے لکھ دیتی ہیں۔ کنول رانی سے بے شمار HEROICS منسوب کی گئی ہیں لیکن کنول رانی خود کہیں کبھی کوئی عمل کرتی ہوئی نظر نہیں آتیں (سوائے ایک موقع کے جب وہ طوفانی اور اندھیری رات میں اپنے مہمان کو اس کے گھر پہنچانے کے لیے گھوڑا گاڑی چلاتی ہیں!) کنول رانی بیسیوں مواقع پر آئیڈیل پرستی اور دنیا داری کے تقاضوں کے درمیان گھر جاتی ہیں اور ہمیشہ اپنے اصولوں کو سر بلند رکھے سرخ رو نکل آتی ہیں لیکن ہم ایک بار بھی کنول رانی کے ذہن، احساس اور شخصیت میں اس تضاد، کشمکش اور فیصلے کے عمل کو صورت پکڑتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ کنول رانی جس سنگھاسن پر بیٹھی ہوئی ہیں ہم دور دور تک اس کے قریب نہیں پہنچ سکتے۔ ہمیں ان کے دربار میں بار نہیں ہے۔ البتہ جمیلہ ہاشمی وقتاً فوقتاً دربار سے خبریں لے کے آتی ہیں اور ہم سن کر دل شاد کرلیتے ہیں۔

شطرنج کے دوسرے مہروں میں ایک صاحب ڈون دار ٹن بھی ہیں۔ "اسپین کے نخلستانوں سے آیا ہوا انگریز سیاح"۔ ان صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سنجیدہ سی سنجیدہ گفتگو میں بھی دو چار بار "او بوائے" کہتے ہیں۔ شاید امریکی فلموں یا سستے امریکی ناولوں نے مصنفہ کو یہ باور کرایا ہے کہ ہر امریکی خواہ وہ عدم و وجود کے اسرار پر بھی کیوں نہ گفتگو کررہا ہو، "او بوائے" ضرور کہتا ہے۔ پھر ڈون دار ٹن امریکی بھی نہیں ہے۔

ایک اور صاحب ہیں، راجندر پرشاد سکسینہ، بہت بڑا عہدیدار جو صرف کنول رانی کے عشق میں مستعفی ہوکر "انسانیت" کے لیے کام کرنا چاہتا ہے۔ یہ صاحب انتہائی دکھ اور فکر کے عالم میں اپنے دوست سے کہتے ہیں "آؤ آج پرانے استادوں کے ریکارڈ سنائیں" اور اس کے بعد "پرانے استادوں" کے یہ ریکارڈ بجائے جاتے ہیں۔

امید ان سے کیا تھی اور کر وہ کیا رہے ہیں
خود ہی بنا رہے تھے، خود ہی مٹا رہے ہیں

اور

اے کاتبِ تقدیر مجھے اتنا بتادے

وضاحتاً یہ بھی بتاتا چلوں کہ "استادوں" کی اس روح نواز موسیقی سے متاثر ہوکر درمیانی

وقفوں میں ایک سرکاری عہدیدار اور ایک اخبار نویس مابعد الطبیعاتی مسائل پر گفتگو کرتے ہیں ؛؛
"تلاشِ بہاراں" ROMANTIC AGONY کا ناول ہے (ماریو پراز کے معنوں میں نہیں) جو صرف ایک مخصوص عمر میں لکھا اور پڑھا جا سکتا ہے اور جو کسی زمانے میں ہمارے ہاں (یادش بخیر ۔ نیاز ۔ ل ۔ احمد ۔ مجنوں کے افسانوں کا دور) نو عمر لڑکوں اور خواتین میں کافی مقبول تھا ۔ اس قسم کی تحریروں میں کسی نفسیاتی ۔ منطقی ۔ تسلسل ۔ جواز یا توجیہ کی کبھی کوئی ضرورت نہیں محسوس ہوتی ۔ ناول نویس جو لکھے ۔ پڑھنے والے اس پر آمنّا صد قنا کہیں اور رومال سے آنسو پونچھ پونچھ کر ناول پڑھتے جائیں ۔ ایسے ناول لکھنے کے لیے عنفوانِ شباب کی غیرآلودہ خالص رومانویت اور لاعلمی سے پیدا ہونے والی معصوم جراءت اور خود اعتمادی کی ضرورت ہے ۔

"تلاشِ بہاراں" کی مصنفہ کے ہاں یہ دونوں خوبیاں بہ درجۂ اتم پائی جاتی ہیں ۔
لگے ہاتھوں اس ناول کی زبان اور اسلوب پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے کیوں کہ پرائز کمیٹی کے معزز اراکین نے بہ طورِ خاص اس خوبی کا ذکر کیا ہے اس سلسلے میں صرف چند نمونے پیش ہیں :

۱ ۔ کرشنا بوس کا نیا شباب تھا ۔
۲ ۔ وہ ناگن کو مار دیتے ہیں اور پھر بھی زخمی ناگن کے آنکھیں کھول کر اپنے گرد دیکھنے پر بھی انھیں بہت حیرت ہوتی ہے ۔
۳ ۔ بارش ایک ہولناک آواز سے مکان کے چھجوں اور چھتوں پر ہو رہی تھی ۔
۴ ۔ کنول ٹھاکر کے چہرے پر غصے اور اس ذلت پر (جو عورتوں کی پوری جنس کے متعلق ان لفظوں میں پوشیدہ تھی) جھنجھلاہٹ تھی ۔ (قوسین مصنفہ کے ہیں)
۵ ۔ مگر اس کی تیز بارعب آواز ہی صرف عدالت کے کمرے میں گونج رہی تھی ۔
۶ ۔ جو کچھ میں نے سنا تھا اس سے یہ لازم تھا کہ کنول رانی کی حفاظت کروں ۔

یہ چھ نمونے صرف چھ صفحات سے (صفحہ ۸ تا صفحہ ۱۴) لیے گئے ہیں اور پورے ناول میں کم از کم سات آٹھ سو ایسے اسلوب و بیان کی خوبیوں سے معمور جملے بہ آسانی مل جائیں گے اور ان کے باوجود اس ناول کی زبان اور اسلوب کو سراہا گیا ہے ۔ فاعتبرو ؛؛

اے ۔ حمید کی رومانی ماورائیت اور قرۃ العین کے اسلوب کی APING کے امتزاج سے اگر اسلوب اور بیان کی خوبی پیدا ہوسکتی ہے تو وہ اس ناول میں موجود ہے ۔
یہ ہے وہ ناول جسے اس سال اردو ادب کا سب سے بڑا انعام دیا گیا ہے ۔

○○○

آدم جی انعام

آدم جی انعام کے لیے درجنوں کتابیں آئی ہوں گی لیکن مجھے ان کا علم نہیں۔ مجھے ان دو ناولوں کے بارے میں علم تھا اور یہ دونوں ناول میں نے پڑھے۔ جمیلہ ہاشمی کا ناول انعام کے اعلان سے پہلے پڑھا اور مفتی کا ناول اعلان کے بعد۔ ان دونوں ناولوں اور انعام کے بارے میں میں نے اپنی رائے کا اظہار کرنا اس لیے ضروری سمجھا کہ ادب میں ذوق اور مذاق کے اختلاف کی گنجائش کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اس اختلاف کی حدود ہوتی ہیں اور یہ حدود کافی وسیع ہیں۔ ساٹھ اور سو کا فرق بھی ان حدود میں آجاتا ہے لیکن پانچ اور سو کا فرق ذوق و مذاق کا اختلاف نہیں ہوتا بلکہ ذوق کو بے توفیقی اور بد مذاقی سے ممیز کرنے والا خطِ فاصل ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں یوں بھی ادبی اقدار اور معیار کے بارے میں کافی سے زیادہ CONFUSION موجود ہے اور ملک کے سب سے بڑے ادبی ادارے کی طرف سے کسی کتاب کو انعام دیا جاتا ہے تو عام طور پر اس کتاب کو مثالی اور معیاری سمجھا جاتا ہے اور اس طرح پڑھنے لکھنے والوں کے سامنے ایک معیار قائم ہوتا ہے لیکن اگر یہ انعام تیسرے درجہ کی چیزوں کو دیا جاتا رہا تو اس کا یہی نتیجہ نکلے گا کہ یا تو اس انعام کی کوئی توقیر اور وقعت باقی نہیں رہے گی یا پھر ملک کی ادبی پیداوار کی عام سطح اور بھی گرجائے گی۔ ظاہر ہے یہ صورت نہ ادارے کے لیے مفید ہوگی اور نہ ادب کے لیے۔

انعامات کے سلسلے میں، خواہ وہ نوبل پرائز ہو یا پلٹزر ہمیشہ اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ کامیو کو نوبل پرائز ملا تو بعض نیک نیت لوگوں کا خیال تھا کہ سارتر کی حق تلفی ہوئی ہے۔ وجہ ان کے نزدیک یہ تھی کہ سارتر ① نے اپنی تحریروں سے "آزاد دنیا" والوں کو بدظن کر رکھا تھا اور کامیو نے الجزائر تک کے مسئلے پر کوئی واضح رویہ نہیں اپنایا (یہ اور بات کہ FINNEGANS WAKE کو سمجھنے کے دعوے دار ADULTEROUS اور THE GUEST کی معنویت نہ سمجھنا چاہیں۔ پھر ادیب سے واضح سیاسی رویے کی بات بھی خوب ہے) لیکن اس "اختلافِ خیال" کے باوجود یہ بات اپنی جگہ برقرار رہے گی کہ سارتر اور کامیو میں نوے اور سو کا فرق ہو سکتا ہے **دس اور سو** کا نہیں۔ سارتر کا کٹر سے کٹر معتقد بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کامیو کی

---

① دوسری طرف تخلیقی ادب میں ENGAGED LITERATURE کی عملی تفسیر تو یہ ہے کہ LOSER WINS کو جو خالصتاً نفسیاتی ڈرامہ ہے، سارتر کی توضیح کے بعد سیاسی ڈرامہ مان لیا جاتا ہے۔

تحریریں تیسرے درجے کی چیز ہیں ۔ اس سطح پر اختلافِ مذاق ممکن ہی نہیں ناگزیر بھی ہے لیکن اگر سارتر کے مقابلے میں کامیو کی بجائے JEANGENET کو نوبل پرائز دے دیا جاتا تو پھر یہ مذاق اور خیال کا اختلاف نہیں رہتا بلکہ صریح بے ایمانی یا انعام دینے والوں کی بد ذوقی قرار پاتا ۔ جہاں تک میری محدود معلومات کا تعلق ہے اس درجہ کی ادبی بد دیانتی یا بد ذوقی کا مظاہرہ اب تک کسی انعام کے سلسلے میں نہیں ہوا ۔ آدم جی انعام البتہ اس سے مستثنیٰ ہے ۔

ہر انعام یافتہ کتاب یا مصنف کے بارے میں عام طور سے اختلافِ خیال کا پایا جانا اس بات کا جواز نہیں بن سکتا کہ ایک بے حد ادنیٰ تحریر کو آنکھ بند کرکے انعام دے دیا جائے اور پورے اطمینان سے ہر احتجاج اور تنقید کو "اختلافِ مذاق" پر ٹال کر اپنے معمولات زندگی یا مکروہاتِ زندگی میں مشغول ہوجائیں ۔

گلڈ بڑے مقاصد کو لے کر اٹھی ہے اور اس نے اب تک کافی اچھا کام کیا ہے ۔ انعام کے سلسلے میں جو فروگزاشت ہوئی ہے اس کا بہ ظاہر گلڈ کے ذمہ دار ارکین سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ بہرحال انعام کا فیصلہ تو پرائز کمیٹی کرتی ہے ۔ گلڈ البتہ اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ کن لوگوں کو یہ کام سونپتی ہے ۔ ممکن ہے کہ گلڈ نے ابتدا میں جن افراد کا انتخاب کیا وہ حضرات بہ وجوہ یہ ذمہ داری قبول کرنے سے قاصر رہے ہوں مگر بعد از خرابیِ بسیار جو حضرات انتخابی کمیٹی کے لیے نام زد ہوئے انھوں نے یہ کارِ نمایاں سر انجام دیا کہ آدم جی انعام کی نوعیت ہی بدل کر رکھ دی ۔ آدم جی انعام تخلیقی ادب کے لیے تھا لیکن "تلاشِ بہاراں" پر ججوں نے جو وضاحتی نوٹ دیا ہے اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ انعام تخلیقی اور تخیلی ادب کو نہیں بلکہ اصلاحی اور تعمیری ادب کو دیا ہے ۔ اصلاحی یا تعمیری ادب کی نشوونما اور فروغ کوئی بری بات نہیں ۔ ہمارے ہاں ہندوستان میں بھی ایسے لوگ ہیں جو پنج سالہ منصوبوں پر ادب کی پیداوار کرتے ہیں لیکن ججوں کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس امر کی وضاحت کردیتے تاکہ غلط فہمی کا امکان نہ رہتا اور شکوے شکایت کی گنجائش ہی نہ پیدا ہوتی ۔

اس انعام کے سلسلے میں ایک اور زیادتی یہ ہوئی ہے کہ نظم کو دو سال سے انعام کا مستحق نہیں سمجھا گیا ۔ اس بار جج صاحبان نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس سال کوئی قابلِ ذکر مجموعہ سامنے نہیں آیا ۔ بنیادی بات تو یہ ہے کہ جج صاحبان کو اس بات کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ انعام کے بنیادی قوانین میں کوئی تبدیلی یا تبدیلی کی سفارش کریں ۔ بات صاف اور واضح تھی کہ ایک انعام نثر کی بہترین کتاب کو اور ایک نظم کی بہترین کتاب کو دیا جائے گا ۔ بہترین کا انتخاب موصول شدہ کتابوں سے کیا جائے گا ۔ اگر موصول شدہ نثر کی کتابوں میں "تلاشِ بہاراں"

بہترین تھی تو نظم کی کتابوں میں یوسف ظفر اور منیر نیازی کے مجموعے بھی تھے ۔ ان مجموعوں میں کیسی شاعری ہوئی ہے ۔ اس سے یہاں بحث نہیں اور نہ جج صاحبان کو اس بحث سے کوئی تعلق ہونا چاہیے تھا ۔ ان کا تو کام صرف اتنا تھا کہ نظم کی موصول شدہ کتابوں سے ایک بہترین کتاب کا انتخاب کرلیتے اور پھر یوسف ظفر کا مجموعہ " صدا بصحرا " اتنی بری کتاب بھی نہیں تھی کہ جج صاحبان کو اسے انعام دیتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ۔ اس مجموعے میں چار چھ نظمیں تو ایسی ہیں (" ملکہ ۔ نیل " ۔ " حسنِ نظر " وغیرہ) جو گذشتہ آٹھ دس سال کی اچھی نظموں میں جگہ پاسکتی ہیں ۔

یہاں پہنچ کر " حسنِ ظن " قائم رکھنے کی ہر کوشش رائیگاں نظر آتی ہے اور مجبوراً سوچنا پڑتا ہے کہ یہ انعامات کس بنا پر دیے جاتے ہیں (کیا پرائز کمیٹی) نے اپنے طور پر پوری طرح ادبی دیانت داری کو ملحوظ رکھ کر فیصلہ کیا تھا ؟ اگر یہ سچ ہے تو پھر ان حضرات کے ادبی ذوق و معیار کے بارے میں دو رائیں نہیں رہتیں ۔

کیا یہ صورتِ حال قدرت اللہ شہاب اور جمیل الدین عالی کے لیے ایک لمحہ ۔ فکریہ نہیں فراہم کرتی ؟ ؟

(مطبوعہ " ہم قلم " ۔ پاکستان ۔ جنوری ۱۹۶۲ ۔)

OO OOO OO

سی۔ایم بورا　　　　ترجمہ: محمود ایاز

علامت پسندی کی روایت۔ایک تعارف

ادب میں تحریکوں کا ذکر خطرناک ہوتا ہے، شاعرانہ وجدان کو ناپایا تولا نہیں جاسکتا۔ شاعر کو کسی جماعت یا فرقے سے منسوب کرنے یا اسے کسی کلیے کی تعریف میں بہ طور نمونہ پیش کرنے میں خود شاعر کی پے چیدہ شخصیت ہمیں ناکام رکھتی ہے۔ لیکن اگر ہم یورپ میں ۱۸۹۰ء سے پہلے جو شاعری کی گئی ہے اس کا موازنہ اس دور کے بعد کی شاعری سے کریں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ دونوں میں کافی فرق ہے اور نئے شاعروں کے ہاں چند ایک چیزیں اس طرح مشترک ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے، یہ سب ایک ہی تحریک کے افراد ہیں۔ ان نئے شاعروں کے ہاں یہ مماثلت کسی طے شدہ منصوبے یا ارادی کوشش کی وجہ سے نہیں آئی ہے۔ اس کا موازنہ Lake School یا Pleiade کے لکھنے والوں سے نہیں کیا جاسکتا مگر یہ شاعران لکھنے والوں کی یاد دلاتے ہیں جو اپنے دور میں اپنے معاصرین سے ممتاز اور مختلف معلوم ہوئے لیکن آنے والی نسلوں نے ان سب کے ہاں اس دور کی ایک ہی مخصوص چھاپ دیکھی، جس طرح ہم آج دیکھتے ہیں کہ بائرن پشکن اور ہیوگو کے ہاں چند ایسے خصائص مشترک ہیں جو آج شاعری سے تقریباً ناپید ہوچکے ہیں۔ بالکل اسی طرح شاعروں کی اس نسل میں جو ۱۸۹۰ء میں ہوش کو پہنچی کچھ ایسی دوسری خصوصیتیں ہیں جو انھیں اپنے پیش رووں سے اور موجودہ لکھنے والوں سے الگ اور ممیز کرتی ہیں، ہم جس تحریک کا ذکر کررہے ہیں۔ وہ اپنی توانائی تقریباً ختم کرچکی ہے۔ اس تحریک کے قابل ذکر نمائندے مرچکے ہیں۔ اس کے افکار و مقاصد زنگ خوردہ ہوگئے ہیں۔ اب یہ تحریک تاریخ کا ایک حصہ بن گئی ہے اور اب وقت آیا ہے کہ اس کے مقاصد اور کامیابیوں کا تجزیہ اور ان کی قدر و قیمت کا تعین کیا جائے۔

اس تحریک کو ان شعری سرگرمیوں کی دوسری لہر سمجھنا چاہیے جنھیں کبھی علامت پسندی اور کبھی انحطاطی شاعری کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا۔ حالاں کہ یہ دونوں نام قطعی نہیں ہیں اور ان سے قطعیت کا مطالبہ عموماً ناکام رہتا ہے، ہر شعری تحریک اپنے نمائندوں سے پہچانی جاتی ہے اور علامت پسندی کے نمائندہ شاعر بودیلیئر، ورلین اور ملارمے تھے، بودیلیئر ان تینوں میں پہلا شاعر تھا جس نے علامات کی اہمیت کو قدر اول کی حیثیت دی۔ ورلین نے علامات کو فطری طور پر استعمال کیا اور ملارمے نے علامات کی تشریح اور جواز میں ایک مابعد الطبیعاتی نظام کی تعمیری کھڑی کردی۔ ملارمے کے نظریات اور عمل میں علامت پسندی کی تحریک اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی تھی۔ اس تحریک کے ذکر کے ساتھ ہی ہمارے ذہنوں میں ملارمے کا نام اور اس کے افکار زندہ

ہو جاتے ہیں لیکن اگر بودیلیئر نہ ہوتا تو ملارمے کی شاعری بھی وجود میں نہ آسکتی تھی اور اگر ورلین ملارمے کے نظریات کو عام قبول پیرائے میں نہ پیش کیا ہوتا تو ملارمے کو مشکل ہی سے کوئی مقام مل سکتا تھا۔ ایک دوسرے سے نمایاں طور پر الگ ہوتے ہوئے بھی ان تینوں شاعروں کا زندگی کو دیکھنے کا زاویہ۔ نظر ایک تھا اور یہ چیز انھیں اپنے پیش رووں سے ممیز کرتی تھی، علامت پسندی اپنے مختلف رجحانات کے باوجود ایک بنیادی مسلک پر متحد تھی اور اسی مسلک نے علامتی شاعری کا کردار متعین کیا۔ ۱۸۹۰ء کے بعد آنے والوں کو یہ مسلک ورثے میں ملا اور انھوں نے اسے اپنا لیا۔ چند ایک نے اسے ترک کیا، دوسروں نے اسے کچھ نئی شکلوں میں ڈھالا جو تقریباً ناقابل شناخت تھیں یا پھر اس راستے سے ہو کر بیان و اظہار کے اپنے خاص اسالیب بنالیے۔ ان سب نے علامتی نظریات کی صداقت اور توانائی کی شہادت دی اور ان لوگوں کی تخلیقات یہ بتاتی ہیں کہ یہ ظاہر وقتی اور محدود نظر آنے والے نظریے سے بھی مختلف اور متنوع نتائج پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ کئی زبانوں اور دوردراز کی سرزمینوں میں ایک فرانسیسی نظریے کو عملی شکل دی گئی اور ان تجربات کے تنوع اور کامیابی سے ظاہر ہوتا ہے کہ فنون لطیفہ میں ایک نظریہ کتنا اہم ہوسکتا ہے، بشرطیکہ نظریے کو فارمولے کے طور پر نہیں بلکہ ایک نئے تجربے کے لیے بنیاد کے طور پر استعمال کیا جائے۔

ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی کے فرانس میں علامت پسندی کی تحریک بنیادی طور پر متصوفانہ تھی۔ مذہب پر روایتی عقیدے سے محروم عہد کے سائنٹفک آرٹ کے خلاف اس تحریک نے پر زور خطابت کے ساتھ احتجاج کیا اور صداقت کی تلاش میں اس عقیدے کا بدل ڈھونڈنے کی سعی کی۔ اس دور کے نمائندہ زولا کے جیسے ناول نگار تھے جو معاصر زندگی کے وسیع کینوس پر بے رحم تفصیلات کے نقوش رقم کر رہے تھے یا پھر ہیریڈیا کی طرح کے شاعر تھے جو گزری ہوئی صدیوں اور دور افتادہ مناظر کی نیم تصویریں پیش کر رہے تھے اس آرٹ میں مذہب یا تصوف کی کوئی گنجائش نہیں تھی، حقیقت نگاروں کو جو اس کے دائرے سے آگے کسی اعلیٰ اور برتر دنیا پر اس عقیدے کی ضرورت نہیں تھی جس سے اگسٹائن کے نوافلاطونی نظریات کو قبول کرنے کے بعد یورپ شناسا ہو چکا تھا۔ ان لوگوں کا یہ مضبوط عقیدہ تھا کہ صداقت سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی اور یہ صداقت صرف اسی دنیا کے تجربات میں ڈھونڈی اور پائی جا سکتی ہے۔ گو راسخ العقیدہ عیسائیت بھی اس دور میں موجود تھی اور اس عقیدے کے ادیبوں اور شاعروں کا ایک طبقہ بھی موجود تھا لیکن یہ لوگ اس عہد کے نمائندے نہیں تھے۔ انیسویں صدی کے تیسرے ربع میں فرانس میں حقیقت نگار اور Parnassians ادبی میدان پر قابض تھے۔ انگلستان میں بھی اسی قسم کی طرز فکر براؤننگ کی ڈرامائی نظموں اور ٹینی سن کی "شہزادی" کی Idyll ، Sweet ، Short قسم کی ان

نظموں میں بھی نمایاں ہے جو اشیا اور اشخاص کے تذکرے میں بالکل خارجی اور ہر طرح کی داخلیت سے مبرا ہیں۔

اس سائنسی حقیقت نگاری کے خلاف علامت پسندوں نے احتجاج کیا۔ اس احتجاج کے پس پشت ایک ایسی مثالی دنیا پر یقین تھا جو ان کے نزدیک حواس کی اس دنیا سے کہیں زیادہ اصلی تھی۔ ان ہی معنوں میں اس دور میں علامت پسندی کی تحریک متصوفانہ تھی گو اسے صحیح معنوں میں عیسوی نہیں کہا جاسکتا۔ یہ سچ ہے ورلین اپنی زندگی کے ایک دور میں ظن و تخمین سے محفوظ مضبوط عقائد پر قائم رہا، بودیلیئر کی "ابلیسیت" کیتھولیسزم ہی کی بدلی ہوئی شکل تھی۔ ملارمے نے کلیسا کی رسوم اور مذہبی شعائر سے کافی مواد لیا لیکن علامت پسندی کا متصوفانہ کردار ان ظواہر سے کہیں زیادہ عیسویت سے دور تھا۔ یہ لوگ دراصل "حسنِ مطلق" کے مذاہب کے پیرو تھے جس کا اظہار بودیلیئر، ورلین اور ملارمے تینوں کے ہاں ملتا ہے۔ اس حسنِ مطلق کو تضاد کے ذریعے ظاہر کرنے کے لیے بودیلیئر کا خود اپنی زندگی کو اندوہناک طور پر مقابل میں پیش کرنا، ورلین کی جسم اور روح کے متوازی خطوط پر لکھنے کی کوشش، ملارمے کے ناقابلِ فہم الہامی جملے، یہ سب اسی کا اظہار تھے۔ بودیلیئر کے ہاں اس حسنِ مطلق کی لگن نے اس کی پریشان اور غم رسیدہ روح کو ایک مقصد اور قوت عطا کی، ورلین کے ہاں یہ لگن ممنوعہ مسرتوں کی تلاش کا جواز بن گئی اور ملارمے کے لیے اول و آخر یہی "حسنِ مطلق" تھا۔ ان لوگوں کے عیسوی عقائد مسخ اور متزلزل ہو چکے تھے اور ایک نعم البدل کی ضرورت کے احساس کے تحت انھوں نے اس "حسن" میں کوئی ایسی چیز دریافت کرلی تھی جس نے انھیں ایک نقطے پر متحد کرکے ان کی کاوشوں کو ایک سمت اور مقصد بخش دیا تھا جو اس کے دائرے سے آگے ایک دنیا پر ان کا یقین۔ دوسرے ہر عقیدے سے مکمل بے نیازی اور اپنے عقیدے سے ان کی شدید اور جذباتی وابستگی ایسی تھی کہ اسے صرف متصوفانہ ہی کہا جاسکتا ہے۔

اس طرح دیکھا جائے تو علامت پسندی جمالیات پرستی ہی کی ایک متصوفانہ شکل تھی اور انگلستان کی جمالیاتی تحریک اسی تحریک کا دوسرا روپ تھا جس کے علم بردار راسٹی اور پیٹر تھے اور آسکر وائلڈ جس کا شہید تھا۔ "مثالی حسن" پر یہی ایمان راسٹی کی پوری شاعری میں رسا بسا ہوا ہے، اس عقیدے نے اس کی کتاب "House of Life" میں محبت کا بڑا عجیب تصور پیش کیا ہے اور مذہبی موضوعات تک اس کے احاطے میں آگئے ہیں جو نظریات راسٹی کے فن میں زیر سطح کارفرما نظر آتے ہیں ان کا براہ راست اظہار پیٹر کی Renaissance کے مشہور و معروف آخری باب میں ملتا ہے۔ آسکر وائلڈ کی تباہی اور زوال کے لیے لعنت و ملامت کا جو طوفان کھڑا کیا گیا تھا وہ صرف آسکر وائلڈ کے اخلاقی جرم پر غم و غصے کا اظہار نہیں تھا بلکہ لوگوں کے عامیانہ پن اور بد مذاقی نے اپنے دشمن کی شکست پر جشن منایا تھا، وائلڈ جس مسلک کا علم بردار تھا اس

سے یہ لوگ ڈرتے اور نفرت کرتے تھے۔ وائلڈ کو جو سزا ملی تھی وہ نہ صرف اس کی زندگی کے لیے تباہ کن تھی بلکہ اس سے جمالیات پرستی کی بنیاد پر ضرب پڑتی تھی۔ اس واقعے نے آرٹ اور فن کو بدنام کر دیا تھا اور اس کے بعد ایڈورڈین عہد کے شعرا ایک کٹے ہوئے طبقے کی حیثیت اختیار کر گئے۔ معاصر فکر کے بنیادی دھاروں سے ان کا رشتہ ٹوٹ گیا اور یہ لوگ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منتشر ہو کر الگ الگ تنہائی میں کام کرنے پر مجبور ہو گئے۔ "چار سالہ جنگ" تک یہی صورت حال رہی اور اس کے بعد کہیں جا کر انگلستان میں شاعروں کو دوبارہ قومی زندگی میں اپنا روایاتی مقام و مرتبہ ملا۔

لیکن فرانسیسی علامت پسندی کے مقابلے میں انگریزی جمالیات پرستی اتنی زیادہ نظریاتی، ریاضت طلب اور متصوفانہ نہیں تھی اور نہ راسکن اور پیٹر نے ملارمے کی طرح "خوب صورتی" کے بارے میں نظریہ بازی کو اتنی خطرناک منطقی حد پہنچایا تھا۔ جمالیات پرستوں نے مذہب اور اخلاقیات کے دائرے میں جو باطنی تجربات ممکن تھے ان سے کہیں زیادہ گہرے اور جان دار تجربے کا عرفان فن اور آرٹ میں ممکن بنالیا تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ وہ کس آدرش کی پرستش کر رہے تھے۔ انھیں اپنے آدرش کا علم تھا اور ان کی زندگیاں فطری اور مخلص تھیں۔ ان کے القانات اور نظریات واقعی انقلابی تھے۔ ان نظریات نے نہ صرف ان کے معاصرین کو دہشت زدہ کیا بلکہ انگریزی کلچر کا پورا کردار ہی بدل کر رکھ دیا۔ ایک طرح سے یہ لوگ بھی مذہبی ہی تھے کیوں کہ انھیں احساس تھا کہ "خوب صورتی" کی تلاش زندگی کو مربوط و متحد بنا کر اسے ایک معنویت بخشتی ہے۔ یہ لوگ ملارمے کی طرح تصوف زدہ نہیں تھے اور نہ ان کے نظریات اتنے ماورائی، اتنے مکمل اور سخت گیر تھے۔ یہ لوگ ارتسامات کو ان کی اصلی شکل میں قبول کرنے پر قانع تھے۔ ان ارتسامات کو تخیل کی رنگ آمیزی سے بڑھا چڑھا کر ایک برتر اور مثالی کائنات میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ شاید پروٹسٹنٹ انگریز کی فطرت کسی بھی مابعد الطبیعاتی نظام یا تصوف کی مکمل اطاعت سے طبعاً گریز کرتی ہے۔ پیٹر کی جمالیات پرستی اپنی نوعیت میں تجرباتی اور داخلی تھی۔ وہ اپنے سارے ارتسامات کو ایک ترتیب دے کر ان پر فکر کرتا اور ان سے اپنے نظریات کی تشکیل کرتا تھا لیکن اس کے اخذ کردہ نتائج نظریاتی کم اور عملی زیادہ ہوتے تھے۔ میرے خیال میں اس نے شاید اپنے دور کی فکر کو اتنا متاثر نہیں کیا جتنا لوگوں کے اعمال و کردار کو۔ اس کی تعلیمات نے یقین و اعتقاد کا محور تلاش کرنے والے کئی لوگوں کو ایک نیا آدرش بخشا اور عظیم تبدیلیوں کے واسطے راستہ ہموار کیا۔ جانسن اور ڈاؤسن جیسے انیسویں صدی کے اواخر کے کئی ایک شعرا پر پیٹر کا بہت اثر تھا لیکن اس کا عظیم ترین شاگرد جیرارڈ ہوپکنس تھا جس کی شعری زندگی پر انگلستان اور یورپ کا کوئی فکری دھارا اثر انداز نہیں ہو سکا تھا۔ پیٹر نے ایک ایسے دور میں شعر و ادب کو عزت و احترام کے قابل بنایا جب ان کی قدر و قیمت گر چکی تھی اور شعر و ادب سے بد گمانی

اور بد ظنی عام تھی لیکن بہ ایں ہمہ پیٹر کے تصورات ملارمے کی طرح اتنے پے چیدہ اور متصوفانہ نہیں تھے۔

ملارمے نے یقیناً ادب کے ایک تصوف کی ایجاد کی تھی جس کا بے ربط اظہار وہ بہت پر اسرار اور شان دار الفاظ میں کرتا رہا۔ اس کے نظریات کا ماحصل یا خلاصہ پیش کرنا ناممکن ہے اور اس کوشش میں اس کے اصل نظریات بالکل مسخ ہو جاتے ہیں کیوں کہ ملارمے نے مخصوص موضوعات پر ہمیشہ استعاروں اور تشبیہوں میں اظہارِ خیال کو ترجیح دی لیکن ان سے ان کی بنیادی نظریات اور طریقہ۔ کار کے بارے میں ضروری معلومات اخذ کی جا سکتی ہیں اور انھیں میں علامت پسندی کے اہم ترین نکات ملتے ہیں مثلاً Divagations " میں ایک جگہ پھول کا ذکر کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک جادو کے لفظ سے ظاہر ہو جانے والا یہ پھول ایک مثالی پھول ہے۔ اس میں سارے پھولوں کی خوب صورتی ہے لیکن یہ خود ہر ایک پھول سے الگ اور بلند کوئی اور ہی چیز ہے۔ ملارمے جس چیز کو "Idee " (خیال) کہتا ہے وہ بہ یک وقت ایک مخصوص معیار بھی ہے اور ایک عالم گیر اصول بھی۔ "وجود" نہیں بلکہ "حسن" ملارمے کے لیے "حقیقتِ کل" تھا۔ خوب صورتی سے بھری ہوئی اس دنیا میں ملارمے نے (Les Idees) خیالات میں ایک ایسا تخلیق کرنے اور سہارا دینے والا ذریعہ تلاش کر لیا تھا جو نہ صرف بالذات خوب صورت بلکہ دوسری اشیا کی خوب صورتی کا باعث بھی تھا Prose, Pour Des, Esseintes میں بھی اس نے تقریباً اسی نظریے کا اظہار کیا ہے، یہاں بھی جس پھول کا ذکر کیا ہے وہ ایک مثالی پھول ہے اور اس کی خوب صورتی، صرف خالص نظر کے لیے ہے، حواس کے لیے نہیں۔

اس قسم کے نظریے میں مذہبی شاعروں کے نظریات کی بہت ساری باتیں مشترک ہوتی ہیں، ملارمے نے جس طرح نظم میں "حسنِ مطلق" کو اسیر کرنے کی کوشش کی اسی طرح ڈانٹے نے ایک غیر مرئی دنیا کا مرئی پیکر تلاش کرنے کی کوشش کی تھی اور اس پیکر کی تخلیق میں جس طرح ڈانٹے کو جنت اور دوزخ کی مسلمہ عیسوی علامات کو استعمال کرنا پڑا اسی طرح ملارمے کو بھی علامات استعمال کرنی پڑیں۔ اس کے پیرووں کو بجا طور پر علامت پسند کہا جاتا ہے کیوں کہ ظاہری اشیا کی زبان میں ایک فوق الفطری تجربے کی ترسیل ہر لفظ کو ایک علامت بنا دیتی ہے اور الفاظ اپنے عام معنوں میں استعمال ہونے کی بجائے ایک ماورائی حقیقت اور اس کے تلازمات کی نشان دہی کے لیے استعمال ہوتے ہیں، ملارمے کا یہ طریقہ نہیں تھا۔ بلیک کی الہامی نظموں اور متصوفانہ ادب میں اس کی مثالیں عام ہیں لیکن یہ فرق ضرور تھا کہ ابتدائی علامت پسند مذہبی عقیدت کے موضوعات کو برتتے تھے اور ان کے برعکس ملارمے کو ایک خاص جمالیاتی تجربے سے دل چسپی تھی۔ اسی تجربے کا اظہار اور اس کی تفسیر وہ بالکل اسی انداز میں کرتا تھا جس انداز میں ایک صوفی دیدارِ حق کی کیفیات بیان کرتا ہے، اس معاملے میں ملارمے کا ایک پیش رو تھا۔

بودیلیئر نے اپنے سانیٹ " Correspon dances " میں فطرت کو کسی اور حقیقت کی علامت کے طور پر پیش کیا تھا۔ بودیلیئر کے لیے یہ کائنات ایسی آیات سے معمور تھی جو قلبِ انسانی کو غم و نشاط کی کیفیات سے پُر کر دیتی ہیں اور رنگ، آواز و بو کے ذریعے انسان کو روحانی ابتہاج و سرمستی کے عالم میں پہنچا دیتی ہیں۔

علامت پسندی کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ نظریہ ایک مثالی حسن رکھنے والی کائنات کے وجود پر اصرار کرتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ اس کائنات کا عرفان فن اور آرٹ کے ذریعے ممکن ہے۔ علامت پسندوں کا دعویٰ تھا کہ مذہبی آدمی عبادات و مراقبے کے ذریعے جس بے خودی اور سرمستی کی کیفیات سے دوچار ہوتے ہیں وہ کیفیات شاعر کو اپنے تخلیقی عمل کے دوران میں میسر آجاتی ہیں۔ ان کا یہ بلند دعویٰ بہت زیادہ غلط بھی نہیں تھا کیوں کہ عبادت میں مکمل یکسوئی اور انہماک سے غرق ہو کر آدمی جس زمان و مکاں سے ماورا سکون و طمانیت سے آشنا ہوتا ہے وہ چیز ایک خالص جمالیاتی تجربے سے حاصل ہونے والی اس بے خودی کی کیفیت سے زیادہ مختلف نہیں ہوتی جس میں غم و نشاط، وقت و مقام اور اپنے پرائے کی ہر تفریق ختم ہو جاتی ہے اور یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ سینٹ جان دی کر اس کی شاعری کیف و وجد کا جو عالم طاری کر دیتی ہے وہ فی الواقعہ مذہبی ہے یا جمالیاتی، کیوں کہ اس میں ملٹن کی استدلالی اور منطقی مذہبیت کا دور تک پتہ نہیں چلتا بلکہ اس شاعری کی کیفیت اس سرور و انبساط سے زیادہ قریب ہے جو شاعروں پر تخلیقی عمل کے دوران طاری ہوتا ہے، بعض صورتوں میں جمالیاتی سرمستی مذہبی خشوع و خضوع کی کیفیت سے مماثل ہو سکتی ہے کیوں کہ جو لوگ اس دنیا کے آگے ایک اور دنیا کے وجود پر یقین رکھتے ہیں ان کے لیے اس دنیا تک پہنچنے کے طریقے ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔

لیکن ایک بنیادی بات ایسی ہے جو فرانسیسی علامت پسندوں کو روایاتی علامت پسندوں سے الگ کرتی ہے۔ کلیسا کے پاس کی اپنی شان دار علامات تھیں جو وقت کے ساتھ مقدس اور قابلِ تعظیم بن گئی تھیں اور صدیوں سے مذہبی آرٹ میں مستعمل ہونے کی وجہ سے عام فہم تھیں۔ عیسویت کی علامات اپنے تلازمات میں بہت زرخیز اور آسانی سے قابلِ شناخت ہیں لیکن جو شاعر اپنی ذاتی اور نجی کیفیات کا اظہار کرنا چاہے اسے اپنی علامات تلاش کرنی پڑتی ہیں اور یہ علامت دوسروں کے لیے آسانی سے قابلِ فہم نہیں ہوتیں۔ بودیلیئر نے اس مسئلے کا یہ حل نکالا تھا کہ کیتھولیسزم کی علامات کو الٹا کر انھیں اپنی محبوبہ اور اپنی ذات کے لیے استعمال کرنے لگا لیکن ملارمے کو نئی علامات دریافت کرنی تھیں اور اس نے اپنے مختلف اور متنوع تاثرات کے دائرے سے یہ علامات منتخب کیں۔ ملارمے کی تصنیفات کے بہ غور مطالعے کے بعد یہ علامات بڑی حد تک سمجھ میں آجاتی ہیں، کچھ علامتیں مبہم رہ جاتی ہیں اور چند ایک ایسی ہیں جو شاعر کے مافی الضمیر کو ظاہر نہیں کر پاتیں۔ اسی وجہ سے ملارمے کی شاعری دنیا کے کسی بھی عظیم شاعر کی شاعری سے کہیں زیادہ

مشکل ہے یہ شاعری اپنے قارئین سے ایسے علم کا مطالبہ کرتی ہے جس کا مکمل حصول تقریباً ناممکن ہے لیکن جہاں علامات سمجھ میں آجاتی ہیں (اور زیادہ تر علامات قابلِ فہم ہیں) وہاں ان کے ذریعے وہ ماورائی اہتزاز و مسرت حاصل ہوتی ہے جس کا احساس ملارمے کو اپنے شعری عمل اور وجدان میں ہوتا تھا اور ان کیفیات کی یہ ترسیل کسی اور ذریعے سے اس سے بہتر طور پر نہیں ہو سکتی تھی۔ کہیں کہیں نظموں کے مجمل نقوش دھندلے بھی ہیں تو مرکزی رنگ اتنے تیز اور واضح ہیں کہ پوری تلافی ہو جاتی ہے اور الفاظ میں عام سطح سے ہٹے ہوئے ایسے تجربات کا بیان ہوا ہے جو کسی اور ہی دنیا کی چیزیں ہیں اور جن کا تعلق عالمِ وجود سے ہے جس کے لیے الفاظ تراشے ہی نہیں گئے۔

علامت پسند ایک خاص شدتِ احساس کی ترسیل کرنا چاہتے تھے اور اس کی لگن میں انھیں شاعری کی کئی مسلمہ خصوصیات سے انحراف کرنا پڑا۔ سب سے بڑی چیز تو یہ تھی کہ انھوں نے تمام سیاسی اور سماجی موضوعات کو اپنے لیے ممنوعہ بنالیا تھا جو کہ اس زمانے میں رومانیوں کو بہت عزیز تھے اور اس میں شک نہیں کہ اگر خلوص اور شدتِ احساس ہوں تو سیاسی شاعری کی بھی ایک اپنی عظمت ہوتی ہے۔ سیاسی شاعری کی کم زوریاں لازماً اس کے موضوع کی عطا کردہ نہیں ہوتیں لیکن مثالی حسن اور خوب صورتی کی دھن میں کھوئے ہوئے علامت پسندوں کے لیے سیاست بے حد نا مطبوع موضوع تھا۔ سیاست کا شور و غل ان کی غور و فکر کی مقدس خاموشی کے لیے بہت گراں تھا۔ سیاسی موضوعات کا بازاری پن ان کے تصور کی یک سوئی اور لطافت کو غارت کر دیتا تھا۔ علامت پسند آرٹ کے سائنٹفک یا حقیقت پسند نظریے سے بھی متنفر تھے کیوں کہ یہ نظریہ تو اس مثالی دنیا کی بنیاد ہی ڈھا دیتا ہے جو ان کے فکر و عمل کا مرکز و محور تھی۔ پارنے سیئن تحریک میں ان کے چند ایک ساتھی دوست ضرور رہے لیکن ورلین اور ملارمے کبھی بھی اس تحریک سے منسلک نہیں رہے۔ ان کے لیے وہ فن بہت زیادہ سائنٹفک تھا۔ ان کا مقصد اس مرئی دنیا کے مناظر کی بازآفرینی تھی اور ملارمے وغیرہ کا مطمحِ نظر کچھ اور تھا۔ گو ملارمے پارنے سیئنس کے رسالے میں چھپتا ضرور تھا لیکن بہت جلد ظاہر ہو گیا کہ اس کی اصلی جگہ وہاں نہیں تھی وہ شاعری آنکھوں کو دعوت دیتی تھی جب کہ ملارمے کی شاعری پنہاں خواہشات، ہیجانات، تنہائی کی لذت اور خاموش ذاتی فکر کو انگیز کرتی تھی۔

علامت پسندوں کی طاقت ان کی ایک آدرش سے لگن میں پوشیدہ تھی۔ اس چیز نے انھیں مذاق اور خلوص کی ان ناکامیوں سے بچالیا جو ٹینی سن اور ہیوگو کے یہاں پڑھنے والوں کو خوف زدہ کر دیتی ہیں۔ ان کی کائنات تنگ سہی لیکن اس کی زرخیزی ناقابلِ تردید ہے کیوں کہ "نادیدہ" کی حدود نہیں مقرر کی جا سکتیں۔ اسی لیے یہ امر تعجب خیز نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی آمد کو ایک انقلاب سمجھ کر اس کا خیر مقدم کیا گیا اور ایسے شاعر بھی ایک عرصے تک ان کے پرچم کے نیچے لڑتے رہے جو نہ علامت پسندوں کے مقاصد سے واقف تھے اور نہ ان کے طریقۂ کار سے۔ یہاں ایسی

شاعری تھی جس میں خلوص بھی تھا اور جو احساسات کو بیدار کرتی تھی۔ یہاں بے جان خطابت اور خشک پند و نصائح نہیں تھے، عوام سے کوئی اپیل نہیں تھی، سوائے "خوب صورتی" کے اور کسی مقصد سے کوئی سروکار نہ تھا۔ علاوہ ازیں علامت پسندوں نے شاعری کو دوبارہ ان خصائص سے مزّین کیا تھا جو مفقود ہو چلی تھیں اور جو لوگ شاعری کا درک رکھتے تھے انھوں نے اس خوش گوار تبدیلی کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے شاعری کو وہ داخلی عنصر بخشا جسے پارنے ٔسیئنس نے گھر نکالا دے دیا تھا، یہ سچ ہے ملارمے نے آرٹ کو غیر شخصی قرار دیا تھا لیکن خود اپنے غیر معمولی تصورات سے وابستہ رہ کر اس نے ظاہر کر دیا کہ شاعری کے لیے "ذات" بھی اتنا ہی زرخیز موضوع بن سکتی ہے جتنا لزلی کے ہاتھی یا ہیریڈیا کے زیرد ریا عجائبات۔ علامت پسندوں نے بتایا کہ شاعری مرصع اور ذاتی دونوں ہو سکتی ہے یہاں مشتعل اور پرجوش نوجوان شاعروں کو اپنے بارے میں لکھنے کا وسیلہ نظر آرہا تھا۔ اس نئے طریقے نے جو احساس کے ہر پہلو کے اظہار کے لیے موزوں تھا، ان نوجوانوں کو خود اظہاری کا راستہ بتایا، یہ بھی کم اہم بات نہیں تھی کہ علامت پسند شاعری میں موسیقیت کے بہت زیادہ قائل تھے۔ ویگنر کی موسیقی ان کے دور کا بہت بڑا انکشاف تھی، ملارمے اور ورلین دونوں ویگنر کے مداح تھے، ویگنر کی موسیقی کا پُروقار آہنگ ان کے کانوں کے لیے ایک نئی چیز تھا۔ اس موسیقی میں انھیں وہی کیفیت نظر آئی جو وہ اپنی شاعری کے ذریعے پیدا کرنا چاہتے تھے۔ موسیقی ان کے لیے بنیادی چیز بن گئی۔ والیری نے کہا کہ علامت پسندوں کا بنیادی کام یہ ہے کہ شاعروں کی گم کردہ موسیقیت دوبارہ موسیقی سے واپس لائی جائے، اس کام میں یقینی دشواریاں اور پے چیدگیاں تھیں لیکن وقتی طور پر بہت خوش گوار امیدیں اور توقعات پیدا ہو گئیں، کم از کم فرانسیسی شاعروں کو تو یہ ایک عظیم الشان مہم معلوم ہو رہی تھی۔ ویگنر نے موسیقی میں نشانات نغمہ میں جو تبدیلی پیدا کی تھی اسی طرح شاعری میں الفاظ کا استعمال نہ صرف ممکن بلکہ ضروری بھی معلوم ہو رہا تھا۔ فرانس کے باہر انگلستان اور جرمنی میں بھی اس رجحان کا خیر مقدم ہو رہا تھا اور اسے گیتوں کی کھوئی ہوئی روایات اور شاعری کی اصل روح کی طرف مراجعت سمجھا گیا۔

اس مسئلے نے ملارمے کو بہت عرصے تک منہمک رکھا۔ شاعری کو کیا ہونا چاہیے کا ایک معیار اپنے سامنے رکھ کر اس نے کافی غور و خوض کیا۔ اس غور و فکر کے بعد اس نے جو نظریہ قائم کیا اس کا اجمال یہ ہے کہ شاعری کا کام معلومات بہم پہنچانا نہیں بلکہ اشارہ کرنا ہے۔ چیزوں کے نام نہیں بلکہ ان کی فضا تخلیق کرنا ہے۔ یہ نئی بات نہیں تھی۔ ملارمے کے ہیرو ایڈ گرایلن نے کہا تھا "مبہم کا ابہام اور غیر قطعیت ایک روحانی تاثر پیش کرتے ہیں" ابہام کے ذریعے شاعری میں اسراری کیفیت پیدا کرنا بہت اعلیٰ مقصد تھا اور کئی ایک شاعر اپنے اپنے انداز میں اس کی کوشش کر چکے تھے۔ اس لیے ملارمے کا مطالبہ کوئی اچھوتی بات نہیں معلوم ہوا لیکن ملارمے نے اس نظریے

کا جان توڑ استقلال سے پیچھا کیا۔ اس کی شاعری Herodiade کی نیم مبہم پُر اسرار شوکت سے ہوتے ہوئے Un Coup de des کے عجیب و غریب آخری حصے تک پہنچتے پہنچتے اپنے ابتدائی دور کا سارا واضح پن کھو کر مکمل ابہام اور پیچیدگی کی نذر ہو گئی۔ Un Coup de des کے آخری حصے میں تو صفحات پر الفاظ کی جسامت اور ترتیب خود الفاظ سے کہیں زیادہ اہم ہو گئی ہے۔ جو پر اسرار کیفیات اسے محسوس ہوتی تھیں ان کو دوسروں تک پہنچانے کی دھن میں اس نے الفاظ کی ساخت اور ترتیب اپنے طور پر کی۔ اوقاف اور اعراب کو کم سے کم کر دیا اور بعض اوقات نحوی قواعد سے بھی روگردانی کی۔ گو ان میلانات نے لوگوں میں غم و غصے کی لہر دوڑا دی تھی لیکن جہاں تک ملارمے کے مرکزی مقصد ابہام و ایمائیت کا تعلق تھا، اس کے مقابلے میں یہ باتیں زیادہ اہم نہیں تھیں۔ ملارمے کے لیے کسی چیز کی فضا تاثر اور اس کی روح خود اس چیز سے کہیں زیادہ اہم تھی۔ وہ تشبیہات اور موازنے کے قدیم وسیلوں کو مسترد کر کے اپنے موضوع کو کسی بھی مماثلت رکھنے والی چیز سے ملا دیتا ہے کیوں کہ اس طرح موضوع اپنے اصلی نام سے کہیں زیادہ بہتر طور پر اپنی معنویت کی ترسیل کر سکتا ہے۔ اس کی ایک مثال دیکھیے۔ ایک سانیٹ میں وہ تاروں بھرے آسمان کا ذکر کرتا ہے۔ عام طور پر لوگوں نے اس منظر سے آدمی کی بے بضاعتی کا احساس قبول کیا ہے لیکن ملارمے کا تصور یہ نہیں ہے۔ اس کے لیے فضائے شب کی وسیع پہنائی بھوتوں کا محل ہے جس کا آبنوس اور جس پر پڑے ہوئے پھولوں کے ہار خالص جھوٹ سے بنے ہیں۔ آسمان کو خدا کا محل بتانے والے سارے خیالات کو ایک تارک الدنیا راہب کے مغرور خواب قرار دینا بہت انفرادیت پرستانہ بات ہے وہ خدا یا آسمان کا نام نہیں لیتا بلکہ اس کی بجائے اس عالی شان محل کو اس کے مرجھائے ہوئے پھولوں سمیت نظروں کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتا ہے، ساری شروعات وضاحتیں اور ان کے موازنے یک سر چھوڑ دیے گئے ہیں، صرف ضروری نکات بیان کر دیے گئے ہیں۔ اس طرح ارتکاز اور تاثیر میں زبردست اضافہ ہو گیا ہے اس میں موسیقی کا براہ راست متاثر کرنے والا جادو شامل ہو گیا ہے۔ ابتدا سے آخر تک نظم شعریت کا ایک مکمل پیکر ہے، ہر قسم کی بے کیف خشکی اور جھول سے مبرا۔ ملارمے کے ہاں بار بار اس کامیابی کا اعادہ ہوا ہے۔ کسی بھی دوسرے فرانسیسی شاعر نے اس کی طرح اتنی خالص اور مکمل شعریت سے بھرپور مصرعے نہیں لکھے۔

ملارمے نے فرانسیسی شاعری میں گہرائی اور لطافت کو جس طرح سمیٹ لیا ہے اس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔ ویگنر کی مثال سے کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہوا۔ ابہام کا طریقہ اپنے ساتھ ایک خاص فائدہ لایا۔ انسانی شعور میں بہت ساری چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کے لیے سیدھا سادہ بیانیہ اظہار نامکمل نہیں بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔ ہم سب ان موہوم گریزاں ذہنی کیفیات سے آگاہ ہیں جن کا کوئی واضح خاکہ یا نقش نہیں ہوتا اور جو بہت کم معرضِ اظہار میں آسکتی ہیں لیکن ملارمے

کے طریقہ۔ کار میں ایسی کیفیات شاعری میں بیان کر دی جا سکتی ہیں۔ مثلاً ایک نظم میں وہ ایک عاشقانہ مہم کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کامرانی کے احساس پر نظم کا اختتام ہوتا ہے۔ اس نظم کو قطعی مفہوم دینے کی کئی کوششیں کی گئیں۔ بعض نے کہا کہ شاعر گاڑی میں گھومنے کے لیے نکلا ہے اور ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں گاڑی کے پہیے سرخ نظر آرہے ہیں۔ کچھ نے کہا شاعر آتش بازی کی نمائش والے چکر کی ایک قسم کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ دراصل یہ سب ایک ایسی جگہ قطعیت ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے جہاں قطعیت سرے سے ہے ہی نہیں۔ شام کے جھٹپٹے میں ایک کامران رتھ کی تصویر کامیابی کے سرور و انبساط کی ذہنی کیفیت کی ترجمانی کرتی ہے اور بس۔ اس نظم کا مدعا بھی یہی ہے اور اس نظم نے اسے بے حد کامیابی کے ساتھ پورا بھی کیا ہے۔

لیکن ملارمے صرف اشارہ کرنے پر قانع نہیں تھا، موسیقی کو اس نے صرف ایک نمونے کے طور پر نہیں لیا تھا۔ کسی طرح اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ شاعری ایک قسم کی موسیقی ہے۔ اس کے معنیٰ اس کے نزدیک یہ نہیں تھے کہ شاعری اور موسیقی سے حاصل ہونے والا حظ اپنی کیفیت اور کمیت میں ایک دوسرے سے مماثل ہے۔ حالاں کہ اس کے نظریے سے یہ مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے پاس ایک متصوفانہ اعتقاد تھا جو سب سے بڑی چیز تھی۔ اسے جمالیاتی مسرت کی ایک ایسی وحدت کا علم تھا جو فکر کی رسائی سے پرے اور با معنیٰ الفاظ سے ماورا تھی۔ اس کا آدرش L'absence تھا ایک کاملیت جو کبھی وجود پذیر نہیں ہوتی، ایک سناٹا جو نغمے سے زیادہ مترنم اور شیریں تھا۔ وہ کاملیت کے اس سراب اور اس سناٹے کے گیت کو اسیر کرنا چاہتا تھا۔ اس کی ایک نظم Sainte میں ایک ولیہ رنگین شیشے کے دریچے میں بیٹھی ہوئی ایک فرشتے کا پر چھو لیتی ہے اور یہ پر ایسی شکل اختیار کر لیتا ہے جیسے وہ کوئی ساز ہو اور ولیہ اپنا بربط پھینک کر "خاموشی کی مغنیہ" Musicienne de Silence بن جاتی ہے۔ ملارمے نے ایک آسمانی موسیقی کے خواب دیکھے، ایک ایسا نغمہ جو "حسنِ مطلق" کی شکل میں روحانی کانوں کو سنائی دیتا ہو۔ اس کے لیے نظم کے معنے تھے۔ Le Silot Scintillations De "Septuoa" کہکشانی آوازوں کا سرگم " ان سنا نغمہ، خاموش لفظ، یہ ملارمے کے اس وجد و انبساط کی علامات تھیں جو اسے اس قدر عزیز تھیں اور جن کی عظمت سے وہ دوسروں کو بھی آشنا کرانا چاہتا تھا۔ ملارمے کو یقین تھا کہ وہ جو بھی شاعری کرے گا اس میں ایک ایسی ماورائے سخن مطلق و مکمل شعریت ہوگی جو اس کی لکھی ہوئی شاعری سے بلند و برتر ہوگی۔ اس نے سخن سنجی اور کمالِ سخن پر ہمیشہ ماورائے سخن والی بات کو فضیلت اور ترجیح دی۔

اکثر لوگ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ جمالیاتی مسرت میں بعض اوقات ایک ایسا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے جس کا اس جمالیاتی مسرت دینے والے فن پارے سے کوئی قابلِ فہم تعلق نظر نہیں آتا، ایک ایسی خالص سرخوشی جو الفاظ کے معانی سے آزاد ہوتی ہے اور اپنی اسی نوعیت کی

وجہ سے اس کیفیت سے قریب ہوتی ہے جو موسیقی سے حاصل ہوتی ہے ۔ ملارمے کو اس کا علم تھا اور اس نے اس چیز کو اپنے عقائد کا مرکز و منتہا قرار دے لیا تھا ۔ اسے امید تھی کہ وہ شاعری کو اس طرح منزہ کرے گا کہ اس سے خالص نشاط و مسرت حاصل ہو سکے ' ایک ایسی مطلق اور مکمل مسرت جو الفاظ پر فطرت کی طرف سے عائد کردہ تمام قیود اور حد بندیوں سے آزاد اور ماورا ہو اور ایک دوسری برتر و اعلیٰ دنیا کی چیز معلوم ہو ۔

تو یہ ظاہر ہوا کہ علامت پسندی اپنی اصل میں متصوفانہ قسم کی شاعری تھی جس کی تکنیک کا انحصار اس کی مابعد الطبعیات پر تھا اور اس کی ابتدائی مقبولیت کی وجہ یہ تھی کہ اس نے شاعر کی ذات کو اہمیت دی اور شاعری میں موسیقی کے عناصر پر اصرار کیا ۔ اس کا دائرۂ اثر کئی ملکوں تک پھیل گیا اور کئی لوگ اس تحریک کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہو گئے لیکن علامت پسندی کے متعلق ان زریں توقعات کے پیچھے کئی خامیاں اور کمزوریاں بھی تھیں ۔ گو یہ خامیاں بنیادی یا مہلک نہیں تھیں لیکن آگے چل کر ان کے مہلک نتائج ضرور نکل سکتے تھے ۔ علامت پسندوں سے عامیانہ جذبات سے اپنا رشتہ توڑنے اور شخصی اور نجی تصورات سے سمبندھ جوڑنے کا جو معمولی قدم اٹھایا تھا اس کے نتیجے میں وہ زندگی کے ایک بہت بڑے حصے سے الگ ہو گئے اور ان کا کام تربیت یافتہ ذوق رکھنے والے چند ایک مخصوص افراد تک محدود ہو گیا ۔ سیاسی طور پر اس کی وضاحت یوں ہو سکتی ہے کہ جمہوری خیالات کے بڑھتے ہوئے دھارے کے خلاف یہ تحریک امارت کا ردِ عمل تھی ۔

اور یہ وضاحت حقیقت سے زیادہ دور بھی نہیں ہے ۔ ولیر کی قسم کے لوگوں کی اپنی عالی نسبی کے متعلق بے جا ڈینگیں اور پیرو یکز کا حلقہ بوریا کے لڈوگ دوم کے حلقے سے الگ نہیں تھا ۔ علامت پسندوں کی عوام سے نفرت فلابیر سے کم نہیں تھی ۔

ملارمے سمجھتا تھا کہ ملن پوُہانڈرا کے ہاتھوں مرا ۔ اس کا جھد اپنے جمہوری مزاج کی وجہ سے اسے اپنا دشمن معلوم ہوتا تھا لیکن زندگی سے یہ دوری معزول اور معتوب علاحدگی پسندی سے کہیں زیادہ تارک الدنیا جوگیوں کی خلوت گزینی سے قریب تھی ۔ یہ تنہائی پسندی ان تقاضوں کا نتیجہ تھی جو جمالیاتی احساس اپنے متاثرین سے کرتا ہے ۔ ایک سچا جمالیات پرست جو اپنے ارتسامات کو بڑھانا اور احساس کے موہوم اور تیز یا خفیف ترین ارتعاشات کو گرفت میں لانا چاہتا ہو وہ زندگی کے غیر شاعرانہ تقاضوں اور جدوجہد سے کٹ جاتا ہے ۔ اپنے مقاصد سے اس کی یہ سچی اور مخلصانہ لگن ایسی تنہائی اور یکسوئی کا مطالبہ کرتی ہے جو بیشتر لوگوں کے لیے ناممکن ہے ۔ جمالیات پرستوں کی اس خلوت گیری کو علامت پسندوں نے اپنا بُت بنا لیا اور اس کی مکمل تعبیر انھیں Huysman کے ناول A Rebours کے ہیرو میں مل گئی جو دنیا سے بھاگ کر اپنے آپ کو کسی ایک ایسے گوشۂ عافیت میں چھپا دینا چاہتا تھا جہاں غیر تغیر پذیر زندگی کی کرخت

آوازیں اس کے کانوں تک نہ پہنچ سکیں ۔ ایسے نظریے کی انتہا کیا ہو سکتی ہے اس کا اندازہ ولیر کے Axel سے ہو سکتا ہے جس میں اصل زندگی کچھ بھی نہیں اور تخیلی تجربہ ہی سب کچھ ہے "زندگی گزارنا؟" Axel چیخ کر کہتا ہے "یہ تو ہمارے خدمت گار ہمارے لیے کر لیں گے" اس ذہنیت کی انگریز جمالیات پرستوں کے ہاں بھی کمی نہیں ہے ۔ پیٹر کو ایسے تخیلی ہیروؤں کے بارے میں خیال آرائی کرنا پسند تھا جو زندگی کی کسی ذمہ داری کو قبول کرنے تیار نہ تھے اور اس خیال آرائی سے اس نے سباسٹین وان اسٹارک کی تصویر پیدا کی جس کی نازک مزاجی کو کوئی قیود اور حدود قبول نہیں تھے ۔ اس نازک مزاجی اور نفاست پسندی نے شاعری اور زندگی کے درمیان ایک خط فاصل قائم کر دیا۔

ایک تو نئے شاعروں کو عوام سے نفرت تھی، اس کے ساتھ جب عوام نے ان کی شاعری کو بھی اپنی سمجھ سے بالا پایا تو ان کی توجہات نچلے درجے کے ادیبوں کی طرف مبذول ہو گئیں اور لکھنے والے عوام سے کٹ کر اور زیادہ اپنے آپ میں محصور ہونے لگے اور اس طرح اس قوت اور توانائی سے محروم ہو گئے جو گلیوں اور بازاروں سے ملتی ہے۔ انھوں نے ایک ملک یا نسل کی بات نہیں کی بلکہ خود اپنے بارے میں لکھتے رہے۔ جہاں ان پیغمبروں نے وائلڈ اور پیٹر کی طرح اپنی تعلیمات کو عوام میں مقبول بنانے کی سعی کی وہاں انھیں اس کی بڑی مہنگی قیمت دینی پڑی ۔ پیٹر کو اس کے بیش تر معاصرین زندگی بھر شک و شبہہ کی نظروں سے دیکھتے رہے ۔ وائلڈ نے عوامی داد حاصل کرنے کی خواہش میں اپنے فن کے بڑے حصے کو خراب کر لیا۔ فرانس میں علامت پسندوں کو مقبولیت کی تلاش نہیں تھی۔ انھیں بورژوازی کی تضحیک اور تحقیر مقصود تھی۔ انھیں اپنے دور سے زیادہ آنے والی نسلوں سے توقعات تھیں کہ وہ انھیں ان کا صحیح مقام دیں گی ۔ لیکن چوں کہ انھوں نے اپنے عہد سے منھ موڑ لیا تھا اس لیے آنے والی نسلوں پر بھی ان کا کوئی حق نہیں رہا۔ ان کے ہاں اکثر اس قوت اور توانائی کا فقدان ہے جو زندگی کے تعلق سے پیدا ہوتی ہے اور اپنی پائیدار انسانی خصائص کی وجہ سے صدیوں زندہ رہ جاتی ہے ۔ ایک شاعر کے لیے ایک محدود حلقے میں خواہ وہ کتنا ہی دل کش کیوں نہ ہو زندگی گزار دینا آسان نہیں ہوتا۔ ایک طرف اس کے فیضان کا سرچشمہ خشک ہونے کا اندیشہ رہتا ہے، دوسری طرف اپنے کلام کی ناقدردانی کا احساس اسے ناکامی اور مایوسی کا شکار بنا سکتا ہے۔ اپنے فن کے بارے میں ضرورت سے زیادہ غور فکر کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے فن کو عملی طور پر برتنے کے قابل نہ رہے بلکہ ملارمے کے ساتھ یہی المیہ ہوا۔

جس "خالص تخلیق" کا خواب اس نے بیس سال تک دیکھا وہ پورا نہ ہو سکا اور اس کی اس قابلِ افسوس ناکامی کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس نے اپنی تخلیق اور نظریۂ تخلیق کے بارے میں سوچتے ہوئے اتنے برس نکال دیے کہ اس عرصے میں اس کی قوت کے سرچشمے خشک ہو گئے۔

Remy de Goumont کا خیال شاید سچائی پر مبنی تھا کہ ملارمے نے اپنے ہاتھوں اپنی جان لی۔ ملارمے نے شاعری کے اصول اور نظریے پر اتنا غور و فکر کیا کہ اس کے لیے کسی اور بات پر سوچنا ممکن نہیں رہا۔ جس وقت اسے کسی ایک نظم کی تفصیلات تیار کرنے میں مصروف ہونا چاہیے تھا اس وقت وہ صرف یہی سوچ سکتا تھا کہ ایک مثالی نظم کیسی ہونی چاہیے۔

ملارمے کے نظریے کی ایک دوسری مشکل یہ تھی کہ اس نے موسیقی کو بے انتہا اہمیت دے رکھی تھی۔ ویگنر کی کامیابی کا تصور اس پر مستوی ہو گیا تھا اور اس نے مختلف طریقوں سے یہ کامیابی نظم میں لانے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں ملارمے اکیلا نہیں، پیٹر نے جب یہ کہا کہ "ہر آرٹ کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ موسیقی کے درجے کو پہنچ جائے تو دراصل سیدھی سادی انگریزی میں وہی بات دہرا رہا تھا جو ملارمے کئی بار کہہ چکا تھا لیکن دونوں کے بیانات کو بہت زیادہ لفظی معنوں میں نہیں لینا چاہیے۔ پیٹر اور ملارمے دونوں محسوس کرتے تھے کہ شاعری میں الفاظ کے معانی ایک ناقابل حل مشکل پیش کرتے ہیں کیوں کہ معانی کی وجہ سے الفاظ شاعری میں موسیقی کی طرح خالص جمالیاتی تاثر نہیں پیدا کر سکتے۔ لیکن ملارمے موسیقی کی مثال سے یقیناً مغالطے کا شکار ہو گیا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگا تھا وہ شاعری میں ایک ایسا خالصتاً جمالیاتی اثر پیدا کر لے گا کہ تفہیم کا سوال ہی ملتوی ہو جائے گا کیوں کہ تلازمات اور صوتی اثرات سارا کام کر لیں گے اور الفاظ کے مفہوم سے کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن الفاظ کا تعلق خیالات سے ہے اور شاعری الفاظ سے بنتی ہے۔ اس میں خالص تصور کی لامحدود وسعت کبھی نہیں آسکتی۔ ملارمے ایک ایسے مطلق حسن کے افسوں میں گرفتار تھا جو اس کے لیے سب کچھ تھا۔ اس حسن کو اس نے کئی علامتوں میں متشکل کیا۔ نیلا آسمان، سحر، برفیلی چٹانیں اور یہ ساری علامتیں بتاتی ہیں کہ یہ حسن غیر شخصی، جامد اور بعید شے ہے۔ ان صفات کی ترسیل کی اس نے جان توڑ کوشش کی لیکن وہ جس کیفیت کی ترسیل کرنا چاہتا تھا وہ ایسی چیز نہیں ہے کہ جس پر ایک پوری نظم لکھی جا سکے۔ الفاظ کو ان کے مفاہیم محدود بنا دیتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ مترنم اور تلازمہ خیز شاعری بھی موسیقی کے مدارج کو نہیں پہنچ سکتی۔ ملارمے کے نظریے کا جواز پیش کرنے کی کوششیں کی گئیں لیکن حقائق ملارمے کے خلاف ہیں۔

اپنے فن کے بارے میں اس کا اپنا اعتراف اپنی عظیم نظم لکھنے میں ناکامی، اس کی طرف سے صفائی پیش کرنے والوں کا یہ ثابت نہ کر سکنا کہ شاعری ایسے تاثرات پیدا کر سکتی ہے جن کا موسیقی کے تاثرات سے موازنہ کیا جا سکے اور یہ ناقابل تردید سچائی کہ الفاظ معانی سے جدا نہیں کیے جا سکتے۔ ان تمام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ملارمے کا نظریہ ناقص تھا۔ عام زندگی سے قطع تعلق اور موسیقی کو شاعری کا مقصود و منتہا قرار دے لینا ملارمے کی شعری زندگی کی سب سے اہم اور نمایاں کمزوریاں تھیں اور شاید یہی کمزوریاں تھیں جن کی وجہ سے اس کی موت کے بعد فرانس میں

علامت پسند ناکام ہوگئے اور پال والیری نے جو صحیح معنوں میں ملارمے کا جانشین تھا۔ ان دونوں مشکلات کا سامنا کیا اور ان کے مفہوم کو سمجھا لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان دونوں غلط میلانات کا ایک اثباتی پہلو بھی تھا۔ ایک میلان نے شاعری کو زندہ اور توانا احساس کا عطیہ بخشا تو دوسرے نے شاعری میں صوفی اثرات کی اہمیت کی طرف توجہ مبذول کرائی اور جدید دنیا کو علامت پسندوں کی شاید یہ سب سے پائیدار دین تھی۔ دونوں کی مشکلات بہت زیادہ ہیں اور علامت پسندوں کے وارثوں نے اسی طرف اپنی زیادہ تر توجہات صرف کیں۔ در حقیقت وہ شاعر جو ۱۸۹۰ء کے بعد اس روایت کے زیر اثر لکھ رہے تھے انھیں مجبوراً اپنے مرصع اسالیب کو ترک کرکے گوشۂ عافیت کے ہاتھی دانت مناروں سے اتر کر عوامی زندگی سے رشتہ جوڑنا پڑا۔ ان لوگوں نے حسنِ مطلق کے دائرے میں زیادہ لچک اور وسعت پیدا کی اور اس کے دوران میں وہ اپنے طریقۂ کار اور نظم کے متعلق اپنے خیالات کو بدلنے پر مجبور ہوگئے۔ ان ہی تبدیلیوں اور اخذ و قبول کی وجہ سے ان لوگوں کی شاعری خاص طور پر توجہ طلب ہے کیوں کہ شاعری کی زندگی تغیر اور تبدیلی میں ہے۔ ایک بار ایک اسلوب مکمل ہوجائے تو اسے ترک کردینا چاہیے۔ کوئی اور چیز ایک عظیم اسلوب سے اتنا دور نہیں ہوتی جتنا اس اسلوب کا چربہ اصل سے دور ہوتا ہے۔ علامت پسندوں کے ورثا نے اس یقین کے ساتھ ابتدا کی تھی کہ ملارمے کے نظریات صحیح تھے لیکن ان سب نے کسی نہ کسی شکل میں ان نظریات کو ترک کردیا۔ اس سے ملارمے پر کوئی حرف نہیں آتا۔ کیوں کہ اپنے آرٹ کے بارے کسی شاعر کے نظریات کو ان کی عالم گیر سچائی کے معیار سے نہیں جانچنا چاہیے بلکہ دیکھنے کی چیز تو یہ ہے کہ ان نظریات نے شاعری کی تخلیق کو کیا طاقت اور توانائی بخشی۔ آج اگر ورڈز ورتھ، ہوریس اور دو بیلے کی طرح ملارمے کے نظریات بھی مسترد ہو چکے ہیں تو اس سے ملارمے موردِ الزام نہیں ٹھہرتا بلکہ وہ تحسین و توصیف کا مستحق ہے کیوں کہ اس کے نظریات نے تخیلات اور اذہان کو روشنی اور کام کرنے کی تحریک بخشی اور آنے والوں کے لیے اپنی اپنی مخصوص طبائع کے مطابق نشو و نما پانے کے راستے میں رکاوٹیں نہیں پیدا کیں۔

○ ○ ○

دعا

جلالِ شامِ ابد، اے جمالِ صبحِ ظہور
ترے ہی پرتوِ روشن سے مہر و ماہ میں نور
تجھی کو ڈھونڈنے نکلا تھا شوقِ آوارہ
تجھی پہ ختم ہوئی آرزوئے نظارہ
ترے ہی جلووں سے روشن چراغِ خانہ ہے
حریمِ دل کو ترا آئینہ بنایا ہے
میں پیچ و تابِ خرد سے نکل چکا، پھر بھی
جنوں کے ہاتھ سے دل کی گرہ نہیں کھلتی
گہر کی آب ہوں لیکن صدف نہیں ملتا
خدنگِ جستہ ہوں، میرا ہدف نہیں ملتا
تری عطا ہے مگر دردِ نارسا ہے بہت
رگِ گلو سے گلے تک کا فاصلہ ہے بہت
مری نوا کو شرف دے فلک مقامی کا
مری دُعا کو ملے اذن ہم کلامی کا

یا خُدا

سارے افکار و عقائد کے طلسم،
سارے اصنامِ خیال،
ہم نے وہ بت شکنی کی ہے کہ مسمار ہیں سب
اپنے گھربار کی محفوظ فصیلیں ہم نے
یوں گرائی ہیں کہ اب
دُور و نزدیک کی ہر تُند ہوا
سب چراغوں کو بس اک پھونک میں گُل کر جائے

ہم کہ ہر سلسلہ و قید کی زنجیر سے آزاد ہوئے
ایسے محبس کے مکیں ہیں کہ جہاں
کوئی دروازہ کوئی روزنِ دیوار نہیں
یا خدا
کوئی غم ایسا کہ ہر غم کو سبک سار کرے
کوئی آگ ایسی کہ ہر آگ کو خاشاک کرے
کوئی مفہوم کوئی نقشِ تمنا کہ جسے
اپنے دل و جاں کا لہو نذر کروں
سُرخ رو ہو کے کہوں
زیست کی یہ مہلت دو ایک نفس
اتنی بے رنگ نہ تھی
اتنی فرومایہ نہ تھی

اے جوئے آب ....

تمام عمر کے سود و زیاں کا بار لیے
ہر انقلاب زمانہ سے مُنھ چھپائے ہوئے،
حیات و موت کی سرحد پہ نیم خوابیدہ
میں منتظر تھا
مسرّت کی کوئی دُھندلی کرن،
زماں مکاں سے پرے اجنبی جزیروں سے
دمِ سحر مجھے خوابوں میں ڈھونڈتی آئے
فشارِ وقت کی سرحد سے دُور لے جائے
کُھلی جو آنکھ
طلوعِ سحر نے ہنس کے کہا
حصارِ وقت سے آگے کوئی مقام نہیں
سمجھ سکو تو زمان و مکاں کی قید نہیں
سمجھ سکو
تو یہی ذات بیکراں بھی ہے

ایک نظم

شعلہ رو امواج کی آغوش میں
ڈوبتے سورج کا چہرہ کھو گیا
دیر تک سرخ و سیہ شعلے
افق کی دوریوں میں جھانکتے چھپتے ہوئے
رات کے بڑھتے اندھیرے کی سکوں پرور رداہیں منھ چھپا کر سو گئے

رات کے جنگل میں جلتی مشعلیں تھامے ہوئے
راہ رو چلنے لگے
اجنبی یادوں کی خوشبو میں بسے
ٹھنڈی ہوا کے نرم رو جھونکے چلے
زرد رو مہتاب اڑتے بادلوں سے جھانکتا چھپتا ہوا
صف بہ صف بڑھتی ہوئی موجوں کے آئینے میں
صد پارہ ہوا

یہ مناظر
میری عمرِ یک نفس سے بے نیاز
وقت کی وسعت میں سرگرمِ سفر
اور میں اس ریت کی آغوش میں کھویا ہوا
سوچتا ہوں
کون سے سورج کا عکس
کون سے مہتاب کا پرتو
مرے شام و سحر میں زندہ ہے
میری مشتِ خاک میں تابندہ ہے

ایک نظم

تری آرزوؤں کو گزرے ہوئے جن دنوں کا الم ہے
تری آرزوؤں کو جن آنے والے دنوں کی تمنّا ہے
وہ دن یہیں ہیں
ہر اک فاصلہ، روز و شب، قرب و دوری کا ہر رنگ
یہ دوش و فردا کے سب مرحلے،
ایک قیدِ زمان و مکاں کے صلے ہیں
بہار و خزاں، وصل و ہجراں
ہمارے ہی اشک و تبسم کے جوڑے ہوئے سلسلے ہیں
شب و روز، دو برق پا ساعتیں ہیں
جو اک دوسرے کے تعاقب میں گرداں چلی ہیں
یہ گردش شب و روز کی،
میرے، تیرے دکھوں کا مداوا نہیں ہے
کہ اس گردشِ روز و شب میں
کوئی دوش و فردا نہیں ہے
بس اک حسنِ مطلق
فضاؤں، خلاؤں میں پھیلی ہوئی روشنی ہے
جو تیری مژہ پر
مرے رنگ و آواز کے درد میں جاگتی ہے
یہی روشنی زندگی ہے
یہی لمحۂ کُل ہے
خدا ہے

۵۵

دوزخ

موجِ صہبا میں تمنا کے سفینے کھو کر
نغمہ و رقص کی محفل سے جو گھبرا کے اُٹھا
ایک ہنستی ہوئی گڑیا نے اشارے سے کہا
"تم جو چاہو تو میں شب بھر کی رفاقت بخشوں"

جنبشِ ابرو نے الفاظ کی زحمت بھی نہ دی
نیم وا آنکھوں میں اک دعوتِ خاموش لیے
یوں سمٹ کر مری آغوش میں آئی جیسے
بھری دنیا میں بس اک گوشۂ راحت تھا یہی

نیم ویران گزرگاہوں پہ چلتے چلتے
گھر تک آئے تو کوئی رنگِ تکلف ہی نہ تھا

دو بدن ملتے ہی یوں ہمدمِ دیرینہ بنے
تندیِ شوق میں دوری کا ہر احساس مٹا

صبح کے ساتھ کھلی آنکھ تو احساس ہوا
میرے سینے میں کوئی چیز تھی جو ٹوٹ گئی
دیر سے دیکھ رہی تھی تری تصویر مجھے
تیرے عارض پہ تھی بہتے ہوئے اشکوں کی نمی
تیری خاموش نگاہوں میں کوئی شکوہ نہ تھا

دیکھتے دیکھتے ویرانیِ دل اور بڑھی
تیری تصویر کو سینے سے لگا کر پوچھا
کس طرب زار میں آسودہ ہے اے راحتِ زیست
مجھے ان آگ کے شعلوں میں کہاں چھوڑ گئی

ایک تصویر

چاندنی سطحِ سمندر پہ رواں
ریگ پہ آسودہ ہے
ساحلِ بحر کے سناٹے میں،
دُور افتادہ جزیروں میں اسیر،
بین کرتی ہوئی موجوں کی صدا آتی ہے
ایک جانی ہوئی بھولی ہوئی کھوئی ہوئی آواز کی لہر
ساحلِ بحر سے ٹکراتی ہے
ایک دیکھے ہوئے بھولے ہوئے کھوئے ہوئے چہرے کی شبیہ
سینۂ بحر پہ سوئے ہوئے مہتاب میں ڈھل جاتی ہے
سیم گوں لہروں پہ ہنستے ہوئے مہتاب کا زرّیں پیکر،
چند بپھری ہوئی موجوں میں بکھر جاتا ہے
کس کا چہرہ؟
کس کی آواز ہے؟
سب دل کو خبر ہے —— لیکن

تم بھی دیکھو تو نہ پہچان سکو گی اس کو
اب یہ تصویر مرے خون سے آلودہ ہے
چاندنی سطحِ سمندر پہ رواں
ریگ پہ آسودہ ہے

نیا سسی فس

دھند میں لپٹی ہوئی شام بڑی ظالم ہے
تتلیاں، خواب، انوکھے بادل
کوہساروں سے اترتے ہیں، قریب آتے ہیں
کھو جاتے ہیں
موت اور زیست کا دکھ دیکھنے والی آنکھیں
اپنی قبروں میں بڑے چین سے سو جاتی ہیں

ایک یخ بستہ خموشی ہے جہاں تک جاؤ
دور تک اپنے ہی قدموں کی صدا آتی ہے
دور تک سلسلہ در سلسلہ زنجیریں ہیں
دل کی تنہائی کہاں جاتی ہے

دھند میں لپٹی ہوئی شام بڑی ظالم ہے

دور وادی سے ابھرتا ہوا کہرے کا دھواں
منجمد خواب کی تصویر میں ڈھل جاتا ہے
آنکھ سے خاک پہ گر جاتا ہے اک قطرۂ اشک
وقت لمحوں کے تسلسل میں بکھر جاتا ہے

دل کی تنہائی سے نکلو تو کہاں جاؤ گے
ہر طرف ایک گرجتا ہوا سناٹا ہے
(کرب کی رات سے ڈر آتا ہے)

کرب کی رات اٹل ہے
تب تک
ناشتہ، دفتری اوقات، تھیٹر، گھر بار
کی ترتیب کے زنداں میں رہو
دن کے ہنگامے سے نکلو
تو کسی بار کا گوشہ ڈھونڈو
نیند سے چونک کے اٹھو تو اندھیرے سے ڈرو
کرب کی رات اٹل ہے
تب تک
دائرہ وار سفر کرتے رہو
دھند میں لپٹی ہوئی شام بڑی ظالم ہے
آنکھ اٹھاؤ تو نظر کے آگے

برف کی آگ میں جلتے ہیں کئی آئینے
دور تک سلسلہ در سلسلہ زنجیریں ہیں
قطرۂ اشک میں سو رنگ کی تصویریں ہیں
کون سا عیشِ فراواں ڈھونڈوں
کون سی سلطنتِ غم مانگوں
کون سے سُکھ کی تمنا کروں کس دکھ کا مداوا چاہوں

کرب کی رات اٹل ہے
لیکن
نیند آجائے تو دم بھر سو لوں

شب چراغ

بسوں کا شور، دُھواں، گرد، دھوپ کی شدت
بلند و بالا عمارات، سرنگوں انسان
تلاشِ رزق میں نِکلا ہوا یہ جمِّ غفیر
لپکتی بھاگتی مخلوق کا یہ سیلِ رواں
ہر اک کے سینے میں یادوں کی منہدم قبریں
ہر ایک اپنی ہی آوازِ پا سے رُو گرداں
یہ وہ ہجوم ہے جس میں کوئی کسی کا نہیں
یہ وہ ہجوم ہے جس کا خدا فلک پہ نہیں
اور اس ہجومِ سرِراہ سے گزرتے ہوئے
نہ جانے کیسے تمھاری وفا، کرم کا خیال
مری جبیں کو کسی دستِ آشنا کی طرح
جو چھو گیا ہے تو اشکوں کے سوتے پھوٹ پڑے
سموم رنگ کے صحرا میں اک نفس کے لیے
چلی ہے بادِ تمنّا تو عمر بھر کی تھکن
سرِمژہ سمٹ آئی ہے ایک آنسو میں
یہ وہ گہر ہے جو ٹوٹے تو خاکِ پا میں ملے
یہ وہ گہر ہے جو چمکے تو شب چراغ بنے

نوحہ

سیہ رات میں ٹمٹماتے ستاروں کے نیچے
خروشاں سمندر کی موجیں تجھے ڈھونڈتی ہیں
خروشاں ہوا کی صداؤں میں تیری صدا ہے
مرا دل تجھے ڈھونڈتا ہے
سیہ رات اشکوں کی شبنم میں سوئی ہوئی ہے
ہر اک پل، ہر اک لمحہ ماضی کا زندہ ہے
موجود میں جاگتا ہے
مگر تیرا پیکر
تہِ خاک اندھیروں کے دامن میں سویا ہوا ہے
مرا دل کہ ماتم گرِ رفتگاں ہے
تجھے ڈھونڈتا ہے
میں آسودۂ ریگ، خاموش، اس رات کی جلتی آنکھوں کو دیکھوں
سیہ رات میں ٹمٹماتے ہوئے ان ستاروں سے پوچھوں،
خروشاں سمندر میں ڈوبا ہوا چاند،
کسی اجنبی سرزمیں پر تبسم کناں ہے

نقوشِ کفِ پا کی منزل کہاں ہے
یمِ زندگی سیل در سیل بہتا ہوا
ایک لمحے کو رُک کر پلٹ کر نہ دیکھے
افق تا افق ٹمٹماتے ستاروں کے نیچے،
فقط اک شبِ بے صدا جاگتی ہے،
شبِ بے صدا پوچھتی ہے
بکھرتی ہوئی موجِ دریا کدھر سے چلی تھی؛
کدھر کو چلی ہے؟
ترا دل کہ ماتم گرِ رفتگاں ہے
کسے ڈھونڈتا ہے ——؟

○○

مرنے والے کے کمرے میں

(مرحوم سلیمان اریب کے نام)

یوں رگ و پے میں اجل اتری ہے
ہاتھ ساکت ہیں دعا کیا مانگیں
آنکھ خاموش ہے کیا دیکھے گی
ہونٹ خوابیدہ ہیں کیا بولیں گے

ایک سناٹا ابد تا بہ ابد
جہدِ یک عمر کا حاصل ٹھہرے
درد کا شعلہ، رگِ جاں کا لہو
جنسِ بے مایہ سے بے مایہ رہے

تیرہ خاک ان کی خریدار بنے
نکہتِ گُل کی طرح آوارہ
بوئے جاں وسعتِ آفاق میں گم
یک کفِ خاک ہے۔ وہ بھی کب تک؟
صبح کی اوس سے آنکھیں دھولو
کمرے سے جھانک کے باہر دیکھو
ایسے مصروفِ تگ و تاز ہیں سب
جیسے کل ان کے مقدر میں نہیں

میں تماشائی ہوں ہر منظر کا
جیسے کل میرے مقدر میں نہیں

.... اندیشہ گماں ہا داشت

چار سو بادِ خزاں چلتی ہے، خاموشی ہے، ویرانی ہے
دل وہ صحرا ہے جہاں بادِ بہار آتی نہیں
آنکھ اس درجہ تہی ہے کہ کوئی اشک گہر تاب نہیں

دن گزرتے ہیں، مہہ و سال میں ڈھل جاتے ہیں
کوئی احساس نہیں ہوتا کہ ہم زندہ ہیں
کوئی جینے کی لگن ہے
نہ یہ حسرت کہ کسی خواب کو سینے سے لگائے
مر جائیں۔
اس سے پہلے بھی کئی بار،
یہ بے کیفیِ ایّام کی رَو دیکھی ہے،
مگر اب کے نہ بچیں گے،
یہ گماں ہے دل کو

آخری منزل

تعلقاتِ جہاں کی ستم گری سے الگ
غم و نشاطِ تمنّا کی دست رس سے دور
تمام عمر کی جہدِ حیات سے تھک کر
ہزاروں حسرتیں مشتِ غبار میں ڈھل کر
کچھ ایسی سوئی ہیں خاموشیوں کے مرقد میں
کہ تا ابد کوئی آوازِ پا جگا نہ سکے

چشمِ مشتاق نے یہ خواب عجب دیکھے ہیں
دل کے آئینے میں سو عکس ہیں سب تیرے ہیں

زندگی سے بھی خفا ہیں، تجھے اپنا بھی کہیں
اس کشاکش میں شب و روز گزر جاتے ہیں

خانۂ دل میں تھا کیا کیا نہ امیدوں کا ہجوم
خانہ ویراں ہے تو راضی بہ رضا بیٹھے ہیں

دولتِ غم بھی خس و خاکِ زمانہ میں گئی
تم گئے ہو تو مہ و سال کہاں ٹھہرے ہیں

ابھی کچھ دیر نہ ڈوب اے مہِ تابانِ فراق
ابھی کچھ خواب بھی جی بھر کے کہاں دیکھے ہیں

O

یہ شہر شہر کی آبادیاں فنا کی طرف
یہ جیتی جاگتی آنکھوں میں وحشتِ صحرا
محبتوں کے بسیرے تہیں مکانوں میں
ہمکتے بچوں پہ آسیبِ وقت کا سایہ
بلائے روزِ جزا ٹل گئی سروں سے مگر
دلوں کی تہہ میں دھڑکتی ہے ہیبتِ فردا
ہوس وہ کاسۂ سائل کہ ہر نفس خالی
بہم ہے دولتِ کونین، دل تہی مایہ
یہ میرے عہد کی مخلوق جی رہی ہے مگر
نفس کی آمد و شد پر مدار ہے اس کا

پلک جھپکتے میں کٹتے ہیں روز و شب، مہ و سال
جو فاصلے تھے من و تو کے درمیان نہ رہے
وفا، رفاقتِ یک عمر؟ کچھ نہیں لیکن
یہ چاہتا ہوں کہ روؤں بہت گلے مل کے
مصافِ زیست میں وہ رن پڑا ہے آج کے دن
نہ میں تمھاری تمنا ہوں اور نہ تم میرے
رفیق و یار کہاں اے حجابِ تنہائی
بس اپنے چہرے کو تکتا ہوں آئینہ رکھ کے
ہزار شورِ تماشا ہو، آنکھ باز نہ ہو
وہ خواب دیکھ کے بیٹھا ہوں عمر بھر کے لیے

غمِ دل ہم رہی کرے نہ کرے
انجمِ صبح ہم تو ڈوب چلے
خامشی کس کے نقشِ پا پہ مٹی
راستے کس کو ڈھونڈنے نکلے

چاند تارے بھی شب گزیدہ ہیں
سرِ مژگاں کوئی چراغ جلے
پاس تھی منزلِ مراد مگر
ہم غمِ رفتگاں کے ساتھ رہے
شمعِ شب تاب ایک رات جلی
جلنے والے تمام عمر جلے

دن کو کارِ درازِ دہر رہا
رات خوابوں کی وادیوں میں کٹی
چاند خاموش جا رہا تھا کہیں
ہم نے بھی اس سے کوئی بات نہ کی
ساعتِ دید تیری عمر ہی کیا
ابھی آئی نہ تھی کہ بیت گئی
برگِ آوارہ سے کوئی پوچھے
بوئے گل کس کی جستجو میں گئی
کس کا نغمہ ہے دل کی دھڑکن میں
کس کی آوازِ پا سکوت بنی

وہ نہ چاہے تو میں بینا نہ رہوں
وہ جو چاہے تو نظر بھی آئے

وہ مرے ساتھ ہے سائے کی طرح
دل کو ضد ہے کہ نظر بھی آئے

اس سے ہی اذنِ سفر مانگا ہے
اس سے ہی زادِ سفر بھی آئے

اس نے توفیقِ دعا بخشی ہے
اب دعاؤں میں اثر بھی آئے

کبھی آہوں سے اٹھے بادِ مراد
کبھی اشکوں سے گہر بھی آئے
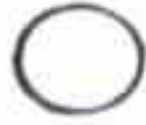
کرشمہ سازِ ازل کیا طلسم باندھا ہے
پریدہ رنگ ہے ہر نقش پھر بھی پیارا ہے
تو روبہ رو ہو تو اے روئے یار تجھ سے کہیں
وہ حرفِ غم کہ حریفِ غمِ زمانہ ہے
کبھی تو ہم پہ اٹھے چشمِ آشنا کی طرح
وہ اک نگاہ کہ صد گردشِ زمانہ ہے
ہماری آنکھوں سے نیرنگیِ جہاں دیکھو
ہماری آنکھوں میں اک عمرِ صد تماشا ہے
ہوائے شوق وہ دن کس خزاں کے ساتھ گئے
تمام عمر ہوئی، انتظارِ فردا ہے

آلِ احمد سرور

"علامہ اقبال، ہمارے عظیم شاعر"

حمید نسیم کی شہرت ان کی خود نوشت سرگزشت "ناممکن کی جستجو" سے ہوئی۔ وہ اس صدی کی چوتھی دہائی میں ایک ممتاز شاعر کی حیثیت سے ابھرے تھے۔ انھوں نے ایک مقرر کی حیثیت سے بھی نام پیدا کیا تھا۔ اردو کے ادبی رسالوں میں ان کا کلام شائع ہونے لگا تھا۔ ریڈیو کی کشش انھیں بہالے گئی اور عرصہ دراز تک ان کی ساری تخلیقی صلاحیتیں اسی طلسماتی دنیا کے لیے وقف رہیں۔ اس سے انھیں ایک فائدہ ضرور ہوا کہ شعر کی موسیقی اور اس کے جادو پر ان کی توجہ مرکوز ہو گئی۔ انھوں نے بڑا ریاض کر کے موسیقی کے اسرار و رموز پر عبور حاصل کیا اور اس سے شعریات کے مطالعے میں انھیں بڑی مدد ملی۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد جب ادب کی طرف ان کی شان دار واپسی ہوئی تو "ناممکن کی جستجو" (خود نوشت) کے علاوہ چند ہی سال میں "دودِ تحیر" اور جستِ جنوں" کے نام سے غزلیات کے دو مجموعے "پانچ جدید شاعر" کے نام سے فیض، راشد، میراجی، عزیز مدنی اور ضیاجالندھری کے کلام پر خاصی تفصیل سے اظہارِ خیال اور کچھ جدید شعرا پر مضامین کا مجموعہ یہ سب کتابیں شائع کیں۔ ان کا تنقیدی سرمایہ ہر لحاظ سے خاصا وقیع ہے۔

"علامہ اقبال ہمارے عظیم شاعر" شروع میں "ایک گذارش" کے علاوہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ ہیں علامہ اقبال حکیم الامت، بانگ درا، مثنوی اسرار و رموز، پیام مشرق، زبور عجم، مثنوی گلشنِ راز جدید، جاوید نامہ، بالِ جبریل۔ ایک گذارش میں حمید نسیم فرماتے ہیں "اس جائزے کی ابتدا ایک Self Contained مقالے سے کی گئی ہے جس کا عنوان ہے "علامہ اقبال حکیم الامت؟" اس مقالے کا مرکزی موضوع یہ ہے کہ حکیم کا مقام، وہ حکیم الامت یا عالی مرتبت متکلم ہی کیوں نہ ہو عظیم شاعر کے مقام سے بہت فروتر ہے۔ دنیا کی کسی زبان کے نقادوں اور ادبی مورخوں نے اپنے بڑے شاعروں کو حکیم یا فلسفی نہیں کہا۔" حمید نسیم نے یہ اچھا کیا کہ اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے خود علامہ اقبال کی لندن کی انڈیا سوسائٹی کی ایک خصوصی تقریب میں علامہ اقبال کی ایک تقریر کا حوالہ دے دیا۔ یہ تقریر حمزہ فاروقی کی کتاب "سفر نامہ۔ اقبال" میں شامل ہے۔ اس میں اقبال نے کہا تھا" بے شک میرے اشعار میں مختلف مسائل کے متعلق فلسفیانہ خیالات موجود ہیں۔ حیات بعد الموت کے ساتھ مجھے خاصی دل چسپی رہی ہے۔ میں انسان کے شان دار درخشاں مستقبل پر پختہ یقین رکھتا ہوں۔ اور میرا یہ عقیدہ ہے کہ انسان نظام کائنات میں ایک مستقل عنصر کی حیثیت حاصل کرنے کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہے۔ یہ عقیدہ

میرے خیالات و افکار میں آپ کو عموماً جاری و ساری نظر آئے گا۔"

دراصل یہ بحث ہی غیر ضروری ہے کہ اقبال بڑے فلسفی ہیں یا بڑے شاعر۔ ہاں ایک فلسفی کی حیثیت سے ان کا مطالعہ ہو سکتا ہے اس لیے کہ ان کی فکر میں ایک وحدت ضرور ملتی ہے۔ یہ وحدت ان کے خودی کے نظریے کی مرہون منت ہے۔ جب اقبال کا مطالعہ مختلف حیثیتوں سے کیا جائے تو اقبال کے فلسفے کی اہمیت پر بھی گفتگو ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں خود اقبال کی لندن کی وہ تقریر جس کا حمزہ فاروقی نے ذکر کیا ہے اور جس پر حمید نسیم نے اپنے مقالے "علامہ اقبال حکیم الامت" کی بنیاد رکھی ہے، سب سے پہلے ملحوظ رکھنی پڑے گی۔ اس بحث میں کہیں یہ خیال ضرور پوشیدہ ہے کہ شاید بڑا فلسفی ہونا بڑے شاعر کے لیے ضروری ہے۔ یا فلسفی شاعر سے بڑا ہوتا ہے۔ یہ دونوں باتیں محل نظر ہیں اور ان سے اس شبہ کو تقویت ملتی ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک وہ بصیرت جو شاعری عطا کرتی ہے، اس بصیرت کے مقابلے میں جو فلسفہ یا سائنس یا کوئی اور علم دیتا ہے کم تر درجہ رکھتی ہے۔ بعض رومانی شاعروں نے اس نظریے کے رد عمل کے طور پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ شاعر کی بصیرت کے مقابلے میں فلسفی یا سائنس داں یا کسی عالم کی بصیرت زیادہ بڑی چیز ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ نہ تو سائنسی علم اور نہ فلسفہ شاعری کی بصیرت سے زیادہ قدر و قیمت رکھنے والی بصیرت عطا کرتا ہے اور نہ یہ بات درست ہوگی کہ شاعر کی بصیرت ان اشخاص کی بصیرت سے افضل ہے۔ دراصل ان دونوں بصیرتوں کی نوعیت علاحدہ اور مختلف ہے۔ ایک کو دوسری پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔ دونوں کی اپنی الگ قدر و قیمت ہے اور یہ ایک دوسرے کا بدل نہیں ہو سکتیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ شاعر کی بصیرت میں کسی فلسفے، کسی نظریے، کسی فکری میلان کی وجہ سے گہرائی آتی ہو اور ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض فلسفیوں مثلاً ہیگل اور نٹشے کے یہاں ایک مخصوص اسلوب کی وجہ سے شعریت پیدا ہوئی ہے۔ پھر بھی جب ہم شعرا کی عظمت کا ذکر کرتے ہیں تو ٹی۔ ایس ایلیٹ کے ساتھ یہاں تک ضرور جا سکتے ہیں کہ "ادب میں عظمت صرف ادبی معیاروں سے نہیں جانچی جا سکتی ہے مگر یہ بات کہ وہ چیز ادب ہے یا نہیں صرف ادبی معیاروں سے متعین ہوگی۔" یعنی بنیادی چیز یہاں ادبیت ہے جسے آپ جمالیاتی اظہار بھی کہہ سکتے ہیں۔ گویا ادب میں اور بالخصوص شاعری میں اصل چیز تخیل کی کارفرمائی کے ذریعے اظہار کی رعنائی اور دل نشینی ہے۔ اب اس رعنائی یا دل نشینی میں کسی فلسفے یا نظریے کی وجہ سے گہرائی پیدا ہو سکتی ہے؟ انسانی نفسیات کے مطالعے سے بھی فطرت انسانی کے پست و بلند کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہاں یہ شاعر پر موقوف ہے کہ وہ شیکسپیر کی طرح زندگی کی تمام جلوہ سامانیوں کو آئینہ دکھانے پر قناعت کرے یا شعر میں دانتے کی طرح زندگی کو ایک خاص نظر سے دیکھے۔ دوسرے الفاظ میں ہمارے یہاں غالب کی طرح زندگی کی تمام بوقلمونیوں کا مطالعہ کرے یا پھر اقبال کی طرح اس کثرت میں ایک وحدت تلاش کرنے کی کوشش کرے۔ شاعر کی عظمت اس کی فکر کی

عظمت میں نہیں ہے بلکہ اس کی شاعری کی مسرت اور بصیرت میں ہے، اس کے ویژن (Vision) کی وسعت اور دائرۂ کار، بلندی اور گہرائی میں ہے۔ اس لیے اقبال کی شاعری کی عظمت پر گفتگو کرتے وقت یہ بات ضرور زیرِ بحث آئے گی کہ ان کے یہاں ایک فلسفیانہ گہرائی ملتی ہے لیکن ان کی شاعرانہ عظمت کا تعین ان کی شاعری کے حسن، ان کے تخیل کی جامعیت، ان کے الفاظ کے اس انتخاب سے ہوگا جس میں لفظ زبان پر ایک فتح ہے اور خود ایک کائنات بن جاتا ہے، جس میں زندگی کے نگار خانے کی ساری تصویریں چلتی پھرتی اپنی چھب دکھاتی اور اپنے اپنے جادو میں اسیر کرتی نظر آتی ہیں۔ جس میں ہر نغمے کی گونج اور ہر نالے کی باز گشت اس طرح ذہن میں بڑھتی اور پھیلتی ہے جیسے ساکن دریا کی سطح پر کوئی کنکر پھینکنے سے لہریں بڑھتی اور پھیلتی ہیں۔ اردو میں لوگ صفات کے استعمال میں بہت فیاض ہیں۔ ویسے یہ مرض پورے مشرق میں عام ہے۔ ابھی تک Under Statement کے آرٹ سے، ہم مشرقی کم ہی مانوس ہیں۔ اس لیے اس مطالعے کے سلسلے میں سب سے پہلے عظیم (Great) اور بڑے (Major) شاعر میں فرق کرنا ضروری ہوگا۔ مثلاً میر، غالب، اقبال، انیس اور نظیر اکبر آبادی اور سودا عظیم شاعر ہیں۔ یا پھر اقبال کے بعد میرے نزدیک جوش، راشد، میراجی، فیض بڑے شعرا ہیں۔ اس کے علاوہ ایک نوع ان شعرا کی بھی ہو سکتی ہے جو عظیم یا بڑے نہیں کہے جائیں گے لیکن ان کو Significant کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً عظمت اللہ خاں جنھوں نے اردو شاعری کو نیا رنگ و آہنگ دیا اور جو دراصل اردو گیت کے پیش رو کہے جاسکتے ہیں۔

"علامہ اقبال حکیم الامت" کے عنوان سے جو پہلا باب ہے اس میں حمید نسیم نے کہا ہے کہ "علامہ اقبال نے قومی خدمت کا آغاز وہاں سے کیا جہاں حالی نے اسے ختم کیا۔ انھوں نے اقبال کے مصرع کو حافظے سے لکھا اور اسی لیے اس میں ان سے ایک سہو ہو گیا ہے۔ حمید نسیم نے لکھا ہے "قوم کا شاعر ہے گویا دیدۂ بینائے قوم" حالاں کہ اقبال کا مصرع ہے "شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم" آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ "بانگِ درا" کے دورِ سوم سے "ارمغانِ حجاز" تک حسب ضرورت انھوں نے ملی شاعری کی جس کی اساس ایک سیاسی پیغام ہے، اسلامی پیغام نہیں۔" یہ نکتہ اہمیت رکھتا ہے۔ مسدس کے متعلق ان کی یہ رائے بھی اہم ہے کہ "یہ نظم جو بڑا موثر منظوم خطبہ ہے بڑی اور دیرپا شاعری نہیں۔" انھوں نے ایک معنی خیز بات یہ بھی کہی ہے کہ "شکوہ، جواب شکوہ، خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا، مثنوی اسرار و رموز، "اے اقوام شرق" اور "مسافر" اور "ضرب کلیم" اور "ارمغانِ حجاز" کا بیش تر کلام، ہماری قوم اور ملت کی سیاسی تاریخ میں، ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ لیکن یہ شاعری یہ خطبات یہ اندازِ تعبیر علامہ اقبال کی اصل پہچان نہیں۔ ان میں سے بیش تر کلام عالمِ اسلام کے بیش تر ملکوں کے حصولِ آزادی کے بعد اپنا مقام حاصل کر چکا اور اب date ہو چکا ہے۔" حمید نسیم نے اقبال کی انگریزی کتاب Reconstruction

Religious thought in Islam کے متعلق بھی یہ کہا ہے کہ اس میں علامہ نے کوئی معرکۃ الآرا بات اسلامی اصول کے بارے میں نہیں فرمائی اور وہ اسلامی الہیات اور اخلاقیات اور ہیئت اجتماعی کی تکوین و تدوین کے اسلامی اصول کو پرکھنے میں شاہ ولی اللہ کی سطح تک نہیں پہنچے۔ یہاں یہ نکتہ حمید نسیم نے نظر انداز کیا کہ اسلام میں حرکت کا تصور اور وحی کے سلسلے کے ختم ہونے کے بعد انسانی عقل پر بڑی توجہ ان کا کارنامہ ہے۔ حمید نسیم کے نزدیک علامہ اقبال کو اپنی ملی شاعری میں فکر کی ایک موقر اساس قائم کرنے کے لیے چند ہمہ گیر تعقلات (Universal Concepts) کی ضرورت تھی انھوں نے تین بڑے تعقلات کو اپنی شاعرانہ فکر اور وجدان کی اساس بنایا۔ ایک تعقل خودی ۲۔ تصورِ فردِ کامل ۳۔ تصورِ عشق۔ حمید نسیم کی یہ رائے بھی قابل غور ہے کہ علامہ اقبال بالعموم اپنی شاعری میں Antiknowledge ہونے کا تاثر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تعقل اور عقل و عشق کے نظریے میں کوئی نئی علمی پیش رفت نہیں ہے۔ حمید نسیم نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ اقبال کا مردِ مومن یا مردِ کامل کا تصور بیش تر مغربی مفکروں کی فکر سے مستعار ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اسلام میں Personality Cult کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے اور فوق البشر یا مردِ کامل کا تصور اس پر منتج ہوتا ہے۔ انھوں نے صاف طور پر کہا ہے کہ علامہ اقبال نے تصورِ خودی، علم، عشق کے بارے میں اپنے تصورِ تعقل اور مردِ کامل کے تصور سے دانش اعصار میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ علامہ دنیا کے عظیم شاعروں کی صف میں شامل ہیں، وہ صف جس میں گوئٹے، دریل، پشکن، ملٹن، ورڈس ورتھ، براؤننگ، بلکے، ہوٹ مین نظیری نیشاپوری، عرفی، صائب اور غالب کی سطح کے شاعر ہیں۔ حمید نسیم نے غالب کو اقبال کا پیش رو قرار دیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ غالب ندرتِ فکر کے بلند ترین مقام پر تھے اور اقبال ان سے فیض یاب ہوئے ہیں۔ حکیم الامت کا مرتبہ ان کے اصلی مقام عظمت سے کم تر ہے یقیناً وہ ایک عظیم شاعر ہیں۔

اگلے باب میں "بانگِ درا" کی شاعری سے بحث ہے اس باب کی خصوصیت یہ ہے کہ کلام کے تجزیے میں بحور کے استعمال اور اس میں تنوع پر زور دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے تنقید میں اس پہلو پر کم توجہ ہوئی تھی۔ حمید نسیم نے اقبال کے شعری سفر کی چار منزلوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہندستان کا قومی شاعر، مسلمان اقوام کی آواز، شاعرِ مشرق جو فرنگی استعمار کی چکی میں پستی ہوئی ساری مظلوم اقوام کو فکری انقلاب اور جدوجہد آزادی کا پیغام دیتا ہے اور پھر وہ شاعری جو آفاقی عظمت کا کلام ہے۔ پہلی تینوں اقسام کی شاعری کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ پہلی تین اقسام کی شاعری میں بھی اعلیٰ پائے کا کلام یہاں وہاں موجود ہے۔ ایسی شاعری خاصے دنوں تک دلوں کو گرماتی ہے۔ لیکن وہ کلام جو آفاقی قدروں اور آفاقی رفعتوں کا حامل ہوتا ہے اسے کبھی زوال نہیں۔ حمید نسیم کا مقصد علامہ اقبال کی ہنگامی شاعری کو ان کی عظیم آفاقی شاعری سے علاحدہ کرنا ہے۔ انھوں نے

"دریائے نیکر کے کنارے"، "تنہائی" اور "سیرِ فلک" جیسی نظموں کی اہمیت کی طرف بجا طور پر اشارہ کیا ہے۔ آگے چل کر "رام" کے عنوان سے نظم پر تبصرے میں حمید نسیم سے یہ غلطی ہوئی ہے کہ نظم کے ہیرو کو سوامی رام تیرتھ سے منسوب کیا ہے جن پر ایک الگ نظم ہے۔ یہ نظم بہر حال جیسی بھی ہو، یہ ایودھیا والے شری رام چندر جی کے متعلق ہے جن کی شجاعت کی داستانیں رامائن میں ملتی ہیں۔ سوامی رام تیرتھ اقبال کے ہم عصر تھے۔ "شمع و شاعر" "حضورِ رسالت مآب میں" اور "جوابِ شکوہ" کو حمید نسیم نے خاص اہمیت دی ہے۔ "والدۂ مرحومہ کی یاد میں" ان کے نزدیک حیات و موت کے جبر و تسلسل کی تصویر کشی بوجھل الفاظ میں کی گئی ہے۔ ایک اور چھوٹی نظم "میں اور تو" کی حمید نسیم نے بڑی تعریف کی ہے۔ "خضرِ راہ" کو وہ "شمع و شاعر" کے بعد "بانگِ درا" کی دوسری بڑی نظم کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک "بانگِ درا" کا حاصلِ کلام "شمع و شاعر اور "خضرِ راہ" ہے۔ بلکہ تکنیکی اور بیانیہ قدرت میں اقبال "خضرِ راہ" میں "شمع و شاعر" سے بھی آگے ہیں۔ حمید نسیم کی اس رائے سے ان کی تنقیدی بصیرت ظاہر ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ارتقا پر اقبال کی چھوٹی سی نظم کا ضرور تذکرہ کرنا چاہیے تھا۔ ان کی ابتدائی نظموں میں "حقیقتِ حسن" بھی میرے نزدیک اہمیت رکھتی ہے۔ گو اس کے پہلے دو شعر غالباً کسی جرمن نظم کا ترجمہ ہیں۔

مثنوی اسرار و رموز پر بحث کے باب میں حمید نسیم نے شروع میں ہی اپنا نقطہ نظر واضح کر دیا ہے وہ کہتے ہیں: "میں ادبِ عالیہ کو پرکھنے میں دو چیزوں کو برابر کی اہمیت دیتا ہوں۔ شاعر تخلیق کار کی حیثیت سے لفظیات، بحور کے استعمال اور وجدان کی سطح پر کیا قامت رکھتا ہے اور ساتھ ہی اتنی ہی اہم بات یہ ہے کہ جو بات اس نے کہی وہ کتنی بڑی یا چھوٹی ہے اور اس بات میں اس کا نیا پن کتنا ہے۔" حمید نسیم نے اس سلسلے میں ان مثنویوں کو علامہ کے ارتقاءِ فکر میں بڑی ابتدائی سطح کی نمائندہ نظمیں کہا ہے۔ انھوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ یہ کتاب علامہ کی تصانیف میں سب سے کم زور ہے اور تخلیق کار کو اس کی عظیم ترین تخلیق پر رکھ کر پرکھا جاتا ہے، اس کی چھوٹی سطح کی تخلیق پر نہیں۔ اقبال نے عورت کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس پر حمید نسیم کا یہ تبصرہ معنی خیز ہے کہ "یہ عورت کے معاملے میں سچے اسلامی اصول پر مبنی بات نہیں، معاشرتی صورتِ حال پر برقرار رہنے کی نفسیاتی Pull ہے۔" مجموعی طور پر حمید نسیم کی رائے مثنوی اسرار و رموز کے متعلق یہ ہے کہ اس میں ملت کو پیغام نشاۃ ثانیہ تو ہے مگر بات اس سطح پر نہیں کہ علامہ اقبال کو شاہ ولی اللہ کا سا رتبہ دیا جائے۔" وہ ان مثنویوں کو منظوم خطبات کہتے ہیں ان میں فکر کہیں کہیں اچھی ہے، بڑی نہیں۔ وہ "شمع و شاعر"، "خضرِ راہ"، "پیامِ مشرق" اور "زبورِ عجم" کی اعلیٰ سطح کی نظموں میں اور "بالِ جبریل" میں علامہ کی اچھی اور بڑی شاعری کی عظمت دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔

"پیامِ مشرق" میں حمید نسیم کے نزدیک اقبال صرف فارسی کے سبکِ ہندی ہی کے ایک

عظیم شاعر نہیں ساری تاریخ ادب فارسی کے ایک منفرد صاحب اسلوب شاعر ہیں۔ ان کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ "اقبال نے مغربی شاعری کی اصناف کے مماثل نظم کے مختلف اسلوب فارسی ادب میں متعارف کرائے۔ "انھوں نے "تسخیرِ فطرت" اور ایلیٹ کی شہرہ آفاق نظم "ویسٹ لینڈ" میں مماثلت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس سلسلے کی مختلف نظموں کی بحروں میں بھی فرق ہے اور موضوع کی مناسبت سے بحور کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اقبال نے فارسی میں جتنی بحروں میں شاعری کی ہے وہ "دیوانِ شمس تبریز" کے علاوہ کہیں نظر نہیں آتی۔ حمید نسیم کے نزدیک "پیام مشرق" کی بڑی نظمیں "تسخیر فطرت"، "سرود انجم"، "فصل بہار" اور "حدی" ہیں۔ اور ساری فارسی شاعری میں ان کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ انسان کی نوعی عظمت، کائنات وجود میں انسان کا مقام، انسان اور خالقِ انسان کا باہمی تعلق، وقت و مکان کے مظاہر کی مختلف سطحیں پیام مشرق کے بڑے موضوع ہیں۔ کلام میں بڑی غنائیت ہے، فکری گہرائی بھی ہے اور تنوع بھی۔ اقبال نے امان اللہ خاں کی شان میں جو کچھ کہا ہے وہ آج عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن لینن اور گوئٹے کے بارے میں اور اپنی قوم کے بارے میں جو اشعار ہیں وہ خوب ہیں۔ "لالہ طور" کے عنوان سے ۱۶۳/ اشعار پر مشتمل جو حصہ ہے اس کو اقبال نے رباعی کیوں کہا اس پر بھی حمید نسیم کو روشنی ڈالنی چاہیے تھی۔ حمید نسیم کے یہاں الگ الگ نظموں پر قابلِ قدر عملی تنقید کے نمونے ملتے ہیں جن میں ان بحروں کی موسیقی پر بھی گفتگو ہے۔ "فصل بہار" پر بحث کرتے وقت اقبال کے بحور میں تجربوں کا بھی ذکر آگیا ہے۔ "فصل بہار" میں سطحِ فکر بڑے شاعر کی ہے۔ "حدی" جیسی بڑی نظم کے آہنگ پر بھی بڑے کام کی باتیں کہی گئی ہیں۔ اقبال کی ایک اعلیٰ پائے کی نظم "محاورہ مابین خدا اور انسان" ہے۔ یہ نظم اور "تنہائی" ان دونوں نظموں میں بڑی شاعری ملتی ہے۔ "مور و شاعر" میں علامہ بہ قول حمید نسیم "پیور پوئٹ ہیں اور ابدی اقدار اعلیٰ کے ترجمان ہیں۔ "مئے باقی میں چالیس پینتالیس غزلیں ہیں اور ایک خاص سطح سے کم کوئی غزل نہیں ہے۔ اور اس شعر پر تو حمید نسیم نے بجا طور پر لکھا ہے کہ "کسی دیوان میں رکھ دیا جائے تو اس کے لیے باعثِ زینت ہوگا۔"

یک نگہ، یک خندۂ دزدیدہ، یک تابندہ اشک
بہرِ پیمان محبت نیست سوگندِ دگر

حمید نسیم نے یہ نکتہ بھی پالیا ہے کہ اگرچہ پیام مشرق کی غزلیں بھی بہت اچھی ہیں لیکن "ان کا جوہر اپنی دائی رفعت پر نظم میں پہنچا ہے۔ "نقشِ فرنگ" میں مختلف النوع افکار و مشاہدات عالم افرنگ کے بارے میں یک جا ہیں۔

اگلے باب میں "زبورِ عجم" کا جائزہ ہے۔ "زبورِ عجم" "پیام مشرق" کے چار برس کے بعد شائع ہوئی۔ "پیام مشرق" کے مقابلے میں قریب قریب بحیثیت تجربے نہ ہونے کے برابر ہیں۔"

تعجب ہے کہ حمید نسیم نے یہ محسوس نہیں کیا کہ "زبورِ عجم" میں ایک جگہ فارم غزل کا ہے مگر غزل کے آداب کے خلاف آخری شعر دوسرے ردیف قلفیے میں ہے۔ یہی بات "بالِ جبریل" میں بھی ایک جگہ ہے۔ شاید اقبال کا زبورِ عجم اور بالِ جبریل میں غزل کا عنوان نہ دینا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اقبال نے یہ جان بوجھ کر کیا ہے۔ "زبورِ عجم" میں بہ قول حمید نسیم غزلیں اور دو چار نظمیں "انقلاب اے انقلاب" جیسی اور "گلشنِ رازِ جدید" مجموعی سطح پر بہت ارفع کلام ہیں۔ "گلشنِ رازِ جدید" میں بغیر اعلان کیے اقبال نے "گلشنِ راز" کے مصنف علامہ شبستری کے فرمانِ تصوف کا رد کیا ہے۔ اگلا باب "گلشنِ راز" کے جائزے کے لیے وقف ہے۔ حمید نسیم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ علامہ شبستری کی گلشنِ راز عجمی تصوف کی راہ پر لے جاتی ہے اور اقبال کے نزدیک یہ راستہ سچے اسلامی تصوف کا نہیں ہے۔ اس کے بعد "جاوید نامہ" پر بحث ہے۔ قدرتی طور پر جاوید نامے کے مطالعے میں دانتے کی "طربیہ خداوندی" کا خیال آتا ہے۔ جاوید نامے میں مشرق اور مغرب کی فکر کا کامل وصال نظر آتا ہے۔ حمید نسیم کی رائے میں جاوید نامے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اقبال تہذیبِ مغرب کی روح، تحقیق و دریافت، ایجاد و تسخیر عناصر کو دل سے بمہ خیر تصور کرتے ہیں۔ جس کو وہ رد کرتے ہیں، عامۃ الناس کی مذہب سے بیگانگی اور حکمرا ں ملوکیت کا، اس علم کو کم زور اقوام کو غلام بنانے کا استعمال کرنا ہے۔ برتر علم اشیا، برتر اسلحہ اور وسائلِ استعمال کو فراہم کرنا ہے۔" علامہ مغربی تہذیب کی کھلی چھوٹ (Permissiveness) کے خلاف ہیں۔ ملوکیت اور مادر پدر آزاد انھیں ایک ہی سطح کے انسان کو انسانیت سے محروم کرنے والے اسلحے نظر آتے ہیں۔ حمید نسیم کو اس کا احساس ہے کہ مغربی ممالک میں عریانیت کے مظاہر نے عرب جاہلیہ کے پدری نظامِ معاشرت سے بہم آمیز ہو کر علامہ کو ایک رخا انداز نظر دیا جس کی وجہ سے وہ عورت کی سب سے بڑی نعمت شوہر کے عطا کردہ زمرد کے گلوبند کو قرار دیتے ہیں۔ "بالِ جبریل" پر اگلا باب ظاہر کرتا ہے کہ حمید نسیم اقبال کی تصانیف میں اس کتاب کو کتنے بلند درجے پر رکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں "" بالِ جبریل" کی عظیم غزلوں اور نظموں میں اقبال کی فکر اور ان کا فن ایک مہرِ جہاں تاب و جہاں فروز ہے۔" حمید نسیم کا یہ خیال ہے کہ "ہئیت میں اور نظم کی Conception میں جو فیض علامہ نے مغربی شاعروں سے حاصل کیا وہ "شمع و شاعر" اور "خضرِ راہ" میں نمایاں ہوا، اور اس کی تکمیل "مسجد قرطبہ" "ذوق و شوق" اور "ساقی نامے" میں ہوئی۔" حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ "شمع و شاعر" میں نظم پر غزل کا خاصا اثر ہے۔ ہاں "خضرِ راہ" اس لحاظ سے زیادہ مکمل نظم ہے کہ اس کا لہجہ خضر کی شخصیت کے مطابق ہے اور اس میں ایک حکیمانہ سنجیدگی ہے۔ "شمع و شاعر" والی رنگینی نہیں۔ جب سید سلیمان ندوی نے اقبال سے یہ شکایت کی تھی کہ "خضرِ راہ" میں اتنی سنجیدگی کیوں ہے اور وہ شعریت کیوں نہیں جو "طلوعِ اسلام" اور ان کی دوسری نظموں میں ملتی ہے تو اقبال نے جواب دیا

تھا کہ "نظم کا لہجہ خضر کی شخصیت کی مناسبت سے حکیمانہ ہے اور مثال یہ دی تھی کہ "خضرِ راہ" کے اس بند میں:

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز

کچھ ایسے شعر درج ہو گئے جو خضر کی شخصیت کے لحاظ سے مناسب نہ تھے، یہ اشعار اس بند سے نکال دیے گئے ہیں اور اب یہ کسی اور نظم کا حصہ بن جائیں گے۔" میں نے اپنے کسی مضمون میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ غالباً "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کے یہ اشعار وہی ہیں جو خضر راہ کے اس بند سے نکالے گئے تھے:

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

حمید نسیم کا اصرار ہے کہ اقبال کی خرد اور علم سے برہمی یا بیزاری میں وقت کے ساتھ جو اضافہ ہوتا دکھائی دیتا ہے اس کی وجہ مغرب میں اس کا غلط استعمال ہے۔ مگر حمید نسیم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ علامہ کے یہاں خرد اور علم سے بیزاری میں Stress (زور) یک رخا ہو گیا ہے۔ اگر وہ اردو میں بھی فارسی کی طرح دو چار مقامات پر علم اور بچی عقل کی تعریف کر دیتے تو ان کا Perspective زیادہ معتبر ہو جاتا۔ حمید نسیم کا فیصلہ یہ ہے کہ آخری تجزیے میں علامہ اقبال اردو شاعری میں فکری سطح پر دو عظیم شاعروں میں سے ایک ہیں انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ باشعور صناع یعنی Conscious Craftsman کی سطح پر اقبال تنہا اور یگانہ ہیں۔ انھوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ فارسی میں بھی صناعی میں "دیوانِ شمس تبریز" عظیم ترین شاعری ہے اور علامہ اقبال اس سے ایک اسٹیپ (قدم) نیچے ہیں۔ میرے نزدیک شعوری صناع والی بات محلِ نظر ہے۔ ہر بڑا شاعر باشعور صناع ضرور ہوتا ہے اور اس لحاظ سے مولانا روم ہوں یا حافظ ہوں یا غالب یہ سب عظیم ہیں اور اس گروہ میں اقبال بھی شامل ہیں۔ "بالِ جبریل" کی غزلوں کا حمید نسیم نے بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے اور خصوصاً ان کی بحروں کی موسیقی پر بجا طور پر زور دیا ہے۔ حمید نسیم رباعی کے لیے لاحول ولاقوۃ والی بحر لازمی نہیں سمجھتے اس خیال سے لوگ شاید متفق نہ ہوں۔ "مسجدِ قرطبہ" "ذوق و شوق" اور "ساقی نامے" کو انھوں نے بجا طور پر ان کی بہترین نظمیں کہا ہے۔ مسجدِ قرطبہ کا موضوع ہے Art and time یعنی فن اور وقت۔ حمید نسیم کا یہ قول معنی خیز ہے کہ "صناع نے یہاں بڑی قدرتِ فن سے اصوات کا نظام مرتب کیا ہے۔" اور جوش میں آکر یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ "ایسی صناعی فارسی اور اردو میں اقبال سے پہلے کہیں نظر نہیں آتی، کہ شعوری

مناعی مغربی عروضیات کی آگہی ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ "حمید نسیم" "مسجد قرطبہ" کو عالمی ادب کی عظیم ترین نظموں میں شمار کرتے ہیں۔ اس بات سے ہر صاحبِ نظر اتفاق کرے گا۔ انھوں نے "لینن" "فرشتوں کا گیت" اور "فرمانِ خدا فرشتوں کے نام" کی اہمیت پر بجا طور پر زور دیا ہے لیکن تینوں نظموں کے متعلق یوں نہیں دیکھا جس طرح "پیامِ مشرق" میں تسخیرِ فطرت والی چار نظموں کے ربط کو دیکھا ہے۔ یہاں بھی یہ تینوں نظمیں ایک سلسلے کی کڑی کہی جا سکتی ہیں۔ "ذوق و شوق" کی بھی انھوں نے بجا طور پر تعریف کی ہے۔ بعض لوگ اسے "بالِ جبریل" کی بہترین نظم کہتے ہیں۔ "لالہ۔ صحرا" پر گفتگو کے سلسلے میں حمید نسیم کا یہ قول اہمیت رکھتا ہے کہ "بانگِ درا" کی نیچر شاعری سے "لالہ۔ صحرا" تک پہنچنے میں اقبال نے تخلیق کار کی حیثیت سے کتنے نوری برسوں کا فاصلہ طے کیا ہے۔ "اس کے بعد "ساقی نامے" پر بجا طور پر توجہ کی ہے اور اسے "بالِ جبریل" کی تین طویل اور عظیم نظموں میں شمار کیا ہے۔ یہاں یہ بات شاید دل چسپ ہو کہ کلیم الدین احمد اگرچہ اقبال کے زیادہ قائل نہیں ہیں مگر "ساقی نامے" کو وہ بھی اقبال کی ایک مکمل نظم اور اقبال کا شاہ کار سمجھتے ہیں)۔ یہ تو بہ ہر حال حمید نسیم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ "زمانے بدل جائیں گے اس نظم کی سطح کی اور نظم تخلیق نہیں ہوگی۔"

حمید نسیم نے "ضربِ کلیم" کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ "ضربِ کلیم" کے متعلق یہ کہنا کہ یہاں "مقصود شاعری نہیں، کلامِ موزوں میں ملت کی اصلاح کی ایک بلیغ کوشش ہے، کسی طرح درست نہیں۔ "ضربِ کلیم" کے (Epigrametic Style) کی بلاغت پر ان کی نظر نہیں گئی۔ (یہ اصطلاح خود اقبال نے استعمال کی ہے) لیکن حیرت ہے کہ وہ "شعاعِ امید" جیسی معرکتہ الآرا نظم کو کیسے نظر انداز کر گئے۔ یہ ایک مکمل نظم ہے۔ سورج اپنی کرنوں کو واپس بلاتا ہے۔ سب کرنیں لوٹ جاتی ہیں، مشرق میں اجالا ممکن نہیں، افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے سیہ پوش ہے۔ لیکن شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہِ حور کہتی ہے:

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

"ضربِ کلیم ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ جولائی ۳۶ء میں اقبال نے اس کا ایک نسخہ علی گڑھ خواجہ غلام السیدین کو بھیجا تھا اور ایک خاص صحبت میں جس میں سیدین صاحب، رشید صاحب، ڈاکٹر عبدالعلیم اور راقم الحروف شریک تھے اس کی بعض نظمیں بلند آواز سے پڑھی گئی تھیں۔ اس نظم میں ہندستان کی عظمت کا تذکرہ اور اس کے آخری شعر میں یہ آفاقی پیام کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا:

۳۰۲

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

ٹی۔ ایس ایلیٹ نے شاعری کی تین آوازوں میں تیسری (ڈرامائی) آواز کو بڑی اہمیت دی ہے۔ "بال جبریل" میں "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں بھی اسی تیسری آواز کا قابل قدر نمونہ ملتا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی "علامہ اقبال ہمارے عظیم شاعر" شاعر اقبال کی عظمت کو اور مستحکم کرنے میں مدد دے گی۔ خصوصاً اس کا مختلف نظموں کی بحروں اور اصوات کا مطالعہ یقیناً اقبالیات میں ایک اضافہ قرار دیا جائے گا۔ پتہ نہیں کچھ لوگ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ اگر اقبال کو بڑا شاعر کہا جائے تو ان کے بڑے فلسفی ہونے پر زد پڑتی ہے۔ کیا اقبال کے لیے یہ عظمت کافی نہیں کہ وہ عظیم شاعروں شیکسپیر اور غالب، دانتے اور رومی کی صف میں ہیں۔ شیکسپیر اور غالب کی عظمت ایک قسم کی ہے، دانتے اور رومی اور اقبال کی دوسری قسم کی۔ آخر ہمالیہ کی چوٹی ایوریسٹ اور کن چن چنگا میں یا کے ٹو میں کوئی بڑا فرق تو نہیں۔ عظمت کی بھی کئی پرتیں ہوتی ہیں ہمیں حسن کی طرح عظمت کی ہر ادا کو بھی پہچاننا چاہیے۔ حمید نسیم ذرا سی توجہ سے ان انگریزی الفاظ کے اردو مترادفات یا مفاہیم بھی دے سکتے تھے جو کتاب میں انھوں نے استعمال کیے ہیں۔ بعض انگریزی الفاظ تنقید میں لانا پڑتے ہیں۔ مگر ان کے ساتھ اردو مترادفات یا ان کا مفہوم ضرور دینا چاہیے۔

("علامہ اقبال ہمارے عظیم شاعر" ایک ناقدانہ جائزہ) از حمید نسیم۔ ناشر: فضلی سنز پرائیوٹ لیمٹڈ، اردو بازار کراچی۔ تاریخ اشاعت: دسمبر ۱۹۹۲ء۔ قیمت: ایک سو پچاس روپے)۔

○ ○ ○

اسلم فرخی

لذت آشنائے تلخیِ دوراں

(سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا محبوب الہیٰ علیہ الرحمتہ نے اپنی ایک مبارک مجلس میں فرمایا تھا کہ "ہر مجمعِ عام میں ایک خاص بھی ہوتا ہے۔" اس عاجز کو زندگی میں انسانوں کے جس جنگل سے واسطہ پڑا اس میں بعض خاص بھی نظر آئے۔ ایسے ہی ایک خاص کا خاکہ مرتب کرنے کی جسارت کی ہے جو دنیا کی نظروں میں گرا ہوا اور گھٹیا آدمی تھا لیکن وفاداری بشرط استواری کی روشنی میں بڑا بھی تھا اور اعلیٰ بھی۔ بڑی مدت سے یہ خاکہ مرتب کرنے کا خیال تھا مگر اس مضطرب روح کو گرفت میں لانا ہمیشہ مشکل معلوم ہوا۔ اب ڈرتے ڈرتے ہمت کی ہے۔ نہ جانے اب بھی یہ مضطرب روح گرفت میں آسکی ہے یا نہیں۔)

ο ο ο

احمد آنسو پونچھتے ہوئے شوکت کی طرف بڑھے۔ شوکت، بھائی کو بڑھتے دیکھ کر زمیں پر لوٹ گئے۔ رونے کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ پچھاڑیں کھانے لگے۔ احمد نے گلے لگایا۔ جیب سے بیس روپے نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھے۔ بولے "اب جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اللہ نے ابا کی مشکل آسان کر دی۔ اب تم جلدی سے چلے جاؤ۔ گھنا پر مسجد کی دکانوں میں حاجی جی بیٹھتے ہیں۔ ان سے سارا سامان مل جائے گا۔ کیوڑے کی بوتل۔ بیری کے پتے اور پھول لے آؤ۔ کپڑا ذرا دیکھ کر لینا، جھر جھرا نہ ہو۔ جلدی سے سب چیزیں لے آؤ۔ دیر نہ لگانا۔"

شوکت باہر نکلے تو سامنے سے رحمت آتا ہوا نظر پڑا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹکے۔ پھر رحمت نے پوچھا۔ "ابے یہ محرمی صورت کیوں بنائی ہے کیا ہوا؟" شوکت نے کہا۔ "ابا گزر گئے۔ کفن لینے جا رہا ہوں۔" رحمت نے کہا۔ "اے تو کیا ہوا۔ بڑے میاں کو ایک نہ ایک دن تو مرنا ہی تھا۔ اچھا ہوا گزر گئے۔ کھٹیا سے کب تک لگے رہتے۔" شوکت نے قہر کی نظروں سے رحمت کو دیکھا مگر رحمت پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ کہنے لگا۔ "کفن بھی لے لیں گے

میری مانو تو پہلے چنڈو خانے میں چل کر چنڈو کے چھینٹے اڑائیں۔ سارا غم غلط ہو جائے گا۔ لگے دم، مٹے غم۔ پھر کفن بھی لے لیں گے۔"

تیسرے دن جب شوکت سوجی سوجی آنکھوں اور ڈھیلے ڈھیلے ہاتھ پیروں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے تب سب سے پہلے بھاوج کی نگاہ پڑی۔ اسی سے بھٹا ہوا۔ بھاوج نے شوکت کو دیکھتے ہی سینے پر دو ہتڑ مارنا اور بین کرنا شروع کر دیا۔ "آگیا جوتیوں سمیت آنکھوں میں گھسنے مونڈی کاٹے۔ باوا کے بدلے تجھے موت نہ آئی۔ ارے تجھے ڈھائی گھڑی کی موت آئے۔ بیچ بھاتی کھٹیا نکلے۔ ارے لوگو! یہ کیسا اندھیر ہے۔ موا باپ کے کفن کے روپوں سے چنڈو پی گیا۔ ارے بے شرم تجھے ہیضہ ہو۔ کمینے، خدائی خوار! ہمارے منھ میں کالک لگادی۔ باپ کا مردہ گھر میں پڑا ہے اور سپوت چنڈو خانے میں چھینٹے اڑا رہے ہیں۔ تیرا ستیاناش ہو۔ ملاعون چنڈو باز، بے غیرت، کیا منھ لے کر آیا ہے۔ ارے کہاں ہو۔ اس کمینے کا ہاتھ پکڑ کر باہر کیوں نہیں نکال دیتے۔" بیوی کی پٹس سن کر احمد کوٹھری سے انگنائی میں برآمد ہوئے۔ شوکت کی سوجی سوجی آنکھوں اور ڈھیلے ڈھیلے ہاتھ پیروں پر نظر پڑی تو بے اختیار پیر سے جوتا اتارا اور شوکت کے سر پر دھڑا دھڑ مارنا شروع کر دیا۔ شوکت بت بنے کھڑے رہے۔ چپ چاپ پٹتے رہے۔ احمد مارتے مارتے تھک گئے تو ہاتھ پکڑ کر دروازے سے باہر لے گئے۔ ڈانٹ کر بولے۔ "اگر شریف کا نطفہ ہو تو کبھی اس گھر میں قدم نہ رکھنا۔"

شوکت گھر سے نکلے تو روتے بسورتے رحمت کے یہاں پہنچے۔ اس نے انھیں دیکھتے ہی ناک بھوں چڑھائی بولا۔ "مجھے سب خبر ہے۔ آگئے جوتے کھا کر۔ مرد بچے بنو۔ گھر میں آدھا حصہ تمھارا ہے۔ احمد یوں نہ مانیں تو نالش کر دو۔ دماغ درست ہو جائے گا۔" شوکت خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ کہنے لگے۔ "میاں میرے، میں تو یہ چاہ رہا ہوں کہ دو چار دن تمھارے یہاں رہوں" "لو بھلا۔ میاں ہوش کے ناخن لو۔ یہاں اپنا ٹھکانا تو ہے نہیں۔ تمھیں کیا طاق میں سجادوں۔ بھائی کوئی اور گھر دیکھو۔ اپنا گھر اجاڑنے سے پہلے کچھ تو سوچا ہوتا۔" شوکت چپ چاپ وہاں سے کھسک لیے سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ رحمت یوں آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لے گا رات محلے کی مسجد میں گزاری۔ بھوکے پیاسے لیٹ رہے۔ صبح کو کسی سے کچھ کہے سنے بغیر اپنے دور پرے کے رشتہ داروں کے پاس گنگا پار چلے گئے۔

○ ○ ○

میں نے بچپن ہی سے شوکت کو اپنے گھر کے ایک لازمی حصے کی طرح دیکھا اور محسوس کیا۔ پرانی روایت کا پابند گھرانا اور ماحول۔ مردانے میں مہمان داری کا زور و شور۔ فتح گڑھ چوں کہ ضلعے کا صدر مقام تھا اس لیے ضلعے کے ہر حصے سے ابا میاں کے ملنے جلنے والے مقدموں،

کاروبار اور دوسرے کاموں سے آتے رہتے تھے۔ تروا، قنوج، چھبرامؤ، گورسہائے گنج، شمس آباد، قائم گنج، سورکھ، سترکھ، تال گرام، ہر جگہ سے لوگ آتے تھے۔ کوٹھی کے بڑے دالان سے ملحق چھپے بڑے بڑے کمرے تھے ان میں پلنگ، بستر، پانی کی صراحی، لوٹا، گلاس، دو چار مونڈھے اور اسی قسم کا سامان تھا۔ کونے کا کمرہ مولوی صاحب کے تصرف میں تھا۔ باقی کمرے مہمانوں کے لیے تھے۔ قنوج اور قائم گنج دونوں جانب سے ریل صبح نو بجے فتح گڑھ پہنچتی تھی۔ آنے والے پہلے کوٹھی آتے۔ منھ ہاتھ دھوتے۔ موسم کی مناسبت سے چائے شربت پیتے۔ پھر کچہری یا بازار چلے جاتے۔ جنھیں ٹھہرنا نہیں ہوتا وہ چار بجے کی ریل سے واپس چلے جاتے۔ جنھیں ٹھہرنا ہوتا وہ شام کو واپس آجاتے۔ کھانا کھاتے اور کام ختم کر کے اگلے دن جاتے۔ میں بڑی مدت تک اس شش و پنج میں رہا کہ ابامیاں رات کا کھانا اتنی دیر میں کیوں کھاتے ہیں۔ ساڑھے نو بجے دسترخوان بچھتا تھا۔ پھر ایک دن معمہ خود بخود حل ہو گیا۔ اوہو! یہ رات کے نو بجے آنے والی ریل کے مسافروں کا انتظار کر کے کھانا کھاتے ہیں۔ تروا، ٹھٹھیا، تال گرام اور چھبرامؤ سے آنے والے عموماً رات ہی کو آتے تھے کیوں کہ یہ قصبے ریل سے دور تھے۔ پہلے قنوج یا گورسہائے گنج آنا پڑتا تھا پھر ریل سے فتح گڑھ تین چار بجے نکلتے اور رات کو فتح گڑھ پہنچتے۔ اگر ابامیاں رات کو جلد کھانا کھالیتے تو آنے والے مہمانوں کو بچا ہوا کھانا ملتا اور مہمان نوازی کا حق ادا نہ ہوتا۔ مہمان نوازی کے بھی کیا کیا انداز تھے۔

بعض مہمان ایسے بھی آتے تھے جو ہفتوں نہیں مہینے رہتے تھے۔ مجھے ایک صاحب خاص طور سے یاد آتے ہیں۔ انھیں سب مسافر صاحب کہتے تھے۔ آتے تو جانے کا نام نہ لیتے اور ہر دوسرے تیسرے دن کبابوں اور ارد کی دال کی فرمائش اندر بھجواتے رہتے تھے۔ مولوی صاحب بھی ایک دفعہ گھومتے پھرتے آپہنچے تھے اور مہمان ہوے تھے۔ نام ان کا سید محمد شفیع تھا۔ جون پور کے رہنے والے تھے۔ ذی علم تھے۔ تھوڑی بہت زمین داری بھی تھی۔ سرکاری ملازم تھے۔ گرد اور قانون گو تھے مگر جوانی ہی میں نہ جانے جی میں کیا آئی کہ نوکری چھوڑ دی۔ زمین داری بہن کے سپرد کر دی فقیری لے لی اور دیس دیس کی سیر کرنے نکل کھڑے ہوے۔

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

گھومتے پھرتے فتح گڑھ آنکلے۔ ابامیاں کے مہمان ہوئے اور ایسے مہمان ہوئے کہ مری کے نکلے برق جو کہتے تھے آخر وہی کر کے اٹھے جان دی آپ کے دروازے پہ مر کے اٹھے سیدھے سچے بزرگ تھے۔ ہم سب بھائی بہنوں کو قرآن شریف انھیں نے پڑھایا تھا۔ میں نے ان سے فارسی بھی پڑھی تھی۔ تعویذ، گنڈے اور جھاڑ پھونک کرتے تھے۔ فال بھی کھولتے تھے۔ ہندو عورتیں اور مرد ان کے بڑے معتقد تھے۔ مسلمان بھی آتے تھے مولوی صاحب کے پاس بھوج پتر کی ایک قلمی کتاب تھی۔ اس کو دیکھ کر فال کھولتے تھے۔ آنے جانے والے کچھ نہ کچھ

نذر بھی کرتے تھے ۔ مولوی صاحب کا کالا قلم دان روپے ۔ دھیلی اور پاؤلی کے سکوں سے بھرا رہتا تھا ۔ مٹھائی بھی بہت آتی تھی ۔ میں نے کئی بار مولوی صاحب کی غیر موجودگی میں ان کی کتاب پڑھنے کی کوشش کی مگر میری سمجھ میں نہیں آئی ۔ دراصل مجھے یہ ڈر تھا کہ اگر کچھ مولوی صاحب نے اپنی تلے دانی کے بارے میں فال کھولی تو انھیں پتہ چل جائے گا کہ ایک دن ان کی ڈانٹ سن کر میں نے اسے کنویں میں پھینک دیا تھا ۔ مگر نہ انھوں نے فال کھولی نہ پتہ چلا ۔

مولوی صاحب میں ساری خوبیاں تھیں مگر ایک کمزوری بھی تھی ۔ کمزوری یہ کہ وہ افیمی تھے ۔ افیم کی گولی بھی کھاتے تھے اور پانی میں گھول کر بھی پیتے تھے ۔ چوں کہ ذی علم تھے ، معزز تھے ، بزرگ تھے اس لیے فتح گرھ کے تمام افیمیوں نے انھیں اپنا قبلہ گاہ بنا لیا تھا ۔ ایک آدھ افیمی ہر وقت ڈٹا رہتا تھا ۔ شام کو باقاعدہ محفل جمتی ۔ انگیٹھی پر چائے بنتی ۔ کڑھے ہوئے بالائی دار دودھ کی یہ چائے بڑی لذیذ ہوتی تھی ۔ لب بند ، لب سوز اور ہر پینے والے کے لیے لبالب ، چراغ جل جاتے تو سارے اہل محفل قاعدے قرینے سے اپنی مقررہ جگہ پر بیٹھتے ۔ مولوی صاحب ڈیٹز کی شفاف چمنی والی لالٹین کی روشنی میں طلسم ہوش ربا پڑھتے ۔ موقع محل کی مناسبت سے ان کا نرم گرم بیان ، سننے والوں کا انہماک ۔ جب مولوی صاحب پڑھتے " کشتی مرا .... " تو حاضرین صدا لگاتے ۔ " وہ مارا مردود کو " لشکر اسلام پر کوئی آفت نازل ہوتی تو نعرہ لگتا " بس مدد آیا چاہتی ہے ۔ پہنچنے ہی والی ہے ۔ " گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے یہ داستان جاری رہتی ۔ پھر محفل برخواست ہو جاتی ۔ اس محفل کے شرکا میں ایسے ایسے زندہ اور توانا کردار نظر پڑے جو اپنی انفرادیت کی وجہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذہن میں محفوظ ہو گئے ہیں ۔ ابا میاں کے دوست احباب کی محفل الگ جمتی تھی ۔ گرمیوں میں کوٹھی کے صحن میں سردیوں میں دیوان خانے میں دونوں محفلیں دو الگ الگ جزیرے تھیں ۔ ابا میاں نے مولوی صاحب اور ان کے حشرات الارض سے کبھی کوئی پرسش نہیں کی ۔ آنے والے انھیں ادب سے سلام کرتے ۔ ابا میاں سوال کا جواب دیتے ۔ خیریت پوچھتے اور آنے والا مولوی صاحب کی طرف بڑھ جاتا ۔ ابا میاں کا انتقال ہو گیا ۔ کوٹھی ان کی زندگی ہی میں فروخت ہو کر کورٹ آف وارڈس کی تحویل میں چلی گئی تھی ۔ دیسی ریاستوں نے ان کے کارخانے سے بے تحاشا خیمے بنوائے ۔ ساز و سامان خریدا ۔ خریداری مسلسل ہوتی رہی مگر ادائیگی بہت کم ہوئی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کارخانہ تباہ ہو گیا ۔ کسی ریاست کے خلاف عدالت میں دعویٰ ہو نہیں سکتا تھا ۔ وائسرائے کی اجازت ضروری تھی اور کسی وائسرائے نے درخواستوں کے باوجود اجازت نہیں دی ۔ ابا میاں قرض میں ڈوب گئے اور کوٹھی کا داغ دل پر لیے چلے گئے ۔ ہماری حیثیت مالک کے بجائے کرائے دار کی ہو گئی مگر میرے والد نے جنھیں میں بھائی جان کہتا تھا ابا میاں کے انداز کو قائم رکھا ۔ مہمان داری بھی وہی رہی اور انھوں نے مولوی صاحب کو بھی خوش دلی سے وراثت میں قبول کر لیا ۔ شوکت

بھی اسی وراثت کا حصہ تھے۔

شوکت پہلے پہل مولوی صاحب ہی کے پاس آئے تھے۔ یہاں کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر یہیں رہ پڑے۔ مولوی صاحب کی صحبت میں شین قاف درست ہو گیا تھا۔ مولوی صاحب کی طرح ان کا کھانا بھی اندر سے آنے لگا تھا۔ مولوی صاحب کبھی کبھی انھیں افیم بھی پلوا دیتے تھے پیسے کوڑی سے بھی مدد کرتے تھے۔ کچھ پیسے بھائی جان سے بھی مل جاتے تھے۔ کپڑوں کا بندوبست بھی بھائی جان ہی کرتے۔ عید بقرعید کو سب کے ساتھ ان کا جوڑا بھی بنتا تھا۔ یہ تو اندر کا حال تھا بہ ظاہر شوکت کسی کے محتاج نہیں تھے۔ سرمہ، مسی بیچتے تھے۔ "من ہش فروش دل صد پارہ خویشم۔" بیچتے کیا تھے، دل کے بہلانے کو ایک شغل پال رکھا تھا۔

میں نے شوکت کو جس انداز میں پہلے پہل دیکھا تھا وہی انداز آخر تک قائم رہا۔ ناٹا قد گھٹا ہوا سر، رنگ گہرا سانولا جو افیم کی وجہ سے کھوان ہو گیا تھا۔ چیاں سی آنکھیں، پچکے ہوئے کلے، تنگ پیشانی، ڈھیلے ڈھیلے ہاتھ پیر، الجھی ہوئی لٹکواں ڈاڑھی۔ میرے بچپن میں کالی تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے سفید ہو گئی تھی۔ کمر میں ہلکا سا خم، موٹے موٹے ہونٹ، کالے کالے دانت جیسے مسی بیچتے بیچتے خود مل لی ہو۔ آواز میں کراراپن، گرمیاں ہوئیں تو بدن سے ننگے۔ لنگوٹی لگی ہوئی۔ جاڑوں میں تہہ بند بندھا ہوا مگر سر پر دو پلی ضرور ہوتی تھی۔ گردن میلی چکٹ پیٹھ اور پیٹ پر میل کی تہیں جمی ہوئی۔ جاڑوں میں کرتا اور مرزئی، جوتے کا روگ نہیں پالتے تھے۔ دھول مٹی میں اٹے رہنے کی وجہ سے پاؤں بالکل سیاہ ہو گئے تھے۔ نہانے کے نام سے دور بھاگتے تھے۔ نہ جانے کبھی منھ بھی دھوتے تھے یا نہیں۔ ادھر کسی نے نہانے کا نام لیا اور انھوں نے کنی کاٹی۔ بڑی گرمی پڑ رہی ہے۔ سب لوگ دن میں دو دو تین تین مرتبہ نہا رہے ہیں۔ علی الصباح گنگا میں اشنان ہو رہا ہے مگر پتھر میں جونک نہ لگی ہے نہ لگے گی۔ کس کی مجال تھی کہ شوکت کو نہانے پر آمادہ کر سکے۔ کسی نے زیادہ اصرار کیا تو کہتے "اب کے جمعہ کو ضرور نہاؤں گا" مگر وہ جمعہ کبھی آیا نہیں۔ اور ان پر کیا منحصر۔ مولوی صاحب بھی نہانے کا نام سنتے ہی پانی پانی ہو جاتے تھے۔ جاڑوں میں نہانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ عید بقر عید کے موقع پر دو تین آدمی انھیں زبردستی پکڑ کر نہلا دیتے تھے اور ان کی زبان سے برا بھلا سنتے مگر نماز کو شوکت پھر بھی نہ جاتے۔

دالان کے آخری کونے میں ایک بڑا سا تخت بچھا تھا۔ یہی شوکت کا بیٹھا تھا۔ رات کو اسی تخت پر لوٹ مارتے تخت کے نیچے ان کی روزی کا ٹھیکرا یعنی پٹاری دھری رہتی تھی۔ اس میں سرمہ، مسی، اینگر، عورتوں کے صابن، کاجل اور نہ جانے کیا کیا مال مسالہ بھرا رہتا تھا۔ مولوی صاحب صبح بھی چائے بنواتے تھے۔ شوکت پہلے تو چائے پیتے، بسکٹ کھاتے۔ اگر مولوی صاحب افیم کی پیالی ان کی طرف بڑھا دیتے تو وہ پانی ڈال کر جوگے کو خوب گھونٹتے تھے

اور زہر مار کر جاتے تھے ۔ اگر مولوی صاحب چپکے رہتے تو شوکت پوست کے چھلکے ابلنے رکھ دیتے ۔ یہ چھلکے وہ لالہ جیون لال کی دکان سے لاتے تھے ۔ افیم کے مقابلے میں بہت سستے ہوتے تھے ۔ ان میں کہیں کہیں افیم کے گلے رہ جانے کا احتمال ہوتا تھا ۔ چھلکے خوب ابل چکتے اور پانی ذرا سا رہ جاتا تو شوکت اسے ٹھنڈا کر کے پی جاتے ۔ ان کے بقول اس سے بڑا سرور گٹھتا تھا ۔ اس ساری کاروائی میں بالعموم صبح کے دس بج جاتے تھے ۔ سورج خاصہ بلند ہو جاتا تھا ۔ دھوپ تیز ہو جاتی تھی ۔

دھوپ تیز ہوئی اور شوکت نے پیترا بدلا ۔ اٹھے ، بیٹھے ۔ پھر اٹھے ۔ پھر بیٹھے جیسے بڑی ہمت کر رہے ہیں ۔ پھر آہستہ آہستہ اٹھے ۔ ملگجا کرتا پہنا ۔ ٹوپی ٹھیک سے سر پر جمائی ، ہتہ بند کسا ، کپڑے کو گول کر کے اینڈوی بنائی ۔ پٹاری سر پر رکھی ۔ ایک موٹی سی لکڑی ہاتھ میں لی اور کانکھتے کراہتے دالان سے صحن میں آئے ۔ یہاں چھوٹے دالان میں منو میاں ، بابو رام اور رام پرشاد خاموشی سے انھیں بڑھتے ہوئے دیکھتے ۔ پھر ان میں سے کوئی بڑے زور سے چھینکتا ۔ آچھیں ۔ شوکت فوراً پینترا بدلتے ، بڑھتے ہوئے قدم رک جاتے ۔ چند لمحوں کے لیے ٹھہر جاتے ۔ اس اثنا میں پھر چھینک کی آواز آتی ۔ آچھیں ، آچھیں ۔ شوکت ہیں کہ سناٹے کے عالم میں ہیں ۔ انھیں ٹھہرے دیکھ کر چھینکوں کا سلسلہ عارضی طور پر رک جاتا مگر ادھر انھوں نے قدم بڑھایا اور آچھیں آچھیں ہونے لگی ۔ وہ کھسیا کر کہتے ۔ "ہت ترے چھینکنے والے کی ناک کاٹوں ۔" مگر چھینکنے والے چھینکتے اور شوکت جھینکتے رہتے ۔ تنگ آکر وہ اپنے تخت کی طرف واپس آجاتے ۔ پٹاری سر سے اتار کر نیچے رکھ دیتے اور تخت پر بیٹھ کر بڑبڑانے لگتے ۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر پھر ہمت کرتے اور باہر نکلتے ۔ ادھر سے چھینکنے اور ادھر سے بڑبڑانے کا سلسلہ پھر شروع ہو جاتا مگر اب شوکت لمبے لمبے ڈگ بھرتے تیزی سے باہر نکل جاتے ۔ منو میاں اور ان کے ساتھی منھ دیکھتے رہ جاتے ۔ یہ تماشا اکثر ہوتا تھا مگر ابامیاں یا بھائی جان کے آنے کا اندیشہ ہوتا تو پھر منومیاں چپکے رہتے اور شوکت بوقدمے چلے جاتے ۔ کوٹھی سے باہر نکلتے ۔ پھاٹک سے باہر ہوتے ہی آواز لگاتے ۔ کھرج دار آواز میں " سرمہ بریلی والا ، مسی پنجاب والی ، اینگر بنارس والا ، کٹوری بندی آگرے والی ۔ " کی گردان کرتے اور جس طرف جی چاہتا چل کھڑے ہوتے ۔ کسی قریبی گاؤں کی طرف نکل جاتے ۔ ان کے گاہک دیہات ہی کے لوگ ہوتے تھے ۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ چھینکوں کا سلسلہ طول کھینچ جاتا ۔ اس دن شوکت دالان میں لوٹ کر پٹاری تخت کے نیچے رکھ دیتے اور بیٹھ کر بڑبڑاتے رہتے یا ٹھنڈی سانسیں بھرتے رہتے ۔ مولوی صاحب کی نظر پڑتی تو وہ پوچھتے ۔ " ارے میاں شوکت ! آج تم گئے نہیں ۔ " شوکت منھ بسور کر کہتے " میاں میرے ، جاؤں کیسے نکلا تو کم بختوں نے ہتے پر ٹوک دیا ۔ سویرے سویرے نیاں ہو گئی ۔ اب کیا جاؤں ۔ جینا حرام کر دیا ہے ان لوگوں نے ۔ سالوں کو

موت بھی نہیں آتی ۔ احسن میاں نے نوکر نہیں رکھے چنڈال چوکڑی جمع کی ہے " شوکت بڑبڑاتے رہتے مگر بھائی جان کا نام سنتے ہی مولوی صاحب چپکے ہو جاتے ۔ ویسے بھی بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا ان کے مسلک کے خلاف تھا ۔ افیمی آدمی یوں بھی لڑائی جھگڑے سے بہت گھبراتے ہیں ۔

مگر ایک دن سچ مچ جھگڑا ہو گیا ۔ ہوا یہ کہ منو میاں نے شوکت کو جاتے دیکھ کر حسب معمول چھینک ماری ۔ اس دن شوکت نے سویرے سویرے یا تو آئینہ دیکھ لیا تھا یا کالی بلی لانگی تھی کہ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ۔ پٹاری سر سے اتار کر زمین پر ٹکائی ۔ لکڑی کا ایک چھوٹا سا ڈبا صحن میں پڑا تھا ۔ لپک کر اسے اٹھایا اور منو میاں کے کھوپڑے پر کھینچ مارا ۔ ڈبا منو میاں کے سر میں بڑے زور سے لگا اور وہ بہ آواز بلند شوکت کی مرحوم والدہ سے رشتہ جوڑتے ہوئے ان سے دست و گریبان ہوئے ۔ شوکت تھے تو مس مسے آدمی مگر وہ بھی اس وقت جان پر کھیل کر لپٹ پڑے ۔ قریب تھا کہ دونوں میں لپاڈگی ہو جائے کہ یک لخت بھائی جان اندر سے آ گئے ۔ انھوں نے ڈانٹ کر پوچھا " یہ کیا ہو رہا ہے ؟ " کہاں تو شوکت اور منو لپاڈگی پر آمادہ تھے ۔ کہاں یہ معلوم ہوا کہ دونوں گلے مل رہے ہیں ۔ شوکت نے بڑی ڈھٹائی سے کہا " احسن میاں ! یہ منو مجھے بتا رہے ہیں کہ جب ڈاکو ان سے لپٹ پڑا تھا تو انھوں نے اسے کیسے دے مارا تھا " بھائی جان نے منو سے پوچھا " ڈاکو تمھارے لپٹ گیا ۔ کب ۔ کہاں ؟ منو بڑی مری ہوئی آواز میں کہنے لگے ۔ " میں ایک دفعہ کٹڑی میں جا رہا تھا " بھائی جان نے کہا " کٹڑی میں ؟ وہاں کیا کرنے گئے تھے ایسی ویسی جگہ مت جایا کرو " ۔ بھائی جان تو یہ کہہ کر چلے گئے ۔ شوکت نے بھی سیدھے سبھاؤ اپنا راستہ لیا اور چوٹ کھائے ہوئے منو میاں سر سہلاتے رہے ۔ بابو رام اور رام پرشاد بھی ان کا سر سہلاتے اور بھیجا کھاتے رہے ۔

اس واقعے بلکہ سانحے کے بعد چھینکوں کا سلسلہ کچھ دن بند رہا مگر منو میاں کی انتقامی طبیعت نے ایک نیا طریقہ واردات شروع کر دیا ۔ شوکت جب بھی چھوٹے دالان کے سامنے سے گزرتے تو منو میاں نعرہ لگاتے " خدا نے کریمی کی " دوسرے تمام لوگ کورس میں جواب دیتے " پھٹ گئی دھوتی افیمی کی " کبھی کبھی ادھر ادھر دیکھ کر یہ اطمینان کر لیتے کہ مولوی صاحب یا کوئی اور تو نہیں سن رہا ہے تو پھر دھوتی کی جگہ وہ لفظ استعمال ہوتا جو گھوڑے کھولنے کے محاورے کے ساتھ زباں زد ، خاص و عام ہے ۔ شوکت خون کا سا گھونٹ ، پیے ، سنی ان سنی کرتے ، منھ میں گھنگھنیاں بھرے باہر نکل جاتے ۔ جب منو میاں اور ان کے ساتھیوں نے دیکھا کہ ان کی انتقامی کاروائی بے اثر ہو گئی ہے تو نعروں کی فراوانی اور شدت میں خاصی کمی آ گئی ۔ مگر سلسلہ ختم نہیں ہوا ۔ نعرے اور چھینکیں جاری رہیں ۔ شوکت عام طور پر چپ شاہ کا روزہ رکھے رہتے ۔ کبھی کبھی برس پڑتے اور خنک پورے کا محاورہ بولنے لگتے مگر منو میاں

اینڈ کو زور زور سے قہقہے لگاتے اور شوکت کھسیانے ہو کر رہ جاتے ۔ یہ سلسلہ برسوں جاری رہا نہ یہ باز آئے نہ انھوں نے ہار مانی ۔

تین چار بجے شوکت پھیری لگاکر لوٹتے ۔ ٹھنڈا مٹی کھانا حلق سے اتارتے ۔ کچھ دیر مولوی صاحب کے پیر دابتے ۔ ادھر شام کے پانچ بجے اور وہ کوٹھی سے نکل کر ہاتھی خانے والے نالے کے سامنے مقصود کی دکان پر جا پہنچے ۔ مقصود عرف عام میں مقصودا کہلاتے تھے اور اپنے چائے خانے کی وجہ سے دور دور تک مشہور تھے ۔ چائے خانہ کیا تھا ۔ ایک چھوٹی سی دکان تھی دکان کے سامنے دو ایک ٹوٹی پھوٹی بنچیں رکھی تھیں ۔ آنے والے انھیں پر ٹک جاتے اور مقصود کی بالائی والی چائے کی چسکیاں لیتے ۔ مقصود چائے خود ہی بناتے تھے ۔ دہرے جسم کے موٹے تازے آدمی تھے ۔ قد کے ناٹے مگر دل کے بڑے ۔ ان کے ہاتھ کی چائے کا بڑا شہرا تھا ۔ فقیر محمد خان جنھیں سب فقیرے ددّو کہتے تھے روزانہ اپنے گاؤں یاقوت گنج سے یہ چائے پینے سائیکل پر فتح گڑھ آتے تھے ۔ دوپہر کوٹھی میں گزارتے ۔ شام ہوتی تو مقصود کے یہاں چائے پیتے اور پھر یاقوت گنج واپس چلے جاتے ۔ میں نے ان کے اس معمول میں کوئی ناغہ نہیں دیکھا ۔ اسی طرح بعض اور لوگ بھی آتے تھے ۔ مقصود اپنے ہم سنوں اور شوکت جیسے لوگوں سے ہنسی مذاق بھی کرتے رہتے تھے ۔ جملہ چپکانے میں بے پناہ تھے مگر جیسا منھ ویسی تھپیڑ کے بھی قائل تھے ۔ فتح گڑھ میں دلی کا ہوٹل بھی تھا ۔ شرفائے شہر یہیں جمع ہوتے اور بکریوں کے دودھ کی چائے پیتے تھے ۔ ریڈیو بجتا تھا ۔ اتوار کی دوپہر کو فرمائشی پروگرام سننے ہمارا ٹولہ بھی وہیں جمع ہوتا تھا ۔ مقصود کے یہاں ریڈیو تو کیا گراموفون بھی نہیں تھا ۔ یہاں شہر کے سارے خدائی خوار جمع ہوتے تھے مگر شرفا بھی نظر آتے تھے ۔ ربانی صاحب (غلام ربانی تاباں) ، مرزا ضمیر ، قمر مسعود ، محبوب اور بعض ایسے لوگ جن کا شہر کے معززین میں شمار ہوتا تھا کبھی کبھی مقصود کے یہاں بھی نظر آتے ۔ ربانی صاحب کھڑے کھڑے چائے پیتے اور طنزاً مجھ سے کہتے " تمھیں اس سیال حلوے میں کیا لطف آتا ہے " میں جواب میں کہتا ۔ " اس قومی چنڈو خانے میں آنے سے زندگی کے حقائق روشن ہوتے ہیں " ربانی صاحب جواب میں کہتے " یارو ۔ میری پوزیشن کا بھی کچھ خیال کیا کرو ۔ "

شوکت چائے خانے کے ایک کونے میں بیٹھے رہتے ۔ کوٹھی میں زرا دبے لچے رہتے ۔ یہاں خوب ڈونکتے ۔ بات بات پر بکتے ، پارہ چڑھ جاتا تو جیب سے اکنی نکال کر پھینکتے اور کہتے " لایار ! چائے پلا " دوسرے آنے والے چائے کی پیش کش کرتے مگر شوکت ٹال جاتے ۔ دوسرں کی چائے کبھی نہ پیتے ۔ چائے بناتے بناتے مقصود موقع محل دیکھ کر ان کے ایک آدھ چٹکی بھی لے لیتے تھے ۔ شوکت بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے ۔ " ارے ہاں شوکت ۔ سنا ہے سارے افیمی لام پر بھیجے جا رہے ہیں ۔ ہوشیار ہو جاؤ ، تمھارا نمبر بھی آنے والا ہے ۔ " " ہاں میاں

میرے۔ دونوں ساتھ چلیں گے۔ تم توپ چلانا۔ این جانب بندوق چلائیں گے۔ " تم تو بیٹھے ہی بیٹھے فیر کرتے رہتے ہو۔ تمھیں بندوق کی کیا ضرورت ہے۔ اٹھ سکے گی تم سے۔ " میاں میرے، ہم نے بھی جوانی میں بہت بندوقیں داغی ہیں۔ چائے بنانا اور ہے، بندوق داغنا اور ہے۔ " اچھا تو تم جوان بھی تھے، لوگ کہتے ہیں تم بڈھے ہی پیدا ہوئے تھے۔ " اتنے میں کوئی ایسا گاہک آجاتا جس کی موجودگی میں دونوں کو چپ ہونا پڑتا۔ شوکت آنے والے کو سلام کر کے پکے پل کی ریوڑیوں اور قلعے جلے کے سوہن حلوے کا ذکر چھیڑ دیتے۔ آنے والا چند لمحوں کے لیے ان کی بات دل چسپی سے سنتا اور ان کو چائے پلوانا چاہتا مگر وہ حیلے بہانے سے ٹال جاتے۔ کوئی خردماغ پھنس جاتا تو وہ شوکت کو بہتے ہی پر ٹوک دیتا اور رخ ملاکر بات نہ کرتا۔ شوکت بھی ہوا کا رخ پہچانتے تھے۔ ایسے لوگوں سے چباچبا کر باتیں کرتے تھے۔ خود دار اتنے تھے کہ فقیر محمد خان کے علاوہ کسی اور کی چائے پینے کے روادار نہیں تھے۔

مقصود کے چائے خانے میں شوکت اور ان کے جنم جنم کے بیری منومیاں میں بھی کوئی چھپتا نہیں ہوتا تھا۔ مقصود اور منومیاں دونوں مکتب میں ہم سبق رہ چکے تھے۔ ماو مجنوں ہم سبق بودیم در لیلائے عشق " دونوں مکتب چھوڑ بھاگے تھے۔ چائے خانے میں شوکت کے بجائے مقصود اور منومیاں حریف ہوتے تھے۔ منومیاں روزانہ کے حاضر باشوں میں نہیں تھے بھولے بھٹکے آٹپکتے تھے۔ ان میں اور مقصود میں ہاتھی خانے کے روزمرے اور محاورے میں مکالمہ ہوتا تھا۔ مقصود منومیاں کی خست پر پھبتی کستا۔ منومیاں جواب میں مقصود کے حلیے پر کوئی گرماگرم فقرہ کہتے اور مقصود انھیں اٹھا کر کندھے پر لاد لیتا کہتا " ادھار کب ادا کرو گے۔ خدا معلوم اب تک کتنی چائے ڈھکوس چکے ہو۔ آج سارا حساب بے باق کرنا ہوگا۔ " منوں میاں اوپر تڑپتے۔ پھر مقصود انھیں آہستہ سے نیچے اتار دیتا۔ چائے بناتا۔ ان کے سامنے رکھتا اور کہتا۔ " لو چڑھا جاؤ۔ کیا یاد کرو گے کسی رئیس سے پالا پڑا تھا۔ " منوں میاں جواب میں کہتے۔ " تو تو گھر کا رئیس ہے۔ " شوکت یہ تماشا چپ چاپ دیکھتے رہتے۔ نہ مقصود کو شہہ دیتے نہ منو سے الجھتے۔ منو پر غصے ہوجاتے تو ان میں اور مقصود میں بیت بحثی شروع ہوجاتی۔

مغرب تک مقصود کے یہاں بڑی رونق رہتی۔ چراغ جلتے تو چھیڑ ہونے لگتی۔ فتح گڑھ میں ان دنوں بجلی عام نہیں ہوئی تھی۔ مقصود کی دکان پر ایک بڑی سی لالٹین جلتی تھی جس کی چمنی اندھی تھی کیوں کہ مقصود کو کبھی لالٹین اور چمنی صاف کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی۔ ادھر مغرب کی اذاں ہوئی۔ لالٹین جلی اور ادھر شوکت نے منھ ہی منھ میں کچھ بدبدا کر دونوں ہاتھ منھ پر اس طرح پھیرے جیسے دعا کے خاتے پر پھیرے جاتے ہیں۔ یہ ان کی رخصت کا اعلان ہوتا تھا۔ منھ پر ہاتھ پھیرتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوتے اور کوٹھی کا رخ کرتے۔ یہاں دوسری محفل جمی ہوتی۔ انگیٹھی دہکتی ہوتی پانی چڑھا ہوتا۔ شوکت آتے ہی پیالیاں کھنگالتے۔ دو ایک

چھوٹے موٹے کام اور کرتے ۔ چائے تیار ہو جاتی اور پیالیوں میں انڈیلی جاتی تو شوکت پیالیاں حاضرین میں تقسیم کرتے اور اپنی پیالی لے کر اپنی جگہ بیٹھ جاتے ۔ طلسم ہوش ربا سنتے جاتے ۔ چائے پیتے جاتے مگر میرا اندازہ ہے کہ طلسم ہوش ربا کی داستان ان کے سر سے گزر جاتی تھی ۔ وہ صرف طلسم ہوش ربا کے مصنفوں کی طول کلامی اور بات سے بات پیدا کرنے کے فن کے قائل تھے ۔ ایران کی پوچھو تو توران سے شروع کرتے تھے مگر ابا میاں اور بھائی جان سے بات کرتے تو بڑی احتیاط سے ۔ چھوٹی امت کے لوگ جن میں کسی حد تک میں بھی شامل تھا اس انداز تکلم سے ہمیشہ ستائے جاتے تھے ۔

ایک دن میں کوٹھی کے پھاٹک پر کھڑا کسی سے باتیں کر رہا تھا ۔ پھاٹک کے بالکل سامنے شہر کی سب سے لمبی گلی تھی جو اس سڑک سے شروع ہو کر بزازے اور سنگت سے گزرتی گاڑی خانے والی سڑک پر بابو دوار کا ناتھ کے مکان کے سامنے ختم ہوتی تھی اس گلی کے نکڑ پر بائیں ہاتھ کی طرف موٹے گھی والے کی دکان تھی ۔ دائیں ہاتھ پر ماسٹر رجن کا راما ہوٹل تھا جس کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا ۔ شوکت اس وقت موٹے گھی والے سے کچھ ہنسی مذاق کر رہے تھے اور راما ہوٹل کا رسوئیا ایک بڑے سے تسلے میں چولھے کی راکھ جمع کر رہا تھا ۔ اتنے میں سامنے سے ایک نوجوان نٹنی ۔ اتراتی بل کھاتی، مٹکتی اٹھلاتی، کسی کا منھ چڑاتی، کسی کو انگوٹھا دکھاتی نمودار ہوئی اور موٹے گھی والے کی دکان کے بالکل قریب آ پہنچی ۔ چہرے پر نمک، کسا ہوا بدن، چولی اور لہنگے میں پھڑکتا ہوا، سر پر چاندی کا بڑا سا چھپکا جس میں ماتھے کی طرف بک کی طرح کی ایک بڑی سی نوک ۔ پیروں میں جھانجھنیں، چھن چھن کرتی ۔ موٹے گھی والے نے اسے دیکھ کر شوکت سے سرگوشی کی ۔ کچھ اشارہ کیا ۔ شوکت ایک دم سے اٹھے ۔ زقند بھری اور سڑک پر سیدھے اس نٹنی کے بالکل سامنے آگئے ۔ دفعتہً انھوں نے جھپٹا مارا اور نٹنی کے لہنگے کا سامنے کا حصہ ہوا میں اچھال دیا ۔ ہونے والی بات لہنگے کا آگا اچھلا اور چھپکی کی نوک میں اٹک گیا نٹنی کا پورا منھ ڈھک گیا ۔ وہ بلبلا کر دوڑی گلی کی طرف وہاں ہوٹل کا رسوئیا راکھ کا تسلہ لیے کھڑا تھا ۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ تسلے کی راکھ اس نٹنی پر اچھال دی ۔ وہ غریب وہیں گلی میں پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی ۔ لہنگے کے آگے کو کانٹے سے چھڑانے لگی وہ بھی کم بخت جھاڑ کا کانٹا ہو گیا ۔ ادھر لوگوں نے ہنسنا اور قہقہے لگانا شروع کر دیے ۔ وہ ہے کہ کانٹے سے کشتی لڑ رہی اور لوگ ہیں کہ قہقہے لگا رہے ہیں ۔ خدا خدا کر کے کپڑا اس کانٹے سے چھوٹا تو وہ کوستی پیٹتی، گالیاں بکتی، بگڑتی، سنبھلتی ۔ گلی ہی میں چمپت ہو گئی ۔ شوکت مونو بلاؤ بنے گھی والے کی دکان پر چپکے بیٹھے تماشا دیکھتے رہے ۔

لگائی بجھائی کرنے والے بھی بڑے غضب کے ہوتے ہیں ۔ کسی نے شام کو یہ بات نمک مرچ لگا کر ابا میاں سے جڑ دی ۔ انہوں نے پوری بات سن کر پوچھا " اچھا ۔ شوکت نے یہ

حرکت کی" ۔ "جی ہاں میاں بڑا بد معاش آدمی ہے" ۔ ابا میاں بڑے زور سے ہنسے ۔ بولے "سالے میں ابھی کچھ جان باقی ہے" ۔ کہنے والے نے منھ کی کھائی ۔ چلا تھا آگ لگانے وہاں پانی کا چھینٹا پڑ گیا ۔

اگلے دن میں نے شوکت سے پوچھا "کیوں میاں شوکت کبھی عشق وشق بھی کیا ہے ۔ بڑے زور سے ہنسے ۔ کہنے لگے "بچوں کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرتے" میں نے کہا ۔ "کیوں کیا میں تمھیں بچہ نظر آتا ہوں" ۔ بولے "نہیں میاں میرے ۔ بچہ تو نہیں ۔ مگر یہ باتیں اچھی نہیں ہوتیں ۔ گڑے مردوں کو اکھیڑنے سے کیا فائدہ" جب انہیں یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ تو پنڈ پڑ گیا ہے ، بے سنے دم نہیں لے گا تو ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگے ۔ "میاں میرے جوانی میں جنگلی جتی سبھی ہوتے ہیں ۔ میں بھی کوئی نیک اور پارسا تو تھا نہیں ، مگر عشق کی بات کچھ اور ہے ۔ کیا کیوں نہیں ۔ اور تباہ کیوں ہوئے" ۔ "اچھا ۔ وہ کیسے" ؟ ۔ "دوڑ دوڑ کر گنگا پار اور راجے پور کیوں جاتے تھے ۔ اماں باوا سمجھتے تھے مجیب خاں بلاتے ہیں ۔ اسلم میاں ۔ کیا آدمی تھے مجیب خاں ۔ بڑے زمین دار تھے ۔ مگر یاروں کے یار ۔ میاں میرے ذرا جو غرور ہو ۔ دسترخوان پر میرے بغیر نوالہ نہیں توڑتے تھے ۔ کیا مزا آتا تھا ۔ جاڑوں کا موسم ختم ہوا ۔ ایکھ تیار ہے ۔ گیہوں کی فصل پک گئی ہے ۔ گاؤں میں بڑے بڑے کڑھاؤ چڑھے ہیں ۔ رس پک رہا ہے ۔ شہر کے یار دوستوں کے لیے رساول تیار ہو رہی ہے ۔ گرم گرم رس کیا مزا دیتا تھا اور میاں میرے ، گرم رس میں گیہوں کی بالی ڈال دو تو سالی جمال گوٹے کا کام کرتی ہے ۔ ایک دفعہ کیا ہوا ۔ مجیب خاں کے یہاں نخلو کے ایک بانکے آگئے ۔ جامے وار کی شیروانی ۔ آڑا پیجامہ ، ریشم کا کمر بند ، سر پر دو پلی ۔ بڑے نازک مزاج ، ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیں ۔ میں نے کہا ۔ آپ کے لیے گرما گرم رس لاؤں ۔ بولے ۔ "نہیں واللہ ۔ مجھے بھی کیا کوئی دیہاتی گنوار مقرر کیا ہے" پھر تھوڑی دیر کے بعد کچھ سوچ کر بڑے "رعاب" سے کہنے لگے ۔

"اچھا لے آؤ ۔ تم بھی کیا یاد کرو گے" تو میاں میرے ۔ میں نے کیا کیا کہ اس کے گلاس میں ڈالی گیہوں کی بالی اور وہ میرا نخلو کا بانکا نواب بے کھٹکے پی گیا ۔ تھوڑی دیر بعد ہوئی پیٹ میں کھد بد ۔ جب تک وہ اٹھ کر جائیں اس وقت تک ان کا وہ چوڑی دار پیجامہ جو تھا وہ سن چکا تھا ۔ بعد میں مجیب خاں کو خبر ہوئی تو پہلے بڑے بگڑے سنبھلے مگر پھر بولے ۔ تم نے اچھا کیا ۔ بڑی دون کی لے رہے تھے" میں نے چڑ کر کہا ۔ "بات کچھ اور ہو رہی تھی تم نخلو کے نواب کا قصہ لے بیٹھے ۔"

شوکت کہنے لگے ۔ میاں میرے ، بگڑتے کیوں ہو ۔ وہی تو سنا رہا ہوں ۔ تو وہیں راجے پور میں ایک لڑکی تھی ۔ بس میاں میرے کیا کہوں ۔ چلتی تو دھرتی کی چھاتی دھمکتی ۔ بولتی تو کانوں میں رس گھل جاتا ۔ ہنستی تو پھول کھل جاتے ۔ جھولے پر پینگ لیتی تو معلوم ہوتا کوندا

لہرا رہا ہے ۔ پرستان کی پری معلوم ہوتی ۔ گوری بھبھوکا رنگت ۔ ہنسنے میں گال میں گڑھا پڑتا تھا پتلے پتلے ہونٹ ۔ پان کھالیتی تو پیک کی سرخی گلے میں دکھائی دیتی ۔ آنکھوں میں بجلی کی سی روشنی اور بال تو قیامت تھے قیامت ۔ میاں میرے کیا کہوں " ۔ میں نے کہا " سب کچھ تو کہہ دیا ہے اچھے خاصے شاعر ہوگئے ہو ۔ " بولے " ہاں میاں میرے ۔ سچ مچ شاعر ہوگیا تھا ۔ بڑی غزلیں یاد تھیں ۔" وہ چلے جھٹک کے دامن ۔" یاالٰہی مٹ نہ جائے دردِ دل ۔" کسی کی خاک میں ملتی جوانی " اب تو سب کچھ بھول گیا ۔ ہائے کیا زمانہ تھا " ۔ میں نے چٹکی لی ۔ " تو وہ لڑکی اگر تھی تو تم جیسے مس مسے آدمی سے کیسے پیار کرنے لگی " ۔ شوکت نے فوراً پینترا بدلا ۔ موچھوں پر ہاتھ پھیرا ۔ کڑک کر بولے ۔ " آج مس مسے ہیں مگر آج بھی ماشاء اللہ ، اللہ رکھے ہزاروں پر بھاری ہیں ۔ میاں میرے ۔ جوانی میں مجھے دیکھتے ۔ " ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگے ۔ " اب کیا رہ گیا ہے ۔ جوانی میں میرے کس بل دیکھتے ۔ زمین میں ٹھوکر مار دیتا تو پانی نکل آتا ۔ اماں باوا نے لاڈ سے پالا تھا ۔ اصلی گھی کھاتا ۔ خالص دودھ پیتا تھا ۔ پہلوان بھی جھونک کھاتے ۔ کس کی مجال تھی جو اپنی جانب سے پنجہ لڑالے ۔ بڑے بڑوں کی ایسی تیسی کر دیتا تھا ۔ ایک دفعہ قنوج گیا تو وہاں دو تین پہلوان آئے ۔ بولے سنا ہے تم بہت بڑے پنجہ کش ہو ۔ میں نے سوچا ۔ کون مصیبت میں پڑے ۔ ان سے پنجہ لڑایا تو نہ جانے اور کتنے آدھمکیں گے ۔ بس تو میاں میرے ۔ میں نے کہہ دیا نہیں بھائی ۔ میں پنجہ کش ابخہ کش نہیں ہوں ہامی بھرلیتا تو اینچم چھوڑ گھسیٹم میں پڑ جاتا ۔ " میں نے ٹوکا " شوکت تم بہکتے بہت ہو ۔ " شوکت نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے ۔ " اسلم میاں ایک بات تھوڑی ہے ۔ ہاں تو وہ مجھ پر جان دیتی تھی ۔ بس چلتا تو میرے گلے کا ہار ہوجاتی ۔ میں بھی اس کی محبت میں باؤلا ہوگیا تھا " ارے میاں تو سیدھے سیدھے دو بول پڑھوالیتے " ۔ کیسے پڑھوالیتا یہی تو مشکل تھی ۔ میاں میرے غیر قوم سے تھی " ۔ اچھا تو پھر " ۔ پھر یہ میاں میرے یہ صلاح ہوئی کہ چپ چاپ ، راتوں رات کہیں باہر نکل جائیں ۔ مار پیچھے پکار ہوتی رہے گی ۔ اس کو سمجھا بجھا کر میں فرخ آباد گیا سوچا کچھ بند و بست ۔ کچھ سیپتا کر لوں ۔ اما باوا سے بھی مل لوں ۔ گھر آیا تو اماں لب گور ۔ دس دن کا کہہ کر آیا تھا دو مہینے لگ گئے ۔ پنجرے میں بند بلبل کی طرح پھڑ پھڑاتا رہا ۔ نہ جانے اماں کی جان کس چیز میں اٹکی ہوئی تھی ۔ خدا خدا کر کے ان کی مشکل آسان ہوئی تو میں سیوم کے اگلے دن ہی چل کھڑا ہوا ۔ ابا نے بہت روکا ۔ بگڑے سنبھلے ، بولے ۔ چالیسواں کر کے جانا ۔ ابھی سے کیوں جارہے ہو ۔ کل جی بھاوج نے بول مارا ۔ جائیں گے کیسے نہیں ۔ وہاں سنگل دیپ کی پدمنی جو ان کا راستہ تک رہی ہے ۔ آندھی بھونچال کی چال چلتا راجے پور پہنچا تو میاں میرے پہنچتے ہی دل پر ایک گھونسا لگا ۔ ہر چیز اداسی میں ڈوبی ہوئی تھی جیسے گاؤں کو کوئی لوٹ لے گیا ہو ۔ ملنے کے ٹھکانوں پر گیا تو وہاں ویرانی برس رہی تھی ۔ بڑا حیران ہوا ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر چیز پر اداسی کیوں چھائی ہے ۔ گاؤں کی ایک آدھ لڑکی نے

مجھے دیکھا تو دانت پیستی تیوری چڑھاتی غصے سے دیکھتی پیر پٹختی چلی گئی۔ میں حق حیران کہ آخر بات کیا ہے۔ ایک سے پوچھنا چاہا تو وہ تنک کر بولی "چل دھوکے باز شہر جا کر وہیں کا ہو رہا۔ شرم نہیں آتی تجھے! جا کہیں ڈوب مر۔ یہاں شکل دکھانے سے تو تیرا ڈوب مرنا اچھا ہے"۔ تو میاں میرے میں اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ فدو بھی کہیں گیا ہوا تھا۔ اسے ساری بات معلوم تھی مگر وہ گھر پر تھا ہی نہیں۔ پوچھوں تو کس سے پوچھوں۔ خدا خدا کر کے وہ شام کو گھر آیا تو آتے ہی نہ سلام نہ دعا۔ بس مجھ پر برس پڑا۔ "کیا ہو توں سوتوں کے مردے نہلا رہے تھے۔ دس دن کا کہہ کر گئے تھے اور اب دو مہینے بعد پلٹے ہو۔" "تو ہوا کیا"۔ ہوتا کیا ہے چڑیا اڑ گئی۔ "کیا ...." فدو نے اٹک اٹک کر پوری بات بتائی۔ اس کے ماں باپ کو شک تو پہلے ہی تھا۔ نکل بھاگنے کی بات اس کی ایک سہیلی نے جڑ دی۔ گاؤں کی عزت کی بات تھی۔ باپ نے چٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات کی۔ ہتھیلی پر سرسوں جمالی۔ سگائی بچپن میں کر دی تھی۔ کہہ سن کر ہاتھوں ہاتھ گونا بھی کر دیا۔ وہ سدا کا روگی سینک سلائی سا آدمی گاؤں کی سندری کو لے اڑا۔ سنا ہے جاتے وقت چھکوں پھکوں رو رہی تھی۔ سارے رستے روتی گئی۔ سارا گاؤں سونا ہو گیا۔ اور تو وہاں شہر میں رنگ رلیاں مناتا رہا۔ بڑا پاپی ہے۔ تیرا تو دل کالا ہے بالکل کالا۔"

میاں میرے! کیا کہوں دل پر کیا گزر گئی۔ اس دن میں نے پیٹ بھر کر تاڑی پی۔ اول فول بکتا، اڑ کتا، وہیں پاگل دیوانوں کی طرح پڑا رہا۔ روز روز تاڑی بھی نہیں ملتی تھی افیم کھانے لگا اور میاں میرے ایک دن جھونج میں کیترا پی لیا"۔ کیترا کیا ہوتا ہے"؟ میاں میرے وہ حکیم امین الدین جو روز آتے ہیں جنھیں تم امین چچا کہتے ہو۔ ان سے پوچھنا کیترا کیا ہوتا ہے۔ اس لیے پی لیا کیترا کہ وہ تو مجبور ہو گئی تھی۔ میں بے وفا نہ کہلاؤں۔ عورت کے قابل ہی نہ رہوں۔ ساری زندگی اسی کے نام کی مالا جپتا رہوں۔ بس دے دی قربانی اپنی جوانی کی"۔ پھر کبھی ملاقات ہوئی اس سے"۔ بس دور سے دیکھا۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ میاں میرے وہ جو لپنے بہادر شاہ تھے نا۔ ارے وہی نا جنھوں نے کہا ہے۔ مرا رنگ روپ بگڑ گیا۔ تو بس وہی بات تھی۔ گونے کے چھ مہینے بعد ہی بے چاری بدھوا ہو گئی تھی۔ ساس سسرے نے گھر سے نکال دیا کہ ابھاگن ہے پتی کو کھا گئی۔ راجے پور میں کچھ دن سسکتی رہی پھر گزر گئی۔ جب اس کی چتا کو آگ لگائی گئی تو میں بھی دور سے دیکھ رہا تھا۔ آگ کے بڑے بڑے شعلے اسے بھی جلا رہے تھے اور میرا دل بھی جلا رہے تھے۔ وہ چلی گئی۔ اسے جل کر چین مل گیا۔ میں بد نصیب اب تک زندہ ہوں اور جل رہا ہوں" شوکت تقریباً روہانسے ہو کر اٹھ گئے اور میں سوچتا رہا۔ آدمی جی دار ہے۔ کسی دوسری عورت سے دل نہیں لگایا۔ وفاداری یہی ہوتی ہے۔ یک در گیر محکم گیر۔ پھر خیال آیا۔ یہ تو اچھی خاصی فلمی کہانی ہو گئی۔ پکی ٹریجڈی۔

شام کو تلن نے سلام کر کے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے۔

یہ بھی مولوی صاحب کے چیلے تھے ۔ گرمیوں میں اسکول میں پنکھا کھینچتے تھے ۔ جاڑوں میں کھیر کے پیالے بیچتے تھے ۔ ان کی جروا پلے میں گوشت رکھ کر گھر گھر بیچتی پھرتی تھی ۔ بڑی جیو عورت تھی ۔ ایک دن تلن مولوی صاحب کے پاس پلنگ میں دنیامافیہا سے غافل بیٹھے تھے ۔ اتنے میں ان کا چھوٹا لڑکا آیا ۔ ابا ابا ایک پیسہ دے دے ۔ تلن پلنگ سے چونک پڑے ۔ لڑکے پر خوب خوخیائے ۔ ڈانٹ کر اسے بھگا دیا ۔ ذرا دیر میں تلن کی جروا چار خانے کا تہہ بند باندھے ، موٹا سا دوپٹہ لپیٹے ۔ ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا لیے آن دھمکی ۔ ڈونگ کر بولی ۔ "پیسہ کیوں نہیں دیتا ہے" تلن نے گھبرا کر تہہ بند کی انٹی سے پیسہ نکال کر پھینک دیا ۔ ماں بیٹا دونوں دفع ہو گئے ۔ تلن کی جروا کے تیور دیکھ کر تھرا مولوی صاحب بھی گئے تھے ۔ جب وہ دفعان ہو گئی تو بولے " بزرگوں نے اسی لیے عورتوں سے دور رہنے کو کہا ہے ۔ جی کا جنجال ہوتی ہیں جی کا جنجال ۔ مرد مار ، قطامہ ، آنکھ میں کوئی حیا شرم نہیں ۔

ویسے تلن بھی کچھ کم نہیں تھے ۔ بڑے چھوٹے لپاٹیے تھے ۔ اسکول میں پنکھا کھینچنے کی تنخواہ سترہ روپے ملتی تھی ۔ گھر والی کو گیارہ بتا رکھے تھے ۔ ایک دن وہ کسی کام سے انھیں ڈھونڈتی ڈھکولتی اسکول آمری ۔ باہر کھڑے تھے اسکول کے بابوجی ۔ ان سے کچھ بات ہوئی تو انہوں نے کہا " سترہ روپے تو ملتے ہیں اور کیا کسی کا گھر لے گا " بس وہ وہاں سے تو چپکی چلی آئی مگر شام کو جب تلن گھر پہنچے تو اس نے سنبھالا ڈنڈا اور میاں تلن کی ساری شیخی کرکری کر دی ۔

شوکت اور تلن میں کچھ لاگ ڈانٹ بھی تھی ۔ دونوں ایک دوسرے کی کاٹ کرتے رہتے تھے ۔ غالباً تلن کو اس بات پر تعجب ہوا ہو گا کہ میری اور شوکت کی اتنی لمبی بات کیوں ہوئی ۔ میں نے جو پوچھا کیا بات ہے تو بولے ۔ اسلم میاں ! آج تو شوکت سے خوب گھلم گتھم ہوئی ۔ کیا پٹی پڑھا رہا تھا ۔ میں نے کہا " پٹی کیوں پڑھا رہا تھا ۔ اپنے عشق کا قصہ سنا رہا تھا ۔ "

" جھوٹا ۔ سالا ۔ یہ کیا جانے عشق کس چڑیا کا نام ہے سدا کا پہاڑیا ہے جانے کیا بانک رہا ہو گا ۔ "

نہیں نہیں راجے پور کی کسی لڑکی کا واقعہ سنا رہا تھا " اچھا وہ میاں مجھ سے سنو ، اماں باوا نے نکھٹو سمجھ کر گھر سے نکال دیا تھا ۔ راجے پور میں مجیب خاں کے گھر پڑا رہتا تھا ۔ وہاں ایک لونڈیا پر ڈورے ڈالنے لگا ۔ وہ اس سے جتنا دور بھاگتی یہ اتنا ہی چپکنے کی کوشش کرتا ۔ وہ تھی گاؤں کی پٹھیا جوان ۔ بٹی کٹی ، چکنی چپڑی ، چٹکی لو تو بدن پر ہاتھ پھسل جائے اور یہ سالے مجنوں کی اولاد وہ منھ لگاتی نہیں تھی ۔ یہ خواہی نخواہی کو پنڈ پڑ جاتے تھے ۔ تنگ آکر ایک دن اس نے اپنے باپ بھائی سے کہہ دیا ۔ وہ تھے کرمی اور شورہ پشت ۔ ایک دن موقع دیکھ کر ان میاں کو پکڑ لیا اور ایسی ٹھکائی کی ، ایسی ٹھکائی کی کہ بچاجی کو چھٹی کا دودھ یاد آگیا ۔ وہ تو خیر یہ ہوئی کہ کسی نے دوڑ کر مجیب خاں کو خبر کر دی ۔ وہ دوڑ پڑے ۔ تتو تھمبو کی ۔ بڑی مشکل سے اس کی جان بچی ورنہ کرمی زندہ نہ چھوڑتے ۔ بلدی چونا تھپا اور مجیب خاں نے کھڑے کھڑے گھر

سے نکال دیا۔ بولے "میں ایسے لچے لفنگے کو اپنے یہاں رکھ کر مفت خدا کی بد نامی مول نہیں لے سکتا۔ یہ تو سدا کا بے غیرت ہے۔ کچھ دن بعد پھر انھیں کی جوتیاں چاٹنے لگا۔ وہاں جانے آنے لگا اب بھی جاتا ہے۔ یہ عشق کرے گا۔ نامرد اسالا، عورت کے قابل تو ہے نہیں۔ عشق کرے گا جوتے خور، نکھٹو "تلن دل کا بخار نکالتے رہے مگر مجھے یقین ہو گیا کہ شوکت جھوٹا نہیں ہے۔ تلن نے جو کچھ کہا بھناس ہو کر کہا اور ڈھلا طونی بانگی۔

اتفاق سے دوسرے دن سویرے سویرے امین چچا آدھمکے۔ فتح گڑھ میں وہ حکیم سیلانی مشہور تھے۔ کیمیا کے دھنی تھے سارے سارے دن جڑی بوٹیوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہتے تھے۔ گھر میں ہوتے تو چولھے پر کچھ نہ کچھ پکاتے رہتے مگر ایک آنچ کی کمی ہمیشہ رہی ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگے۔ بیٹا۔ سونا تو کب کا بن جاتا مگر سمجھ میں نہیں آتا۔ بوقلموں کہاں سے لاؤں "میں نے کہا" گرگٹ بے شمار نظر آتے ہیں۔ دِقت کیا ہے جتنے چاہے پکڑ لیجیے۔" حیران ہو کر کہنے لگے اچھا بوقلموں گرگٹ کو کہتے ہیں، بس پالا مار لیا۔ مگر ایک آنچ کی کسر پھر بھی رہی۔ ان دنوں وہ ڈھورو جنتی کے چکر میں تھے۔ سب سے پوچھتے رہتے تھے۔ ڈھورو جنتی کبھی سنا ہے؟ "شامت اعمال۔ ایک دن بھائی جان سے بھی پوچھ۔ بیٹھے" ڈھورو جنتی سنا ہے" "بھائی جان نے کہا ہاں ہاں کیوں نہیں سنا ڈھور ڈنگر کو جمع کرنے کے لیے جو آواز نکالی جاتی ہے اس کو ڈھورو جنتی کہتے ہیں" ۔ امین چچا نے یہ فقرہ سنا اور چپکے ہو رہے۔ اس وقت میں نے ان سے پوچھا۔ کیترا کیا ہوتا ہے۔ کیا خواص ہیں؟ "انہوں نے مجھے تعجب سے دیکھا۔ بولے۔ میں نے تم سے بارہا کہا ہے۔ طب کی دو چار ابتدائی کتابیں دیکھ لو اور یہ کیترے کے خواص کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ مزاجاً سرد خشک ہے۔ مانع خشونت سینہ و حلق ہے" "اور۔۔" اور کیا "میاں کتاب دیکھ لو" میں سمجھ گیا یہ اپنی زبان سے بتانا نہیں چاہتے۔ شوکت سچ کہتا ہے۔ کیترے میں ضرور کوئی مرد شکن خاصیت ہے۔

اس گفتگو کے تین چار دن بعد شوکت کوٹھی کے پھاٹک پر کھڑے تھے۔ سامنے سے دیہاتیوں کا ایک غول جا رہا تھا۔ بولے "اسلم میاں تماشا دیکھو گے" میں نے کہا "ضرور۔" انہوں نے پھاٹک سے ملی ہوئی حافظ عبدالرشید عطار کی دکان سے شربت کی ایک خالی کلیا لی۔ عورتوں کے پیچھے ہولیے۔ پھر انہوں نے آہستہ سے وہ کلیا اس طرح لڑھکائی کہ وہ ایک لڑکی کے پیر میں لگی۔ لڑکی نے پلٹ کر دیکھا۔ ہنسی اور آگے بڑھ گئی۔ شوکت بولے۔ میاں میرے ہنسی تو.... سمجھتے ہو" ۔ پھر ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو گئے۔ ذرا دیر بعد خود ہی بڑ بڑانے لگے "اب اور کیا رہ گیا ہے کلیا میں گڑ پھوڑنا اور خوش ہو جانا۔ بہت تیرے نصیب کی۔"

ایک دن شوکت کی طرم خانی دھری رہ گئی۔ برس کے برس ایک ایسا تیوہار آتا تھا جس میں دیہاتی عورتیں غول در غول سوپ ہاتھ میں لیے۔ ناچ پھٹکتی گالیاں گاتی شہروں اور

قصبوں کا رخ کرتیں ۔ جو سامنے پڑ گیا اسی پر گالیاں پڑنے لگیں ایکے والے، تانگے والے، راہ گیر، دکان دار فقیر، چھوٹے بڑے سب ان گالیوں کی زد میں آتے ۔ کچھ خیال بھی نہ کرتے ۔ بازار کی گالی ہنس کر ٹالی ۔ اتفاق سے اسی تیوہار کا دن تھا ۔ شوکت منو میاں کی چھینکوں کے گرما گرم گولے کھاکر بھرائے ہوئے پھیری کے لیے جو باہر نکلے تو دیہاتنوں کے ایک غول نے انھیں گالیوں پر دھر لیا ۔ گھبرا کر دوسری طرف بھاگے تو وہاں دوسرا غول جو پہلے غول سے بھی بڑا تھا سرے والے کی مدح خوانی کو تیار تھا ۔ جدھر جاتے وہ نغمہ، شیریں سنتے کہ روح پر وجد طاری ہو جاتا ۔ جب یہ دیکھا کہ کہیں جائے فرار نہیں ہے، دیہاتنیں ہنس ہنس کر انھیں چٹکیوں اور گالیوں پر اڑا رہی ہیں تو گھبرا کر کوٹھی کے پھاٹک میں پناہ لی ۔ کہنے لگے ۔ "ہت تیری قسمت کی ایسی تیسی" ۔ دالان میں آئے تو مولوی صاحب نے پوچھا گئے نہیں ۔ بولے گیا تھا مگر وہ چنڈالنیں پیچھا چھوڑتیں تو آگے بڑھتا ۔ سالیوں نے کوئی گالی نہیں چھوڑی ۔ اب یہ دن آن لگا ہے کہ دیہاتنیں ہمیں گالیاں سنا رہی ہیں ۔ نہ ہوا اگلا سا زمانہ ۔ نہیں تو سالیوں کے کلے چیر ڈالتا ۔ کوئی مرد ہوتا تو بتاتا ۔ ان مکھیانیوں کے منھ کون لگے ۔"

شوکت کبھی کبھی دورے پر بھی جاتے تھے ۔ راجے پور چلے گئے، اللہ گنج چلے گئے، اندر گڑھ پہنچ گئے، گنگا پار خوب گھومتے تھے ۔ اس علاقے سے انھیں بڑا لگاؤ تھا ۔ کمال گنج کا پھیرا بھی کر لیتے تھے مگر نہیں گئے تو تین میل دور شہر ۔ فتح گڑھ والے فرخ آباد کو شہر کہتے تھے ۔ فرخ آباد والے فتح گڑھ کو کینو کہتے تھے ۔ مرتے مر گئے مگر لال دروازے کے اندر قدم نہیں رکھا ۔ ساری دنیا میں ہنڈتے پھرتے مگر فرخ آباد کے قریب بھی نہ پھٹکتے ۔ گلی محلہ تو کیا شہر ہی چھوڑ دیا ۔ بھائی جب آتے منت سماجت کرتے ۔ بھتیجا سبقت بھی محبت سے بلاتا مگر شوکت سنی ان سنی کر دیتے ۔ بھاوج کا بول دل میں زہری جان بن کر اتر گیا تھا "کاہی مارے بول " احمد کے کہنے پر ایک آدھ دفعہ مولوی صاحب نے بھی سمجھایا مگر شوکت ٹس سے مس نہیں ہوئے ۔ بھتیجوں کی شادی میں بھی نہیں گئے ۔ احمد چھٹی چھماہی ان کے پاس آنکلتے تھے ۔ شوکت اپنے تخت سے احمد کو آتے دیکھتے تو بڑ بڑاتے "آ گئے خدائی خوار ۔ اب انھیں دونوں وقت کھانا ٹھنساؤ ۔ بڑے بڑے نوالے ہڑپ کریں گے ۔ بھر بھر قدے چائے ڈھکوسیں گے ۔ افیم کھائیں گے اور پھر وہی موت کا جلو ہاتھ میں ۔ اتنے میں احمد صحن پار کر کے قریب آ پہنچتے ۔ شوکت بندر کی طرح چھلانگ مار کر آگے بڑھتے "ارے میرا بھیا آگیا، اللہ نظر بد سے بچائے " دوڑ کر گلے لگ جاتے ۔ احمد سر پر ہاتھ پھیرتے ۔ دعائیں دیتے ۔ سبقت ساتھ ہوتا تو شوکت اسے بھی گلے لگاتے ۔ احمد بڑھ کر مولوی صاحب کو سلام کرتے اور بیٹھ جاتے ۔ بالکل بیٹا پھوس تھے ۔ بھویں تو بھویں پلکیں تک سفید تھیں ۔ چھوٹے سے قد کے پاکٹ سائز والے آدمی تھے ۔ دیکھ کر یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ زور سے ہوا چلی تو اڑ جائیں گے ۔ مگر بیٹا سبقت پہاڑ کا پہاڑ تھا لمبا چوڑا ۔ جوانی میں

شوکت بھی ایسے ہی ہوں گے ۔ سبقت کے نام سے بھی یہ گمان ہوتا تھا کہ شوکت کے نام پر رکھا گیا ہے ۔ احمد تھے تو ٹھگنا پھوس مگر بڑے کائیاں اور خوراک بھی بڑی ڈبل تھی ۔ شوکت سے دگنی تگنی ۔ آتے ہی اندر سلام کہلواتے ۔ "آپا سے سلام ضرور کہہ دینا" آپا جگت آپا تھیں بیگم صاحبہ نہیں تھیں ۔ ہمارے خاندان میں بیگم صاحب صرف اماں جان ، ہماری دادی تھیں ۔ آپا سلام سن کر ہنستیں ۔ "لو اور سنو ۔ یہ مردا بھی مجھے آپا کہتا ہے" سلام دراصل اس بات کا اعلان ہوتا تھا کہ ہم نازل ہوگئے ہیں ۔ ہمارا کھانا بھی دونوں وقت آنا چاہیے ۔ شوکت کے کھانے کے ساتھ ان کا کھانا بھی آتا ۔ دونوں بھائی کھانے بیٹھتے ۔ احمد واقعی بہت بڑے بڑے نوالے کھاتے تھے ۔ خدا معلوم نگلتے کیسے تھے ۔ سو کھی چٹائی کرتے تھے ۔ کیا مجال جو کھانے کے بیچ میں ایک بوند پانی پی لیں ۔ پانچ چھ روٹیاں آسانی سے ڈکار جاتے تھے ۔ شوکت منٹھل منٹھل کر دو روٹیاں حلق کے نیچے اتارتے ۔ سبقت بھی کھانے میں احمد کی حقیقی اولاد تھا ۔ احمد کو مہمان سمجھ کر مولوی صاحب افیم بھی پلوادیتے تھے ۔ احمد آتے تو سدا بسورتے ہوئے ۔ کنگیاں بناتے تھے ۔ سدا یہی رونا روتے رہتے کہ جاپان والے بڑے خبیث ہیں ۔ ربڑ کی کنگیاں بنا بنا کر بھیجتے ہیں ۔ سینگ کی کنگھیوں کو اب کوئی نہیں پوچھتا ۔ سالوں نے منھ سے رزق چھین لیا ہے ۔ مولوی صاحب صلاح دیتے "کوئی اور کام کیوں نہیں کرتے" احمد بسور کر جواب دیتے مارو کرنے کوئی اور کام آتا ہی نہیں ہے" تین چار دن موج کرنے کے بعد احمد جب رخصت ہوتے تو شوکت سے ایک آدھ روپیہ بھی جھاڑ لیتے ۔ چلتے وقت شوکت کو یاددہانی کراتے ۔ گھر ہو جاؤ ۔ تمھاری بھاوج تمھیں بہت یاد کرتی ہیں ۔ تم نے جیسے قسم کھالی ہے ۔ کتنا کتنا کہا ۔ کماشدا کے بیاہ میں بھی نہیں آئے ۔ "سارا گھر سونا سونا معلوم ہوتا تھا" شوکت سر ہلا کر کہتے ۔ "بس دو چار دن میں پھیرا کروں گا ۔ ہاں کماشدا اپنے اپنے گھر خوش تو ہیں کوئی بال بچہ ؟ احمد آنے کا وعدہ لے کر چھوٹے چھوٹے قدموں سے چل دیے ۔ شوکت انھیں اکیوں کے اڈے پر چھوڑ کر بکتے جھکتے واپس آجاتے ۔

ایک دفعہ شوکت گنگا پار گئے ہوئے تھے ۔ گئے تھے بات کو رہ گئے رات کو ۔ ہفتے دس دن کا کہہ گئے تھے ۔ ایک مہینہ ہو گیا ۔ ایک دن بھائی جان کو خیال آیا مولوی صاحب سے پوچھا "شوکت نظر نہیں آتا" مولوی صاحب نے کہا "احسن میاں! ایک ہفتے کا کہہ کر گنگا پار گیا تھا ۔ ایک مہینہ ہو گیا ہے" بھائی جان کچھ فکر مند سے ہوگئے ۔ کہنے لگے بیمار ویمار نہ ہو گیا ہو ۔ پھر مجھ سے بولے "تم صبح راجے پور چلے جاؤ ۔ اسے لے آؤ" ۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں ۔ گرمیوں کی چھٹیوں کی ابتدا تھی گھر میں بور ہو رہے تھے ۔ دوسرے دن صبح سویرے گھٹیا گھاٹ کے کشتیوں والے پل سے گنگا عبور کی ۔ دوپہر کو رائے پور پہنچے ۔ بڑی کوفت ہوئی ۔ معلوم ہوا کہ شوکت یہاں سے آٹھ میل دور کسی اور موضع میں ہیں ۔ شام تک وہاں پہنچے شوکت وہاں بھی نہیں تھے ۔

پھیری پر نکلے ہوئے تھے ۔ دو چار آدمی ادھر ادھر دوڑائے گئے اور شوکت ہانپتے کانپتے آپہنچے ۔ خوشی سے باچھیں کھلی جارہی تھیں ۔ "میاں نے بلایا ہے ۔ سنا! میاں میرے اتا چاہتے ہیں شوکت کو ایک مہینے سے نہیں دیکھا تو اسلم میاں کو بھیجا ۔ جاؤ لے آؤ جا کر ۔ میاں میرے! یہ ہوتی ہے محبت اور میاں میرے خاندانی رئیسوں کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے " پھر انہوں نے سنایا کہ ایک دن عین دوپہریا میں پھیری لگانے نکلے تو لو لگ گئی ۔ بے ہوش پڑے رہے ۔ خدا خدا کر کے ٹھیک ہوئے ہیں ۔ شام کو بڑے زور کا کھانا ہوا ۔ اینٹھ کا دن تھا اس لیے گوشت تو ملا نہیں ۔ کھانے میں ارد کی دال تھی ، پھریری ، ایک اک دانہ گھی میں تر بتر ۔ انڈوں کا سالن ۔ گھٹی سکی گرما گرم روٹیاں چپراں اور دو دو خربوزے تھے ۔ پپیتا پور کے تو نہیں تھے مگر شہد میں ڈوبے آم تھے ۔ رات کو سوتے وقت بھینس کا خالص دودھ خوب کڑھا ہوا بالائی دار چپرالی دوسرے دن ہم لوگ سویرے سویرے نکلے ۔ شام ہوتے ہوتے گھر آگئے ۔ بھائی جان شوکت کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے ۔ شوکت تھے کہ خوشی کے مارے ان کے پیروں میں لوٹے جارہے تھے ۔ میاں میرے ۔ میاں میرے کی رٹ لگائے تھے ۔ بھائی جان نے خلاف عادت شوکت کی حسب حال سنسنی خیز تقریر بھی دل لگا کر سنی ۔

شوکت کبھی کبھی کمال گنج کا پھیرا بھی کرتے تھے ۔ یہ قصبہ فتح گڑھ سے نو میل کے فاصلے پر ہے ۔ محمد خان بنگش کے چیلے کمال خان کا آباد کیا ہوا ۔ سنا ہے شاہی عہد میں یہاں پانوں کی بڑی منڈی تھی ۔ ہمارے زمانے میں منڈی ونڈی ختم ہو چکی تھی ۔ منگل اور جمعہ کو پینٹھ لگتی تھی ۔ یہاں کے ایک حلوائی پیارے کی دکان کی گجیاں بھائی جان کو بہت پسند تھیں ۔ کھویا ہی کھویا ہوتا تھا ۔ منھ میں رکھا اور گھل گیا ۔ پیارے یہ گجیاں آٹھ آنے سیر بیچتا تھا مگر بھائی سے چھ آنے سیر کے دام لیتا تھا ۔ بعد میں وہ کھوئے کی منڈی میں تولا ہو گیا تھا ۔ مٹھائی کا کام چھوڑ دیا تھا ۔ بھائی جان ہمیشہ اس بات پر افسوس کرتے تھے ۔ کمال گنج کے نمبر دار واجد خان بھائی جان کے بڑے گاڑھے دوست تھے ۔ دونوں کے مزاج بالکل الگ تھے مگر دوستی پکی تھی ۔ واجد خان نمبر دار بھی تھے ۔ پہلوان بھی تھے ۔ گھٹا ہوا سر ، ٹوٹے ہوئے کان ، شیر کا سا کلہ جبڑا ، چوڑا سینہ ، چوڑا چکلا باز ، بڑے بڑے اور مضبوط ہاتھ پیر مگر شراب کے دھتی تھے ۔ بہت پیتے تھے ۔ ڈٹ کر پیتے تھے ۔ شرابی کبابی نمبردار کی زمین داری جائیداد سب شراب کے میلے لگ جاتی مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اکلوتا بیٹا ماجد خان باپ کے بالکل الٹ نکلا ۔ وہ شرابی ، یہ پارسا ۔ وہ فقط کالے اچھر پہچانتے تھے اس نے اپنے شوق سے بھائی جان کی نگرانی میں میٹرک پاس کر لیا ۔ باپ لکھ لٹ تھے ۔ اس نے قصبے میں بساط خانے کی بڑی سی دکان کھول دی ۔ باپ کا دست نگر نہیں رہا ۔ آلو کا کاروبار شروع کر دیا ۔ بڑی ترقی کی ۔ باپ طنزاً کہا کرتے تھے ۔ راج پوت گھرانے میں سالا بنیا پیدا ہوا ہے ۔ سالے بنئے نے اپنے لیے دو منزلہ مکان بنوا لیا ۔ خاندانی

جائیداد جو واجد خان کی رنگ رلیوں کی وجہ سے رہن تھی چھڑالی - سارے قصبے میں واجد خان کی بدمستیوں اور ماجد خان کی بھلی منساہت کی دھوم تھی -

ہم لوگ بھی اکثر کمال گنج جاتے رہتے تھے - لاری سے - اکے سے ، ریل سے - شام کے پونے چار بجے ریل ادھر جاتی تھی - پنیٹھ کے دن ساڑھے تین بجے گھر سے نکلے - ریل میں بیٹھے چار بجے کمال گنج پہنچے - اسٹیشن قصبے ہی میں تھا - بازار کا چکر لگایا - وہیں واجد خان مل گئے - خاطر تواضع ہوئی - پھر ماجد خان کی دکان پر جاکر بیٹھ گئے - بھائی جان اپنے دوست داروغہ اولاد احمد سے ملنے پولیس اسٹیشن چلے گئے - میری اور ماجد خان کی اچھی گھٹتی تھی - مغرب کے بعد کھانا ہوا ، بات چیت ہوئی ساڑھے آٹھ بجے اٹھے - اسٹیشن آئے - ٹھیک پونے نو بجے ریل آئی اور ہم لوگ سوار ہو کر نو بجے فتح گڑھ پہنچ گئے - سفر بھی ہو گیا - تفریح بھی ہو گئی -

ایک شام ہم لوگ کمال گنج پہنچے تو حسبِ معمول واجد خان سے بازار میں ملاقات ہوئی - کرسی پر ڈٹے ہوئے تھے اور کسی قدر سرور کے عالم میں تھے - یہ ذرا چونکا دینے والی بات تھی کیوں کہ ان دنوں صوبے میں کانگریسی وزارت تھی - اس وزارت نے صوبے کے بعض اضلاع میں نشہ بندی کر رکھی تھی - فرخ آباد بھی ان اضلاع میں شامل تھا - نشہ بندی کے باوجود واجد خاں کا سرور کے عالم میں ہونا واقعی چونکا دینے والی بات تھی مگر یار کی یاری سے کام یار کے فعلوں سے کیا کام کے مطابق بھائی جان کچھ بولے نہیں - واجد خان کے پاس ہی شوکت زمین پر پالتی مارے بیٹھے تھے - ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے - آگے پیچھے پھرتے رہے - پھر ہم لوگ ماجد خان کی طرف چل دیے -

اس شام کھانے کے بعد باتوں کا سلسلہ ذرا طول کھینچ گیا - ہم لوگ دوڑتے بھاگتے اسٹیشن پہنچے تو " گاڑی گزر چکی تھی پٹری چمک رہی تھی - " پیچھے پیچھے ماجد خان بھی تیز تیز قدموں سے چلتے آئے - بولے - " آج رات یہیں رہیے - صبح چلے جائیے گا - ویسے تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی لاری بھی جائے گی مگر آپ لاری سے نہ جائیے - " ہم باپ بیٹے ان کے ساتھ واپس چلے گئے انھوں نے اپنے آبائی مکان میں ڈیوڑھی کے پاس والا بڑا کمرہ کھلوایا - اس میں چھ سات پلنگ بچھے تھے - پلنگوں پر صاف ستھرے بستر - خوب اچھی روئی بھرے بڑے بڑے لحاف جن پر فرخ آباد کے ریشمی ابرے - صاف ستھرا بڑا سا لیمپ - رات کو خاصی دیر تک بات چیت ہوتی رہی پھر ماجد خاں سامنے اپنے مکان میں چلے گئے - ہم لوگ اپنے اپنے پلنگ پر دراز ہو گئے - اتنے میں کمرے کا دروازہ کھلا اور واجد خان ڈولتے ہنکارتے ہاتھ میں بوتل لیے اندر داخل ہوئے - پیچھے پیچھے گلاس لیے ہوئے شوکت - واجد خان شام کو سرور کے عالم میں تھے مگر اس وقت بھائی جان کے بقول " آدمی سے الو بنے ہوئے تھے - " نشے میں لہرا رہے تھے - بوتل شوکت کی طرف بڑھا کر بولے - " جلدی لا - " شوکت نے گلاس بھر کر ان کے حوالے کیا اور وہ آہستہ آہستہ پینے

لگے ۔ ایکا ایکی ان کی نظر ہم دونوں پر پڑی ۔ تھوڑی دیر تک سکتے کے عالم میں رہے ۔ خالی گلاس شوکت کی طرف بڑھا دیا اور آنسوؤں سے رونے لگے ۔ " لعنت ہو ہمارے اوپر ۔ لعنت ہو ہمارے اوپر ۔ بیٹا لیٹا ہوا ہے ۔ ماشٹر لیٹے ہوئے ہیں اور ہم بہن.... شراب پی رہے ہیں ۔ لعنت ہو ہم پر ۔ " بھائی جان میٹرک پاس کر کے گورنمنٹ اسکول فتح گڑھ میں ماسٹر ہو گئے تھے ۔ ابا میاں بڑے ناراض ہوئے ۔ بہت بگڑے مگر بھائی جان اسکول میں پڑھاتے رہے ۔ ابا میاں کی گھڑکیاں اور ڈانٹ ڈپٹ جو کام نہ کر سکی وہ ترک موالات کی تحریک نے کیا ۔ نان کوآپریشن شروع ہوا تو بھائی جان نے بہت سے نوجوان مسلمانوں کی طرح فوراً استعفی دے دیا مگر سارا شہر انھیں ماسٹر صاحب کہتا رہا ۔ واجد خان بھی انھیں " ماشٹر " ہی کہتے تھے ۔ اب واجد خان ہیں کہ پیے جا رہے ہیں اور روئے جا رہے ہیں ۔ یہی رٹ لگی ہے کہ لڑکا لیٹا ہوا ہے ۔ " ماشٹر " لیٹے ہوئے ہیں اور ہم سالے پیے جا رہے ہیں ۔ ایکا ایکی شوکت کی طرف جھک پڑے ۔ یہ سب اس سالے شوکت کی شرارت ہے ۔ پیر سے جوتا اتار کر دھڑا دھڑ شوکت کے سر پر مارنے لگے ۔ شوکت ہیں کہ چپ چاپ جوتے کھا رہے ہیں اور نمبردار آنسو بہا رہے ہیں ۔ بین کر رہے ہیں " اس وقت شوکت کی وہی مثل تھی کہ ناحق چوٹ جلاہا کھائے ۔ " بوتل ختم ہو گئی تو بھائی جان نے واجد خان سے کہا ۔ " واجد اب تم سو جاؤ ۔ " واجد خان پھر ہنکارے " سو کیا جاؤں ۔ ارے کیا منھ دکھاؤں تم لوگوں کو ۔ زہر کھاؤں ، موت آجائے ، لڑکا کیا کہے گا دل میں ۔ " بھائی جان نے سہارا دیا ۔ ایک طرف سے شوکت نے ہاتھ لگایا ۔ نمبردار کو بستر پر ڈھکیلا پھر بھائی جان نے شوکت کو ڈانٹا ۔ لیٹ کیوں نہیں جاتے ۔ شوکت فوراً گڑی مڑی ہو کر نیچے دری پر پڑ رہے ۔ نمبردار کب لیٹے کب سوئے یہ تو مجھے معلوم نہیں مگر میں نے یہ ضرور دیکھا کہ ماجد خان بت بنے دروازے میں کھڑے ہیں ۔ ان کا بس چلتا تو اپنی اور واجد خان کی جان ایک کر دیتے ۔

صبح کو جب میری آنکھ کھلی تو واجد خان بے سدھ پڑے زور زور سے خراٹے لے رہے تھے ۔ شوکت دری پر سکڑے پڑے تھے ۔ ناشتے کے بعد ہم لوگ صبح نو بجے والی ٹرین سے واپس آ گئے ۔ شوکت دس پندرہ دن غائب رہے ۔ اس کے بعد چپ چاپ لوٹ آئے مگر بھائی جان کے سامنے نہیں پڑے ۔ چوروں کی طرح چھپتے رہے ۔ کب تک چھپتے رہتے ایک دن سامنا ہو گیا ۔ بھائی جان نے ان سے کچھ کہا نہیں ۔

شوکت موقع محل کی مناسبت سے بُل بلاتے بھی تھے اور بلبلاتے بھی تھے ۔ بل بلانا اس وقت ہوتا جب وہ اپنی اہمیت جتاتے اور بلبلاتے اس وقت تھے جب ہم میں سے کسی کو تکلیف میں دیکھتے ۔ ایک دفعہ یہ ہوا کہ دوپہر کے سناٹے میں ایک لڑکے نے چھوٹے دالان میں رکھی ہوئی ایک الماری کا تالا توڑ لیا ۔ شامت اعمال شوکت پلنگ سے چونکے تو ان کی نظر پڑ گئی اب جو وہ بل بلائے ہیں تو سارے پاس پڑوس کے آدمی جمع ہو گئے ۔ شوکت ہیں کہ ہنکار رہے

ہیں۔ پولیس والے آگئے ۔ایکا ایکی شوکت کو کچھ خیال آیا ۔ زنانے مکان کی طرف دوڑے اور جو بلبلاکر پکارنا شروع کیا ہے تو بھائی جان گھبرا کر باہر نکل آئے ۔ شوکت نے انھیں چھوٹے دالان کی طرف کھینچا ۔بھائی جان کو جب پوری بات معلوم ہوئی تو انھوں نے چاہا کہ لڑکے کو چھوڑ دیا جائے کیوں کہ وہ پاگل مشہور تھا مگر پولیس والے اسے پکڑ کر لے گئے ۔ مقدمہ چلا ۔ اس لڑکے کو تین مہینے کی سزا ہو گئی ۔ مقدمے میں خاص گواہ شوکت تھے جو زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ عدالت میں پیش ہوئے ۔ سنا ہے کہ جب وہ عدالت میں میاں میرے ۔ میاں میرے کی گردان کرتے تو حاکم عدالت انھیں تنبیہہ کرتا مگر شوکت تو شوکت تھے اپنی ہی کہتے رہے ۔

۴۶ء میں مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا ۔ آپا کہتی تھیں کہ جب میں ۱۹۱۸ء میں بیاہ کر لکھنو سے فتح گڑھ آئی تھی تو مولوی صاحب مہمان کی حیثیت سے موجود تھے ۔ مولوی صاحب کے مرنے سے شوکت پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ۔ بالکل بے سہارا ہو گئے ۔ افیم کا آسرا بھی جاتا رہا ۔ پیر کوڑی کا جو سہارا تھا وہ بھی ختم ہو گیا ۔ میں ان دنوں لکھنو گیا ہوا تھا ۔ واپس آکر شوکت کو دیکھا تو افسوس ہوا ۔ ان کی حالت پر نہیں بلکہ صبح شام کی رونق اور مجمع کے اجڑنے پر ۔ مولوی صاحب روزانہ صبح "مدینہ" اخبار بہ آواز بلند پڑھتے تھے ۔ دو چار سننے والے بھی ہوتے تھے ۔ یہ شغل کوئی دو گھنٹے جاری رہتا تھا ۔ بیچ بیچ میں فال کھلوانے اور تعویذ لینے والے بھی آتے رہتے مگر اخبار کی پڑھائی جاری رہتی ۔ مدینہ ہفتے میں دو بار شائع ہوتا تھا ۔ اس کی لوح پر عزیز لکھنوی کا شعر

معجزہ شق القمر کا ہے مدینے سے عیاں مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

چھپا ہوتا تھا مولوی صاحب نے ایک دن اس شعر کو مہمل قرار دیا تھا ۔ مولوی صاحب کی صبح کی محفل خاص تھی ۔ خاص خاص لوگ آتے تھے ۔ شوکت اس میں مارے باندھے شریک ہوتے تھے کیوں کہ اخبار کے مضامین ان کے سر سے گزر جانے والی چیز تھے ۔ شام کی محفل میں مجمع زیادہ ہوتا تھا مگر مولوی صاحب کے اٹھ جانے سے دونوں محفلیں اجڑ گئیں ۔ کچھ دن تک صبح اور شام کچھ لوگ جمع ہوتے رہے ۔ بھائی جان اخبار بھجوا دیتے تھے ۔ وحید خان نے کچھ دن پڑھ کر سنایا پھر وہ قائم گنج چلے گئے اور کوئی پڑھنے والا تھا نہیں ۔ شام کو بھی یہی صورت پیش آئی ۔ چائے تو خیر جوں توں کر کے بن جاتی مگر طلسم ہوش ربا کون سنائے ۔ رفتہ رفتہ دالان میں سناٹا ہو گیا صرف شوکت رہ گئے یا فقیر محمد خاں فقیر محمد خاں نے اپنی وضع داری نہ چھوڑی ۔ روزانہ دوپہر کو سائیکل پر یاقوت گنج سے آنا ، دالان میں لیٹنا بیٹھنا ، حقہ گڑگڑانا ، افیم پینا ، شام کو مقصود کی دکان پر چائے پینا اور پھر واپس جانا ۔ فقیرے ددّو کے اس معمول میں کوئی فرق نہیں آیا ۔ جس طرح مولوی صاحب کی زندگی میں آتے تھے اسی طرح آتے رہے ۔ باقی لوگ رفو چکر ہو گئے ۔ کوئی ٹھیا نہیں رہا ۔ کبھی کبھی کوئی آن ٹپکتا تو بھائی جان بڑی توجہ سے اس کا حال سنتے ۔ شوکت

بھی لنگوٹی لگائے آ بیٹھتے ۔ آنے والے کو چائے پلوانے میں بڑی مستعدی دکھاتے مگر ان کی حیثیت ہارے ہوئے بڑے لشکر کے آخری سپاہی کی سی ہو گئی تھی ۔ نہ میدان ، نہ ہتھیار ، نہ ساتھی اور نہ دشمن کیونکہ ان کی حالت دیکھ کر منو میاں اور مقصود دونوں نے ان پر فقرے کسنا بند کر دیے تھے اور وہ خود بھی ہر وقت منھ لٹکائے رہتے تھے ۔ پھیری کو نکلتے تو آواز میں کرارا پن نہ ہوتا ۔ مول تول میں بھی جھگڑا کم کرتے تھے ۔ کئی کئی دن پھیری پر نہ جاتے تخت پر لیٹے بیٹھے اونگھتے رہتے ۔ احمد اور سعادت خیر خیریت کو آتے تو انھیں دیکھ کر بھی گم سم بیٹھے رہتے ، سیدھے ہاتھ میں رعشہ آگیا تھا ۔ بھائی بھی کم دیتا تھا ۔ ایک دن بڑے رازدارانہ طریقے سے مجھ سے کہنے لگے ۔ "میاں میرے ۔ یہ رعشہ وعشہ نہیں ہے ۔ مولوی صاحب زندہ تھے تو کسی جن کی مجال نہیں تھی کہ شرارت کر سکے ۔ وہ اٹھ گئے تو کسی جن نے یہ شرارت کی ہے ۔ اب میاں میرے کوئی توڑ کرنے والا تو ہے نہیں ۔ ساری زندگی کو روگ لگ گیا ۔ ہائے مولی صاب ۔ ہائے مولی صاب ۔"

ایک شام شوکت کوٹھی سے نکل کر مقصود کی دکان جا رہے تھے ۔ کم دکھائی دینے کی وجہ سے کنارے کنارے چل رہے تھے ۔ سامنے سے ایک نو سکھیا اناڑی سائیکل لہراتا آرہا تھا ۔ ایک دم سے شوکت کے سامنے آگیا ۔ بدحواسی میں سائیکل ان کے اوپر پیل دی ۔ شوکت وہیں ڈھیر ہو گئے ۔ راہ گیر ، دکاندار دوڑ پڑے ۔ بعض نے اس نو سکھیے کی پٹائی شروع کر دی ۔ کسی نے دوڑ کر بھائی جان کو خبر کی ۔ بھائی جان شوکت کو فوراً ہسپتال لے گئے ۔ ڈاکٹر ان کا دوست تھا ، ہیڈ کمپاؤنڈر مولوی ہدایت اللہ جنھیں سب لوگ "اللہ میاں" کہتے تھے روز کے آنے والے ۔ ایکس رے ہوا ۔ معلوم ہوا کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے ۔ آپریشن ہوا ۔ بڑی عمدہ دیکھ بھال ہوئی ۔ بڑی توجہ سے علاج ہوا ۔ کچھ دن بعد شوکت ہسپتال سے فارغ کر دیے گئے ۔ خدا معلوم ہڈی صحیح جڑی نہیں یا کوئی اور بات ہوئی کہ شوکت چلنے کے بجائے گھسٹنے لگے ۔ دن بھر دالان میں پڑے رہتے ۔ دوپہر کو فقیر محمد خان آجاتے ۔ ان سے باتیں کرتے رہتے ۔ کچھ دکھ سکھ بیان کرتے ۔ کچھ زمانے کی بے وفائی اور کچھ مولوی صاحب کا تذکرہ ہوتا ۔ شام ہوتی تو گھسٹتے ، کوڑھتے مقصود کی دکان پر جا پہنچتے ۔ ایک کونے میں بیٹھے رہتے ۔ مقصود نے لاکھ چاہا کہ ان سے چائے کے پیسے نہ لے مگر وہ تو ناک پر مکھی بیٹھنے کے روادار نہیں تھے ۔ چائے پینے سے پہلے اکنی نکال کر مقصود کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے ۔ پیسے آتے کہاں سے تھے ۔ یہ ایک معمہ تھا ۔ میں نے کئی بار بھائی جان سے پوچھا مگر وہ ہنس کر خاموش ہو جاتے اور اگر کچھ کہتے تو یہ کہ "میاں اللہ تعالیٰ بڑا کارساز ہے ۔ "کارساز ما بہ فکر کار ما" میرا خیال ہے کہ وہ برملا اظہار سے اپنی نیکی کا ثواب ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے ۔

صبح کو روزانہ بڑی پابندی سے بجن اور جناب علی شوکت کے پاس آتے ۔ بجن ان کے

لیے پوست کے چھلکے بھی لاتے تھے ۔ جناب علی انھیں ابلتے اور شوکت انھیں نوش جاں فرماجاتے ۔ ہفتے عشرے میں تلن بھی پھیرا کرتے تھے ۔ دوچار باتیں جلی کٹی کہتے ۔ ایک دن سبقت کچھ روزگار مندا ہونے کا شکوہ کر رہے تھے ۔ شوکت سنتے رہے سنتے رہے ۔ پھر تاؤ کھاکر بولے ۔ "میاں میرے ۔ کام کوئی ہو ۔ محنت کرنا پڑتی ہے ۔" پھر کڑک کر بولے ۔ "لو لے جاؤ یہ میری روزی کا ٹھیکرا ۔ کل سے پھیری لگاؤ ۔ اللہ برکت دے گا ۔" ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگے ۔ "سوچاتھا ٹھیک ہو جاؤں گا تو پھیری پر نکلا کروں گا مگر اب تو میاں میرے یہ دکھائی دیتا ہے کہ قبر کا کونا ہی آباد کروں گا ۔ لے جاؤ ۔ میرا منھ کیا دیکھ رہے ہو" سعادت مند بھتیجا معذور چچاکی روزی کا ٹھیکرا خوشی خوشی اٹھالے گیا ۔

پاکستان بناتو میں کراچی آگیا ۔ نئی زندگی ، نئی فضا ، نیا ماحول ۔ ایک دن بھائی جان کا خط آیا" شوکت کاانتقال ہو گیا ۔ سائیکل سے ٹکرانے کے بعد معذور ہو گئے تھے ۔ شام کو کسی نہ کسی طرح کڑھتے مقصود کی دکان پر چلے جاتے تھے ۔ مرتے مر گئے مگر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا ۔ وضع دار تھے ۔ اب دالان میں بالکل سناٹا ہو گیا ہے ۔ اس طرف خاک اڑتی ہے ۔ ہم سب بھی ایک دن خاک ہو کر اڑجائیں گے ۔ وضع داری کی داستانیں کتابوں میں لکھی رہ جائیں گی ۔"
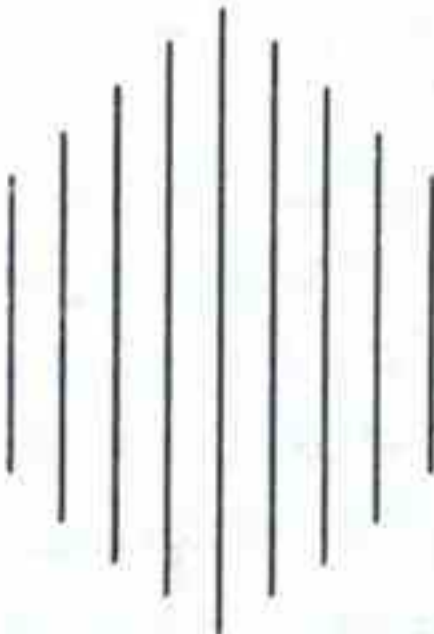
چندر موہن

ترجمہ: قاسم ندیم

سونی گلی

(عصری ہندی ادب سے "سوغات" کے لیے بہ طور خاص دو کہانیوں کا ترجمہ (۱) سونی گلی (چندر موہن پردھان) اور (۲) دھواں دھواں اونچائی (مہیپ) پیش کر رہا ہوں۔ یہ کہانیاں مسلم معاشرے کو مد نظر رکھ کر بنی گئی ہیں۔ دونوں کہانیوں میں مثبت اور منفی پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ انھیں پڑھنے کے بعد خود اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دیگر زبانوں کے تخلیق کار مسلم معاشرے کو کس نگاہ یا زاویے سے پیش کر رہے ہیں۔ اس سے واقفیت اردو زبان کے قارئین کو ہو اس لیے میں نے ان کا ترجمہ کیا ہے۔ کہانیوں پر قارئین کی رائے کا منتظر رہوں گا ----قاسم ندیم)

نثار میاں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی، پونے آٹھ ---- انھیں شک ہوا، پھر سالی کہیں بند تو نہیں ہو گئی۔ ہلا ڈلا کر دیکھا، کان کے پاس لگایا، نہیں گھڑی ٹھیک ہے، وہ لیٹ نہیں ہوں گے۔

جلدی سے اسٹو جلا کر چائے کا پانی رکھ دیا۔ رات کا رکھا ہوا دودھ تھا ہی، چائے بننے میں کتنی دیر لگتی ہے، لیکن بسکٹ! انھیں خیال آیا، بسکٹ ختم ہو گئے ہیں، کل لانا ہی بھول گئے تھے۔ ادھر ادھر ہاتھ مارا۔ کچھ نہیں ملا۔ لعنت ہے۔ آج صرف چائے پی کر دوڑنا پڑے گا۔ آتے وقت بسکٹ لانا ضروری ہے۔

دیگر ساتھیوں کی طرح وہ ناشتہ پانی کر کے ٹفن لے کر کارخانے نہیں جا پاتے۔ کبھی رات کا کچھ بچا لیا، یا کبھی سویرے موقع نکال کر کچھ بنا لیا تو بات اور ہے۔ ورنہ دوپہر کے ٹفن ٹائم میں ہی کھانا کھا پاتے ہیں۔ مجرد ہونے سے اور کیا ہو گا؟ گھر تو گھر والی کا ----

انھوں نے حسرت کے ساتھ ادھر ادھر دیکھا۔ چھوٹا سا گھر ہے۔ جانے کب کا بنا ہوا۔ تین کمروں میں ایک میں تو باورچی خانہ ہے اور ایک چھوٹا سا آنگن۔ اگر گھر والی ہوتی تو اس چھوٹے سے آنگن میں ہی چھوٹا سا باغیچہ ہوتا۔ گھر تو سچ مچ گھر والی کا مرہون منت ہوتا ہے۔ ورنہ نثار میاں کیا ہیں، جیسے کوئی مسافر خانے میں ٹھہرا ہوا ہو۔ وہ اکثر تصور کرنے لگتے ہیں کہ آٹھ بجے تک مزے سے بستر گرما رہے ہیں۔ بیوی پیار سے انھیں اٹھاتی ہے، اب چائے بھی پیو گے یا پڑے ہی رہو گے۔

پانی ابلنے کی آواز نے چونکایا۔ رنگ برنگے خواب غائب۔ پھر وہی کنج قفس۔ پھر وہی صیاد

کا گھر! سامنے وہی مٹیالا بوسیدہ گھر۔ ابو میاں کے زمانے کے بکسے، ٹرنک، ان کی اپنی خریدی ہوئی الماری۔ امی کی انھیں یاد نہیں ہے۔ ابو کہتے تھے، جب وہ کل چار پانچ سال کے رہے ہوں گے، تبھی کالاآزار میں چل بسی تھیں۔ لوگوں سے سنا ہے، ابا کسی عورت کو لے آئے تھے۔ پتہ نہیں شادی کر کے یا ایسے ہی۔ وہ نیک بخت مہینے بھر میں ہی جو ہاتھ لگا لے کر گھر پر اپنے حساب سے گویا جھاڑو پھیر گئی۔ تب سے ابا کسی عورت کے چکر میں نہیں آئے۔ عورت ذات سے انھیں نفرت سی ہو گئی۔ شاید وہی نفرت نثار میاں کو بھی ورثے میں ملی تھی۔

چائے کے گرما گرم گھونٹ گلے کے نیچے اتار کر انھوں نے شیشے میں دیکھتے ہوئے بال سنوارے۔ چہرہ اچھا خاصہ تو ہے۔ ابھی کوئی کہہ نہیں سکتا کہ نثار میاں تیس پار کر گئے ہیں۔ داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ابھی کل ہی بنائی ہے، اب کل سہی۔

گلی میں حسبِ معمول گندگی ہے۔ وہ کوڑے سے بچتے بچاتے چل دیے۔ سبحان میاں کی دکان سے ایک بنڈل بیڑی خریدی، پان منھ میں دبائے اور یسین کے دروازے پر آکر آواز لگائی، اما، یسین میاں ہو۔۔۔۔"

فوراً ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر یسین کی چھوٹی بیٹی نسیمہ نکل آئی، جھبرے بال ہلاتی، بڑی بڑی آنکھوں سے انھیں پہچان کر چلائی۔"ابا" نثار چاچا آئے ہیں۔"

یسین میاں نے اندر سے ہی کہا، ٹھہرو یار، ابھی آیا۔ پھر ذرا آواز دھیمی کر کے بولتے رہے،"بیگم صاحبہ کا مزاج تو ہمیشہ ساتویں آسمان پر رہتا ہے۔"

نثار میاں وہیں پڑے ہوئے موڑھے پر بیٹھ گئے۔ کان اندر ہی لگے ہوئے تھے۔ بیگم صاحبہ نے ثبوت دے دیا کہ شیطان، سانپ اور عورت کے کان بڑے تیز ہوتے ہیں۔ یسین کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی جھنکارتی آواز کانوں میں پڑی، " ارے تو نو بجے تک پڑے ہوئے اینڈتے رہو گے اور اٹھتے ہی پانی سے منھ دھو کر ناشتہ مانگو گے۔ صبر کرو، ابھی ہوا جاتا ہے۔"

نثار میاں کے کانوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا۔ بے شک گھر کی زینت عورت سے ہے۔ یہ یسین بھی کیسا خوش قسمت ہے۔ صبح صبح تو بیوی کی جھاڑ سن لیتا ہے۔ خود نثار میاں کا کون ہے جو کچھ کہے۔ دس بجے تک سوئے پڑے رہیں۔

کٹورہ دان سنبھال یسین میاں باہر آگئے۔ جلدی سے تیار ہوئے ہیں، سو صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ناک بھوں چڑھائے ہوئے بولے "چلو یار" ان عورتوں کی زبان پر پتہ نہیں اللہ میاں نے کتنی دھار رکھ دی ہے۔"

نثار میاں کو۔۔۔ یسین سے بڑھ کر اور کوئی خوش قسمت دنیا میں نظر نہیں آرہا تھا۔ انھوں نے کہا،" ٹھیک تو کہتی ہیں بھابھی، جب ہمیں نو بجے تک پہنچنا ہے تو آٹھ بجے تک تیار ہو جایا کرو۔"

یٰسین میاں چڑ گئے۔" تمھیں کیا پتہ میاں؟ گھر گرہستی کی لاکھ جھنجھٹیں ہوتی ہیں۔ رات میں سکینہ کے خالو آئے۔ پکڑ کر لے گئے ڈاکٹر کے یہاں۔ ان کی بیوی نکڑ والے ڈاکٹر مشرا کے کلینک میں داخل ہوئی ہیں۔ پہلا بچہ ہونے والا ہے۔ اور ڈاکٹر نے کچھ خطرہ بتادیا ہے، اس لیے کلینک میں لے آئے ہیں۔ اب پچھری سالی کا معاملہ، ہم میاں بیوی دس بجے تک وہیں بیٹھے رہے۔ گھر آئے، کھانے پینے میں آدھی رات بیت گئی۔ پھر خدا الگتی کہو، کون کم بخت سویرے سویرے مرغا بولنے کے ساتھ ہی اٹھ بیٹھے گا۔"

نثار میاں سنتے رہے۔ یہ سب پریشانیاں انھیں پریشانیاں ہی نہیں لگ رہی تھیں۔ آدمی کے پاس جب پیسہ ہوتا ہے تبھی تو اس کی حفاظت کے لیے تکلیفیں اٹھاتا ہے، بینک دوڑتا ہے، تجوریاں خریدتا ہے، پہریدار رکھتا ہے، راتوں کی نیندیں حرام کرتا ہے۔ جو مفلس ہے اسے کس چیز کی پریشانی؟ یٰسین میاں کو اللہ نے سب دے رکھا ہے۔ اچھی خاصی ناک نقشے والی بیوی ہے، دو بیٹیاں ہیں، بیٹا ہے، خود کام میں لگے ہیں، اور کیا چاہیے؟

دونوں پان کھانے کے لیے رکے۔ فیکٹری پاس میں ہی ہے۔ اوپر سینما چوک سے گھوم کر تھوڑا آگے۔ چھوٹا سا کارخانہ ہے۔ پرائیویٹ ہے۔ لیکن خوب کام چل رہا ہے۔ آج کل تو اتنا کام آیا ہوا ہے کہ رات کی بھی شفٹ اوور ٹائم میں ہی ہو رہی ہے۔ نثار میاں کے ابا کہتے تھے کہ مالک گپتاجی نے ان کے ساتھ تین چار تجربہ کار مستریوں کے بھروسے کام شروع کیا اور اب اچھا خاصہ کارخانہ بن گیا ہے۔ لاکھوں کی آمدنی ہے۔ ابو میاں نے ہی نثار کو یہاں رکھوایا ہے۔ مالک، مینیجر باپ کی طرح ہی بیٹے پر بھی مہربانی کی نظر رکھتے ہیں۔ بھلا آدمی ہے مالک۔ نثار میاں کو گپتاجی پہچانتے ہیں۔ ابو کے زمانے سے ہی وہ ان کے ساتھ ہولی دیوالی عید پر ان کی کوٹھی پر جاتے، انعام اکرام پاتے۔

فیکٹری کے گیٹ پر گورکھا دربان، ہمیشہ کی طرح اجلے دانت دکھاتا ہوا ہنسا، "آگیا نثار صاحب۔۔۔۔"

"مزے میں تو ہو بہادر؟" کہتے ہوئے نثار میاں اندر چلے گئے۔ ان کی لیتھ مشین انتظار کر رہی تھی۔ ٹفن ٹائم میں وہ چوک پر رام آسرے کی دکان پر کھانا کھاتے ہیں۔ یٰسین میاں وغیرہ تو اپنی بیوی کے ہاتھ کے بنے پراٹھے روٹیاں کھاتے ہیں۔

واپسی پر ردھیا کی جھونپڑی نما چائے بسکٹ کی دکان پر بیٹھے سوہن لال نے پکار لیا، "اجی نثار میاں ذرا ادھر بھی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی نگاہیں ادھر چلی گئیں۔ سوہن لال، ادریس، طفیل، شیام سندر وغیرہ وہیں بیٹھے کھاپی رہے تھے۔ ردھیا تیس بتیس کی جوان عورت ہے۔ بیوہ ہے۔ ناک نقشہ ٹھیک ہے۔ بدن تن درست اور مضبوط ہے۔ سنتے ہیں اچھی عورت نہیں ہے۔ کسی بھی بات کا برا نہیں مانتی۔ ابھی کسی کے مذاق پر دانت نکالے ہنس رہی ہے۔ آنچل گرا جارہا

ہے، بڑی بڑی چھاتیاں ہنسی میں ہل رہی ہیں، سالی کو کسی کی پرواہ نہیں۔
طفیل کہتا ہے "نثار میاں، رد ھیا کا سائیلنسر ڈھیلا ہو گیا ہے ذرا فٹ کرتے جائیے۔" سب گھوڑے کی طرح دانت نکال کر ہنہنانے لگتے ہیں۔ نثار میاں سامنے دیکھتے ہوئے اپنی راہ لیتے ہیں۔ انھیں کنوارا جان کر یہ سالے مذاق کا کوئی موقع نہیں چھوڑتے۔ بے ہودہ کہیں کے!

چھٹی ہونے پر صابن سے مل مل کر کہنیوں تک ہاتھ دھوئے، منھ دھویا، بال سنوارے، کیل پر ٹنگی اپنی پوشاک اتار کر پہنی۔ کام کے وقت والی گندی پتلون، اوور آل وہیں چھوڑ دیے۔ مینیجر صاحب کو گھر جانے کے پہلے سلام کرنے ضرور جاتے ہیں۔
رجسٹر پر الجھے ہوئے مینیجر نے آنکھیں اٹھائیں، "نثار میاں، کل اتوار ہے نا۔ ذرا بنگلے پر آجانا۔ واٹر پمپ میں تھوڑی گڑبڑ چل رہی ہے۔ میم صاحب پریشان ہیں۔ کئی بار یاد دلا چکی ہیں کہ تمھیں بھیج دوں۔"
"جی بہت خوب حضور، کل آجاؤں گا۔"
نثار میاں جانتے ہیں کہ افسر کو کیسے خوش رکھا جائے۔ اپنا افسر راضی ہے تو خدا راضی۔ وہ ان اینٹھو مستریوں میں سے نہیں جو ہر بات میں اوور ٹائم وغیرہ مانگ لیا کرتے ہیں۔ ابو میاں اسی فیکٹری میں فورمین رہے۔ پہلا مینیجر اینگلو انڈین۔ والد صاحب نے انھیں اچھی طرح سمجھایا ہے کہ کام کرتے ہوئے سرخ رو رہنا ہے تو اپنے افسر کو خدا اور پیغمبر کے بعد کا درجہ دو۔ ابو کی بات درست ثابت ہوئی۔ نثار میاں اتنے جلنے والوں کے بیچ مزے سے کام کر رہے ہیں، ترقی کے بھی چانس ہیں۔
بتیس چونتیس کے ہوگئے ہیں نثار میاں، لیکن شادی نہیں ہو سکی۔ ابو میاں کے ملک عدم روانہ ہونے کے بعد دنیا میں وہ اکیلے رہ گئے۔ جہاں ابو شادی کی بات چلا رہے تھے، ان لوگوں نے ہچکچاہٹ دکھائی۔ لڑکی گھر میں اکیلی کیسے رہے۔ کچھ دن تو ساس نند دیور کا سکھ ملنا چاہیے۔ نثار میاں ناک پر مکھی تو بیٹھنے نہیں دیتے۔ کہہ دیا کہ رکھیے اپنی بیٹی اپنے گھر، تین حرف اس پر جو ادھر کا رخ بھی کرے۔ پھر بات چلائے کون؟ دنیا میں اپنا کہنے والا کوئی نہیں۔ وہ ایسے ہی رہ گئے اور اب پینتیس کے پیٹے میں ہیں۔

ادھر دنادن خبریں آنے لگیں کہ مسلمانوں کے گھروں میں بھی بہوئیں ہندوؤں کی طرح رنگین ٹی وی، موٹر سائیکل وغیرہ کی مانگ پر جلائی جانے لگی ہیں۔ ساس، سسر، دیور ہی اکثر ایسے گناہ کر رہے ہیں۔ اب رکھے رہیں وہ لوگ بیٹی کو سسرال والوں کی پناہ میں۔ انھیں اب اپنے کام سے لگاؤ ہے۔ کام کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ جتنا اس میں کھو جاؤ اتنا ہی فائدہ پہنچاتا ہے۔ عورت والی بات یہاں نہیں کہ خوشامد، درآمد میں مہینوں برسوں ضائع کیے اور موقع پر بڑی آسانی سے ٹھینگا

دکھادے۔

جب شادی کی بات ٹوٹ گئی تو انھیں رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ گلی کی ایک لڑکی انھیں چور نظروں سے دیکھا کرتی ہے۔ تین گھر بعد والے حامد علی آب کاری محکمے میں سپاہی ہیں اور ضلع آب کاری سپرنٹنڈنٹ کے اردلی۔ ہفتے میں پانچ دن دورے پر رہتے ہیں۔ گھر میں ایک بوڑھی پھوپھی دو لڑکیاں۔ چھوٹی لڑکی آٹھ نو سال کی تھی، بڑی سترہ اٹھارہ کی۔ بڑی والی رحمت کے ناک نقش بہت خوب صورت تو نہیں تھے پر بڑی بڑی آنکھوں میں ایک کشش سی تھی۔ نازک سے ہونٹ، سانولا سا نمکین چہرہ۔ اس عمر میں لڑکیاں تو سبھی خوب صورت لگتی ہیں۔ گلی کے موڑ والے بوردیل پر پانی بھرتے، آتے جاتے وہ انھیں چھپی ہوئی گہری نظر سے دیکھتی۔ وہ جلد ہی نظریں تاڑ گئے۔ انھیں بھی دل میں کچھ ایسا احساس تھا کہ حامد علی کو اپنی بیٹی کے لیے ان کا ہی خیال پہلے جائے گا۔ تین گھر چھوڑ کر ایسا کماؤ لڑکا سامنے پڑا ہے۔

چھیدی لالہ کی دکان پر سودا لینے کے لیے نثار میاں جاتے تو شاید یہی وقت رحمت کے لیے بھی چائے پتی، چینی، نمک وغیرہ لانے کا ہوتا۔ ایک بار چھیدی لالہ کی دکان پر ایک گاہک سودا لینے میں کچھ حجت کر رہا تھا اور وہیں کھڑے نثار میاں بے زاری سے سن رہے تھے کہ رحمت بھی دوپٹہ سنبھالے آئی۔ نثار میاں کی جانب کنکھیوں سے دیکھا اور لالہ سے اپنی نازک آواز میں چائے کی پڑیا دینے کو کہا، لیکن لالہ اور گاہک کی بک بک میں اس کی آواز کھو گئی۔ نثار میاں نے اس کی مدد کے لیے لالہ کا دھیان اس طرف کرنے کی کوشش کی اور ایک قدم بڑھے کہ تبھی نہ جانے کیسے ان کے ہاتھ سے رحمت کی کہنی ٹکرائی اور اس کی مٹھی کے چھٹے پیسے بکھر گئے۔

نثار میاں نے فوراً پیسے چن کر رحمت کو تھمادیے۔ رحمت کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور نثار میاں کو اپنی زندگی سیراب معلوم ہونے لگی۔ گویا کسی مسافر کو ریگستان میں نخلستان ملا ہو۔ چائے کی پتی خرید کر واپس لوٹتی رحمت کو وہ تب تک دیکھتے رہے جب تک کہ لالہ نے ان کی بانہہ ہلاکر پانچ کلو آٹے کا پیکٹ نہ تھمادیا۔

نثار میاں زندگی میں پہلی بار کسی جوان لڑکی کے اتنے نزدیک آئے تھے۔ ان کے دل میں ایک عجیب سی نامعلوم بے چینی بھر گئی۔ اس دن سے اپنا چھوٹا سا پرانا گھر اور زیادہ بوسیدہ لگنے لگا۔ جب تک اس کے آنگن میں رحمت کی ست رنگی اوڑھنی نہ لہرانے لگے تب تک یہ بھلا کوئی گھر میں گھر ہے۔ ایک مسافر خانہ ----

لیکن لڑکی کے پاس نسبت لے کر کون جائے؟ مسلمانوں میں پہل اکثر لڑکے والے کرتے ہیں۔ حامد علی کا کیا ہے، پتہ نہیں وہ کیا سوچ رہا ہو؟ اب نثار میاں کے پاس پہلے کی طرح لڑکی والے بھی نہیں آتے۔ لوگوں نے مان لیا ہے کہ وہ شادی نہیں کریں گے۔ ہو سکتا ہے، حامد میاں بھی یہی سوچ رہے ہوں۔ بہت دور دور تک نظریں دوڑانے پر انھیں اپنے ایک رشتے کے چاچا کا

خیال آیا جو ان کے بچپن میں کبھی کبھی حاجی پور کے پاس کے لال گنج سے آیا کرتے تھے۔ تب ابو بھی زندہ تھے۔ چاچا اکثر حاجی پور اور لال گنج کی خبریں سنایا کرتے۔ تمباکو اور کیلے کی فصل کی باتیں ہوتیں۔ انھیں لال گنج نام یاد رہ گیا۔ ادھر عرصے سے چاچا نہیں دکھائی دیے۔ پتہ نہیں زندہ بھی ہیں؟ انھوں نے سوچا کیوں نہ لال گنج ہو آئیں۔ ممکن ہے اسی بہانے کچھ اپنے رشتہ دار بھی ملیں، وہاں چھوٹی جگہ میں ہوں گے ہی کتنے گھر، پتہ لگالیں گے۔

تبھی انھیں پتہ چلا کہ حامد علی نے اپنے چچیرے بھائی کے بیٹے سے رحمت کا رشتہ طے کر دیا ہے۔

وہ چپ رہے کچھ نہ کر سکے۔ کرتے بھی کیا، اپنی طرف سے صرف اتنا کیا کہ دعوت وغیرہ میں شامل نہ ہوکر خاموش بیٹھے رہے، جس کی شکایت ابھی بھی حامد علی کو ہے۔ جہنم میں جائیں عورتیں۔ آدمی کو حیران کرنے کے لیے ہی خدا کی بندیاں بھیجی گئی ہیں۔ انھیں عورت ذات سے نفرت سی ہو گئی۔ اب وہ رہے اور ان کا کارخانہ۔ لوگ طنز کرتے۔ تنہا ہیں، عیش کر رہے ہیں۔ بیوی بچے ہوں سر پر تب پتہ چلے کہ زندگی کیا ہے؟

نثار میاں کے من میں عورت ذات سے چڑ ہونے میں ان کے مینیجر کی میم صاحب کا بڑا ہاتھ رہا۔ وقت ضرورت پر مینیجر انھیں بھروسے کا اور بھلا آدمی سمجھ کر اپنے گھر بلا کر اپنا ذاتی کام بھی کراتا تھا۔ وہ کر دیتے۔ ایک بار جب وہ ٹوٹی ہوئی آرام کرسی کی ویلڈنگ کرنے کے لیے گئے تو دوپہر کا وقت تھا۔ مینیجر کارخانے میں ہی تھا۔ وہ ٹھیلے سے کرسی اتار کر برآمدے میں لے گئے۔ صدر دروازہ بند تھا۔ پکارنے پر کوئی نوکر نہیں آیا تو وہ پچھواڑے کی طرف کسی کو کھوجتے چلے۔ ایک کھڑکی کے پیچھے سے ہلکی ہلکی آواز آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ انھوں نے جھانک کر دیکھا تو بری طرح چونک پڑے۔ کسی دوسرے آدمی کے ساتھ میم صاحب ایسی حالت میں تھیں جو کسی شریف اور عزت دار مینیجر کی گھر والی کے لیے نہایت ہی شرمناک تھی۔

وہ کرسی کو برآمدے میں ہی چھوڑ الٹے پیروں واپس لوٹ پڑے تھے۔ مینیجر کو کچھ نہیں بتایا۔ اس شریف آدمی کو کیوں ناحق تکلیف دیں۔ جب بیوی ہی بے وفا ہو تو ایک عزت دار شریف آدمی کے لیے رہ ہی کیا جاتا ہے۔ کبھی کسی بہانے مینیجر کو اشارہ ضرور دیں گے تاکہ بے چارہ آگے کسی خطرے میں نہ پھنسے۔ لیکن کیسے؟ یہ بعد میں سوچ لیں گے۔ تبھی سے انھیں عورت ذات سے نفرت ہو گئی۔ ایک دو لڑکی والے رشتے کے لیے بات چلانے آئے بھی تو انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ وہ شادی ہی نہیں کریں گے۔ تب سے دو سال یوں ہی خواب کی طرح بیت گئے۔

آج وہ مینیجر کے گھر جا کر پمپ ٹھیک کر آئے ہیں۔ آتے آتے چھ بج گئے۔ اب نثار میاں نے بنا چائے پیے کپڑے تبدیل کیے، آج سینما دیکھنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ چائے ناشتہ ادھر ہی

ہو جائے گا۔

باہر کچھ آہٹ محسوس ہوئی تو انھوں نے بال سنوارنا چھوڑ دیا اور ادھر دیکھا۔ کسی کے دروازے پر آنے کی وجہ سے کمرے میں ہلکا اندھیرا گھرا ہو گیا تھا۔ وہ چونکے۔ شام ہو رہی ہے۔ سوچ دبا کر روشنی کی اور جیسے ہی دروازے کی راہ روشنی کا سیلاب کمرے میں آگیا، رنگین اوڑھنی لہراتی ایک خاتون اندر چلی آئی۔ ساتھ میں ایک بچہ بھی ہے۔

رحمت کو پہچان کر نثار میاں کا منھ کھلا رہ گیا۔ کل جمع ڈھائی تین سال ہوئے ہوں گے۔ رحمت میں کیا غضب کا نکھار آگیا ہے۔ حسن ہے کہ جیسے ابل رہا ہے۔ چہرہ سانولے سے کھل کر گیہواں ہو گیا۔ ہاتھ پیر بھر گئے۔ بازو کیسے سڈول، سینے کی اٹھان تو نظریں ٹکنے نہیں دیتی۔ رنگ برنگی اوڑھنی، آسمانی کرتا شلوار۔ خدا جانے رحمت یہ حسن کہاں چھپائے ہوئے تھی۔

بچہ بہت پیارا ہے۔ سال بھر کا ہو گا۔ قمیض نیکر پہنے ہوئے۔ آنکھیں پھاڑے، منھ میں انگلی ڈالے، ایک ہاتھ سے رحمت کا دامن تھام انھیں دیکھ رہا ہے۔

"رحمت۔۔۔" وہ ہکلا کر رہ گئے۔

رحمت نے بھرپور نگاہوں سے انھیں دیکھا اور مسکراتی ہوئی بچے سے بولی، "منو انھیں سلام کرو، تمھارے چاچا۔" بچے نے ہاتھ اٹھا کر ماتھے سے لگایا، "چچا سلام۔"

نثار میاں کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ انھیں لگا ان کے مکان میں اتنا سکھ برس رہا ہے کہ وہ اسے کسی طرح سمیٹ نہیں سکتے۔ بچے کو گود میں اٹھا کر پیار کرتے ہوئے انھوں نے کہا "سلام، بیٹا جی، سلام، جیتے رہو ہزاروں برس۔" انھیں ہوش آیا۔ کرسی آگے کرتے ہوئے بولے "بیٹھو نا! یہ یکایک تمھیں دیکھ کر میں تو چکرا ہی گیا۔ پہچان میں نہیں آئیں۔ کب آئیں؟

رحمت اب اتنی ہچکچاتی نہیں۔ ایک طرح کی خود اعتمادی اس میں آگئی ہے۔ کرسی لے کر اطمینان سے بیٹھتی ہوئی بولی۔۔ "کل رات آئی۔ آپ کیسے ہیں؟"

نثار میاں بچے کو گود میں لیے چارپائی کے کنارے ہی بیٹھ گئے۔ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ وہی رفتار ہے زندگانی کی۔ ساون سوکھا نہ بھادوں ہرا۔ تم اپنی سناؤ۔ میاں کیسے ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟"

اوڑھنی کے سرے کو انگلیوں سے پلیٹتی کھولتی رحمت نے سر جھکا کر کہا، "ڈرائی کلیننگ کی دکان ہے۔"

نثار میاں نے پہلا سوال پھر کیا "کیسے آدمی ہیں؟ تمھارا خیال رکھتے تو ہیں؟" اپنا سوال انھیں بے کار سا لگا۔ بھلا اس حسن کی ملکہ کو کون مرد نہیں چاہے گا۔

رحمت کچھ دیر تک خاموش رہ کر بولی "اچھے ہی ہیں۔ مانتے ہیں۔"

نثار میاں کو بات سمجھ میں نہیں آئی۔ کہیں کچھ کسر لگ رہی ہے۔ لیکن زیادہ کریدنا

ٹھیک نہیں۔ گھر گھر مٹی کے چولھے ہی ہیں۔ وہ سوچنے لگے۔ گلی محلے کا معاملہ ہے۔ وہ کنوارے ہیں۔ یوں رحمت کا آنا۔ لوگ کیا سوچیں گے؟"

وہ گھبرا اٹھے۔ ادھر ادھر دیکھ کر بولے "رحمت، تم یہاں چلی آئیں، کوئی دیکھ لے تو؟"

رحمت نے لاپرواہی سے کہا "تو کیا کرے گا؟ پڑوس میں جانے، ملاقات کرنے میں کیا حرج ہے! پڑی پڑی کیا کرتی؟ گھر میں صرف پھوپھی اور عطیہ ہیں۔ مجھے مہمان سمجھ رہے ہیں۔ کسی بھی کام میں ہاتھ لگانے نہیں دیتے۔"

"گلی محلے کی بات ہے، طرح طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔"

رحمت بڑی بے باکی سے بولی، "آپ مرد ہو کر بھی ڈرتے ہیں۔"

نثار میاں شرمندہ ہوگئے۔ سچ ہے اس کی شادی ہو گئی ہے۔ اب یہ محفوظ ہے۔ کہیں بھی جائے آئے بچے کو ساتھ لے کر، تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟

وہ بچے سے کھیلنے لگے۔ باتیں کرنے کو جیسے دونوں کے پاس الفاظ کی کمی ہو گئی تھی۔ کچھ سوچ کر چونکے، "میں ابھی چائے بناتا ہوں۔"

"رحمت کھڑی ہو گئی۔ یہ کام تو میرا ہے۔" باورچی خانے کی طرف یوں چل دی جیسے اس کا دیکھا بھالا ہے۔ نثار میاں حواس باختہ سے بچے کو لیے اس کے پیچھے پیچھے۔ رحمت نے فوراً چولھا سلگایا، پانی رکھا اور جب تک رحمت میاں سامان جتا کر لاتے، چائے بنا ڈالی۔ بچے کو زیادہ دودھ اور شکر ڈال کر تھوڑی چائے دے کر اس نے نثار میاں کو کپ تھمایا، بیجیے۔ نثار میاں نے جب سے ہوش سنبھالا تب سے پہلی بار باورچی خانے میں کسی خاتون کے پاؤں پڑے۔ گھر اب کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ ایک رحمت سے ہی سارے گھر میں بہار چھا گئی ہے۔ کونا کونا جگمگا اٹھا ہے۔ کاش

کپ سنبھالتے ہوئے ان کے ہاتھ کانپے۔ رحمت نے سنبھال کر کپ انھیں پکڑایا اور اپنا کپ ہاتھ میں لیے باہر کے کمرے میں چل دی۔ نثار میاں چسکی لیتے ہوئے پیچھے چل دیے۔ چائے آج عجیب ذائقہ دے رہی ہے۔ اسے کہتے ہیں چائے! آج تک جو وہ چائے کے نام پر پیتے آئے ہیں وہ تو جوشاندے کا کاڑھا۔۔۔۔

خاموشی سے چائے پی لی گئی۔ جھک کر وہ چارپائی کے نیچے کپ رکھنے لگے تو رحمت نے لپک کر اسے پکڑنے کی کوشش کی۔ انھوں نے سر اٹھایا تو رحمت کے گداز سینے سے ان کا چہرہ ٹکرا گیا۔ ان کے ہاتھ پیر میں سنسنی دوڑ گئی۔

رحمت نے جیسے شرمندہ ہو کر کہا "معاف کیجیے۔" وہ دونوں کپ لے کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

نثار میاں آپے میں نہیں تھے۔ بچے کو چارپائی پر کھیلتا ہوا چھوڑ کر وہ ادھر ہی چل دیے۔

واپس لوٹ رہی رحمت سے سامنا ہو گیا۔ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے لرزتی ہوئی آواز میں بولے،
"رحمت۔۔۔۔"

رحمت نے ان کی کمر کو دونوں ہاتھوں کے گھیرے میں لے کر ان کے سینے پر ماتھا لگا دیا۔
نثار میاں کی گرم سانسیں اس کی گردن پر پڑنے لگیں۔ "رحمت۔۔۔۔ رحمت۔۔۔۔"
اس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا، بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو تھے۔ دھیمے لہجے سے کہا "میرے نثار۔"

انھوں نے اس کے گال سہلائے، تمھارے دل میں میرے لیے ابھی بھی جگہ ہے رحمت؟

"ہمیشہ سے رہی ہے۔ اس بچے کا باپ میرا ظاہری مالک بھلے ہی ہو، مگر دل میں تمھاری ہی جگہ بنی ہوئی ہے۔ تم میرے روحانی مالک ہو میرے نثار!"
ان کے ہاتھ ڈھیلے پڑنے لگے۔ رحمت دوسرے کی ہے۔ انھیں اس پر کیا حق؟ یہ چوری ہے رحمت کی موجودگی نے انھیں پھر مدہوش کر دیا۔ نیچے جھک کر چاہا کہ ان ہونٹوں کو چوم لیں۔ تبھی اگلے کمرے سے بچے کی آواز آئی، "امی۔"
وہ چونک پڑے۔ ہوش میں آگئے۔ آہستگی سے رحمت کی پیٹھ پر پھرتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ رحمت نے پیار سے کہا "آرہی ہوں بیٹے۔" پھر پھسپھسا کر بولی، ابو باہر ہیں، پھوپھی اور عطیہ کے سو جانے پر آؤں گی۔ یہیں رہو گے نا؟" وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دی، نثار میاں بھک سے رہ گئے۔ بیٹھے گلے سے بولے، "رہوں گا۔" رحمت نے بچے کو گود میں لیا۔ ماما کر دچاچا کو "تھا، تا تا۔۔۔۔"

وہ بچے کو چومنے کے لیے جھکے۔ رحمت نے دھیرے سے کہا، "کنڈی مت بند کرنا۔ دروازہ ایسے ہی لگا دینا۔" ایک بجلی سی گرا کر وہ گلی کی تاریکی میں سما گئی۔ چار قدم پر گھر ہے۔
نثار میاں کی حالت ایسی تھی جیسے کوئی غریب ایمان دار آدمی کسی کا بھرا ہوا بٹوا پا گیا ہو۔ من میں لالچ بھی ہو اور گناہ کا احساس بھی خوف زدہ کر رہا ہو۔ یہ شام ان کی اکیلی زندگی میں ایک یادگار شام بن گئی۔ کبھی نہ بھولنے والی۔ کانپتے ہاتھوں سے انھوں نے ٹوپی ٹھیک کی۔ تالا لگا کر گلی میں نکل گئے۔ سینما کا اب وقت نہیں۔ سامنے سڑک پر بڑی چہل پہل ہے۔ دکانوں پر ٹیپ ریکارڈ بج رہے ہیں۔ وہ کھوئے کھوئے سے بازار میں گھومتے رہے۔ رہ رہ کر اپنے مینیجر کی میم صاحبہ کی یاد آرہی تھی۔ کچھ عجیب ہی لذت ہے اس عورت ذات کے بدن چھونے میں بھی۔ اس لذت کے بعد اب تک اپنا بیتا ہوا کل بالکل بے رس لگ رہا تھا۔ پوری گزری ہوئی زندگی بے مزہ سبزی جیسی۔ اب جیسے رحمت نے ان کے آگے چھپن پکوانوں کی تھالی پروس دی ہو۔ جیسے کسی مفلس کے آگے علی بابا کا خزانہ کھل گیا ہو۔

خزانہ دوسرے کا ہے۔ وہ چور بن گئے۔ وہ رحمت کو دل سے چاہتے ہیں، لیکن اس کا شوہر؟ اس بے چارے کو دھوکے میں رکھے گی رحمت! نثار میاں بھی اس میں شامل ہو گئے۔ ان کا ضمیر ڈگمگانے لگا۔ چوری کے بیر کتنے بھی مزے دار ہوں، پر گناہ تو گناہ ہے۔ ویسے وہ رحمت کا کوئی قصور نہیں پاتے۔ لڑکی ذات، جدھر چاہا باپ نے ہانک دیا۔ لیکن اس کا اپنا بھی تو دل ہے، خواہش ہے، عورت اور کیا کرے؟ سوائے اس کے جسے اپنا اصلی آدمی مانتی ہو اسے اپنی سب سے بڑی دولت سونپنے کو بے قرار ہو جائے۔ اپنی محبت ظاہر کرنے، اس پر مہر لگانے کا ذریعہ عورت کے پاس اور کیا ہے کہ خود کو سونپ دے۔ وہ بے چاری تو عورت ہے۔ مگر نثار میاں مرد ہیں، وہ کیا کریں؟

رحمت سب کے سامنے دن دھاڑے ان کے ساتھ آنے کو تیار ہو تو وہ اس کا ہاتھ تھام لیں۔ کسی کی بھی پرواہ نہ کریں۔ لیکن رحمت اپنا گھر ادھر بھی بنائے رکھنا چاہتی ہے اور ادھر دل کو سکون دینا بھی چاہتی ہے۔ کیا یہ مناسب ہے؟ نثار میاں بھی مینیجر کی گھر والی کے چھپے یار کی طرح چور اور گنہگار ہیں؟

بے چینی کے ساتھ ٹہلتے ہوئے وہ اگلے چوراہے پر آئے۔ جیسے ان کے دل میں مچی ہلچل کے جواب میں رام آسرے حلوائی کا باجا گا رہا ہو، وہاں پیدل ہی جانا ہے ---- خدا کو منھ دکھانا ہے ----۔ ان کے قدم حلوائی کی دکان کی طرف مڑ گئے۔

نثار میاں نے دروازے پر دستک دی۔ "حامد میاں"

دروازے کی آڑ سے بوڑھی پھوپھی کی لرزتی آواز آئی۔ "کون ہے؟ حامد گھر پر نہیں ہے۔"

"ارے پھوپھی، ہم ہیں، نثار۔"

دروازے کا ایک پٹ کھلا۔ صحن میں ہلکے پاور کا بلب دھیمی روشنی دے رہا تھا۔ بوڑھی نے ہاتھ کا چھجا بنا کر دیکھنے کی کوشش کی۔ "نثار ہو؟ کیا بات ہے بیٹا؟"

"سنا ہے، رحمت بہن آئی ہے؟"

رحمت کا بچہ دروازے سے آلگا۔ پیچھے رحمت کی ست رنگی اوڑھنی اور موٹی موٹی آنکھیں جھلک اٹھیں۔

چھلام چاچا ---- بچے نے طوطے کی طرح رٹ دیا۔ دل کو مضبوط بناتے ہوئے نثار میاں نے مٹھائی کا ڈبہ بچے کو تھما دیا۔ اس کا گال سہلاتے ہوئے بولے، بیٹا ہم چاچا نہیں، تمھارے ماموں ہیں ماموں۔ لو یہ مٹھائی اپنی امی کو دینا۔

انھوں نے کچھ زور کی آواز سے جیسے رحمت کو سناتے ہوئے بوڑھی سے کہا، پھوپھی، ابھی ہمیں اسی وقت مینیجر صاحب نے طلب کیا ہے۔ شاید کارخانے میں رات بھر کی ڈیوٹی دینی پڑے۔ یہ مٹھائی بچے کے لیے لیتا آیا۔ میرا سلام کہہ دینا رحمت بہن سے۔ پھر دن میں کبھی ملنے آؤں گا۔"

ایک چھپی نظر رنگین اوڑھنی پر ڈال کر وہ لوٹ پڑے۔ اب ان کا من ہلکا تھا۔ کل سے ہی مینیجر سے کہہ کر رات والی شفٹ لے لینی ہوگی۔

بازار میں بے مقصد ٹہلتے ہوئے نثار میاں سوچ رہے تھے کہ گلی میں سناٹا چھا جائے، زندگی کی رمق ختم ہوجائے تو وہ چپکے سے گھر واپس لوٹیں۔

○ ○ ○

چندر موہن

ترجمہ: قاسم ندیم

دھواں دھواں او نچائی ۔ وجئے

بلقیس پردہ ہٹاکر دائیں ہاتھ کی مٹھی میں سمیٹ لیتی ہے۔ شام ہونے سے پہلے اندھیرا نالی میں بہتی ہوئی گندگی کے ساتھ خاموش دوستی بڑھارہا ہے۔ ایک عجیب سی بے چینی کر یدتی ہے ---- پورے بیس سال گزرے تھے یہاں، اور اب آٹھ نوسال میں ہر سال تین چار بار تو آتی ہی ہے۔ سامنے کے بند مکان کے اندر گونگے پن کا احساس ---- محسوس ہوتا ہے کہ پورا قبرستان خاموشی سے کراہ رہا ہے۔ کٹرہ شہناز کی یہ گلی نمبر دو ---- نفیس سنگ تراشی کی تاریخ کا نمونہ، آج اندھیرے سے گھائل اور جہالتوں کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ پتھروں پر پھول چڑھائے جاتے ہیں اور فن کاروں کو دفنا کر لوگ انھیں بھول جاتے ہیں۔

ٹھیلے لٹکائے انور میاں کے پورے جسم کو سرنگ نما گلی کے بیچ میں وہ چلتے ہوئے نہیں، بلکہ گھسٹتے ہوئے محسوس کرتی ہے، جیسے انور میاں زنگ لگے لوہے کی پرانی چیز ہیں۔ گلی کی نالی پر فارغ ہوتے بچے ایک دوسرے پر کنکر اچھال دیتے ہیں۔ کوئی کنکر انور میاں کی پیٹھ چھولیتا ہے۔ ان کی ضعیف آنکھیں اندھیرے میں کچھ ٹٹولتی ہیں اور بچے دبی دبی مسکراہٹ چھوڑ کر جگہ بدل لیتے ہیں اور پھسپھساتے ہیں، انور میاں کے جادوئی تھیلے "ڈالیں لیمو نکلیں کیلے۔"

بلقیس دیکھتی ہے ---- صحن میں غرق ہونے والے سرے پر لاپتہ ہوجانے والی گلی کے ساتھ انور میاں بھی غائب ہوگئے ہیں۔ بوڑھے ہاتھوں میں لمبے تھیلے لٹکائے ہوئے ان کا وجود اندھیرے میں تیرتا، برف کی ڈلی کی طرح غائب ہوجاتا ہے۔ ایک تھیلے میں پولیتھین میں بند، چنے، لائی، گڑدھانی، سستی ٹافیاں اور دوسرے تھیلے میں اگر بتیاں، موم بتیاں، ماچس، اسٹو کی پنیں، تمام ضروریات زندگی کی چیزیں، کوئی خریدے نہ خریدے، انور میاں کانستھوں کی بستی پاک ٹولے کی گلی میں اور کٹرہ شہناز کی ہر گلی میں چکر ضرور لگاتے ہیں۔ تاج گنج کی دوسری خوش حال بستیوں میں کھانے کی چیزیں، لوگ پھیری والوں سے اپنے بچوں کو کم ہی خریدنے دیتے ہیں۔ کٹرے اور پاک ٹولے کے بیچ کی کولیوں کی بستی میں انور میاں پھیری نہیں لگاتے، کیوں کہ بچے خریدتے کم ہیں سامان زیادہ گم کردیتے ہیں۔

بیس سال پہلے تک وہ سامان ٹھیلے پر لاتے تھے۔ اسی سال ان کی اکلوتی بیٹی رمیضہ کا نکاح ہوا تھا۔ ساتھ ہی بیوی کا انتقال بھی۔ درد میں ڈوبے ٹھیلے کو دھکیل رہے تھے کہ چنگی والوں نے

گھیر لیا۔ مال تو گیا ہی، ٹھیلا بھی ٹوٹا ملا وہ بھی رشوت دینے پر، اور اسی دن سے انور میاں نے دونوں کندھوں پر تھیلے لٹکانا شروع کر دیے۔ بہت تھک گئے تھے اس دن۔ پانی مانگا تو امی نے چار نان خطائی بھی ایک رکابی میں سامنے رکھ دیں۔ انور میاں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے۔ "سب چلے گئے۔ ایک ٹھیلا بچا تھا وہ بھی چلا گیا۔ صحیح نوالہ نہیں نگلا گیا دلہن!"

پاس کھڑی ہوئی بلقیس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا کہ مدت سے گلی میں گھومتا انور میاں کا ٹھیلا اچانک ہی لڑکوں کے لیے بوجھ کیسے بن گیا! اور اب جب انور میاں خود ایک ٹھیلا بن گئے ہیں اس شہر میں کون سی کائنات جڑ گئی ہے۔ آج بلقیس سمجھ سکتی ہے کہ انور میاں جیسے لوگ خود میں ایک اندھیری گلی بن جاتے ہیں، جن کی بے کسی پر دولت سے کھیلتی دنیا فقرے کستے ہوئے ہنستی ہے۔ روٹی کے لیے مٹتا ہوا ہر وجود بنا پہیوں کا ٹھیلا ہی تو ہوتا ہے۔ اللہ بڑا کارساز ہے دلہن، تمھیں برکت نصیب کرے گا۔" یہ کہتے ہوئے انور میاں نے بلقیس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

چھوٹی تھی بلقیس تو اکثر انور میاںؔ کا ٹھیلا روک کر کہانیاں سنتی تھی۔ انور میاں نے بتایا تھا کہ آزادی سے پہلے جب وہ اپنے ابا حضور کے ساتھ آئے تھے تب یہاں بجلی نہیں تھی۔ مگر مٹی کے تیل کا لیمپ جلتا تھا۔ مکان اکہرے تھے اور گلی میں دھوپ آتی تھی۔ ہر گھر میں سنگ تراشی ہوتی تھی۔ خواتین زری کی کڑھائی کرتی تھیں۔ پتھر پر پچی کاری کی آواز ایک ساز کی طرح گلی میں سنائی دیتی رہتی تھی۔ پڑوس، پڑوس تھا اور رشتے گلی کو ایک دھاگے میں باندھے ہوئے تھے۔

سات نمبر مکان میں خواجہ صاحب کا گھر تھا۔ جامع مسجد کے پاس ان کی چار دکانیں تھیں اور ہاتھی گھاٹ پر پتھر کی آڑھت۔ ان کا بھائی تجارت کے لیے بھاگ دوڑ کرتا تھا۔ ان کے سامنے کے مکان میں افضل میاں رہتے تھے۔ لیڈر تھے۔ آزادی کا زلزلہ آیا۔ خواجہ صاحب رئیس اعظم بننے پاکستان چلے۔ افضل میاں کے برخوردار رشید میاں، جو قائد اعظم کی تعریف میں قصیدے گڑھتے تھے، ایک ہی رات میں بدل کر گاندھی پارٹی میں آگئے۔ گلی کے ہر مکان سے کوئی نہ کوئی چلا گیا۔ ان کے جانے کا درد لوگوں کی آنکھوں میں تھا۔ گھروں میں کم پاور کے بلب جلنے لگے اور آنکھوں پر چشمے بھی چڑھتے گئے، مگر پتھروں پر ہلکی کھٹ کھٹ کی آواز تیز ہوتی گئی۔ ٹورسٹ زیادہ آنے لگے، مگر دکانیں، پنجاب سے مار کھا کر آئے بدنصیبوں کے ہاتھ چلی گئیں جنھوں نے تجارت کا رخ ہی بدل دیا۔ دھیرے دھیرے ہنر ناپید ہونے لگا۔ آدمی کے ہاتھوں کی جگہ مشینوں نے لے لی۔ اور یہ گلی، جہاں گلاب مہکتے تھے ---- تمھارے سامنے ہے سب کچھ۔

ایک دن انگریزوں کے آخری دور کی کہانی سنانے لگے۔ "انگریزوں نے دوسری بڑی لڑائی جیتی تھی۔ تاج محل میں توپوں کے اسٹینڈ پر بڑی بڑی سرچ لائٹیں لگوائیں۔ اندھیری رات میں تاج محل کا ہر بیل بوٹا چمکنے لگا اور راتوں میں تو چاند جدھر روشنی ڈالتا تھا وہاں کے رنگین پتھر چمکتے تھے اور لڑکے چلاتے ---- وہ چمکی! لڑکیاں دھڑادھڑ برقعے یا ساڑی کا پلو شرما کر چہرے پر

ڈال لیتی تھیں، پر اس رات کو ہر پتھر چکا۔۔۔۔ پردے کہاں تک کون کھینچتا؟ اور آج۔۔۔۔ بے پردہ ہوتے ہوتے دنیا ننگے پن کا خیال بھی بھول گئی ہے۔" ایک عجیب سی ہنسی، آواز میں پیوست ہو گئی تھی۔

بلقیس بھی کھل کر چہچہائی تھی۔۔۔۔ "میں بھی بتاؤں! وہ آمنے سامنے کے مکان میں حاجی منیر بابا ہے نا، حج سے ابھی ابھی لوٹے انصاری چاچا کو ڈانٹتے ہیں، کیوں لگائی ہے آپ نے مکہ مدینہ کی تصویر۔ حج کر آئے مگر بت پرستی نہیں گئی۔۔۔۔ اور انصاری چاچا کہتے ہیں، آپ نے کیوں اپنا حاجیوں والا فوٹو بیٹھک میں ٹانگ رکھا ہے۔۔۔۔ دونوں لڑتے ہیں، مگر رہتے ساتھ ساتھ ہیں، ہے نا مزے دار بات۔"

بلقیس کو یاد ہے کہ جس دن ہاشم بھائی کے یہاں قرقی آئی تھی، پوری گلی میں فقرے گھوم رہے تھے۔۔۔۔ لو، نکل گئی رئیس زادوں کی پھونک! خواجہ کیا نہیں چھوڑ گئے تھے اور اس ہاشم نے گڑ کا گوبر بنا دیا۔ انور میاں اس دن پھیری کر آئے، پر آواز نہیں لگا سکے۔ ٹوٹتے رشتوں کا غم انھیں کھائے جا رہا تھا۔ بلقیس کی دہلیز پر آرام کرنے کے لیے بیٹھ گئے تھے۔ ایک ٹھنڈی آہ کھینچ کر خود ہی کہنے لگے تھے۔۔۔۔ آزادی! برن اینڈ مارٹن چلاتی تھی دو پاور ہاؤس! تاج محل کالا نہ ہو جائے، اس لیے بند کر دیے گئے۔ سیاح آگرہ میں نہ رکیں، اس لیے پانی گندہ بھیجا جاتا ہے۔ یہ گلی ہی نہیں بلکہ پورا شہر اندھیرے اور گندگی سے کھجلی زدہ کتے کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ اوپر سے متھرا سے تیل اور گیس کا کارخانہ دھوئیں کی بارش کرتا ہے۔ اس پر خوابوں کی اونچائی جگائی جا رہی ہے۔ ہاشم بھائی نے پتھروں کی آڑھت چھوڑ کر بینک سے لاکھوں کا قرض اٹھا کر لگوایا تھا ایک چھوٹا سا کارخانہ۔ ایک دن میں ایک لاکھ سول بنانے کا سوچا تھا، پھر بڑا کارخانہ شروع کرنے کا خیال تھا۔ پر ہوا کیا؟ دودھ کی ہانڈی پر منڈلاتی ہوئی مکھی مارنے کے لیے ہتھوڑی چلادی۔ بازار گر رہا تھا۔ مدراس مقابلے پر ہے۔ کہاں فروخت ہوتے روزانہ ایک لاکھ سول! سود چڑھتا گیا۔ مشین کم چلے یا زیادہ۔ بل تو پورا بھرنا ہی ہے۔۔۔۔ آگئے آج قرق امین!"

بلقیس کو ہاشم خاندان کا حشر آج تک یاد ہے۔ ان کا بیٹا اختر غائب ہو گیا۔ بیٹی نگار زار و قطار روتی تھی۔ گلی کے ببن میاں ہندستانی ٹورسٹ بس اسے چلاتے چلاتے ڈھوکی کے کسی چکلے میں بنی کی طرح ہیروئن بنانے کے لالچ میں بیچ آئے تھے۔ اعتماد الدولہ کے رکشا اسٹینڈ پر لو کھائے ہوئے ہاشم میاں خون کی الٹی کرتے ہوئے مرگئے۔ نگار کے غائب ہونے پر بلقیس بہت روئی تھی۔ بہت دنوں تک روتی رہی تو امی نے سمجھایا تھا "عورت کی قسمت ابابیل کے پنجوں سے بندھی ہوتی ہے۔ باپ ہو یا خاوند، قسمت بس بولی نہیں کہ ابابیل لے اڑی، اتار دے گی کہیں خندق میں یا چٹان پر، جہاں باز جھپٹ لیں گے۔

بلقیس بہت ڈر گئی تھی۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ عورت پاؤں ہوتے ہوئے بھی آدمی کی

بیسا کھی کے سہارے چلنے والی تدبیر ہے۔ پڑھائی نے اسے سوچنے کی حد میں پہنچادیا تھا، مگر اس سرحد کو پار کرنے کی تجویز وہ تلاش نہیں کر پائی تھی۔ہاں! یاد آئی تھیں بچپن کی باتیں۔ افتخار میاں کی بیٹھک شام تک بند رہتی تھی۔ صحن میں بچے کھیلتے رہتے تھے۔ اچانک ایک کونے میں لے جاکر جمیل نے گال چوم لیا تھا اور کہا تھا "چل فتح سنگھ والے کھنڈر میں، ابو امی والا کھیل کھیلیں گے۔" بلقیس تمتما اٹھی تھی۔ مراد ایک دن ثریا کو لے گیا تھا۔ کپڑے اتار دیے تھے کہ بندر آگیا۔ ثریا ننگی بھاگی تھی اور گلی میں کہرام مچ گیا تھا۔ ثریا تو گھر میں پٹی، مراد کو اس کے اپنے اور ثریا کے ابا نے پچھاڑ دیا تھا۔ رات میں ڈرتے ڈرتے امی سے پوچھا تھاپہلے تو امی غرائیں پھر سمجھایا تھا، "لڑکوں کے اندر ایک جن ہوتا ہے، جو لڑکی کو اکیلے میں جکڑ لیتا ہے اور لڑکی پاگل ہو جاتی ہے۔"

اور جن کا کرشمہ ایک دن سامنے آگیا۔ ویسے، جب وہ چھت پر سبق یاد کر رہی ہوتی، جمیل اسے دیکھ، ہاتھ چوم کر اشارہ کرتا، پر اچھا لگنے پر بھی جن کے ڈر سے وہ سبق زور سے پڑھنے لگتی۔ مگر اس دن تو گلی کے اوپر کا آسمان جیسے پھٹ پڑا۔ گلی کی پالتو کالی چالاک بلی دبک کر بیٹھ گئی اور گھروں میں دودھ اور گوشت کے پتیلے بنا چھوئے پڑے رہے۔

حادثہ کم شرم ناک نہیں تھا۔ انور میاں بنا کچھ فروخت کیے ہوئے گزر گئے۔ ان کے پیچھے شور مچاتے بچے بھی آج یہ کہتے نہیں دوڑے۔ "انور میاں کے جادوئی تھیلے۔ رکھے امرود نکلے کیلے۔" ناظر صاحب روز رات میں پی کر لوٹتے۔ بیوی کی وفات کے بعد بلاناغہ دیر سے آنا اور دروازہ کھٹکھٹانا ایک دستور بن گیا تھا۔ لوگ جاگ جاتے اور سمجھ جاتے کہ ایک یا دو بجے ہیں۔ پھر اچانک ہی رات میں آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ ناظر صاحب نے بیٹی اور گلی والوں کی پریشانی کا حل ڈھونڈ لیا تھا۔ گھر کے ایک خاص دروازے سے وہ بیٹھک میں داخل ہو جاتے اور وہیں لڑھک جاتے۔ مگر اس رات ــــــ شام کو وہ مے خانے کے بجائے منشی رادھے شام کے یہاں چلے گئے جو بے حد علیل تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر پینے کا منصوبہ چھوڑ دیا اور رات میں جلد ہی لوٹ آئے۔ بیٹھک کے دروازے سے داخل ہوئے تو اندر دوسرے کمرے میں منشا کے ساتھ بستر پر اسحاق بھی تھا۔ رئیس باپ کا بیٹا تھا، نہ جانے کتنی سوغاتیں منشا کو دی تھیں اس نے۔ ناظر صاحب کو دیکھا تو کود کر بھاگ گیا۔ مگر منشا کہاں جاتی؟ پٹتی رہی اور چیختی رہی۔ اس کے ابا نے آکر ہی چھڑی پکڑی اور پھٹکارا۔ "بچی کو علم کی روشنی سے محروم رکھا، پیار کرنے والی ماں ہے نہیں اور آپ کو مے کشی سے فرصت نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ بیس سال کی لڑکی پوری طرح جوان ہوتی ہے۔ علم اور پیار کا سہارا ملتا تو کیا لڑکی کفر کا دامن تھامتی؟"

خود بلقیس نے اپنی ہتھیلیوں سے گولے کا تیل منشا کے جسم پر لگایا، تو پاگلوں کی طرح ہنس پڑی۔ "چھوکری عشق کا درد، زخموں کی ٹیس سے زیادہ تیکھا اور زہریلا ہوتا ہے۔ وہ کمینہ اسحاق ہی دغاباز نکلا کہہ دیا منشا بچپن کا کھیل سمجھ کر بھول جانا سب کچھ، پر کیا منشا کا خیال کیا اس

نے! اپنی باجی کی بات یاد رکھنا بلقیس ـ ـ ـ ـ آدمی پر اعتبار مت کرنا، وہ چاہے عاشق ہو، خاوند ہو یا والد!"

ایک صبح نشہ ٹوٹتے ہی ناظر صاحب کا ہمیشہ دھاڑنے والا وجود سسک کر رو پڑا۔ منشا نے گلے میں رسی باندھ کر خودکشی کرلی تھی۔ بلقیس نے اپنی امی سے خودکشی کی وجہ جاننی چاہی، انھوں نے تیکھی آواز میں کہا، "اس کے جسم میں آسیب داخل ہو گیا تھا۔ زیادہ دماغ مت چاٹ لڑکی! کتاب میں دیدہ لگا۔"

مگر ابا نے بڑی خوب صورتی سے رٹا دیا تھا "جو پڑھتے نہیں ہیں، انھیں مبارک زندگی نصیب نہیں ہوتی ہے۔ کٹرے میں ان پڑھ عورتوں کو پٹتے ہوئے، سڑتے اور مرتے ہوئے دیکھتی ہو نا۔ تم تو پڑھوگی، ایک دن ڈاکٹر بنوگی۔"

جمیل کی چھت سے لگی چھت والے مکان میں خراد کے کاریگر ادریس میاں پر اچانک ہی امیری چھا گئی تھی۔ پیشہ کار بہاری مگن مہربان ہو گئے تھے۔ بڑھیا نسل کے کبوتر لے آئے تھے۔ چھت پر دن بھر سیٹیاں بجتیں۔ رات میں پیشہ کار کے ساتھ بوتل کھلتی۔ اور حسنہ چاچی کا تیس سالہ خوب صورت جسم کانپتا رہتا۔ اور ڈر صحیح نکلا۔ مگن بہاری نے ادریس کو کمٹی کی حسین بیوہ ثمینہ سے الجھا دیا اور خود حسنہ چاچی کے پاس پہنچ گیا۔ چاچی نے جوتی دکھائی تو کہہ دیا۔ "اگر میرا کہا نہیں مانا تو سڑک پر اور پھر کوٹھے پر پہنچا دوں گا۔"

پیشہ کار نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ ادریس چاچا سے مکان خرید کر انھیں پہنچا دیا ثمینہ بیگم کے گھر اور دو بچیوں کے ساتھ طلاق کی شرمندگی لیے ہوئے چاچی سڑک پر آ گئی۔ وہ تو حسنہ چاچی کے بھائی وقت پر خبر پاکر شمس آباد سے آکر لے گئے۔ نہیں تو مگن بہاری انھیں کوٹھے پر پہنچا ہی دیتا۔ دوسرے سال شاہ جہاں کے عرس پر بلقیس نے تاج محل میں ثمینہ کو دیکھا تھا۔ وہ حسنہ چاچی کے مقابلے میں صفر تھی۔ وہ خود اس رات بال بال بچ گئی۔

رضیہ کے ساتھ پتلی گھر کی طرف کی بھول بھلیاں میں پہنچ گئی تھی۔ باہر قوال گا رہے تھے اور دو ہاتھ اچانک ہی رضیہ کو بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔ تبھی جمیل کے ہاتھوں نے اسے گھیرنا چاہا تھا۔ اچانک ہی ابا کا چہرہ اس کے سامنے آگیا اور وہ پاگلوں کی طرح باہر کی طرف دوڑ پڑی تھی۔ سنگ مرمری چبوترے کا سہارا لے کر ہانپتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ تبھی جمیل سر جھکائے ہوئے پاس آکھڑا ہوا۔ "معاف کر دینا بلقیس!" یہ کہہ کر وہ چلا گیا تھا۔ وہ کافی دیر تک پریشان کھڑی رہی تھی ـ ـ ـ کبھی لگتا تھا کہ زندگی کے خاص لمحے سے اجنبی رہ گئی اور کبھی لگتا کہ اس نے جمیل کا دل توڑ دیا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ یہ ہوتا رہا ہے اور رکے گا نہیں۔ مگر منشا آپا کی تصویر اسے روکے رہتی تھی۔

ثمینہ بیگم کو دیکھ کر امی نے تھوک دیا تھا۔ "اللہ نے آدمی کو سکندر کیوں بنا دیا، عورت

کو اس نے بنا کر بندر یا، جہاں چاہا نچا دیا۔ بے چاری حسینہ!" گھر پہنچ کر امی نے ابا کے سامنے بھی اپنی بات دہرائی تھی۔ ابا اداس ہو گئے تھے۔ ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا تھا۔ "اسی لیے بلقیس کو پڑھا رہا ہوں کہ کوئی اسے بندریا نہ بنا سکے۔"

"اس کا نصیب!" امی نے بھی لمبی سانس کھینچی تھی۔ گلی میں ان دنوں بھاگ دوڑ، چہل پہل اور تقریروں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ گلی کے پرانے باشندے رشید میاں اسمبلی کے لیے انتخاب میں کھڑے ہوئے تھے۔ لوگ کہہ رہے تھے تجربے کے حساب سے اس بار جیتنے پر وزارت ضرور ملے گی۔

بلقیس بھی گلی میں بچھی ہوئی دری پر امی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہی وعدوں کی تقریر اور آخر میں ---- "یہ کٹرہ میرا گھر ہے۔ باہر تو بہت دیکھ لیا۔ اب گھر کو دیکھوں گا۔ روشنی، پکی سڑک! آپ مسلمان ہیں اور میں آپ کا نمائندہ۔" پھر دھیرے سے کہا تھا "بھائی" "میں تو میجارٹی کے مقابلے میں ہوں۔ آپ ہی اپنے نمائندے کی عزت رکھ سکتے ہیں۔ جیتا تو جیت آپ کی اور اسلام کی۔"

لوگ اپنی تکالیف بھول کر مذہبی رنگ میں رنگ گئے تھے۔ کیا ذلیل ہو گیا ہے زمانہ۔ دولت، کارخانے اور جائیداد کے بعد بھی نیت نہیں بدلی ہے۔ تاج گنج میں بستی ہندوؤں کی ہو یا مسلمانوں کی، سن اڑتالیس کے بعد کون سی سڑک نئی بنی ہے۔ ہاں تاج محل کے آس پاس گلشن آباد ہو گیا ہے مگر دریس ہو یا پاک ٹولہ، نہ تو نل میں پانی آتا ہے اور نہ گھروں میں ترتیب سے بجلی پہنچتی ہے۔ رشید میاں بھی امرود کی طرح مذہب کو بھنا کر ووٹ جمع کر لیتے ہیں۔ بوڑھے ہو گئے ہیں۔ کسی نوجوان کو آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ دو بیٹیاں باپ کے گناہوں سے طلاق پا کر گھر میں لوٹ آئی ہیں۔ مگر لیڈری کی ہوس، دوسروں کے درد اور اپنے گناہوں پر نظر پڑنے ہی نہیں دیتی ہے۔"

بلقیس گھر میں آئی۔ پاس ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔ جمیل کا درد دل میں بار بار اٹھ رہا تھا۔ عرس والی رات کے بعد وہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ پوچھنے پر اس کی بڑی امی نے ہی بتایا، "نہ جانے کیا نفرت بھر گئی تھی میرے لیے کہ لونڈے نے کبھی امی یا بڑی امی نہیں کہا۔ رات میں کتنی بار کھلا پڑا رہتا اور میں اٹھ کر رضائی اڑھاتی۔ مگر اس کے دل میں پیار کی ڈلی نہیں پگھلی۔ اپنے ماموں کے پاس پڑھنے کے لیے علی گڑھ چلا گیا ہے۔ کہتا ہے، اس گلی میں رہا تو مر جاؤں گا؟"

بلقیس اٹھ کر چھت پر چلی گئی۔ ہاشم میاں کی چھت خالی پڑی تھی، اسے منگت ککر یجانے قرقی میں خرید لیا تھا۔ راوت پانڈے کے موڑ پر ان کی شراب کی دکان تھی۔ ککر یجا کی عمر تقریباً پینتیس سال کی ہو گی۔ دھان پان شخصیت تھی اور بیوی دملا کسے ہوئے بدن کی گوری چٹی اور باتونی تھی۔ ہر ایک گھر میں جھانکنے کی عادت تھی۔ جس گھر میں جوان لڑکا ہوتا۔ وہاں کے چکر لگاتی ہی رہتی۔ ایک دن چھت پر عریاں حالت میں فیض کے ساتھ دیکھا تھا تو بلقیس پاگل کی طرح نیچے

اتر آئی تھی۔ امی چلائی تھی۔ "پاگل ہوئی ہے کیا؟"

"نہیں خوں خوار بندر، بندر یاہے چھت پر!"

کچھ مہینوں بعد گکر یجا کو لڑکا ہوا تو رشتہ داروں کے ساتھ پوری گلی کے لوگوں کو اس نے دعوت دی۔ بلقیس نے دیکھا کہ لڑکے کا چہرہ فیض جیسا ہے! اور اب، اب گکر یجا کا لڑکا پندرہ سولہ سال کا ہے۔ مکان کے اندر باہر سنگ مرمر لگا ہوا ہے اور وہ اسٹیریو کی آوازوں پر ناچتا رہتا ہے۔ سو سو چوہے کھا کر اس کی ماں بھگتن بن گئی ہے۔ سنا ہے، گھر میں مندر والے کمرے کے نیچے بتہ خانہ ہے جس میں امپورٹیڈ شراب کی بوتلیں رکھی جاتی ہیں۔

چھت پر امی چائے پہنچا گئی۔ تو منڈیر سے اس نے پیچھے کی گلی اور ڈربے نما کچے کچے مکانوں میں چائے کا گھونٹ بھر کر جھانکا۔ پھیکی روشنی اور اونچی آوازیں بستی کو آباد کیے ہوئے تھیں۔ بلقیس کو کالج کی پڑھائی کے دن یاد آگئے۔ ٹیبل لیمپ لگا کر اوپر چڑھ رہی تھی کہ اچانک پیچھے گولیوں کے گھروں سے ایک عورت کے چیخنے کی آوازیں ابھرنے لگیں۔۔۔۔ اس نے جھک کر سندر کی بہو کو آواز دی تھی۔ "بھابھی کون چیخ رہا ہے؟"

تمھاری چھوٹی بھابھی، پاتی کی بہو۔ بچہ ہو رہا ہے۔ دائی اندر ہے۔ دیکھنے کے لیے آجاؤ۔"

"دھت!" کہہ کر پیچھے ہو گئی تھی۔

ایک دن اندھیرے میں لوٹا لے کر چھپر بندوں کی طرف کے ٹیلے پر فارغ ہونے گئی تو پاتی کی بہو لوٹی ہی نہیں۔ اس کی لاش آئی۔ سانپ نے ڈس لیا تھا۔ پھلجھڑی جیسی ہنسی بکھیرنے والی عورت اب خاموش تھی۔ سودا سلف کے چار کام کر جاتی تھی۔ اسی لیے امی کو اس کی موت کا غم بہت دنوں تک ہوتا رہا۔

رات میں بستر پر پہنچی تو امی دریافت کر ہی بیٹھی، "تم آگئی" اچھا ہوا۔ مگر سہیل اور نذر کو مسوری اسکول میں ڈال کر بے انصافی کی ہے تم نے۔"

"امی، نوکری اور بچوں کو میں اکیلے سنبھال نہیں سکتی ہوں اور شاہد کی اپنی زندگی ہے، جس میں گھر کی عورت کپڑے اور زیور کی حق دار تو ہو سکتی ہے، مگر۔۔۔۔ خیر چھوڑیے، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بچے اچھے اسکول میں ہیں۔ اسکول میں پڑھانے سے میرا وقت بھی اچھا کٹ جاتا ہے۔" بلقیس نے لمبی سانس کھینچی تھی۔

شاید ابا نے اشارہ کر دیا تھا۔ امی نے رضائی سر کے اوپر چڑھا لی تھی۔ اس دن شام ہونے سے پہلے شمس میاں، شاہد اور اس کا حال چال پوچھنے آئے تھے۔ اصل میں وہ کوئی سراغ لگانا چاہتے تھے۔ کچھ ہاتھ نہ لگا تو بولے۔ "بلقیس دیکھ رہی ہے اس شہر کو؟ اس شہر میں تاریخی پتھروں سے بے انتہا محبت کرتے لوگ ایک دوسرے سے کبھی میٹھا نہیں بولتے تھے۔ اور آج۔۔۔۔ تاج محل دنیا کو بلاتا ہے اور ہمیں رلاتا ہے۔ اس پر متعصب فضائیں جینا حرام کر رہی ہیں۔"

لیٹے لیٹے بلقیس کو کالج کے دنوں کی یاد آ گئی۔ جب وہ انور میاں کے دیے ہوئے ربن بالوں میں باندھ کر نکلی تو شمس میاں جو گلی میں انگریزی پڑھے لکھے لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے اور آگرہ کی تاریخی عمارتوں کے فری لانس گائیڈ تھے بزرگ حاجی منیر کو لے کر گھر آ گئے تھے۔ بڑی سنجیدگی سے ابا کو سمجھایا تھا انھوں نے۔ رسک لے رہے ہیں آپ جیب میاں! کورس کی کتابیں خواتین کو متاثر کرتی ہیں مگر اس کا اثر الٹا ہوتا ہے۔ عورت اور گھوڑی، آدمی کے استعمال کی شئے ہیں۔ بہتر ہے کہ اپنے گھر اور اصطبل میں رہیں اور آدمی کے ہاتھوں میں اس کی نکیل ہو۔ باہر جائیں تو کنپٹیاں ڈھکی ہوں۔ میں تو روز دیکھتا ہوں گوری چمڑی کی عورتوں اور ہندوؤں کی جینس پہنی ہوئی لڑکیوں کو توبہ توبہ ---- وہ کیا قابو میں رہنے والی ہیں۔"

طنز سے ابا کے ہونٹ ترچھے ہو گئے تھے۔" شمس میاں، کیوں حاجی صاحب کو تکلیف دی۔ انھوں نے تو دنیا دیکھی ہے اور اب دنیا میں رہ کر صرف دین سے رشتہ بنائے ہوئے ہیں۔ سمجھنا آپ کے لیے ضروری ہے۔ گھر اور باہر کے خطروں کو پہچانیے۔ منشا یار ضیہ، گھر سے کب باہر نکلیں؟ اگر لڑکی باہر کی دنیا علم کے نور سے دیکھے، تو اس دوزخ کو کافی حد تک بدل سکتی ہے۔ ہر گھر میں ایک جنت بنا سکتی ہے۔ بہتر ہے کہ بلقیس کو اپنے راستے پر بڑھنے دیا جائے۔ تاکہ جب وہ اپنا گھر بسائے، تب اس کی زندگی میں صرف اندھیرا اصطبل نہ ہو۔ گھر ہو، جہاں ایمان اور انسان ساتھ ساتھ رہ سکیں۔"

آج بلقیس محسوس کرتی ہے کہ عورت پڑھی لکھی ہو یا ان پڑھ، مرد اس پر فقط سواری کرتا ہے۔ شاہد تو انجینیر تھا ---- اس کی وفا کا جب راز کھلا تو چابک نکال لیا تھا اور اسے گھوڑی بنا کر کنپٹیاں بند کرنی چاہی تھیں۔ تب بلقیس نے اپنی پڑھائی اور سوچ کو کتنا یتیم محسوس کیا تھا۔ اپنی ساری کشمکش اور انسانی حوصلے کو اپنے اندر ٹوٹتے ہوئے، تکیے کو آنسوؤں سے اس نے گیلا کر دیا تھا۔ ایک جھوٹا سا یقین دلایا تھا ---- "ترا جسم گروی ہے مگر روح تو آزاد ہے۔ اگر شاہد تجھے جانور بنا کر استعمال کرتا ہے تو تو اپنے پیار کے سارے دروازے ادھر سے بند کر دے۔"

اس دن شمس میاں بر امان گئے تھے۔ مگر جب بیٹے اور بیٹی کے لیے اچھا گھر تلاش نہ کر سکے تو معافی مانگی تھی۔ جیب بھائی، تمھارا تجربہ میری سوچ سے بہتر ہے، بلقیس کو لگا کہ اگر ابا کے تجربے کی ناکامیابی انھیں بتا دیں، تو کیا سوچیں گے شمس میاں؟"

کالج کے زمانے میں بلقیس اپنا کے محمود کے قریب آ رہی تھی۔ دونوں کی دوستی نظیر اکبرآبادی کے عرس پر پرانی منڈی میں ہوئی تھی۔ نظیر کی شاعری نے بلقیس کو بہت متاثر کیا تھا۔ وہ اپنا میں جوش و خروش سے کام کرنا چاہتی تھی، مگر ابا نے ٹیڑھی لکیر کھینچ دی تھی۔ "تمھیں آزادی دینے کے لیے تیار ہوں، مگر پہلے اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤ۔"

اور وہ تاج گنج سے دیال باغ پہنچ گئی، ایک سال کے لیے بی ایڈ کرنے۔ محمود سے ملنا بھی

بند ہو گیا۔ نواب رائچی میں کھیلنے کی وجہ سے وہ بہترین نوکری پاکر بڑودہ چلا گیا۔

بلقیس ان دنوں جمیل کے نادان پیار کو بھلا کر محمود کے سپنوں میں ڈوبی رہتی تھی۔

"جو تا جو چراتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی ----" جیسے شعروں نے اس کی سوچ کو بدل دیا تھا۔ تب وہ اوروں کی طرح گلی کی زندگی کو پہچان کی نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔ اس دوران جمیل ڈپلوما لے کر واپس آگیا تھا۔ مگر اس نے بلقیس کی طرف آنکھیں نہیں اٹھائیں۔ بلقیس جب بھی اپنے اندر کھوجتی تو وہ جمیل کو اپنے اندر پاتی۔ حالاں کہ اس کی نامعقول حرکتیں اسے پسند نہیں تھیں۔ بچپن میں ایک دن اردو پڑھاتے وقت مولوی صاحب نے جمیل کو بہت پیٹا تھا، کنیر کی ٹہنی سے۔ غصے میں زبان سے مولوی صاحب کو بلقیس نے چڑایا تھا۔ بڑی اماں سے بھی کہا تھا کہ قصائی جیسے مولوی صاحب کو ہٹادیں۔ بڑی اماں خوب ہنسی تھیں ----۔ لگتا ہے کہ جمیل نے مار کھائی مگر چوٹ تجھے لگی ہے۔"

آج اچانک ہی آگرے کا آدمی ہندو اور مسلمان بن گیا۔ خون کا رنگ بدل گیا۔ شہر کے امن کو چیل اٹھاکر لے گئی۔ تاج گنج کا بچہ بچہ تاج محل کا عاشق ہوتے ہوتے بھی اچانک ایک دوسرے کا دشمن بن گیا۔ گمٹ کے چودھری خاں نے اسلحہ جمع کرائے۔ کوچہ پتی رام کے کیسری سیٹھ نے ہتھیار بند غنڈوں کے لیے سدا ورت کھول دیا۔ مگر پہلا شکار کون بنا؟ ایک بڑھیا فقیر، جس کی شناخت میں کوئی کہہ نہیں سکتا کہ ہندو ہے یا مسلمان۔ اور دنگے شروع ہوگئے۔ رشید میاں آرام سے پولیس کے پہرے میں دن گزارتے یا ہتھیار بند جیپ میں گلزاری لال کے یہاں بوتل کھول کر غم غلط کرتے۔ دونوں کو لگتا تھا کہ یہ جھگڑے ان کی لیڈری کی سیڑھیاں بنیں گے۔

کرفیو ہٹنے کی خبر اخبار میں پڑھتے ہی بلقیس آگرہ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ شاہد نے اوپری طور پر کہا۔ "دو دن بعد جائیں تو بہتر ہے۔" مگر بلقیس جانتی ہے کہ یہ دکھاوا ہے۔ اب کلب سے شاہد جلدی لوٹا کریں گے اور سروج ملکانی پہلے سے کوٹھی میں انتظار کرتی ملیں گی۔

رکشا جب گورنمنٹ اسکول کے پاس سے ہوتا ہوا تانگہ اسٹینڈ سے گزرا، تو کئی آنکھوں نے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ نندا بازار سونا اور سہما ہوا تھا۔ نندو کچوری والا دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور ممن سبزی والا مرے ہوئے ہاتھوں سے ترازو سنبھالے ہوئے تھا۔ کٹرہ شہناز کی گلی نمبر دو میں سور اور کتے بنا کسی تفریق کے کیچڑ بھری نالی میں پڑے ہوئے تھے۔ تعجب ہوا تھا پاک ٹولے کے پاس دھرم سنگھ کی حویلی کا پھاٹک سونا پڑا دیکھ کر۔ یہاں ریٹائرڈ منشی فخرالدین، کنور شریواستو، "نتھو پہلوان اور نہ جانے کتنے لوگ ڈیرا جمائے رہتے تھے۔ یہ جوبلی گلی، بستی کی لڑکیوں کے لیے ڈھارس بندھانے میں مدد کرتی تھی۔ کہیں کوئی چھیڑ دے، تو سب سے پہلے شکایت یہیں درج ہوتی تھی اور سزا دینے کا پرچم نتھو پہلوان یا ان کے شاگرد فصیل پہلوان اٹھاتے تھے۔ نتھو پہلوان اور ان کے شاگردوں کا ایک سلوگن تھا ----۔ پہلوان کی صحیح پہچان

۔۔۔۔ لڑکی بوڑھی بہن سمان!

اپنے گھر کی کنڈی کھٹکھٹانے سے پہلے پیار بھری نظروں سے اس نے جمیل کے بند دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ دروازہ امی نے کھولا اور دیکھتے ہی لپٹ کر رو پڑی۔ "میری بچی!" ابا نے صبر کا دامن تھامے رکھا۔ "خیرت تو ہے! بچے اور شاہد میاں!"

"جی اللہ کا فضل ہے۔" پھر امی نے اس کے سامنے بری خبروں کا پٹارہ کھول دیا۔۔۔۔

"ہمارے جمیل کو نفرت کی آگ نگل گئی۔ کیسا بانکا جوان تھا۔ ڈیوٹی سے اسکوٹر پر لوٹ رہا تھا۔ کافروں نے آنتیں نکال دیں۔ گلی نمبر سات کی شکیلہ کے ساتھ نہ جانے کتنوں نے منھ کالا کیا۔ بے چاری فساد سے ناواقف تھی اس لیے بس اسٹانڈ پر اتر کر رکشے میں آرہی تھی۔ پولو گراؤنڈ کے سامنے غنڈوں نے پکڑ لیا۔ رکشا والے کو کاٹ دیا۔ بعد میں شاہ جہاں گارڈن کے ایک تالاب میں شکیلہ کی سڑی گلی لاش ملی۔

بلقیس کو جمیل کا قتل دہشت سے ہلا گیا۔ اسے محسوس ہوا، ایک معمولی بار سے ایک دم صوفی بن گیا تھا بے چارہ۔ جب نوکری شروع کی تھی تو وہ خود مبارک باد دینے گئی تھی۔ "میاں، آپ تو ولی بن گئے" "ہم تو وہی ہیں" جیسے پہلے تھے۔ اسی لیے مبارک باد دینے اور مٹھائی کھانے آگئے:

بڑی اماں نے پیڑوں کا ڈبہ سامنے رکھ دیا اور آنچل پھیلا دیا۔ "بھائی کو دعا دے کہ تیرے جیسی خوب صورت اور پڑھی لکھی بیوی ملے۔" بلقیس گھبرا گئی تھی۔ جمیل گہری نظر ڈال کر اور بہانہ بنا کر چلا گیا تھا۔ بڑی اماں کے آنسو نکل پڑے تھے۔ ایک دم صوفی بن گیا ہے۔ بولتا ہی نہیں۔ تیس کا ہو گیا ہے پر نکاح کے لیے تیار نہیں ہے۔ مجھ سے اب نفرت تو نہیں کرتا، پر ایک بار "امی" سننے کے لیے میری روح تڑپ رہی ہے بیٹی تو سمجھانا اسے!"

ابا کی درد بھری آواز نے اسے چونکایا تھا۔ "نفرت کی آندھی کسی پر مہربان نہیں ہوتی ہے بلقیس۔ دونوں طرف جوان لڑکے مرے، عورتیں پامال ہوئیں اور بے گناہ تھانوں میں بند ہوئے۔ دھرم سنگھ اور ان کے نوکر کشور کو کوئی نیند میں ہلاک کر گیا۔ نتھو اور پہلوان نے فساد ختم کرانے کی کوشش کی۔ رشید میاں اور گلزاری کے اشارے پر وہ جیل پہنچ گئے۔"

"دھرم چاچا کو بھی۔۔۔۔" بلقیس ہاری ہوئی سی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

ایک لمبی گھائل سانس کھینچ کر ابا وقت کا شجرہ بلقیس کے سامنے کھولتے ہیں۔۔۔۔ "چلو یہ لوگ تو نفرت کی آگ میں جلے۔ پر جمیل کی بڑی اماں نے کیا گناہ کیا تھا؟ جب وارث نہ دے سکی تو خود میاں کا دوسرا نکاح پڑھوایا۔ سوت کو چھوٹی بہن مانا۔ مگر اس نے اسے بہن نہیں مانا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ چھوٹی کو کینسر ہو گیا۔ وہ چل بسی۔ بڑی نے کیا نہیں کیا جمیل کے لیے۔ اس کو لڑکے نے بھی کبھی "امی" یا "بڑی امی" نہیں کہا اور وہی بے غیرت عورت جمیل کی لاش پر ہائے میرا لال کہہ کر گری، تو اٹھی ہی نہیں۔ اس قربانی کو کیا کہو گی۔ بلقیس؟ اندھا ہو گیا ہے آدمی۔ ہر

آدمی عیاش شیخو اور عورت ملکہ نور جہاں بننا چاہتی ہے۔ ایسے وقت میں جمیل کی بڑی اماں کا پیار بھرا وجود ایک کوڑے دان کی حیثیت ہی تو بن جاتا ہے۔"

بلقیس محسوس کرتی کہ فرق آج بھی خاص نہیں ہے ۔۔۔۔ بچے پنڈت جی کے خوانچے سے ہر گلی میں چورن خریدتے ہیں، کالے کپڑے پہنے پیر فقیر ہندو اور مسلمان دونوں ہی گھروں میں مور پنکھ کے مور چھل سے بھوت پریت جھاڑ آتے ہیں۔ فرق تو سیاست اگاتی ہے۔

ابا کی باتیں سن کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے بلقیس نے! چائے پی کر اوپر چھت پر خود سے مخاطب ہونے چلی آئی تھی۔ پیچھے کولیوں کی گلی میں کہرام مچا تھا۔ اسے دیکھ کر مولا کی ماں رو پڑی تھی۔ "بیٹیا" کرم پھوٹ گئے۔ جھگڑے نے آدمی کو مردہ بنا دیا ہے۔ دس دنوں میں چار آنے بھی نہیں کمائے۔ بچے بھوک سے بلبلا رہے ہیں۔"

"کیوں سرکار نے ؟" پھر خود ہی چپ ہو گئی تھی۔ جانتی ہے کہ سرکار کی سیاست کو رشید میاں اور گلزاری لال چلاتے ہیں۔ جن کے یہاں سرمایہ دار ہنہناتے ہوئے تھیلی پہنچا دیتے ہیں۔ ان کو غریب بستی کی بھوک اور تلملاہٹ سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ انتخاب کے وقت چند لوگوں کو خرید کر، نئے چہرے لگائے وہ ہر گلی میں فرشتے کی شکل میں اتر جائیں گے۔

بلقیس کی نگاہ املی کے درخت پر پڑی۔ چونک اٹھی تھی وہ پیڑ پر اترتے ہوئے گدھ کو دیکھ کر ۔۔۔۔ یہ پچھلے سال تک تو یہاں نہیں تھا ۔۔۔ کب آ گیا؟

اچانک اسے اپنی کوٹھی کی یاد آ گئی۔ جہاں شاہد میاں کی آنکھوں میں گدھ کی آنکھ کو اس نے پہچانا تھا۔ سہانے دن اچانک ہی طوفان سے گھر گئے تھے، بلقیس جب بھی کروٹ لیتی تھی، گدھ پھڑپھڑا اٹھتا تھا۔

وہ ابا امی سے مل کر آگرے سے لوٹی تھی۔ رکشا رکا تو پورچ میں سہیل اور نذر کو اداس بیٹھے ہوئے پایا۔ پوچھنے پر سہیل نے کہا، "ابا جان نے ڈانٹ کر کہا ہے کہ باہر بیٹھو۔"

کیوں؟ اندر کون ہے؟ پریشان سی بلقیس نے دونوں بچوں کو آغوش میں لیتے ہوئے پوچھا تھا۔

"چمپا بوا ہے۔" سہیل نے کہا۔ نوکرانی چمپا کو بچے بوا ہی کہتے تھے۔ بلقیس کی روح اچانک ہی کوچ کر گئی تھی۔ دروازے کی گھنٹی بجائی تو کافی دیر کے بعد غصے سے شاہد آئے تھے۔ اسے دیکھا تو چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ پھر گرگٹ بن گئے تھے۔ "ارے فون کر دیتی تو گاڑی بھیج دیتا۔"

بلقیس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ شاہد سے وہ جسمانی رشتہ قائم نہیں رکھ سکے گی۔ اس وقت جمیل بہت یاد آ رہا تھا، جو آگرہ لوٹ آیا تھا۔ نوکری کر رہا تھا اور جس نے نکاح سے انکار کر دیا تھا۔ انکار کی وجہ صرف بلقیس اور جمیل ہی جانتے تھے اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اندھیرے سے نکلنے کی کوشش میں سورج کے قریب پہنچ کر جل رہی ہے۔

تین دن بعد قہر ٹوٹا۔ شاہد دیر سے آئے۔ بچے سو چکے تھے۔ اس نے پاجامہ کرتا تھمادیا۔ تو شاہد نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ بلقیس ہٹ گئی تو گرم ہوگئے۔ بلقیس نے اپنی بات پیش کی تو تلملاگئے۔ ان کا انجینیر ایک رکشا والے کی شکل میں تبدیل ہوگیا۔ انھوں نے گھٹنوں سے بلقیس کا سینہ دبادیا۔ وہ بے ہوش سی ہوگئی۔ اپنی مراد پوری ہونے کے بعد وہ آرام سے سوگئے۔ بلقیس رات بھر سوچتی رہی۔ اس نے طے کرلیا کہ شاہد بھلے ہی جسم کا استعمال کریں۔ اس کی روح آزاد رہے گی۔ شاہد کو روح درکار بھی نہیں تھی۔ ان کی آنکھوں میں گدھ بیٹھ گیا تھا جو شکار کرنے میں چوکتا نہیں تھا۔ شاہد نے طنزیہ الفاظ اگلے تھے۔ "طلاق دے کر آزاد نہیں کروں گا۔ دیکھتا ہوں، کب تک تری عقل ٹھکانے نہیں آتی ہے۔"

بلقیس طلاق نہ دینے کی وجہ بھی جانتی ہے۔ بچوں نے کم عمر میں ہی باپ کے ظلم اور ماں کی بے بسی کو پہچان لیا تھا۔ اسے لگا کہ دولت مرد کے اندر سے ایک بیوی کی پاکیزہ محبت کو ترک کرکے ہوس کے حرم بنانے لگتی ہے۔ ایک بیوی، کئی بیویاں، ایک بیوی یا کئی رکھیلیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ دونوں ہی شکلوں میں عورت ہی مسلی کچلی جاتی ہے۔

بلقیس حویلی کی املی کے گدھ کو برداشت نہیں کرپائی اور نیچے اتر آئی۔ نیچے امی سالن کے لیے مصالحہ پیس رہی تھیں۔ اسے پاس بٹھاکر انھوں نے پوچھا، "شاہد میاں ناراض تو نہیں ہیں، تیرے آنے سے؟"

ایک چھپا ہوا طنز ہونٹوں پر آگیا، "نہیں امی! بڑے انجینیر ہیں انھیں دوسروں کے لیے سوچنے کی فرصت کہاں ہے؟"

"دوسرے! ارے، ہم کب سے پرائے ہوگئے بیٹا۔ پہیلی نہ بجھا، صاف صاف بتا" امی نے جھڑکتے ہوئے کہا۔

"اگر انھیں کسی اور کے لیے فرصت ہوتی تو بچوں کو مسوری کیوں بھیجنا پڑتا امی؟"

"صاف صاف بتا بیٹی۔"

کھلکھلاکر ہنسی تھی بلقیس اور سچائی کو دل کی سات پرتوں کے نیچے چھپادیا تھا۔ تمھیں کیسے سمجھاؤں؟ میری بھولی بھالی امی! انگریزوں کو نکال کر جہاں پر آدمی انگریزوں کی طرح رہتا یا رہنا چاہتا ہو، اس دنیا کی بات تم اس گلی میں رہ کر نہیں سمجھ سکتی ہو۔ تمھیں گلی سے باہر نکلنا ہوگا، جیسے رشید میاں نکل گئے۔"

"میری جوتی جائے بیٹا! ہمیں، ہماری گلی مبارک! لاکھ لڑیں مریں لوگ، مگر کسی کی انگلی کٹتے ہی ہلدی لے کر ہر کوئی تیار رہتا ہے یہاں۔" امی کے آنکھوں سے دنگوں کی دہشت کافور ہوگئی تھی اور امید کی شمع جل اٹھی تھی۔

امی کو تو بہلادیا، مگر ابا سے کترانا مشکل تھا۔۔۔۔ "کب جاؤگی بلقیس؟ شاہد میاں کو

تکلیف ہو رہی ہوگی؟"

"کیوں ابا؟ کیا بھاری پڑ رہی ہوں؟" بلقیس نے ہنسنے کی کوشش کی تھی۔

ابا نے گہری نگاہوں سے دیکھا تو دبی ہوئی آواز میں کہا، "گھر میں چمپا نوکرانی ہے اور دفتر میں مس ملکانی! اچھی دیکھ بھال کر لیتی ہیں، ابا۔"

ابا سچائی کو سمجھ گئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک ڈرا ہوا کبوتر آ بیٹھا تھا۔ جیسے آنکھیں کہنا چاہتی ہوں کہ بیٹی ان آخری دنوں میں کوئی بری خبر نہ سنا دینا کسی دن۔

بلقیس ہنسی تھی۔ "ڈریے نہیں ابا۔ جس دنیا میں علم کے بندے پیسے کی ٹکسال میں شامل ہو جاتے ہیں، وہاں روحانی رشتوں کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ ہاں سماجی رشتوں کو کاٹھ کے گھوڑے کی طرح سجائے رکھنے کا فخر بھی وہ نہیں چھوڑتے ہیں۔ اس لیے رشتے میں دراڑ ہوتے ہوئے بھی رشتے کی عمارت ڈہے گی نہیں، زمیں بوس نہیں ہوگی۔ آپ بے فکر رہیں۔ آپ نے مجھے اتنا مضبوط بنا دیا تھا کہ بلقیس خود کبھی نہیں گرے گی۔ ٹوٹی ہوئی عمارت کو سنبھالے اور سنوارے رہے گی۔ آج کی ترقی یافتہ دنیا ایک مجبوری کی کائنات ہے۔ جب تک یہ کائنات ہے۔ مہرے لڑکھڑا کر بھی بساط سے نہیں گریں گے۔"

بلقیس کے ابا مجبوری کی کائنات کا خلاصہ کرنے میں ہار گئے تو چلم گرم کر کے گڑگڑانے لگے کہ دھواں کتنی اونچائی تک جاتا ہے۔ انھیں لگا کہ مجبوری کی کائنات یا دھواں دھواں اونچائی دونوں ہی ایک پہیلی ہے۔ ایسی پہیلی جس کی اصلیت پہچان کر بھی ہم انجان رہتے ہیں۔

○ ○ ○

ضیا جالندھری

غزلیں

وہ پاس تھا، پہ کسی دور کے خیال میں گم
میں فاصلوں کی نئی شکل کے ملال میں گم

پسِ مژہ مری رفتہ رتوں کی یادیں ہیں
کئی جہان ہیں اس چشمِ تر کے تال میں گم

میں اس کی بزم سے آتو گیا کہ آنا تھا
مگر یہ آنکھیں کہ ہیں اس کے خدوخال میں گم

اب اس کے ذکر سے کیا فائدہ کہ مدت سے
وہ اپنے رنگ میں خوش ہے، ہم اپنے حال میں گم

تمام نکتہ وری اس نظر کے سامنے ہیچ
فسونِ حرف و سخن تابشِ جمال میں گم

چلو کہ عفتِ اقدار ڈھونڈھنے نکلیں
جو ہو گئی کہیں افسونِ جاہ و مال میں گم

چلے تھے لے کے جنہیں قریۂ کمال کی سمت
وہ خواب کب کے ہوئے عرصۂ زوال میں گم

اب ان پرندوں کی آواز کیوں نہیں آتی
نواگرانِ محبت ہیں کون جال میں گم

شجر کی ہیئتِ موجود پہ فسردہ نہ ہو
ہزار باگلِ امکاں ہیں اس کی چھال میں گم

کہاں کرو گے ضیا گہرے پانیوں میں تلاش
وہ دل جو ہو گیا اک لپکتے سوال میں گم

یہ خاک ہے سخن گفتنی، زباں میں ہوں
زمیں پہ پھیلے ہیں نقش اس کے، ترجماں میں ہوں

اگر میں تجھ سے الگ ہوں تو فاصلہ کیا ہے
کہاں پہ ختم ہوئی تیری حد، کہاں میں ہوں

عدم میں رکھ مجھے یا حیطۂ وجود میں رکھ
یہ "ہے" "نہیں" کی کشاکش نہ ہو جہاں میں ہوں

مجھے یہ رنج کہ تو مجھ پہ آشکار نہیں
زمانے بھر کو گماں تیرا راز داں میں ہوں

تری عطا کہ خیال و نظر ہیں لامحدود
تو بے کنار، ترا عکسِ بیکراں میں ہوں

شجر، حجر، گل و لا سب ترے کلام کے رنگ
مخاطبِ سخن و درخورِ بیاں میں ہوں

کبھی کبھی تو ضیا شک تھا اپنے ہونے پہ
کبھی کبھی یہ لگا مرکزِ جہاں میں ہوں

شفیق فاطمہ شعریٰ — غزل

جھونکے، دھوپ، صدائیں، سائے پاری جات!
جانے پھر کب وہ رت آئے پاری جات!
آدی باسی میلے میں گہنوں کی دکان
کتنا پیار دلار کمائے پاری جات!
ہرکارے رہوار ہوا پر دوڑائے
ورق ورق خود کو بکھرائے پاری جات
بنتے بکھرتے لعل یشب پکھراج کے ڈھیر
کوچے جوہریاں بن جائے پاری جات
پھر دیکھا تو شبنم کی رم جھم میں گھلی
تاروں کی جھلمل تھی بجائے پاری جات
پھر دیکھا تو نیلاہٹ میں دھنک کے رنگ
تیری خوشبو کے پیرائے پاری جات!
پگڈنڈی پر پھر رتھ دوڑا، دھول میں پھول
پڑے ہیں مرجھائے مرجھائے پاری جات!

ہارسنگھار کہے اتنا تو وہ نامانوس
پھر بھی ردیف میں لایا جائے پاری جات۔

پاری جات۔ ہارسنگھار (مراٹھی)

غزلیں

جب سے یہ دل میزان ہوا
کیا بونوں، کیا نقصان ہوا

ہم نے تو شمع جلائی تھی
یہ دل کیوں آتش دان ہوا

کب راہ کٹھن تھی میرے لیے
کب مجھ پہ سفر آسان ہوا

مجھ میں بھی تو ہے اک آبادی
میں کب سارا ویران ہوا

کل رات جو تارا ٹوٹ گرا
دل رہ رہ کیوں ہلکان ہوا

نکلا ہے کوئی جگنو سرِ شب
میرے جینے کا سامان ہوا

ہیں برہم خواب و ماہ مرے
وہ کون کہ حسرت جان ہوا

کب میری پہنچ سے باہر تھا
کب مجھ پر وہ آسان ہوا

چھو کے مجھے تو نے چھوڑ دیا
لے! میں تیری پہچان ہوا

تھا دل میں تو تھے خواب امنگ
کیا بولتا گھر سنسان ہوا

احمد جاوید

کچھ بول اے دلبر بول
خاموشی کے پیکر بول

تو کس کا تفخر تھا
ٹوٹے ہوئے شہپر بول

تعبیر کروں تودے سے
چاہے تو سمندر بول

"در ہے نہ کوئی دیوار"
بے جبر اسے گھر بول

اس در سے ملا کیا ہے
اے دل بڑائے گداگر بول

جو زخم ملے ان سے
انہیں تارے چندر بول

ق

ہے اپنے تئیں کہنا
پھر سوچ سمجھ کر بول

آنکھوں کو صحرا کہہ
سینے کو سمندر بول

قرض دل کا جو ہے ادا کرنا
نظم لکھنا، غزل کہا کرنا

جو بھی ہونا ہے تیری رحمت سے
ہمنا آتا نہیں دعا کرنا

اب تو عادت سی پڑ گئی دل کو
شام ہی سے جلا بجھا کرنا

اک یہی کام روز و شب اپنا
خود ہی بننا، خود ہی ڈھا کرنا

ق

اچھا کرنا کہ پھر برا کرنا
کام یاں کچھ نہ کچھ کیا کرنا

کچھ نہیں ہے، تو دل کے ٹانکے ہی
کھولنا اور پھر سیا کرنا

لے! چلے اب جھٹک کے دامن ہم
دل میں کب تک ترے رہا کرنا

عشق گر جرم ہے تو اے سجنی
اک یہی جرم بار ہا کرنا

ہواؤں کو اذنِ سفر کس لیے
دیے ہیں پرندوں کو پر کس لیے

یہ ہر روز خورشید چھپتا ہے کیوں
نکلتا ہے نجم السحر کس لیے

رکھا کس لیے سر پہ اوندھا فلک
بچھائے ہیں یہ بحر و بر کس لیے

ذرا اور پھیلائے آفاق کو
نہیں تو یہ ذوقِ نظر کس لیے

ہے بستر زمیں اور چادر فلک
یہ درباں یہ دیوار و در کس لیے

میں خود اک تلاطم میں خود اک فشار
یہ صرصر ہے کیا یہ بھنور کس لیے

نہیں ہے کوئی خواب و خواہش تو پھر
یہ امید کیا ہے، یہ ڈر کس لیے

فلک پہ ستارا پلک پر لہو
چلے جاتے ہیں بے خبر کس لیے

ابھی تک سمجھنے سے قاصر ہے دل
ادا چیز کیا ہے، نظر کس لیے

کم تری کا نہ برتری کا ہے
یہ رویہ تو دلبری کا ہے

خاک اڑانے کی کس میں طاقت ہے
یہ تماشا تو بے گھری کا ہے

درد ڈھلتا ہے لفظ و معنی میں
شوق کس کو سخنوری کا ہے

چاند بھی ماند پیش تاب سخن
پھر اسے دعوا ہم سری کا ہے

دل سے، جانم! تجھے مٹا دینا
مرحلہ سخت آزری کا ہے

اس کا دربار، سر اٹھاتے کیا
یہ علاقہ تو چاکری کا ہے

اوروں سے کہتے ڈرتے ہیں
ہم چاند سے باتیں کرتے ہیں

زخموں کو شگوفے کرتے ہیں
آ دیکھ! کہ کیا بسر کرتے ہیں

کچھ دل نہیں تیرا، بھر جائیں
یہ زخم ہیں، بھرتے بھرتے ہیں

وہ تارے ہوں یا زخم مرے
راتوں کو چمکا کرتے ہیں

دل جانتا ہے سوز و تاب
بارش سے پھول نکھرتے ہیں

وہ تیرے لمس کہ خواب ترے
چپکے سے دل میں اترتے ہیں

جینے کے سہارے باقی ہیں
دو چار ستارے باقی ہیں

خود سے تو گئے تجھ سے بھی گئے
کیا اور خسارے باقی ہیں

آنکھوں میں بھٹکتے ہیں خواب ابھی
گویا کہ شرارے باقی ہیں

بچہ تو خوش ہے کہ اس کے پاس
دو چار غبارے باقی ہیں

لو کام تمہارے نپٹ گئے
کچھ کام ہمارے باقی ہیں

غزلیں

روشن لعل روشن

ان آنکھوں میں رہتا ہوں
میں آنسو کا قطرہ ہوں

خود سے کیا پہچان ہوئی
محفل محفل تنہا ہوں

دل کی جانب جا نکلا !
یوں خود کو کھو بیٹھا ہوں

چارہ گرو! مایوس نہ ہو
پہلے سے اب اچھا ہوں

روئے فضا کیا نکھری ہے
اتنا کھل کر رویا ہوں

آئینوں کی نگری میں
یارو میں بے چہرا ہوں

قطرہ قطرہ ایک بھنور
میں یادوں کا دریا ہوں

حسرت سے مت دیکھ مجھے
مفلس کا سرمایا ہوں

خوابوں کا بیوپاری ہوں
ہنس کر دھوکے کھاتا ہوں

بستی میں بازاروں میں
اب میں کھوٹا سکہ ہوں

یارو حافظ ہے اللہ
اچھا تو اب چلتا ہوں

میرے اندر اک جگ روشن
میں تیرا آئینہ ہوں .

ذکی بلگرامی

اپنی چشم تر میں ضو افشانی رکھ
اشکوں کی چھاگل میں زندہ پانی رکھ

جسم کے اس پنجرے میں وحشی رہتا ہے
اپنے اس وحشی پہ کڑی نگرانی رکھ

اپنا منظر اوروں کے منظر سے جوڑ
لیکن اپنا پس منظر لاثانی رکھ

دل کے اندر کیسا گھور اندھیرا ہے
اس تہہ خانے میں اک روشندانی رکھ

میرے مولا! میرا ابھی تو سینہ کھول
میرے اندر بھی انمول نشانی رکھ

رزق کشادہ کر دے میری آنکھوں کا
بینائی کے کاسے میں حیرانی رکھ

ایک بگولا پربت سے کہتا ہے ذکی
تو بھی اپنے پیروں میں جولانی رکھ

غزل

ذکیؔ بلگرامی

صورتِ دودِ پریشاں آسماں باقی ہے کچھ
بوند بھر سایہ سرِ آشفتگاں باقی ہے کچھ

مُہرِ ناموسِ سیادت دیکھ میری پشت پر
میرے پُرکھوں کی چٹائی کا نشاں باقی ہے کچھ

کھل گئی پھر دردِ دل کے گوشواروں کی بیاض
یاد پھر آیا حسابِ دوستاں باقی ہے کچھ

زندگی خوابوں کے ٹکڑے جوڑنے میں کٹ گئی
آپ کہتے ہیں کہ کارِ دیگراں باقی ہے کچھ

عقل کہتی ہے کہ اس کی نذر سب کچھ کر دیا
دل یہ کہتا ہے سرِ محرابِ جاں باقی ہے کچھ

گرمیِ پروازِ شہ پر سے اُترتی ہی نہیں
ایسا لگتا ہے کہ سیرِ لامکاں باقی ہے کچھ

طاق پہ ٹوٹے ہوئے کوزے سجا رکھتا ہوں میں
اِن میں خوشبوئے کفِ کوزہ گراں باقی ہے کچھ

قریۂ نامہرباں میں پاؤں پھیلانے ذکیؔ
خیریت جانو کہ سر پہ سائباں باقی ہے کچھ

کب مجھے دولت کدہ معلوم تھا اس شخص کا
پیاس کی خوشبو نے بتلایا پتہ اُس شخص کا

بہتے دریاؤں کے ماتھے پہ ہواؤں کا قلم
حشر تک لکھتا رہیگا مرثیہ اس شخص کا

نیل میں رستہ بنایا اور موسیٰؑ چل پڑے
اس قدر آساں نہیں تھا راستہ اس شخص کا

کیسے اپنا خون بہا لوں؟ کیسے اسکی جان لوں؟
میرا دشمن دے رہا ہے واسطہ اس شخص کا

رات بھر اک روشنی کرتی رہی میرا طواف
رات بھر کرتا رہا میں تذکرہ اس شخص کا

اس لیے شاداب رہتی ہے ذکیؔ شاخِ گلو
میرے ہونٹوں پہ ہے اسمِ جانفزا اس شخص کا

غزلیں

شکیل اعظمی

میں ڈوب جاؤں، ہوا اپنا رخ بدلنے لگے
نہ جانے کب یہ زمیں پاؤں سے نکلنے لگے
وہ میرے اشک ہوں یا تری یاد کے جگنو
کوئی چراغ جلے، کوٹھری اجلنے لگے
اندھیرا کر کے دل و جاں میں بیٹھا رہتا ہوں
دیا جلاؤں تو ممکن ہے کوئی چلنے لگے

گذشتہ شب مرا لفظوں سے رابطہ یوں تھا
کہ جیسے خاک سے چشمہ کوئی اُبلنے لگے

سفر ہے شرط، کسی سمت کو نکلتے رہو
صلہ ملے نہ ملے راستے پہ چلتے رہو
شناخت کے لئے قربانیاں ضروری ہیں
چراغ بن کے کسی رہگذر پہ جلتے رہو
عذاب یہ بھی ہمارے ہی سر اترنا تھا
کہ شہر ہی میں رہو اور گھر بدلتے رہو

اسی کے ہو رہو جو چیز دل کو بھا جائے
کسی بھی طرح کسی شغل سے بہلتے رہو

برف پگھلے، کہ زر آراستہ ہونے لگ جائے
دھوپ مل کر مرے احساس سے رونے لگ جائے
دل کی دھڑکن بھی سنائی نہیں دیتی اب کے
تیری یاد آئے کوئی چیز چبھونے لگ جائے
یا تو اختتام ہو بہتے ہوئے پانی کا سفر
یا کوئی لہر مری ناؤ ڈبونے لگ جائے
ایسی سردی ہے، کہ اس بار مرے ہاتھوں سے
ڈر رہا ہوں کہ ترا لمس نہ کھونے لگ جائے
کوئی منظر کوئی تصویر بنے آنکھوں میں
ابر برسے در و دیوار بھگونے لگ جائے

صلاح الدین محمود

نس دن

خواب میں سائے نہیں ہوتے تھے
کبھی ایسا تھا
کہ بیداری بھی بے سایہ تھی
میرا بچو تاجا بدن
اس چاندر کی تلاش میں رہتا تھا
کہ جو
سب سے پہلے خواب میں
میں نے پایا تھا،
ایک دریا تھا
جو کہ چاندر کی عمر جتنا پرانا تھا
اور اب زمین میں دھنس کر
دن رات بہتا تھا
کہ اس کے دوسرے پہلو

سورج کے انگ جیسے جنگل میں
میں نے یہ چاندر پایا تھا
یہ وہی چاندر تھا کہ جہاں چڑیاں
اپنی بینائی پانے لائی جاتی تھیں
کہ جس کی کوری دوب پر
میں ننگے پیر تھا
اور سائے نہیں تھے

پھر جب پہلے خواب کے بعد
پہلی بیداری میں
نابینا پن میرے کاندھے آیا
تو میں نے ہر رات
وہ چاندر چاہا
مگر نہ پایا،
میں نے دریا پائے
مگر ان کے خم بے چاندر تھے
میں نے سورج کی رنگت کے جنگل پائے
مگر ان کی منڈیروں پر کے دریا
انجانے تھے

اپنے کاندھے، میں

اپنی نابینا چڑیا لیے
نیند در نیند، خواب در خواب
جاگ در جاگ
پھرا ہوں
مگر وہ چاند رنہ ملا ہے
اور میں نا آشنا ہوں

کیا یہ چاندر
صرف پہلے اور آخری خواب میں
وا ہوتا ہے

جمال اویسی

اپنے لیے ایک نظم

اے خاک مجھے پہچانتی ہے!
کیا میرا نسب تو جانتی ہے؟
میں چیستاں اپنے واسطے ہوں
تو بھی مجھے مبہم مانتی ہے؟

اے باد! خیال ترا ہے کیا؟
کیا تو بھی نہیں ہمراز مرا؟
میں نے تو سنا ہے لوگوں سے
ہے تجھ سے تنفّس جاری مرا
چل مجھ کو بتا
میں کون ہوں میرا نام ہے کیا؟
کیوں آتشِ جاں کے ایندھن سے
میں شعلہ بیاں ہو جاتا ہوں
اور بول کے جب چپ ہوتا ہوں
تب سوچتا ہوں، کیا بول گیا
سب بھول گیا!

اے آب و ہوا
اے آتش و خاک!
تخلیق مری کیوں ایسی ہے؟
ہیں چار عناصر جب مجھ میں
پھر کس لیے تنہائی سی ہے؟
کیوں خود سے گریزاں رہتا ہوں
کیوں خاک اُڑاتا پھرتا ہوں

جمال اویسی

ویران گاہ

رات کے طولِ المناک میں دیکھوں اکثر
آسماں گرد کی مانند اڑے اور زمیں
پھیل کر وسعتِ افلاک میں چھا جاتی ہے
یک بیک زندگی ویران نظر آتی ہے

ہنگام

مجھ کو معلوم نہیں کتنے زمانے گذرے
میں وہی، لوگ وہی، دن کا پہر، رات وہی
زندگی تیز کہیں، سست کہیں
اس کا معمول یہی
پھر بھی سب چھوٹ رہا ہو جیسے
اڑتے بادل کی طرح، بھاگتے سایوں کی طرح
اور محسوس نہیں ہو پاتا
آئینہ دیکھ کے ہول آتا ہے
سوچتے سوچتے ڈر لگتا ہے!

نزولِ شعر

رات کے قلب سے گذرتے ہوئے
شہر کی شاہراہ پر تنہا ۔
مجھ کو آواز دی ستاروں نے
خامشی کی ردا کو اوڑھے ہوئے

ایستادہ درختوں نے اک بار
مجھ کو سرگوشیوں میں دی آواز
دور بہتی ہوئی ندی سے تبھی
نام لے کر مرا پکارا گیا
سامنے میرے کچھ ہیولے سے
چھاتے جاتے تھے اور میں چپ تھا
یک بیک چھا گیا نظر میں غبار
اور بانگِ رحیل گونج اٹھی
آگ کی اک لپیٹ سی کوند گئی
گردشِ آسمان سے جھڑ کر
کہکشاؤں نے مجھ سے دوستی کی
اور خلاؤں نے بھیج کر پیغام

جمال اویسی

یہ کہلوایا ان میں گم ہو جاؤں
گہرے نیلے بسیط گنبد پر
اپنے جوہر کو آشکار کروں
شعر لکھوں، خدا سے بات کروں

نزول

نہ جانے کتنے جنگل اور صحرا مجھ میں اتریں گے
ابھی اک بحرِ بے پایاں ہمکتا ہے مرے اندر
خلا سے ٹوٹ کر گرتے ستاروں کا امیں بن کر
مجھے دہشت زدہ کرنے بہت سے اجنبی آئے
مگر سب قلب میں میرے سما کر دوست بن بیٹھے
یہ ہفت افلاک بھی اپنی بلندی سے اگر اترا
تو مجھ پر ہی یہ اترے گا؟

سوہن راہی

کل آج اور کل

پہلی کرن اگنے سے پہلے
جب تو نے اپنے ہاتھوں سے
میرے سیاہ بالوں کی رات میں
سیندوری تحریر سے میرا
نیا نویلا نام لکھا تھا۔
جب سے میری پلکوں کی
بوجھل دیواریں ٹوٹ گئی ہیں۔
میرے کانپتے ہونٹوں کو
تیری آوارہ آنکھوں نے
چپکے سے جب چوم لیا تھا
میرے دل کی خاموشی کو
جب تیرے دل کی دھڑکن نے
ایک نیا پیغام دیا تھا
جب نینوں میں
انتظار کی رات کا
گہرا کالا کاجل
ملن سمے کی بوند بنا تھا۔
میں اس پل کی
اُس پربھات کی
ایک کہانی
تیری رانی
گاؤں گاؤں شہروں شہروں
تیرے ساتھ چلی ہوں اب تک

وہ شیتل نورانی کرنوں کی اک منزل
ان دیکھی، انجانی راحت
روپہلی کرنوں کا ساحل
تیرے میرے من کی چاہت
تحریروں میں بندھا سویرا
رنگ کھلاتا نور کا چہرہ
سورج کا اکلوتا بیٹا
جانے کس بستی کے
کھلیانوں میں اب تک
دفن ہوا ہے
جانے کون سی ڈائن کی لمبی جیبھا نے
سرخ سنہری تحریروں کو چاٹ لیا ہے۔
ہریالی کی دلہن کب سے
بانجھ پڑی ہے
کب سے دھرتی کے کاغذ پہ
ویرانی کا حرف لکھا ہے

کب سے اک بیوپار شروع ہے
انسانوں کو انسانوں سے قتل
کروانے کے منصوبے
ساگر کے اِس پار سے جائیں
قاتل اور بارود کے رشتے
جیون کو ویران بنانے
جسموں پہ بندوق کے گہنے
موت کے سنّاٹے کو بھاتی
زہر بھری گولی کی دستک
آدم خوروں کی اک ٹکڑی
خون کی پیاسی
لاشوں کے انبار لگائے
دھرتی کی اجلی چھاتی پر
پت جھڑ کی سنگین کا پہرہ

کب سے پھولوں کلیوں کی
بیزار بہاریں
موت کے نامے ہاتھ میں لے کر
ہونے اور نہ ہونے کی
مفلوج گھڑی کو سوچ رہی ہیں ۔
سچائی کے آئینوں کو
دیکھنے والے
سب چہرے خاموش
ہوئے ہیں ۔
چہروں کے
اپنے کاندھے نہ اپنے تن ہیں ۔
من کی میل کی کالک
چہروں کی پہچان پہ ایسے اتری
جیسے سورج
گرد میں لپٹی کالی رات کی
اک موٹی پوشاک
پہن لے ۔
اپنے تپتے چہرے کا احساس
گنوا دے ۔
موت کے سب آثار ہیں ایسے
دھیرے دھیرے جیون مالا ٹوٹ رہی ہے
ٹوٹ رہے ہیں
مسکاتی کرنوں کے گجرے ۔
روٹھ گئے ہیں
راہوں سے لہراتے آنچل ۔
آشاؤں کے پھول کھلاتے
سارے چہرے جھلس
گئے ہیں ۔

تو نے میری سونی مانگ میں
لال سنہرے گگن کو بھر کے
اوشا کو بیدار کیا تھا

کتنی مانگوں، کتنی میرے جیسی کومل
کویتاؤں کو
دلہن کے ساکار روپ کا
ان چھویا احساس ملا تھا
لیکن اب
کتنی مانگوں میں خونی انگارے بھر کے
دنیا اپنے جینے کی
راہیں ہموار کیے بیٹھی ہے۔
کتنی کومل کویتاؤں کو پھونک دیا ہے۔
کتنی بے بس آشاؤں نے
ایک فقط ساڑھی کے بدلے
آگ کی لپٹوں سے تن مندر ڈھانپ لیا ہے
ایسے جیون کایا کا ادّھار کیا ہے
سونے چاندی پر رشتوں کو بار دیا ہے
دن اور رات کی باہنوں میں
کانٹوں کے کنگن۔
پیروں میں رسموں کے شعلوں کی زنجیریں۔
اگنی پتھ پر چلتی پھرتی پرچھائیوں نے
موت سے بدتر جیون بھی سویکار کیا ہے۔
میرے صبح اور شام کے آنگن میں اب
زہر بھرا ہے ایسا
جس سے بے بس معصوموں کے نیم شگفتہ ننھے چہرے
میری آنکھیں بن کے مجھ میں
جھانک رہے ہیں

کیا ہوگا؟
تہذیب کے ٹوٹے آئینوں کا۔
کیا ہوگا؟
برباد ہوئے ویران گھروں کا۔
کب تک؟
مریادا میں جکڑی سب سیتائیں
لالچ کے اندھے چولھے کا
ایندھن بن کر
حرص و ہوس کے پیٹ کی کھولی بھرتے بھرتے
راکھ بنیں گی۔
کب تک لکشمی گھر آنگن میں
اشکوں کے دیپوں سے راہی
دیوالی کا جشن منائے۔

جب کوئی بھی رستہ نہ ہو
سوچ کے دیپک جلتے جلتے بجھ جاتے ہیں
سوچ کی ندیاں بہتے بہتے جب رک جائیں
آنکھیں بھی پھر ویران ہو کر
دنیا دیکھنے کے بردان کو کھو دیتی ہیں۔
کھو دیتی ہیں آج کو
آنے والے کل کو

کھودیتی ہیں آنکھوں سے جب گنگا جل کو

کہتے ہیں کہ جینے مرنے کا
سامان خدا نے دے کر
انسان کو مذہب کا بھی پہرا دا بخشا
مذہب نے انسان کو شاید
جینے کا احساس دیا ہے
لیکن ———
انساں نے مذہب کے نام
یہ کیا کیا ظلم کیے ہیں اب تک ۔
بہنوں کا سہاگ لوٹ کر بچّوں کو
نیلام کیا ہے ،
بھوک اور پیاس کا تحفہ دے کر ظلم وستم
کو عام کیا ہے ۔

مذہب کا تحفہ جیسے زہریلی گولی
تن اور من کی ہریالی کو چاٹ گئی ہے
کل اور آج کے آئینے میں ایک خدا
کے کتنے روپ
رنگ برنگے پہراؤں میں کتنے چہرے
اک چہرے پر کتنے پردے
کتنے لبادے ۔
کتنے رنگ کے آنچل ہیں

تہذیب کی بوڑھی شاخوں پر
گہرے لال ، نسیلے آنچل
سرسوں جیسے پیلے آنچل
ہرے ، سنہرے کالے آنچل
نیلے اور رنگیلے آنچل
جن کے رنگوں میں لہرائے
ان جانے لمحوں کا لہو بھی
ان لمحوں سے ٹوٹنے والے
بے بس چہرے پوچھ رہے ہیں
پانی دھرتی اور آکاش
کے آقاؤں سے ۔
کیا تم نے ایجاد کیا ہے
دنیا کے
مفلوج خدا کو ؟
یا ایجاد کیا ہے تم کو
بے چہرہ مفلوج خدا نے ؟
کیا انسان خدا کا ہے جھوٹا شہکار ؟
یا کہ انسان کا جھوٹا شہکار خدا ہے ؟
کیوں انساں
کے ساتھ ساتھ
دکھ درد ہیں جیتے ؟
کیوں صدیوں سے
ہم اپنے آنسو ہیں پیتے ؟

کیوں ہم زخموں کی مالا
تن پہ پہنے ہیں ؟
کیوں آشا کا مول
سوگ کے سب گہنے ہیں ؟
جیون چندا بڑھتے بڑھتے
کیوں گھٹتا ہے ؟
انساں جگ میں
کیوں جیتا ہے اور مرتا ہے ؟

جیون دیپک انساں یا بھگوان جلائے ؟
آخر میں یہ جیون دیپک کون بجھائے ؟

یہ پرچھائیوں کا جنگل بیچ کے ہر اک انساں
گھور اماوس کے ساگر میں کھو جاتا ہے
سانسوں کے مرجھائے پھول پتوں کو راہی
چنچل ہوا کوا رپن کر کے سو جاتا ہے ۔

خصوصی مطالعہ

- شفیق الرحمٰن — مرزا حامد بیگ
- شفیق الرحمٰن — نظیر صدیقی
- ایک خوشگوار سفر — محمد خالد اختر
- لوگ جنھوں نے مسکرانا سکھایا — مستنصر حسین تارڑ

فکاہیہ

- زنانہ اردو خط و کتابت — شفیق الرحمٰن

خاکہ

- تعارف — شفیق الرحمٰن

افسانہ

- فاسٹ باؤلر — شفیق الرحمٰن

پیروڈی

- تزکِ نادری عرف سیاحت نامۂ ہند — شفیق الرحمٰن

سفر نامے

- نیل — شفیق الرحمٰن
- دھند — شفیق الرحمٰن
- دجلہ — شفیق الرحمٰن

●●●

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

شفیق الرحمٰن

نام : شفیق الرحمن
قلمی نام : شفیق الرحمن
پیدائش : ۹ / نومبر ۱۹۲۰ء بہ مقام کلانور ، مشرقی پنجاب
تعلیم : ایم - بی - بی - ایس (پنجاب) ، ڈی - پی - ایچ (اڈنبرا برطانیہ) ، ڈی - ٹی - ایم اینڈ ایچ (لندن) فیلو آف کالج آف فزیشنز اینڈ سرجنز (پاکستان)

۱۹۴۲ء میں پنجاب یونیورسٹی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، لاہور سے ایم - بی - بی ایس کیا۔ آزادی کے بعد آپ کو پاکستان آرمی کی طرف سے اڈنبرا اور لندن یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے بھیج دیا گیا۔ دو برس وہاں رہ کر ڈی - پی - ایچ اور ڈی - ٹی - ایم اینڈ ایچ کے ڈپلوما کورس کیے۔

مختصر حالاتِ زندگی:

آپ کے والد کا نام عبد الرحمٰن خان تھا۔ شفیق الرحمٰن کا بچپن سی - پی (بھارت) میں گزرا کنگ ایڈورڈ کالج ، لاہور میں زمانۂ طالب العلمی کے دوران ڈرائنگ کلب کے سکریٹری اور کالج میگزین کے ایڈیٹر (۴۲ - ۱۹۴۱ء) رہے۔ لڑکپن اور جوانی میں سیر و سیاحت ، کرکٹ ، باکسنگ اور تیراکی میں جنون کی حد تک دل چسپی رہی۔ کارٹون نگاری ، مصوری اور فوٹو گرافی کے خبط اس کے علاوہ تھے (۱)۔

۱۹۴۲ء میں ساڑھے اکیس برس کی عمر میں ایم - بی - بی - ایس کرنے کے بعد میو ہسپتال لاہور میں چند ماہ ہاؤس جاب کیا اور اسی سال انڈین میڈیکل سروس میں چلے گئے۔ دوسری جنگ عظیم میں مختلف محاذوں پر ملازمت کرنے اور کئی ممالک دیکھنے کا موقع ملا۔ ۱۹۴۷ء میں آپ کی تبدیلی پاکستان آرمی میڈیکل کور میں ہو گئی اور حکومت کی طرف سے آپ کو پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے سلسلے میں برطانیہ بھیج دیا گیا۔ پانچ برس کے لیے آپ کو بری فوج سے بحریہ میں منتقل کر دیا گیا جہاں سے ستمبر ۱۹۷۹ء میں سرجن ریئر ایڈمرل کے رینک سے بہ طور ڈائریکٹر میڈیکل سروسز ریٹائر ہوئے۔ دسمبر ۱۹۸۰ء میں آپ کو اکادمی ادبیات پاکستان کا چیرمین مقرر کر دیا گیا جہاں سے مدت ملازمت ختم ہو جانے کے بعد آج کل راولپنڈی میں ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ کرنیں (افسانے) مکتبۂ اردو، لاہور: طبع اول: ۱۹۴۲ء
اس کتاب کا دیباچہ حجاب امتیاز علی نے لکھا ہے۔ اس کتاب کا ایک ایڈیشن مکتبہ، جدید، دہلی نے ۱۹۵۲ء میں شائع کیا۔

۲۔ شگوفے (افسانے / مضامین) طبع اول: ۱۹۴۳ء

۳۔ لہریں (افسانے) طبع اول: ۱۹۴۳ء
یہ کتاب مکتبہ میری لائبریری، لاہور نے بھی شائع کی ہے۔ ۱۹۴۳ء میں ایک ایڈیشن ادارۂ اشاعت اردو، حیدر آباد دکن نے شائع کیا۔

۴۔ مدو جزر (افسانے) طبع اول: ۱۹۴۴ء

۵۔ پرواز (افسانے) طبع اول: ۱۹۴۵ء
اس کتاب کا ایک ایڈیشن مکتبہ میری لائبریری، لاہور نے بھی شائع کیا ہے جب کہ مکتبۂ جدید دہلی نے اس کا ایک ایڈیشن ۱۹۵۲ء میں نکالا۔

۶۔ جنگ اور غذا کا مسئلہ (معاشیات) طبع اول: ۱۹۴۳ء

۷۔ پچھتاوے (افسانے) طبع اول: ۱۹۴۶ء
سولہ افسانوں کے اس مجموعے کو ادبی دنیا، اردو بازار، دہلی نے بھی شائع کیا۔

۸۔ حماقتیں (افسانے) طبع اول: ۱۹۴۷ء
اس کتاب کا ایک ایڈیشن مکتبہ میری لائبریری، لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔

۹۔ مزید حماقتیں (افسانے) طبع اول: ۱۹۵۴ء
اس کتاب کا ایک ایڈیشن چمن بک ڈپو، اردو بازار، دہلی نے بھی شائع کیا ہے۔

۱۰۔ نئے شگوفے (افسانوں کا انتخاب) طبع اول: س۔ن

۱۱۔ دجلہ (ناولٹ) طبع اول: ۱۹۸۰ء

۱۲۔ معاشرہ اور ذہنی صحت (از: ایلز بتھ ایم ڈاج کا ترجمہ) مقبول اکیڈیمی، لاہور:
یہ کتاب مؤسسہ فرینکلن نیویارک کے تعاون سے شائع ہوئی۔ یہ
Your Community Mental Health کا ترجمہ ہے۔

۱۳۔ انسانی تماشے (ناول از ولیم سرویاں کا ترجمہ) طبع اول: ۱۹۵۶ء
یہ کتاب مؤسسہ فرینکلن نیویارک کے تعاون سے شائع ہوئی۔ یہ ناول
The Human Comedy کا ترجمہ ہے۔

۱۴۔ آپ کا آپریشن (جراحی / کتابچہ) از رابرٹ ایم کنگھم مقبول اکیڈمی، لاہور

یہ کل ۴۴ صفحات کا کتاب چہ ہے۔

طبع اول: ۱۹۶۵ء

۱۵۔ طبی تحقیق آپ کو مہلک امراض سے بچا سکتی ہے (طب / کتاب چہ) طبع اول: ۱۹۶۵ء
از گلبرٹ کانٹ کا ترجمہ، مقبول اکیڈیمی، لاہور:
یہ کل ۵۶ صفحات کا کتاب چہ ہے۔

۱۶۔ کیا میرا بچہ تن درست پیدا ہو گا؟ (طب / کتاب چہ) از جان گولڈ طبع اول: ۱۹۶۴ء
کا ترجمہ، مقبول اکیڈیمی، لاہور: یہ کل ۵۶ صفحات کا کتاب چہ ہے۔

۱۷۔ درس زندگی (سماجیات) از پطرس بخاری و ایڈورڈ مرو کی کتاب طبع اول: ۱۹۵۶ء
کا ترجمہ بہ اشتراک عبدالمجید سالک، یہ کل ۱۹۸ صفحات کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

۱۸۔ ذہنی امراض اور ان کا علاج (ترجمہ) طبع اول

(نوٹ) شفیق الرحمن کے افسانوں اور مضامین معروف کتب کے موجودہ ناشر غالب پبلیشرز، سمن آباد، لاہور ہیں۔

غیر مدون:

کم از کم دو مجموعوں کا مواد (افسانے / مضامین) زیر ترتیب ہے۔

مستقل پتے:

۱۔ ۲۶۔ ویسٹرج ۱، راول پنڈی، پاکستان۔
۲۔ معرفت۔ ایچ رحمٰن اینڈ کمپنی۔ ہارون آباد ضلع بھاول نگر، پاکستان

اعزاز:

۱۔ ہلال امتیاز (ملٹری)

نظریہ فن:

"جو خود پر بیتی اور جن حالات میں دوسروں کو دیکھا وہ لکھ دیا۔"
(بہ حوالہ: مکتوب بہ نام مرزا حامد بیگ مورخہ ستمبر ۱۹۸۴ء)

(۱) بہ حوالہ "ستاروں کی محفل" مرتبہ: بشیر ہندی۔

(اردو افسانے کی روایت ۱۹۰۳ء-۱۹۹۰ء)

پروفیسر نظیر صدیقی

شفیق الرحمٰن

اردو کے نہایت مقبول ادیبوں میں ایک نام شفیق الرحمٰن کا بھی ہے ۔ وہ آج سے چالیس سال پہلے بھی مقبول تھے اور آج بھی مقبول ہیں ۔ یہ چالیس سال پہلے کی بات ایک عام اندازے کے مطابق کہی جا رہی ہے ۔ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں کہ انھوں نے کس سنہ میں کس تاریخ سے لکھنا شروع کیا تھا ۔ ان کی پہلی تحریر کون سی تھی ۔ ان کی پہلی کتاب کرنیں پہلی مرتبہ کس سن میں شائع ہوئی آج کل "کرنیں" کا چوتھا ایڈیشن دستیاب ہے اور اس سے پتہ نہیں چلتا کہ اس کتاب کا پہلا ، دوسرا اور تیسرا ایڈیشن کب چھپا ۔ جب میں اپنے حافظے پر زور دیتا ہوں تو اتنا یاد آتا ہے کہ ان کی کتاب کرنیں کے آنے سے پہلے اردو ادب میں "ترقی پسند تحریک" اور دنیا میں دوسری جنگِ عظیم آچکی تھی ۔ مجھے ترقی پسند تحریک اور دوسری جنگِ عظیم کے بارے میں بھی علم نہیں کہ ان دونوں میں کون کس کی وجہ سے آئی ۔ البتہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شفیق الرحمٰن کی کتاب "کرنیں" نہ ترقی پسند تحریک کی پیداوار تھی نہ دوسری جنگِ عظیم کی ۔ یہ شفیق الرحمٰن کی پہلی خوبی تھی کہ ایک ادیب کی حیثیت سے ایک نہایت سنجیدہ تحریک اور ایک عالم گیر جنگ کے سائے میں ابھرنے کے باوجود وہ ذہن کی شوخی اور قلم کی شگفتگی کے لیے مشہور و مقبول ہوئے ۔ اسی لیے اردو کے ایک نہایت ممتاز افسانہ نگار کرشن چندر نے ان کے بارے میں لکھا :

> "شفیق الرحمٰن کے افسانے پڑھ کر شوخ رنگوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے ۔ سرخا سرخ ، نارنجی ، یاقوتی اور زعفرانی ۔"

اردو ادب کے حساس ترین نقاد حسن عسکری نے ان کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی کہ :

> "سارے نئے ادب میں لے دے کر ایک شفیق الرحمٰن صاحب ہیں جنھوں نے تفریحی ادب کی طرف توجہ کی ہے یہ شگفتگی ، یہ لا ابالی پن ، یہ مچلتی ہوئی جگمگاہٹ بس ان ہی کا حصہ ہے ۔"

بیس ویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں جب اردو کے دو تین نہایت ممتاز

رسالوں میں شفیق الرحمٰن کی تحریریں اور تصویریں چھپتی تھیں تو بہت سے قارئین کو یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوتا تھا کہ ان کی تصویر زیادہ خوب صورت ہے یا تحریر۔ وہ اپنی تصویروں میں ایک خوب صورت اور خوش لباس جوان نظر آتے تھے اور اپنی تحریروں میں ایک خوش مزاج انسان اور شگفتہ نگار ادیب۔ آج کے مجلسی شفیق الرحمٰن نہایت کم سخن اور متین دکھائی دیتے ہیں۔ معلوم نہیں ان کی یہ متانت صرف ظاہری ہے یا باطنی بھی اور ان کی یہ کم سخنی ان کے مزاج کا حصہ ہے یا ان کے منصب کا تقاضا۔ یہ بہرحال ان کے قارئین کو ذاتی اور مجلسی شفیق الرحمٰن سے کیا لینا۔ وہ اپنی ذاتی زندگی میں جیسے کچھ ہیں وہ ان کے سوانح نگار کا مسئلہ ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوا بلکہ اردو ادب کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اردو کے ادیبوں اور شاعروں کے سوانح نگار پیدا ہی نہیں ہوتے۔

اردو قارئین کے ذہنوں میں شفیق الرحمٰن کا عام تصور ایک مزاح نگار کا ہے۔ شفیق الرحمٰن کے مزاح نگار ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن اردو قارئین کا یہ تصور کہ شفیق الرحمٰن ایک مزاح نگار ہیں ان کی پوری ادبی شخصیت کے ساتھ انصاف نہیں کرتا۔ اردو قارئین کے اس تصور کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس تصور میں افسانہ نگار شفیق الرحمٰن بالکل غائب ہوجاتے ہیں جب کہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہی افسانہ نگاری سے ہوا تھا اور افسانہ نگار شفیق الرحمٰن مزاح نگار شفیق الرحمٰن سے ایک بالکل مختلف چیز ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو ادب کی جس صنف کو سب سے زیادہ فروغ حاصل ہوا وہ افسانہ نگاری ہی ہے۔ اس دور نے بڑے بڑے افسانہ نگار پیدا کیے۔ ان افسانہ نگاروں کی صف میں شفیق الرحمٰن کا کیا مقام ہے اس موضوع کو کبھی اردو تنقید کی توجہ حاصل نہ ہوسکی۔ ضرورت آج بھی ہے کہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے شفیق الرحمٰن کا مرتبہ ان کے معاصرین کے پس منظر میں متعین کیا جائے۔ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

شفیق الرحمٰن کے معاصرین نے عموماً دو طرح کی افسانہ نگاری کو فروغ دیا۔ ان کے زمانے کے افسانے یا تو سماجی ہوتے تھے یا نفسیاتی۔ لیکن خود ان کے افسانے نہ تو سماجی ہیں نہ نفسیاتی۔ ان کے افسانوں کو اگر کسی بہتر لفظ کی عدم موجودگی میں رومانی کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ شفیق الرحمٰن سے بہت پہلے اردو ادب میں رومانی افسانوں کا ایک دور نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھ پوری اور ل۔ احمد وغیرہ کے ساتھ گزرچکا تھا۔ شفیق الرحمٰن کی رومانیت اس دور کی رومانیت سے واضح طور پر مختلف ہے۔ ان کے یہاں نیاز فتح پوری اور ان کے ہم راہیوں کی مثالیت پسندی بالکل نہیں ہے۔ ان کی محبت بیسویں صدی کی وہ محبت ہے جو کالجوں اور یونیورسٹیوں کی فضا میں پروان چڑھتی ہے۔ شفیق الرحمٰن کے ہیرو اور ہیروئن بہت حسین بھی ہیں

اور بہت ذہین بھی۔ان کی محبت اپنی بہت ساری سماجی آزادیوں کے باوجود انسانی فطرت کی پے چیدگیوں کا شکار ہوتی رہتی ہے ۔

شفیق الرحمٰن کہانی کہنے کا سلیقہ بہت عمدہ جانتے ہیں ۔ انھیں کہانی کی زبان اور بیان پر ایسی قدرت ہے جو ان کے بہت کم معاصرین کو حاصل ہے ۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے جملوں اور اپنی چھوٹی چھوٹی عبارتوں میں بڑی آسانی اور روانی کے ساتھ ہر منظر کو اجاگر کرتے چلے جاتے ہیں ۔ بیان کا بہاؤ کرشن چندر کی یاد دلاتا ہے اور صورتِ حال کی کسک تسنیم چھتاری کی لیکن اس مماثلت کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ شفیق الرحمٰن ، کرشن چندر یا تسنیم سلیم چھتاری سے متاثر رہے ہیں ۔ ان کے افسانوں میں سوز و گداز کی ایک کیفیت ضرور ہے جس کی طرف پروفیسر احتشام حسین کی نظر گئی تھی ۔ انھوں نے لکھا تھا کہ :

" شفیق الرحمٰن محض مزاح نگار ہی نہیں وہ زندگی کی پرسوزی سے لتنے ہی قریب ہیں جتنے اس کے طربیہ پہلو سے ۔ "

پروفیسر احتشام حسین کی اس رائے کو پڑھتے وقت ذہن مغربی تنقید کے اس عظیم الشان سوال کی طرف منتقل ہوجاتا ہے کہ کیا کمیڈی بھی اپنے اندر وہی اخلاقی سنجیدگی رکھتی ہے جو ٹریجڈی میں پائی جاتی ہے ؟ یہاں اس کا موقع نہیں کہ مغربی تنقید کے اس سوال کی روشنی میں شفیق الرحمٰن کے مزاح پر گفتگو کی جائے پھر بھی اتنا کہہ لینے میں کوئی حرج نہیں کہ ایک اچھا مزاح نگار زندگی کے پرسوز پہلوؤں سے بے خبر نہیں ہوتا اور اس کی ہنسی بے حسی کی ہنسی نہیں ہوتی ۔

شفیق الرحمٰن کے یہاں انسانی زندگی کے حسرت انگیز پہلو بھی ہیں اور لطف انگیز مناظر بھی لیکن میرا تاثر یہ ہے کہ ان کے یہاں یہ دونوں چیزیں دوش بہ دوش نہیں ہیں ۔ زندگی کے حسرت انگیز پہلو ان کے افسانوں میں ملتے ہیں اور لطف انگیز مناظر ان کے مزاحیہ مضامین یا سفر نامے میں جس کا نام " دجلہ " ہے ان کے افسانوں میں جو شگفتگی ہے اسے ظرافت سے ہرگز گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے ۔ شفیق الرحمٰن کا المیہ غالباً یہ ہے کہ مزاح نگار شفیق الرحمٰن قارئین کے ذہنوں پر اس قدر حاوی ہوگئے ہیں کہ ان کے سنجیدہ افسانوں کی سنجیدگی کا احساس ناپید ہوچلا ہے ۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اردو ادب میں شفیق الرحمٰن کی چار حیثیتیں ہیں ۔ ۔ ۔ وہ ایک افسانہ نگار بھی ہیں ، مزاح نگار بھی ، سفر نگار بھی اور مترجم بھی ۔ ترجمہ انھوں نے ایک ہی کیا ہے " انسانی تماشا " کے عنوان سے امریکی ناول نگار ولیم سرویاں کے ناول Human Comedy کا ترجمہ ۔ سفر نامہ بھی انھوں نے ایک ہی لکھا ہے دجلہ جو اردو کے دوسرے

سفر ناموں سے مختلف اور کسی اچھے ناول سے قریب ہے۔ شفیق الرحمٰن کی باقی آٹھ کتابیں حسب ترتیب یہ ہیں:

۱۔ کرنیں ۔ ۲۔ شگوفے ۔ ۳۔ لہریں ۔ ۴۔ مدوجزر ۔ ۵۔ پرواز ۔ ۶۔ حماقتیں ۔ ۷۔ پچھتاوے ۔ ۸۔ مزید حماقتیں۔ ان کتابوں میں کچھ تو افسانوں کے مجموعے ہیں اور کچھ مزاحیہ مضامین کے مجموعے۔

شفیق الرحمٰن نے مزاح نگاری کے لیے پیروڈی کی صنف کو خاص طور پر اپنایا ہے۔ قصہ پروفیسر علی بابا کا ۔ تزک نادری عرف سیاحت نامہ ۔ ہند ۔ سفر نامہ جہاز باد سندھی کا۔ شفیق الرحمٰن کی مشہور پیروڈیاں ہیں جس کی تازگی اور شادابی میں شاید ہی کبھی کمی آئے۔ ان پیروڈیوں میں داستانی زبان پر ان کی قدرت اور ان کا بے ساختہ مزاح لطف و لذت کا ایک ایسا سرچشمہ ہے جو کبھی خشک نہیں ہوسکتا۔ تزک نادری عرف سیاحت نامہ ۔ ہند کا ایک اقتباس سنیے:

دریائے بلمند نہایت خوش نما دریا ہے فرماں بردار خاں معروض ہوا کہ شاہانِ سلف کا رواج رہا ہے حملہ کرتے وقت جو دریا راستے میں آئے تیر کر عبور کرتے ہیں۔ اس کے کہنے پر غلطی سے ہم نے بھی چھلانگ لگادی اور شاہانِ سلف میں شامل ہوتے ہوتے بال بال بچے کنارے کی طرف آنے کی کوشش کی ہم پوستین کو چھوڑتے تھے لیکن پوستین ہمیں نہ چھوڑتی تھی اور بہ مشکل ہمیں باہر نکالا گیا۔ بڑے پشیمان ہوئے۔ تنبیہ کیا کہ جب تک تیراکی کے ماہر نہ ہوجائیں پانی میں کبھی قدم نہ رکھیں گے۔

OO OOO OO

محمد خالد اختر

ایک خوش گوار سفر

(ایک پرانے دوست کی صحبت میں دو دن)

اکتوبر ۱۹۷۹ء کی بارھویں تاریخ۔ مجھے مدتوں بعد راولپنڈی جانا نصیب ہوا۔ ایامِ جوانی میں میں گویا سیاحِ گیتی نورد اور جہانیانِ جہاں گشت تھا اور جس ریل گاڑی کو دیکھتا تھا اس میں سوار ہو جانے اور اس کی منزل تک جانے کو دل مچلنے لگتا۔ اب کئی ایک برس سے یہ کیفیت ہے کہ سفر کے خیال سے دل ڈوبنے لگتا ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ پچھلے چند سالوں میں سفر کے جھنجھٹ اور صعوبتیں بہت بڑھ گئی ہیں اور گاڑی یا بس میں کہیں آنا جانا اتنا آسان اور آرام دہ نہیں رہا کہ جتنا میری جوانی کے دنوں میں تھا۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک اوپر ساٹھ برس کی عمر میں قویٰ میں اضمحلال کے ساتھ دل بجھ اور مر گیا ہے اور گوشۂ عافیت کو چھوڑ کر جوکھوں میں پڑنے کی ہمت اپنے میں نہیں پاتا۔ میں لاہور میں بہ سلسلہ ملازمت ماسوا ڈیڑھ دو سال کے بیس بائیس سال سکونت پذیر رہا اور تم یقین نہیں کرو گے کہ اس مدت میں اب کے دوسری بار راولپنڈی جانا ہوا۔ حالاں کہ میرے لڑکپن اور جوانی کا دوست شفیق الرحمٰن وہاں رہتا ہے اور اکثر بلاتا رہتا ہے۔

اب اس بارہ تاریخ کو وہاں ایک خاندانی شادی کی تقریب تھی اور دولہا، جو ایک سول انجنیئر ہے اور رشتے میں میرا بھتیجا، بہ نفسِ نفیس گھر آکر مجھے شمولیت کی دعوت دے گیا تھا۔ عذر داری کی صورت نہ تھی ورنہ ٹال ہی جاتا۔ یہ شادی میرے پنڈی جانے کا جواز بنی۔

صبح کی ریل کار سے بارہ بجے دوپہر پنڈی پہنچا۔ (راستے میں اپنے آبائی گاؤں ہبی کی پہاڑیوں اور دریا کے کنارے جہلم شہر کے پُر تصویر منظر کو دیکھ کر میرا دل اچھلا۔ اپنے کالج کے ایام میں میں اسی جہلم شہر سے سائیکل پر ٹلہ جوگیاں کی خطرناک مہم پر روانہ ہوا تھا۔ اوہ! وہ امنگ! وہ جوانی!)

ریل کار کچھ لیٹ پہنچی۔ وہ اس لیے کہ دینے سے کچھ آگے اسے ایک حادثہ پیش آگیا۔ ہم ایک بے پھاٹک کی کراسنگ پر ایک اسکوٹر سوار اور اس کے پیچھے بیٹھے ایک اسکول کے بچے

پر چڑھ دوڑے ۔ ڈرائیور کے فی الفور بریکیں لگانے سے ان دونوں کی جانیں معجزانہ طور پر بچ گئیں گو اسکوٹر تڑمڑ گیا ۔

شفیق الرحمن پلیٹ فارم پر موجود تھا ۔ آرمی اسٹائیل میں تراشے ہوئے سفید بال ، سرخ و سپید خوشی سے چمکتا چہرہ اپنی رنگین دھاری دار قمیص اور خاکستری پتلون میں چاق و چوبند ۔

شفیق اور میں ہم عمر ہیں ۔ وہ ساٹھ برس سے کچھ کم ، میں کچھ زیادہ ۔ اس نے مجھے گرم جوشی سے بازوؤں میں لیا اور مجھے اس اردو شعر کا خیال آیا جس کا مطلب ہے کہ ایک دیرینہ دوست کا ملنا خضر اور سکندر کی ملاقات سے بہتر ہے ۔ شفیق کا سب سے چھوٹا بیٹا امین الرحمن بھی اس کے ساتھ تھا ۔ سولہ سترہ برس کا شرمیلا ، کچھ کچھ بوہیمین لڑکا ، آنکھوں میں چاہت کی چمک اور چہرے پر تپاک کی مسکراہٹ ۔ شفیق کے تین بیٹے ہیں ۔ سب سے بڑا عتیق ایک بچے فتنا ، من موجی دیو ہے ، جس نے میڈیکل کورس کو چھوڑ کر (کیوں کہ اس کی طبیعت انسانی اناٹومی کی چیر پھاڑ سے الٹنے لگتی تھی) آرٹس کالج میں داخلہ لے لیا ہے ۔ عتیق باسکٹ بال کا بڑا اچھا کھلاڑی ہے ، ایک welsh آدمی کی طرح آتشیں مزاج ! بے صبر اور ہٹیلا ! اور میرا خیال ہے کہ شفیق اس سے کچھ کچھ ڈرتا ہے ۔ عتیق سے چھوٹا خلیق ، ہموار ، قائم مزاج اور محنتی لڑکا ہے ۔ وہ میڈیکل کے لیے تیاری کر رہا ہے اور ان لڑکوں میں سے ہے جو اسکول اور کالج میں اول آتے ہیں اور ثابت قدمی سے اپنے پیشے کی بلندی حاصل کر کے دم لیتے ہیں ۔ سب سے چھوٹا امین ، نان میڈیکل کے سیکنڈ ایئر میں ہے اور انجینیئر بنے گا ۔ ایسے تین چمکیلے اور تندرست بیٹوں کا باپ ہونا شفیق کی بڑی خوش قسمتی ہے مگر ان تینوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جو بڑا ہو کر باپ کی طرح کتابیں لکھے گا ۔

امین نے میرا بیگ اٹھایا اور ہم اسٹیشن سے باہر آئے ۔ شفیق نے خود گاڑی ڈرائیو کی اگرچہ مجھے شک ہے کہ اکثر آرٹسٹک اور ادبی لوگوں کی طرح وہ مشینوں سے آسودہ خاطری سے نہیں نپٹ سکتا ۔ اپنی اس نئی موٹر کے گیئروں سے اس کی جھجھک اب تک کلی طور پر دور نہیں ہوئی ۔ اس کا بیٹا عتیق اب بیش تر ڈرائیونگ کرتا ہے اور والد صاحب ڈرائیو کیے جانے میں آنند پاتے ہیں ۔

ہم ویسٹ ریج کی طرف گئے جہاں دوسرے افسروں کے بنگلوں کے درمیان شفیق کا اپنا ایک اچھا سا خوش گوار گھر ہے ۔ سلیقے سے سجا دھجا مگر نمائشی سامان کے بغیر ۔ میرا بیگ اوپر کمرے میں لے جایا گیا ۔ جہاں مجھے ٹھہرنا تھا ۔ اس کے سامنے شفیق کا اپنا کمرہ تھا ۔ صحیح معنوں میں ایک ردوم ۔ ایک کتابوں کی سائیڈ بورڈ ، دو کرسیاں ، بستر اور ایک اونچا ڈرائینگ کرنے کا ڈیسک ۔ پچھلے چند سال سے امریکی ناولسٹ ارنسٹ ہیمنگوے کی طرح شفیق اپنا سب لکھنے پڑھنے

کا کام کھڑے ہو کر ڈرائینگ ڈیسک پر کرتا ہے۔

میرے اور شفیق کے کمروں کے درمیان ایک بالکنی نما کوٹھی سی ہے جہاں میں نے کسرت کرنے کے کئی آلات پڑے دیکھے ۔ ڈمبل، میڈیسن بال، چیسٹ اکسپنڈر، باکسنگ کے دستانے ۔ مگدر مجھے یقیناً وہاں دکھائی نہیں دیے ۔ اس کوٹھی میں کئی بڑے مقفل سیاہ ٹرنک رکھے ہوئے ہیں۔ کتابوں، البموں، پرانی وردیوں، تمغوں وغیرہ سے بھرے ہوئے جنھیں شفیق نے فوج اور نیوی میں اپنی عسکری ملازمت کے دوران اکٹھا کیا ہے ۔ (یہاں میں یہ بتاتا جاؤں کہ شفیق پچھلے ستمبر سے اپنی عسکری ملازمت سے سبک دوش ہو چکا ہے اور اس کا آخری منصب جس پر اس کی تعیناتی تھی، پاکستان نیوی میں ریر ایڈمرل کا تھا۔)

میں شادی کی تقریب میں بہلا پھسلا کر شفیق کو اپنے ساتھ لے گیا اور چوں کہ مری روڈ پر مطلوبہ محلے میں گلی نمبر ۸ کی کھوج لگانا کوئی آسان کام نہ تھا ہم وہاں عین اس وقت پہنچے جب نکاح پڑھایا جا رہا تھا ۔ میرا خیال ہے کہ یہ خاندانی شادیاں کچھ فائدے سے خالی نہیں ہوتیں ۔ وہاں میں اپنے ان چچیروں، ممیروں، ماموؤں، خالوؤں سے برسوں کے بعد ملا جن کے بارے میں بھول چکا تھا کہ ان کا وجود بھی ہے اور جن کی ہیئت اس مدت میں انقلابی طور پر بدل چکی تھی ۔

بارات کو، جو ایک گھنٹہ پہلے ہی کی پہاڑیوں کے دامن میں آباد ہمارے آبائی گاؤں کھوڑی سے بس میں پہنچی تھی، اسی دن لوٹنا تھا اس لیے تقریب نے معمول کا طول نہ پکڑا اور ہم جلد ہی فارغ ہو کر وہاں سے کھسکے ۔ چکنے، مرغن اور لذیذ شادی کے کھانے کو جلانے کے لیے شفیق اور میں نے راولپنڈی صدر تک پیدل چلنے کا قصد کیا۔ (شفیق پہلے دوپہر کا کھانا مطلقاً نہیں کھایا کرتا تھا ۔ لیکن اب ایک عرصے سے اپنے اصول پر کاربند نہیں رہا ۔) اکتوبر کے آخری دنوں کے سورج میں ابھی کچھ حدت تھی اور راستے میں ہم نے ایک ٹیکسی لی ۔ جس نے ہمیں صدر کے علاقے میں جا اتارا ۔ جمعے کا دن ہونے کی وجہ سے سب دکانیں بند تھیں مگر، جیسا کہ اہالیانِ پنڈی جانتے ہیں، اس روز یہاں ایک میلہ سا لگتا ہے ۔ بازار کے چوک میں چاروں سمت Pavement پر پرانی کتابوں، رسالوں، میگزینوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور گاہکوں کی ریل پیل سے اندازہ ہوتا ہے پنڈی کے لوگ کافی لٹریری ہیں اور کتابیں پڑھنے پر مائل ہیں ۔ لاہور میں جو کتابوں کا میلہ ہر جمعے کے روز انارکلی میں بائیبل سوسائٹی کے آس پاس لگتا ہے پنڈی کے میلے کا پاسنگ بھی نہیں ۔

شفیق اپنے چوڑے Rim کے گورکھا ہیٹ میں (جسے اوڑھے وہ شادی کی تقریب میں شامل ہوا تھا) پرانی کتابیں بیچنے والوں کے لیے ایک آشنا، جانی پہچانی صورت ہے ۔ ان میں سے دو تین نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا اور اس کی خیریت دریافت کی ۔ ڈیڑھ دو گھنٹے ہم نے اس

میلے کی سیر کی ۔ چند کتابیں خرید کیں اور کچھ پرانے Saturday Review of Literature اور Punch کے پرچے ۔

اب شام کے ساڑھے چار پانچ ہو چکے تھے اور اپنے بنڈلوں پیکٹوں سے لدے پھندے ہم نے گھر چلنے کی ٹھانی ۔ چوک پار کر کے شفیق نے ایک پھل فروش سے اپنے منجھلے بیٹے خلیق کے لیے ڈیڑھ دو سیر سیب خرید کیے ۔ (خلیق کا پسندیدہ پھل سیب ہے ، یہاں تک کہ وہ اسے آم سے بھی بہتر سمجھتا ہے ۔) سیبوں کے اس بڑے لفافے نے ہمارے مختلف النوع پیکٹوں اور بنڈلوں میں ، جنھیں ہم اٹھائے ہوئے تھے ، ایک اور کا اضافہ کر دیا ۔

ٹیکسی کرنے کی بجائے ہم پاس ہی واقع جی ۔ ٹی ۔ بسوں کے اڈے پر گئے جہاں سے میں نے اگلے روز کے لیے ڈی لکس سروس میں ایک سیٹ ریزرو کرا لی ۔ پھر میں نے شفیق سے کہا کہ میں کرنل محمد خاں سے ملنا چاہتا ہوں ۔

" چلو دیکھ لیتے ہیں ۔ پنڈی کلب پاس ہی ہے ۔ " اور اس ہیئت کذائی سے اپنے بنڈلوں پیکٹوں اور لفافوں کو بغل میں دبائے ، بازوؤں میں سمیٹے اور سینے پر چمٹائے ہم اپنے پنڈی کلب کرنل کو ملنے کے لیے چل کھڑے ہوئے جس کے متعلق ہمیں قطعی یقین نہ تھا کہ وہ اپنے دولت کدے میں موجود ہو گا ۔

کرنل گھر پر تھا ۔ یعنی کلب میں اپنے کمروں کے Suit میں ۔ اس کے نوکر نے بتایا کہ کرنل صاحب سوتا ہے مگر ہم کو عزت دار ملاقاتی جانتے ہوئے چھوٹے صاف ستھرے ڈرائینگ روم میں بٹھاکر کرنل صاحب کو جگانے چل دیا ۔ ہم نے فوراً بقچوں اور پوٹلیوں سے اپنی خلاصی کرائی اور انھیں کمرے میں مناسب مقامات پر ٹھکانے لگا دیا ۔

کرنل نے آنے میں دیر نہ کی ۔ کھچڑی بال ، آنکھوں میں خوش آمدید کی ٹمٹماہٹ ، شلوار اور کرتا پہنے ۔ کرنل ایک چست ، خوش گوار ، چھوٹا سا آدمی ہے اور ان مونچھیل ، تکڑے ، کھڑکنے والے فوجیوں میں سے نہیں جنھیں دیکھ کر اپنی بے بضاعتی پر افسوس ہوتا ہے ۔ اس کا انداز ملائم میٹھا ہے اور تم اسے بخوبی سلیم الطبع بوڑھوں کے طبقے میں جگہ دے سکتے ہو (میں بھی اسی کیٹیگری میں آتا ہوں) ۔

ویسے پنڈی کلب یا بجنگ آمد والا کرنل قطعاً بوڑھا نہیں ۔ وہ غالباً اٹھاون ساٹھ برس کا مستعد چھیل چھبیلا رنگین نوجوان لڑکا ہے جیسا کہ اس کی پچھلی کتاب " بہ سلامت روی " کے لفظ لفظ سے مترشح ہے ۔ ہم اپنی جہان گردی سے کافی تھکے ہوئے تھے اور کرنل کی سینڈوچز اور بسکٹوں پر قدرے ندیدے پن سے ٹوٹ پڑے ۔ چائے پر ہم نے کتابوں اور ناشر حضرات کی باتیں کیں اور ناشر حضرات اگر وہاں موجود ہوتے تو شاید چلو بھر پانی میں ڈوب مرتے ۔ شفیق کو اپنے ناشروں کے ہاتھوں کئی رنج پہنچے ۔ اس کی مقبولِ عام کتابوں کے درجنوں ایڈیشن چھپے مگر

شفیق اپنی مروت، دوستی اور سادہ لوحی کی مار کھاتا رہا۔ کرنل کو بھی اس کے ناشروں نے ابتدا میں شیشے میں اتارنے کے جتن کیے اور جب اس کی پہلی کتاب "بہ جنگ آمد" طبع ہوئی تو اسے اس کا ایک پیسہ بھی معاوضہ نہ ملا۔ کرنل اپنے ملائم انداز کے باوجود کافی کڑا آدمی تھا۔ وہ بھی اپنے ناشروں سے پورا اترا۔ ان پر نالش کر دی اور ان کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ اس نے اپنے ناشر بدل ڈالے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں "بہ جنگ آمد" جس نے اردو مزاح میں مستحقاً جھنڈے گاڑ دیے ہیں، اس کے کوئی دس ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں اور وہ ایڈیشن چار پانچ ہزار سے کم نہ تھے میرا خیال ہے کہ شفیق الرحمان کی کتابوں کو چھوڑ کر اردو مزاح میں قبولِ عام کی سند جتنی "بہ جنگ آمد" کو نصیب ہوئی ہے کسی اور کتاب کو نہیں ملی۔ کرنل کی اس سال میں لکھی دوسری کتاب "بہ سلامت روی" بھی، جسے کرنل نے خود طبع کیا تھا، اب غالباً چوتھے یا پانچویں ایڈیشن میں ہے۔

اب شفیق اور کرنل نے اپنی نئی کتابیں باقاعدہ معاہدے سے ایک ہی ناشر کو چھاپنے کے لیے تھما رکھی ہیں۔ شفیق کی نئی تصنیف کا نام "دجلہ" ہے یہ اس کی پچھلے اٹھارہ بیس سال میں پہلی کتاب ہوگی۔ اور اس میں اس کی نئی لمبی کہانی "دھند" بھی شامل ہوگی۔ جسے اس نے بے اندازہ عرق ریزی سے لکھا ہے۔ کرنل کی کتاب، اس کے متفرق مضامین اور چھوٹے ٹکڑوں کا انتخاب ہے جو اس نے "بہ جنگ آمد" کے بعد وقتاً فوقتاً تحریر کیے۔

ہماری باتیں خوب پر لطف تھیں کیوں کہ شفیق اور کرنل دونوں چمک دار گفتگو کرنے والے ہیں اور عام واقعات کے بیان کو بھی ظرافت کی چاشنی سے رنگ دیتے ہیں۔ مجھے ہوں ہاں سے زیادہ بات کرنی نہیں آتی مگر اس کا کیا؟ میں ایک اچھا ہنسنے والا ہوں اور صحیح قسم کی صحبت میں میرے قہقہے اونچے اور مسرت بھرے ہوتے ہیں۔ (صورت شکل سے میں ایک ٹریجک ایکٹر دکھائی دیتا ہوں اور اس میں مجھ سے زیادہ میرے جگر کا قصور ہے۔)

ان اختلاط و انبساط کی باتوں میں وقت اڑتا گیا اور جب ہم کرنل سے رخصت ہوئے شام گہری ہو چکی تھی۔ ہم نے پھر اپنی پوٹلیوں اور بقچوں کو سمیٹا اور کرنل اس معاملے میں ہماری مہارت اور چترائی پر ششدر رہ گیا۔ وہ ہمیں کلب تک چھوڑنے آیا۔ اس نے معذرت کی کہ اس کی گاڑی مرمت کے لیے ورک شاپ میں ہے ورنہ وہ ہمیں پہنچا آتا۔ کلب کے گراؤنڈ میں کوئی بارات اتری تھی۔ دولہا کی پھولوں اور گجروں سے سجی Mercedes کے علاوہ بہت سی دوسری چمکیلی موٹر کاریں ایک دوسرے سے ناک بھڑاتی کھڑی تھیں۔ آدھ درجن موٹے پلے ہوئے لوگ مختلف سائزوں میں اور تھری پیس سوٹ ڈانٹے اتراتے پھر رہے تھے۔ ان میں ایک کرنل کو جانتا تھا اور اس سے بڑے تپاک سے ملا۔ بعد میں میں نے کرنل سے پوچھا کہ کیا وہ بھی ویڈنگ گیسٹ ہے۔

"نتھنگ ڈوئنگ ۔" کرنل بولا۔ "Not me."

موٹے پلے ہوئے بطخ نما آدمی ہمیشہ حسِ ظرافت کو بھڑکانے کا موجب بنتے ہیں ۔ وہ انہیں اس طرح پلے ہوئے توندیل ہونے پر معاف نہیں کرتا ۔ وہ ایسی وضع قطع کیوں کر اختیار کر لیتے ہیں اور انسانوں سے زیادہ بطخوں سے کیوں مشابہت رکھنے لگتے ہیں ؟ اس کے بارے میں شفیق کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے ۔ اسے سچ مچ افسوس ہوتا ہوگا (اگرچہ شفیق جیسے بشاش صحت مند آدمی کو کم ہی کسی قسم کا افسوس ہوتا ہوگا ۔) کہ پچھلے دس بارہ سالوں میں ملک میں موٹے پلے ہوئے چھوٹے قد کے لوگوں کی تعداد بے حد بڑھ گئی ہے اور وہ ہر جگہ اپنے شارک سکن سوٹوں ، چکنے چہروں ، خالی ذہنوں اور ری کنڈیشنڈ ٹیوٹا اور ڈاٹسن کاروں کے ساتھ پائے جانے لگے ہیں ۔ اس Phenomenon کی باتیں کرتے ہوئے ، جو اس مملکت خداداد پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا ، ہم پنڈی کلب سے باہر آئے اور خشک نیلی رات میں گھر کی سمت چلنے لگے ۔ ہم ٹیکسی لینا چاہتے تھے کیوں کہ ویسٹ رج سے کلب تک کم و بیش چار میل کا فاصلہ تھا ۔ ابھی تک سڑکوں پر اچھا خاصا ٹریفک رواں دواں تھا ۔ تین چار جگہ چوکوں اور Square پر ہم نے ٹیکسیوں کو روکنے کے لیے ہاتھ ہلائے (بلکہ بنڈل ہلائے) اور نعرے لگائے لیکن وہ کسی اور جگہ کا قصد کیے ہوئے تھے یا انہوں نے ہمیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھا ۔ ویسے پنڈی میں ٹیکسی کا ملنا لاہور سے کہیں زیادہ آسان ہے اور ٹیکسیوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے ۔ (لاہور میں تو وہ اب کسی وجہ سے خال خال نظر آتی ہیں اور وہ بھی بالکل خستہ کھڑکی ہوئی حالت میں ۔) اسی طرح ٹیکسی کی امید دل میں لیے ہم ایک چوک سے دوسرے چوک تک مارچ کرتے رہے اور بالآخر ویسٹ رج جانے والے لمبی چوڑی پشاور روڈ پر نکل آئے ۔ ہمارے بنڈل اب ہمارے بازوؤں اور بغلوں سے پھسل پھسل جاتے تھے مگر دو پرانے ہمدموں کو ، جن کے پاس ایک دوسرے سے کہنے کے لیے بہت کچھ ہو ، سڑکوں کے لمبے میل بھی نہیں تھکا سکتے ۔ ہمیں ٹیکسی مل جاتی تو ہم اسے ضرور خوش آمدید کہتے مگر :

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا ۔

ہم نے گھر کا آدھا راستہ طے کیا تھا کہ دکھن کی جانب سے بادل گرجنے لگے اور گھنے درختوں کی شاخوں میں سے بجلی تین چار بار کوندی ۔ ہم نے بادلوں کا مذاق اڑایا کہ وہ مری کی پہاڑیوں پر ہونے کی بجائے الٹی سمت پر گھر رہے ہیں اور ہماری خیال تھا کہ اتنی جلدی بارش پڑنے کا کوئی خدشہ نہیں ۔

اور پھر یک لخت اولوں جیسے موٹے اور ٹھنڈے بارش کے پہلے قطرے گرے ۔ میں نے پہلے انہیں اولے ہی سمجھا ۔ ہم ان قطروں کو نظر انداز کرتے ہوئے اندھیری Side walk پر چلتے گئے اور بارش ٹپ ٹپ تیز ہوتی گئی ۔ الٹے رخ سے گھرنے والے بادل اب ہم

پر ہنس رہے تھے۔

ویلسٹ برج اور ہمارے گھر کو جانے والی سڑک پر بجلی کے اکا دکا لیمپ روشن تھے۔ موٹر گاڑیوں کی آمد ورفت جاری تھی اور ان کی تیز ہیڈ لائٹس دو بھیگے ہوئے اور لتھڑوں سے لدے پھندے راہیوں کو درختوں کے اندھیرے میں راستہ بجھاتی تھیں۔ مجھے شفیق کا ایک بار رکنا اور مجھ سے کہنا یاد ہے: "بھئی دیکھو اس ملک میں موٹر گاڑیاں کس قدر ہیں، پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ غریب ملک ہے"۔

ہم تیز بوندا باندی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے تاریک، گیلے راستے پر چلتے گئے۔ کیچڑ میں شب شپاتے ہوئے، پانی سے بھرے ہوئے گڑھوں میں گرتے پڑتے۔ شفیق جو مجھ سے کئی قدم آگے چل رہا تھا، مڑمڑ کر میری حوصلہ افزائی کرتا جاتا تھا "بس یار گھر اب تھوڑی دور ہے۔ وہ جو سامنے اسٹریٹ لائٹ نظر آرہی ہے وہیں سے ہم نے مڑنا ہے" وہ شاید اس طرح پنڈی کے موسم کی عذرداری کرنا چاہتا تھا۔ ہم اس اسٹریٹ لائٹ پر پہنچ گئے جہاں ہمیں گھر کی سمت جانے کے لیے سڑک پار کرنا تھا مگر یہ غلط اسٹریٹ لائٹ تھی۔ ہماری اسٹریٹ لائٹ ابھی آدھ فرلانگ، فرلانگ، دو فرلانگ، تین فرلانگ اور آگے تھی۔

میں نے اس بارے میں سوچنا ترک کر دیا اور بارش اب واقعی سنجیدہ ہو گئی۔ باقاعدہ موسلادھار! ہم اب اس کا مذاق نہیں اڑا سکتے تھے۔ ہم اس کے زور سے بچنے کے لیے پانی میں شرابور سائیڈ واک کے پاس ایک چھدری شاخوں اور چوڑے پتوں کے درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ کہنے کو تو یہ درخت تھا مگر اسے اگر ضرورت سے زیادہ اگا ہوا جھاڑ کہا جائے تو بہتر ہو گا اس جھاڑ نے حتی المقدور ہمیں بوندوں کی یورش سے پناہ دی۔ شفیق کا چوڑے چھجے کا گور کھا ہیٹ اس کے سر پر تھا اور اس نے اس کے لیے چھتری کا کام دیا۔

اپنی اس چھوٹی سی بدبختی پر ہم راز داری سے تھی تھی ہنسے اور پھر میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھ میں پکڑے لفافے میں سے بھتیجے خلیق کے سیب آئزک نیوٹن کے اصول ثقل کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نیچے لمبی گھاس میں گر رہے ہیں۔ لفافے کا کاغذ گیلا ہو ہو کر بالکل گل چکا تھا۔ ہم نے پانچ دس منٹ ہر سو اندھیرے میں سیبوں کو ڈھونڈنے میں صرف کیے اور بالآخر ان سب کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب ان سب کو سنبھالا کیوں کر جائے؟ میں نے ایک موٹے سیب کو اپنی پتلون کی جیب میں ڈالا، دوسرے کو دوسری جیب میں۔ شفیق نے گور کھا ہیٹ اتارا اور بچے ہوئے چار سیبوں کو اس میں ڈال دیا۔ بڑی مفید چیز ہے یہ گور کھا ہیٹ۔

اب بوندوں کی ٹپ ٹپ مدھم ہو گئی اور ہم درخت کو باقاعدہ "تھینک یو" کہہ کر ویلسٹ برج کو رواں دواں ہو گئے۔ ایک اسٹریٹ لائٹ سے دوسری اسٹریٹ لائٹ تک، جو پانچ چھ کھمبے چھوڑ کر آئی تھی۔ آخر ایک جگہ شفیق رکا اور اپنے حدود اربع کو متعین کرنے کے

بعد سڑک پار کرنے لگا۔

"بھئی یہاں سے گھر کو جانا ہے۔" اس نے مجھے آواز دی۔ میں لڑھکتا پھڑکتا کافی پیچھے رہ گیا تھا کیوں کہ مجھے اندھیرے میں بہت کم دکھائی دیتا تھا اور میں پانی بھرے گڑھوں سے بہت ڈرتا ہوں۔

آخر کار ہم بارش میں دو گھنٹے کے اس ایڈونچر کے بعد صحیح سلامت شفیق کے ویسٹ رج کے مکان میں پہنچ گئے جہاں سب روشنیاں جل رہی تھیں۔ ہمارے گیلے سیلے بنڈل محفوظ تھے اور مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ خلیق کے سیبوں میں سے کوئی بھی بچ کر نکل نہیں پایا۔

اوہ! ایک روشن، محبت بھرے گھر کا آرام۔

شفیق نے کہا: "بھئی ہاتھ منہ دھو لو اور پھر ادھر آجاؤ۔"

میں نے اپنے کیچڑ میں لت پت بوٹ اتارے، گیلی پتلون اور قمیض سے چھٹکارا حاصل کیا اور صاف ستھرے باتھ روم میں شاور باتھ نے میری ساری تھکن اتار دی۔ مجھے ایسے لگا جیسے میرا بدن میرے لیے نیا نیا بنا ہو۔ میں نے سالوں سے اس احساس کو نہیں جانا تھا اور اس کے لیے قطعی بیگانہ ہو چکا تھا۔ میں شلوار قمیض پہن کر شفیق کے کمرے میں چلا گیا جہاں اس کا پرانا Steward گل ہمارے لیے قہوہ لے آیا پھر ہم نے کتابوں اور دنیا جہان کی باتیں کیں۔

ہم نے World.s Best Books کی جلدوں کی سیر کی جو میں نے شفیق سے اس زمانے میں خرید وائی تھیں جب وہ آئی۔ ایم۔ ایس (انڈین میڈیکل سروس) میں لفٹننٹ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت یہ چھے کی چھے جلدیں ہمیں ساٹھ ستر روپے میں مل گئیں۔ اب ان کی لاگت تین ساڑھے تین ہزار روپئے سے کم نہ ہوگی مگر پھر بھی وہ نایاب ہیں۔

شفیق نے اپنی سب کتابوں کو وقت کی ساری گردشوں میں سے سنبھال کر بہ حفاظت رکھا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس Alpha of the Plough (اے جی گارڈینر) کے خوب صورت essays کی ساری کتابیں ہیں۔ ایلفا، کالج کے دنوں میں ہمارا محبوب essayist تھا۔ ایک سچ مچ کا مسرت بخش اور جادو جگانے والا دوست۔ افسوس کہ ایلفا کی یہ بے مثل کتابیں اب کہیں بھی نہیں ملتیں اور کسی کو اس کا نام یاد نہیں۔ اس وقت اردو ادب میں انشائیے کو ایک نئی ادبی صنف کے طور پر پیش کیا جارہا ہے اور بہت سے لوگ دعویدار ہیں کہ انشائیہ فقط وہی چیز ہے جو وہ لکھتے ہیں مگر میرے ان دوستوں نے شاید ایلفا کے سحر انگیز essay نہیں پڑھے اور اس کے جادو تلے نہیں آئے ورنہ وہ جان جاتے کہ قدرتی essayist ہونا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ ایلفا جیسے essay لکھنے کے لیے ایک شادلب، تربیت یافتہ ذہن، ایک گرم دھڑکتے ہوئے دل اور ایک بے داغ نثری

اسلوب کا مالک ہونا ضروری ہے۔ ہم میں سے کتنے یہ جوہر رکھتے ہیں؟ اور واقعہ ہے کہ: ایں سعادت بہ زورِ بازو نیست! یہ کہا جاتا ہے کہ essay نگاری اردو زبان میں بالکل انوکھی اور جدید صنف ہے۔ میں اس کو کبھی نہیں سمجھ سکا۔ ہماری زبان میں essay لکھے جاتے رہے ہیں۔ کیا محمد حسین آزاد نے اپنی پر بہار تصنیف "نیرنگ خیال" میں essays نہیں لکھے جنھیں پڑھنے سے جی نہیں بھرتا۔ ہم مہدی الافادی اور عبدالحلیم شرر اور کئی دوسروں کے essayists کو کیوں بھول جاتے ہیں جو خوبیوں کے بغیر نہیں۔

شفیق نے مجھے اپنی نئی کہانی "دھند" کے بارے میں بتایا جو مکمل ہو چکی ہے مگر جس پر ابھی تک فن کارانہ تراش خراش اور کتر بیونت کا عمل جاری ہے۔ اس نے سائیڈ بورڈ پر دھری ہوئی پانچ چھ نوٹ بکیں مجھے دکھائیں جن میں "دھند" کے مختلف ٹکڑے، سین اور episodes درج ہیں اور پوری کہانی موجودہ شکل میں اچھے خاصے ناول کی طوالت کو جا پہنچے گی۔ شفیق اسے اپنی مشہور طویل کہانی "برساتی" کے مطابق تراشنا چاہتا ہے اور اسے ناول بنانے کے حق میں نہیں۔

میں نے اس سے اتفاق کیا کیوں کہ ناول کی وسعت میں تاثیر کی وحدت کو دھچکا پہنچنے کا احتمال رہتا ہے۔ پی۔ جی ووڈ ہاؤس کا مزاح بھی اس کے لمبے ناولوں میں قدرے منتشر اور مشینی ہو جاتا ہے اور اس کی کہانیاں یقیناً اس کے ناولوں سے زیادہ کامیاب اور دیرپا ہیں۔ شفیق نے مجھے بتایا کہ اب اس کے پاس کافی فراغت ہے اور روزانہ اپنے ڈیسک پر دو تین گھنٹے "دھند" کو فیئر آؤٹ کرنے میں صرف کر سکے گا۔ اس رفتار سے وہ اس کہانی کو پندرہ بیس روز میں اس کے آخری روپ میں صاف کر سکے گا۔ اس نے میری رائے پوچھنے کے لیے "دھند" کے کئی حصے پڑھ کر سنائے۔ (دھند، کے واقعات کا منظر اور اس کی جائے واردات ایک پہاڑی مقام ہے جہاں وہ تعینات تھا اور جہاں ایک لکڑی کے کیبن میں، میں بھی اس کے پاس دو تین مہینے رہا۔) میں "دھند" سے کافی متاثر ہوا۔ کہانی اس کے مسرور ترین آہنگ میں لکھی ہوئی ہے۔ مزاح قدرتی اور جگمگاتا ہوا ہے اور بعض مناظر تو اس انوکھی چابک دستی سے رنگے گئے ہیں کہ آدمی اس کے طبعی جوہر کا قائل ہو جاتا ہے۔ اردو میں اس کے پائے کے نثر نگار کم ہی ہوں گے۔ ایک ٹکڑا، جس میں چمنستانی خطے کے رنگارنگ پرندوں کی مختلف اوقات میں بولیوں کو انسانی آوازوں سے مطابق کیا گیا ہے حقیقتاً استادانہ صنعت کا نمونہ ہے۔ صرف شفیق ہی اتنی خوب صورتی اور لطافت سے پرندوں اور انسانوں کو ازلی رفاقت میں منسلک کر سکتا تھا۔ اس کے "دھند" سنانے کے دوران میں کئی بار بے طرح ہنسا۔ میرا خیال ہے کہ "دھند" نوک پلک کے سنورنے کے بعد برساتی، اور ڈینیوب، سے کئی لحاظ سے بڑھ چڑھ کے ہوگی کیوں کہ اس میں پختہ دور کے شفیق کے زندگی کے فلسفے کی تاپ ہے اور بعض کردار جیتے جاگتے اور

جانے پہچانے لگتے ہیں۔

ٹھیک سوا نو بجے زندگی کی سب سے اچھی چیزوں کی طرح یہ شاداں محفل آخر ہوئی اور گل دبے پاؤں ہمیں بتانے آیا کہ کھانا لگ گیا۔ ہم ذہنوں میں دمک سی لیے نیچے کھانے کے کمرے میں اترے۔ شفیق کے تینوں بیٹوں میں سے صرف مسکراتے ہوئے امین نے ہمارے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانا بچی داڑھی والے خانساماں کا پکایا ہوا، لذیذ تھا اور ہم نے گھوڑوں کی طرح کھایا۔ شفیق تلی ہوئی چیزوں سے کوسوں دور بھاگتا ہے اس کے لیے ابلے ہوئے چاول تھے، چھلکوں سمیت ابلے ہوئے آلو اور تھوڑے گھی کے سالن۔ سلاد پر اس نے بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارے۔ اس نے مرغ پلاؤ کو آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھا، جس کا ڈونگا ہمارے سامنے رکھا تھا اور جس پر امین اور میں نے مل کر ہاتھ صاف کیا۔

ہماری اشتہا چمکی ہوئی تھی اور برسوں میں مجھے کھانے نے اتنا مزہ نہیں دیا۔ کھانے کے بعد ہم سونے کے لیے اوپر چلے گئے۔ میں نے سونے سے پہلے ڈپٹی نذیر احمد کی " بنات النعش " کی کچھ ورق گردانی کی مگر دو چار ورق ہی الٹے ہوں گے کہ آنکھیں مندنے لگیں اور نیند نے غلبہ پالیا۔

گل نے بیڈ ٹی کے لیے مجھے صبح سات بجے جگا دیا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد شفیق کے معمولاتِ زندگی کچھ اس طرح سے ہیں اور جہاں تک ہوسکتا ہے وہ اوقات کی پابندی کرتا ہے۔ سات بجے صبح بیڈ ٹی۔ (اس نے اب ایک مدت سے سگریٹ پینا ترک کر دیا ہے جس سے اسے ورزش کرتے وقت کبھی کبھی کھانسی ہونے لگی تھی مگر وہ کہتا ہے کہ روزانہ آٹھ دس سگریٹ تک پینے سے کسی کو کچھ نقصان نہیں ہوتا۔) وہ اپنے کمرے میں یا صحن میں اپنی صبح کی کسرتیں کرتا ہے اور نہا دھو کر نو بجے ناشتے کے لیے اترتا ہے ایک نیم پختہ بھرتا بنا ہوا انڈا اور دو ٹوسٹ، ایک مارملیڈ کے ساتھ اور ہلکی چینی کی چائے کی دو پیالیاں۔ میں نے اسے کبھی دودھ پیتے نہیں دیکھا جسے وہ چھوٹے بچوں کے لیے موزوں خوراک سمجھتا ہے۔) ناشتے پر وہ اخبار کے عنوانات پر اچٹتی نگاہ ڈالتا ہے۔ اس نے کبھی اخبار دل چسپی اور دل جمعی سے نہیں پڑھا جو بہت سارے لوگوں کا طریقہ ہے۔ گویا کہ دنیا میں اور کرنے کا کوئی کام نہیں۔ ناشتے کے بعد وہ اپنے گھر کی شمالی پہاڑیوں کی طرف اکیلا سیر پر نکل جاتا ہے اور خوب تھک چور ہو کر گیارہ تک لوٹتا ہے۔ پھر دو ڈھائی گھنٹے جم کر ڈیسک پر اپنی نئی کہانی " دھند " کو فیئر آؤٹ کرتا ہے۔ وہ دو تین صفحات سے زیادہ نہیں کر پاتا۔ ڈیڑھ بجے گھی سے مبرا ہلکا متوازن لنچ۔ سہ پہر کو چائے کی پیالی اور پھر شام کو لمبی سیر یا اسٹیڈیم میں دوڑ۔ پھر دو تین گھنٹے notes وغیرہ لیتا ہے یا پڑھتا ہے۔ وہ ٹیلی ویژن سے قطعی لگاؤ نہیں رکھتا۔ (میرے شام کے چار پانچ گھنٹے مستقلاً ٹیلی ویژن کے سامنے گزرتے ہیں۔) نو بجے رات کے

کھانے کے بعد دس بجے تک وہ بستر میں ہوتا ہے۔

پنڈی میں اس کے دلی دوست بہت کم ہیں جو لمبی سیروں پر اس کے ساتھ جا سکیں یا جن سے اسے تعلقِ خاطر کا احساس ہو۔ طبعاً وہ ہمیشہ سے ایک شرمیلا آدمی رہا ہے اور کبھی ڈرائینگ روم کا چھیلایا سوشل ڈینڈی نہیں بنا۔ snobbery اور نمائش اسے چھو تک نہیں گئی اور وہ اپنے پرانے لنگوٹیے یاروں کی صحبت میں اصل اطمینان اور خوشی پاتا ہے۔

ناشتے کے بعد ہم فوراً ہی لمبی سیر کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ویسٹ رج کے خوش نما گھر جلد ہی ہمارے عقب میں تھے اور ہم مرغالہ کی گھاس سے ڈھکی ہوئی عنابی اور نارنجی پہاڑیوں کے درمیان تھے!

لڑھکتے ہوئے سبزہ زاروں میں اترتے اور چڑھتے، بیتی ہوئی دور دراز کے ایڈونچرز کی باتیں کرتے، کشمیر اور کلو کی وادیوں میں گزارے ہوئے دنوں کی یادوں کو پھر سے بلاتے اور مختلف پرندوں کی راگنیاں سنتے۔ ہمارے اردگرد ساری قدرتی دنیا پیلی سنہری دھوپ میں نہائی ہوئی تھی اور مکمل سکوت اور شانتی کا راج تھا۔ پنڈی کے دل فریب ہونے کی ایک وجہ اس کی پہاڑیوں سے قربت ہے۔ رنگین پہاڑ جنہیں دیکھتے ہی روح کے آزاد ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

شفیق نے مجھے بتایا کہ یہ پہاڑ مرغالہ پہاڑ کہلاتے ہیں۔ ان کے پیچھے کوہِ شوالک کا سلسلہ ہے اور اس کے پرے کوہِ ہمالیہ کی رینج ہے۔ نانگا پربت ہمالیہ کی آخری اونچی چوٹی ہے۔ اگر فضا میں یہ ہلکی سی دھند نہ ہوتی اور ہم ذرا سویرے نکلتے تو غالباً یہاں سے پیر پنجال پر برفوں کی جھلملاہٹ دیکھ سکتے لیکن آج ہم اتنے خوش قسمت نہیں۔

شفیق نے مجھے اپنی کہانی "دھند" کا پورا ڈھانچہ سنایا۔ کسی خاص وجہ سے اس نے اس پہاڑی مقام کو کوئی نام نہیں دیا جہاں واقعات رو پذیر ہوتے ہیں اور کردار اپنے اپنے پارٹ ادا کرتے ہیں لیکن ہم اسکی پوری topograhpy ، اس کے سارے منظر، اس کے چپے چپے کو جانتے تھے۔ وہ ایک البم کی طرح ہمارے ذہن میں محفوظ تھی!

میں نے شفیق سے کہا کہ اگر اس پہاڑی مقام کا نام دے دیا جائے تو کوئی ہرج نہیں ہوگا۔ اس نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا اور پھر میں نے اس کے فیصلے کی حکمت دیکھی۔ اس پہاڑی مقام کو بے نام ہی رہنا چاہیے۔ دھند میں لپٹا ہوا کوئی Shangrila ۔ ہم نے کہانی کے مختلف episodes پر بحث کی کہ کون سے episodes کو رکھا جائے، کون سے کو حذف کیا جائے اور کون سے ٹکڑے کو دوبارہ دیکھا جائے تاکہ پڑھنے والے کے ذہن میں وحدتِ تاثر اپنا بھرپور نقش چھوڑے۔

ہم نے اپنی نئی زندگی کے لیے نقشے بنائے کہ ہم اب آنے والے ماہ و سال کس ڈگر سے

گزاریں گے اور کیا کیا نئے ایڈونچرز کریں گے ۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اب کچھ نہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور اس طرح جیوں گا جیسے میرا دل چاہے گا ۔ میں کتابیں پڑھوں گا اور تھوڑا بہت لکھوں گا مگر لکھنے کی خواہش جو کبھی مجھے تلملاتی تھی اب بجھ چکی ہے اور میں لکھنے والا کبھی تھا ہی نہیں ۔

شفیق نے کہا کہ یہ فقط میرا وقتی اور عارضی احساس ہے اور میں اس احساس سے گزر جاؤں گا ۔

اس نے بتایا کہ وہ اب باقاعدگی سے لکھنے کا ارادہ رکھتا ہے اور اس کی اس بارے میں سنجیدگی سے میں خوش ہوا کیوں کہ پچھلے اٹھارہ بیس سال سے اس کے قلم سے کوئی نئی کتاب نہیں آئی ۔

ہم ریل کے پشتے پر آئے ۔ پرے ایک ڈھلوان میدان کے پار بلندی پر چمچماتا ہوا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا ۔ limestone گھروندوں کا ننھا سا جھرمٹ ۔ اس کے مکان ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے تھے اور درختوں کی پھنگیں اس کی سالم پیوستگی کو جابجا چھید رہی تھیں ۔ اس گاؤں کے بیچ میں ایک فیروزی گنبد تھا ۔ گاؤں کے پیر کا مزار!

مجھے وہ گاؤں رومانس یا سچی مسرت کی تصویر لگا جہاں جاکر آدمی دنیا کے فکروں کو بھول سکتا تھا ۔ میرا وہاں جانے کو جی مچلا مگر شفیق نے کہا کہ گاؤں اتنا نزدیک نہیں جتنا کہ نظر آتا ہے ۔

ہم ویسٹ رج سے کوئی چار میل کا فاصلہ طئے کر چکے تھے ۔ پھر ریلوے ورک شاپ کی عمارت کا چکر کاٹ کر ایک پکی سڑک سے واپس لوٹے ۔ میں مڑمڑ کر اس گاؤں کو دیکھتا رہا اور اسے کبھی نہیں بھولوں گا ۔

لنچ کے بعد ہم کو لکی میں جا بیٹھے ۔ وہاں دو آرام کرسیاں تھیں جن پر دھوپ پڑ رہی تھی ۔ دھوپ میں ابھی کچھ حدت تھی اور ہم نے محرابی بے پٹ دریچوں پر پڑے ہوئے پردے مناسب طریق پر ٹھیک کر دیے ۔ شفیق کے چمکیلے سیاہ ٹرنکوں میں برسوں کی جمع کی ہوئی محبوب کتابیں ، پرانی تصویروں کے البم ، آئی ایم ایس کے دنوں کی وردیاں ، تمغے اور ٹوٹم تھے ۔

میں نے سوچا کہ ان اچھے ٹرنکوں نے ماضی کے ان نشانوں کو امتداد زمانہ سے محفوظ رکھا ہے ۔ یہ نہ ہوتے تو ان کا پتا نہ ملتا ۔ میری طرح ، جس کے پاس ٹرنک نہیں وہ بھی ان ٹوٹموں کو ادھر ادھر رکھ کر کھو چکا ہوتا اور اپنے بچپن اور لڑکپن کو پھر سے نہ پا سکتا ۔

اپنی کاہلی کی وجہ سے میں نے کبھی ان پرانی چیزوں ...... تصویروں ، مسودوں اور خطوط ...... کو سنبھال کر نہیں رکھا جو اس عمر میں ، جس میں میں اب ہوں ، زندگی کا قیمتی سرمایہ ہونے کا جواز بن سکتی ہیں ۔ اگر چہ میں نے کبھی موپساں کی کہانی پڑھی تھی جس میں ایک تنہا

پنشن یافتہ سیول سرونٹ اپنے پرانے خطوط پڑھتا ہے جس سے اس کو اپنی موجودہ ویرانی اور بے رونقی کا اتنا شدید احساس ہوتا ہے کہ وہ ان خطوط کو جلا کو خود کشی کر لیتا ہے۔ موپساں کی کہانی کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنے پرانے خطوط کبھی مت پڑھو۔

شفیق کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے اپنی زندگی میں کسی نے ایسے خطوط نہیں لکھے: محبت کے جذبے سے رنگین، جیسے موپساں کے ریٹائرڈ سیول سرونٹ کی محبوبہ اسے لکھا کرتی تھی۔ اس لیے میں اگر خودکشی کروں گا تو اس کی وجہ پرانے خطوط نہیں ہوں گے۔

میں نے ان موٹے البموں کے ورق لٹے۔ یہ خاندانی البم بھی حیرت خیز چیزیں ہوتے ہیں۔ وہ کہیں وقت اور سالوں کے سفر پر لے جاتے ہیں۔ الفت اور رفاقت میں بندھے ہوئے بچوں، لڑکوں اور بڑوں کے شوخ، شاداں یا متین چہرے جو اب گردش ایام اور برسوں کے گزرنے سے اتنے بدل چکے ہیں کہ پہچانے نہیں جاتے کہ یہ وہی ہیں یا جو فنا کے دھندلکوں میں گم ہو چکے ہیں اور خیال اور یاد بن گئے ہیں۔ میں کسی البم کو گلے میں پھانس اور دل کی دھک دھک کے بغیر نہیں دیکھ سکتا۔ البم مجھے مسرور کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس کرے پر حیات انسانی کی بے ثباتی اور بے ثمری پر اداس کر دیتے ہیں۔

میں نے اپنا البم نہیں بنایا، اس وجہ سے نہیں کہ میں دکھ جھیلنے کے معاملے میں بزدل ہوں بلکہ اس لیے کہ مجھے کیمرے سے تصویر کھینچنا نہیں آتا اور میں تصویروں کو کھو دیتا ہوں۔ (میرے پاس ایک کیمرہ کچھ عرصہ ضرور رہا مگر میں نہیں جانتا کہ وہ اب کہاں گیا۔)

ایک تصویر میں گنجان درختوں کی دیوار کے آگے ایک ندی کے کنارے چست کوٹ اور برجس میں ایک لمبا اکہرے بدن کا آدمی کھڑا تھا۔ وہ کسی آلے غالباً تھیوڈولانٹ میں سے ندی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک شائستہ شفقت اور علم کی کیفیت تھی، شفیق نے بتایا کہ یہ اس کے مرحوم والد تھے جن کو قدرتی مناظر اور آؤٹ ڈور زندگی سے بے حد لگاؤ تھا۔

شفیق کے مختلف دوروں میں خاندان کی کئی ایک تصویریں تھیں۔ اور شفیق مجھے بتاتا جاتا کہ کب اور کہاں یہ تصویریں کھینچی گئی تھیں۔ میں ورق الٹتا گیا اور پھر ایک جگہ ٹھٹکا یہ ہمارے اسکول کے دنوں کا ایک گروپ فوٹوگراف تھا۔ غالباً ۱۹۳۱ء کا، جب ہم بھاول پور کے صادق ڈین ہائی اسکول میں آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ ہم پانچ دوستوں نے یہ فوٹو خاص طور پر بھاول پور کے واحد فوٹوگرافر لالہ نعمت رائے سے کھنچوایا تھا جو اپنی عینک، پھندنے دار رومی ٹوپی اور اچکن کے ساتھ رتن ناتھ سرشار کی تصویروں سے مشابہ تھا اور ہمارے شہر کی سب سے زیادہ نامور ہستی تھا۔ اس مدھم فوٹو میں اگلی صف میں شفیق، منظور اور ریاض کرسیوں پر براجمان تھے، پیچھے میں اور مجید کھڑے تھے۔ کتنا شوخ و شنگ اور تازہ رو

میں اس تصویر میں لگتا تھا۔ شفیق اپنی پگڑی اور کھلی شلوار قمیص میں اصل راؤ لگتا تھا، گل گوتھنا اور شگفتہ۔ اوہ..... وہ دن!

اس تصویر میں پانچ لڑکوں میں سے چار ابھی اس دنیا میں ہیں۔ منظور Appendicitis سے میو ہسپتال میں مرا جب وہ گورنمنٹ کالج، لاہور میں ایم۔ اے فائنل کا طالب علم تھا۔ باقی چار اب پنشن یافتہ ہیں۔ ساٹھ کے ہیں مگر ابھی اس دنیائے فانی کو چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ وہ رابرٹ براؤننگ کے عذرا بن میر کی طرح اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ بہترین وقت نے ابھی آگے آنا ہے۔ میں کیسا Optimistic خوش اندیش ہوں۔

پھر وادی کشمیر اور کلو وادی کے اطالوی جنگی قیدیوں کے کیمپ میں لی ہوئی تصویریں تھیں ان جگہوں اور محاذوں کی تصویریں بھی جہاں شفیق کی دوسری جنگ عظیم کے دوران بہ طور لفٹننٹ (کندھے پر دوستار، کپتان (تین ستار)، اور میجر (ایک کراؤن) تعیناتی ہوئی۔ (وہ ان دنوں اپنے ستاروں اور کراؤنوں پر اتراتا اور میں اس پر رشک کیا کرتا اگرچہ اب وہ ان پر ہنستا ہے۔) کچھ تصویریں تب کی جب شفیق اڈنبرا یونیورسٹی اور لندن یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔ پھر اس کی شادی کی تصویر اور ساتھ کے صوفے پر سیولین سوٹ میں ملبوس فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، جنرل برکی سے کوئی بات کرتے ہوئے اور میری اور شفیق کی ایک اور تصویر (آٹھ آنے میں پانچ منٹ میں تیار ہونے والی تصویر)۔ سال پتے لڑھکنے لگ گئے۔

میں جب بھاول پور کالج میں ایف۔ اے میں پڑھتا تھا اور چند دنوں کے لیے لاہور میں ایک مشہور نمائش دیکھنے آیا تھا جس کی بڑی دھوم تھی اور جو منٹو پارک میں لگی تھی۔ وہاں شام کو کارنیوال میں شفیق مجھے مل گیا۔ وہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں فرسٹ ایر کا اسٹوڈنٹ تھا اتفاقاً اس طرح ملنے سے ہم بڑے ہی خوش ہوئے۔ ہم نے کارنیوال کے سب کھیل تماشے دیکھے چرخ چوں کے لکڑی کے گھوڑوں پر بیٹھے۔ جھولے میں دنیا کی چوٹی پر پہنچے جہاں سے تم سارا لاہور دیکھ سکتے تھے۔ قسمت آزمائی کے ربڑ حلقے پھینکے۔

ہم نے ایک حلوائی کے سٹال سے دو موٹے گھی میں تر بتر قیمے کے قتلے کھائے جو بڑے مزے دار لگے اور جواب اس عمر میں ہمارے سامنے رکھے جائیں تو ہم کانوں کو ہاتھ لگائیں۔ وہیں ہم نے ایک چلتے پھرتے فوٹوگرافر سے یہ تصویر کھنچوائی۔

البموں کی سیر کے بعد شفیق کے ایک ٹرنک میں ایک درجن تمغے دیکھے جو اس نے دوسری جنگ عظیم اور بعد کے سردس کیریر میں جیتے تھے۔ شفیق کو جب وہ نیوی میں ریر ایڈمرل تھا، اپنی طویل لائق توصیف خدمات کے سلسلے میں ہلال امتیاز بھی مل چکا ہے۔ ایک تصویر میں شفیق تمغوں سے سجا ہوا اپنی ایڈمرل کی چاک سی سفید یونیفارم میں کھڑا ہے اور صدر

مملکت مسکراتے ہوئے اس کے سینے پر ہلال امتیاز آویزاں کر رہے ہیں ۔ میں نے اس فوٹو کو پسند نہ کیا کیوں کہ Flash Lights کی کسی چھل کی وجہ سے اس میں اپنا آپ نہیں لگتا اور اس کی عمر زیادہ دکھائی دیتی ہے ، پھر وہ تصویر جب پاکستان کالج آف فزیشنز اینڈ سرجنز کے کنووکیشن پر اسے فیلوشپ کی سند مل رہی ہے ۔

اس کے فوج میں درجہ بہ درجہ مناصب کی ستاروں اور کراؤنوں اور Crossed تلواروں سے زر نگار وردیاں بھی ان ہی ٹرنکوں میں تہہ بہ تہہ ہیں ۔ اس نے انھیں رکھ چھوڑا ہے ۔ شاید اس لیے کہ وہ اسے اپنی زندگی کے مختلف مراحل یاد کراتی رہیں...... کیوں کہ پرانے کپڑوں سے تمھاری سنگت ، تمھارا لبھاؤ حقیقی اور محکم ہوتا ہے اور انھیں کبھی بے مہری سے اپنے سے الگ نہیں کرنا چاہیے ۔

پھر ہم نے ٹرنکوں میں تہہ بہ تہہ جمائی کتابیں دیکھیں ۔ مارک ٹوین ، ای ۔ وی ۔ لوکس ، جی ۔ کے ۔ چسٹرٹن ، پریسٹلے کی بھولی بسری نایاب جلدیں جن سے ہم اپنے آغاز شباب کے ایام میں محبت کرتے تھے اور جن کو موجودہ نسل میں کوئی نہیں پڑھتا اور پھر ایک کونے میں چپکے سے سمٹی ہوئی Alpha of the Plough کی چھ Essays کی کتابیں تھیں ۔ چھوٹے سبز چھوٹی سی کتابیں ۔ ایلفا کو آج کل کوئی نہیں جانتا اور انگریزی ادب کی تاریخوں میں اس کے نام کا کہیں ذکر نہیں ہوتا ۔ مگر کیسے خوب صورت مسرت بخش Essays وہ لکھتا تھا اور ملنے میں وہ کتنا شفیق ، ہنس مکھ خوش گفتار رفیق ہوگا ۔ اب میں نے اس کی کتابیں سالوں کے بعد دیکھیں ۔ ایک پھانس سی میرے حلق تک آئی اور میں نے انھیں بھیگی ہوئی آنکھوں سے ، احترام سے اس گوشے سے اٹھایا ۔ ان کی سبز جلدوں کو (جن پر ایک مسافر کو اپنے ہاتھ میں کتاب لیے اور جنگل کی راہ گزر میں چلتے دکھایا گیا ہے) اپنے ہاتھ سے بار بار تھپکا ۔ ایلفا پیارے ایلفا ، تم نے ہمیں ہماری جوانی میں کیا کچھ نہیں دیا ۔ تمھارے جیسے Essay ، زندگی کے حزن ، اس کی شادمانی اور خوب صورتی سے دمکتے ہوئے اب کون لکھ سکے گا ۔ میں نے ایلفا کے Set کو پھر اپنی آرام گاہ میں لٹادیا ۔ الوداع ، الوداع ! پیارے دوست !

بعد میں ہم آرام کرسیوں پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے ۔ دو گھنٹے پرانی چیزوں کے دیکھنے میں گویا پلک جھپکتے گزر گئے ۔ اب پونے چار ہو چلے تھے ۔ ڈی لکس بس کی روانگی کا وقت پانچ بجے تھا مگر بس یا ٹرین کے سفر مجھے بے کل اور حیران کر دیتے ہیں اور میں بس کے اڈے پر ساڑھے چار بجے تک پہنچ جانا چاہتا تھا ۔ ہمارا خوش شکل طویل قامت باسکٹ بال پلیئر ٹیوشن پڑھنے کے لیے کار لے گیا تھا ۔ امین نے ایک ڈاک کا پیکٹ لاکر اپنے باپ کو دیا ۔ اس میں " قومی ڈائجسٹ " کا ایک حالیہ نمبر برآمد ہوا ۔ ابوالاعلیٰ مودودی چشمے اور بھرواں داڑھی کے ساتھ فرنٹ کور پر غور و فکر کی حالت میں ۔ ایک آدمی جو اپنے آپ میں ایک انجمن تھا ، یقیناً اس

دور کا سب سے بڑا دینی عالم، ملک کی سب سے نامور ہستی جس کے سوگ میں نہ سکولوں اور دفتروں میں تعطیل ہوئی نہ سرکاری عمارتوں پر جھنڈے سرنگوں لہرائے۔ کیسی قوم ہیں ہم!

تین ماہ پہلے شفیق کی لمبی کہانی "دھند" کا ایک ٹکڑا" قومی ڈائجسٹ" میں شائع ہوا تھا، تب سے اسے یہ رسالہ باقاعدگی سے آنے لگا ہے۔ اس کی ورق گردانی کرتے کرتے ایک جگہ دیکھا کہ ہمارے دوست مستنصر حسین تارڑ نے رسالے کے قارئین کو یہ بتایا ہے کہ وہ کیوں اور کس لیے لکھتا ہے؟ "کیوں اور کس لیے" کے بارے میں تو کچھ نہیں تھا مگر نوجوان مصنف نے ہر ایک کو یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی تھی کہ اردو میں اصلی اور حقیقی سفرنامے صرف اسی نے لکھے ہیں۔ پیش روؤں کو یہ پتا ہی نہیں تھا کہ سفرنامہ ہے کیا بلا اور بعد میں آنے والوں نے تارڑ کی نقالی کی اور بقول اس کے، اس کے اجزائے ترکیبی کو استعمال میں لائے۔ اس نے یہ بھی ذہن نشین کرایا کہ جو کچھ وہ لکھ رہا ہے اسے دوام حاصل ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور بعض اور ادیب جو بھاڑ جھونک رہے ہیں وہ نقلی مال ہے جس سے گاہک خبردار رہیں۔

اس پیراگراف کا طنز و تعریض سے بھرا ہوا لہجہ لکھنے والے کی خود پسندی اور نرگسیت کی خبر دیتا ہے۔ کیوں کہ مستنصر ہمارے چند اور لکھنے والوں کی طرح ان لٹریری جنٹل مینوں میں سے ہے جو تن دہی اور یکسوئی سے خود اپنی عبادت کرتے ہیں اور اپنے تماشائے جمال میں محو ہیں۔ ان کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ برسرِ بازار ہم چوما دیگرے نیست کی لاف زنی کسی کو زیب نہیں دیتی اور خاص طور پر ایک سنجیدہ لکھنے والے کو۔ آخر ہمارے لکھنے والوں پر کیوں کسی نہ کسی ادبی صنف کا موجد ہونے کا بھوت سوار ہے؟ وہ اکھاڑہ جیت کر اپنے حریفوں کو گرد کرنے کے درپے کس لیے ہیں؟

میں تعجب کرتا ہوں کہ آیا مستنصر نے کبھی سٹیونسن، ڈی ایچ لارنس، ماہام، ملر، گراہم گرین، ولفرڈ تھی سائیجر اور بیسیوں دوسرے مغربی مصنفوں کے سفرنامے پڑھے ہیں؟ مسٹر مستنصر! اور چند خوش نصیب ہی اسے حاصل کر سکتے ہیں۔ ماضی کے کتنے ہی صاحب جوہر اور باکمال جو اپنے دور میں اپنے متن میں سر دفتر اور پیشوا مانے جاتے تھے، ان کے اور کام سب خاک ہوئے۔ ان کو یاد کرنے والا کوئی نہیں۔ میرا Alpha فراموش ہو گیا اور تو اور بیچارے ارنسٹ ہیمنگوے کے اسلوب کی بھی ہنسی اڑائی جا رہی ہے۔ دلّی اتنی نزدیک نہیں!

اب سوا چار بج چکے تھے اور شفیق نے کہا کہ ہمیں چلنے کی تیاری کرنی چاہیے۔ میرا سوٹ کیس پہلے ہی سے Packed اور تیار تھا، شفیق نے اسے اٹھالیا اور ہم نیچے اترنے لگے گل نے کھانے کی میز پر چائے رکھ دی تھی۔ ساڑھے چار ہو گئے۔ اور ہمارا طویل قامت ابھی اپنی ٹیوشن سے نہ لوٹا تھا۔

"اسے پتا ہے۔" شفیق نے کہا، "وہ آتا ہی ہو گا۔"

چار پنتیس، چار چالیس، عتیق کا نشان تک نہیں۔ میں کچھ نروس ہو گیا۔ کچھ زیادہ نہیں۔ میں ڈی لکس سروس کو اپنے بغیر لاہور کے لیے روانہ ہوتے دیکھ سکتا تھا۔ میری نشست بک تھی مگر میں نے ٹکٹ اڈے پر پہنچ کر خریدنا تھا۔ اگر بس نکل بھی گئی تو اس سے آسمان نہیں ٹوٹے گا۔ اگلے دن میری دفتر سے چھٹی تھی اور نہ بھی ہوتی پھر بھی وہاں کوئی یہ چیک نہ کرتا کہ میں آیا ہوں یا نہیں۔ میرا دفتر اسی قسم کا ہے۔ شفیق نے کہا کہ ٹیلیفون پر بس کے اڈے سے ڈی لکس کی روانگی کا وقت کنفرم کر لو۔

میں نے اڈے پر رنگ کیا اور اپنے کوائف بتائے۔

"پانچ بجے کی ڈی لکس شاید نہیں جائے گی۔ اس میں کچھ خرابی ہو گئی تھی۔ اگر ٹھیک ہو گئی تو شاید جائے۔ آپ پندرہ منٹ تک کنفرم کر لیں۔" دوسرے سرے پر ایک آدمی نے کہا۔

جب میں فون کر رہا تھا۔ تو عتیق موٹر میں سچ مچ آ ہی پہنچا۔ سوٹ کیس ڈکی میں رکھا اور ہم اڈے کی طرف کوئی ساٹھ میل کی رفتار سے چلے۔

میں دل ہی دل میں خواہش کر رہا تھا کہ ڈی لکس نہ جائے تو اچھا ہے۔

اپنے باپ کی، گاڑی آہستہ چلانے کی نصیحت کو ان سنا کرتے ہوئے اس نے کار خوب تیز چلائی۔ وہ فرسٹ کلاس ڈرائیور ہے مگر سب آتش خو نوجوانوں کی طرح وہ بے صبرا ہے اور انتظار نہیں کر سکتا۔ ایک جگہ آگے سڑک بلاک ہونے کی وجہ سے ہمیں بائیں طرف سڑک کی دوسری شاخ پر موڑ گھومنا پڑا۔ ہمارے دائیں سے ایک لڑکھڑاتی ہوئی بس بھی ہمیں بیچ کے پشتے کی طرف دباتی ہوئی موڑ گھومنے میں پہل کرنے لگی۔ اب عتیق اس کی کیسے اجازت دیتا اور اس نے کار کو نہ روکا اور مڑتی ہوئی بس چھوتی ہوئی ہمارے اوپر یلغار کرتی آئی۔ دونوں گاڑیوں کے Bonnet دست و گریبان ہوتے ہوتے رہ گئے۔ بس ڈرائیور نے آخر مونچھ نیچی کر لی، اپنی بس کو بریک لگائی اور ہم کو موڑ گھومنے کی اجازت دے دی، ہمارا طویل قامت (چہرہ غصے سے سرخ) جیت گیا تھا مگر ہم حقیقتاً ایک خطرناک ٹکر سے بال بال بچ گئے تھے۔

"بھئی عتیق!" باپ نے اسے تنبیہہ کی، "ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ تم گاڑی کو Slow down کر لیتے۔"

"ابا!" اس نے تیز لہجے میں جواب دیا۔ "فالٹ بس والے کا تھا۔ وہ بائیں طرف سے کیوں اوورٹیک کر رہا تھا۔"

"عتیق!" باپ نے کہا، "بات مانا کرو۔ آج کل ٹریفک کے قواعد کی کون پرواہ کرتا ہے۔ ہمیشہ اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔"

وہ چپ رہا لیکن بزرگوں کی یہ تنبیہہ اُسے ناگوار گزری ۔ یہ میں اس کے چہرے سے پڑھ سکتا تھا ۔ صدر میں سے گزرتے ہوئے ، جہاں گورنمنٹ بس کا اڈا ہے ، وہ اڈے کو بائیں طرف چھوڑتا ہوا آگے چلا گیا ۔ میں نے اسے بتایا کہ اڈا پیچھے رہ گیا ہے جسے شفیق نے بھی دہرایا ۔
" ابا ! " اس کے لہجے میں رنجیدگی اور جھلاہٹ کی رمق تھی ، " یہ تو لاہور جانے والی بسوں کا اڈا نہیں ہے ۔ یہاں سے تو وہ لوکل Wagons چلتی ہیں جو اسلام آباد وغیرہ کو جاتی ہیں ۔ لاہور والی بسوں کا اڈا تو ادھر دوری مری روڈ پر ہے ۔ "
" میں نے کل بکنگ تو یہیں سے کرائی تھی ۔ " میں نے کہا ۔ " جی ۔ ٹی ۔ ایس ۔ بھی یہیں سے چلتی ہیں ۔ "
" ابا ، مجھے پتا ہے کہ لاہور کی بس کا اڈا آگے جا کر مری روڈ پر ہے ۔ "
عتیق کو کبھی بس میں لاہور جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا مگر جوانی کے تیقن اور ہٹیلے پن سے وہ اصرار کرتا رہا کہ وہ جانتا ہے کہ لاہور جانے والی بسیں آگے مری روڈ سے کہیں چلتی ہیں وہ ہمیں سر پھرے ، الٹی کھوپڑی والے سمجھ رہا تھا جو اس کا وقت ضائع کر رہے تھے اور غلط جگہ پر لے جا رہے تھے ۔
آخر وہ کار گھما کر بڑی ناراضامندی سے جی ۔ ٹی ۔ ایس کے اڈے پر لے گیا ۔ ہم سے کچھ کچھ خفا کہ ہم صحیح تھے اور وہ غلط کیوں کہ اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ لاہور کی بسیں اسی اڈے سے جاتی ہیں ۔ میں اس کے احساسات کو بھانپ سکتا تھا ۔ کیوں کہ میرا بھی ہو بہو عتیق جیسا ایک بیٹا ہے مگر کیا نوجوانوں کی اس خودسری اور بڑوں کے لیے کچھ بے لحاظی کا برا ماننا چاہیے ؟ ہم بھی کبھی جوان تھے اور ایسے ہی تھے ۔ ویسے عتیق ایک کیپٹل ، پر اعتماد ، زندگی سے چمکتا دمکتا لڑکا ہے ۔ بازوؤں میں بل مارتا ہوا جوانی کا جوش اور سپورٹس سے شیفتگی اور کوئی باپ بھی ایسے بیٹے پر دل میں غرور کر سکتا ہے ۔
کاؤنٹر کے آدمی سے پوچھ گچھ کر کے کنفرم کیا کہ پانچ بجے کی ڈی لکس کینسل ہو گئی ہے اور " نہیں " جائے گی مگر ایک ایکسپریس جی ۔ ٹی ۔ بس لاہور جانے والی ہے اور میں اس میں سیٹ لے سکتا ہوں ۔ مجھے سکھ کا احساس ہوا ۔ کیا میرا جانا اتنا ہی ضروری تھا ! کہاں مجھے جانا تھا اور کیوں ! میں پنڈی میں ایک دن اور اپنے دیرینہ دوست کی دل نواز صحبت میں بسر کرنا چاہتا تھا اور پھر میں ایک بلڑ بھلڑ آدمی ہوں اور پایانِ عمر میں اپنی ہڈیوں کو آرام اور راحت سے رکھنا چاہتا ہوں ۔
" نہیں " میں نے کہا ، " میں ڈی لکس سے جاؤں گا ۔ " اور میں نے اگلے دن سب سے پہلی ڈی لکس میں ، جو دس بجے روانہ ہوتی ہے ، ایک سیٹ ریزرو کرا لی ۔
ہمارا طویل قامت ، جواب خوش طبعی کے موڈ میں تھا ، ہمیں ویسٹ رج واپس لے گیا

شام کا جھٹ پٹا ہو چلا تھا ۔ اور گھر پہنچتے ہی ہم پُر سکون اترتی اور چڑھتی سڑکوں پر سیر پر چل کھڑے ہوئے ۔ ہم ریلوے لائن تک گئے اور پھر وہاں سے لوٹے شفیق سارا وقت اپنے دائیں بازو کو ایک چکر میں حرکت دیتا رہا جیسے وہ سبز پچ پر کسی بیٹسمین کو فاسٹ بولنگ کر رہا ہو ۔ (کالج کی کرکٹ ٹیم میں وہ ایک فاسٹ بولر تھا ۔ تب اسے تین Colour ملے تھے: کرکٹ، باکسنگ، اور سوئمنگ کے اور اس کی کہانی "فاسٹ بولر، اس کی سب سے قہقہہ آور کہانیوں میں سے ہے ۔) سارا وقت وہ اپنی چمک دار، جاں فزا باتیں کرتا رہا جس کا اندازہ اس کی کتابوں سے ہو سکتا ہے ۔

نیلے اندھیرے میں ہم روشن گھر میں تھکے ماندے آئے اور پھر کل کی لائی ہوئی کافی پر نو بجے تک بیٹھے نہ جانے کیا کیا باتیں کرتے رہے ۔ میرا خیال ہے کہ ہم نے " دھند " کے ڈھانچے پر کچھ اور بحث کی اور اس نے مجھے کچھ ان لوگوں کے حلیوں اور عادات سے بہلایا جو " دھند " کے مذکر اور مؤنث کرداروں کے اصل پروٹوٹائپ تھے ۔

دس بجے کھانا کھایا ۔ بڑی بڑی دل گداز آنکھوں اور کنول کی مانند کھلے چہرے والا امین حسبِ معمول کھانے کی میز پر تھا ۔ میں اس سے انسیت محسوس کرنے لگا اور میرا خیال ہے کہ اپنے باپ کے تین بیٹوں میں سے وہ اپنے مذاق اور فکر میں اس سے سب سے زیادہ نزدیک ہے اور اسے سب سے زیادہ سمجھتا اور ایڈمائر کرتا ہے ۔ یقیناً تینوں شان دار لڑکوں میں میرا چہیتا بھتیجا ۔

گیارہ بجے بستر میں ۔ اور میں کسی وجہ سے دیر تک جاگتا رہا ۔ دوسری صبح ناشتے سے فارغ ہوتے ہوتے بس کا ٹائم ہو گیا ۔ عتیق نے باسکٹ بال کے میچ یا ٹیوشن پر جانا تھا ۔ اور شفیق نے اس سے کہا کہ وہ ہمیں بس کے اڈے پر چھوڑ کر اپنے کام پر چلا جائے اور پھر گھر لوٹتے ہوئے اسے لندن بک کمپنی سے لے لے ۔

پنڈی کے جی ۔ ٹی ۔ ایس کے اڈے پر جو بھاگڑ مچی رہتی ہے میں نے کہیں نہیں دیکھی کیوں کہ اڈے کی چار دیواری کے اندر ان سب بسوں کے لیے جگہ نہیں جو وہاں ہر وقت آتی جاتی رہتی ہیں ۔ بسیں وہاں ٹاپے میں بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح شانہ بہ شانہ گردنیں ملا کر ٹھنسی رہتی ہیں اور ایک بڑا ہی کائیاں ڈرائیور بہت سے داؤ گھات کر کے اور حکمت عملیاں بروئے کار لا کر اپنی بس کو مسافر بٹھانے کے لیے پلیٹ فارم پر لانے میں کامیاب ہوتا ہے ۔ جو افراتفری اور بے نظمی ہمارے ملک میں پھیلی ہے ۔ وہی پنڈی کے بس کے اڈے پر ہے کیوں کہ مسافر وہاں اترتے نہیں اور سوار ہو کر اپنی منزل کو روانہ ہوتے ہیں، حیرت انگیز ہے ۔

میں نے ٹکٹ خریدا ۔ دس بجنے والے تھے مگر ڈی لکس کہیں دکھائی نہ دی ۔ ہم اس کے پلیٹ فارم پر لگنے کا انتظار کرنے لگے ۔ ہمارے دل اس وداع اور جدائی پر قدرے غم ناک ۔

ہم نے اکٹھے دو خوب صورت دن گزارے تھے۔ لمبی سیروں اور اچھی گفتگو میں اور میں اس کے لیے قسمتوں کا شکر گزار تھا۔

سوا دس! کہاں ہے بس؟ پھر شفیق نے ایک بس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "بھئی وہ ہے تمھاری بس ڈی لکس۔ وہ آگے اور پیچھے بسوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ اگر ڈرائیور اسے راہِ راست پر لے آئے تو یہ بڑا ہیٹ ٹرک ہو گا۔"

داڑھی والا ڈرائیور، کنڈکٹر اور چار پانچ دوسرے، گلا پھاڑ پھاڑ کر مناسب ہدایتیں دینے والا، لوگوں کی مدد سے بس کو اس گورکھ دھندے سے نکالنے کے جتن کر رہے تھے۔ اس نے پندرہ، بیس منٹ تک سب گر استعمال کیے۔ وہ کامیاب نہ ہوا سوائے اس بات کے کہ بیک کرتے ہوئے پیچھے کھڑی ایک بس کی ہیڈلائٹ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ دوسری بس کا ڈرائیور (جو ہدایات دینے والا تھا) ہیڈلائٹ ٹوٹنے پر داڑھی والے ڈرائیور پر بگڑا اور دونوں کے درمیان نہ چھپ سکنے والے مواد کا تبادلہ ہوا۔ پھر داڑھی والے ڈرائیور کی جگہ ایک اور ماہر ڈرائیور نے لی جس نے نوکیلی داڑھی کے علاوہ عینک بھی لگائی ہوئی تھی اور جو کافی معتبر اور قابل معلوم ہوتا تھا۔ وہ بس کو پلیٹ فام سے پیچھے اس پوزیشن میں لانے میں کامیاب ہو گیا کہ مسافر اس میں سوار ہو سکیں۔

میں نے اپنی ریزرو سیٹ پر اپنا سوٹ کیس رکھا اور پھر نیچے شفیق کو الوداع کہنے اور لمبا ہینڈ شیک کرنے اترا۔۔ اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں نومبر میں ریاض کے ہمراہ ضرور آؤں گا۔ میں اب اپنی نشست پر آبیٹھا اور جب ہم دس منٹ کے بعد حرکت میں آئے تو شفیق اسی طرح اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ گورکھا ہیٹ میں لمبا تڑنگا، چست، کھلنڈرا لڑکا سا، مگر قدرے تنہا اور کھویا کھویا۔

میرا بچپن اور لڑکپن کا دوست جس نے پڑھنے والوں کی دو نسلوں کو چھپے ہوئے لفظ سے کسی اور شخص سے زیادہ ہنسایا تھا اور خالص صاف ستھرے اور طنز سے پاک مزاح کی پُربہار کتابیں لکھی تھی اور جو شرمیلا اور ہر طرح کی بناوٹ سے دور، دل سوز اور من بھاون ساتھی تھا۔ اس کی موجودگی نے دنیا کے دکھ دردوں میں ہمیشہ میرا دل بڑھایا۔

بس اور اڈے پر اتنی ہڑبونگ اور طوفان بدتمیزی بپا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو Wave نہ کر سکے!

(یاترا سے شکریے کے ساتھ نقل ہوا ہے)

00 000 00

مستنصر حسین تارڑ

لوگ جنھوں نے مسکرانا سکھایا

دھوپ ٹھٹھرتی ہوئی گدلی اور بے رنگ جو شدتِ سرما کے بوجھ تلے دب کر کسی فضا میں ہی تحلیل ہوجاتی ہے ۔

دھوپ ، سفید سیسے کی طرح پگھلی ، کرنیں چبھتے کھبتے کانٹے ، موسم گرما کی آگ جیسے آسمان سے دیوانگی برس رہی ہے ۔

مگر یہ دھوپ . . . .

فروری کا آخیر ، ایک فٹ پاتھ ، دھوپ کا وہ لمس جو بدن سے چھوتے ہی ان رتوں کو معدوم کردیتا ہے جنھیں شمار کرکے ہم اپنے آپ کو بوڑھا یا جوان کہتے ہیں ۔ کوزی (Cosy) نکھتی اور آرام دہ دھوپ . . . میری ہتھیلیاں مجھے بتاتی ہیں کہ پتلون کی جیب میں اور باہر فضا کا ایک ہی درجہ ، حرارت ہے میں اتوار کی دوپہر کو کاہل الوجودی کی تمام تر لذتوں سے لطف اندوز ہورہا ہوں ۔

چوڑے فٹ پاتھ پر سیکنڈ ہینڈ کتابیں اور رسالے اپنے کاغذی جسم پھیلائے اسی دھوپ میں پڑے اونگھ رہے ہیں ۔

ایر فورس کے چند کیڈٹ ہوابازی کے رسالوں کو الٹ پلٹ رہے ہیں ۔ جدید ترین لڑاکا ہوائی جہازوں کی تصاویر دیکھ کر ان کے چہروں پر وہی شہوت پھوٹنے لگتی ہے جو اسی عمر کے عام لڑکوں کے بدن کو اس وقت بے چین کرتی ہے جب وہ کسی نیم برہنہ جسم کو دیکھ لیتے ہیں ۔

ایک مولانا کشمیری بازار میں چھپنے والے مذہبی جرائد کو نہایت خشوع و خضوع سے دیکھ رہے ہیں ۔

کچھ طالب علم پرانی کتابوں کے ڈھیروں میں سے کورس کی کتابیں تلاش کررہے ہیں ۔

دھوپ مہربان اور نسوانی بدن میں سے آتی آنچ ایسی دھوپ ۔

چند بچے کامکس دیکھنے کے علاوہ ٹٹ بٹس کے پرچوں میں پوشیدہ پن اپس بھی ملاحظ کررہے ہیں ۔

میں نیشنل جیوگرافک کے ڈھیر میں سے ایسے شمارے تلاش کرتا ہوں جو میرے پاس نہیں ہیں۔ دو شمارے ملتے ہیں کتابوں والوں سے قیمت دریافت کرتا ہوں ۔ ۔ ۔ دس روپے فی، میں رسالے اسی ڈھیر میں غرق کرکے پھر دھوپ سے لطف اندوز ہونے لگتا ہوں۔

ایر فورس کے کیڈٹوں ، باریش مولانا ، طالب علموں اور بچوں سے پرے فٹ پاتھ کے دوسرے کنارے پر کھڑا ایک لمبا تڑنگا ، خوش لباس گورا سا شخص کتابیں دیکھ رہا ہے ۔

۔جھیل کے شفاف اور نیلے پانی پر ہلکی ہلکی دھند چھائی ہوئی ہے ۔ دور بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوا میں تیر رہے ہیں ۔ کناروں پر پھول دار بیلیں اور پودے جھکے ہوئے تھے اور بے شمار تتلیاں اڑ رہی تھیں جھیل کے کنارے دور دور تک چلے گئے تھے ۔ دوسرا کنارہ بہت دور تھا اور کبھی کبھار ہی دکھائی دیتا کبھی دور دور تک محل اور قلعے دکھائی دیتے کبھی گھنے اور سرسبز باغ اور کبھی ریت کے ٹیلے اور نخلستان نظر آتے ۔"

میرا جی چاہا کہ میں اسی کے ایک کردار کی طرح جا کر پوچھوں "ایک چھ فٹ کے لمبے تڑنگے خوب صورت گورے سے لڑکے آپ ہی ہیں ؟"

بیڈن روڈ پر متعدد آنہ لائبریریاں تھیں اور ان سب کے مالک مجھ سے بے حد نالاں تھے ۔ میں صبح سویرے ایک ضخیم سی کتاب لے جاتا اور شام ہونے سے پیش تر ہی واپس کر جاتا ، ظاہر ہے ایک روز کا کرایا صرف ایک آنہ بنتا ۔ جب کہ وہی کتاب عام حالات میں کم از کم آٹھ دس گنا زیادہ رقم کی وصولی کا باعث بنتی ۔ ایک وقت ایسا آیا کہ مجھے دور سے دیکھ کر ہی وہ انکار میں سر ہلادیتے کہ کوئی نئی کتاب نہیں ہے ۔ میں ان کے تمام تر ذخیرے یہاں تک کہ ایم اسلم ، رئیس احمد جعفری ، نسیم حجازی اور ابن صفی کی کتابیں بھی چاٹ چکا تھا ۔ اس بلا تفریق مطالعے کے دوران مجھے ان مصنفوں تک بھی رسائی حاصل ہوگئی جو میرے ادبی مستقبل پر اثر انداز ہوئے بلونت ، بیدی ، کرشن ، منٹو ، قاسمی اور شفیق الرحمٰن ۔ پھر میں انگلستان چلا گیا ۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ایک سگریٹ فیکٹری میں بڑے بڑے کارٹن اٹھاتے ہوئے جانے ایک روز کیا ہوا کہ شفیق الرحمٰن کی "برساتی" ایک فلم کی طرح میرے سامنے حرکت کرنے لگی ۔

"برساتی ایک سفر نامہ ہے جس نے نوعمری کے اوائل میں میرے اندر چھپے ہوئے آوارہ گرد کو تھپکی دی اور میرے بدن میں دیوانگی ، لیاقت کا پہلا کانٹا چبھویا ۔ اس روز میں گھر واپس آیا اور شفیق الرحمٰن کو ایک مخصوص قسم کا احمقانہ فین لیٹر لکھ دیا ۔ چند روز بعد مجھے ایک ایسا خوش بودار اور زنانہ رائیٹنگ میں لکھا ہوا لفافہ ملا جسے دیکھ کر میرا دل اس زور سے دھڑکا کہ قیامت کر دی ۔ خط کھولا ، وہ لڑکی جو ہم ہمیشہ پیچھے چھوڑ آتے ہیں اس کا نہ تھا ، شفیق الرحمٰن کا تھا ۔" یونان

صرف موسمِ بہار میں جاؤ۔ پھولوں سے اٹا ہوگا۔ سوئٹزر لینڈ موسم گرما میں خوش گوار ہوتا ہے اور اطالیہ۔۔۔۔۔ کسی بھی موسم میں چلے جاؤ۔" وہ ان دنوں شاید لیفٹیننٹ کرنل یا میجر تھے۔ اس دن فین لیٹر کو لکھے ہوئے آج شاید اٹھارہ برس گزر چکے تھے۔

ایر فورس کے کیڈٹوں۔ بارلیش مولانا۔ طالب علموں اور بچوں سے پرے فٹ پاتھ کے دوسرے کنارے پر جو لمبا تڑنگا۔ خوش لباس گورا سا شخص کتابیں دیکھ رہا تھا شفیق الرحمٰن تھا۔ مگر آج میرے سیاہ بالوں میں چاندی کے تار چمک رہے تھے اور میں نے بھی ادب کے سمندر میں پھنکار تے بڑے بڑے جہازوں کے درمیان کاغذ سے چند کشتیاں تخلیق کر کے ڈال دی تھیں۔ اپنی کتابوں کی صورت میں اور شفیق الرحمٰن وہ بے چارے اب بھی میجر ہیں مگر ایک فرق کے ساتھ کہ اس کے بعد جنرل کا ہیبت ناک اضافہ بھی ہوچکا ہے۔

"یہ خود فریبی کی نیلی جھیلیں اور دوسرے کنارے عمر بھر پیچھا نہیں چھوڑتے۔۔۔۔۔ ہم زندگی بھر اپنے آپ کو فریب دینے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ یہ یقین دلانے کی کوشش میں کہ جو چیزیں یہاں نہیں ہے وہ یہاں ہے۔۔۔۔ دوسرے کنارے کے متعلق تم نے کیسے سہانے خیالات دل میں بسا رکھے ہیں۔ میں وہاں کئی مرتبہ گیا ہوں۔ وہ کنارہ بالکل ویران ہے۔ اس کنارے سے کہیں برا ہے۔ میری مانو تو تم کبھی اس طرف مت جانا ورنہ تمھیں افسوس ہوگا دوسرا کنارہ بس دور سے ہی اچھا لگتا ہے"۔

میرا بھی یہی خیال تھا کہ دوسرا کنارہ بس دور سے ہی اچھا لگتا ہے مگر آج میں شفیق الرحمٰن سے پہلی مرتبہ ملا تھا اور مجھے محسوس ہوا کہ دوسرے کنارے پر کھڑا یہ شخص نزدیک آکر بھی اتنا ہی سحر انگیز ہے۔۔۔۔۔ صرف مجھے اس کے جنرل ہونے پر اعتراض ہے۔ اسے میں توپ قسم کا جنرل بھی نہیں کہہ سکتا کہ آرٹلری (توپ خانے) کے نہیں میڈیکل کے ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں اگر کسی ناتواں قریب المرگ مریض کو یہ کہہ دیا جائے کہ اب جنرل صاحب تمھاری خبرلیں گے تو وہ بے چارہ تو مارے دہشت کے صرف فوت ہی ہوسکتا ہے نا! ادھر پاکستان آرمی میں مزاح نگاروں کی اتنی وافر تعداد دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ کاکول اکیڈمی میں ان دنوں چارلی چپلین انسٹرکٹر لگا ہوا تھا۔

آخر آپ جنرل شفیق الرحمٰن۔ کرنل محمد خان۔ میجر ضمیر جعفری اور کرنل صدیق سالک کو کس کھاتے میں ڈالیں گے؟

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا شفیق صاحب چند رسالے تھامے میری جانب آرہے تھے

- بھئی لاہور پہنچتے ہی کتاب محمد خالد اختر کو دے دیجیے گا۔ وہ اسٹیونسن کے بارے میں بے

حد جذباتی ہے ۔ اسی کی شاعری کا مجموعہ ہے ۔ " انھوں نے ایک سرخ جلد والی بوسیدہ کتاب مجھے دیتے ہوئے کہا ۔

میں نے کتاب کھول کر ایک نگاہ ڈالی ۔

" میں جب بڑا ہو جاؤں گا تو اتنا امیر اور طاقت ور بن جاؤں گا کہ پھر کسی کو میرے کھلونے چھیننے کی جراءت نہ ہوگی ۔ "

" اور یہ آپ کے لیے ہے ۔ " ان کے تن سازوں ایسے مضبوط چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی ۔ قابوس نامہ ہے ۔ ایک ایرانی شہنشاہ نے مرتے وقت اپنے بیٹے کو دنیاوی قباحتوں سے بچنے کے آداب بتائے ہیں ۔ "

" بہت دیر ہو چکی ۔ " میں نے کتاب وصول کر کے جیب میں اڑس لی ۔ شفیق الرحمٰن کا معمول ہے کہ وہ ہر اتوار کی دوپہر پنڈی کی مال کے قریب فٹ پاتھ پر بکھری سیکنڈ ہینڈ کتابوں میں گم گزرتے ہیں میرے جیسا بد ذوق انسان یوں قابو آگیا تھا کہ اپنے پنجابی ناول " پکھیرو " کی افتتاحی تقریب کے سلسلے میں پنڈی آنا پڑا ۔ وہاں پنڈی کلب آنا ہوا جہاں شفیق الرحمٰن صاحب سے اتفاقاً ملاقات ہوگئی ۔ انھوں نے دیکھتے ہی حکم دے دیا کہ تم اتوار کا دن میرے ساتھ گزارو گے ۔ یہ حکم ایسے ہی تھا جیسے کوئی مس یونیورس آپ کو کہہ دے کہ تم آج کی شب میرے ساتھ بسر کرو گے ۔

" اگر آپ فارغ ہوگئے ہیں تو واپس گھر پلٹیں ۔ " انھوں نے پوچھا ۔

" میں مصروف ہی کب ہوا تھا ؟ "

انھوں نے اپنے ڈرائیور کو اشارہ کیا جو حسب معمول نہایت غیر پیشہ ورانہ انداز میں کار چلاتے ہوئے ہمارے قریب آگیا ۔

شفیق صاحب کا گھر بھی ان کی کہانیوں ایسا ہے ۔ خوب صورت پلاٹ ، شگفتہ اور نکھرے نکھرے کمرے ، نفیس سجاوٹ یوں لگتا ہے جیسے اس کی تعمیر کے دوران شفیق صاحب معماروں کو اپنی کہانیاں سناتے رہے اور ان بھلے لوگوں نے مسحور ہو کر اینٹ اور سیمنٹ کی بجائے ان ہی کی تخلیقات سے تعمیر کر دی ۔

دوپہر کے کھانے کے لیے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تو میز پر سجی خوراک کو دیکھ کر میں بقیہ مہمانوں کا انتظار کرنے لگا ۔

" بسم اللہ کیجیے " شفیق صاحب نے دہی کا ایک پورا کونڈا میرے طرف بڑھاتے ہوئے کہا ۔

" جی " میں بیہوش ہوتے ہوتے بچا۔ " دہی کا سالم۔۔۔۔ "

" بہت مفید چیز ہے " انھوں نے تقریباً دوسیر دہی میری پلیٹ میں انڈیلتے ہوئے اطلاع کی۔

پھر اطالوی سویوں کا ایک انبار آگے آیا۔ ابلی ہوئی سبزیوں کا ایک ڈھیر، مٹر قیمہ خاصے رقبے میں پھیلا ہوا، حلیم بھی تھی، دیگ میں تو نہ تھی۔ بہ ہرحال دیگچے میں کہ لیجیے۔۔۔۔ سویٹ ڈش اور آخر میں پھلوں کا ایک باغ۔

روایت ہے کہ قدیم چین میں ایک شاہی حکومت کے دوران میں ایک مہمان خوراک کی کمی کے باعث انتقال کرگیا تب سے چینیوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ مہمان کو کم از کم بھوک سے تو مرنے نہیں دیں گے۔ شفیق صاحب کے آباؤ اجداد میں بھی شاید اس قسم کا کوئی سانحہ ظہور پذیر ہوا تھا۔

کھانا ختم ہوا بلکہ ختم کروایا گیا تو میں تقریباً اونگھ رہا تھا۔ میں نے ایک نہایت احمقانہ مسکراہٹ لبوں پر سجالی اور مجھے اس کے لیے زیادہ کوشش نہ کرنی پڑی اور پھر اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کے لیے جتن کرنے لگا۔

" آیئے ٹیرس پر بیٹھتے ہیں۔ کافی وہیں آجائے گی۔ "

ٹیرس پر بیٹھے ہوئے جو چیزیں دیکھنے کو ملیں ان سے نشہ دو آتشہ ہوگیا۔ شفیق صاحب کے دریائی سفر ناموں دجلہ، فرات، ڈینیوب اور نیل کے مسودے۔ ان کی تازہ کہانی " دھند " کا ڈرافٹ اور پھر وہ پرانی تصویری البم جس کے ہر صفحے پر شفیق الرحمن کے لازوال کردار کھلے ہوئے تھے۔

" یہ روفی ہے شیطان، شاید آپ جانتے ہوں۔ " انھوں نے ایک دبلے سے لڑکے کی تصویر پر انگلی رکھ کر کہا۔ اس کی آنکھوں سے جیسے شرارت ابل رہی تھی، ان دنوں ولایت میں ہے۔ " ایک سرخ بالوں والی یورپی لڑکی بے حد اداسی سے کیمرے کو تک رہی تھی۔ " اس کا نام این ہے۔ سکاٹ لینڈ کی۔۔۔ " " برساتی والی این؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔ " شفیق صاحب مسکراتے رہے۔

" جس نے آپ کے سر پر بلغ رکھ دی تھی جو آپ کو نیوکاسل تک کار میں چھوڑنے آتی تھی۔۔۔۔ جو آپ کو بے پناہ۔۔۔۔ "

اس سے پیشتر کہ میری حالت مزید غیر ہوتی انھوں نے صفحہ پلٹ دیا۔ ایک خوش شکل اور اسمارٹ سا نوجوان ساحل پر لیٹا ریت پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔

"یہ صاحب کون ہیں ؟ "

" محمد خالد اختر" انھوں نے دھیرے سے کہا ۔

" جی نہیں " میں نے زور زور سے سر ہلایا ۔

"کیوں ؟ " وہ حیرت زدہ ہوگئے ۔

" آپ کا مطلب محمد خالد اختر ہی ہے نا ۔ اپنے خالد صاحب ۔ سود پاک سواتی اور کاغانی مہم ۔ تذکرہ ۔ اہل لاہور والے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

شفیق صاحب ہنسنے لگے " بھئی ان دنوں خالد جوانِ رعنا تھا ۔ نہایت حسین ۔ ہم دونوں لاہور میں پڑھتے تھے اور ایک ہی ہوسٹل میں رہتے تھے ۔ ہر اتوار کو ہم پیدل مارچ کرتے ہوئے دریائے راوی پر جاتے ۔ بوٹنگ کرتے پھر مقبرہ ۔ جہانگیر میں گھومتے ۔ ۔ ۔ پھر ۔ ۔ ۔ بہ ہرحال رات گئے واپس ہوسٹل لوٹتے ۔ "

میں حیرت سے ان لوگوں کے محمد خالد اختر کو دیکھا گیا ۔ وقت ، وقت ، وقت ، پھر بادلوں کی تصاویر کا ایک سلسلہ سامنے آیا ۔ ساون کے بادل ۔ پانی سے بوجھل ۔ بوجھ سے خالی ہلکے ہلکے بادل ۔ صحرا پر امڈے ہوئے ۔ ویرانے میں چمکتے آبادیوں پر سایہ کیے ہوئے بادل !

ایک صفحے پر شفیق الرحمن کی جوانی کی تصاویر تھیں کرکٹ کھیلتے ہوئے ۔ سوئمنگ پول میں بال بکھرائے ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی کہانیوں کے ہیرو کی طرح قصرِ الحمرا کے جھروکوں میں اور مسجدِ قرطبہ کے صحن میں ۔

ماضی میں تانک جھانک ختم ہوئی تو ادب کی بات چھڑ گئی ۔

مجھے اردو ادب میں اخلاق کی "گڈریا" اور آپ کی مسجد قرطبہ والی تحریر "ہجوم تخیل" بے حد پسند ہے ۔ میرے کان سرخ ہوگئے ۔ آخر مزاح نگار ہیں ۔ ساتھ والے کمرے کے کھلے دروازے میں سے سانتانہ یا سرپرز قسم کی موسیقی دھمادھم بر آمد ہورہی تھی ۔ انھوں نے اٹھ کر دروازہ بند کردیا ۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ ہوا سے کھل گیا ۔ ۔ ۔ دھما دھم ۔ ۔ ۔ وہ پھر اٹھے اور دروازہ بند کردیا ۔

تیسری مرتبہ ان کا خوب رو بیٹا باہر آگیا ۔

"کیا بات ہے ابو ؟ "

" بیٹے موسیقی ۔ ۔ ۔ "

بیٹے نے پوری بات سنے بغیر اندر جا کر جلد سے ٹیپ بند کردیا ۔

شفیق صاحب پھر اٹھے " بیٹا موسیقی ضرور بجاؤ ۔ ۔ ۔ ٹیپ آن کردو فوراً ۔ ۔ ۔ صرف دروازہ بند رکھو ۔ شاباش ۔ " ان کے لہجے میں دوستی اور اپنائیت تھی ؛ ان کی اپنی تحریروں کے بزرگوں سے بالکل جدا جو بات بے بات پر نئی نسل کو کوستے ہیں اور یوں ان کی قدرتی نشوونما میں حائل ہوتے ہیں ۔

باہر شام ہورہی تھی ۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی ۔ لاہور کے لیے آخری گاڑی پندرہ منٹ میں چھوٹتی تھی ۔

وہ مجھے باہر تک چھوڑنے آئے ۔ ۔ ۔ کار گیٹ سے باہر نکلی تو میں نے پیچھے مڑکر دیکھا ۔ ان کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا ۔ ایک چھ فٹ کے لمبے تڑنگے خوب صورت گورے سے لڑکے آپ ہی ہیں ۔

"دنیا کا گوشہ گوشہ نقشے میں موجود ہے ۔ لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ کہیں نہ کہیں ایک ایسا جزیرہ ضرور ہے جس میں انسان نے آج تک قدم نہیں رکھا ۔ اس جزیرے میں ایسے ایسے رنگ ہیں جو انسانی آنکھ نے کبھی نہیں دیکھے ، طرح طرح کے خوش نما پرندے ہیں جن کے چہچوں میں ایسی موسیقی ہے جس سے انسان ناآشنا ہے ؛ اس کا کونہ کونہ پر اسرار اور مسحور کن ہے ۔ وہ جزیرہ اس سیاح کا منتظر ہے جو کسی دن کشتی لے کر چپکے سے آجائے گا ۔ "

شفیق الرحمن اس منتظر جزیرے میں چپکے سے کشتی لے کر چلا گیا ۔ اور پھر اس نے اپنی تحریروں میں وہ تمام رنگ بکھیر دیے جو انسانی آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھے ۔ کہانیوں کے پس منظر میں خوش نما پرندوں کے چہچہانے کی موسیقی ابلتی ہے اور وہ اس جزیرے کے تمام اسرار ، سارے سحربیان کرتا چلاجاتا ہے یہاں تک کہ ہم سب بھی مسحور ہوجاتے ہیں ۔

OO OOO OO

۴۴-۴۳

زنانہ اردو خط و کتابت

شوہر کو

سرتاج من سلامت!

کورنشات بجالاکر عرض کرتی ہوں کہ منی آرڈر ملا۔ یہ پڑھ کر طبیعت اچھی نہیں ہے، از حد تشویش ہے۔ لکھنے کی بات تو نہیں ہے مگر مجھے بھی تقریباً دو ماہ سے ہر رات بد خوابی ہوتی ہے۔ آپ کے متعلق برے برے خواب نظر آتے ہیں۔ خدا خیر کرے۔ صبح کو صدقے کی قربانی دے دی جاتی ہے، اس پر کافی خرچ ہو رہا ہے۔

آپ نے پوچھا ہے کہ میں رات کو کیا کھاتی ہوں۔ بھلا اس کا تعلق خواب سے کیا ہو سکتا ہے۔ وہی معمولی کھانا۔ البتہ سوتے وقت ایک سیر کڑھا ہوا دودھ کچھ میوہ اور آپ کا ارسال کردہ سوہن حلوہ۔ حلوہ اگر زیادہ دیر رکھا رہا تو خراب ہو جائے گا۔

سب سے پہلے آپ کے بتائے ہوئے ضروری کام کے متعلق لکھ دوں کہ کہیں باتوں میں یاد نہ رہے۔ آپ نے تاکید فرمائی ہے کہ میں فوراً بیگم فرید سے مل کر مکان کی خرید کے سلسلے میں ان کا آخری جواب آپ کو لکھ دوں۔ کل ان سے ملی تھی۔ شام کو تیار ہوئی تو ڈرائیور غائب تھا۔ یہ غفور دن بہ دن سست ہوتا جارہا ہے۔ عمر کے ساتھ اس کی بینائی بھی کم زور ہونے لگی ہے۔ اس مرتبہ آتے وقت اس کے لیے اچھی سی عینک لیتے آئیں۔۔۔۔ گھنٹوں کے بعد آیا تو بہانے تراشنے لگا کہ تین دن سے کار مرمت کے لیے گئی ہوئی ہے چاروں ٹائر بے کار ہو چکے ہیں، ٹیوب پہلے سے چھلنی ہیں۔ یہ کار بھی جواب دیتی جارہی ہے آپ کے آنے پر نئی کار لیں گے۔ اگر آپ کو ضرورت ہو تو اس کار کو منگالیں۔ خیر تانگا منگایا۔ راستے میں ایک جلوس ملا۔ بڑا غل غپاڑہ مچا ہوا تھا۔ ایک گھنٹہ ٹریفک بند رہا۔ معلوم ہوا کہ خان بہادر رحیم خاں کے صاحب زادے کی برات جارہی ہے۔ برات نہایت شان دار تھی۔ تین آدمی اور دو گھوڑے زخمی ہوئے۔

راستے میں زینب بوا مل گئیں۔ یہ ہماری دور کی رشتہ دار ہوتی ہیں۔ احمد چچا کی سسرال میں جو ٹھیکے دار صاحب ہیں نا ان کی سوتیلی اماں کی سگی بھتیجی ہیں۔ آپ ہمیشہ زینب بوا اور رحمت بوا کو ملا دیتے ہیں۔ رحمت بوا میری ننھیال سے ہیں۔ ماموں عابد کے ہم زلف کے تائے کی نواسی ہیں۔ رحمت بوا بھی ملی تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ کبھی باجی قدسیہ کو ساتھ لاکر ہمارے ہاں چند مہینے رہ جائیں۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے۔ باجی قدسیہ بھی اپنے عزیزوں میں سے ہیں۔ یہ وہی ہیں جو تایا نعیم کے ساتھ ہماری شادی پر آئی تھیں۔ تایا نعیم کی ساس ان کی دادی کی منھ بولی بہن تھیں بلکہ ایک دوسرے سے ڈوپٹہ بدل چکی تھیں۔ یہ سب اس لیے لکھ رہی ہوں کہ آپ کو اپنے عزیز و

اقارب یاد نہیں رہتے۔ کیا عرض کروں آج کل کا زمانہ ایسا آگیا ہے کہ رشتے دار کو رشتے دار کی خبر نہیں۔ میں نے زینب بوا کو گھر آنے کے لیے کہا، وہ اسی شام آگئیں۔ میں نے خاطر کی۔ خواہش ظاہر کرنے پر آپ کے ارسال شدہ روپوں میں سے دو سو انھیں ادھار دے دیے۔

ہاں تو میں بیگم فرید کے ہاں پہنچی۔ بڑے تپاک سے ملیں، بہت بدل چکی ہیں۔ جوانی میں مسز فرید کہلاتی تھیں، اب تو بالکل رہ گئی ہیں۔ ایک تو بے چاری پہلے ہی اکہرے بدن کی ہیں اس پر طرح طرح کے فکر، گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتی ہیں۔ کہنے لگیں اگلے ہفتے برخوردار نعیم کا عقیقہ ہے، اس سے اگلی جمعرات کو نور چشمی بتول سلمہا کی رخصتی ہوگی ضرور آنا۔

میں نے حاجی بھرلی اور مکان کے متعلق ان سے آخری جواب مانگا۔ پہلے کی طرح چٹاخ پٹاخ باتیں نہیں کرتیں، آواز میں بھی وہ کرارا پن نہیں رہا۔ انھیں تو یہ بتول لے کر بیٹھ گئی۔ عمر کا بھی تقاضا ہے۔ سوچ رہی ہوں کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ دو ڈھائی سو روپے خرچ ہو جائیں گے، نیا جوڑا سلوانا ہوگا۔ ویسے تو ان سردیوں کے لیے سارے کپڑے نئے بنوانے پڑیں گے۔ پچھلے سال کے کپڑے اتنے تنگ ہو چکے ہیں کہ بالکل نہیں آتے۔ آپ بار بار سیر اور ورزش کو کہتے ہیں۔ بھلا اس عمر میں مستانوں کی طرح سیر کرتی ہوئی اچھی لگوں گی۔ ورزش سے مجھے نفرت ہے، خواہ مخواہ جسم کو تھکانا اور پھر پسینہ۔ نہ آج تک کی ہے نہ خدا کرائے۔ کبھی کبھی کار میں زنانہ کلب چلی جاتی ہوں وہاں ہم سب بیٹھ کر نٹنگ کرتی ہیں، واپس آتے آتے اس قدر تکان ہو جاتی ہے کہ بس۔

آپ ہنسا کرتے ہیں کہ نٹنگ کرتے وقت عورتیں باتیں کیوں کرتی ہیں۔ اس لیے کہ کسی کام میں لگی رہیں۔

آپ نے جگہ جگہ خط میں شاعری کی ہے اور الٹی سیدھی باتیں لکھی ہیں۔ ذرا سوچ تو لیا ہوتا کہ بچوں والے گھر میں خط جا رہا ہے۔ اب ہمارے وہ دن نہیں رہے کہ عشق وشق کی باتیں ایک دوسرے کو لکھیں۔ شادی کو پانچ برس گزر چکے ہیں خدارا ایسی باتیں آئندہ مت لکھیے۔ توبہ توبہ اگر کوئی پڑھ لے تو کیا کہے۔

ان دنوں میں فرسٹ ایڈ سیکھنے نہیں جاتی۔ ٹریننگ کے بعد کلاس کا امتحان ہوا تھا۔ آپ سن کر خوش ہوں گے کہ میں پاس ہوگئی۔

پچھلے ہفتے ایک عجیب واقعہ ہوا۔ بنو کے لڑکے کو بخار ہوا۔ یوں تپ رہا تھا کہ چنے رکھو اور بھون لو۔ میں نے تھرمامیٹر لگایا تو نارمل تھا۔ دوبارہ لگایا تو نارمل سے بھی نیچے چلا گیا، پتہ نہیں کیا وجہ تھی۔ پھر گھڑی لے کر نبض گننے لگی۔ دفعتہً یوں محسوس ہوا جیسے لڑکے کا دل ٹھہر گیا ہو کیوں کہ نبض رک گئی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ دراصل گھڑی بند ہوگئی تھی۔ یہ فرسٹ ایڈ بھی یوں ہی ہے خواہ مخواہ وقت ضائع کیا۔

ڈاکٹر میری سٹوپس کی کتاب ارسال ہے، اگر دکان دار واپس لے لے تو لوٹا دیجیے۔ یہ

باتیں بھلا ہم مشرق کے رہنے والوں کے لیے تھوڑا ہی ہیں۔ اس کی جگہ بہشتی زیور کی ساری جلدیں بھجوا دیجیے۔ ایک کتاب "گھر کا حکیم" بڑی تعریف سنی ہے یہ بھی بھجوا دیجیے۔

چند نئی فلمیں دیکھیں کافی پسند آئیں۔ ہیرو کا انتخاب بہت موزوں تھا۔ موٹا تازہ، لمبے لمبے بال، کھوئی کھوئی نگاہیں، کھلے گلے کا کرتہ، گانے کا شوق، کسی کام کی بھی جلدی نہیں، فرصت ہی فرصت۔ آپ بہت یاد آئے۔ شادی سے پہلے میں آپ کو اسی روپ میں دیکھا کرتی تھی۔ کاش کہ آپ کے بھی لمبے لمبے بال ہوتے، ہر وقت کھوئی ہوئی نگاہوں سے خلا میں تکتے رہتے، کھلے گلے کا کرتہ پہن کر گلشن میں گایا کرتے۔ نہ یہ کم بخت دفتر کا کام ہوتا اور نہ ہر وقت کی مصروفیت لیکن خواب کب پورے ہوئے ہیں۔

ان فلموں میں ایک بات کھٹکتی ہے، ان میں عورتوں کی قوالی نہیں ہے۔ فلم بناتے وقت نہ جانے ایسی اہم چیز کو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ گیت بے حد معمولی ہیں۔ مثلاً ایک گانا بھی ایسا نہیں ہے جس میں راجہ جی، مورے راجہ یا ہو راجہ آتا ہو۔ سادہ الفاظ گیت میں جان ڈال دیتے ہیں۔

ایک بہت ضروری بات آپ سے پوچھنا تھی۔ زینب بوا نے شبہہ سا ڈال دیا ہے کہ آپ کے لفافوں پر پتہ زنانہ تحریر میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کے دفتر میں کوئی سکریٹری یا سٹینو وغیرہ آگئی ہو اور آپ مصروفیت کی بنا پر پتہ اس سے لکھواتے ہوں۔ یہ لڑکی کس عمر کی ہے؟ شکل وصورت کیسی ہے؟ غالباً کنواری ہوگی۔ اس کے متعلق مفصل طور پر لکھیے، اگر ہو سکے تو اس کی تصویر بھیجیے۔

باقی سب خیریت ہے اور کیا لکھوں، بس بچے ہر وقت آپ کو یاد کرتے ہیں۔ اصغر روز پوچھتا ہے کہ ابا میری سائیکل کب بھیجیں گے۔ آپ نے آنے کے متعلق نہیں لکھا۔ اب تو ننھی کی بسم اللہ بھی قریب آچکی ہے۔ میری مانیے تو واپس یہیں تبادلہ کرا لیجیے۔ بھاڑ میں جائے یہ ترقی اور ایسا مستقبل۔ تھوڑی سی اور ترقی دے کر محکمے والے آپ کو اور دور نہ بھیج دیں۔

آپ بہت یاد آتے ہیں۔ ننھے کی جرابیں پھٹ چکی ہیں، ننھی کے پاس ایک بھی نیا فراک نہیں رہا۔ برا ہو پردیس کا، صورت دیکھنے کو ترس گئے ہیں۔ امی جان کی اونی چادر اور کمبلوں کا انتظار ہے۔

ہر وقت آپ کا انتظار ہے، آنکھیں دروازے پر لگی رہتی ہیں۔ صحن کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑ رہا ہے۔ مالی کام نہیں کرتا۔ اس کی لڑکی اپنے خاوند کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

آتے وقت چند چیزیں ساتھ لائیں۔ بچوں کے جوتے اور گرم کوٹ، ننھے کی جرابیں اور کنٹوپ، ننھی کا فراک، دو چمڑے کے صندوق۔ زینب بوا کے لیے اچھا سا تحفہ، بلی کے گلے میں باندھنے کے لیے ربن اور کتے کا خوب صورت سا کالر، کچھ سوہن حلوہ اور ننھی کا سویٹر۔ ننھی کے

کان میں پھنسی تھی۔ چچا جان سول سرجن بلانے کو کہتے تھے میں نے منع کر دیا۔ کیوں کہ کل تعویذ آجائے گا۔

یہاں کی تازہ خبریں یہ ہیں کہ پھوپی جان کی بھینس اللہ کو پیاری ہوئی۔ سب کو بڑا افسوس ہوا۔ اچھی بھلی تھی دیکھتے دیکھتے دم توڑ دیا۔ میں پرسہ دینے گئی تھی۔ تایا عظیم کا لڑکا کہیں بھاگ گیا ہے۔ احمد چچا کا جس بینک میں حساب تھا وہ بینک فیل ہو گیا ہے اور ہاں پھوپا جان کی ساس جو اکثر بہکی بہکی باتیں کیا کرتی تھیں، اب بالکل باؤلی ہو گئی ہیں۔ بقیہ اگلے خط میں لکھوں گی۔

سرتاج من کو کنیز کا آداب۔ فقط

(ایک بات بھول گئی۔ منی آرڈر پر مکان کا نمبر ضرور لکھا کیجیے۔ اس طرح ڈاک جلدی مل جاتی ہے)۔

امی جان کے نام

مری پیاری امی مری جان امی!

بعد ادائے آداب عرض یہ ہے کہ یہاں ہر طرح سے خیریت ہے اور خیر و عافیت آپ کی خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے۔ صورت احوال یہ ہے کہ یہاں سب خیریت سے ہیں۔ والا نامہ آپ کا صادر ہوا، دل کو از حد خوشی حاصل ہوئی۔ چچا جان کے خسر صاحب کے انتقال پر ملال کی خبر سن کر دل کو از حد قلق ہوا۔ جب سے یہ خبر سنی ہے چچی جان دھاروں رو رہی ہیں۔ خلیفہ جی یہ سناؤنی لے کر پہنچے تو کسی سے اتنا نہ ہوا کہ ان کی دعوت ہی کر دیتا۔ میں نے سوچا کہ اگر ذرا سی الکسی ہو گئی تو خاندان بھر میں تھڑی تھڑی ہو جائے گی۔ فوراً خادم کو لے کر باورچی خانے میں پہنچی۔ اس نے جھپاک جھپاک آٹا گوندھا لیکن سالن قدرے تیز آنچ پر پک گئے۔ چناں چہ پھل پھلواری سے خلیفہ جی کی تواضع کی۔ بہت خوش ہوئے۔ تائی صاحبہ نے خوان بھجوا کر حاتم کو شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے روز ناشتے پر بھی بلوایا۔ اوچھے کے ہوئے تیتر باہر باندھوں کہ بھیتر۔ یہ تائی صاحبہ بھی ہمیشہ اس طرح کرتی رہتی ہیں۔ رنگ میں بھنگ ڈال دیتی ہیں۔

الفت بیا آئی تھیں، تائی صاحبہ کا فرمانا ہے کہ یہ بچپن سے بہری ہیں۔ بہری وہری کچھ نہیں فقط وہ سنتی نہیں ہیں۔ کیا مجال جو آگے سے کوئی ایک لفظ بول جائے۔

گو دل نہیں چاہ رہا لیکن آپ کے اشارے کے مطابق ہم سب ممانی جان سے ملنے گئے۔ وہاں پہنچے تو سارا کنبہ کہیں گیا ہوا تھا۔ چناں چہ ہم چڑیا گھر دیکھنے چلے گئے۔ ایک نیا جانور آیا ہے۔ زیبرا کہلاتا ہے بالکل گدھے کا سپورٹس ماڈل معلوم ہوتا ہے۔ اچھا ہی ہوا دیکھ لیا ورنہ ممانی جان کی طعن آمیز گفتگو سننی پڑتی۔

پڑھائی خوب زوروں سے ہو رہی ہے۔ پچھلے ہفتے ہمارے کالج میں مس سید آئی تھیں جنھیں حال ہی میں ولایت سے کئی ڈگریاں ملی ہیں بڑی قابل عورت ہیں۔ انھوں نے مشرقی علوم

اور پردے پر لیکچر دیا۔ ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مس سید نے شنائل کا ہلکا گلابی جوڑا پہن رکھا تھا۔ قمیص پر کلیوں کے سادہ نقش اچھے لگ رہے تھے۔ گلے میں سرخ پھول نہایت خوب صورتی سے ٹانکا گیا تھا۔ شیفون کے آبی دوپٹے کا کام مجھے بڑا پسند آیا۔ بیضوی بوٹے جوڑوں میں کاڑھے ہوئے تھے ہر دوسری قطار کلیوں کی تھی ہر چوتھی قطار میں دو پھول کے بعد ایک کلی کم ہوجاتی تھی۔ دوپٹے کا پلو سادہ تھا لیکن بھلا معلوم ہورہا تھا۔ مس سید نے بھاری سینڈل کی جگہ لفٹی پہن رکھی تھی۔ کانوں میں ایک ایک نگ کے ہلکے پھلکے آویزے تھے۔ تراشیدہ بال بڑی استادی سے پرم کیے ہوئے تھے۔ جب آئیں تو کوئی کی خوش بو سے سب کچھ معطر ہوگیا لیکن مجھے ان کی شکل پسند نہیں آئی۔ ایک آنکھ دوسری سے کچھ چھوٹی ہے۔ مسکراتی ہیں تو دانت بڑے معلوم ہوتے ہیں۔ جتنی بہت ہیں ویسے بھی عمر رسیدہ ہیں۔ ہوں گی ہم لڑکیوں سے کم از کم پانچ سال بڑی۔ ان کا لیکچر نہایت مقبول ہوا۔

آپ یہ سن کر پھولی نہ سمائیں گی کہ آپ کی پیاری بیٹی امور خانہ داری پر کتاب لکھ رہی ہے۔ مجھے بڑا غصہ آتا تھا جب لوگوں کو یہ کہتے سنتی تھی کہ پڑھی لکھی لڑکیاں گھر کا کام کاج نہیں کر سکتیں۔ چناں چہ میں نے یہ آزمودہ ترکیبیں لکھی ہیں جو ملک کے مشہور زنانہ رسالوں میں چھپیں گی۔ نمونے کے طور پر چند ترکیبیں نقل کرتی ہوں۔

لذیذ آرنج سکواش تیار کرنا: آرنج سکواش کی بوتل لو۔ یہ دیکھ لو کہ بوتل آرنج سکواش ہی کی ہے کسی اور چیز کی تو نہیں ورنہ نتائج خاطر خواہ برآمد نہ ہوں گے۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ مہمانوں اور گلاسوں کی تعداد ایک ہونی چاہیے۔ گلاسوں کو پہلے صابن سے دھلوالینا اشد ضروری ہے۔ بعد ازیں سکواش کو بڑی حفاظت سے گلاس میں انڈیلو اور پانی کی موزوں مقدار کا اضافہ کرو۔ مرکب کو چمچے سے تقریباً نصف منٹ ہلاؤ۔ نہایت روح افزا آرنج سکواش تیار ہوگا۔

موسم کے مطابق برف بھی استعمال کیا جاسکتا ہے (لیکن برف کو صابن سے دھلوالینا نہایت ضروری ہے)۔

انڈا ابالنا: یہ عمل اتنا آسان نہیں جتنا کہ لوگ سمجھتے ہیں لیکن اگر مشق ہوجائے تو ذرا مشکل نہیں لگتا۔ ایک انڈا لو (بہتر ہوگا کہ انڈا مرغی کا ہو) پیش تر اس کے کہ عمل شروع کیا جائے یہ معلوم کرلینا ضروری ہے کہ انڈا خراب تو نہیں۔ اس کا سہل اور مجرب طریقہ یہ ہے کہ انڈے کو ایک کونے سے ذرا سا توڑ کر تسلی کرلی جائے۔ اب انڈے کو پانی میں ڈبو کر پانی اور انڈا دیگچی میں ڈالو۔ دیگچی کو چولھے پر رکھ کر گرم کرو اور ذرا ذرا سی دیر کے بعد پانی میں انگلی ڈال کر دیکھتی رہو کہ ابال آنا شروع ہوا ہے یا نہیں۔ شوں شوں کی آواز پر آگ بجھا دو اور ہاتھ یا کسی اور چیز کی مدد سے جلدی سے انڈا دیگچی سے باہر نکال کر ٹھنڈا کرلو۔ اب انڈا بالکل تیار ہے اور کھایا جاسکتا ہے۔

مزے دار فروٹ سلاد تیار کرنا: مہمانوں کے یک لخت آجانے پر ایک ملازم کو جلدی سے بازار بھیج کر کچھ بالائی اور ایک ٹین پھلوں کا منگاؤ۔ اس کے آنے سے قبل ایک بڑی قاب کو صابن سے دھلوالینا چاہیے ورنہ بعض اوقات فروٹ سلاد میں اور طرح کی خوش بو آنے لگتی ہے۔ اب ٹین کھولنے کا اوزار لے کر ٹین کا ڈھکنا کھولنا شروع کرو اور خیال رکھو کہ کہیں انگلی نہ کٹنے پائے۔ بہتر ہوگا کہ ٹین اوزار نوکر کو دے دو۔ اب پھلوں کو ڈبے سے نکال کر حفاظت سے قاب میں ڈالو اور بالائی کی ہلکی ہلکی تہہ جماؤ۔ نہایت مفرح فروٹ سلاد تیار ہے، نوش جان کیجیے۔

میزپوش سینا: جس میز کے لیے پوش درکار ہو اس کا ناپ لو۔ بہتر ہوگا کہ کپڑے کو میز پر پھیلا کر لمبائی کے مطابق وہیں قینچی سے قطع کر لیا جائے۔ اب ہاتھ یا پاؤں سے چلنے والی سینے کی مشین منگاؤ۔ سوئی میں دھاگا پرو کر میزپوش کے ایک کونے سے سلائی شروع کرو اور سیتی چلی جاؤ حتیٰ کہ وہی کونا آجائے جہاں سے بخیہ شروع کیا تھا۔ اب میزپوش کو استعمال کرنے کے لیے۔ اگر سیتے وقت سارے کپڑے کے دو چکر لگ جائیں تو دگنا پائے دار میزپوش تیار ہوگا۔ ضرورت کے مطابق بعد میں کسی سے بیل بوٹے کڑھوائے جاسکتے ہیں۔

استری پھیرنا: (نوٹ: استری بڑا پرانا لفظ ہے۔ سنسکرت میں بار بار استری کا لفظ آتا ہے)

اپنے قد سے تقریباً دو فٹ نیچی میز منگاؤ، استری میں دہکتے ہوئے کوئلے ڈالو اور ہاتھ پھیر کر دیکھتی رہو کہ گرم ہو گئی ہے یا نہیں۔ جب ہاتھ پھیرنا مشکل ہو جائے تو سمجھ لو کہ استری تیار ہے اور پھیری جاسکتی ہے۔ اب استری کو کپڑے پر پھیرو۔ کپڑے کی تہہ درست کرنا نہ بھولنا چاہیے ساتھ ساتھ پانی کے چھینٹے دیتی جاؤ (کپڑے پر) جب کپڑا بھورا ہونا شروع ہو جائے تو سمجھ لو کہ مکمل استری ہو گئی۔ دوسرا کپڑا پہلے استری شدہ کپڑے پر پھیلا کر یہ عمل دہرایا جاسکتا ہے۔ جب ایک جانی پہچانی بھینی بھینی خوش بو کمرے میں پھیلنے لگے تو استری کرنا ایک لخت بند کر دو۔

کپڑے ڈرائی کلین کرنا: مناسب کپڑے چن کر ایک سمجھ دار ملازم کے ہاتھ ڈرائی کلین کی دکان پر بھجوادو۔ بھیجنے سے پہلے ایک فہرست ضرور تیار کر لو۔ بہتر ہوگا کہ صرف وہی کپڑے بھیجو جنھیں بعد میں پہچان سکو۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کپڑے واقعی ڈرائی کلین کیے گئے ہیں ایک بڑی آزمودہ ترکیب ہے۔ کپڑوں کو سونگھ کر دیکھو اگر پٹرول کی بو آرہی ہو تو سمجھ لو کہ ٹھیک ہے۔ اب کپڑے ڈرائی کلین ہو چکے ہیں اور انھیں فوراً استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔

سچ بتانا اچھی امی جان! آپ کو یہ ترکیبیں پسند آئیں؟ ایسے اور بہت سے نسخے بھی میرے پاس محفوظ ہیں جنھیں اگلے خط میں بھیجوں گی۔

میں علی الصبح اٹھتی ہوں۔ آپ کا ارسال شدہ ٹائم پیس اتنے زور سے بجتا ہے کہ رات کو اسے رضائی میں لپیٹ کر ایک کونے میں رکھنا پڑتا ہے۔ عید پر جو خالہ جان نے مٹاپے کا طعنہ دیا تھا، اس کے لیے بڑی کوشش کر رہی ہوں۔ فالتو چیزوں کا استعمال آہستہ آہستہ بند کر رہی ہوں۔

نشاستے سے پرہیز کرتی ہوں۔ کپڑوں تک میں سٹارچ نہیں لگنے دیتی۔

ایک خوش خبری دینا تو بھول ہی گئی۔ آپ کی پیاری بیٹی اس سال فارسی میں کالج میں دوئم آئی ہے، یہ سب آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے ورنہ لونڈی کس لائق ہے۔ یہ آپ سے کس نے کہا کہ میں کلاس میں دیر سے پہنچی تھی۔ پہلا گھنٹہ فارسی کا ہوتا تھا اور فارسی میں صرف دو لڑکیاں تھیں، نجمہ اور میں۔ شاید یہ اطلاع میری سہیلیوں میں سے نہیں بلکہ رشتہ داروں میں سے کسی نے پہنچائی ہوگی۔

اب خط ختم کرتی ہوں۔ میری طرف سے بزرگوں کی خدمت میں آداب، بچوں کو بہت بہت پیار، ہم عمروں کو سلام علیک۔

دیکھیے وہ کون سا مبارک دن ہوتا ہے کہ میں اپنی امی کو جھک کر آداب کروں اور امی جان مجھے کلیجے سے لگالیں اور سدا لگائے رکھیں۔ آمین ثم آمین۔ فقط

ناچیز، آپ کی بیٹی

منگیتر کو

جناب بھائی صاحب!

آپ کا خط ملا۔ میں آپ کو ہرگز خط نہ لکھتی لیکن پھر خیال آیا کہ آپ کی بہن میری سہیلی ہیں اور کہیں وہ برا نہ مان جائیں۔ وہم و گمان میں بھی نہ آسکتا تھا کہ کبھی ایک غیر مرد کو خط بھیجوں گی۔

امید کرتی ہوں کہ آئندہ خط لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھیں گے کہ آپ ایک شریف گھرانے کی ایشیائی لڑکی سے مخاطب ہیں۔۔۔۔ احتیاطاً تحریر ہے، میرا آپ کو خط لکھنا اس امر کا شاہد ہے کہ ہم لوگ کس قدر وسیع خیالات کے ہیں۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ رشیدہ اور حمیدہ کو جانتے ہیں، کلثوم اور رفعت سے بھی واقفیت رہ چکی ہے، ثریا اور اختر کو خط لکھا کرتے تھے، آپ کو کلب میں ناچتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے اور ایک شام کو آپ چمکیلی سی پیلے رنگ کی چیز چھوٹے سے گلاس میں پی رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم ماڈرن نہیں ہیں۔ ہمیں یہ ہوا نہیں لگی نہ اس روش پر چلنے کا ارادہ ہے۔ ہمارے ہاں جہاں مذہب، شرافت اور خاندانی روایات کا خیال ملحوظ ہے وہاں اعلیٰ تربیت اور بلند خیالی بھی ہے۔

میں بی۔ اے (آنرز) میں پڑھتی ہوں شام کو مولوی صاحب بھی پڑھانے آتے ہیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ آپ نے مجھے تانگے میں کالج سے نکلتے دیکھا تھا اور میں نے برقعے کا نقاب الٹ رکھا تھا۔ آپ نے کسی اور کو دیکھ لیا ہوگا۔ اول تو میں ہمیشہ کالج کار میں جاتی ہوں دوسرے یہ کہ میں نقاب نہیں الٹا کرتی۔ ہمیشہ برقعہ میری بانہہ میں کتابوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

جی ہاں مجھے ٹھوس مطالعے کا شوق ہے۔ ابا جان کی لائبریری میں فرائیڈ، مارکس، ایڈگر

ویلیس، ڈکنز، آگاتھا کرسٹی، کارلائل، پیٹر چینی، تھورن سمتھ اور دیگر مشہور مفکروں کی کتابیں موجود ہیں۔ میں نے سائیکالوجی پڑھنی شروع کی تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سب تو مجھے پہلے سے معلوم ہے۔ فلاسفی پڑھی تو محسوس ہوا جیسے یہ سب درست ہے۔ سوشل سائنس پڑھی تو لگا کہ واقعی یوں ہی ہونا چاہیے تھا۔ آخر ہمیں ایک نہ ایک روز تو جدید تہذیب کے دائرے میں آنا تھا۔ زمانے کو بیسویں صدی تک بھی تو پہنچنا ہی تھا۔ میرے خیال میں کافی مطالعہ کر چکی ہوں چناں چہ آج کل زیادہ نہیں پڑھتی۔

آپ نے پوچھا تھا کہ موجودہ ادیبوں میں مجھے کون کون پسند ہیں۔ سو ڈپٹی نذیر احمد، مولانا راشد الخیری اور پنڈت رتن ناتھ سرشار میرے محبوب مصنفین ہیں۔ شاعروں میں نظیر اکبر آبادی مرغوب ہیں۔ خواتین میں ایک صاحبہ بہت پسند ہیں۔ انھوں نے صرف دو ناول لکھے ہیں۔ ان میں جدید اور قدیم زیورات و پارچہ جات، بیاہ شادی کی ساری رسوم اور طرح طرح کے کھانوں کے ذکر کو خوب صورتی سے سمو دیا ہے کہ یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ ناول کہاں ہے اور یہ چیزیں کہاں؟

ایک اور خاتون ہیں جو باوجود ماڈرن ہونے کے ترقی پسند نہیں ہیں۔ ان کے افسانے، ان کی امنگیں، ان کی دنیا سب کچھ صرف اپنے گھر کی فضا اور اپنے خاوند تک محدود ہے۔ مبارک ہیں ایسی ہستیاں، ان کی تصویریں دیکھ دیکھ کر ان سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ پھر پتہ چلا کہ ان کا رنگ مشکی ہے اور عینک لگاتی ہیں۔

آپ کی جن کزن کا کہنا ہے کہ انھوں نے مجھے کلب میں دیکھا تھا۔ ذرا ان سے پوچھیے کہ وہ خود وہاں کیا کر رہی تھیں۔

یہ جن حمید صاحب کا آپ نے ذکر کیا ہے وہی تو نہیں جو گورے سے ہیں جن کے بال گھنگھریالے ہیں اور داہنے ابرو پر چھوٹا سا تل ہے۔ گاتے اچھا ہیں روٹھتے بہت جلد ہیں۔ جی نہیں، میں انھیں نہیں جانتی نہ کبھی ان سے ملی ہوں۔

میری حقیر رائے میں تو آپ نے آرٹس پڑھ کر بڑا وقت ضائع کیا ہے۔ آپ کی بہن نے لکھا ہے کہ اب آپ کا ارادہ بزنس کرنے کا ہے۔ اگر یہی ارادہ تھا تو پھر پڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔ عمر میں گنجائش ہو تو ضرور کسی مقابلے کے امتحان میں بیٹھ جائیے اور ملازمت کی کوشش کیجیے۔ کیوں کہ ملازمت ہر صورت میں بہتر ہے، اس کے بغیر نہ پوزیشن ہے نہ مستقبل۔ یہاں ڈپٹی کمشنر صاحب کی بیوی ساری زنانہ انجمنوں کی سکریٹری ہیں اور تقریباً ہر زنانے جلسے کی صدارت وہی کرتی ہیں۔ دوسرا فائدہ ملازمت کا یہ ہے کہ انگلستان یا امریکہ جانے کے بڑے موقع ملتے ہیں۔ مجھے یہ دونوں ملک دیکھنے کا ازحد شوق ہے۔

آپ نے موسیقی کا ذکر کیا ہے اور مختلف راگ راگنیوں کے متعلق میری رائے پوچھی

ہے۔ جی ہاں مجھے بھی تھوڑا بہت شوق ہے۔ جے جے و نتی سے آپ کو زیادہ دل چسپی نہیں ۔۔۔۔ آپ کو تعجب ہو گا کہ جب دلی سے بھنڈہ آتے وقت میں نے جے جے و نتی ریلوے اسٹیشن دیکھا تو مجھے بھی پسند نہیں آیا۔ میاں کی ملہار سے آپ کی مراد غالباً خاوند کی ملہار ہے۔ جی نہیں میں نے یہ نہیں سنی۔ ویسے ایک خاندان کے افراد بھی میاں کہلاتے ہیں، شاید یہ ملہار ان کی ہو۔ آپ کا فرمانا ہے کہ ٹوڈی صبح کی چیز ہے لیکن میں نے لوگوں کو صبح و شام ہر وقت ٹوڈی بچہ ہائے ہائے کے نعرے لگاتے سنا ہے۔

بھوپالی کے متعلق میں زیادہ عرض نہیں کر سکتی کیوں کہ مجھے بھوپال جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ البتہ جوگ اور بہاگ کے بارے میں اتنا جانتی ہوں کہ جب یہ ملتے ہیں تو سوزِ عشق جاگ اٹھتا ہے (ملاحظہ ہو: "جاگ سوزِ عشق جاگ")

جی ہاں مجھے فنونِ لطیفہ سے بھی دل چسپی ہے۔ مصوری، بت تراشی، موسیقی، فوٹو گرافی اور کروشیے کی بہت سی کتابیں اباجان کی لائبریری میں رکھی ہیں۔ میں اچھی فلمیں کبھی نہیں چھوڑتی۔ ریڈیو پر ایک اچھا موسیقی کا پروگرام ہو تو ضرور سنتی ہوں۔ خصوصاً دوپہر کے کھانے پر۔ سیاست پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے، اس کے متعلق اپنی رائے اگلے خط میں لکھوں گی۔

آپ کو میری سہیلی کے بھائی نے میرے متعلق باتیں بتائی ہیں۔ ہاں یہ درست ہے کہ اسحاق بھائی ہمارے ہاں آتے ہیں لیکن بس پندرہ بیس منٹ کے لیے۔ اشفاق بھائی اور انور بھائی ہمارے ساتھ پہاڑ پر ضرور گئے تھے لیکن ان کی کوٹھی ہم سے ایک میل دور تھی، پہاڑ کے دوسری طرف۔ لطیف بھائی اور کلیم بھائی فقط اپنی بہنوں کو چھوڑنے آتے ہیں۔ یہ غلط ہے کہ میں نے عفت کے بھائی کے ساتھ سفر کیا تھا۔ رحیم بھائی یوں ہی اسٹیشن پر مل گئے تھے۔ میں چھٹیوں میں گھر آرہی تھی، انھیں کوئی کام تھا وہ اپنے ڈبے میں بیٹھے رہے میں اپنے ڈبے میں۔ آپ جمیل بھائی اور مسعود بھائی سے پوچھ سکتے ہیں۔

آپ کی بہن مجھ سے خفا ہیں اور خط نہیں لکھتیں۔ شکایت تو الٹی مجھے ان سے ہونی چاہیے۔ انھوں نے رتی کو وہ بات بتادی جو میں نے انھیں بتائی تھی کہ اسے نہ بتانا۔ خیر بتانے میں اتنا حرج نہ تھا لیکن میں نے ان سے تاکیداً کہا تھا کہ اس سے یہ نہ کہنا کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ اس سے نہ کہنا۔

پتہ نہیں یہ کزن والی کون سی بات ہے جس پر انھوں نے مجھ سے قسم لی تھی کہ رتی تک نہ پہنچے۔ مجھے تو یاد نہیں۔ ویسے میری عادت نہیں کہ دانستہ طور پر کوئی بات کسی کو بتاؤں۔ اگر بھولے سے منھ سے نکل جائے تو اور بات ہے۔

خط گھر کی بجائے کالج کے پتے پر بھیجا کیجیے اور اپنے نام کی جگہ کوئی فرضی زنانہ نام لکھا کیجیے، یوں معلوم ہو جیسے کوئی سہیلی مجھے خط لکھ رہی ہے۔

باقی سب خیریت ہے۔ فقط

آپ کی بہن کی سہیلی

(اور اس خط کا کسی سے بھی ذکر مت کیجیے، تاکیداً عرض ہے)

سہیلی کو

پیاری سہیلی انہیلی!

اوئی دل پتھر کر لیا ہے۔ ایسا بھی کیا کبھی خیر سلا کے دو لفظ ہی بھیج دیا کرو۔ وہی معاملہ ہوا کہ آنکھیں ہوئیں اوٹ تو دل میں آیا کھوٹ۔

شاید تمھیں پتہ نہیں کہ میں پہاڑ پر گئی ہوئی تھی۔ بوا میرا تو وہاں بالکل دل نہیں لگا۔ لوگ قدرتی نظارے قدرتی نظارے کی رٹ لگاتے ہیں۔ میرا تو جی ہفتے میں اچاٹ ہو گیا۔ نہ کوئی ڈھنگ کا سینما ہال، نہ اللہ ماری کوئی کام کی کپڑوں یا زیوروں کی دکان۔ دو مہینے میں صرف آٹھ جوڑے سلوا سکی اور صرف ایک جوڑی سونے کے آویزے پسند آئے۔ اس آنے جانے میں نگوڑا نیا گرم کوٹ بھی نہ سل سکا۔ اب سردیوں میں وہی پچھلے سال بنوایا ہوا کوٹ پہننا پڑے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ ساری گرمیوں میں ایک بھی نئے ڈیزائن کا جوڑا نہیں سلوا سکی۔ کسی نئی فلم میں ہیروئن کے کپڑے دیکھوں تو کچھ بنواؤں بھی۔

ایک بات بتاتی ہوں مگر وعدہ کرو کہ کسی سے نہیں کہوگی کیوں کہ نکلی ہونٹوں چڑھی کوٹھوں۔ وہ جو رشید ہے نا۔ اب تم مجھے چھیڑوگی، اے ہٹو۔ پہلے سن بھی لو، اس کے چچا کالج میں پروفیسر بن کر آئے ہیں۔ ہوں گے کوئی پینتالیس چھیالیس برس کے۔ میں اگلی سیٹ پر بیٹھتی ہوں چناں چہ حضرت کو غلط فہمی ہو گئی حالاں کہ میں نے اتی سی بھی لفٹ نہیں دی۔ سوائے اس کے کہ میں غور سے ان کی آنکھوں کو دیکھا کرتی تھی (آنکھیں اچھی ہیں) پروفیسروں کو کون غور سے نہیں دیکھتا۔ کبھی کبھار ان سے علاحدگی میں سوال پوچھ لیے تو کیا ہوا۔ کل تین یا چار مرتبہ ان کے ساتھ چائے پی، وہ بھی ان کے بلانے پر۔ عید پر انھوں نے چھوٹے موٹے تحفے دیے جو ان کا دل رکھنے کے لیے قبول کرنے پڑے۔ صرف ایک دو دفعہ ان کے ساتھ پکچر دیکھی۔ بس پھر کیا تھا شاعری پر اتر آئے۔ کہنے لگے تم اب تک کہاں تھیں۔ میری زندگی میں پہلے کیوں نہ آئیں۔ حالاں کہ ان کی زندگی کے شروع کے حصے میں تو میں پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ شکل و صورت معمولی ہے۔ گنجے بھی ہیں۔ سنا ہے کئیوں سے وعدہ خلافی کر چکے ہیں۔ پانچ چھ سال کے بعد بڑے بوڑھوں میں کہلائیں گے۔ تعجب ہے کہ اس عمر میں بھلا کوئی وعدہ کر سکتا ہے۔

ناہید نے تو سب کے سامنے ان کی خبر لی۔ انھیں جھوٹا، ہٹ دھرم، مکار اور نہ جانے کیا کیا کہا۔ ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ خیر سے باکی فٹ بال کے ریفری بھی ہیں اور اس قسم کے کلمات کے عادی ہو چکے ہیں۔ دراصل ناہید بندی نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ، کھٹ سے شادی

کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بالکل بلا سوچے سمجھے جیسے کہ بعض لڑکیاں اکثر کرتی ہیں۔

ایک شام کو ان کے مجبور کرنے پر ان کے ساتھ سینما گئی۔ وہاں رشید اگلے درجے میں بیٹھا ہوا تھا۔ نہ جانے چچا کو کیا سوجھی کہ بھتیجے کو بلا کر پاس بٹھا لیا اور مجھ سے اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ رشید کو خواہ مخواہ آگ لگ گئی۔ رشید کے چچا کی اس حرکت پر مجھے سخت غصہ آیا۔ انھوں نے نہ صرف میرا مستقبل کا پروگرام تباہ کر دیا بلکہ ایسی اچھی شام تباہ کر کے رکھ دی۔ آج کل رشید کی مجھ سے لڑائی ہے کل میں نے فون کیا تو طعنے دینے لگا۔ بولا تم بے حد خطرناک ہو۔ عجیب الٹی منطق ہے حقیقت یہ ہے کہ کوئی عورت بھی خطرناک نہیں ہوتی یہ مرد ہی ہے جو کم زور ہوتا ہے۔ دونوں جائیں بھاڑ میں۔ سنا ہے رشید زیبو کے پیچھے لگا ہوا ہے اور اس کا چچا سلی کے پیچھے۔

زیبو تو تمھاری ہم جماعت تھی، بے چاری بڑی بنتی ہے۔ میں تو اسے کب سے جانتی ہوں جب اس کے متعلق کوئی چھوٹی سی افواہ تک نہیں اڑتی تھی۔ پتہ نہیں کس بات پر اتراتی ہے اجڑا اجڑا حلیہ، دبلی پتلی اتنی کہ اچھی طرح دیکھنے کے لیے دو بار دیکھنا پڑتا ہے۔ پچھلے سال کسی سیکنڈ لفٹننٹ سے واقفیت تھی اس سال بھی سنا ہے کہ کسی اور سیکنڈ لفٹننٹ کے ساتھ سیکنڈل رہا۔ بار بار اسے سیکنڈ لفٹننٹ ہی ملتا ہے۔ پہلا لفٹننٹ بھاگ جاتا ہوگا۔ کیا بتاؤں ان دنوں اتی بدل چکی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی۔ پچھلے ہفتے ایک پارٹی پر ملاقات ہوئی۔ میں نے نئے بندے اور نیا ہار پہن رکھا تھا۔ پھوٹے منھ سے ان کے بارے میں ایک لفظ نہ نکلا، حالاں کہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ ادھر میں کئی مرتبہ جھوٹ موٹ اس کی چیزوں کی تعریف کر چکی ہوں، ملمع کی ہوئی چوڑیوں کو بار بار سراہتی تھی۔ ایسی اکل کھری ندیدی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ سنا ہے رشید اسے خوابوں کی ملکہ کہتا ہے۔ ضرور خوابوں میں ڈرتا ہوگا۔

سلی غریب بائیس برس کی ہو چکی ہے اور اب تک کوئی نہیں ملا۔ میں نے تو کئی مرتبہ کہا کہ گزٹ پڑھا کرو۔ آج کل ترقی ملنے پر ادھیڑ عمر کے لوگ اکثر نئی شادی کر بیٹھتے ہیں، ایسے کئی مل جائیں گے۔

سنا ہے کہ اس کے لیے سچ مچ ایک رشتہ آیا تھا کسی بڑے زمین دار کا جس کے پاس دو درجن گائیں، بھینسیں تھیں اور جو وِسکی میں دودھ ملا کر پیا کرتا تھا۔ پھر جہیز کے معاملے میں کچھ گڑبڑ ہو گئی۔

ان صاحب زادی کو بھی پر لگ رہے ہیں، کیا تو جیسے زبان تھی ہی نہیں کیا اب کتر کتر چلتی ہے۔ فرماتی ہیں میں تو سرخی اس لیے لگاتی ہوں کہ اور لڑکیوں میں نمایاں نہ معلوم ہوں۔ ایک اور فقرہ ملاحظہ ہو کہتی ہیں ۔۔۔۔ مواد دل کیا ہے برف کا تودا ہے، اتنی جلدی پگھل جاتا ہے۔ یہ سب رشید کے چچا کا اثر ہے۔ مجھے ان پروفیسر صاحب پر غصہ ہے تو اس بات کا کہ ساری خرافات مجھ ہی کو سناتے رہے، ابا جان سے کچھ بھی نہیں کہا، جیسے کہ خاندانی لوگوں میں دستور ہے۔ گنجے

ہیں تو کیا ہوا، مرد اکثر گنجے ہو جاتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کی عمر زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر آنکھوں کی طرف دیکھتے رہو تو صرف چالیس برس کے لگتے ہیں، خیر دفع کرو ان سب کو۔

بلو کی منگنی ہونے والی ہے۔ میں نے چھیڑا کہ بلو کا منگیتر پبلشر ہے اس لیے انگوٹھی پر جملہ حقوق محفوظ ہیں، ضرور لکھوائیں۔

عفو کی بات پکی ہو گئی ہے، نہیں اس کے منگیتر کو نہیں دیکھا لیکن سنو گی تو خوش ہو گی کہ چھ سو روپے ماہوار پاتا ہے۔ اکلوتا ہے بہن بھائی کے قضیے سے پاک ہے۔ عفو کے والدین نے اچھی طرح یقین کرالیا ہے کہ شراب نہیں پیتا اور کیا چاہیے اور ہاں لڑکے کی والدہ حج کرنے جارہی ہیں۔ عفو نے تو یہاں تک سنا ہے کہ ان کا ارادہ حج کے بعد وہیں رہ جانے کا ہے۔ خدا کرے یہ خبر سچ ہو۔

اچھا بہن تم اپنی سناؤ کیا کیا مصروفیتیں ہیں۔ تمھاری خاموشی سے دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔ دور ہو تو کیا، تل تل رتی رتی سب جانتی ہوں۔ اللہ وہ دن لائے کہ اپنی پیاری سہیلی کے ہاتھ رنگے ہوئے دیکھوں۔ خدا سہیلی دے تو ایسی جس کی دسوں انگلیاں دسوں چراغ۔

حمو تمھیں یاد ہوگی۔ اس کی شادی پر ہم سب گئے تھے۔ سنا ہے لڑکے نے اعتراض کیا کہ نہ تو رسوم ادا کی جائیں اور نہ باجا گاجا ہو، خاموشی سے سب کچھ ہو جائے تو یہ کیسا ہونق لڑکا ہوگا۔ شادی ہو رہی ہے یا کوئی چوری کر رہے ہیں۔ ولایت سے ابھی ابھی آیا ہے اس لیے دماغ درست نہیں ہے۔ لیکن کون سنتا ہے۔ رسمیں ساری ہوئیں۔ مانجھے بٹھانا، کنگنا باندھنا، مہندی لگانا، مسالا پسوانا، پانی بھروانا، تمھیں خوشی ہوگی کہ مہر تیس ہزار مقرر ہوا ہے اور ڈیڑھ سو روپے جیب خرچ لکھا گیا ہے۔ حمو کتنی خوش نصیب ہے۔ باقی رسمیں بھی ادا کی گئیں۔ چوتھی کھیلنا، دلہن کی جوتی دولھا کے کندھے پر لگانا، آرسی مصحف کرنا، دولھا کے سر پر بہنوں کا آنچل ڈالنا، دولھا کو زعفران کے بہانے مرچیں کھلا دینا، دولھا کے جوتے چرالینا، پھر دولھا کو الٹی چارپائی سے گرا دینا، اس کی شیروانی پلنگ سے سی دینا، میراسنوں کا بے ہودہ گانے گانا۔ بڑا لطف رہا۔ دولھا بھی ایک چغد نکلا۔ جنم نہ دیکھا بوریا سپنے آئی کھاٹ، سنا ہے کہ نکاح کے فوراً بعد ہی کہیں فرار ہو گیا۔ بڑی مشکلوں سے ڈھونڈ کر لائے۔ پتہ نہیں آج کل کے لڑکے کیسے ہو گئے ہیں۔ یہی رسومات تو قوموں کے زندہ رہنے کی نشانیاں ہیں۔ دولھا نے مہر میں بھی میخ نکالی کہ بیس ہزار کا جو جہیز لڑکی کو دے رہے ہیں، یہ اپنے پاس رکھیے اور تیس ہزار کی رقم کو کم کرکے مہر دس ہزار کر دیجیے۔ لاحول ولا قوۃ!

شادی میں کچھ لڑکے بھی تھے ہمیں چھیڑنے لگے۔ ڈانٹا تو بولے سنگار کیوں کرتی ہو۔ یہ لوگ اتنا نہیں جانتے کہ ہم کپڑے اور زیورات صرف ایک دوسری کو دکھانے کے لیے پہنتی ہیں۔ موئے لڑکوں کو اس سے کیا۔

حمو کی رخصت ہو گئی۔ خدا کرے کہ بنے بنی میں ہمیشہ بنی رہے لیکن آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ افواہ ہے کہ اس کی ساس نندیں بڑی ظالم ہیں۔ پر کا کوا اور رائی کا پہاڑ بنانے کو ہر دم تیار

ہیں۔ پر ذہن یہ مرحلہ تو ہر لڑکی کو طے کرنا ہے۔

رشید کے چچا بھی آئے ہوئے تھے، ان کے متعلق ایک لطیفہ سنا کہ رنڈوے ہیں مگر کوئی کہہ رہا تھا کہ بیوی زندہ ہے۔ خیر مجھے اس سے کیا۔

اوئی کتنا لمبا خط لکھا ہے، لو اب خوش ہو یا اب بھی روٹھی رہو گی۔ خط لکھو مفصل سا ہو۔ کس کس کی نسبت ٹوٹی ہے، کس کس کے گھر شکر رنجی ہوئی ہے یا ہونے کا امکان ہے۔ ہماری جاننے والیوں میں سے کوئی سسرال سے لڑ کر آئی ہے۔ میرے متعلق کسی سے کوئی بات تو نہیں سنی۔ ان دنوں کس کس کے سکینڈل چل رہے ہیں۔ کوئی نیا فلمی گانا پسند آیا؟ غرارے یا جمپر کا کوئی نیا ڈیزائن ۔۔۔۔ ساری باتیں مفصل لکھنا۔

امید ہے کہ منشی فاضل کا امتحان پاس کر چکی ہوگی۔ کبھی آکر مل ہی جاؤ۔ صرف چالیس پچاس میل کا تو فاصلہ ہے۔ فقط

تمہاری دور افتادہ سہیلی

(بہ شکریہ "شاہ کار")

○ ○ ○
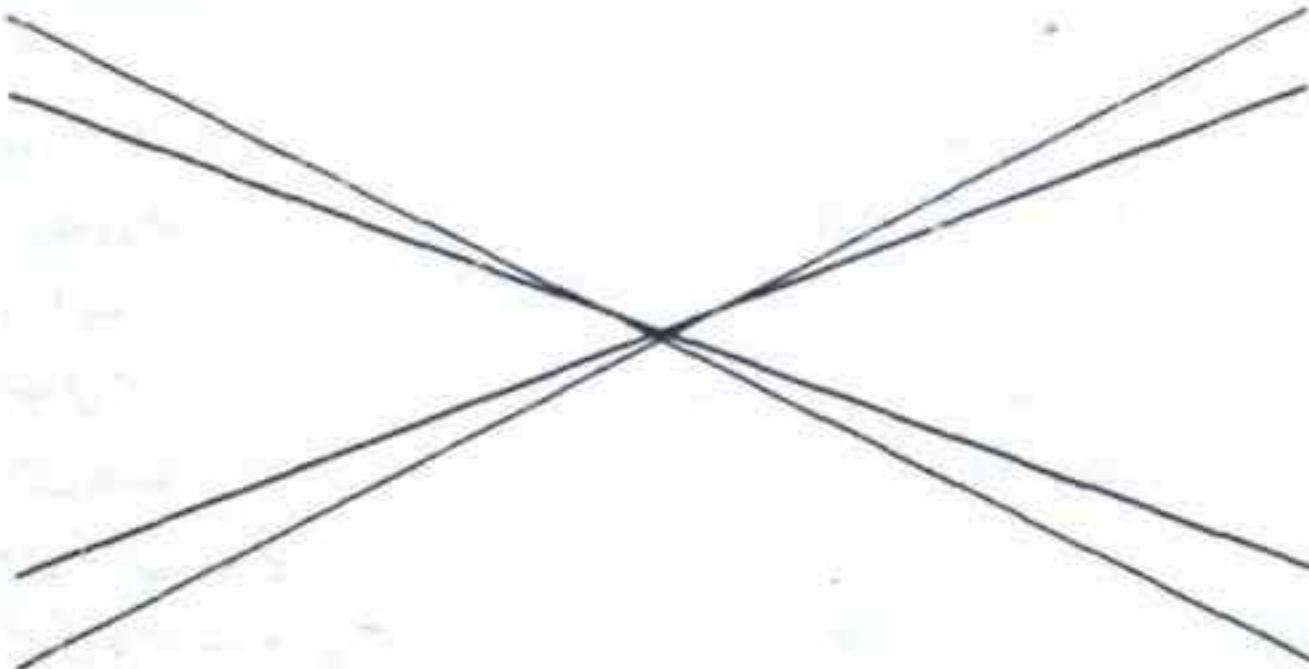
شفیق الرحمٰن

تعارف

(۱)

محترم جناب فکر تونسوی مدظلہ کا دیدار بڑے انتظار کے بعد نصیب ہوا۔ مدتوں سے تمنا تھی کہ ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہو۔ آخر میرا نصیب اسی روز جاگا جب اخبار میں پڑھا کہ وہ ہمارے قصبے میں مشاعرے کی صدارت فرمائیں گے۔

میں نے بڑی محنت کے بعد ایک غزل "کہی" پھر اسے کاغذ پر خوش خط لکھا اور کاغذ بغل میں دبا کر (کیوں کہ بس میں اتنی دھکاپیل تھی کہ فقط بغل ہی محفوظ جگہ معلوم ہوتی تھی) پنڈال میں پہنچا۔

مشاعرہ شروع ہوتے ہی پہلے بھی جیسے رنگروٹ شعرا کو مُرخانے کی کوشش کی گئی۔ جب میرا نام پکارا گیا تو فکر صاحب زاد لطفہ سے اس قدر مرعوب ہو چکا تھا کہ اپنی غزل کہیں گرادی۔

سٹیج پر پہنچ کر کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر ان کی طرف ہاتھ بڑھا کر فقط یہ کہہ سکا:

اب تک نہ خبر تھی مجھے اجڑے ہوئے گھر کی
تم آئے تو گھر بے سرو ساماں نظر آیا

اس کے بعد زبان کو جیسے قفل لگ گیا۔ لیکن انھوں نے ازراہ کرم اٹھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور انگریزی میں بولے "That will do" ---- اس کے بعد مزید عنایت ہوئی اور فرمایا کہ جب کبھی تصحیح کی ضرورت ہوا کرے تو جس چیز کو تم اپنا کام سمجھتے ہو بلا تکلف مجھے بھیج دیا کرو۔

چناں چہ آپ کی تصحیح سے میری شاعری کو دن دونی رات چوگنی ترقی ہوئی۔ ان کی بزرگانہ شفقتیں سدا شامل حال رہیں اور وہ ہمیشہ لطف و کرم سے نوازتے رہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جو کچھ بھی میں ہوں محض ان کی عنایت سے ---- وغیرہ وغیرہ۔

اس انداز میں کافی طویل مقالہ لکھا جاسکتا تھا۔ مگر یہ سراسر غلط ہوگا کیوں کہ نہ تو فکر مجھ سے عمر میں اتنے بڑے ہیں نہ میں شاعر ہوں اور پھر مجھے مدظلہٗ، اور زاد لطفہ، کے اصلی معنی بھی نہیں آتے۔

نیز یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ دن کے وقت جب سب جاگ کر محنت کرتے ہیں تو فقط دگنی ترقی نصیب ہوتی ہے۔ ادھر رات کو سوتے اور خراٹے لیتے ہوئے وہ چوگنی کیوں کر ہو جاتی ہے؟

شاید اس میں کوئی رمز ہو اور کسی نے کہا ہے کہ:

رمز رمز ہے اس کی تفسیر مت کر

(۲)

بر صغیر بلکہ بر کبیر کے مشہور دانش ور جناب فکر تونسوی کے فن کے متعلق لکھتے ہوئے موزوں الفاظ چننا آسان کام نہیں پھر بھی ڈکشنری کی مدد سے پوری کوشش کی جائے گی کہ جہاں تصور و تفکر، تحقیق و کاوش، ادراک و ذکاوت، اظہار و ابلاغ، زاویہ نگاہ کی جامعیت اور جمالیاتی تصورات سے ہم آہنگی، آمد اور آورد۔ ابعاد ثلاثہ بعد رابع ---- جیسے عام فہم الفاظ اس ٹھوس مضمون میں شامل کیے جائیں، وہاں ہم عصروں کی تقلید و تتبع، تذبذب اور ---- وجدانیات اور وجدانیات، ابہام کی لذت، عمق و استدلال، کمالیات و جمالیات، تحت الشعوری کشمکش، نرگسیت کی جامعیت جیسے روزمرہ کے جانے پہچانے الفاظ بھی موجود ہوں۔

---- اور یہ بھی کہ فکر صاحب نے زندگی کی راہ میں کون کون سے مراحل طے کیے؟ اور کیوں کیے؟ وہ تلاش و جستجو کی کن کن منزلوں سے گزرے؟ اور کہاں کہاں سے نہ گزر سکے؟ ---- کیا اس لیے کہ ان منزلوں کا پورا پتہ معلوم نہ تھا؟ اور انھوں نے کس کس جگہ قیام کیا؟ اور کن مقامات پر قیام نہ کر سکے؟ اور کیوں؟ اور کب؟ اور وغیرہ وغیرہ۔

ایسی چند ہی سطریں لکھیں ہوں گی کہ شبہ سا ہو چلا ہے کہ شاید اس قسم کا مضمون اچھی طرح نہ لکھ سکوں۔ اگر چہ جی بہت چاہتا تھا کہ ان پر ٹھوس اور جامع مقالہ رقم کروں۔

یہ صحیح ہے کہ موصوف پر بہت کچھ چھپا ہے، تاہم اسے کم ہی سمجھا جائے کیوں کہ جہاں بغیر سوچے سمجھے کافی مشکل کام ہے، وہاں طرح طرح کی پچاس ساٹھ کتابوں کے حوالے دیے بغیر تو اور بھی دشوار ہے۔

(۳)

مشاعرہ شروع ہوا ہی تھا کہ ایک شرمیلا سا نوجوان سٹیج پر آیا۔ اس کی غزل کے پہلے دو شعروں پر ہی چونک پڑا بقیہ اشعار سننے پر یقین ہو گیا کہ یہ نو مشق بہت جلد غضب ڈھائے گا۔ میں نے صدر مشاعرہ کی طرف اشارہ کیا جو میری جانب اشارہ کرنے والے تھے۔

ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات ---- وہ دن اور آج کا دن، دیکھتے دیکھتے عزیزم فکر نے ایسی ترقی کی کہ بڑے بڑوں کے کان کاٹنے لگے۔

جس قدر پروپیگنڈہ میں عزیزی کے لیے کر سکتا تھا دل کھول کر کیا اور لگاتار ہمت بھی بندھاتا رہا۔ حتیٰ کہ چاروں طرف ان کا طوطی بولنے لگا۔

اسے ان کی سعادت سمجھیے کہ جب بھی ان پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برستے ہیں اور

وہ اس خاکسار کو یاد رکھتے ہیں اور یہ بتانے میں بخل سے کام نہیں لیتے کہ جن بلندیوں کو وہ چھو رہے ہیں اس میں مجھ ناچیز کی حقیر کوششیں بھی شامل ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

اس قسم کی عبارت بھی درست نہیں ہوگی کیوں کہ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے نہیں ہیں۔ لہٰذا انھیں عزیزی کسی حساب سے نہیں لکھا جاسکتا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی طبعیت میں شروع ہی سے انکسار رہا ہے۔۔۔۔ اس قدر کہ اگر انھوں نے کبھی باقاعدہ طور پر اپنی سوانح عمری لکھی تو اپنے بارے میں کچھ شامل نہیں کریں گے، ساری کتاب میں دوسروں کا ذکر ہوگا۔ ویسے بھی ان کی شخصیت یاروں دوستوں کو عزیز رہی ہے۔ (ایک مرد کے لیے مونث صیغہ استعمال کرتے ہوئے افسوس ہوتا ہے لیکن اگر کسی کو گلہ ہو تو بجائے راقم الحروف کے اردو گرامر سے ہونا چاہیے)

اس کے علاوہ بردا کا پودا آج تک دیکھنا نصیب نہیں ہوا، لہٰذا اس کے پتوں کی چکنائی (یا کھردرے پن) کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جاسکتا۔ رہ گیا کان کاٹنا تو انھوں نے کسی کے کانوں کو چھوا تک نہیں، یہاں تک کہ پالتو بلی یا کتے کے کان کو بھی نہیں۔ جہاں تک طوطی بولنے کا تعلق ہے تو کہیں بھی وہ طوطی نہیں دیکھا گیا جو کسی انسان کو شہرت ملنے پر بولنے لگتا ہے۔

دوسرے یہ کہ موصوف کو پرندوں سے کوئی خاص دل چسپی نہیں ہے ۔۔۔۔ سوائے مرغ، تیتر اور بٹیر کے ۔۔۔۔ اور پتہ نہیں کہ وہ بھی رہ گئی ہے یا نہیں۔

اور ڈونگروں کو نہ تو کبھی ساکن حالت میں دیکھا اور نہ برستے ہوئے۔ بلکہ یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ ہوتے کیا ہیں۔

بہ ہر حال محاورے پھر محاورے ہیں۔

(۴)

میں اور میرا دوست کلو اور کانگڑے کے خوش نما علاقے کی سیر سے واپس آرہے تھے۔ پٹھان کوٹ سے ہمیں جو ٹرین ملی وہ اتنی سست رفتار نکلی کہ لاہور صبح چار بجے پہنچی ۔۔۔۔ یا شاید وہ صحیح وقت پر آئی ہو اور ہم ٹائم ٹیبل ٹھیک طرح نہ دیکھ سکے۔

سٹیشن پر معلوم ہوا کہ قصور کی طرف جانے والی پسنجر ٹرین میں ابھی چھ سات گھنٹے باقی ہیں۔ سوچنے لگے کہ تب تک کیا کیا جائے۔

بے وقت ناشتہ کرنے کا خیال آیا لیکن جب بٹوے نکال کر روپے آنے اور پیسے گنے تو لودھراں تک کے دو تھرڈ کلاس ٹکٹوں جتنی رقم تھی۔ لودھراں سے بہاول پور فقط چند میل دور ہے لیکن بیچ میں دریائے ستلج حائل ہے۔

یکایک میرے دوست کو وہ خط یاد آگیا جو میں نے پہاڑوں اور وادیوں کے جلال و جمال سے متاثر ہو کر فکر صاحب کو بھیجا تھا۔

"فکر صاحب اہلِ قلم ہیں تو ان کے ساتھ صبح کیوں نہ منائی جائے؟" اس نے مشورہ دیا۔
"ادبی شخصیتوں کے ساتھ شام منائی جاتی ہے، وہ بھی ان سے پہلے پوچھ کر۔ آج تک نہیں سنا کہ کسی کے ساتھ صبح منائی گئی ہو"
"شام کو تو وہ ان سوشل پروگراموں میں مصروف ہوتے ہوں گے۔ دن بھر رسالے کے دفتر میں کام رہتا ہوگا۔ لہٰذا صبح ہی وہ وقت ہے جب ۔ ۔ ۔ ۔"
مگر صبح ہونے میں تو ابھی دیر ہے ۔ ۔ ۔ ۔"
"تو پھر صبحِ کاذب یا صبحِ صادق منانے میں تو اور بھی جدت ہوگی۔ یہ بالکل نئی چیز ہے، لہٰذا ترقی پسندی میں شامل ہوگی۔"
محض اس کے اصرار پر مجبور ہو کر (اور چند میل پیدل چل کر) فکر صاحب کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔
پھر میرے دوست نے یہی عمل بڑی سرگرمی سے اس وقت تک جاری رکھا جب تک کہ پڑوسیوں نے شور نہیں مچایا۔ اس پر دروازہ کھلا اور پیش تر اس کے فکر یہ سمجھ سکتے کہ کیا ہو رہا ہے اور ہم کون ہیں، میرے دوست نے اردو شاعری کے جدید رجحانات کے بارے میں سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ یہاں یہ بتانے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ان کا کمرہ چار دیواروں، ایک فرش، ایک کرسی، چھت، دو دروازوں، میز، دو کھڑکیوں اور ایک بلی سے مزین تھا۔
ان کا اونگھتا ہوا ملازم ہمارے لیے دو دو چھٹانک کی ہلکی ماڈرن کرسیاں لایا، جن پر ہم بیٹھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے، کیوں کہ وہ چبھتی تھیں میز پر بیٹھنا زیادہ آرام دہ تھا۔ اس کے بعد وہ دروازے کھڑکیاں بند کر کے دیر تک ان چیزوں کو جلانے کے لیے ہوا دیتا رہا جنھیں وہ کوئلے سمجھ رہا تھا۔ اس کے پنکھے کی متواتر گردش سے کمرے کا ٹمپریچر نقطہ انجام تک پہنچ گیا ہوگا۔ اس کا ثبوت وہ چھینکیں تھیں جو ہم سب کو دبا دب آ رہی تھیں۔ ادھر فکر صاحب جمائیاں بھی لے رہے تھے اور جاگنے کی کوشش میں مصروف تھے۔
جب ان سے پوچھا گیا کہ شاعری اور نثر میں کیا فرق ہے؟ تو انھوں نے انتہائی تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ سوال کی وضاحت کی جائے۔ میرے دوست نے اپنا سوال دہرا کر کہا نیز یہ کہ آزاد شاعری اور نثر کو الگ الگ کرنے میں کبھی کبھی غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں۔
انھوں نے جواب دیا کہ شاعری اور نثر میں پہلا فرق تو ہے کہ غزل ہو یا نظم ۔ ۔ ۔ ۔ کاغذ پر تحریر کرتے وقت "لکھی" نہیں جاتی" بلکہ "کہی" جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ شاعری کا ہر مجموعہ دیوان کہلاتا ہے اس سلسلے میں انھوں نے بارہا سوچا کہ اگر یہ دیوان ہے تو ریاستوں میں نواب یا راجہ کے معتمد خاص کو دیوان صاحب کیوں کہا جاتا ہے؟ تیسرے یہ کہ آزاد ہوتے ہی جہاں شاعری ساری زنجیریں توڑ چکی ہے وہاں نثر کو نہ جانے کیوں آزادی نہ مل سکی۔ یہ اب تک غلامی میں

پھنسی ہوئی ہے۔ چوتھے یہ کہ کسی فل سکیپ کاغذ پر پہلے عبارت لکھ دیں پھر کاغذ کو نصف بتہ کر لیا جائے تو شاید داہنی طرف کے فقروں سے ایک آزاد نظم وجود میں آسکتی ہے اور بائیں جانب کی سطروں سے دوسری۔

اتنے میں ان کا ملازم کسی دکان سے ایسی جانی پہچانی چائے لایا جس میں سب کچھ پہلے ہی ملا ہوا تھا اور جسے پیتے ہی ہم سب ہڑبڑا کر اٹھے۔

فکر نے فوراً چونک کر کہا کہ جہاں غزلوں کے اشعار ہارمونیم اور طبلے پر گائے جاتے ہیں، وہاں آزاد نظم کے مصرعوں کا کوئی ساز ساتھ نہیں دے سکتا۔۔۔۔ یہاں تک کہ غیر ملکی ٹرومبون، یوفونیم، یوکلیلی وغیرہ بھی نہیں۔ اس کے علاوہ جہاں شاعری میں دو غزلہ، سہ غزلہ بلکہ چہار غزلہ تک کی کھلی اجازت ہے وہاں نثر میں دو مضمونہ، سہ انشائیہ یا چہار افسانیہ لکھتے وقت جھجک محسوس ہوتی ہوگی۔

باتوں باتوں میں یہ احساس ہی نہ رہا کہ ٹریفک شروع ہو چکا ہے۔ سڑک سے طرح طرح کی آوازیں آرہی تھیں اور کھڑکی سے سورج کی شعاعیں۔

دفعتہً ایک گرج دار صدا سنائی دی:

یوں پکارے ہیں مجھے کوچہ جاناں والے
ادھر آبے ابے او چاک گریباں والے

اس پر ہمارے کان کھڑے ہوئے۔ پھر دبنگ نعرہ لگا جو کسی بادشاہی سرمے یا کسی اصلی شہنشاہی چیز کے اشتہار کے بارے میں تھا۔

کیا ہی کنڈلی مار کے بیٹھا ہے جوڑا سانپ کا

پھر یہ شعر نازل ہوا:

مرتے مرتے ہم بچے اور خیر کی اللہ نے
رات بھر چوٹی سمجھ کر سر مروڑا سانپ کا

اس پر میرے دوست نے پوچھا کہ جب غلط فہمی کے تحت سانپ کا سر مروڑا جا رہا تھا تو اس نے احتجاج کیوں نہیں کیا۔۔۔۔ کاٹ لیتا یا دوڑ جاتا۔

موصوف نے فرمایا کہ کوئی صاحب دل سانپ ہوگا جو رواداری میں وہیں بیٹھا رہا۔ پھر آپ نے چٹکی بجائی اور ملازم حلوائی کی دکان سے گرم گرم حلوہ لے آیا۔ ہم سمجھ گئے کہ اب وہ پوری طرح بیدار ہو چکے ہیں۔

میرے دوست نے اس بے انصافی کا ذکر کیا جو مغربی دانش ور مشرق والوں اور خصوصاً جنوب مشرق والوں سے روا رکھتے ہیں یعنی ان کے ہر کارنامے کا Credit خود لے لیتے ہیں۔

اس پر فکر صاحب نے جنوب مشرقی جیومیٹری، جنوب مشرقی Electronics ،

جنوب مشرقی سرجری اور آئن سٹائن کی جنوب مشرقی تھیوری پر ہلکی سی روشنی ڈالی اور ملازم کو ایک خاص اشارہ کیا۔ جسے وہ ضرور سمجھ گیا ہوگا کیوں کہ اس نے فوراً یاد دلایا کہ آج رسالے کے دفتر میں کانفرنس ہے لہٰذا انھیں جلد پہنچنا ہوگا۔

اس طرح یہ انٹلکچوئل محفل ختم ہوئی وغیرہ وغیرہ۔

ایسی داستان جو طویل بھی کی جاسکتی ہے۔ شاید ماڈرن قدروں کے عین مطابق ہو لیکن درحقیقت یوں بالکل نہیں ہوا تھا۔

بھلا دو معمولی طالب علم ایک مشہور رسالے کے مدیر سے اتنی بے تکلفی کیوں کر برت سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ایسے حالات میں کسی بھی مدیر کا اتنا صابر اور متحمل ہونا بہت مشکل ہے۔

(ویسے اس سے ملتا جلتا واقعہ پیش ضرور آیا تھا لیکن ادبی سلسلے میں نہیں بلکہ اکھڑ قسم کے حالات میں اور وہ بھی میرے دوست کے دوستوں کے ساتھ)

(۵)

راقم الحروف نے اب تک محققانہ انداز میں کچھ نہیں لکھا۔۔۔۔

قارئین اور سامعین دونوں کے لیے یہ امر باعث مسرت و بہجت ہوگا کہ خاکسار نے جس کاوش اور چھان بین سے فکر صاحب کے طنز و مزاح پر ایک ضخیم مقالہ لکھنے کا مصمم ارادہ کر رکھا ہے۔ امید کامل ہے وہ خود اس موضوع پر ایک گراں قدر تصنیف بن جائے گی اور اس میں ایسے ایسے انوکھے زاویوں سے موضوع اور متعلقہ اجزا کو پرکھا جائے گا کہ اس سے مستفیض ہونے کے لیے خاص ذوق، ذہانت و دیگر لوازمات ضروری ہوں گے۔

پوری کوشش کی جائے گی کہ اسے جس قدر Symbolic یعنی اشارتی بنایا جاسکے دریغ نہ کیا جائے تاکہ محض انٹلکچوئل طبقے کے لیے خاصے کی چیز ہو۔

اور اگر دوسرے اسے Out of Bounds سمجھیں تو سمجھا کریں۔

سب جانتے ہیں کہ ادب کو اشارتی بنانے میں خاصی دشواریاں ہوتی ہیں جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے:

بے کار نالے صورت بلبل کیے تو کیا
کس سے کہیں کہ گل کی سماعت میں فرق ہے

سالم مقالہ تو طوالت کی وجہ سے یہاں نقل نہیں کیا جاسکتا، لیکن Trailer یعنی نمونے کے طور پر کہیں کہیں سے چند حصے پیش ہیں:۔

انسان کا خیال ہے کہ وہ کائنات کا محور ہے اور اس کی اپنی ذات کے اندر بھی ایک کائنات موجود ہے تبھی اس نے خود اپنے لیے اشرف المخلوقات کا لقب چنا ہے۔۔۔۔ غالباً اس لیے

کہ دیگر جان دار (سوائے طوطے کے) بول نہیں سکتے اور نہ (طوطے سمیت) لکھ سکتے ہیں۔

فکر صاحب کے فن کی تشریح سے پہلے اگر ہنسی، ہنسنے کا عمل، ہنسی کی حد، ہنسوڑ پنے کے درجے، قہقہوں کی اہمیت ---- وغیرہ کی وضاحت کر دی جائے تو بہتر ہوگا ---- یعنی "دل ہی دل میں لڈو پھوٹنا" (خواہ پڑھنے والا سوچتا رہے کہ لڈو دل میں کیسے پہنچ گئے) ---- "باغ باغ ہو جانا" (خواہ چاروں طرف ریگستان ہو) ----

زیرِ لب (اور اگر مونچھیں ہوں تو زیرِ مونچھ مسکرانا ---- "باچھیں کھل جانا۔" بیش تر لوگوں کو باچھیں کے معنے معلوم نہیں تبھی وہ کھِل جانا کی جگہ کھُل جانا پڑھتے ہیں) ---- بتیسی دکھانا (خواہ سارے دانت مصنوعی ہوں) ---- بغلیں بجانا (اپنی بغلیں) ---- وغیرہ کی کیا نوعیت ہے اور ان سب میں کتنا فرق ہے۔ اسے دیباچے کے شروع میں بیان کیا جائے گا۔

اس کے بعد اس عجیب و غریب (غریب کی جگہ شاید امیر بہتر ہوتا) کیفیت کا تجزیہ ہوگا کہ انسان کو کیا مصیبت پڑی ہے کہ وہ ہنسے، جب کہ دیگر جان دار ---- یعنی چرند، پرند، درند ---- سنجیدہ رہتے ہیں۔ اس کا جواب دینے کے لیے بھی تقریباً تیس چالیس صفحات درکار ہوں گے مزاح کی اصناف ---- مثلاً ٹھٹھول بازی، بذلہ سنجی، حاضر جوابی۔ دل لگی۔ ضلع جگت، برجستہ گوئی، پھکڑ پن، مضحک لفاظی ---- وغیرہ کا تذکرہ مقالے کے وسط میں ہوگا۔

پھر یہ کہ اردو میں جتنا بھی مزاح ہے اس کا اثر ہم پر عملی طور پر کیوں نہ پڑ سکا؟ ہنس مکھ قوموں کی شگفتہ مزاجی سے متاثر ہونے سے ہم کیوں معذور رہے ہیں؟ اور معذور رہنے کے لیے ہم نے کیا کیا جتن کیے اور کیسے کیسے بہانے بنائے؟

اس پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی (ممکن ہے کہ وہ کچھ دھندلی سی ہو، کیوں کہ بقول انگریزوں کے (Ignorance is Bliss)

اس سے اگلے حصے میں سنجیدہ نثر اور مزاحیہ نثر میں فرق معلوم کرنے کے مفید گر بتائے جائیں۔

بعد میں ادبی مزاح اور صحافتی طنز کے مدغم ہو جانے سے پبلی شرز اور نقادوں کو جو فائدے ہوئے اور جن الجھنوں نے سر اٹھایا۔

---- ان لوگوں کو الگ الگ کرنے کی کوشش کی جائے گی ---- پھر ان پے چیدگیوں پر لمبا تبصرہ کیا جائے گا جو پیدا نہ ہو سکیں قبل از مسیح کے طنز و مزاح کا بھی ذکر ہوگا۔

مثلاً بابل اور نینوا کے کھنڈرات میں جو انسان نما حیوانوں کے مجسمے ملے ہیں ان کی مونچھیں داڑھیوں سے بھی بڑھی ہوئی ہیں جو محاورے کے سراسر خلاف ہے اور یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ سنجیدہ ہیں یا ہنس رہے ہیں کیوں کہ چہرہ بالوں سے بھرا ہوا ہے۔

ادھر مصنوعی داڑھی لٹکانے والے فرعونوں کے مقبروں میں مصریوں کی تصویریں دیکھ

کر یوں لگتا ہے کہ وہ مطمئن تو شاید ہوں لیکن مسرور نہیں معلوم ہوتے۔ شاید اس لیے کہ انھیں علم ہو گا کہ جوں ہی صحرا کی طرف سے بادِ سموم چلی تو مصنوعی داڑھی کے جلنے اور گر جانے کا امکان ہو سکتا ہے۔

یونانیوں کے عہدِ زریں میں اداکاری بالکل کھلے ہوئے یعنی بغیر چھت کے تھیٹروں میں ہوا کرتی۔

چناں چہ اداکار اور تماشائی دونوں کچھ ڈرے ڈرے سے رہتے۔ یعنی دھوپ میں پسینے سے شرابور اور اگر شام کو بارش ہو جائے تو سب کے تہمد نما کپڑے بھیگ جائیں۔ سردیوں میں ایسے لباس میں خوب ٹھنڈ لگتی ہوگی ---- تبھی ان کے طربیہ ڈرامے اتنے طربیہ نہیں لگتے جتنی کہ اس خوش نما علاقے کے زندہ دل لوگوں سے توقع رکھی جا سکتی تھی۔

رومن آئے تو حیوانوں، انسانوں کی لڑائی میں تینوں متعلقین ---- جانور لڑنے والے اور تماشائی ---- سب کو سنجیدہ ہونا پڑا۔

لیکن چند رنگیلے رومن حکمرانوں نے بعد میں محفلِ رقص و سرود منعقد کرا کے سنجیدگی اور ہنسی کو برابر برابر چھڑوانے کی کوشش ضرور کی۔

پھر جو تہذیبیں آئیں ---- اور وہ تہذیبیں جن کے متعلق معلومات کم ہیں ان کے بارے میں ستر اسی صفحات کے لگ بھگ۔

پھر تقریباً پچاس صفحات میں اس گتھی کو سائنٹیفک طریقے سے سلجھایا جائے گا کہ انسان سارے سنجیدہ جان داروں کے سامنے ہنس ہنس کر خواہ مخواہ اپنی پوزیشن کو آک ورڈ کراتا ہے ---- وغیرہ وغیرہ

لیکن شاید راقم الحروف یہ سب کچھ پوری تفصیل سے نہ لکھ سکے کیوں کہ زیادہ سے زیادہ الفاظ میں کم سے کم کہنا کافی مشکل کام ہے۔ اس کے علاوہ اگر مضمون اور طویل ہو گیا تو Thesis کہلانے کا مستحق ہو گا، جسے پی ایچ۔ ڈی کے لیے بھیجا جا سکتا ہے۔ ڈگری ملنا نہ ملنا اور بات ہے لیکن یہ خاکسار پہلے ہی سے ڈاکٹر ہے اور ڈبل ڈاکٹر بننا کسی کسی کا کام ہے۔

(۶)

دانش وروں کی شرح کی عمر کی تگ و دو اور طرح طرح کے تجربوں کا ذکر نہ صرف پسند کیا جاتا ہے بلکہ شبہ سا ہے کہ موجودہ دور میں پڑھنے والے شاید اس کی توقع بھی رکھتے ہوں۔

اوائلِ عمر میں ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ فکر صاحب نے ٹیوشن کی (یعنی دوسروں کو پڑھانے کی کوشش) ایک فل ٹائم ٹیکنیکل ڈیپارٹمنٹ میں پارٹ ٹائم کام کرتے رہے، بیمہ کمپنی کے ایجنٹ بنے لیکن اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیا۔ جب مینجر کو معلوم ہوا اور اس نے پالیسی

لینے پر اصرار کیا تو آپ نے کہا کہ میرا عقیدہ تو یہ رہا ہے کہ Honesty is the best policy اس کے بعد دیہات سدھار کے محکمے میں شریک ہوئے اور کئی بڑے بڑے شہروں کی رونق میں اضافہ کیا۔

جب آپ ریڈ کراس میں تھے تو حسب معمول ایک منہ پھٹ دوست نے آپ کو ڈبل کراس کرنے کی دعوت دی گئی لیکن دفتری کاروائی اور Visa وغیرہ میں اتنی دیر لگ گئی کہ لنکا سری لنکا بن چکا تھا۔

ایکٹنگ کرنے کا موقعہ بھی ملا لیکن میک اپ کرتے وقت چہرے پر جس قسم کی چیزیں تھوپنی پڑتی ہیں اور جو آسانی سے اترتی ہی نہیں ان کی وجہ سے ہیرو بننے کا خیال چھوڑ دیا۔

اس کے بعد ایک کمرشیل بنیک کے مینیجر بنے اور پھر بلڈ بنیک کے ---- وغیرہ وغیرہ۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ بلہ بھی ناکام رہے گا۔ کیوں کہ ان کے ساتھی فوراً اس کی تردید کر دیں گے کہ فکر صاحب نے ایسی یا اس قسم کی اور حرکتیں بالکل نہیں کیں۔

رہ گیا تجربہ ---- اس کے حصول کے لیے سب تلقین کرتے ہیں اور بار بار اس کی اہمیت دہرائی جاتی ہے لیکن بعض اوقات اسی کوشش میں ایسے ایسے تجربے بھی ہو جاتے ہیں کہ انسان لاحول پڑھتا ہے کہ اس قسم کے ہونق تجربے سے پہلے وہ کہیں بہتر تھا۔

(۷)

تعارف نویسی کی یہ چند کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔

سوچ رہا ہوں کہ جب وہ مدیر تھے کیوں نہ ان دنوں کے واقعات اور باتوں کا ذکر کیا جائے۔ ان کا جس مشہور رسالے سے واسطہ تھا اس کے دفتر میں سہ پہر سے رونق شروع ہو جاتی، جو دیر تک رہتی اور ایسے ایسے ادبی V.I.P اکٹھے ہوا کرتے کہ فقط ہم جیسے نو مشقوں (جو تعلیم کے دباؤ کی وجہ سے محض کبھی کبھار وہاں جا سکتے) ہی کو V.U.Ps (یعنی - Very Un Important Persons) کہا جا سکتا تھا۔

ادبی (اور غیر ادبی) گفتگو میں چھیڑ خانیاں ہوتیں۔ قہقہے لگتے اور وہ عمل جسے انگریز Leg Pulling کہتے ہیں اس کا مظاہرہ عام ہوتا۔

مثال کے طور پر ایک صاحب آئے جو چند پبلیشرز کی مطبوعہ کتابوں کی تعریف میں اشتہار گردپوش کی عبارت وغیرہ لکھتے اور معاوضہ وصول کیا کرتے:

کسی نے چوٹ کی کہ جو شخص ہر افسانہ نویس، شاعر، مضمون نگار کی تصنیف پر زمین آسمان کے قلابے ملا سکتا ہے کاش کہ وہ اپنے مقرر کیے ہوئے معیار پر ایک چھوٹا سا کتابچہ ہی خود لکھ کر دکھا دے۔

اسی طرح ایک دفعہ فکر کی شاعری کے ساتھ ساتھ جب ان کی مزاحیہ تحریر چھپی تو کئی

حضرات چونکے ۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مزاحیہ تحریر بھی انہی کے قلم سے ہے اس پر ایک صاحب نے کاغذ پر یہ لکھا ۔

"جناب فکر تونسوی کے قلم سے ۔۔۔۔

یعنی قلم واقعی فکر کا تھا لیکن اس تحریر کے لیے اسے استعمال کسی اور نے کیا ۔

تازہ مطبوعات کا تذکرہ ہوتا تو کچھ اس قسم کے فقرے سننے میں آتے :

"اس مجلد پیکٹ کے متعلق فقط اتنا کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک کتاب ہے اس کی واحد خوبی یہی ہو سکتی ہے کہ اسے کسی نے چھاپ دیا ہے رہ گیا ادبی پہلو ۔۔۔۔ سو کاغذ اچھا خاصا ہے اور قیمت واجبی ہے ۔۔۔۔"

یا "مصنف کی کتاب کا پہلا ایڈیشن سچ مچ ایک ہزار جلدوں پر مشتمل تھا کسی کو شبہ ہو تو پبلیشر کے گودام میں جاکر خود گن لے "

اور "سارے ناول میں فقط اس کے اختتام کی تعریف کی جاسکتی ہے ، جب پڑھنے والا اطمینان کا سانس لیتا ہے کہ شکر ہے اس سے چھٹکارا ملا ۔۔۔۔"

یا پھر "میں نے اس کتاب کو لگاتار پڑھ کر رات کے چار بجے ختم کیا جس سے یہ اندازہ بھی لگایا جاسکتا کہ میرے شب و روز کس قدر پھیکے اور بے کیف گزر رہے ہیں "

اور "اس ذہین شاعر کا مستقبل خاصہ روشن نظر آتا ہے ۔۔۔۔ لیکن شاعری میں نہیں بلکہ ٹھیکے داری ، عرائض نویسی دکان داری وغیرہ میں ۔۔۔۔"

اس پر موزوں جواب دیے جاتے ۔ بعض اوقات تو ایسے جو سراسر ناقابل اشاعت ہوتے ایک جغادری دانش ور ۔۔۔۔ (پہلی مرتبہ یہ لفظ سنا تو جگادھری معلوم ہوا) جن کا ردیہ کچھ یوں تھا کہ ۔۔۔۔ "مسودے میں جو کچھ میں نے نہیں پڑھا وہ پسند نہیں تھا جو کچھ نظر انداز کیا وہ اچھا نہیں لگا اور بقیہ جس حصے پر نشان نہیں لگائے یعنی جیسے جوں کا توں رہنے دیا ہے ، اس سے مطمئن نہیں ہوں ۔ چوں کہ یہ ایک نئے لکھنے والے کی تحریر ہے اس لیے میں مدیر کو بدظن نہیں کرنا چاہتا ۔ اگر وہ چاہے تو بے شک چھاپ لے " ۔ مگر ان کی تنقید اور کاٹ 3-Dimentional تھی ۔

نکتہ چینی کرتے وقت وہ لکھنے والے کی پرانی نگارشات پر حملہ آور ہوتے ۔ انھیں شکست دے کر اس کی موجودہ تخلیقات کو ڈھادیتے ۔ پھر اس کے مستقبل پر بھی فاتحہ سی پڑھ دی جاتی ۔ اگر مصنف احتجاج کرتا کہ جو میری تحریریں وجود ہی میں نہیں آئیں جنھیں ابھی تک لکھا ہی نہیں ان میں میں نے غلطیاں کیسے کر دیں ؟ تو جواب ملتا ۔ "کدی تو کرو گ"

یہ چھوٹا سا فقرہ ہماری سمجھ سے بالاتر تھا ۔ چناں چہ ایک ڈی ۔ آئی ۔ پی ادیب سے وضاحت چاہی ۔

انھوں نے بتایا کہ ریاستوں راج واڑوں میں افراتفری کے زمانے میں کسی عہدے دار

نے محض شبہے پر کسی کو پچاس روپے جرمانے کی سزا دی ۔ اس زمانے میں پچاس روپے کی قیمت کافی ہوا کرتی تھی ۔ وہ فوراً آگیا اور پڑوس کے شہر سے چند گواہ لایا جنھوں نے الزام غلط ثابت کر دیا اور حلفیہ بیان دیا کہ واقعے کے وقت یہ شخص یہاں سے سو میل دور ہمارے پاس تھا ۔

اس پر جواب ملا کہ "اچھا مان لیا کہ اس نے قصور نہیں کیا، اب تم سب جاسکتے ہو" ۔

لیکن وہ شخص وہیں کھڑا رہا ۔

"تم کیوں کھڑے ہو؟"

"میرے پچاس روپے واپس کیے جائیں" ۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ میں نے قصور نہیں کیا" ۔

"کدی تے کرد ۔ ۔ ۔ ۔ " کہہ کر عہدے دار نے کیس ڈسمس کر دیا ۔

ہفتہ واری پرچوں میں کبھی کبھی چند ادبی شخصیتوں کی پینے پلانے کی محفلوں کا ذکر چھپا کرتا ۔ لیکن ان میں کبھی فکر کا نام بہ طور تماشائی بھی نہیں شامل ہوا ۔

فکر کا نظریہ حیات کچھ ایسا رہا کہ:

پانی پی پی کے توبہ کرتا ہوں
پارسائی سی پارسائی ہے

جب شہر کے غل غپاڑے سے جی اچاٹ ہو جاتا تو اپنے آبائی قصبے اور اس کے مضافات کا چکر لگاتے ۔ یہ غالباً:

نالہ ہائے خانگی دل را تسلی بخش نیست
در بیاباں می تواں فریاد خاطر خواہ کرد

کے سلسلے میں ہوتا ہوگا ۔

ویسے رسالے کے دفتر میں شام کی محفلوں کے علاوہ دن بھر لوگ آتے جاتے رہتے لیکن وہ ہر قسم کی گہما گہمی میں بھی اپنے کام میں جٹے رہتے ۔ انھیں یہی دھن رہتی کہ رسالے کا معیار اور بلند ہو ۔ ذاتی رابطے سے اور لگاتار خط و کتابت کے ذریعے کوشش کرتے کہ ہر نئے شمارے کے لیے اچھے سے اچھے مسودے مل سکیں ۔

"اچھے مواد کی اہمیت کے سلسلے میں شاید کسی نے اس زمانے کے اطالوی ڈکٹیٹر کا یہ بیان انھیں پڑھ دیا ہوگا ۔ مسولینی نے کھلم کھلا اعلان کیا تھا کہ ۔ ۔ ۔ "جب مجھے لڑنے کے لیے اٹلی سے صحیح قسم کا مواد ہی نہیں مل رہا تو میں فتوحات کیوں کر حاصل کروں؟ سوچیے تو سہی کہ اگر مائیکل انجلو جیسے عظیم فن کار کو سنگ مرمر نہ مل سکتا تو کیا اس کے شاہ کار مجسمے ظہور میں آتے؟ اگر اسے

محض سادہ کار ملتا تو وہ ایک اچھا ظروف ساز بن سکتا تھا، بس۔"

فکر صاحب شروع سے میانہ رو رہے، تبھی انھوں نے مدیری کا دور بڑی عمدگی سے نبھا دیا۔ بہت سارے دوست بنائے۔ کئی نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔

ایک صاحب نے جو دفتر میں ان کے ساتھ تھے، کہا کہ ہر متنازعہ اور مجتی معاملے پر کچھ کہنے سے پہلے فکر صاحب دو تین مرتبہ سوچتے تھے ۔۔۔۔ اور پھر کچھ بھی نہیں کہتے تھے۔ موجودہ دور میں کارکردگی کو Score میں بیان کرنے کا رواج ہو چلا ہے۔ لہٰذا فکر کی شاعری، ایڈیٹری، مزاح نویسی اور کالم نگاری ۔۔۔۔ ان سب کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کا سکور 6.3، 6.4، 6.4، 6.5 کے لگ بھگ رہے گا۔

معیاری رسالوں کے مدیروں کی خوب خوشامد کی جاتی ۔۔۔۔ عموماً کچھ اس قسم کے فقروں سے ۔۔۔۔ "آپ تو ہمیشہ صداقت کے علم بردار رہے ہیں اور سب جانتے ہیں کہ خوشامد کو تو آپ قطعاً پسند نہیں کرتے۔"

فکر ایسے جملوں پر یا تو جھینپنے لگتے یا کھانسنا شروع کر دیتے۔

اسی طرح ادبی حلقوں میں عموماً "ادبی مبصروں" کا ذکر کیا جاتا کہ "ایک ادبی مبصر کا کہنا ہے کہ ۔۔۔۔" یا "ابھی ابھی ہمارے ادبی مبصر نے اطلاع دی ہے کہ ۔۔۔۔"

پوچھنے پر ایک صاف گو ادیب نے بتایا کہ "یہ مبصر... جہاں بھی ہوتے ہوں حوالہ دینے کے لیے کارآمد ہیں ۔۔۔۔ ان کے علاوہ "معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ۔۔۔۔" کی گول مول اضافت بھی خاصی مفید ہے اور ۔۔۔۔ "ادبی حلقوں میں یہ خبر تیزی سے گشت کر رہی ہے کہ ۔۔۔۔" کا تو جواب نہیں"

جب بھی افواہوں کا تذکرہ شروع ہوتا فکر صاحب "ابھی آیا" کہہ کر کچھ دیر کے لیے غائب ہو جاتے۔

کبھی فکر صاحب کے بے تکلف دوست اکٹھے ہوتے تو ہلکی پھلکی باتیں ہوتیں۔

مثلاً یہ کہ صحت کے معاملے میں فکر کا حال ہمیشہ ایک سا رہا ہے۔ یعنی نہ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے۔ شاید اس لیے ہے کہ نہ انھیں خوش خوراکی کا شوق ہے اور نہ ورزش کا۔

دوسرا بتاتا کہ چست رہنے کے لیے انھیں صبح صبح پیدل سیر کرتے ہوئے تو دیکھا گیا ہے، رہ گئی باقاعدہ ورزش تو یوں لگتا ہے جیسے انھیں کسرت کے فوائد پر شبہات ہوں پھر کسرت پر کوئی ولایت سے نئی نئی آئی ہوئی پختہ عمر Matron کا قصہ سناتا، جو دیسی تہوار پر ہسپتال کے عملے کی خوشیوں میں گرم جوشی سے شامل ہوئی۔ لیکن جب اکھاڑے میں دیسی لنگوٹ کسے ہوئے پہلوانوں کی کشتیاں شروع ہوئیں تو پہلے مقابلے پر گھبرائی۔ دوسرے تیسرے پر ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگی۔ آخری کشتی پر تو باقاعدہ غش کھانے کو تیار تھی۔ وجہ پوچھنے پر بڑی معصومیت سے

بولی۔۔۔

They Were Trying to Pull Down Whatever Little They Had on Them.

کسی کو شبہ ہو تا کہ فکر کی خوش خوراکی خصوصاً ادبی تقریبوں میں کافی پر اسرار ہے اس میں ضرور کوئی راز ہو گا۔ سند کے طور پر حاجی لق لق کا یہ شعر پیش کیا جاتا:

میں کہاں اور مغربی فیشن کہاں
میری Necktie میں بھی اک راز ہے

یہ ان کی اس مشہور "پولٹیکل غزل" کا ایک شعر ہے جو انھوں نے سہراب مودی کی فلم "پکار" کے ہر دل عزیز گانے اور انگریز حکم رانوں کی غیر ہر دل عزیز مار دھاڑ سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔۔۔"یا کہی" تھی۔ غزل کا یہ شعر بہت مقبول ہوا تھا:

اف یہ لاٹھی چارج بھی کیا ساز ہے
بج رہا ہے اور بے آواز ہے

لیکن دوسرا ان کی طرف ۔ اری میں کہتا کہ کھانا کھاتے وقت انٹلکچوئل باتیں بھی کرنی پڑیں تو کافی دقت ہوتی ہو گی۔ کھانے میں بھی اور گفتگو میں بھی۔ تبھی چند سو برس پہلے جاپان میں شوگناتے کے عہد میں یہ دستور تھا کہ ادبی تقریب میں شامل ہونے والے اپنے گھر سے کھانا کھا کر آیا کرتے تاکہ محض دانش ورانہ اور نفیس گفتگو پر توجہ دے سکیں۔ پھر رخصت ہوتے وقت میزبان انھیں لذیذ کھانوں کا پیکٹ پیش کرتا کہ اگلے روز اطمینان سے نوش فرمائیں۔

کوئی اس رسم کی تعریف کرتا کہ یہ سلسلہ جاری رہ سکتا تو بہتر ہوتا۔ اور یہ کہ کچھ اتنی دیر بھی نہیں ہوئی کہ اسے دوبارہ شروع نہ کیا جاسکے۔

فکر کی پسند ناپسند پر فقرے کسے جاتے۔ مثلاً یہ کہ جس لفظ کے آخر میں ist ۔ یا ism آتا ہو اس سے انھیں قطعاً دلچسپی نہیں رہتی۔

چناں چہ وہ فاشزم، مسمریزم ریڈ ٹیپ ازم، ہپناٹزم، مارکسزم سے بھی اتنے ہی کتراتے جتنا کہ سوشلسٹ، موٹر سائیکلسٹ امپیریلسٹ، سائینٹسٹ، انارکسٹ وغیرہ سے۔

فکر نامہ ایک طرح کا ذاتی ریکارڈ ہے۔

جی تو چاہتا ہے کہ اس میں سے بہت سارے چٹکلے نقل کیے جائیں لیکن یوں کیا تو کتاب کا کافی حصہ آؤٹ ہو جائے گا (جیسا کہ امتحان کا پرچہ آؤٹ ہو جاتا ہے) اس لیے محض گنی گنائی چیزیں یہاں درج کی ہیں۔

فکر صاحب لکھتے ہیں کہ:

○ "جملہ حقوق۔۔۔سب کے نام محفوظ"

برِ صغیر میں کاپی رائیٹ ایکٹ کی جو درگت ہوئی ہے اس کی اتنی عمدہ تشریح اس سے بہتر انداز میں کرنا مشکل ہے

○ "انتساب ـ ـ ـ ـ اپنے نام

انھوں نے کتاب اپنے نام معنون کی ہے اس لیے کہ بغیر اپنے عزم اور اپنی ہمت کے کتاب تو کیا ایک معمولی سا پمفلٹ بھی نہیں لکھا جا سکتا۔

○ "یعنی جنم ہی سے میرے اور دیوتاؤں کے تعلقات کشیدہ ہوگئے اور اب تک کشیدہ ہیں

ظاہر ہے کہ اس قسم کی بد گمانیاں یک طرفہ نہیں عموماً باہمی ہوا کرتی ہیں خصوصاً جب کہ دوسری پارٹی طاقت ور ہو۔

○ "بہن بھائیوں میں میرا ساتواں نمبر تھا۔ یعنی والد محترم کے لیے پیدائش صرف ہندسوں تک محدود تھی ـ ـ ـ ـ پانچواں، چھٹا، ساتواں ـ ـ ـ ـ نتیجہ یہ ہوا کہ دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ ہندسوں سے بھی میرے تعلقات بگڑ گئے۔ آج تک بگڑے ہوئے ہیں"

حالاں کہ فکر انگریزی اصطلاح کے مطابق Lucky Seven کے زمرے میں تھے۔

○ "جب بھاتو نے پوچھا۔ تمھیں شرم نہیں آتی ـ ـ

آتی ہے ـ ـ ـ ـ میں مسکرایا۔"

ایسے موقعوں پر یہ بالکل صحیح اور مخلص جواب ہے

○ "وہ چند ایک اوصاف حمیدہ کے مالک تھے اور چند ایک اوصاف حمیدہ کے مالک نہیں تھے۔ اس لیے بڑے متوازن انسان تھے۔" جنھوں نے ریاضی پڑھی ہے وہ اس Equation سے دگنا لطف اٹھائیں گے۔

○ "ہمارے دھوبی نے مرتے دم تک اپنا جنم دن منایا کیوں کہ انھیں عمر بھر پتہ ہی نہ چلا کہ وہ جنم لے چکے ہیں۔"

واقعی ان خطوں میں بے شمار لوگ ایسے ہوں گے جنھیں اپنی پیدائش برتھ ڈے کا نہ تو علم ہے اور اگر ہے بھی تو یہ نہیں جانتے کہ اس روز کیا کیا جاتا ہے۔

○ کسی کے پیچھے کتا لگاتے وقت ـ ـ ـ ـ "میں نے یہ سن کر اپنے کتے سے کہا کہ ان صاحب کو گھر چھوڑ آؤ ـ ـ ـ ـ" شائستگی کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔

○ "سال ہا سال کے تلخ تجربے کے بعد میں مایوس ہو گیا کہ میری بیوی سے کوئی عقل مندی سرزد نہیں ہو سکتی۔"

یہ پڑھ کر امریکی مزاحیہ ایکٹر گراؤچو مارکس یاد آجاتا ہے۔ جس نے بیوی کی اس شکایت پر کہ تم شادی کے بعد سرد مہری برتتے ہو یہ جواب دیا تھا کہ "تمھیں یاد ہوگا، میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ شادی شدہ عورتوں سے مجھے کوئی دل چسپی نہیں۔"

○ (فکر نامہ میں کنہیالال کپور پر بھی ایک مضمون ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے ان سے اکثر ملاقاتیں ہوا کرتیں۔ پھر وہ موگہ چلے گئے اور کئی برس کے بعد اپنے مجموعے "دلیل سحر" کو راقم الحروف کے نام معنون کیا۔۔۔اس مصرعے کے ساتھ:

میں وہی ہوں مومن مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

تحریروں اور طبیعت کی بشاشت ان کی نمایاں خوبی تھی۔ زندگی کی ناہمواریوں اور ناکامیوں کو وہ ہمیشہ مسکراہٹ کے لٹھ سے ہانکتے۔ حالات کتنے ہی ناگوار ہوتے ان کے رویے میں فرق نہ آیا۔ جس پر واٹر لو کی جنگ کا وہ انگریز نامی یاد آجاتا جس نے بے شمار لڑائیوں کے فاتح نپولین کو شکست کھانے کے بعد اپنی پیرس جانے والی بگھی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا، تو نعرہ لگایا۔ Come on Marshal . you cannot win them all. روایت ہے کہ نپولین نے یہ فقرہ سن کر سمجھ لیا تھا)

○ فنڈ کے لیے اپیل پر۔۔۔۔ "دوست نے اپیل کرتے وقت گیارہ روپے بھی دیے۔ دیکھتے دیکھتے دو ہزار اکٹھے ہوگئے، جن میں پچانوے روپے نقد تھے اور باقی کے وعدے تھے۔ ان پچانوے روپوں میں تین نوٹ پھٹے ہوئے تھے۔"

ایسے موقعوں پر یہی ہوتا ہے۔

○ "گیدڑ کو معلوم ہے کہ شہر میں اس کے کھانے اور رہنے کا کوئی بندوبست نہیں اور گائے اگر شہر کا بائی کاٹ کرکے جنگلوں میں سکونت اختیار کرے تو وہ بھی اتنی ہی خوفناک ہو سکتی ہے جتنا شیر اور بھیڑیا۔"

یعنی ہم نے اپنے مطلب کے لیے جو حیوان پالتو بنا رکھے ہیں ان کی اور جنگل میں مجبوراً رہنے والوں کی پوزیشن کسی وقت بھی Vice Versa ہو سکتی ہے۔

اور بھی بہت سی پھلجھڑیاں ہیں۔۔۔۔ مثلاً۔۔۔۔

○ "ہماری آبائی جائیداد دو کمروں والا ایک مکان ہے جو ہم نے کرائے پر لے رکھا ہے۔ یا پھر والدِ محترم کے قبضے میں ایک بہی کھاتا ہے جس میں درج ہے کہ ہمارے خاندان کے پاس ڈیڑھ سو ایکڑ زمین ہے جس پر آج کل ایک دریا بہہ رہا ہے۔ والدِ محترم گذشتہ گیارہ برس سے اس دریا کے سوکھنے کا انتظار کر رہے ہیں۔"

○ "برادرِ موصوف کا رنگ بچپن میں دودھ کی طرح گورا تھا تھا۔ ان دنوں وہ صرف دودھ پیا کرتا۔ لڑکپن میں گندمی ہو گیا کیوں کہ گندم کھانا شروع کر دیا۔ جوان ہوتے ہی سیاہی مائل ہو گیا۔۔۔۔ پتہ نہیں جوانی میں چوری چھپے اس نے کیا کھانا شروع کر دیا اور جب والد صاحب اسے برا بھلا کہتے تو لمحے بھر کے لیے رنگ پیلا پڑ جاتا۔ گویا وہ ہزار رنگا رنگ۔

آدمی تھا۔"

- "میرے کرایہ دار کا نام گجانند تھا۔ جو اگرچہ نامعقول نام تھا لیکن وہ منسٹر کا سفارشی خط لے کر آیا تھا۔"
- "مجھے ایک جیوتشی پنڈت رگھو بر دیال شاستری نے کہا تھا کہ تیری موت کسی اونچی جگہ سے گرنے سے ہوگی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میرے وارثوں کو چاہیے کہ اس جیوتشی کو پکڑ کر کسی اونچی جگہ سے گرادیں۔ تاکہ اس کا جیوتش اگر میرے حق میں صحیح ثابت نہ ہو تو اس کے حق میں ہی صحیح ثابت ہو جائے۔"
- "تم مجھے رشوت دے کر میرا ضمیر خریدنا چاہتے ہو؟" میں نے گرج کر کہا تھا۔ (ان دنوں میں کافی احمق تھا)
- "لیکن ڈنڈا بلی کی بجائے دودھ کی کڑھائی کو جا لگا۔ دودھ الٹ گیا۔ نہ بلی کے کام آیا نہ میرے۔ میں اور بلی دونوں بہت دیر تک کفِ افسوس ملتے رہے۔"
- "منی بس کے اڈے پر وہ رش تھا کہ کئی سواریوں کو تو اس دھکا پیل میں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ انھیں اترنا ہے یا چڑھنا ہے۔"

(۹)

پڑھنے والوں کی رائے میں مشرقی معاشرے پر لکھتے ہوئے فکر صاحب کی نگارش دن بہ دن نکھرتی جارہی ہے لیکن اتفاق سے مشرقی معاشرہ اسی رفتار سے بے تکا ہوتا جارہا ہے۔ یعنی میزان تقریباً برابر ہے۔

کوئی قنوطی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اس موضوع پر جوں جوں ان کی تحریریں بہتر ہوتی جائیں گی۔ شاید معاشرے کے حالات اور بھی ہونق ہوتے جائیں گے ـــــ لیکن اس میں فکر کا کوئی قصور نہیں ہوگا۔

کہنے کو تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ فکر کا پرانے مدرسہ۔ فکر سے تعلق ہے، کیوں کہ وہ اس صدی کے پہلے ربع میں پیدا ہوئے لیکن وہ Fifties کی نسل میں بھی شامل ہیں۔ اس لیے کہ ان کی شاعری اور نثر کے عمدہ حصے صدی کے وسط میں بھی چھپے اور فکر نامہ چوں کہ ابھی شائع ہوا ہے۔ اس لیے ان کا عہدِ جدید سے بھی پورا واسطہ ہے۔

مضمون یہاں تک پہنچا تھا کہ ایک دوست نے ٹوکا کہ یہ کافی طویل ہو گیا ہے۔ ساتھ ہی بتایا کہ لکھنے والے کو اپنی خامیوں کا اعتراف نہیں کرنا چاہیے اور یہ بھی کہ ایسا مضمون فنِ تعارف نویسی کو برسوں پیچھے لے جاسکتا ہے، یا پھر کسی اور سمت میں۔ (بہ شکریہ نیرنگِ خیال)

شفیق الرحمٰن

فاسٹ باؤلر

فاسٹ کا مطلب ہے تیز اور باؤلر کا مطلب ہے گیند پھینکنے والا۔ بس سمجھ لیجیے کہ ان دونوں کا مطلب ہوا۔ تیز گیند پھینکنے والا۔ فاسٹ باؤلر وہ انسان ہے جو وکٹوں سے بیس پچیس قدم سے ہی یک لخت دوڑنا شروع کردیتا ہے اور وکٹوں کے پاس آکر اس کی حالت قابلِ رحم اور صورتِ حال قابلِ دید ہوجاتی ہے۔ وہ پانچ چھ قدم پرے سے ہی ایک لمبی چھلانگ لگاتا ہے اور بے تحاشا گھما کر گیند کو کھلاڑی کے منھ پر دے مارتا ہے۔ اور پھر کچھ دور تک اپنے ہی زور میں بھاگتا چلاجاتا ہے۔ ادھر یا تو وکٹ اڑتی دکھائی دیتی ہے یا دھپ سے گیند کھلاڑی کے لگتی ہے اور یا وہ شان دار باؤنڈری لگتی ہے کہ گیند پورے گیارہ آدمیوں کے روکنے سے بھی نہیں رکتی۔ فاسٹ باؤلر کو اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کوئی کھلاڑی اڑجائے اور آؤٹ ہونے کا نام ہی نہ لے۔ دوسرے الفاظ میں کھلاڑی کو ڈرانے کی کوشش کی جاتی ہو۔ اگر میدان میں بارش ہوگئی ہو یا تھوڑی سی بھی نمی ہوتو فاسٹ باؤلر صاحب کا ذرا سا بھی بس نہیں چلتا۔

جن دنوں کا میں یہ قصہ بیان کرتا ہوں ان دنوں میں بھی بدقسمتی سے اسی طبقے میں شمار ہوتا تھا جسے فاسٹ باؤلرز کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

میں ایک سالانہ امتحان میں بیٹھا اور اتفاق سے پاس بھی ہوگیا۔ اب مجھے دوسرے شہر میں بھیجا گیا۔ رہنے کو تو ہاسٹل ہی میں رہتا تھا مگر مجھے ایک صاحب کی نگرانی میں رکھا گیا۔ ان کے ہم لوگوں سے بہت پرانے تعلقات تھے۔ انھوں نے بہت سال پہلے مجھے چھوٹا سا دیکھا تھا اور اب وہ مجھے بڑا سا دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ انھیں خان صاحب کا خطاب ملا تھا۔ کوئی پچاس پچپن سال کی عمر، خدا جھوٹ نہ بلائے کم از کم آٹھ دس عینکیں استعمال کرتے تھے اور عینکیں بھی ایسی کہ ایک کے اوپر دوسری فٹ ہوتی چلی جاتی تھی۔ پڑھتے وقت ایک عینک پہلی عینک پر لگائی اور جواب دے دیا۔ کوئی بچہ دور چلایا۔ انھوں نے نمبر دو عینک اتاردی اور کوئی اور عینک لگائی اور اس کی طرف دیکھ کر اسے موقع کے مطابق دھمکایا یا چمکارا، کھانا کھاتے وقت کوئی اور عینک لگتی تھی۔ سینما میں کوئی اور۔

مجھے ان کے گھر ہفتے میں کم از کم تین مرتبہ حاضری دینی پڑتی تھی اور اتوار کو صبح موٹر میں کنبے کے ساتھ کہیں باہر سیر سپاٹے کو اور شام کو سینما ساتھ جانا ہوتا تھا۔ وقت بہت

اچھا کٹ جاتا تھا ۔ خان صاحب اور ان کی بیگم مجھے بہت پیار کرتے تھے ۔ بچے مجھ پر عاشق تھے ۔ مگر جہاں یہ سب کچھ تھا وہاں میں ایک ہستی سے بہت ڈرتا تھا ۔ یہ ان کی بڑی لڑکی تسنیم تھی ۔ اگر مجھ سے چھوٹی نہیں تو غالباً برابر عمر کی ہوگی ۔

اب میرا فرض ہے کہ میں اس کی شکل بھی بتاؤں ۔ سو عرض ہے کہ نہ تو اس کی بھنویں کمان کی طرح تھیں نہ اس کی پلکیں تیر کی طرح ۔ نہ اس کی گردن کئی فٹ لمبی تھی اور نہ اس کی آنکھیں کٹورے کی طرح تھیں اور چار چار انچ چوڑی بھی نہ تھیں اور ہاں میں شاعر حضرات سے معافی چاہتا ہوں اس کے لب بھی تھے جن پر مجھے نہ تو کبھی مسیحائی نظر آئی اور نہ کبھی خون دکھائی دیا ۔ کئی سال پہلے میں اور وہ ساتھ کھیلا کرتے تھے ۔ اتنی مدت کے بعد میں ان کے ہاں گیا ۔ اس نے مجھے دیکھا اور میں نے اسے ۔ اسے دیکھ کر ہی نہ میرا دل بے تحاشا دھڑکتا ہوا سینے سے باہر آپڑا اور نہ ہی میری روح آنکھوں میں کھنچ کر آئی مگر وہ مجھے اچھی ضرور لگی ۔ اب یہ بات اور ہے کہ اس جذبے کو شاعرانہ طریقے سے بیان کیا جائے کہ جب میں نے اسے پہلے پہل دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ زہرہ زمین پر اتر آئی ہے ۔ میرا دل تھرتھرایا ۔ میں ڈرا کہ کہیں تھم نہ جائے ۔ میں اس حسین شعلے کی تاب نہ لاسکا اور بھسم ہوگیا ۔ مجھے یک لخت محسوس ہوا کہ میرا دل غائب ہوچکا ہے ۔ صرف شریانیں باقی رہ گئی ہیں ۔ جگر میں کسی نے دیا سلائی دکھا دی ہے ۔ پھیپھڑے زخمی ہوچکے ہیں ۔ گردوں نے اپنا کام چھوڑ کر ہڑتال شروع کردی ہے وغیرہ وغیرہ ۔

وہ لڑکیوں کے کالج میں پڑھا کرتی تھی ۔ اپنی جماعت میں بڑی لائق تھی ۔ ویسے بھی اس میں بہت خوبیاں تھیں مگر سب سے بڑی برائی یہ تھی کہ وہ مجھے ہر وقت چھیڑتی رہتی تھی ۔ اس قدر تنگ کرتی کہ میں بسورنے لگتا ۔ اس طریقے سے ستاتی کہ اس کی باتیں صرف مجھے ہی چبھتیں اور کسی کو پتہ بھی نہ چلتا ۔ سب لوگ بیٹھے ہوئے ہوتے ۔ میں کوئی دلچسپ بات سناتا ۔ جب میں بات ختم کرنے لگتا تو وہ مسکرا کر کہتی ۔ "اچھا ، بس یہی بات تھی ؟" یا "اوہو ، اب پتہ چلا ہمیں خوب ۔" اب آپ خود ہی خیال فرمایئے کہ اگر میری جگہ آپ ہوتے تو کس قدر کوفت ہوتی آپ کو ۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میں کسی میچ کا کارنامہ سنا رہا ہوں ۔ کچھ سچ ہے کچھ جھوٹ ۔ خان صاحب غور سے سن رہے ہیں ۔ میں سینہ پھلا کر کہتا ہوں ۔ "اجی مجھے انھوں نے بالکل آخر میں بھیجا اور ابھی پچاس رنز باقی تھیں ۔ ہار سامنے نظر آرہی تھی ۔ میں نے پہلے تو گیندیں روکیں ۔ باؤلرز کو تھکا دیا اور پھر جو ہٹیں لگانی شروع کی ہیں تو بس ۔ ۔ ۔ ۔"

" اتنے میں آنکھ کھل گئی ؟" وہ بولی ۔ خان صاحب نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا جس میں ان کی بہت سی عینکیں ناک سے پھسل گئیں ۔ کنبے کا کنبہ ہنسنے لگا اور میں کھسیانا سا

ہو کر رہ گیا ۔ جب میں کوئی عقل مندی کی بات شروع کرتا تو وہ میرے بچپن کے واقعات دہراتی ۔ ۔ ۔ اور میری بات فورا ہنسی میں اڑجاتی ۔ غرض یہ کہ میں اس لڑکی سے تنگ آگیا تھا ۔ آخر سوچ کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ بس اب ان کے گھر آنا جانا بند کردیا جائے ۔ ابھی چار روز ہی اس طرح گزرے ہوں گے کہ پانچویں روز خان صاحب مع کار کے ہوسٹل میں آئے اور مجھے لے گئے ۔

ایک روز کا ذکر ہے میں میچ کھیل کر واپس آیا ۔ دیر کافی ہوچکی تھی اور خان صاحب کے ہاں حاضری بھی دینی تھی ۔ بغیر کپڑے تبدیل کیے چلا گیا ۔ وہ بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے ۔ مجھے دیکھ کر جھٹ سے عینک بدلی اور بولے ۔

آؤ بیٹا ! تمھارے بارے ہی میں سوچ ساچ رہا تھا میں اور تسنیم بھی تمھارا انتظار انتظور کررہی تھی ۔

میں نے سلام کیا اور قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا ۔ انھوں نے جلدی سے عینک بدلی اور بولے ۔

آج تم کچھ دبلے دبلے سے دکھائی دیتے ہو ۔"

"کیا سچ مچ دبلا دکھائی دیتا ہوں ؟ بھلا دو روز میں کس طرح دبلا ہوگیا ہوں ؟ " میں نے اپنا جائزہ لیتے ہوئے کہا ۔

" ہاں تھکا ہوا ضرور ہوں ۔ صبح سے میچ کھیلتا رہا سارا دن بھاگنا پڑا ہے ۔ "

" اور ہاں بھئی ایک بات تو میں بالکل بھول گیا تھا ۔ وہ یہ کہ اس میچ سے فائدہ کیا ہے آخر ؟ صبح سے شام تک بھاگتے رہتے ہو ۔ اور سچ پوچھو تو مجھے یہ کرکٹ ورکٹ پسند ہی نہیں ۔ ایک آدمی کھیل رہا ہے اور دوسری طرف کے گیارہ کے گیارہ آدمیوں کا دل بے ایمان ہے ۔ دل میں دعاء مانگ رہے ہیں کہ یہ کم بخت کہیں آؤٹ واؤٹ ہو تو گھر چلیں ۔"

" اجی برا تو مجھے بھی لگتا ہے ۔" میں نے اوپری دل سے کہا ۔ " مگر کیا کروں اب ایک دفعہ شروع کردیا ہے تو چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا ۔"

" اچھا تو گویا یہ بھی کوئی شراب شروب ہوئی کہ کم بخت چھٹتی ہی نہیں کیوں ؟ " انھوں نے ایک قہقہہ لگایا ۔

" اور ہاں یہ تو بتاؤ کہ تم کھیلتے کھوتے کیسے ہو ؟ "

" اجی کیا خاک کھیلتا ہوں ۔ بس گیند پھینکتا ہوں ۔ "

" کیا باؤلر ہوئے تم ؟ ایں ؟ "

"جی ہاں، فاسٹ باؤلر۔" میں نے ذرا رعب سے کہا۔

"تو میاں تمھارا میچ ضرور دیکھیں گے کبھی مگر ذرا اسٹائل اسٹوئیل تو دکھاؤ اپنا۔"

"تو کیا یہیں کمرے میں دکھاؤں؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"ہاں اس میں حرج ہی کیا ہے۔ دیکھیں تو سہی تم کیسے گیند وینڈ پھینکتے ہو۔" انھوں نے جلدی سے دوسری عینک بدل دی۔

میں ہنستا ہوا اٹھا اور دروازے تک قدم گنتا ہوا گیا۔

"دیکھیے جی، فرض کیا کہ یہ گیند ہے۔" میں نے ان کے دیا سلائی کے بکس کو ہاتھ میں لے کر کہا۔ "ویسے تو میں بہت دور سے بھاگ کر آیا کرتا ہوں مگر وکٹوں کے پاس آکر گیند۔۔۔ اس طرح۔۔۔ پھینکتا ہوں۔"

میں نے ہاتھ گھمایا اور بکس کو دوسرے دروازے پر دے مارا۔

"بہت خوب!" یہ آواز تسنیم کی تھی۔ میرے دیوتا کوچ کر گئے۔

"دیکھا ابا جان آپ نے، اس کا نام ہے باؤلنگ!" وہ پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوئی۔ میں وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ لاحول ولا قوۃ، گویا یہ ایک ہفتے تک کی چھیڑ خوانی میں نے خود ہی مول لے لی تھی۔ اگلے روز میرا نام فاسٹ باؤلر رکھ دیا گیا۔ گھر میں بچوں سے بھی کہ دیا گیا کہ وہ مجھے بھیا کے بجائے فاسٹ باؤلر کہا کریں۔ گھر کے طوطے کو پورے ایک ہفتے کی محنت کے بعد فاسٹ باؤلر خوش آمدید سکھایا گیا۔ میری جتنی کتابیں ان کے ہاں پڑی تھیں ان سب پر فاسٹ باؤلر لکھ دیا گیا۔

اگلے ہفتے ہمارا کسی دوسرے کالج سے میچ تھا۔ میں نے بہت ٹالنے کی کوشش کی۔ مگر خان صاحب اپنی بات پر اڑے رہے کہ میچ میں وہ بھی آئیں گے اور تسنیم بھی آئے گی۔ میں نے بہت سے دلائل پیش کیے۔

"بھلا لڑکیاں بھی کرکٹ میچ میں آتی ہیں؟"

"جس چیز میں دل چسپی نہیں اس کے دیکھنے سے فائدہ؟"

"ان کا امتحان نزدیک ہے۔ کیا ضروری ہے انھیں ایک دن ضائع کرنا؟"

جس پر جواب ملا۔ ہم دیکھیں گے اور ضرور دیکھیں گے۔ خواہ آپ کھیلیں یا نہ کھیلیں۔ آپ میچ میں کتنی ہی فاسٹ باؤلنگ کیوں نہ کریں آپ کو ایک وکٹ بھی نہیں ملے گی۔ آپ خود ہی خیال فرمائیے بھلا میں کیا جواب دیتا۔

خیر! میچ والا دن بھی آیا۔ میں دعا مانگ رہا تھا کہ ہمارے شروع کے کھلاڑی ذرا جم جائیں اور شام تک کھیلتے رہیں۔ خان صاحب وغیرہ آئیں گے ان کا کھیل دیکھ کر چلے جائیں

گے ۔ نہ میرے کھیلنے کی باری آئے گی اور نہ بولنگ کی مگر سارا کام الٹ پلٹ ہوگیا ۔ شروع کے کھلاڑی بہت جلد رحلت فرما گئے ۔ اب ہم آخیر کے اناڑی رہ گئے ۔ مجھے انھوں نے نویں نمبر پر بھیجا ۔ میں نے اچھی طرح چاروں طرف دیکھا ۔ خان صاحب کی کار کا نام و نشان تک بھی نہ تھا ۔ میں نے کھیلنا شروع کیا ۔ گیندیں روکتا رہا ۔ روکے گیا ۔ کھیل کا رنگ ہی بدل گیا آہستہ آہستہ رنز بھی ہورہی تھیں ۔ ہم دونوں نے مل کر اسکور ساٹھ سے سو تک پہنچادیا ۔ لوگ ہر ایک ہٹ پر شور مچاتے تھے ۔ ہمارے کالج کے لڑکے مارے خوشی کے ناچ رہے تھے ۔ یکایک میری نگاہ خان صاحب کی کار پر پڑی جو سامنے آرہی تھی ۔ انھوں نے کار کو دور ہی ٹھہرالیا اور لگے جھانکنے ۔ غالباً عینک ضرور بدلی ہوگی ۔ پچھلی سیٹ پر کھڑکی میں سے کچھ نیلی نیلی چیز نظر آرہی تھی ۔ یہ تسنیم تھی ۔

میں بوکھلا سا گیا ۔ پہلے ہی جانتا تھا کہ ان لوگوں کے سامنے کھیل نہ سکوں گا ۔ کیا تو میں بڑھ بڑھ کر ہٹیں لگا رہا تھا اور کیا ایک دم گیندیں روکنا شروع کردیں ۔ دو گیندیں ہی روکی تھیں کہ تیسری گیند زناٹے سے آئی ۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا وکٹ غائب ، لاحول ولا قوہ ، مجھے جس بات کا ڈر تھا آخر وہی ہو کر رہی ۔ میرے آؤٹ ہونے سے دوسرے ساتھی کی ہمت کچھ ٹوٹ سی گئی ۔ دسویں صاحب نے جاتے ہی بلا گھمایا اور خودکشی فرمالی ۔ یعنی خود ہی بلا وکٹوں میں مارلیا، گویا باؤلر سے یہ کہا کہ بھیا تو کیوں ناراض ہوتا ہے ہم تو خود ہی چلے جاتے ہیں ۔

تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں ۔ گیارھویں حضرت بھی سستے ہی چھوٹ گئے ۔

اب رن کی باری تھی ۔ ہمارے کپتان نے میرے ہات میں نئی گیند دی اور کہا ، "مولانا ، اب ہماری جیت ہار تمھارے ہاتھ ہے ۔ آج پورا زور لگا دو ۔ " میں نے کار کی طرف دیکھا ۔ ایک جھر جھری سی آگئی ۔ دل میں خیال آیا کہ اگر یہ کار یوں ہی نظر آتی رہی تو آج کچھ بھی نہ ہوسکے گا اور سارا کیا کرایا خاک میں مل جائے گا ۔ میچ شروع ہوا ۔ میرے قدم ڈگمگارہے تھے میں نے آیۃ الکرسی پڑھی، پھر ایک گلاس پانی پیا ۔ دل کو تسلی دی اور وکٹوں سے قدم گن کر فاصلہ بنایا ۔ بولنگ شروع کی ۔ وکٹوں کے پاس آکر قدم غلط ہوگئے اور ایک عجیب و غریب اسٹائیل سے میں نے گیند پھینکی جو کھلاڑی کے تین فٹ ادھر سے نکل گئی ۔ " وائڈ بال ، " امپائر چلایا اور لوگوں نے قہقہے لگانے شروع کردیے ۔ " بہت اچھے " شاباش ایسے ہی گیند پھینکو ، "

" ارے واہ رے میرے شیر ، کیا گیند پھینکی ہے ۔ نثار کو مات کردیا ہے اس وقت تو ، "

خیر ، دوسری گیند ذرا ٹھیک پڑی ۔ مگر اس پر کھلاڑی نے وہ زناٹے دار ہٹ لگائی ہے کہ گیند درختوں کے اوپر سے گزر گئی ۔ ایک شان دار چھکا (Sixer) پڑا ۔ لوگوں نے وہ شور مچایا کہ خدا کی پناہ ، تیسری گیند پھینکتے پھینکتے میں وکٹوں کے پاس آکر رک گیا ۔ چوتھی پر میرا پیر پھسل گیا اور گیند کھلاڑی کے سر کے اوپر سے گزر گئی ۔ غرض یہ کہ میرے دو اوورں (Overs) میں اسکور تیس ہوگیا ۔ کار بدستور کھڑی تھی ۔ تیسرے اودر میں میں نے پہلی گیند ذرا آہستہ سے پھینکی ۔ کھلاڑی اچھی طرح نہ سمجھ سکا ۔ گیند سیدھی وکٹوں میں گئی ۔ میدان تالیوں سے گونج اٹھا ۔ ان کا کپتان آوٹ ہوگیا تھا ۔ میں نے فاتحانہ نگاہوں سے کار کی جانب دیکھا مگر کار غائب تھی ۔ وہ لوگ پہلے ہی چلے گئے تھے ۔ ایسا دل چاہا کہ خودکشی کرلوں ۔

اب جو جھنجھلا کر میں نے بولنگ شروع کی ہے تو وکٹوں کا تانتا بندھ گیا ۔ دوسرا ، تیسرا ، چوتھا غرض یہ کہ ساری ٹیم پچاس رنوں میں آوٹ ، ہم جیت گئے تھے ۔ سات وکٹیں میری تھیں ۔ مگر یہ سب کچھ فضول تھا ۔ اسی افسوس میں اس روز میں ان کے ہاں نہیں گیا ، دوسرے روز اتوار تھا ۔ سہ پہر کو ڈرتے ڈرتے پہنچا ۔ سارا کنبہ بیٹھا ریڈیو سن رہا تھا ۔ خان صاحب دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے ۔ "ارے تم صبح کیوں نہیں آئے آج ؟ آج ہم تمہاری وجہ سے کہیں سیر پر بھی نہیں گئے ۔"

افوہ ، بڑا افسوس ہے آپ چلے جاتے ۔ میرا انتظار ناحق کیا آپ نے ۔" اس نے بہ دستور سر جھکائے رکھا ۔

"جب تک کوئی فاسٹ باولر ساتھ نہ ہو تب تک سیر کا کیا لطف آسکتا ہے کیوں ابا" تسنیم بولی ۔

"تم کچھ رنجیدہ رنجیدہ سے معلوم ہوتے ہو ۔ کیا ہوا جو ایک میچ میں وکٹیں نہ ملیں ۔ میں تو پھر یہی کہوں گا کہ یہ کرکٹ ورکٹ فضول ہے بالکل ۔"

جی میں آیا کہ کہہ دوں ۔ "جناب سات وکٹیں لی ہیں سات" ۔ مگر پھر تسنیم کا ڈر لگا کہ سمجھے گی کہ جھوٹ بول رہا ہے اور دوگنا مذاق اڑے گا ۔

"ہاں کیا ہوا جو کھلاڑی آوٹ نہیں ہوئے ۔ یہ ان کا قصور تھا ۔ ویسے آپ کا اسٹائیل تو ماشاء اللہ نہایت ہی لاجواب تھا ۔" وہ بولی ۔

"بس اب چپ بھی کر خواہ مخواہ ستارہی ہے ۔ بھولے بھالے بچے کو ۔" اس کی والدہ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ۔

"بہت یاد آیا ابا جان ! آج آسٹریلیا اور انگلینڈ کے کرکٹ میچ کو نشر کیا جارہا ہے ۔

اگر فرمائیں تو بدلوں اسٹیشن ۔"

یہ کہہ کر خود ہی اسٹیشن بدل دیا ۔ آواز آئی " ابھی ابھی کچھ بارش سی ہوئی تھی ۔ جس سے زمین گیلی ہے اوریلی اور وریٹی سے لوگوں کو بہت کچھ امیدیں ہیں ۔ مگر دونوں ٹیموں کے فاسٹ باؤلر آج کچھ بھی نہیں کرسکتے ۔" فاسٹ باؤلر کا نام آتے ہی سرگوشیاں شروع ہوگئیں ۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ آگئی ۔ ایک بچہ تو ٹھس ٹھس اور ہی ہی کی حد سے باہر نکل گیا ۔ اور کھلکھلا کر ہنس پڑا ۔ غصے سے میرا منھ سرخ ہوگیا ہوگا ۔ میں اٹھ کر چلنے ہی لگا تھا مگر اس نے جلدی سے ریڈیو بند کردیا ۔ "آپ براماں گئے ؟ لو بھئی بچو ! خبردار ، جو آئندہ کسی نے بھی انھیں فاسٹ باؤلر کہا ہے تو ۔"

خان صاحب نے جلدی سے عینک بدلی اور بولے ۔ "بس تسنیم اب تم اپنے کمرے میں جاکر کپڑے بدلو ۔ سینما میں دیر ہورہی ہے ۔" وہ چلی گئی پھر میری طرف مخاطب ہوکر کہنے لگے ۔ " تم اس کے کہنے کا ذرا بھی خیال نہ کیا کرو ۔ دوپہر سے تمھارا انتظار کرتی رہتی ہے ۔ گھڑی گھڑی دروازے تک جاتی ہے ۔ کئی دفعہ شوفر سے کہتی ہے کہ وہ تمھیں لے آئے اور پھر جب تم آجاتے ہو تو تمھیں چھیڑتی ہے ۔ عجیب لڑکی ہے ۔"

" ہاں عجیب لڑکی ہے ۔" میں نے دل میں دہرایا ۔

ہم لوگ سینما ذرا دیر سے پہنچے ۔ نیوز دکھائی جارہی تھیں ۔ بد قسمتی سے وہاں بھی کسی کرکٹ میچ ہی کا قضیہ تھا ۔ انگلینڈ کے فاسٹ باؤلر فارنز کو گیند پھینکتے ہوئے دکھایا جارہا تھا ۔ آواز آئی ۔

" یہ ہیں فارنز ، جو زمانہ ، حاضرہ کے بہترین فاسٹ باؤلر ہیں ۔" میں چوکنا سا ہوگیا اور کن انکھیوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا ۔ کہ کہیں کوئی ہنس تو نہیں رہا ۔ پچھلی قطار سے تسنیم نے آگے سر نکال کر میرے کان کے قریب کہا ۔ " دیکھیے میں نہیں ہنس رہی ہوں پھر بھی آپ کہہ دیں " میں اٹھ کھڑا ہوا ۔ خاں صاحب نے جلدی سے عینک بدلی اور میری طرف دیکھ کر بولے " یہ تم کہاں جارہے ہو ؟ "

" ابھی آیا ۔ یہ کہہ کر وہاں سے جو دوڑا ہوں تو ہوسٹل آکر دم لیا ۔ ساری رات مجھے نیند نہ آئی ۔ آخر اس لڑکی کا مطلب کیا ہے ؟ اسے مجھ سے نفرت ہے کیا ؟ مجھے چھیڑتی ہے ۔ دوسروں کے سامنے شرمندہ کرکے خوش ہوتی ہے

جانتی ہے کہ فاست باؤلر کے نام سے میں چڑتا ہوں ۔ پھر بھی جان بوجھ کر بار بار یہی دہراتی ہے اس لیے کہ کٹ ہوں ۔ مگر پھر یہ میرا انتظار

بھی کرتی ہے ۔ آخر کیا معمہ ہے یہ ؟ ۔ ۔ ۔ میں بہت دیر تک سوچتا رہا ۔ پھر جی میں خیال آیا کہ کل کہہ دوں گا ۔ دیکھیے صاحب ، بچہ میں نہیں جس سے آپ کھیلتی رہیں ۔ جہاں تک میرا خیال ہے میں بے وقوف نہیں ہوں ۔ اس لیے آپ مجھے معاف کردیں ۔ ورنہ میں آپ کے ہاں آنا جانا بند کردوں گا ۔ مگر پھر مجھے ہنسی آئی ۔ لاحول ولا قوہ ۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی ایک لڑکی سے اس قسم کے الفاظ کہوں گا ۔ اور پھر ایک ایسی لڑکی سے جو اتنی پیاری ہے ۔ نیلے لباس میں تو سچ مچ گڑیا سی معلوم ہوتی ہے ۔ کتنی بھولی بھالی سی دکھائی دیتی ہے اور جب چھیڑتی ہے تو کیسا شرارت آمیز تبسم لبوں پر ہوتا ہے ۔ مجھے غصہ ضرور آتا ہے مگر اس میں پیار بھی ہوتا ہے اگر کئی روز ان کے گھر نہ جاؤں تب اداس سا ہوجاتا ہوں ۔ پھر دل میں گد گدی سی آٹھتی ہے کہ کوئی چھیڑے ۔ کوئی فاسٹ باؤلر کہے ۔ اسے ضرور میرا کچھ خیال ہے ۔ تبھی تو وہ انتظار کرتی رہتی ہے مگر ۔ ۔ ۔ یہ بعض اوقات اجنبیوں کی سی باتیں ۔ ۔ ۔ کیا مطلب ہے ان کا ۔ واقعی وہ عجیب لڑکی ہے ۔ خیر صاحب ، کچھ بھی ہو اب ان کے گھر نہیں جاؤں گا ۔

بابا اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے ۔ وہاں بچے سے بوڑھے تک سب مجھ پر ہنستے ہیں اور ادھر میں ہوں کہ تیسرے روز بڑے اطمینان سے وہاں پہنچ جاتا ہوں ۔ ۔ ۔ مجھے پتہ نہیں میں کب سوگیا ۔

ایک ہفتہ تک میں ان کے ہاں نہیں گیا ۔ خاں صاحب بھی آئے ۔ شوفر بھی بار بار موٹر لے کر آیا ۔ مگر میں پہلے تو مصروفیت کا بہانہ پیش کرتا رہا اور پھر شام کو ہوسٹل سے ہی غائب رہنے لگا ۔

ایک روز علی الصبح میں نہاکر آیا تھا اور کالج جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ کسی نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا ۔ میں نے دیکھا تو ایک چھوٹا سا لڑکا کھڑا تھا " کیا ہے ؟ " میں نے پوچھا

" کیوں، تیس نمبر کمرہ یہی ہے نا ؟ "

" ہاں یہی ہے ۔ "

" اور ایک چھ فٹ کے گورے سے لڑکے آپ ہی ہیں نا ؟ "

" جی تیس نمبر کمرے میں ایک لمبے سے گورے سے مضبوط سے ۔ ۔ ۔ "

" کیا بیہودہ بکواس ہے ؟ آخر کیا نام ہے اس لمبے سے لڑکے کا ؟ "

" اجی نام تو مجھے بھی معلوم نہیں ۔ آنا چا میں نے بتا ہی دیا ہے ۔ انھیں بابر کوئی صاحب بلا رہے ہیں ۔ "

" اس میں تیرا نقصان کیا ہے ذرا پھر سے یاد کرکے بتا ۔ دیکھ نہ بھیا بڑا اچھا ہے

تو۔" میں نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

وہ آہستہ سے دروازے سے نکلا اور یکلخت بھاگ پڑا۔ پھر پیچھے مڑکر بولا۔" فاسٹ باؤلر" ۔۔۔ میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگا اور سڑک تک بھاگتا ہوا چلا گیا۔ ہوسٹل کے دروازے پر خاں صاحب کی کار کھڑی تھی۔ وہ دوڑ کر اس میں گھس گیا۔ میں ٹھہر گیا۔ کھڑکی میں سے ایک سفید سی کلائی اور ایک نازک ہاتھ نکلا اور مجھے اشارہ کیا۔ میں آگے بڑھا۔ یہ تسنیم تھی۔" سنیے تو ذرا۔" میں نے اپنے اوپر نگاہ ڈالی۔ ماشاء اللہ کیا حلیہ تھا۔ ایک ہاتھ میں ٹائی۔ دوسرے میں کالر کا بٹن۔ گریبان کھلا ہوا۔ بال بکھرے ہوئے۔

"ذرا ادھر تو آئیے۔" میں کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔

"آپ اتنے روز سے کیوں نہیں۔۔۔؟"

میں چپ رہا۔

"بتلائیے نا، دیکھیے ہم لوگ بہت اداس رہے۔ ارے یہ خون سا کہاں سے آگیا۔ آپ کے چہرے پر؟" اس نے اپنے ننھے سے رومال کو میرے گال پر پھیرتے ہوئے کہا۔

"ابھی حجامت کی تھی میں نے،"

"حجامت کی تھی؟۔۔۔ کس کی؟"

"اپنی!۔۔۔ اور کس کی؟۔۔۔" میں ہنس پڑا۔۔۔ وہ بھی ہنس پڑی۔

"تو آج آئیں گے نا آپ؟"

"جی نہیں، میں نہیں آنے کا۔"

"جی نہیں، ضرور آئیں گے آپ؟" اس نے بالکل میری نقل اتارتے ہوئے کہا۔

"میں کالج جارہی ہوں۔ چلیں گے آپ؟"

"کیا آپ کے کالج چلوں؟"

"جی نہیں، چلیے آپ کے کالج میں چھوڑتی جاؤں آپ کو۔"

"مگر میرا حلیہ تو ملاحظہ ہو ذرا۔۔۔" کار چل دی۔ اس نے رومال ہلایا۔ میں نے ٹائی ہلا دی۔

میں پھر پہلے کی طرح جانے لگا۔ مگر جلدی ہی ایک عجیب سا حادثہ پیش آیا۔

بات یوں تھی کہ خاں صاحب کے ہاں بہت فری پاس آیا کرتے تھے۔ یوں تو ہر اتوار کو میں ان کے ساتھ سینما جایا کرتا تھا۔ مگر دوسرے روز ان کے ہاں سے پاس بھی اکٹھے کر لاتا تھا۔ یار دوست بھی خوب بل گئے تھے۔ ہر روز ان کا یہی تقاضا رہتا تھا کہ پاس لاؤ۔"

ایک بہت اچھی پکچر لگی ہوئی تھی ۔ مجھ پر بڑا دباؤ ڈالا گیا کہ پاس لاؤں ۔ میں خاں صاحب کے ہاں پہنچا تو وہ باہر گئے تھے ۔ میں واپسی پر باغ میں سے گزر رہا تھا ۔ سامنے تسنیم گلاب کے قطعے میں کرسی پر بیٹھی ہوئی کچھ پڑھ رہی تھی ۔ گلابی ساڑی پہن رکھی تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی ایک گلاب کا پھول ہے ۔ اس نے مجھے روک لیا ۔ " اتنی جلدی واپس کیوں جا رہے ہیں آپ ؟ " یہ کہہ کر اس نے ایک پھول ہاتھ میں لے کر ہاتھ گھمایا اور پھول ایسے پھینکا جیسے بولنگ کرتے ہوں ۔

" ایک کام تھا خاں صاحب سے ! " میں بولا ۔

" بہت اچھا ، جاسکتے ہیں آپ ! " ۔ ۔ ۔ میں حیران رہ گیا کیا بدتمیزی تھی یہ ۔ اس طرح بھی کوئی باتیں کرتا ہے ۔ میں نے سائیکل سنبھالی ۔ مگر پھر خیال آیا کہ اگر پاس نہ لے گیا تو وہ جو چار پانچ حضرات انتظار کر رہے ہیں ۔ وہ کیا کہیں گے ۔

" دیکھیے ذرا مجھے پاس لا دیجیے ! "

" ہمیں پاس واس کا کچھ پتہ نہیں ۔ کہاں پڑا ہے کہاں نہیں ۔ آپ زیادہ سینما دیکھا نہ کیجیے ۔ دن بھر آپ باؤلنگ کرتے رہتے ہیں ۔ رات کو پڑھا کیجیے سمجھ گئے آپ ، اور پھر بڑوں کا کہنا ضرور ماننا چاہیے چھوٹوں کو ۔

" اوہ ، تو گویا بڑی ہیں آپ ۔ لاحول ولا قوۃ ! "

" کیوں اس میں لاحول ولا کی کیا بات ہوئی ؟ سچ کہتی ہوں ۔ "

" خیر غور کیا جائے گا اس پر ، کل سے پڑھا کریں گے ۔ ذرا پاس تو لا دیجیے ۔ "

" آج ابا جان بھی سینما جانے کو کہہ رہے تھے ۔ انھوں نے پوچھا ۔ پاس کہاں ہے پھر ۔ ۔ ۔ ؟ "

" مگر ان سے تو سینما میں کوئی پاس نہیں مانگنے کا ۔ دیکھیے لا دیجیے ! "

" بہت اچھا مگر ۔ ۔ ۔ ! " وہ ہنس پڑی ۔ ۔ ۔ اور اندر سے پاس اٹھا لائی میں لے کر چل دیا ۔

میں نے سائیکل چلائی تھی کہ خاں صاحب کی کار کوٹھی میں داخل ہوئی انھوں نے مجھے جھٹ سے روک لیا ۔

" چائے وائے پی کر جانا بھئی ! " وہ بولے ۔ میں نے جلدی سے ایک پیالی پی اور اٹھا ہی تھا کہ تسنیم بولی ۔

" ابا جان نہ معلوم یہ آپ کے سینما کے پاس کون چرا لے جاتا ہے ۔ ہر روز ؟ "

" لے جاتا ہوگا کوئی کم بخت ! " خاں صاحب بولے " اور میں کون سا روز کھیل ویل دیکھتا

ہوں ۔"

"مگر ابا سوچیے تو سہی آج کسی نے پاس چرایا ہے تو کل کوئی اور چیز چرالے گا ۔"

ادھر میرا حلق خشک ہورہا تھا ۔ میں نے اس کی طرف بڑی بے بسی سے دیکھا مگر کیا مجال جو اس پر اتنا سا بھی اثر ہوا ہو ۔

"تو پھر کیا کیا جائے اب ؟" خاں صاحب جھنجھلا کر بولے ۔

"ابی بندوبست ہونا چاہیے ۔ اس چوری کا آپ آج خود جاکر چور کو پکڑ لیجیے ۔"

"دیکھا تم نے ! یہ لڑکی کیسی جاہلوں وا ہلوں کی سی باتیں کرتی ہے ۔ بھلا اب میں ایک پاس کی خاطر سنیما کا پہرہ وہرہ دوں گا ۔"

"نہیں ابا آج ضرور چور کا پتہ لگا لیے ؟ میرے لیے ، وہ آج ضرور آپ کا پاس لے کر سینما آئے گا ۔"

"اچھا تو جناب ! مجھے اجازت دیجیے ۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔ وہاں سے سیدھا ہوسٹل میں آیا اور دوستوں کو صاف صاف بتا دیا کہ بھیا پاس چرا کر لایا ہوں ۔ اگر پتہ چل گیا تو وہاں سے فورا نکال دیے جائیں گے ۔ مگر وہ نہ مانے ۔ خیر سینما پہنچے ۔ انھیں میں نے اندر بھیج دیا ۔ اور خود بڑی شان سے باہر ٹہلنے لگا سامنے سے مینجر سگریٹ پیتا ہوا آرہا تھا ۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا ۔

"معاف کیجیے ۔ کیا پوچھ سکتا ہوں کہ خاں صاحب آپ کے کیا لگتے ہیں ؟"

"میرے وہ یعنی میں ان کا ۔ ۔ ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ میرے ایک عزیز ہیں ۔"

"جی ہاں ! اور یہی تو میں پوچھتا ہوں کہ وہ آپ کے کون ہوتے ہیں ؟"

"جی ! جی وہ میرے ۔ ۔ ۔ میرے چچا ہیں ۔"

"اچھا تو آپ ٹھہریے ۔ میں ذرا فون تک ہو آؤں ۔ ابھی آیا ۔" غالباً وہ خاں صاحب سے پوچھنے گیا تھا کہ ان کا کوئی بھتیجا بھی ہے یا نہیں ۔ مگر بدقسمتی سے ان کا کوئی بھتیجا تو کیا کوئی بھانجہ تک بھی نہیں تھا ۔

میں لپک کر اندر پہنچا اور ان حضرات سے کہہ دیا کہ بھانڈا پھوٹ گیا ہے تمھیں کوئی کچھ نہیں کہے گا ۔ مینجر کم بخت میرے پیچھے لگا ہے ۔ اب میں دوڑتا ہوں ۔ ۔ ۔ اتنے میں پکچر شروع ہوگئی ۔

گیٹ سے مینجر کی آواز ائی ۔ خاں صاب نے کہا ہے کہ جو پاس لایا ہے اسے پکڑلو ۔ ارے وہی لمبا سا لڑکا تو ہے جس سے میں ابھی باتیں کررہا تھا ۔ ابھی ابھی اندر گیا ہے

وہ ۔ ذرا پکڑو تو سہی اسے ۔ "

دو آدمی اندر داخل ہوئے ۔ میں جھکتا ہوا دوسری طرف چلا ۔

" بیٹھ جائیے ،" پچھلی قطار سے آواز آئی ۔

" وہ جارہا ہے ،" ۔ ۔ ۔ منیجر چلایا ۔ میں نے قلانچ بھری اور کئی آدمیوں کے اوپر سے ہائی جمپ کرتا ہوا سیکنڈ کلاس میں جا پہنچا ۔

" لینا پکڑنا ، وہ جارہا ہے ،" سینما میں بھگدڑ سی مچ گئی ۔ گیٹ پر ایک خوانچے والا کھڑا تھا ۔ میں نے اسے تو گیٹ کیپر کے اوپر دے مارا اور خود دروازہ کھول کر باہر دوڑا ۔ میرے پیچھے آٹھ دس آدمی بھاگے آرہے تھے ۔ میں بھی بھاگے گیا نصف میل کی دوڑ کا لطف آرہا تھا ۔ بھلا میں ان لوگوں کے کہاں ہاتھ آنے لگا تھا ۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا ۔ تعاقب کرنے والے صرف دو تین آدمی رہ گئے تھے ۔

آخر انھوں نے مجھے آ ہی لیا ۔

" ہمیں بڑا افسوس ہے ۔ مگر ہم مجبور ہیں ۔ آپ ہمارے ساتھ ذرا خاں صاحب کی کوٹھی تک چلیے ۔" منیجر بولا ۔

میں اس کے پیچھے پیچھے ہولیا ۔

آگے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ خاں صاحب نے منیجر کو خوب ڈانٹا ۔ مجھ سے سب نے معافی مانگی ۔ سوائے تسنیم کے ، جو اس ساری شرارت کی بانی تھی ۔

میں ہوسٹل پہنچا اور باہر دیوار کے ساتھ ڈیڑھ گھنٹے تک کھڑا رہا ۔ جب سب لڑکے سوگئے تب اندر گیا ۔ رات کو میں بالکل نہ سوسکا ۔ میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا ۔ میں کتنا زبردست بے وقوف تھا ۔ میں اب تک یہی سمجھتا رہا کہ اسے مجھ سے دل چسپی ہے ۔ مگر وہ اتنے دنوں تک مجھ سے کھیلتی رہی ۔ کیا میں اتنا گیا گزرا تھا کہ میرے جذبات کو اس طرح ٹھکرایا جائے ۔

انسان بعض اوقات سوچتا کچھ رہتا ہے اور ہو کچھ جاتا ہے ۔ واقعی موپاساں نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ۔ گہرے سے گہرے دوست ، پیارے سے پیارے عزیز ایک دوسرے کے بارے میں بالکل تاریکی میں رہتے ہیں ۔

میں نے تہیہ کرلیا کہ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے اب زیادہ بے وقوف نہ بنوں گا ۔ اگر اسے اپنے اوپر غرور ہے تو ہوا کرے ۔ مجھے بھی غرور ہے ۔ اگر اسے مجھ سے نفرت ہے تو میں بھی اس سے نفرت کرسکتا ہوں ۔

لگے بیٹے مجھے بخار چڑھ گیا۔ کئی روز تک اکیلا ہوسٹل میں پڑا رہا۔ خان صاحب باقاعدہ دن میں دو مرتبہ دیکھنے آتے تھے ۔ وہ روز گھر لے جانے پر اصرار کرتے ۔ آخر پانچویں روز مجھے اپنے ہاں لے ہی گئے ۔ وہاں جاکر اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ کچھ جی بہل گیا۔ میرے پلنگ کے گرد بچے بیٹھے رہتے تھے ۔ ایسے ایسے لوگ مزاج پرسی کے لیے آتے تھے کہ بیماری کا غم آدھا رہ گیا تھا۔ ہاں تسنیم بھی مجھے دیکھنے آتی تھی۔ اپنی والدہ کے ساتھ ، اکیلی بھی نہیں ۔

میں نفرت سے اس کی طرف سے منہ پھیرلیتا اور وہ بھی ناک بھوں چڑھاتی میری نبض دیکھتی اور چلی جاتی ۔ دن گزرتے چلے جارہے تھے۔ کم بخت بخار تھا کہ اترنے ہی میں نہ آتا تھا۔ ایک روز بہت بارش ہوئی ۔ شام کو موسم بہت خوش گوار ہوگیا۔ بچے بہت جلد سوگئے ۔ خاں صاحب بیگم صاحبہ کے ہم راہ کسی پارٹی میں گئے ہوئے تھے ۔

میں اکیلا پڑا بخار میں تپ رہا تھا ۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اس وقت کوئی ایسی ہستی ہو جو میرے ساتھ میٹھی باتیں کرے جو میری تکلیف میں شریک ہو ۔ مجھے تسنیم یاد آرہی تھی ۔ مگر اسے میری کیا پروا تھی ؟ ۔ ۔ ۔ اس نے مجھے کس قدر ستایا تھا ۔ مگر اسے ذراسا بھی خیال ہوتا تو مجھ سے ضرور معافی مانگتی ۔ اس سے باتیں کیے پورا مہینہ گزر گیا تھا۔ میری آنکھیں پرنم ہوگئیں ۔ میں دنیا میں بالکل اکیلا تھا ۔ سب لوگ مجھے بے وقوف سمجھتے تھے ۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور سوچنے لگا کہ اگر میں مر بھی جاؤں تو کسے غم ہوگا ۔ تسنیم تو الٹا خوش ہوگی ۔ بھلا کیوں خوش ہوگی ؟ ۔ ۔ ۔ اس کا جواب مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا ۔ ۔ ۔ بیماری میں انسان عجیب عجیب باتیں سوچتا ہے ۔

یکایک میں نے اپنے چہرے پر ایک ملائم سے ہاتھ کا لمس محسوس کیا ۔ پھر ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی میرے سرہانے بیٹھ گیا ہو ۔ ایک بھینی بھینی سی خوش بو میرے دماغ تک پہنچی ۔ میں نے ایک آنکھ ذراسی جھپکی ۔ ۔ ۔ یہ تسنیم تھی ۔ وہی نیلا لباس پہن رکھا تھا جسے دیکھ کر میں پاگل ہوجایا کرتا تھا ۔

اس کی انگلیاں میرے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی ۔ میں نے اپنا منہ ایک طرف پھیر لیا ۔ شاید وہ مجھے ستانے آئی تھی ۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اپنی بے بسی پر خوب روؤں ۔ کیا وہ مجھے تنگ کرنے آئی تھی ؟

ٹپ سے ایک قطرہ میرے چہرے پر گرا ۔ پھر دوسرا ۔ پھر تیسرا ۔ مجھے آنکھیں کھولنی ہی پڑیں ۔ میں نے دو بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو دیکھے ۔

وہ رو رہی تھی ۔ میرا دل پگھل گیا ۔

کیا واقعی اسے میرے دل کے درد کا احساس تھا؟ کیا واقعی اسے میرا خیال تھا؟ دل سے آواز آئی۔ پگلے، اب بھی نہ سمجھا تو۔ آخر کب سمجھے گا۔ اب یہ معافی مانگ رہی ہے۔ اور اگر تو یوں ہی خاموش رہا تو ذرا سی دیر میں تجھے معافی مانگنی پڑے گی۔ میں نے اس کے نازک سے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک وہ روتی رہی۔ اس نے میرا ہاتھ اچھی طرح آنسوؤں سے تر کر دیا۔ دیر تک ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ دونوں کی زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکلا۔ مگر خاموشی نے دل کے راز داستان کی صورت میں سامنے رکھ دیے تھے۔ باہر ٹھنڈی ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ رات کے سناٹے میں دو دل دھڑک رہے تھے۔

OO OOO OO

تزکِ نادری عرف سیاحت نامہء ہند

رقم زدہ : اعلیٰ حضرت جناب نادر شاہ سابق شہنشاہ ،
سابق ابن شمشیر ابن شمشیر سابق مرحوم و مغفور وغیرہ وغیرہ

پیش لفظ ۔۔۔ عرف کرنا مرتب اس تزک کا ہمارا آج جو اتفاق سے پرانی پوستین کو جھاڑا تو متعدد اشیا کے ساتھ ہمارے خود نوشتہ اوراقِ کرم خوردہ بھی زمین پر گر پڑے ، جنھیں ہم نے وقتاً فوقتاً لکھا تھا ۔ پڑھا تو حیران رہ گئے ۔ سوچا کہ سیاحتِ ہند کے بعد معترضین نے ہم پر جو طرح طرح کی افترا پردازی کی ہے کیوں نہ اس کے جواب میں یہ اوراق پیش کیے جائیں ۔ اگرچہ ہم مقامی مورخین کی لگام بندی فرما چکے تھے تاہم غیر ملکی پریس نے واویلا مچا کر جو غلط فہمی پیدا کردی ہے اس کا ازالہ بہت ضروری ہے ۔ تصویر کا یہ رخ دکھا کر کیوں نہ معترضین کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرادیں ۔ پھر ہمیشہ سے لوگوں کو گلا بھی رہا ہے کہ تاریخ غلط پیش کی گئی ہے ۔ تبھی تاریخ کی غیر جانب دار اور مستند کتابوں کی کمی محسوس کی جاتی ہے ۔

خدا گواہ ہے کہ ہم ہندوستان محض حملے کی غرض سے ہر گز نہیں گئے ۔ دراصل ہمیں اپنی دور افتادہ پھوپھی محترمہ سے ملاقات مقصود تھی ۔ حملے کا خیال ہمیں راستے میں آیا ۔ تختِ طاؤس اور کوہ نور ہیرا ہم نے زبردستی ہر گز نہیں ہتھیایا ۔ عزیزی محمد شاہ عرف رنگیلے نے بہ صد منت و سماجت ہمارے سامان میں یہ چیزیں بندھوادیں ۔ اور قتلِ عام ؟ قتلِ عام کس مسخرے نے کرایا تھا ۔ وہ تو ایک معمولی سا لاٹھی چارج تھا ۔ یہ اور بات ہے کہ اہلِ ہند نحیف و نزار ہونے کی وجہ سے اس کی تاب نہ لاسکے ۔ سنا ہے ہمارے متعلق لوگوں نے طرح طرح کی کہاوتیں گھڑ لی ہیں مثلاً شامتِ اعمال باصورتِ نادر گرفت ۔ ہمارے دل کو خصوصاً اس مثل سے سخت صدمہ پہنچا ہے یعنی اگر اس نادر سے مراد ہم ہیں تو یقین دلاتے ہیں کہ یہ نادر کوئی اور شخص تھا ۔ اگر ہمیں علم ہوتا کہ ہماری سیاحت کے بعد اس قدر غل غپاڑہ مچے گا تو واللہ کبھی ہند کا رخ نہ کرتے اور اگر دلی میں پتہ چل جاتا تو وہاں سے کبھی نہ لوٹتے ۔

والیِ کابل سے ناچاقی مدت سے ارادہ تھا کہ والیِ کابل کی گوشمالی کریں۔ وہ ناکار بلا کسی وجہ ہمارے خلاف زہر اگل رہا تھا۔ جب ہم نے خط لکھ کر اس سے خواہ مخواہ پروپگنڈے کی وجہ پوچھی تو اور بھی زیادہ زہر اگلنے لگا۔ چناں چہ موسم کو مناسب پاکر حملہ آور ہوئے۔ غالباً ان لوگوں کو ہماری قوت کا غلط اندازہ تھا۔ ہم نے دریائے بلمند کو جگہ جگہ سے کاٹ کر ان کے ہوش ٹھکانے لگادیے۔

دریائے بلمند بہت زیادہ خوش نما دریا ہے۔ فرماں بردار خاں معروض ہوا کہ شاہانِ سلف کا رواج رہا ہے کہ حملہ کرتے وقت جو دریا راستے میں آئے تیر کر عبور کرتے ہیں اس کے کہنے پر غلطی سے ہم نے بھی چھلانگ لگادی اور شاہانِ سلف میں شامل ہوتے ہوتے بال بال بچے۔ کنارے کی طرف آنے کی کوشش کی۔ ہم پوستین کو چھوڑتے تھے لیکن پوستین ہمیں نہ چھوڑتی تھی۔ بہ مشکل ہمیں باہر نکالا گیا۔ بڑے پشیمان ہوئے۔ تہیّہ کیا کہ جب تک تیراکی کے ماہر نہ ہوجائیں پانی میں قدم نہ رکھیں گے۔

شہباز خاں کو خطاب کا عطیہ مقامی باغ میں چند الو دکھائی دیے۔ یہاں کا الو ایرانی الو سے بڑا اور بہتر ہوتا ہے۔ الوؤں کا ایک جوڑا ہمارے ساتھ ہولیا۔ شام کو ہماری قیام گاہ کے پاس بسیرا لیتا اور رات بھر ہاؤ ہو مچاتا۔ ہم نے فرماں بردار خاں سے پوچھا کہ یہ جوڑا کیا چاہتا ہے۔ وہ بولا کہ گستاخی کرتا ہے اور ہمیں واپس جانے کو کہتا ہے۔ ہم بے حد خفا ہوئے اور فرماں بردار خاں کو پاپوشِ مبارک سے زدوکوب کرکے سرفراز فرمایا۔ ساتھ ہی شہباز خاں کی رائے دریافت کی۔ وہ جاں نثار معروض ہوا کہ فالِ نیک ہے۔ الو جیسا منحوس پرندہ بھی ہم سے بلند طالع شہنشاہ کی آمد پر خوش آمدید کہتا ہے۔ ہم اس جواب پر خوش ہوئے اور نمک حلالی کی قدر کرتے ہوئے اس کو الوشناس کے لقب سے نوازا اور اس کے ہم جنسوں میں اس کی عزت افزائی فرمائی۔

سیاحتِ ہند کا ارادہ کابلی افواج کے ساتھ ہماری جنگ خاصی رہی۔ یہ ان تمام خصوصیات کی حامل تھی جس نے نادر شاہی جنگوں کو اس قلیل عرصے میں اس قدر حیرت انگیز شہرت بخشی۔ اب ماشاء اللہ نادرشاہی حکم، نادری قہر، نادر موقعے اور نادری حکومت بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ والیِ کابل اپنے کیے پر نادم تھا۔ اس نے وفاداری کا حلف اتنی بار اٹھایا کہ ہم نے تنگ آکر منع کردیا۔

شہباز خاں الو شناس ہر روز ملک ہندوستان کی خبریں سناتا کہ کابل سے میوہ جات

کثیر تعداد میں ہند بھیجے جاتے ہیں اور اس کے بدلے تجار ہینگ، بھنگ، چرس و دیگر تفریحات لاتے ہیں۔ ہم نے اس ذکر میں دل چسپی لی تو الو شناس بھی چست ہوگیا۔ اس نے ہمیں پھوپھی محترمہ کی یاددلائی، جو غالباً ہند میں مقیم تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم نے اپنی پھوپھی کا محض ذکر ہی سنا تھا نہ کبھی انھیں دیکھا تھا نہ شرفِ ملاقات بخشا تھا۔ گستاخ فرماں بردار خاں کا خیال تھا کہ ہماری کوئی پھوپھی تھیں ہی نہیں۔ خیر چوں کہ کابل کی مہم اندازے کے خلاف بہت جلد ختم ہوگئی۔ سوچا یہ بے کار وقت کیوں نہ سیاحتِ ہند میں صرف کیا جائے۔ ہمیں بتایا گیا کہ حملہ آوروں کی سہولت کے لیے اہلِ ہند نے دو راستے صاف کروا رکھے ہیں۔

بہ راہِ افغانستان: خیبر ایجنسی، پشاور، لاہور، پانی پت

بہ راہِ بلوچستان: سمہ سٹہ۔ بھٹنڈہ۔ دلی

ہم نے پہلا راستہ پسند فرمایا کیوں کہ بلوچستان کے راستے میں جیکب آباد پڑتا ہے جو دنیا کے گرم ترین مقاموں میں سے ہے۔

کابل سے کوچ

چار گھڑی گزرنے پر کابل سے کوچ کیا۔ عمائدینِ شہر فصیل تک بلکہ درہ، خیبر تک چھوڑنے آئے۔ جانے نہ دیتے تھے والیِ کابل مفارقت کا سوچ کر روتا تھا اور ہمارے ہم راہ سیاحتِ ہند میں شریک ہونے کی اجازت طلب کرتا تھا، لیکن ہم جانتے تھے کہ یہ رونا پیٹنا دکھاوے کا ہے۔ یہ لوگ بڑے کائیاں ہیں' ہمارے رخصت ہوتے ہی پروپگنڈا دوبارہ شروع کردیں گے اور پھر ہم اہلِ ہند پر مہمان نوازی کا زیادہ بوجھ ڈالنا قرینِ مصلحت نہ سمجھتے تھے۔ چناں چہ اسے سمجھایا کہ جب ہم سیاحتِ ہند سے واپس لوٹ آئیں تب اس کا جانا زیادہ موزوں ہوگا۔ وہ پھر بھی روتا تھا۔ اسے ازراہِ غریب پروری ایک ریشمی رومال آنسو پونچھنے کے لیے مرحمت فرمایا اور بڑی مشکل سے پیچھا چھڑایا۔

اس منزل سے کوچ کرکے درہ، خیبر پہنچے۔ نہایت پر فضا مقام ہے۔ سکندر یونانی، محمود غزنوی اور دوسرے نامی سیاح بھی اسی راستے سے گزرے تھے۔ ہم نے بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے میں بہتری سمجھی۔ اس درے پر پرند، چرند، درند انسان بلکہ نباتات و جمادات تک نظر نہیں آتی۔ خداوندِ باری تعالیٰ کی کیا قدرت بیان کی جائے۔

مغل فوج دار نے پشاور سے کچھ درے آکر سعادتِ آستاں بوسی حاصل کی اور مشورہ دیا کہ ہمارا واپس چلا جانا بہتر ہوگا کیوں کہ اس موسم میں سیاحت لطف نہیں دیتی۔ اس نے دوسو مہرِ طلائی نذر اور ایک مرصع گھوڑا بہ طور پیش کش گزرانا۔ ہم نے بھی ازراہِ محبت ایک دنبہ عنایت کرکے ٹالا۔ پشاور سے آگے شیر ملا۔ پہلی دفعہ دیکھا کھڑا دیکھتا رہا۔ یہ ایک گربہ کی مثل

ہوتا ہے ۔ نہایت نفاست پسند اور بورڈ واقسم کا چوپایہ ہے ۔ کچھ دیر ہمیں دیکھنے کے بعد اس درجہ مرعوب ہوا کہ بھاگ نکلا ۔ اگلے روز کسی نے ہمیں بتایا کہ وہ شیر نہیں تھا کچھ اور چیز تھی واللہ اعلم بالصواب ۔

سفر کا حال دریائے سندھ عبور کرنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ معلوم ہوا کہ سید بایزید ابن یزید یزدانی آستاں بوسی کی سعادت کے متلاشی ہیں ۔ جب بلایا تو دیکھا کہ فقط ایک آدمی ہے ۔ ہم نے ازراہ تلطف اسے گلے سے لگایا اور پیار سے بھینچا ۔ وہ بے ہوش ہوگیا ۔ اسے فوراً اٹھاکر باہر لے گئے ۔ لخلخہ سنگھایا گیا ۔ مالش کی گئی ۔ دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو وہ نذریں جو پیش کرنے لایا تھا لے کر رفو چکر ہوگیا ۔ ہم نے اہل کاروں کو اس کے پیچھے دوڑایا کہ اگر خود نہیں آتا تو نذریں تو بھجوادے ۔ مگر اس کا کوئی پتہ نہ چلا ۔

قلعے کا فوج دار ہماری سواری کے لیے ایک عجیب و غریب چوپایہ لایا جسے ہاتھی کہتے ہیں ۔ نہایت پر شوکت فیل جسم جانور ہے ۔ دو دانت ہوتے ہیں جو صرف دکھانے کے لیے ہیں ۔ ناک جس کو سونڈ کہاجاتا ہے زمین کو چھوتی ہے ۔ ہاتھی پر چڑھ کر آدمی دوسروں کے گھروں کے اندر سب کچھ دیکھ سکتا ہے ۔ ہم نے سواری کا قصد کیا اور باگ ہاتھ میں لینی چاہی ۔ وہ بولا اس کی لگام نہیں ہوتی ۔ ڈرائیور علاحدہ بیٹھتا ہے ۔ ہم نے ایسے بے لگام جانور پر سواری سے انکار کر دیا ۔

لطیفہ سندھ کے علاقے سے وفد آیا کہ وہاں کے عمائدین بے تاب ہیں کہ ہم ان کو سرفراز فرمائیں ۔ ساتھ ہی ایک مشہور خانقاہ کی گدی کی پیش کش بھی تھی ۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس ملک میں عجیب دستور ہے ۔ کوئی گھاگ چند ہتھکنڈے دکھاکر بھولے بھالے انسانوں کو رام کرلیتا ہے ۔ یہ شخص پیر کہلاتا ہے اور معتقدین مرید کہلاتے ہیں ۔ مرید اپنی آمدنی کا ایک حصہ پیر کو باقاعدگی کے ساتھ نذر کرتے ہیں ۔ پیر کوئی خاص کام نہیں کرتا سوائے اس کے کہ کبھی کبھی کاغذ کے پرزوں پر کچھ لکھ دیتا ہے جنھیں تعویذ کہتے ہیں ۔ ان تعویذوں سے بوڑھوں کے ہاں اولاد ہوسکتی ہے اور اولاد کے سرپرستوں کا انتقال ہوسکتا ہے وغیرہ وغیرہ ۔ یہ لطیفہ سن کر ہم بہت ہنسے کہ کسی نے کیا بے پر کی اڑائی ہے ۔

لیکن جب الو شناس تین چار پیروں کو ہماری ملاقات کے لیے لایا تو ہمیں محسوس ہوا کہ لطیفہ دوسروں پر نہیں ہم پر ہوا ہے ۔ پیروں کی زندگی کی طرح طرح کی دلچسپیاں اور ان گنت مشغلے ۔ ہمارے منھ میں پانی بھر آیا ۔ اپنی گذشتہ زندگی پر بڑا افسوس ہوا کہ ناحق خراب ہوتے

رہے ۔ اگر پہلے سے پتہ ہوتا تو سیدھے ہند آکر پیر بن جاتے اور مزے لوٹتے ۔
ایسا سنہری موقع ملنے پر ہم نے خداوندِ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور وفد کے ہم راہ چلنے کا قصد ظاہر کیا لیکن الو شناس نے رائے دی کہ سندھ کے سیاسی حالات ہمیشہ کچھ ایسے ویسے رہتے ہیں ۔ چناں چہ اس تجویز کو التوا میں رکھا ۔ اگر خدا نخواستہ شہنشاہی کامیاب نہ رہی تو ضرور بالضرور پیر بن جائیں گے اور دل کی ساری امنگیں پوری کریں گے ۔ انشاء اللہ العزیز ۔

اختـــر شماری کل رات اختر شماری کی۔دو سو پچاس تارے گنے ہوں گے کہ نیند آگئی ۔ باقی بہ شرطِ زندگی کل گنیں گے ۔

شترِ غمزے مقامی قلعہ دار کی دعوت پر اس کے ساتھ گئے اور شترِ غمزے ملاحظہ فرمائے ۔ محظوظ ہوئے کیوں کہ ایران میں یہ چیز نہیں ہوتی اور اس ملک میں عام ہے ۔

ایک مفید رسم جہلم کے قریب ایک قلعہ دار نے ہم پر دھاوا بول دیا اور پھرتی سے قلعے میں محصور ہوگیا ۔ ارادہ ہوا کہ اس کو اسی طرح محصور چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں لیکن الو شناس ملتمس ہوا کہ نیا ملک ہے یہاں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے ۔ ہم نے فرمایا کہ اس طرح قدم رکھے تو دلی پہنچنے میں دیر لگے گی ۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ لوگ عقب سے آکر تنگ نہ کریں ۔ اس روز ہمیں نزلہ ساتھا اور قصد لڑائی بھڑائی کا ہرگز نہ تھا ۔ الو شناس کے اصرار پر دو دن تک قیام کیا لیکن کچھ نہ ہوا ۔ الو شناس چلا گیا ۔ شام کو لوٹا تو اس کے ساتھ ایک ہندی سپاہی تھا ۔ الوشناس کے کہنے پر ہم نے سپاہی کو پانچ سو طلائی مہریں دیں ۔ ابھی گھنٹہ نہ گزرا ہوگا کہ قلعے کے دروازے کھل گئے ۔ ہم بڑے حیران ہوئے ۔

ہند میں یہ ایک نہایت مفید رسم ہے ۔ جب کٹھن وقت آن پڑے یا مشکل آسان نہ ہو تو متعلقہ لوگوں کو ایک رقم یا نعم البدل پیش کیا جاتا ہے ۔ تحفے کی مقدار اور پیش کرنے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں لیکن مقصد ایک ہے ۔ اسے یہاں رشوت کہتے ہیں ۔ کس قدر زود اثر اور کارآمد نسخہ ہے ۔ اگر لاکھوں کے لگے ہوئے کام ہزار پانچ سو سے سنور جائیں تو اس میں ہرج ہی کیا ہے ۔ رشوت دینے دلانے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس عمل سے کرنسی حرکت میں رہتی ہے ۔ ہم واپس ایران جاکر اس رسم کو ضرور رائج کریں گے ۔

ہمیں بتایا گیا کہ کچھ مہریں سپاہی نے اپنے استعمال کے لیے خود رکھ لی تھیں ۔ باقی کوتوال کو دیں جس نے اپنا حصہ رکھ کر بقیہ رقم قلعہ دار کے حوالے کی۔قلعہ دار نے سنتریوں کو خوش کرکے

دروازے کھلوادیے ۔ واقعی یہ ملک عجوبہ ، روزگار ہے ۔

گوجران والے میں قیام شیخ بوٹا شجر پوری ایک ایرانی النسل درویش ہیں جو بڑے فاضل ریاضت کار ، مبارک نفس ، متوکل اور گوشہ نشیں ہیں ۔ گوجران والے میں ان سے مل کر معرفت اور وجدان کی باتیں ہوتی رہیں ۔ فیصلہ کیا کہ سب کچھ چھوڑ کر تارک الدنیا بنا جائے ۔ پھر شبہ ساہوا کہ کہیں یہ بھی پیر نہ ہوں ۔ تحقیقات کرلے پر شبہ درست نکلا ۔ آپ بڑے رنگیلے پیر ہیں ۔ پنجاب سے وادی کانگڑہ کی طرف ہجرت کر رہے ہیں کیوں کہ وہ علاقہ زیادہ رنگین ہے ۔ دیر تک ان سے خفیہ باتیں ہوتی رہیں جنھیں سینہ بہ سینہ رکھنے کا ارادہ ہے ۔ یہ ملاقات کیا تھی گویا تجدید عہدِ شباب تھی ۔

ہمارا سنجیدہ ہوجانا گلستانِ بیکانیر سے ایلچی درِ دولت پر حاضر ہوا اور ملتجی ہوا کہ چلیے مشتاقانِ دیدار راہ دیکھ رہے ہیں ۔ تربوزوں کا موسم بھی ہے ۔ ارادہ ہوا کہ کچھ دنوں کے لیے چلے چلیں مگر الو شناس کو حسبِ معمول شبہ ہوا کہ کوئی چال ہے ۔ بیکانیر لق و دق صحرا ہے جس میں نہ پانی ہے نہ روئیدگی ۔ یہ لوگ ہمیں صحرا میں چھوڑ کر بھوک پیاس سے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ آنکھوں میں خون اتر آیا اور ہر چیز سرخ نظر آنے لگی ۔ فوراً ایلچی کو بلواکر الٹا لٹکوایا جب پتا کہ واقعی یہ چال تھی تو کھلوا کر سیدھا کیا ۔ اس حادثے نے ہمارا موڈ خراب کردیا ۔ سوچا کہ اہلِ ہند سے اچھے سلوک کی توقع کرنا حماقت ہے ۔ کیوں نہ کسی بہانے اس ملک پر حملہ کرکے ان کی گوشمالی کریں ۔ فرماں بردار خاں کو حکم دیا کہ حملے کی چند وجوہات سوچیے اس نے یہ فہرست پیش کی ۔

۱ ۔ ہم عوام کے مفاد کے لیے جنگی چالوں کی ایک کتاب " رہ نمائے حملہ آورانِ ہند " لکھنا چاہتے ہیں ۔

۲ ۔ ہندی گوّیے ترانوں کو " نادر نادھیم " سے شروع کرکے ہماری توہین کرتے ہیں ۔

۳ ۔ تاریخ میں اس سے پہلے ایران نے ہند پر باقاعدہ حملہ نہیں کیا ۔

۴ ۔ ہند پر حملہ ہوئے کافی عرصہ گزرچکا ہے ۔

۵ ۔ یوں بھی ان دنوں ہند پر حملے کا رواج عام ہے ۔

ایسی بے معنی وجوہات معروض ہونے پر ہمیں غصہ آیا ۔ ایک بھی بات خدا لگتی نہ تھی ۔ قصد ہوا کہ فرماں بردار خاں سے وہی پرانا سلوک کریں ۔ دیکھا تو وہ کبھی کا غائب ہوچکا تھا ۔ ہم نے خود ان سے بہتر وجوہات سوچنے کی دیر تک کوشش کی ۔ جب کامیابی نہ ہوئی تو خوش ہوکر فرماں بردار خاں کو بحال فرمایا ۔

شاہدرے میں آمد آمد شاہدرہ کے قریب ایک لڑکی نظر آئی ۔ اس کی ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں ۔ چال ڈھال سب لڑکوں کی سی تھی ۔ نام بھی عبداللطیف گویا مردانہ تھا ۔ ہم نے پیش کاروں کو حکم دیا کہ اس کے باپ سے مل کر تحقیق کریں ۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عبداللطیف لڑکا ہی تھا اور کسی مقامی کالج میں پڑھتا تھا خدا جانے ہم کو یہ کیسے خیال آیا کہ وہ لڑکی ہے ۔

لاہور پہنچے ہی تھے کہ صوبے دار لاہور کے گوریلا دستوں نے ہم پر حملہ کردیا ۔ ہمارے سپاہی جدید جنگی طریقوں سے ناواقف تھے اور صوبے دار موصوف نہ صرف ہفت ہزاری تھا ، بلکہ گوریلا لڑائی کا ماہر تھا ، ہم نے بھی فورا چڑیا گھر سے سارے گوریلے نکال کر سدھائے گھمسان کارن پڑا ، گوریلا گوریلے پر ٹوٹ پڑا اور سپاہی تماشا دیکھتے رہے ۔ دشمن نے لڑائی کا رخ بدلا ، صوبیدار ہمیں گھیرے میں لینے کی کوشش کرنے لگا اور ہم اسے ۔۔دونوں فوجیں ایک دوسرے کے قریب سے کئی کترتی گزرجاتیں ، گرم جوشی کا یہ عالم تھا کہ گھیرے میں لینے کی کوشش میں صوبیدار فوج سمیت جہلم جا پہنچا اور ہم فیروزپور ۔ غلطی کا احساس ہوا تو لوٹے ۔الو شناس کے مشورے پر ہند کا مروجہ کار آمد نسخہ رشوت آزمایا اور شکست فاش دی ۔ شکست کے بعد ہم نے اس سے ہفت ہزار بہ صد دقت وصول کیا ۔ شام کو الو شناس کچھ اور منصب داروں کو لایا جو بالترتیب پنج ہزاری ، سہ ہزاری ، دوہزاری تھے کئی روز گرفتار رکھا ۔ تب کہیں دس ہزار روپیہ وصول ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے عہدیداروں کی قیمتیں گرنے لگیں ۔لوگ بڑے لالچی ہیں ۔ایک روز کا ذکر ہے کہ کوئی ہزاری بہت چلایا کیا کہ وہ ہزارہ کا رہنے والا ہے لیکن ہم نے اپنا اصول ترک نہیں کیا ۔

لاہور سے روانگی چاہیے تو یہ تھا کہ ان علاقوں میں چند روز رہ کر دادِ عیش و کامرانی دیتے مگر یہاں کی پرانی رسم ہے کہ وہ سیاح جو درہ ، خیبر سے آتے ہیں انھیں سیدھے دلی جانا پڑتا ہے ۔ راستے میں کہیں نہیں ٹھہر سکتے ۔

جہلم ،چناب ،راوی عبور کر چکے تھے ۔ستلج کو عبور کیااور پنجاب کے پانچویں دریا کو بہت ڈھونڈا۔خبر ملی کہ بیاس تو پہلے ہی ستلج سے مل چکا ہے سخت مایوسی ہوئی ۔مصاحبین نے دست بستہ عرض کی کہ ملک کا دستور ہے حملہ آوروں سے اس علاقے میں ضرور لڑتے ہیں اس کے لیے پانی پت ،تراوڑی وغیرہ کے میدان مخصوص ہو چکے ہیں ۔ ہم نے فرمایا کہ لڑیں تو تب اگر مقابلے میں کوئی فوج آجائے ۔ معلوم ہوا کہ حملہ آور کو انتظار کرنا پڑتا ہے کیوں کہ اگر اہلِ ہند اس علاقے میں نہ لڑیں تو پھر کہیں نہیں لڑتے ۔

محمد شاہ کو ہماری تشریف آوری کا علم ہو چکا تھا۔ ایک مرتبہ تو اس نے ایلچی کو لفافے سمیت شراب کے مٹکے میں دھکیل دیا اور بولا۔ ایں ایلچیِ بے معنیٰ غرقِ مے ناب اولیٰ کسی طلبچی نے حافظ کا یہ مصرع صحیح کرنا چاہا تو محمد شاہ نے اسے بھی مٹکے میں دھکیل دیا۔ آدمی باذاق معلوم ہوتا ہے۔

ہمیں تحفہ دینے کا نتیجہ دلی سے ایک درباری قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا تحفے تحائف سے لدا ہوا تھا اس لیے ہم نے بلا لیا۔ بولا یا شہنشاہ سنا ہے کہ آپ تبدیلیِ آب وہوا کی غرض سے اس طرف تشریف لائے ہیں۔ جہاں تک آب وہوا کا تعلق ہے اس ملک کو یہاں ختم سمجھیے۔ اس سے آگے سخت گرمی پڑتی ہے۔ رعایا کی التجا ہے آپ دو کروڑ کی حقیر رقم بہ طور سفر خرچ قبول فرما کر یہاں سے مراجعت فرما جائیں۔ ہمیں رضا مند پاکر وہ نابکار بغلیں بجانے لگا۔ ڈانٹا تو معلوم ہوا کہ یہاں کا رواج ہے۔ ایک تو یہاں کے رسم ورواج نے ہمیں عاجز کر دیا ہے۔ واپسی کے لیے سامان بندھوا رہے تھے کہ الو شناس نے شبہ کرادیا کہ اہلِ ہند ہم پر اپنا محبوب نسخہ استعمال کر رہے ہیں۔ یہ رقم ہمیں "تحفتہً" پیش کی جارہی ہے۔ شام کو وہی درباری بغلیں جھانکتا ہوا پھر حاضر ہوا اور دلی چلنے کی ترغیب دینے لگا۔ عجب ڈھل مل یقین لوگ ہیں۔ الوشناس نے اصل وجہ بتائی۔ جب درباریِ مذکور دلی دربار میں پہنچ کر انعام کا خواہاں ہوا تو کسی نے پوچھا تک نہیں بلکہ خان بہادر کا خطاب کسی حریف کو مل گیا۔ اس نے جل بھن کر دھمکی دی کہ ٹھہرو، ابھی لاتا ہوں نادر شاہ کو۔

ہم نے سوچا کہ اب اتنی دور آگئے ہیں تو دلی دیکھ کر جائیں گے۔ کرنال کے مقام پر محمد شاہی فوج دکھائی دی جو ہمیں دیکھتے ہی ادھر ادھر ہو گئی۔ ہم نے کہلوا کر بھیجا کہ ہماری خواہش ہے کہ اس جنگ کو تاریخ میں پانی پت کی تیسری لڑائی یا کنال کی پہلی لڑائی کا رتبہ ملے۔ اس پیغام پر باقی ماندہ فوج بھی بھاگ نکلی۔

قطب صاحب کی لاٹھ نزولِ اقبال دلی کے باہر ہوا۔ قطب صاحب کی لاٹھ کے پاس نادر شاہی جھنڈے گاڑے گئے۔ یہ لاٹھ قطب صاحب کی تعمیر کردہ ہے لیکن اس کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا۔ پتہ نہیں قطب صاحب کا ارادہ کیا تھا۔ فرماں بردار خاں نے عرض کیا کہ غالباً قطب صاحب آسمان تک پہنچنا چاہتے تھے لیکن تجویز کو تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ بہ صد دقت اوپر تشریف لے گئے۔ واقعی بہت اونچا مینار ہے۔ آسمان یہاں سے کافی قریب ہے۔ سستانے کے بعد نیچے تشریف لائے۔

حملہ آوری اور برادرم محمد شاہ کی ہماری ذات سے عقیدت

صبح سے محمد شاہ اپنا لشکر لے کر سامنے آیا ہوا تھا مگر ابھی تک سعادتِ زیارت سے مشرف نہ ہوا تھا۔ دوپہر کو ایک ایلچی رنگین جھنڈا لہراتا ہوا آیا اور معروض ہوا کہ محمد شاہ نے دریافت کیا ہے کہ حملہ کرنے کا کس وقت ارادہ ہے۔ ہم نے پوچھا "ابے حملہ کیسا؟ ایلچی نے عرض کیا۔ "خداوند نعمت وہ تو عرصے سے آپ کے حملے کے منتظر ہیں۔ لتے دنوں سے تیاریاں ہوتی رہیں اگر حملہ نہ ہوا تو سب کو سخت مایوسی ہوگی۔ کل بارش کی وجہ سے لشکر اکٹھا نہ ہوسکا اور پھر یہ رسم چلی آتی ہے کہ درہ، خیبر سے آنے والے۔" "بس بس! آگے ہمیں پتہ ہے" ہم نے اسے ڈانٹا۔

مجبوراً ہم نے حملے کا حکم دے دیا، لیکن لڑائی کا لطف نہ آیا۔ وہ لوگ فوراً تتر بتر ہوگئے۔ ہم شہر کے دروازے میں داخل ہوئے تو عزیزی محمد شاہ نے پھولوں کا ہار پہنایا۔ گھوڑے سے اتر کر بغل گیر ہوئے، اس کے بعد دو دن تک محمد شاہ کا کوئی پتہ نہ چلا۔

دلی میں نازل ہو کر ہم نے اور بندگانِ درگاہ نے خوب دادِ عیش دی کہ شیوہ، سیاحاں ہے۔ حمام گئے، الحمد للہ کہ آج پورے ایک سال کے بعد غسل فرمایا۔ صبح سے شام تک تخت طاؤس پر بیٹھ کر شغل خور و نوش و خوش فعلیوں اور خوش گپیوں سے اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کرتے اور رعایا کو اپنے دیدار سے فیض یاب کرتے رہے۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ ہمارے جیسا صاف باطن اور نیک دل بادشاہ تاریخ میں کوئی نہ ہوا ہوگا۔ سکندر نے پورس سے جو سلوک کیا اس سے کہیں بہتر سلوک ہم نے عزیزی محمد شاہ سے کیا۔ ہر چند کہ اس کی رنگین مزاجی ہمیں نہ بھاتی تھی۔ اس کو مانند اپنے عزیز کے سمجھا۔ حق تو یہ ہے کہ اس نے ہماری اتنی خدمت کی کہ کیا کوئی اپنے بزرگ کی کرتا ہوگا۔

ہمیں شاہی مہمان خانے کے بہترین حصے میں ٹھہرایا گیا جو مرہٹوں کے لیے مخصوص تھا۔ عزیزی محمد شاہ نے شام کو ہمارے لیے مسواکیں، لباسِ شب خوابی، سلیپر بھیجے، چادریں اور غلاف بدلوائے۔ یہ اور بات تھی کہ ہم راستہ بھول گئے اور نہ جانے کہاں پوستین سمیت سیڑھیوں پر سوگئے۔ لال قلعہ سے باہر تو سیدھا سادہ سا قلعہ معلوم ہوتا تھا لیکن اندر نفیس و نازک عمارتوں اور خوش نما باغوں کی بھول بھلیاں میں ہمیں گائیڈ کی ضرورت محسوس ہوا کرتی۔ ہماری آمد کی خبر پاکر (غالباً ہمیں متاثر کرنے کی غرض سے) حکومتِ ہند نے امتناعِ شراب کے احکامات جاری کردیے تھے لیکن عزیزی کی وساطت سے ہمارے سپاہیوں کے لیے پینے پلانے کا انتظام ہوہی جاتا تھا۔

تختِ طاؤس ایک دفعہ جب ہم متواتر دس گھنٹے تختِ طاؤس پر بیٹھے رہے تو عزیزی بولا "معلوم ہوتا ہے کہ تختِ طاؤس سے آپ کو از حد انس ہو گیا ہے۔ اگر آپ کا اس درجہ طویل قیام تختِ طاؤس کی وجہ سے ہے تو چشم ما روشن دل ماشاد۔ آپ اسے بخوشی لے جا سکتے ہیں۔"

ایسے خلوص و محبت سے کس کا دل نہ پسیج جاتا۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ ہم جب یہاں سے عازمِ ایران ہوں گے تختِ طاؤس ہم راہ لے جائیں گے۔ ہم انکار کرکے اس کا دل نہیں دکھانا چاہتے تھے۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے پوچھا۔ دلّی کو اپنی ذاتِ بے مثال سے محروم کرنے کی تاریخ سے مطلع فرمایا جائے تاکہ اہلِ دہلی کو مطلع کر دیا جائے۔ وہ اس دن کے لیے گھڑیاں گن رہے ہیں۔"

"کیوں گھڑیاں کیوں گن رہے ہیں۔ کیا وہ ہم جیسے مشفق بزرگ کو بن بلایا مہمان سمجھتے ہیں؟" ہم نے غیظ و غضب میں فرمایا۔

"جی نہیں۔ آپ نے غلط سمجھا۔ وہ الوداعی پارٹیوں کا انتظام کرنا چاہتے ہیں" وہ بولا۔

"ہمیں ان گلیوں کو چھوڑنے کی کوئی ایسی جلدی نہیں۔ جن کے متعلق کوئی استاد ذوق شعر کہیں گے" ہم نے فرمایا۔

"یوں ٹھہرنے کو آپ چھ ماہ۔ سال۔ دس سال ٹھہریے بلکہ ایران کا دارالخلافہ دلی کو بنوائیے۔" عزیزی بڑی محبت سے ملتمس ہوا۔

"دیکھا جائے گا" ہم نے بھی محبت سے فرمایا۔

وہ گل قند والا قصہ بات کچھ بھی نہ تھی۔ مغلئی دسترخوان کی مرچیں ہمیں تیز معلوم ہوئیں تو حلوے کے مرتبان کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ مشکل کوئی پاؤ بھر حلوہ کھا سکے ہوں گے کہ قرباں بردار خاں نے بڑی بدتمیزی سے مرتبان ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا۔ اس معمولی سے واقعے پر لوگوں نے اتنا لمبا چوڑا افسانہ تراش لیا۔ ہمیں ہرگز علم نہ تھا کہ مرتبان میں حلوے کی جگہ گلقند ہے اور اگر علم ہوتا بھی تو کیا فرق پڑ جاتا۔

ہنوز دلی دور است اس فقرے کو ہم نے اہلِ دلی کا تکیہ کلام پایا۔ جب ہم خیبر میں تھے تو سنا تھا کہ ہمارے لیے ہنوز دلی دور تھی۔ جب لاہور پہنچے تب بھی دور رہی۔ لال قلعے میں پہنچ کر بھی لوگوں کا یہی خیال ہے کہ ہنوز دلی دور است ہے۔ اچھا بھئی چلو دلی دور است بس!

محمد شاہ کا دربار مسز محمد شاہ لال قلعے میں اس دھوم دھڑلے سے رہتی ہیں کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ سیاسی دنگے فساد میں ہمیشہ ان کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ملک کی خارجی اور اندرونی پالیسی (جب اتفاق سے ہوتی ہے) وہ خود ترتیب دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ اعلیٰ حکام کی پوسٹنگ وغیرہ بھی وہ خود ہی کرتی ہیں۔ وہ فارسی، عربی، سنسکرت اور مدراسی بول سکتی ہیں لیکن دیگر بیگمات کا خیال ہے کہ وہ سمجھ ایک زبان بھی نہیں سکتیں۔ (ویسے دیگر بیگمات کا ہمیشہ کچھ اور ہی خیال ہوا کرتا ہے) درباری بیگمات بے حد ذہین ہیں۔ ایک برجیس جہاں بیگم نے برجس کو دیکھ کر چوڑی دار پاجامہ ایجاد کیا۔ دوسری نے شلوار کو ساری میں ضرب دے کر دو پر تقسیم کر دیا اور غرارہ دریافت کیا۔ تعجب ہے کہ یہ خیال اسے علیٰ الصبح غرارہ کرتے وقت آیا۔

صبح شام شہر کی چیدہ چیدہ خواتین حاضر ہوکر آداب بجا لاتی ہیں اور شہر کی دوسری چیدہ چیدہ خواتین کے بارے میں تازہ ترین افواہیں سناتی ہیں۔

عزیزی محمد شاہ بھی لال قلعے ہی میں وہیں کہیں رہتا ہے۔

اس کا خیال ہے کہ وہ ہندوستان کا بادشاہ ہے۔ لہٰذا اپنے تئیں شہنشاہِ ہند کہلاتا ہے۔ رنگین خواب دیکھتا ہے، رنگین لباس پہنتا ہے، رجعت پسند ادب اور تنزل پسند شاعری کا گرویدہ ہے۔ لیکن حرکتیں سب ترقی پسند کرتا ہے۔

کل وزیرِ جنگ نے بتایا کہ ملک کے کچھ حصوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے۔ عزیزی محمد شاہ خوش ہوکر بولا۔ اب ملک کا بیشتر حصہ خود مختار ہو چکا ہے جتنے صوبے اور ریاستیں خود مختار ہوں گے اتنا ہی ہمارا کام کم ہو جائے گا۔ ملک کے ریاستوں میں بٹتے ہی ان کی ریاست ہائے متحدہ بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

عزیزی کے تعلقات مرہٹوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ خوش گوار ہیں۔ جب مرہٹے بے کار ہوتے ہیں تو سیدھے دلی آ دھمکتے ہیں۔ پچھلے ماہ آئے تھے تو نربدا، چنبل اور مالوہ کے علاقے لے کر ٹلے۔ خیر، ہمیں کیا عزیزی جانے اور اس کا کام۔ ہندی فوج کو دیکھ کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔ لڑنے جاتے ہیں تو پالکیوں میں بیٹھ کر، میدانِ جنگ میں ڈھال ملازم اٹھاتا ہے، ہر وقت صلح کے خواہاں ہیں۔ ہر سپاہی کی وردی مختلف ہے۔ کرنال میں ہم سے لڑنے آئے تو جیسے عید کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ہمیں زیادہ نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیے۔ انسان خاک کا پتلا ہے۔

مینا بازار اور ہم محمد شاہ کے بزرگوں کے وقت سے رسم چلی آتی ہے کہ موسمِ بہار میں لال قلعے میں مینا بازار لگتا ہے جس میں طرح طرح کی دکانیں سجائی جاتی ہیں۔ دکانوں سے زیادہ بیگمات سجتی ہیں اور مختلف اشیا بازار سے چوگنے نرخ پر خریدتی ہیں۔ ان دنوں تو ذرا بہانے پر

مینا بازار لگ جاتا ہے ۔ ہماری طبیعت حاضر تھی ۔ محمد شاہ سے مینا بازار دیکھنے کی خواہش ظاہر کی ۔ اس نے ٹالنا چاہا ۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم بزرگ بھی ہیں ۔ وہ بولا کہ اگر آپ کو اتنا ہی شوق ہے تو دو دن سمندِ شوق کو لگام دیجیے ۔ اس مینا بازار کے ختم ہوتے ہی ایک مردوں کے مینابازار کا انتظام کرائے دیتا ہوں جس میں سب مرد ہی مرد ہوں گے ۔ پوچھا کہ ہم زنانے شو میں کیوں نہیں جا سکتے ۔ بولا ۔ اس میں سوائے بادشاہِ ہند کے کسی کا گزر نہیں ہو سکتا ۔ ہم نے فرمایا کچھ دیر کے لیے ہمیں بادشاہِ ہند سمجھ لیا جائے ۔ آدمی عقل مند تھا ۔ مان گیا ۔ ہمارا فرزند علی قلی خاں بائیس سال کا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو نابالغ سمجھتا ہے ۔ اپنے ہم جنسوں کی صحبت کے بجائے عورتوں میں اٹھنے بیٹھنے کو ترجیح دیتا ہے ۔ ہمارے ساتھ مینا بازار جانے پر مصر ہوا ۔ دیکھا کہ ہر طرف نازنینانِ گل بدن رنگ برنگے ملبوس پہنے چہلیں کرتی ہیں ۔ نہ نگاہیں نیچی ہیں ۔ نہ دوپٹے کا خیال ہے ۔ دیکھ کر آنکھوں میں خون اتر آیا (آج صبح بھی ایک مرتبہ خون اترا تھا) ہمارے بارے میں سب کو علم ہو چکا تھا ۔ ہمیں گھیر لیا گیا ۔ ہمارے دستخط لیے گئے ۔ ساتھ ساتھ مناسب اشعار لکھنے کو کہا گیا ۔ ہم سے طرح طرح کے پریشان کن سوالات پوچھے گئے ۔

ارادہ ہوا کہ کچھ زنانہ سامانِ آرائش ایران لے جانے کے لیے خریدیں پھر سوچا ہمارے پہنچتے پہنچتے کہیں فیشن نہ بدل جائے ۔

ایک ماہ رو نظر پڑی کہ کچھ سامان لیے جاتی ہے ۔ ایک دکان کے سامنے اس نے آواز دی۔ قلی ! قلی ! ، کیا دیکھتے ہیں کہ پسرِ ناخلف علی قلی خدا جانے کہاں سے بھاگتا ہوا آیا اور اس کا سامان اٹھالیا ۔

" تم قلی ہو ؟ " اس نے پوچھا ۔

" ہاں ۔۔ بالکل ۔۔ " علی قلی نے جواب دیا ۔

اگرچہ ہم علی قلی کے اس قسم کے قلی بن جانے پر خفا تھے مگر اس کی حسِ مزاح پر حیرت ہوئی کیوں کہ ہمارا خاندان اس حس سے بے بہرہ تھا ۔ ہم میں خود مذاق برداشت کرنے کی تاب نہیں ۔ کچھ دیر بعد جب غلطی کا ازالہ ہوا تو نازنین بے حد محظوظ ہوئی اور بڑی معصومیت سے پوچھنے لگی ۔ " آج شام آپ کیا کر رہے ہیں ؟ "

" کوئی خاص کام نہیں ۔ " علی قلی نے جواب دیا ۔

" مست قلندر صاحب کے عرس پر ایک سرکس آیا ہوا ہے ۔ " وہ بدستور معصومیت سے بولی ۔

" میں پہلے شو کے لیے دو نشستیں بک کرالوں گا اور باہر ٹکٹ گھر کے پاس انتظار کروں گا ۔ خدا حافظ ! میرے ابا مجھے گھور رہے ہیں ۔ " علی قلی بھاگا ۔

شام کو ہم اس کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ آئینے کے سامنے کھڑا مونچھیں تراش رہا

ہے ۔ بازپرس کی تو بولا عرس پر جارہا ہوں ۔ ہم نے پوچھا ٹکٹ کی قیمت کون دے گا ۔ اس کے منہ سے نکل گیا ۔ چچا محمد شاہ نے دو سیٹیں بک کرادی ہیں ۔ پوچھا دوسری کس کے لیے ہے تو چپ ہوگیا ۔

"نامعقول ! ایسے ہجوم میں جاکر خواہ مخواہ اسکینڈل کروائے گا ۔" ہم نے گرج کر کہا "کچھ ہماری پوزیشن ہی کا خیال کر ۔"

"ابا جان میں وعدہ کرچکا ہوں ۔" اس نے ایسے عدم تشدد انداز سے کہا کہ ہم لوٹ آئے ۔

ہندی کلچر ہندی کلچر کی بے حد تعریفیں سن تھیں چناں چہ دیکھنے کا شوق تھا (حملے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی تھی ۔ فرماں بردار خاں کو وقت پر سوجھتی نہیں ۔)

عزیزی محمد شاہ سے ذکر کیا وہ بولا کلچر وغیرہ کا تو پتہ نہیں آپ نے ایگری کلچر سنا ہوگا ۔ وہ البتہ مشہور ہے ۔ ہم مصر ہوئے تو کہنے لگا ۔ آپ سنی سنائی باتوں کا یقین نہ کیجیے ۔ ویسے ہمارے ہاں چند ایک باتیں واقعی شہرہ ، آفاق ہیں ۔ ایک تو یہی قدیم دواخانے جن کے لیے بھیس بدل کر شہر میں چلنا ہوگا ۔ چناں چہ ہم دونوں گئے ۔ ایک جگہ ایک شخص (جو کہ مدرس تھا) بھینسوں کے آگے بین بجارہا تھا اور بھینسیں متوجہ نہیں تھیں ۔ ایک سیاسی جلسے میں بہت سے حضرات اپنے سامنے ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ رکھے عبادت میں مشغول تھے ۔ وہیں ایک شخص کہ باغیرت معلوم ہوتا تھا ۔ چلو میں پانی لیے ناک ڈبونے کی کوشش کررہا تھا ۔ ایک جگہ دو حکام شہر ایک پرندے کو کھینچ کر سیدھا کرنے کی کوشش کررہے تھے ۔ پرندہ الو تھا ۔ ایک نہایت ضعیف بزرگ قبر کے کنارے پاؤں لٹکائے نوجوانوں پر تنقید کررہے تھے ۔ محمد شاہ کے متعلق ہم کہہ نہیں سکتے ۔ البتہ ہم از حد محظوظ ہوئے ۔

علی قلی کی گستاخی اور ہمارا تحمل آہستہ آہستہ برخوردار علی قلی اور اس لڑکی کا قصہ مشہور ہوتا جارہا تھا ۔ سوچا کہ اس معاملے کو فوراً ختم کیا جائے ۔ چناں چہ اس کے کمرے میں گئے وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال گھنگھریالے بنانے کی کوشش کررہا تھا ۔ ہمیں دیکھ کر بولا "ابا جان معاف فرمائیے ۔ دروازہ کھٹکھٹائے بغیر اندر آنا موجودہ آداب کے خلاف ہے ۔"

ہمیں سخت غصہ آیا ۔ یہ نئی پود ہمیں آداب سکھائے گی ۔ یہ لڑکا دن بہ دن بگڑتا جارہا ہے ۔

"ہم تجھے جگالی کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں ۔ جب سے دلی آیا ہے ۔ ہر وقت منہ چلتا رہتا ہے ۔ کیا ہے تیرے منہ میں ۔ ؟"

"پان کھارہا ہوں ۔ کسی نے دیا تھا ۔" وہ بولا ۔

"یہ کسی کون ہے؟ وہی عرس والی لڑکی تو نہیں۔ وہ تو بے حد معمولی سی ہے۔"
ہم نے فرمایا۔

"ابا جان اس کی ٹھوڑی پر جو وہ خوش نما تل ہے وہ نہایت بھلا معلوم ہوتا ہے۔"
مصیبت تو یہ ہے کہ آج کل کے نوجوان خوش نما تل پر عاشق ہو کر سالم لڑکی سے شادی کر بیٹھتے ہیں۔"

"ابا جان محبت بری چیز ہے۔؟" وہ سرد آہ کھینچ کر بولا۔

"تو سپاہی ہے۔ تجھے تلوار اور گھوڑے سے محبت کرنی چاہیے۔ ہم خود گھوڑوں کو چاہتے ہیں۔ گھوڑے جب پیار کریں تو ساڑیوں اور زیورات کی فرمائش نہیں کرتے۔"

"اباجان بات دراصل یہ ہے کہ مجھے۔ اس سے۔"

"خبردار گستاخی کرتا ہے۔ جانتا ہے کہ تو نادر شاہ ابن شمشیر ابن شمشیر کی اولادِ ناخلف ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ دادا جان کا نام شمشیر تھا۔ شمشیر شاہ۔"

"ابے گستاخ، شمشیر سے مطلب تلوار ہے۔ سمجھا؟"

"سمجھ گیا۔ اباجان کیا آپ مجھے چار روپے آٹھ آنے دے سکیں گے سرکس کے لیے۔"
ایسے نالائق کو ہم اور کیا کہہ سکتے تھے۔

ہمارا اصلاحات رائج کرنا مصاحب حضوری حقہ بردار خاں معروض ہوا کہ شہنشاہوں کا رواج رہا ہے کہ رعایا کی بہبودی کے لیے حسبِ توفیق اصلاحات نافذ کرتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ رعایا کی بہبودی کے لیے مفید اصلاحات عمل میں لائیں تاکہ اہلِ ہند ہمیں رہتی دنیا تک یاد کریں۔ ہم حیران ہوئے کیوں کہ ہمارے خیال میں ہماری ہر حرکت میں اہلِ ہند کے لیے کوئی نہ کوئی اصلاح پوشیدہ تھی۔ جب دیکھا کہ وہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتا تو کافی غور و خوض کے بعد مندرجہ ذیل فہرست مرتب فرمائی۔

۱۔ درہ خیبر کو ڈھا کر ہموار کرایا جائے۔ وہاں سے دلی تک دس دس میل کے فاصلے پر عالی شان سرائیں تعمیر کرائی جائیں تاکہ حملہ آوروں کو کسی دقت کا سامنا نہ ہو۔ سڑک پر جگہ جگہ "خوش آمدید" نصب کیا جائے۔ ساتھ ہی ایک محکمہ کھولا جائے جو دوسرے ممالک میں نشر و اشاعت کے ذریعے لوگوں کو ہند میں آنے کی ترغیب دے۔

۲۔ ستلج اور جمنا کے درمیان ایک وسیع علاقہ خشک اور غیر آباد پڑا ہے۔ اس خطے کو سیراب کرنے کے لیے ایک عظیم الشان دریا کھدوایا جائے۔

۳۔ ہند کے تاریخی مقامات ملک بھر میں بکھرے ہوئے ہیں۔ سیاحوں کو بڑی قباحت

کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ تاج محل آگرے میں ہے ۔ غار ہائے ایلورا، ایلورا میں تو جہانگیر کا مقبرہ لاہور میں ۔ ان ساری تاریخی عمارات کو منہدم کرکے دلی میں (جو کہ مرکزی مقام ہے) دوبارہ تعمیر کرایا جائے تاکہ سب کچھ بہ یک وقت دیکھا جاسکے ۔

۴ ۔ ہر سال درخت اکھاڑنے کا ہفتہ بڑے زور و شور سے منایا جائے ۔

۵ ۔ قطب صاحب کی لاٹھ کا نام تبدیل کرکے اگلے حملہ آور کے آنے تک نادر شاہ کی لاٹھ رکھا جائے تاکہ لوگوں کو حملہ آوروں کے نام بہ آسانی یاد رہ سکیں اور تاریخ ہند مرتب کرنے میں آسانی ہو ۔

وہ اصلاحات گنانے بیٹھیں جو ہم نے اس مختصر سے قیام میں نافذ کرائیں تو بے شمار ہیں ۔ ہمیں یاد بھی نہیں رہیں مثلاً بارہ دری کی جگہ تیرہ دری بھی تعمیر کرائی جائیں ۔ جنگل میں منگل ہی نہیں بدھ بھی منایا جائے وغیرہ وغیرہ ۔

محبت اور شادی کے متعلق ہمارے خیالات ہمارے خیال میں اگر محبت کو شادی سے اور شادی کو محبت سے دور رکھا جائے تو دونوں نہایت مفید چیزیں ہیں لیکن نوجوان بڑی جلد بازی سے کام لیتے ہیں ۔ دوسروں کے تجربے سے مستفیض نہیں ہوتے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ شادی مول لے بیٹھتے ہیں ۔

اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ جو لوگ شادی سے پہلے پچھتاتے تھے وہ شادی کرنے کے بعد بھی خوب پچھتاتے ہیں ۔ ہم کبھی نہیں پچھتائے حالاں کہ ہم کسی زمانے میں بڑے بانکے البیلے نوجوان مشہور تھے ۔

جب ہمیں معلوم ہوا کہ برخوردار علی قلی شادی پر تلا بیٹھا ہے تو ارادہ ہوا کہ اسے من مانی کرلے دیں ۔ کیا یاد کرے گا لیکن ان ہی دنوں ہم ایک ایسی حرکت کے مرتکب ہوئے جو ہمارے جیسے بزرگ کی شان کے شایان ہرگز نہ تھی ۔ ویسے ہم چھپ کر کسی کی باتیں سننے کے عادی نہیں ہیں ۔ اس روز نہ جانے کیوں ہم نے یہ برداشت کیا اور اوٹ سے ان دونوں کی گفتگو سنی ۔

لڑکی نے برخوردار علی قلی کی آمدنی کے متعلق پوچھا ۔ علی قلی نے ہمارا حوالہ دیا کہ والدِ بزرگ شہنشاہ ہیں ۔ وہ بولی " شہزادوں کی تو خدا کے فضل سے یہاں بھی کوئی کمی نہیں ہے ہر تیسرا نوجوان شہزادہ ہے بلکہ غیر شہزادہ ہونا زیادہ اہمیت رکھتا ہے ۔

"ہمارے ملک میں تیل کے چشمے ہیں ۔ " علی قلی کا یہ کہنا تھا کہ لڑکی کی باچھیں کھل گئیں ۔

"تمہارے کنبے کے متعلق ہی پوچھ رہی تھیں ۔ تم مغل ہو ۔ "

" مغل وغیرہ کا پتہ نہیں ۔ ویسے ہم ابن شمشیر ابن شمشیر ہوتے ہیں ۔ " علی قلی بولا

"بہرحال ہمارے کنبے والے ایران سے تمہارے چال چلن کی تصدیق کرائیں گے۔"
"چال تو میں ابھی چل کر دکھادیتا ہوں۔ علی قلی نے بھول پن سے کہا۔" رہ گیا چلن شادی کے بعد ایران چلوگی تو وہاں دیکھ لینا۔"
"ایران جانا تو ذرا مشکل ہے کیوں کہ امی جان مجھے بے حد چاہتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ شہزادہ علی قلی ہر سال ایک ماہ کی چھٹی لے کر آیا جایا کرے گایا یوں ہو کہ ابا جان شہنشاہ محمد شاہ سے مل کر تمہیں کوئی ریاست الاٹ کرادیں۔"
"تجویز تو یہ بھی اچھی ہے۔" وہ ناخلف بولا "لیکن اگر میں ایران چلا گیا تو تم اداس رہا کروگی۔"
"تم اس کی فکر نہ کرو۔ ہمارے ہاں کافی شہزادوں کا آنا جانا ہے۔"
علی قلی بگڑنے لگا "تم پرسوں شام کس شہزادے کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے گئی تھیں۔" "وہ تو بھائی جان کے دوست ہیں ان کی پالکی بالکل نئے ماڈل کی ہے۔ تمہارے ساتھ پیدل چلنا پڑتا ہے۔ شام کا لباس خراب ہوجاتا ہے۔"
ہم بقیہ گفتگو سنے بغیر تشریف لے آئے۔

علی قلی کا علاج

ہمیں یقین ہوچکا تھا کہ یہ لڑکی بہت زیادہ ماڈرن خیالات کی ہے۔ بے چارے علی قلی کو وہ تگنی کا ناچ نچائے گی کہ زن مرید بن کر رہ جائے گا۔ ہم نے جو برخوردار خاں فیلسوف سے ذکر کیا اس نے بڑے پتے کی بات کہی۔ یہی کہ وہ دونوں محض فلرٹ کررہے ہیں۔ سنجیدہ کوئی بھی نہیں ہے۔ علی قلی لڑکی سے ہمیشہ شام کو ملتا ہے اور شام کو اس کے سانس میں مئے رنگیں کی بو ہوتی ہے جسے وہ الائچی یا پان سے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک روز اس کی پوستین سے پوست کی کافی مقدار برآمد ہوئی۔
ہمارا تجربہ ہے کہ غروبِ آفتاب کے بعد قندیلوں کی جھلملاتی روشنی میں سب لڑکیاں حسین معلوم ہوتی ہیں۔ خصوصاً چند گھونٹ بادہ رنگین چڑھالینے کے بعد۔ ہم نے درویشِ کامل شیخ بوٹا شجر پوری کا نسخہ نکالا جو انھوں نے محبت اتارنے کے سلسلے میں بتایا تھا۔ اسے علی قلی پر آزمایا اور تیر بہ ہدف پایا۔ شام ہوتے ہی علی قلی کو کہیں باہر کام پر بھیج دیا جاتا۔ پینا پلانا چھڑوادیا گیا۔ لڑکی لگاتار علی الصبح اسے دکھائی گئی۔ سورج کی روشنی میں جب علی قلی نے لڑکی کی اصلی شکل بغیر میک اپ کے دیکھی۔ تو بہت سے راز ہائے پنہاں آشکار ہوئے۔ چند ہی دنوں میں ایسا بدلا کہ لڑکی سے کوسوں دور بھاگنے لگا۔ دلی کا رخ ہی نہ کرتا تھا۔ بلکہ ایک روز معروض ہوا کہ میں تارک الدنیا بننا چاہتا ہوں۔ ہم نے اسے منع کردیا۔

شیخ بوٹا شجر پوری کے بقیہ نسخے بھی استعمال کریں گے ۔ انشاء اللہ تعالیٰ ۔

ہند کے بادشاہ گر ہند کے دو بادشاہ گر سید برادرز (حسین علی خاں اور پتہ نہیں کیا علی خاں) تقریباً ہر روز پریس کانفرنس منعقد کرتے اور انواع و اقسام کے بیان دیتے ۔ چوں کہ پریس ان کے ہاتھ میں تھا اس لیے ملک کی سیاست پر پورا قابو تھا ۔ دونوں بھائی اکثر دورے پر رہتے تھے اس لیے ہماری خدمت میں حاضر نہ ہوسکے ۔ ایک روز ہم نے بازار میں ایک بورڈ دیکھا جس پر "اصلی شہنشاہی بادشاہ گرانِ مملکت ہند" لکھا تھا ۔ اوقات ملاقات اور مشورے کی فیس بھی درج تھی ۔ ہم نے انھیں اپنے دیدار سے سرفراز فرمایا اور انھیں بلا کا چست و چالاک اور چار سو بیس پایا ۔ کاش کہ ہم ایسے اسمارٹ لوگوں کو اپنے ساتھ لے جاسکتے ۔ محمد شاہ سے کہا کہ ہمیں ایک جوڑی بادشاہ گر درکار ہیں ۔ وہ ملتمس ہوا کہ انہی کے دم سے تو دلی میں رونق ہے لِلّٰہ انھیں چھوڑ جائیے ۔ گداگر البتہ حاضر ہیں ۔"

"وہ تو ہم ملتان سے خود لاسکتے ہیں ۔" ہم نے فرمایا ۔

ایک رفیقِ دیرینہ سے ملاقات چاندنی چوک سے گزر رہے تھے کہ شور و غل سنائی دیا ۔ دیکھتے ہیں کہ بہت بڑا جلوس آرہا ہے ۔ آگے آگے ہاروں سے لدا ہوا ایک شخص ہے کہ شکل اس کی زمانہ ساز خاں سے ملتی ہے ۔ یہ زمانہ ساز خاں ہی تھا ۔ ہمیں پہچان گیا، معانقہ کیا ۔ معلوم ہوا کہ ملک کے بڑے لیڈروں میں سے ہے ۔ خدا کی شان کہ یہی زمانہ ساز خاں کبھی زمانے کی ٹھوکریں کھاتا اور بھیڑوں کی اون تراشتا ۔ آج اس شان و شوکت سے نکلتا ہے کہ شہنشاہ دیکھیں تو رشک کریں ۔ شام کو ہم نے اسے مدعو کرکے اس کی عزت افزائی فرمائی اور اس حیرت انگیز ترقی کی وجہ پوچھی ۔ کہنے لگا کہ اس کی زندگی قربانیوں کا مرقع رہی ہے ۔ ملک اور قوم کی خدمت کرکے اس رتبہ کو پہنچا ہے ۔ شراب کا دور چلا تو بہت جلد آؤٹ ہوگیا ۔ ہمارے دوبارہ استفسار کرنے پر اصلی بھید کھلا ۔ اس نے اقبال کیا کہ ایران سے یہاں آکر بکریوں کی اون تراشنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی ۔ پھر پوسٹر چسپاں کرنے پر ملازم ہوگیا ۔ ایک روز شوئیِ قسمت سے پوسٹر لگاتا ہوا گرفتار کرلیا گیا ۔ صاحبِ پوسٹر سے جیل میں تعارف ہوا ۔ رہائی کے بعد انھوں نے ایک سیاسی جلسے میں بلایا ۔ اسٹیج کے قریب دھواں دھار تقریر سننے میں ہمہ تن گوش تھا (جو خاک سمجھ میں نہیں آرہی تھی) کہ لاٹھی چارج کی مہیب صدا کانوں میں پڑی ۔ گھڑی بھر میں افراتفری مچ گئی ۔ چناں چہ مخالف سمت میں جست لگائی اور اتفاقاً اسٹیج پر اپنے تئیں کھڑا پایا ۔ گرفتاری شروع ہوئی تو غلطی سے لیڈروں کے ساتھ دھرلیا گیا ۔ جیل میں سیاسی قیدیوں والا سلوک

ہوا جو کہ نہایت تسلی بخش تھا ۔ رہائی ہوئی تو پبلک نے جھنڈوں ، بینڈ باجوں ، نعروں اور آتش بازی سے استقبال کیا ۔ شہر بھر میں جلوس نکلا ۔ گھر پہنچا تو بالکل جی نہ لگتا تھا ۔ اگلے ہفتہ سیاسی جلسے میں دانستہ طور پر اسٹیج کے قریب رہا ۔ لاٹھی چارج ہوتے ہی فورا لیڈروں میں گھس گیا تاکہ گرفتاری کے وقت آسانی سے دست یاب ہوسکے ۔ بڑے گھر میں قیام و طعام کا انتظام گھر سے لاکھ درجے بہتر تھا ۔ چناں چہ تقریباً ہر روز یہی تماشا ہوتا رہا ۔ پبلک بھی اسے بار بار دیکھ کر نوٹس لینے لگی ۔ اسے بھی محسوس ہوا کہ آہستہ آہستہ وہ کچھ لیڈر بنتا جارہا ہے ، اب اس نے سنجیدگی سے کام شروع کیا ۔ کتابوں سے تقریریں نقل کرنے لگا ۔ آئینے کے سامنے مشق شروع کردی ۔

خدا نے دن پھیرے اور وہ لیڈروں میں شمار کیا جانے لگا ۔

ہم نے یہ سنا تو رشک و حسد کے جذبات محسوس فرمائے ۔ پھر سوچا کہ موجودہ پوزیشن بھی کوئی خاص بری نہیں ہے ۔ زمانہ ساز خاں معروض ہوا کہ " برخوردار علی قلی خاں کچھ کچھ پرولتاری سا معلوم ہوتا ہے کیوں نہ اس کو اسی لائن میں ڈال دیا جائے ۔ " ہم نے فرمایا کہ علی قلی خاں روپے پیسے والا ہے ۔ یہ تو جب چاہے لیڈر بن سکتا ہے ۔ وہ ملتمس ہوا کہ یہ بھی درست ہے لیکن فی زمانہ لیڈری افضل ترین پیشہ ہے ، ہم نے بات کاٹی اور فرمایا کہ نہیں لیڈری نمبر دو ہے اور پیری مریدی نمبر ایک ۔

ہمارا مقامی سیاست میں حصہ لینا ان دنوں ایک الیکشن زوروں پر تھی ۔ الوشناس معروض ہوا کہ ہم دلی میں اس قدر مقبول ہوچکے ہیں کہ کسی ٹکٹ پر کھڑے ہوجائیں انشاء اللہ کامیاب ہوں گے ۔ بادشاہ گروں سے مشورہ لینا بے کار تھا کیوں کہ الیکشن کے معاملے میں وہ بالکل یوں ہی تھے ۔ ایک ایک ٹکٹ پر لاتعداد امیدواروں کو نامزد کردیتے تھے ۔ یہاں تک کہ بعض اوقات امیدواروں کی تعداد رائے دہندگان سے زیادہ ہوجاتی ۔ لطف یہ تھا کہ ہمارے مقابلے میں محمد شاہ بھی تھا ۔ قرباں بردار خاں نے حسبِ معمول نہایت مایوس کن خبریں سنائیں ۔ جب ہم نے اس کو برا بھلا کہا تو وہ بھی مان گیا کہ واقعی ہم شہر میں بے حد ہر دل عزیز ہیں اور الیکشن میں ضرور کامیاب ہوں گے ۔ یہ شخص آہستہ آہستہ ہمارے مزاج سے واقف ہوتاجارہا ہے ۔

سات امیدواروں میں سے دو کو زرِ کثیر تحفتاً دے کر بٹھایا گیا ۔ تیسرے کو ذرا دھمکا کر علاحدہ کیا ، چوتھے کو سفیر بناکر باہر بھجوانا پڑا ۔ دو کمال درجہ ضدی نکلے ، ایک کو زدو کوب کرایا تو مانا ، دوسرے نے مشکوک حالات میں داعیِ اجل کو لبیک کہا ۔ رائے شماری شروع ہوئی ۔ حقہ بردار خاں نے شہر بھر کی دعوت کی ، لوگوں کو تحفے اور زرِ نقد دیا ، رائے دینے والوں کو ... سے خوش کیا ۔ اتنی خاطر تواضع کے بعد بھی کوئی بد تمیز نہ مانتا تو اسے ڈنڈے

کے زور سے منوایاجاتا کہ ہم سچ مچ ہر دل عزیز ہیں ۔ ہم جیت تو گئے لیکن اخراجات کی تفصیل دیکھی تو از حد پشیمان ہوئے ۔ افسوس بھی ہوا کہ ناحق ذرا سی خوش وقتی کی خاطر اتنا روپیہ اور وقت برباد کیا ۔ معلوم ہوا کہ ہند میں ہر صاحبِ دولت کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے کہ الیکشن لڑے ۔ سیاسی معاملات میں یہ لوگ سنجیدہ بالکل نہیں ہوتے ۔ نتیجے سے زیادہ وقتی ہنگامے کی پرواہ کرتے ہیں اور محظوظ ہوتے ہیں ۔

ملک ملک کا رواج ہے صاحب ۔

دلی میں سیٹل ہونے کا ارادہ الو شناس نے مشورہ دیا کہ دنیا میں یوں مارے مارے پھرنے کی بجائے کیوں نہ ہم ایک اچھی سی مملکت میں باقاعدہ سیٹل ہوجائیں ۔ یہ حقیقت ہے کہ اب تک ہماری حیثیت مانند ایک رفیوجی کے رہی ہے ۔ ہم نے عزیزی محمد شاہ سے عرض کیا اور رہائش کے لیے لال قلعہ الاٹ کروانے کی خواہش ظاہر کی ۔ وہ بولا ۔ لال قلعے میں تو ہم رہتے ہیں ۔ آپ قطب صاحب کی لاٹھ الاٹ کرالیجیے یا شاہی مسجد ۔

ہم نے انکار فرمایا اور اپنے مہاجر ہونے کی اہمیت جتائی ۔ وہ بولا ۔ ہم لوگ بھی تو مہاجر ہیں ۔ ہمارے آباء و اجداد وسطِ ایشیا سے آئے تھے ۔ ہم نے بہیترا سمجھایا کہ وہ مقامی مہاجر ہیں اور ہم نووارد ہیں جنہیں اب تک نہیں بسایا گیا تھا ۔ اس نے گستاخانہ کہا یوں تو حضرت آدم بھی مہاجر تھے کہ بہشت چھوڑ کر آئے تھے ۔

ہمیں سخت غصہ آیا لیکن فوراً اتر گیا ۔ پتہ نہیں کیا بات ہے ۔ ہند میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد وہ پہلے جیسا غصہ ہی نہیں آتا لیکن محمد شاہ کو اس گستاخی کی سزا اسی شام کو مل گئی ۔ الو شناس بھاگا بھاگا آیا ۔ بولا ۔ محمد شاہ خزانے میں ہے اور زر و جواہرات ادھر ادھر چھپارہا ہے ۔ ہم فوراً موقع پر پہنچے ۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے اس نے ایک وزنی سی چیز اپنی پگڑی میں چھپالی ۔ ہند کے رواج کے مطابق ہم نے از راہِ مروت فرمایا کہ آج سے محمد شاہ اور ہم بھائی بھائی ہیں لہٰذا ہم دونوں اپنی پگڑیاں بدلیں گے ۔

یہ محض اتفاق تھا کہ اس پگڑی سے کوہ نور ہیرا برآمد ہوا ۔

ہندی وزرا سے شکر رنجی الو شناس اور محمد شاہ کے وزرا کی ناچاقی کی وجہ دو کروڑ کی وہ رقم تھی جو شاہی ایلچی ہمارے لیے کرنال میں لے کر آیا تھا ۔ وزرا کا اصرار تھا کہ رقم ادا ہوچکی ہے ۔ الو شناس انکار کرتا تھا اور یہ بھی کہتا تھا کہ رقم دو کروڑ نہیں ڈھائی کروڑ تھی ۔ ایلچی اسی کش مکش میں اللہ کو پیارا ہوچکا تھا ۔ ہم نے محمد شاہ سے فرمایا کہ روپیہ پیسہ ہاتھ کا میل

ہے لہٰذا شاہی خزانے سے رقم چکادی جائے ۔ رقم ادا کردی گئی لیکن شکر رنجی نہ گئی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ اپنے وزیروں سے ڈرتا ہے ۔ بولا ۔ اہل دربار کی التجا ہے کہ اس مرتبہ آپ سے رسید لکھوالی جائے ۔ ہم مان گئے ۔ ڈھائی کروڑ کی رسید تیار کی گئی ۔ ہم نے دستخط شروع کیے ۔ ابھی چوتھی مرتبہ ہی ابن شمشیر لکھا ہوگا کہ وہ گھبرا گئے اور کہنے لگے کہ کاغذ چھوٹا ہے دستخط مختصر ہونے چاہئیں ۔ عزیزی محمد شاہ کے دستخط تو بےحد مختصر ہیں ۔ اس نے شکستہ حروف میں محض ۔ ایم ایس ۔ رنگیلا لکھا ہے ۔

اب کم بخت محرر کہیں سے آمرا ۔ معروض ہوا کہ محاسب اعلیٰ کے اعتراض سے بچنے کے لیے رسید پر ایک آنے کا ٹکٹ چسپاں کیا جائے ۔ ٹکٹ لگایا تو معلوم ہوا کہ یہ غلط ٹکٹ تھا ۔ محکمہ ۔ مال کا ٹکٹ ہونا چاہیے ۔ پھر کسی نے کہا کہ ایک آنے کا نہیں دو آنے کا ٹکٹ ہونا چاہیے ۔ مجبوراً اپنی جیب سے دو آنے دیے ۔ اس دفتری کاروائی سے طبیعت بدمزہ سی ہوگئی اور ساڑھے چار کروڑ کا لطف نہ آیا ۔

"ایسے لاجواب وزیر تم نے کہاں سے حاصل کیے ؟" ہم نے پوچھا ۔

"وزیرستان سے" وہ بولا ۔

"اور یہ وزیر آباد کیا ہے ؟"

"یہ یوں ہی ہے" ۔

ایک باکمال بزرگ قطب الدین خاں جاگیردار کی شادی پر گئے ۔ دولھا کی عجب درگت بنی ۔ عورتیں پہلے تو اسے برا بھلا کہتی رہیں پھر زدو کوب کرنے لگیں اور وہ تھا کہ چپ چاپ بیٹھا تھا ۔ سوچا کہ ان بن ہوگئی ہے لیکن معلوم ہوا کہ شادی کی رسمیں ادا ہورہی ہیں ۔ لاحول پڑھی ۔ نکاح سے قبل ہم نے دولھا سے دریافت کیا کہ اس کی آخری خواہش کیا ہے تاکہ پوری کروادی جائے ۔ وہیں ایک لنگوٹی پوش بزرگ کو دیکھا کہ لمباسا عصا ہاتھ میں لیے خاموش بیٹھے ہیں ۔ کسی کو علم نہ تھا کہ یہ رہتے کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں لیکن کہیں شادی ہو تو ضرور آتے ہیں ۔ نکاح شروع ہوا تو ذرا قریب آگئے ۔ جب دولھا نے "قبول کیا" کہا تو بزرگ نے "ڈنڈا اچھال کر "پھنس گیا" کا نعرہ لگایا اور غائب ہو گئے ہر شادی میں وہ اسی طرح کرتے ہیں ۔

تعجب ہے کہ ہند میں ایسے ایسے باکمال بزرگ بھی موجود ہیں ۔

مینا بازاروں کی بھرمار اب تو مینا بازار ہر ہفتے ہوتا ۔ ملک کے مختلف حصوں سے خواتین آرائشی سامان خریدنے کے بہانے آتیں ۔ اپنی دختران وغیرہ کو بھی ساتھ لاتیں ۔ نہ جانے

کس نے اڑا دی تھی کہ یا تو خدا نخواستہ ہم ایک اور شادی کریں گے یا برخوردار علی قلی خاں منگنی کرائے گا لیکن ہم خواتین سے دور ہی رہتے ۔ برخوردار علی قلی کو بھی دور دور رکھتے ۔ ہم شادی برائے شادی کے ہرگز قائل نہیں ہیں ۔

خواتین سے دور رہنے کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ ان کے قریب رہ کر ہمیں دیدے مٹکانے ، ہاتھ نچانے اور انگلی سے ناک چھوکر بات کرنے کی عادت پڑگئی تھی ۔ دوران گفتگو میں ہمارے منہ سے غیر شعوری طور پر اف ، اوئی ، اللہ ، توبہ ، ہائے ، نگوڑا وغیرہ جیسے کلمات بھی نکل جاتے جس سے بعد میں سخت پشیمانی ہوتی ۔ ہم زیورات ، کپڑوں اور ساس بہو کے قضیوں میں بھی دلچسپی لینے لگے تھے ۔ ذرا ذرا سی بات پر جھنجھلا اٹھتے ۔ بات بات پر لڑنے کو تیار ہوجاتے ۔ چناں چہ جب کسی خاتون نے میناباز ار میں ہم سے حملہ آوری کی وجہ پوچھی تو ہم نے پہلے تو بھرے بازار میں کوسنے دیے کہ اگر ہم نہ آتے تو کوئی اور آجاتا ۔ پھر فائل منگاکر وہ تمام کانفیڈنشل خطوط دکھائے جو ہندی امرا نے وقتاً فوقتاً ہمیں لکھے تھے اور ہمیں حملہ کرنے کا مشورہ دیا تھا (ہماری حملہ آوری کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے جو فرماں بردار خاں کو یاد نہ رہی) ۔

جنوبی ہند سے وفد

جنوبی ہند سے وفد برائے نادر یار جنگ بہادر آیا ۔ ہم بہادر ضرور ہیں ۔ جنگ کا بھی شوق ہے لیکن یار وغیرہ کسی کے نہیں ہیں ۔ انھیں گلہ تھا کہ خیبر سے آنے والے حملہ آور دلی تک آتے ہیں اور وہیں کے ہو رہتے ہیں ۔ جنوب کو بھولے سے بھی نہیں نوازتے ۔ ہم چوں کہ سٹیل ہونے کے اہم مسئلے پر غور فرمارہے تھے اس لیے معذوری ظاہر کی ۔ انھوں نے التجا کی کہ شبیہِ مبارک کی ایک تصویر ہی عنایت فرمائی جائے تاکہ کیلنڈروں ، جنتریوں میں چھپواسکیں ۔ ہندی بادشاہ تصویر اترواتے وقت ہاتھ میں ایک پھول پکڑ کر سونگھتے ہیں ۔ ہم نے جدت پیدا کی اور دونوں ہاتھوں میں دو پھول پکڑ کر سونگھے ۔

ایک ترقی یافتہ خاتون

ہمارا اور محمد شاہ کے دربار کی ایک ترقی یافتہ خاتون کا قصہ بہت بڑھا چڑھاکر بیان کیا گیا ہے ۔ یہ بیان بالکل بے بنیاد ہے کہ ہمیں اس سے لگاؤ تھا ۔ دراصل ہمیں تمباکو ، شراب ، محبت و دیگر منشیات سے بچپن سے نفرت رہی ہے ۔ خاتون موصوف کو گانے بجانے کا شوق تھا اور ہمیں گانے بجانے سے خفقان ہوچلا تھا ۔ دربار میں اس نے "نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی" والی رباعی کچھ ایسے انداز میں گائی کہ یار لوگوں کو شبہ ہوا اور افواہیں اڑنے لگیں ۔ شروع شروع میں تو ہمارا خیال اس کی جانب رہا لیکن پھر الو شناس کے سمجھانے پر سنبھل گئے ۔ اس نے بتایا کہ بالائی طبقے میں لڑکیوں کا ایک

مدرسہ۔ فکر ایسا بھی ہے جو چلیں تو کرتی ہیں نوجوانوں سے اور شادی کرتی ہیں بوڑھے امیروں سے خواہ ان کی پہلی بیویوں کی تعداد کتنی ہی ہو۔ کبھی کبھار بوڑھے کے پروگرام میں شریک ہوگئیں لیکن زیادہ وقت کزنوں کے ساتھ گزارا۔

ایسا کرنے میں وہ اپنے آپ کو اس لیے حق بہ جانب سمجھتی ہیں کہ نوجوانوں کے پاس روپیہ نہیں ہے اور بوڑھوں کے پاس روپیہ ہے اور باقی چیزیں آنی جانی ہیں۔

ایک روز ہم پڑگئے۔ اس لئے ایک غزل گائی جس کے شروع کے بول یہ تھے:

ساٹھویں سال میں قدم آیا ۔۔۔ زلف مشکیں میں پیچ و خم آیا
آمد آمد ہوئی جوانی کی ۔۔۔ غمزہ و نازو و دل ستانی کی

یہاں ساٹھ برس کی عمر میں اکثر لوگ سٹھیا جاتے ہیں، ہم ساٹھ کے نہ تھے۔ مگر سمجھ گئے کہ وار ہم پر ہوا ہے، دیر تک آئینے کے سامنے کھڑے رہے لیکن قطعی رائے قائم نہ کرسکے۔ فرماں بردار خاں سے اپنی شکل و صورت کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے حسب معمول نہایت گستاخ و مایوس کن جملے کہے۔ طیش میں آکر اسے درے لگوانے کا قصد کیا۔ پھر خیال آیا کہ فرماں بردار خاں تو پہلے سے ہی درانی ہے چناں چہ اسے معاف کیا اور الو شناس کو بلایا۔ وہ نمک خوار معروض ہوا کہ روئے پر نور پر وہ ہیبت جلال طاری ہے کہ نگاہیں اوپر نہیں اٹھتیں لہٰذا شکل و صورت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس فقرے سے بھی ہماری تسلی نہ ہوئی۔

پھر ہمیں معلوم ہوا کہ سارے معاملے میں مسز محمد شاہ کا ہاتھ ہے۔ محمد شاہ خود ترقی پسند ہے لہٰذا خاتونِ موصوف میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لیتا رہا ہے۔ عورتوں کا حسد مشہور ہے۔ مسز محمد شاہ ہمیں اس عمر میں بے وقوف بنانا چاہتی ہیں کہ ہم اس طرار حسینہ کو اپنے ہمراہ ایران لے جائیں۔ ہم بھانپ گئے اور اس سے دوردور رہنے لگے۔ خاتونِ مذکور ہماری بے اعتنائی سے چراغ پا ہوگئی اور ایک جلسے میں ہمارے رجعت پسند ہونے کا اعلان کرکے ہم سے مکمل بائیکاٹ کردیا۔

خیر، رسیدہ بود بلائے ولے بہ خیر گذشت۔

جامعۂ فرقانی آج صبح ملا فرقان اللہ بن برہان اللہ کہ مقامی جامعۂ فرقانی کا صدر ہے آستان بوسی کے لیے حاضر ہوا اور ملتمس ہوا کہ جامعہ ہم کو ایک اعزازی سند دے کر عزت افزائی (اپنی) کرنا چاہتا ہے۔

جامعہ میں پورا کورس چھ برس کا ہے۔ بعض فارغ البال اور نیک نفس والدین کے بچے یہ کورس بارہ سال میں کرتے ہیں۔ ان طلبہ کو خلیفے کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی بچہ کورس کے

اختتام سے پہلے بھاگ جائے تو اس کو صرف علامہ کی سند ملتی ہے کورس پورا کر لے تو علامۃ الدہر کہلاتا ہے ۔ دوسری سندیں مثلاً ابوالبرکات ۔ ابوالفضال ۔ ابوالفضیلت عموماً سرکاری حکاموں ، جامعہ کے معلمین کے دوستوں اور ہمارے جیسے سیاحوں تاجروں اور حملہ آوروں کے لیے وقف ہیں ۔ عزیزی محمد شاہ دو مرتبہ ابوالبرکات ہے اور تین مرتبہ ابوالفضیلت ۔

جامعہ ہر سال چار سو علامۃ الدہر بناتا ہے ۔ جو عموماً بیس پچیس روپے ماہوار کے منشی یا کسی تاجر کے نیم بن جاتے ہیں ۔ منشی بننے کے کوئی چار پانچ مہینے کے بعد ان کے والدین کو شادی کی (اپنے ہونہار فرزند کی ۔ اپنی نہیں) فکر پڑ جاتی ہے ۔ شادی کرتے وقت شکل صورت کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی جاتی (کیوں کہ اس ملک میں شکل صورت نہیں ہوتی) صرف روپے پیسے کا خیال رکھا جاتا ہے ۔ عجیب تماشا ہے کہ شادی میں لڑکے دلہن کے علاوہ ایک کثیر رقم کی بھی توقع رکھتے ہیں ۔ یہ بھی چاہتے ہیں کہ سسرال والے انھیں اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے سمندر پار بھیج دیں تاکہ وہ خوب دادِ عیش دے سکیں ۔ ہمارے خیال میں یہ انتہا درجہ کی کم ہمتی ہے ۔ تبھی اس ملک میں بے چاری لڑکیوں کی وہ آؤ بھگت نہیں ہوتی جو لڑکوں کی ہوتی ہے ۔

جامعہ میں ہماری تقریر

اعزازی سند کے سلسلے میں ہمیں خواہ مخواہ تقریر کرنی پڑی حالاں کہ نہ ہمیں پہلے سے خبردار کیا گیا تھا اور نہ ہم تیار تھے ۔ پہلے ملافرقان اللہ بن برہان اللہ نے ہماری ذات کا تعارف یوں کرایا :

" حضرات کیسا روز سعید جامعہ کی زندگی میں آیا ہے کہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ صاحب کی ذات والا صفات کا نزول ہوا ہے ۔ شاہ صاحب کا تعارف محتاج بیان نہیں ۔ آپ نے جس سلسلے میں دلی تشریف لانے کی زحمت گوارا کی ہے وہ اب واضح ہو چکا ہے ۔ سنا ہے کہ جناب خاں صاحب بین اقوامی سطح پر ایرانی اور ہندوستانی روپے کی قیمت چکانے آئے ہیں ۔ آپ کی علمیت شبیہِ مبارک سے ظاہر ہے ۔ آغا صاحب پہلوی زبان کے ہر پہلو سے ماہر ہیں ۔ شہنشاہی سے پہلے آپ کا شغل .... خیر جانے دیجیے .... ان کی تقریر کو خاموشی سے سنا جائے کیوں کہ آپ شہنشاہ ہیں اور آپ کو اپنی پھوپھی صاحبہ مدظلّہا سے بھی ملاقات مقصود تھی جو اتفاق سے اس ملک میں مقیم نہیں ہیں لیکن ہماری شامتِ اعمال ۔ ۔ ۔ معاف کیجیے ۔ ۔ ۔ اچھا تو حضرات ۔ ۔ مولانا نادر شاہ صاحب ۔ "

ہم کو اس بد تمیز ملا پر سخت غصہ آیا کہ ہمارے تئیں کبھی آغا کہتا ہے تو کبھی مولانا ایک بات پر قائم نہیں رہتا ۔ یہ شخص دانستہ طور پر ہمارا تمسخر اڑاتا ہے ۔ اچھا اسے سمجھیں گے ۔

ہم تالیوں کے شور میں اٹھے اور فرمایا ۔ ۔ ۔ " پیارے اطفال ۔ معلمین حضرات

وپرنسپل ملا ایف اللہ ۔ آپ نے ہم کو یہاں مدعو کرکے جامعہ کی جو عزت افزائی کی ہے اس کے لیے ہم آپ سب کو ممنون ہونے کا موقع دیتے ہیں ۔ آپ کو یہ موقعے روز بہ روز کہاں میسر ہوتے ہیں کہ ہم سا شہنشاہ آپ کو اپنی خوش کلامی سے مستفیض کرے ۔اول تو ہمیں آپ حضرات کی زبوں حالی پر تعجب ہوتا ہے رونا بھی آتا ہے ۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ یہاں کوئی دو ہزار کی تعداد میں بیٹھے ہیں ۔ یہ خدا ہمیں آپ ڈیڑھ سو کے قریب لگ رہے ہیں ۔ پرسوں دربار میں کوئی کاری گر بیس گز ڈھاکے کی ململ ایک انگوٹھی میں سے گزار رہا تھا ۔ دوسری طرف سے کپڑے کو جھٹکے سے کھینچا گیا تو کاری گر خود بھی انگوٹھی میں سے گزر رہا ۔ اس قدر دھان پان انسان ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھے ۔ یہ آپ کی غذا کا قصور ہے یا آب وہوا کا ۔ آپ کے چہروں پر کچھ ایسا جمود اور بے حسی ہر وقت رہتی ہے جیسے آپ ہر چیز سے مطمئن ہیں ۔ آپ جی کیا رہے ہیں زندگی پر احسان کر رہے ہیں ۔آپ کے قبرستانوں میں کتبے تک غلط ہیں (ہم نے بلیک بورڈ پر لکھنا شروع کیا) مثلاً

شیخ خدا بخش مرحوم
فلاں سنہ میں پیدا ہوئے
ساٹھ برس کی عمر میں انتقال فرما گئے

یہ غلط ہے ۔ اس کی جگہ یوں ہونا چاہیے

شیخ خدا بخش مرحوم
فلاں سنہ میں پیدا ہوئے
پچیس سال کی عمر میں انتقال فرمایا
ساٹھ برس کی عمر میں دفن ہوئے ۔

حضرات و اطفال ہم ایران سے بڑی بڑی امیدیں لے کر چلے تھے ۔ خیال تھا کہ دشمن کی بوٹی بوٹی اڑادیں گے ۔ کابل میں آئے تو سوچا انھیں زدوکوب کریں گے ۔ خیبر پہنچے تو ارادہ ہوا کہ ان سے کشتی لڑیں گے لیکن یہاں کی آب و ہوا کو اس درجہ سکون پرور اور باشندوں کو اس حد تک با اخلاق ۔ وضع دار ۔ نحیف و نزار پایا کہ دن بھر قیلولہ کرتے اور یار لوگوں سے گپیں لڑانے کا شغل اختیار کرلیا ہے ۔ یہاں کی آب و ہوا کا اثر نہایت صلح جو یانہ ہے ۔ یہ خون کو بھی ٹھنڈا کرتی ہے ۔ اب ہم سوچتے ہیں کہ دشمن نے ہمارا کیا بگاڑا ہے ۔ مفت کی لڑائی بھڑائی سے آخر فائدہ ؟ سنا ہے کہ جنوبی اور مشرقی ہند کی آب و ہوا اور بھی گئی گزری ہے ۔ لیکن ہم اور آگے نہیں جائیں گے ۔ ہم آپ کو مبارک باد دیتے ہیں آپ کی روایات پر ۔ آپ کی قومی روایات بے حد شان دار ہیں ۔ آپ نے کسی اجنبی کو مایوس نہیں کیا ۔ کئی سو سال سے

آپ کا شغل بیرونی لوگوں سے حکومت کروانا ہے ۔ اور تو اور آپ نے خاندانِ غلامان سے حکومت کروائی ہے اور وسعتِ قلب کا ثبوت دیا ہے ۔ آپ کو ایک دوسرے کی نقل کرنے میں خاص مہارت حاصل ہے یعنی آپ بھیڑ چال چلتے ہیں (یہاں ہم اسٹیج سے نیچے اترے اور بھیڑ چال چل کر دکھائی) ۔

آپ کے ادب و موسیقی کے چرچے ہم نے پہاڑ کے اس پار سنے تھے ۔ آپ کے ہاں تقریباً ہر شخص شعر کہتا ہے اور تخلص کرتا ہے ۔ یہ آب و ہوا اور یہ صحت جیسی کہ آپ کی ہے شعروشاعری کے لیے نہایت ناسازگار ہے ۔ آپ کی موسیقی کے کیا کہنے ، پچھلے ہفتے لال قلعے میں چار پانچ آدمیوں کو قوالی گاتے سنا ، وہ لوگ خوب سردھنتے اور وجد میں آکر تالیاں بجاتے ۔ یہ لوگ بے حد دانا ہیں ۔ گاتے وقت ایک کان پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں ۔ غالباً دوسرے کان سے جسے کھلا چھوڑتے ہیں ضرور بہرے ہوجاتے ہیں ۔ پھر ایک شخص کو دیکھا کہ گانے کے بہانے طرح طرح سے ہمارا منہ چڑاتا تھا ۔ ہمیں بتایا گیا کہ راگ گاتا ہے ۔ سنا ہے کہ آپ کے ہاں ہر وقت کا راگ جدا جدا ہوتا ہے ۔ آپ کی موسیقی کا مطالعہ فرما کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہاں صبح صبح ہر شخص بیزار ہوتا ہے ۔ غالباً رات کو آپ زیادہ نشہ کرجاتے ہیں ۔ کئی مرتبہ یہ ہوا کہ علی الصبح مسرور اٹھے لیکن وقت کے راگ نے غمگین کردیا ، رات کو عبادت کا قصد کر رہے تھے کہ وقت کے راگ سے متاثر ہوکر رنگ رلیاں شروع کردیں ۔

حضرات ! جب ہم پشاور سے آگے آئے تو ہمیں بتایا گیا کہ سکندر یونانی کے زمانے میں یہاں بہت بڑا جنگل تھا ۔ مبارک ہو کہ آپ نے بیش تر جنگلات کو صاف کردیا ہے آپ کے نزدیک درخت کا صحیح مقصد اس کو کاٹ ڈالنا ہے ۔ ہم نے گاؤں میں بچوں کو چھوٹی چھوٹی کلہاڑیاں لیے تقریباً درخت کاٹتے دیکھا ہے ۔ "

ہماری تقریر جو کہ بے ربط تھی ملا فرقان اللہ کی گستاخی کا صحیح جواب تھی ۔ ہم دیر تک بولتے رہے ہیں یاد نہیں کہ ہم نے اور کیا کچھ کہا ۔ اچانک بد تمیز طلبہ کی جمائیوں اور خراٹوں نے ہمیں چونکا دیا اور ہم بیٹھ گئے ۔

سوالات اور جوابات

ملا فرقان نے اٹھ کر ہمارا شکریہ ادا کیا اور حاضرین سے مخاطب ہوکر بولا " نادر شاہ سے سوال پوچھے جائیں تو آپ ان کا مناسب جواب دیں گے ۔ "

کچھ دیر خاموشی رہی ۔ پھر ایک کونے میں کھسر پھسر ہونے لگی ۔ " کیا آپ ملوکیت پسند ہیں ؟ " پوچھا گیا ۔

" ہم طوائف الملوکیت پسند ہیں ۔ " ہم نے جواب دیا ۔

- تو گویا آپ شہنشاہ پسند ہوئے ۔ " کسی اور نے پوچھا ۔
- شہنشاہ پسند ؟ " ہم نے مسکرا کر کہا ۔ " ہم خود شہنشاہ ہیں ۔ "
- کیا آپ کے خیال میں شہنشاہی بے کار سی چیز نہیں ۔ ۔ ۔ خصوصاً جب ہم سب کے سب ایک جیسے ہیں ۔ " ایک برخوردار بولے ۔
" ہاں ۔ " میں نے فرمایا ۔ جسمانی لحاظ سے تو ایک جیسے ہیں لیکن اوپر والی منزل میں (ہم نے اپنے سر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا) فرق ہوتا ہے ۔ "
- صاف صاف بتایئے قبلہ آپ دائیں جانب ہیں یا بائیں جانب "
یہ سوال ہماری سمجھ میں نہ آیا ۔ ہم نے اسی طرح مسکراتے ہوئے (مقرر کو ہمیشہ مسکراتے رہنا چاہیے) جواب دیا ۔ " ہم شہباز خاں الوشناس کی بائیں جانب ہیں اور ملا فرقان اللہ کی دائیں جانب ۔ "
- کیا آپ ایران سے آئے ہیں ۔ "
ایسے آسان سوال پر ہم بہت خوش ہوئے ۔ " ہاں ہاں برخوردار ۔ اور کیا تم ہندوستان میں رہتے ہو ؟ "
- شہنشاہی سے پہلے آپ کا ذریعہ معاش کیا تھا ۔ ۔ ۔ ؟ " ایک طرف سے آواز آئی ۔
اگر چہ ہم نے کافی صبر و تحمل دکھا یا تھا لیکن اس سوال نے ہمیں تپ پا کر دیا ۔ ہماری آنکھوں میں خون اترنا شروع ہوا ۔ میز پر ہمارا مکا اتنے زور سے پڑا کہ میز ٹوٹ گئی منہ کا جھاگ ملّا فرقان اللہ پر گرا جس نے جست لگائی اور دوسری میز پر چڑھ گیا ۔ ہڑ بونگ سی مچ گئی ۔ لوگ اپنی پگڑیاں چھوڑ کر بھاگنے لگے ۔

نوازنا ملا فرقان اللہ کو ہمیں یقین ہوگیا کہ ہو نہ ہو یہ سب اسی ملا کی شرارت ہے ۔ پہلے ہمیں خفا کر کے ایسی جلی بھنی تقریر کروانا ۔ سوال پوچھنے کا شوشہ جان بوجھ کر چھوڑنا ۔ اگلے روز ہم نے اس کی مالی حالت کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں ۔ پتہ چلا کہ ملائی کا ڈھونگ ہے ۔ خوب عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔چناں چہ ہم نے عزیزی محمد شاہ سے کہا کہ اس کی خدمات کے صلے میں اسے ایک ہاتھی انعام میں دیا جائے ۔ کچھ عرصے کے بعد آدمی بھیج کر پتہ کرایا تو معلوم ہوا کہ شاہی ہاتھی کے خور و نوش پر نصف سے زائد اثاثہ نیلام ہوچکا ہے ۔ ہم نے دربار میں بلوا کر عزت افزائی کے بہانے ایک اور ہاتھی (جو سفید تھا) مرحمت فرمایا ۔ ہفتے عشرے کے انتظار کے بعد خبر ملی کہ ملا فرقان اللہ نے خود کشی کر لی اور کیفر کردار کو پہنچا ۔ ہمارے ساتھ کوئی جیسا کرے گا ویسا بھرے گا ۔

اہلِ ہند کو گستاخیوں کا صلہ ہم نے وہ تقریر کیا کی مصیبت ہی مول لے لی۔ دنیا میں سچ بولنا بھی جرم ہے۔ ذراسی تنقید بھی ان لوگوں سے برداشت نہیں ہوتی۔ احتجاج ہو رہے ہیں، جلوس نکل رہے ہیں، پوسٹرلگ رہے ہیں۔ آج تو اہلِ ہند کی گستاخی حد سے بڑھ گئی۔ گزشتہ چند راتیں عزیزی محمد شاہ کی دعوتوں میں جاگ کر گزارنی پڑیں۔ چناں چہ طبیعت کچھ گراں ہوگئی۔ شاہی حکیم معائنہ کرنے آئے۔ اتنے میں نہ جانے کس احمق نے شہر میں یہ خبر اڑادی کہ نعوذ باللہ ہم اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ لوگوں نے اس خبر کو نہ صرف سچ مان لیا بلکہ اسی سلسلے میں جامع مسجد کے پاس فقرا کو جلیبیاں تقسیم کی گئیں۔ اس کی شہادت یوں ہوئی کہ شہباز خاں الو شناس کو جو اس وقت جامع مسجد کے قریب سے گزر رہا تھا فقیر سمجھ کر کچھ جلیبیاں دی گئیں جنھیں وہ بارگاہِ دولت میں لے کر حاضر ہوا۔ ہم نے ان کو چکھا اور نہایت لذیذ پا کر اسے دوبارہ جامع مسجد کی طرف بھیجا۔ ہم دوہزار ایرانی سپاہی لال قلعے میں رکھا کرتے تاکہ بہ وقت ضرورت کام آسکیں۔ مفسدوں نے ان کے متعلق یہ مشہور کردیا کہ ہم انھیں ہر شام مقفل کردیتے ہیں کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائیں۔ ان سپاہیوں کو قلعے کے اندر چھیڑا گیا، ہمارے کچھ سپاہی چاندنی چوک سے گزر رہے تھے۔ ان پر آواز کسے گئے اور ٹماٹر شلجم وغیرہ پھینکے گئے۔ ایسی کئی وارداتوں کی ہمیں اطلاع ملی۔ ہم اسپِ نمرود (یہ خطاب ہمارا دیا ہوا تھا) پر سوار ہوکر شہر میں گئے تاکہ رعایا کو شرفِ دیدار بخش کر ان کی غلط فہمی دور کرادیں۔ اب یہ مشہور ہوگیا کہ اصلی نادر شاہ تو بہشت کو سدھار چکے ہیں یہ کوئی اور ہے جو بہروپ بھرے ہوئے ہے۔ ہم تختِ طاؤس پر بیٹھے تھے کہ دور سے "نادر شاہ مردہ باد" کے نعرے سنائی دیئے۔ اسی وقت غیض و غضب میں تخت سے چھلانگ لگا کر اپنے دو ہزار سپاہیوں کو کھولا اور تلوار کھینچ کر حکم دیا کہ تلوار کے دستوں سے لاٹھی چارج کردو۔ یہ تھا وہ "قتلِ عام"۔۔۔ ہم چاہتے تو باقاعدہ تلواریں استعمال کراسکتے تھے۔ گرمی سخت تھی۔ ہم قمیص اتار کر موتی مسجد میں حوض کے کنارے ننگی تلوار ہاتھ میں لیے بیٹھے رہے۔

قتلِ عام چناں چہ صاحب قتلِ عام شروع ہوا، ہمارے سپاہیوں نے فقط اہلِ شہر کو زدوکوب کیا تھا اس کے باوجود لا تعداد لوگوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اگلے روز ایک بزرگ آنکھوں میں آنسو بھرے آئے اور درد ناک لہجے میں گویا ہوئے ۔۔۔ کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ نازکشی۔

یہ شعر ہم نے پہلے سن رکھا تھا، چناں چہ ہم نے مسکرا کر دوسرا مصرع: مگر کہ زندہ کنی خلق راو بازکشی۔ سنا کر ظاہر کردیا کہ ہمیں پرانی فرسودہ شاعری زیادہ متاثر نہیں کرسکتی۔ ہمیں شاعری کی جدید قدروں کا قدردان پاکر انھوں نے جیب سے کاغذ کا پرزہ نکال کر ایک آزاد نظم پڑھی

جو ہماری سمجھ میں بالکل نہ آئی سوائے ایک مصرع کے جس میں ہمیں تلوار نیام میں ڈالنے کو کہا گیا تھا ۔ رات بھر جاگتے رہے تھے ، گرمی زیادہ تھی ۔ ہمارا دل پسیج اٹھا ۔ بغل گیر ہونے کی نیت سے آگے بڑھے کہ بزرگ جلدی سے آداب بجا لاکر چمپت ہوئے ۔ خیر ۔ اب تلوار کو میان میں ڈالنے کی جو کوشش کرتے ہیں معلوم ہوا کہ ہمارے ہاتھ میں تو شہباز خاں کی تلوار تھی ۔ ہماری تلوار تو پہلے ہی میان میں تھی ۔ گویا کہ سارا قتل عام ہی غلط ہوا تھا ۔ ہم نے فوراً منادی کرادی کہ پہلا قتل عام غلط ہوا ہے بلکہ ہوا ہی نہیں کیوں تلوار تو میان سے ذرا نہیں نکلی ۔ چناں چہ اس مرتبہ دوسرا صحیح قتلِ عام شروع ہوا جو کافی کامیاب رہا ۔ دراصل فریقین کو کافی ریہرسل مل چکی تھی ۔ پہلے ارادہ تھا کہ اس کے بعد ایک مختصر سا ، قتلِ خاص ۔ بھی کرائیں جو امرا کے لیے ہو ۔ پھر سوچا اہلِ دہلی اس قسم کے تماشوں کے عادی ہوچکے ہیں ۔ تیمور کا قتلِ عام تین دن رات تک ہوتا رہا تھا ۔ بھلا ہمیں کب خاطر میں لائیں گے ۔

شام کو وہی بزرگ آئے ۔ ایک اور آزاد نظم سنائی (جو ہماری سمجھ میں بالکل نہ آئی) اور معافی کے خواست گار ہوئے ۔ ہم بھی مسجد میں اکیلے بیٹھے تھے تھک چکے تھے ۔ مسکرا کر معاف فرمایا اور از راہِ تلطف انھیں بغل گیری سے سرفراز فرمایا ۔ وہ فوراً بے ہوش ہوگئے ۔ جب ہوش میں آئے تو پسلیوں میں درد کی شکایت کرتے تھے ۔ پتہ نہیں کیوں ۔ شاید ہماری بغل گیری کا نتیجہ ہو ۔ آئندہ محتاط رہیں گے انشاء اللہ باری تعالیٰ کارساز ہے ۔

ہم پر کمبل ڈلوانے کی کوشش شام کو دریائے جمنا کے کنارے مچھلی پکڑنے کی نیت سے بیٹھے تھے ۔ مچھلیاں تھیں کہ جلال شاہی سے قریب نہ پھٹکتی تھیں ۔ اندھیرا ہو چلا تھا ، اچانک ہم نے اپنے اوپر کمبل کا دباؤ محسوس فرمایا ۔ سمجھا کہ کوئی ہمارا پرستار ہے جو خنکی کا خیال کرتے ہوئے گرم کپڑا لایا ہے ۔ چناں چہ خاموش بیٹھے رہے ۔ لیکن ہمیں بالکل ڈھانپ دیا گیا ہمارا دم گھٹنے لگا ۔ گستاخ آوازیں سنیں تو معلوم ہوا کہ کوئی شرارت ہے ۔ ہڑبڑا کر اٹھے ۔ دونوں لفنگوں کو پکڑ کر بغل میں دبایا ہی تھا کہ انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہہ کر سعادتِ دارین پائی ۔ نیا ملک ہے ۔ خبردار رہنا چاہیے ۔

واپسی کا مقصد ایک کباڑیے کی دکان پر پوستین دیکھی ۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے (فرمانبردار خاں کی آنکھوں میں) ہم کبھی پوستین کو دیکھتے تھے اور کبھی اپنے چوڑی دار پاجامے اور جلال دار کرتے کو ۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ پوستین ہماری ہی تھی ۔ اس قدر تنگ ہوچکی تھی کہ کوشش کرنے کے باوجود نہ پہن سکے ۔ پہلے سے ہمارا وزن کافی بڑھ گیا تھا ۔ دن بھر

طرح طرح کے خیالات دل میں آتے رہے۔ دلی کے قیام نے ہمیں کتنا تبدیل کر دیا ہے ہم موٹے ہو گئے ہیں۔ رات کو خراٹے لیتے ہیں۔ صبح کی چائے اور تمباکو نوشی کے بغیر بستر سے نہیں اٹھتے۔ قیلولہ کی عادتِ قبیحہ ہمیں شام تک بیزار رکھتی ہے۔ ہماری رنگت سنولاتی جا رہی ہے۔ اگرچہ ہندی شاعری میں سانولا، سنوریا، کالیا وغیرہ کو پسند کیا گیا ہے تاہم یہ پسندیدگی تسلی بخش نہیں کیوں کہ ہندی شاعری ہے تو عورت کی زبانی لیکن شاعر سارے مرد ہیں اور پھر ہم نے جنوبی ہند کے باشندوں کو بھی دیکھ پایا تھا جن کے آباواجداد کبھی اچھے بھلے ہوں گے۔ ادھر ملک میں عجب دھاچوکڑی مچی ہوئی ہے۔ ہماری تقریر اور قتلِ عام سے پبلک دشمن بن گئی ہے۔ ہر روز کہیں بھوک ہڑتال ہو رہی ہے تو کہیں ستیہ گرہ۔ کمبل ڈالنے کے حادثے نے ہمارا موڈ قطعی خراب کر دیا ہے۔ چناں چہ سیٹل ہونے کے خیال پر لعنت بھیجی اور کوچ کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔

ہمارا دلی سے تشریف لے جانے کا حال خدا کے فضل سے زادِ راہ کافی تھا کہ راستے میں اخراجات بھی کافی ہوتے ہیں۔ ہم نے از راہِ مروت محمد شاہ کو اجازت دے دی کہ اگر اس کی نظر میں کوئی ایسی چیز ہو کہ جس کو بہ طور تحفہ لے جا سکتے ہوں اور غلطی سے یاد نہ رہی ہو تو بے شک ساتھ باندھ دے۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور بار بار کہتے تھے کہ لال قلعہ اب خالی خالی سا معلوم ہو رہا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ لال قلعہ ہمیں بھی خالی خالی سا معلوم ہو رہا تھا۔

اسپِ نمرود پر سوار ہو کر درودیوار پر حسرت کی نظر ڈال ہی رہے تھے کہ عین چوراہے میں گھوڑے سے نیچے آ رہے۔ اس بے ایمان گھوڑے کو ہم نے زیادہ منہ چڑھا لیا ہے۔ تعزیری طور پر اہلِ ہند کو واپس دے دیا اور عزیزی محمد شاہ سلمہ سے فرمایا کہ اس انسان نا شناس کو خطاب سے محروم کرکے تانگے میں جتوایا جائے۔

کابل میں والیِ کابل سے نجات والیِ کابل ہماری خدمات میں ملتمس ہوا کہ آپ ہند سے ہمارے لیے جو تحفے لائے ہیں وہ دیتے جائیں ورنہ مروت سے بعید ہوگا۔ ہم نے سمجھایا کہ یہ ہزار اونٹوں پر لدے ہوئے تحائف جو وہ دیکھ رہا ہے ہمارے پیارے عزیز محمد شاہ کی نشانیاں ہیں جن سے ہم مرتے دم تک جدا نہیں ہو سکتے۔ البتہ کچھ پوستین، دنبے یا گل قند درکار ہو تو وہ دے سکتے ہیں۔ والیِ کابل راضی نہ ہوتا تھا۔ عجب ہو نق آدمی ہے۔ دنیاوی دولت کی ہوس اس کو بہت ہے۔ بہتیرا سمجھایا کہ آدمی کو خدا سے لو لگانی چاہیے۔ دنیا آنی جانی

ہے ۔ شیخ بوٹا شجرپوری کی مثال پیش کی کہ دنیاداری سے مستثنیٰ ہو کر تارک الدنیا بنے ہوئے ہیں ۔ اس پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ گستاخانہ بولا ۔ آپ خود تارک الدنیا کیوں نہیں ہو جاتے ۔ بہت کہا کہ ہمارے حالات مختلف ہیں ۔ وقت آنے پر تارک الدنیا بھی بن کر دکھا دیں گے ۔ جب نہ مانا تو ہم نے ٹالنے کو فرمایا کہ تو خود سیاحت پر کیوں نہیں جاتا ۔ آدمی سیانا تھا ۔ جان گیا کہ پچھلے چالیس پچاس سال کی دولت تو ہم سمیٹ چکے ہیں ۔ اب وہ ہند گیا تو کر کری ہوگی ۔ کچھ ہاتھ نہ آئے گا ۔ آخر از راہِ پرورش اس کو پانچ شتر تازی : چھ اسپ باسی ۔ دو سو مقامی مینڈھے دُنبے ۔ دو من گل قندِ لال قلعہ کا کچھ بوسیدہ فرنیچر ۔ نقرئی پنجرے میں بند ایک ہندی کوا دے کر سرفراز کیا اور اس حریص لیمو نچوڑ سے رہائی پائی ۔

ختم شد

تتمہ

ہمارا خلد میں نزول جس بات کا ڈر سے خدشہ تھا آج وہی ہو کر رہی ۔ چند نابکاروں نے تنہا پا کر گھیر لیا اور ہمارا کام تمام کیا ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ ہند سے ایران واپس پہنچ کر ہم اس نئی سیاحت پر سوئے عراق نکل کھڑے ہوئے تھے ۔ ہمیں اپنی ناگہاں جوانا مرگ پر بے حد قلق ہے ۔ کیوں کہ اس میں مشیتِ ایزدی ہرگز نہ تھی اگر ہم فرمانبردار خاں کا کہا مان لیتے اور اتنی رات گئے تنہا باہر نہ نکلتے تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا ۔ خیر اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ۔ عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے ۔

دیکھیے آں جہانی بنتے ہیں یا خلد آشیانی یا اور کچھ ۔ ہمارے متعلق یہاں طرح طرح کی مایوس کن افواہیں اڑ رہی ہیں ۔

شفیق الرحمٰن

نیل

قاہرہ پہنچ کر اپنے مصری دوست کو ٹیلیفون کیا۔ اس نے نعرہ لگایا۔ "کہاں ہو؟" میں نے بتایا کہ المصر میں ہوں، بلکہ القاہرہ میں۔

بولا "بس ایک منٹ میں پہنچتا ہوں۔ تم کہیں اِدھر اُدھر مت جانا۔ زیادہ سے زیادہ مجھے پانچ منٹ لگیں گے۔"

چناں چہ جب وہ مشرقی روایات کے مطابق تقریباً دو گھنٹے کے بعد پہنچا تو میں ہوٹل کے باہر اچھے خاصے ہجوم میں گِھرا ہوا تھا۔ یہ سب حضرات پھیری والے اور چھابڑی والے تھے جو نہایت ضروری اور کار آمد اشیا پیش کر رہے تھے۔ ایک صاحب گھوڑے کی زین کوڑیوں کے مول بیچنا چاہتے تھے، دوسرے کا اصرار تھا کہ اگر میں نے اس قدر بڑھیا اور سستا اونٹ ہانکنے کا چابک نہ خریدا تو عمر بھر پچھتاؤں گا۔ ساتھ ساتھ بچوں کے پنگھوڑے، عورتوں کے لیے کشیدہ کاری کا سامان، پودے تراشنے کی مشین، مضبوط اور دیرپا قفل، بجلی کے بلب اور فٹ بال، جن کی ضرورت سیاحوں کو ہر وقت رہتی ہے، دینا چاہتے تھے۔

میرے دوست نے ٹھیٹھ عربی میں ان سے کچھ کہا اور وہ فوراً منتشر ہو گئے۔

بغل گیری کی اہم رسم کے بعد اس نے پوچھا۔ "بتاؤ کیا دیکھو گے؟"

یہ سوال بالکل اس طرح کیا گیا تھا جیسے جنگلوں میں رہنے والے مہاتما کسی چیلے کی تپسیا سے خوش ہو کر پوچھا کرتے ہیں کہ بول بچہ کیا مانگتا ہے؟

سوال کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے مؤدبانہ جواب دیا۔ "یوں تو خدا کا دیا سب کچھ ہے، لیکن جب بھی اس شہر میں آیا، حالات کو ساز گار نہ پایا۔ کبھی جنگ تھی اور کبھی امن۔ ہر مرتبہ قاہرہ نے مجھے دیکھا لیکن میں قاہرہ کو نہ دیکھ سکا۔"

"تو یوں کرو کہ کوٹ اور ٹائی اتار کر ہوٹل میں رکھو، سر کے بال پریشان کر لو، چہرے سے تجسس کا اظہار دور کرو، چلتے وقت ہر راہ گیر کو گھورو اور دوسروں کے معاملات میں بلا تکلف دخل اندازی کرو، لوگ تمھیں اجنبی نہیں سمجھیں گے۔"

دن بھر میں نے ان ہدایات پر عمل کیا۔ نتائج نہایت تسلی بخش تھے۔

شام کو ہم سابق شاہ فاروق عابدین محل میں داخل ہوئے جو قرونِ وسطیٰ کے کسی فرانسیسی بادشاہ کی رہائش گاہ معلوم ہوتی تھی یا کسی اطالوی شاہزادے کا Villa۔

عالی شان عمارتیں، سنگِ مرمر کے بت، خوش نما قطعے اور بوندیں بکھیرتے ہوئے فوارے۔ دیوی Venus کا حسین و جمیل مجسمہ بجلی کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ مصنوعی چشمے رنگین قمقموں کی روشنی میں جھل مل کر رہے تھے۔

بے حد لمبی قمیض پہنے ہوئے ایک ویٹر آیا اور ہمیں تالاب کے کنارے لے گیا جہاں ایک میز پر میرے دوست کا نام لکھا ہوا تھا۔

اس نے گھڑی دیکھی اور بتایا۔ "ابھی نیل کی سیر کا وقت نہیں ہوا۔"

"کوئی خاص وقت ہوتا ہے؟"

"چاند ابھی سر پر ہے۔ کچھ دیر کے بعد کرنیں ترچھی پڑیں گی۔ کرنوں کا زاویہ صحیح ہولے پھر نیل کی سیر ہوگی۔"

یک لخت اس امر کا انکشاف ہوا کہ میرا دوست آرٹسٹ بھی ہے۔

Menu کے کارڈ کا مطالعہ کیا اور پوچھا۔ "کباب اور کوفتے تو ہمارے ہاں بھی ہوتے ہیں۔ مگر یہ دبی نم؟ ---- اس نام میں سراسر نسوانیت ہے ---- جیسے خانم ----"

"کھانے کی چیز ہے۔ دودھ جما کر بنائی جاتی ہے اور کھٹی ہوتی ہے۔" اس نے بتایا۔

کھانوں کے آخر میں پڈنگ اور کافی کے بعد لکھا تھا ---- سمیعہ جمال (جسے مصری کمال پڑھتے ہیں)۔

"یہ کیا چیز ہے؟"

"یہ واقعی لڑکی ہے، مشہور رقاصہ۔ تم نے نام تو سنا ہوگا۔ آج رات اس کا ناچ ہے۔"

"کب ہوگا؟"

"کھانا ختم ہولے تب۔ کھاتے وقت ہم ادھر ادھر نہیں دیکھا کرتے ---- ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے۔ تم نے کوفتے نہیں لیے ----"

"یہ تو کباب ہیں۔"

"کباب تو وہ ہیں۔" اس نے تکوں کی طرف اشارہ کیا۔

تالاب کے چاروں طرف لوگ بڑے انہماک سے کھانا کھا رہے تھے۔ دور سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے لیبارٹری میں بہت سے سائنس دان خوردبینوں پر جھکے ہوئے ہوں۔

ایک طرف آرکسٹرا رمسکی کراسکو کی مشہور دھن شہرزاد بجا رہا تھا۔ سمفنی کا یہ وہ حصہ تھا جہاں شہرزاد بڑھتے ہوئے طوفان کا قصہ سناتی ہے۔

"یہ قصہ بغداد کا ہے، دھن اس علاقے کی ہے، لیکن نغمہ نگار یورپین ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔" وہ بولا۔

"افسوس کی بات تو ہے لیکن کیا کیا جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ مشرق کو سمجھنے کے لیے

ہمیں مغرب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ دوسرے موضوع تو ایک طرف رہے، خود ہمارے علوم وہ ہم سے بہتر جانتے ہیں۔ مشرق پر ریسرچ اکثر برٹش میوزیم میں کی جاتی ہے۔ ابنِ خلدون، رازی، بو علی سینا، ابن بطوطہ، بابر اور دیگر شہرۂ آفاق ہستیوں کی تصانیف ہم پہلے انگریزی میں پڑھتے ہیں۔ رہ گئی ہماری موسیقی جس پر ہم اس قدر فریفتہ ہیں وہ سکھائی جاتی ہے پڑھائی نہیں جاتی۔ کسی نے اسے لکھا اور چھاپا نہیں۔"

"ایسا کیوں ہے؟"

"پتہ نہیں۔ شاید اس لیے کہ ہمارے علوم و فنون سینہ بہ سینہ چلتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ فن کار کا بیٹا سدا فن کار نہیں ہوتا۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ طبابت ورثے میں ملے۔ لہٰذا بہت کچھ ضائع ہوتا رہا ہے اور ضائع ہوتا رہے گا۔"

دہی نم ختم ہو چکی تو میں نے پوچھا۔ "سمیعہ کمال کب آئے گی؟"

"ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں۔ تھوڑے سے کوفتے لو۔"

میں نے چند کباب سامنے رکھ لیے۔

چاند ڈھل چکا تھا۔ ادھر لوگوں کو کھانا چڑھ رہا تھا اور وہ جمائیاں لے رہے تھے۔

دفعتہً بل چل مچی جیسے آدھی رات کو کسی برانچ لائن کے سٹیشن پر ٹرین آنے سے پہلے ہوتا ہے۔

آرکیسٹرا تبدیل ہو رہا تھا۔ لمبے لمبے چغوں والے حضرات تشریف لا رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں قبل از مسیح قسم کے ساز تھے۔ بیٹھتے ہی انھوں نے ایک الف لیلوی دھن چھیڑی۔ جیسے کوئی فراق زدہ عاشق یا معشوق، یا دونوں، از حد کرب کی حالت میں بھوں، بھوں رو رہے ہوں۔

سمیعہ کمال کیا آئی، طوفان آگیا، زلزلہ آگیا۔

ساز تھرائے "واللہ" کے نعرے لگے اور رقص شروع ہوا۔ اس کی انگلیوں میں مجیرے تھے جنھیں وہ بڑی فیاضی سے استعمال کر رہی تھی۔ جو تھوڑا سا لباس اس نے ازراہِ کرم پہن رکھا تھا۔ وہ ملتان کی گرمیوں کے لیے تو موزوں ہو سکتا تھا لیکن قاہرہ کی خنک رات کے لیے غالباً مناسب نہیں تھا۔

مشرقِ وسطیٰ کا یہ رقص خوب ہے۔ اس میں آرٹ کم ہے اور بھتر کنا زیادہ، جنبش اتنی تیز کہ نگاہیں ساتھ نہیں دے سکتیں۔ بالکل جیسے کھلونے کو چابی بھر کر چھوڑ دیا جائے۔

پہلے تو وہ آرکیسٹرا والوں کے قریب ناچتی رہی، پھر میزوں کا رخ کیا۔ راستے میں ستون آیا تو اس کے گرد تین چار چکر لگا دیے۔ ایک کرسی سے کسی کا بچہ اٹھا کر ہوا میں اچھال دیا۔ بچہ یا تو عادی تھا اور پہلے بھی اچھالا جا چکا تھا بالکل سہما ہوا تھا وہ رویا نہیں۔

ناچتے ناچتے وہ پانی کے اتنے قریب آجاتی کہ لگتا تھا کہ اب گری، اب گری لیکن اس کا

پاؤں ایک دفعہ بھی نہیں پھسلا۔ نہ اس پر کششِ ثقل کا اثر ہوا۔

پہلی میز، دوسری، تیسری، چوتھی، پانچویں ---- پھر ہماری باری آئی۔

ہمیں دیکھ کر وہ پہلے تو مسکرائی، پھر آنکھیں بند کر لیں۔ مجیرے بجے، بازو تھرکے اور قلابازی سی لگاکر وہ بالکل قریب آگئی۔ اب ہم تینوں کی ناکوں کے درمیان کل پانچ چھ انچ کا فاصلہ ہوگا۔ مجیرے گویا کانوں میں بج رہے تھے۔

اس نے ایک آنکھ ذرا سی کھولی اور مسکرائی۔

"ہمیں بھی مسکرانا چاہیے۔" میرے دوست نے سرگوشی کی۔

میں فوراً مسکرانے لگا۔ ایک دفعہ تو میں نے آنکھیں بھی بند کیں۔

سمیعہ نے کندھے مٹکائے، کمر کو چار پانچ بل دیے اور چہرے کو آسمان کی طرف اٹھالیا۔

"واللہ!" ساتھ کی میز سے کسی نے نعرہ لگایا۔

خنک جھونکوں سے اس کی زلفیں لہرا رہی تھیں۔ سازندوں نے ایک نغمہ چھیڑا اور مل کر گانے لگے۔

"یہ کیا گا رہے ہیں؟" میں پوچھا۔

"نہایت مہمل گانا ہے۔ بالکل بے معنی اور لغو ---- یہ فلمی گیت ہے۔ تم باتیں مت کرو۔" میرے دوست نے پھر سرگوشی کی۔

سمیعہ نے آنکھیں کھولیں، پھر بند کر لیں۔ اب وہ خوب تھرک رہی تھی اور دل لگاکر ورزش کر رہی تھی۔ جب وہ اگلی میز پر گئی تو میرے دوست نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

بقیہ میزوں کو بھگتاکر وہ واپس سازندوں کے پاس چلی گئی۔

"کیا خیال ہے؟" میرے دوست نے پھر سرگوشی کی۔ حالاں کہ کوئی بھی آس پاس نہیں سن رہا تھا۔

"کس کے متعلق؟"

"سمیعہ کمال کے متعلق"

"ہمارے ہاں جمال کو جمال پڑھتے ہیں۔"

"نہیں! اس کا رقص کیسا ہے؟"

"طبی نکتہ نظر سے ایسا رقص صحت کے لیے نہایت مفید ہے۔ اس سے کمر کے پٹھے مضبوط ہوتے ہیں۔ بھوک کھل کر لگتی ہے اور متواتر اچھل کود سے جگر بھی بیدار رہتا ہے۔"

"ہائے، تم کچھ نہیں۔ طبی رائے کون لے رہا ہے؟ فنی زاویے سے بتاؤ۔"

"فن کا تو پتہ نہیں، لیکن اگر ایسا ناچ اہرام سے برآمد کی ہوئی کسی فرعون کی ممی کے سامنے کیا جائے تو ممی چھلانگ مار کر اٹھ کھڑی ہو۔"

"اس علاقے کا رقص ایسا ہی ہے۔ مگر پبلک تو بڑے شوق سے دیکھتی ہے۔ بلکہ حاضرین میں سے کئی تو تسبیح بھی پھیرتے رہتے ہیں۔ اگر چہ دوسرے ہاتھ میں شراب کا گلاس ہوتا ہے۔"

"پبلک عادی ہو چکی ہے۔ پبلک اکثر عادی ہو جایا کرتی ہے۔"

قہقہے بجھا دیے گئے۔ ساز مدھم پڑ گئے۔ سمیعہ نے ایک ہلکا سا لبادہ اوڑھ لیا۔

اب ایک اور طرح کا رقص شروع ہوا۔ دیکھتے دیکھتے سب کچھ بدل گیا۔ موسیقی کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ وہ ہلورے لے رہی تھی۔ وہ ہوا کے جھونکوں سے کھیل رہی تھی۔ وہ بادلوں کے ساتھ فضاؤں میں تیر رہی تھی۔

لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک نہ رہ سکی۔ دفعتاً سمیعہ کو دورہ سا اٹھا۔ اس نے لبادہ ایک طرف پھینک کر چھلانگ ماری۔ سازندوں نے بھی گیئر بدلا اور وہی دھما چوکڑی پھر شروع ہو گئی۔

فاروق کے محل میں حسن تھا، خمار تھا، چنچل پن، چھیڑ چھاڑ، راگ رنگ، سب کچھ تھے، فقط فاروق نہیں تھا۔

ہم باہر نکلے تو میرے دوست نے چاند کا دوبارہ معائنہ کیا اور فیصلہ سنایا۔ "ابھی وقت نہیں ہوا۔ چلو مینا چلتے ہیں۔"

جنگ کے دنوں میں اہرام کے پاس مینا کیمپ تھا اور مینا ہاؤس ہوٹل، ہوٹل اب بھی ہے۔

میں نے اہرام کو بار بار دیکھا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ علی الصبح، غروبِ آفتاب کے وقت، چاندنی میں، چلچلاتی دھوپ میں۔

چاندنی میں اہرام کو دیکھ کر جو تاثرات پیدا ہوتے ہیں وہ کسی اور عظیم عمارت کو دیکھنے سے نہیں ہوتے۔

اہرام خوش نما نہیں ہیں، نہ پُرہیبت و سنگلاخ ہیں، انھیں نستعلیق بھی نہیں کہا جا سکتا۔ پتھروں کے یہ ڈھیر بے حد سادہ سے ہیں، جیسے ریاضی کے کسی طالب علم نے تکون بناتے وقت چند خطوط کھینچ دیے ہوں۔ اس کے باوجود ان میں انوکھا پن ہے۔ ان سے عظمت ہویدا ہے اور یہ پُرکشش ہیں۔

یہ انسانی تاریخ کا اولیں ترین باب ہیں۔

یونان کے عہدِ زریں سے صدیوں پہلے جب دنیا کے باشندے غاروں اور جھونپڑیوں میں رہتے تھے تب مصر کے بادشاہوں کے دل میں لافانی بننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ کسی قسم کی مشینوں کی مدد کے بغیر انسان نے سینکڑوں میل دور پہاڑوں سے پتھر کاٹے، نیل میں کشتیاں چلیں، پتھر آئے تو انھیں تراش کر محض بازوؤں کی قوت سے ایک دوسرے کے اوپر تہوں میں بڑی نفاست

سے چنا گیا۔ بیس برس لگے، لیکن انتظار کیا گیا اور چٹیل میدان میں پہاڑ کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد پانچ ہزار سال تک انسان نے اتنا زبردست تعمیری کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ پوری پچاس صدیاں گزرنے پر امریکہ میں جدید ترین مشینوں سے بولڈرڈیم بنا، جسے خوفو کے ہرم سے بڑا ہونے کا فخر نصیب ہوا۔

اہرام نے تہذیبوں کا مدوجزر دیکھا ہے۔ تہذیبیں پھیلیں اور مٹ گئیں، قومیں ابھریں اور تباہ ہو گئیں، سکندر اعظم، جولیس سیزر، عمرو بن العاص، نپولین ---- فاتح یکے بعد دیگرے آئے اور چلے گئے، لیکن اہرام سینہ زمین پر جوں کے توں کھڑے ہیں۔

چاروں طرف خاموشی تھی۔ دور قاہرہ کی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ نیچے میدانوں میں دھند سی پھیلی ہوئی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس دھند کے پیچھے لاتعداد انسان مشقت کر رہے ہیں، رسّوں سے بڑے بڑے پتھروں کو کھینچ رہے ہیں۔ ننگی پیٹھوں پر کوڑے برس رہے ہیں۔ پتھروں کو تراشا جا رہا ہے، اوپر گھسیٹا جا رہا ہے اس لیے کہ فرعون کا مدفن تیار ہو جائے اور اسے اطمینان ہو جائے کہ وہ غیر فانی بن جائے گا۔

چاندنی میں اہرام کے پتھر چمکتے ہیں تو دیکھنے والا بھول جاتا ہے کہ ان پتھروں میں خون اور پسینہ جذب ہے۔ ان سے وہ ہوائیں کھیلی ہیں جو آہوں اور سسکیوں سے بوجھل تھیں۔

فرعونوں کے نام سب جانتے ہیں۔ ان کی عظمت و جبروت کے تذکرے عام ہیں۔ لیکن ان کروڑوں انسانوں کے متعلق معلومات بہت کم ہیں جو اس عجوبے کے اصل خالق تھے۔

"یہ وقت نیل کی سیر کا ہے ----" میرے دوست نے فیصلہ کیا۔ "نیل کی رات! ایسی رنگین اور پرفسوں رات محض کہیں کہیں میسر ہوتی ہے ---- آؤ ----"

جب ہم نیل کے کنارے کنارے جا رہے تھے تو چاند دوسری طرف درختوں کی قطار کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کھجوروں کی چوٹیاں چاند کو چھوتیں، پھر چاند رہ جاتا اور آسمان اور نیل کی شفاف سطح۔

ڈھلتی ہوئی رات کے ساتھ تاروں کی چمک تیز ہوتی جا رہی تھی۔

"ایسی ہی رات میں فرعون کی بیٹی کو حضرت موسیٰ کا پنگھوڑا یہیں کہیں تیرتا ہوا ملا تھا۔ یہی چاند تھا اور یہی دریا جب قلوپطرہ کے بجرے یہاں تیرتے تھے۔ اس دریا میں کچھ تو ہوگا جو اجنبیوں کو دور دور سے کھینچ کر لاتا تھا اور اب بھی لاتا ہے۔ یونانی آئے تو یہیں جذب ہو کر رہ گئے۔ رومن آئے اور واپس جانے کا نام تک نہ لیتے تھے۔ ان میں سے چند ممتاز رومن تو کافی خوار بھی ہوئے۔ عرب آئے تو واپس نہیں گئے۔ نپولین کا قیام یہاں طویل ہوتا چلا گیا۔ انگریز بھی بڑی مصیبتوں سے رخصت ہوئے اور اب بند تعمیر ہوں گے جو اس متلون دریا کو قابو میں لائیں گے۔

چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی ہو جائے گی۔ فلاحین کے شب و روز بدل جائیں گے۔ ہر گاؤں میں سکوٹر چلنے لگیں گے اور خوش حالی کے ساتھ ساتھ لمبی لمبی قمیضوں کی جگہ بش شرٹ اور پتلونیں لے لیں گی۔"

اپنے دوست سے معاشی ارتقا کی شان دار تفسیر سن کر بڑی خوشی ہوئی۔

ہوا چل رہی تھی لیکن دریا میں ایک لہر بھی نہ تھی۔ پانی کی سطح آئینے کی طرح چمک رہی تھی جیسے دریا بہتے بہتے رک گیا ہو۔

"نیل ہی مصر ہے۔ اجنبی ہنستے ہیں کہ مصریوں کا مزاج نیل کی طرح ہے۔ جیسے نیل میں اتار چڑھاؤ آتے ہیں ویسے ہی ہماری طبیعت ہے۔ ابھی خاموش ہیں، ابھی بھڑک اٹھے۔ من گئے تھے پھر پارہ چڑھ گیا۔"

"اس وقت نیل بالکل ساکن ہے۔" میں نے اسے بتایا۔

"سنا ہے کہ تمھارے ہاں کئی دریا ہیں ----"

"ہاں ---- اور گزشتہ صدیوں میں حملہ آوروں کی بھی کمی نہیں رہی لیکن وہ کسی خاص دریا کے سلسلے میں نہیں آتے تھے۔"

"تمھارے دریا کیسے ہیں؟"

"خیریت سے ہیں۔ مگر ہم نے سارے شہران پر نہیں بسائے۔"

"وہ کیوں؟"

"شاید اس لیے کہ ہم نے اپنے دریاؤں کو اور انھوں نے ہمیں اچھی طرح نہیں سمجھا۔ تبھی وہ بار بار اپنا راستہ بدلتے رہتے ہیں اور سیلاب بھی لاتے ہیں۔"

"لیکن ہم تو نیل کے سیلاب کا بڑے شوق سے انتظار کرتے ہیں، کیوں کہ یہ آب پاشی کرتا ہے اور زرخیز مٹی گار دیتا ہے۔"

"اتفاق سے ہمارے ہاں آب پاشی کے لیے بے شمار نہریں ہیں لیکن کیا کیا جائے، دریاؤں کو بہ ذات خود آب پاشی کرنے کا شوق ہے۔ چناں چہ برسات میں وہ دور دور کے کھیتوں تک پہنچنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔"

"تمھارے ہاں اس طرح دریا کے کنارے سیر کی جا سکتی ہے؟"

"رات کے چار بجے تبھی کی جا سکتی ہے جب آوارہ گردی کے چالان کا ڈر نہ ہو۔"

رنگ برنگی روشنیوں کا عکس پانی میں پڑ رہا تھا۔ چند سال پہلے انگریزی حروف پانی میں چمکا کرتے تھے، اب ہر جگہ عربی حروف تھے۔ ہوٹل فندق بن چکے تھے سادہ پانی یعنی Water ے کہلاتا تھا۔

چڑیا گھر حدیقۃ الحیوانات تھا۔ Nowaiting کی جگہ ممنوع الانتظار لکھا تھا۔ مس اب آنسہ تھی۔ یہاں تک کہ عبد الکریم اینڈ سنز کی جگہ عبد الکریم و اولادہ، نے لے لی تھی۔ مگر کچھ الفاظ سے یوں لگتا تھا جیسے ترجمہ کرنے والا اور ترجمہ کرانے والا دونوں اتنی جلدی میں ہوں کہ آگے پیچھے سرپٹ بھاگتے ہوئے دبادب ترجمے کر رہے ہوں۔ مثلاً سارجنٹ کو رقیب (شاید رقیب روسیاہ کے سلسلے میں) اور لفٹننٹ کو ملازم کہنا۔ ادھر فیلڈ مارشل کے لیے مہیب استعمال کرنا بھی کچھ عجیب سا معلوم ہوتا تھا اور اسی طرح Benign Malaria کو ملاریا حمیدہ (یعنی مبارک بخار) بنادینا اور Malignant Malaria کو ملاریا خبیثہ۔

"عید کارڈ کے جواب میں بیرام کی مبارک باد بھیجا کرتے ہو۔ یہ بیرام کیا ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تمھارے ہاں بیرام نہیں ہوتا؟"

"ایک بیرم خاں گزرے ہیں۔ مانے ہوئے جنگ جو تھے۔"

"اچھا! کتنی دل چسپ بات ہے؟ مشرق وسطے میں لاتعداد الفاظ مشترک ہیں۔"

"لیکن ہر جگہ معنے مختلف ہیں۔ حمام کسی جگہ پرندہ ہے تو کہیں غسل خانہ۔ اردو کہیں زبان ہے تو کہیں فوج۔ تمھارا محکمہ۔ اہلیہ ملکی معاملات پر نظر رکھتا ہے، ہمارے ہاں اہلیہ بیوی ہوتی ہے۔ ویسے تاریخ ہند میں ایک اہلیہ بائی بھی تھیں۔ ایران میں خصم دشمن ہوتا ہے اور ہمارے ہاں خاوند۔"

"خاوند اور دشمن ایک ہی ہستی کے دو نام سمجھو۔ رہ گئی عید ---- تو تمھاری عید قرباں ہماری قربان بیرام ہے ----"

"تو پھر یہ عید وفاء النیل کیا چیز ہے؟"

"فرعونوں کے زمانے میں ہر سال طغیانی آنے پر سب خوشی مناتے تھے اور نیل کی شادی کی جاتی تھی۔ ایک نو عمر حسینہ کو زبردستی دریا میں ڈبو دیا تھا۔ عربوں نے یہ رسم بند کی لیکن تہوار اب تک منایا جاتا ہے۔"

"یوں تو ---- ہر فرعونے راموسیٰ ---- لیکن حضرت موسیٰ والا فرعون کون سا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"رعمسیس۔"

"اول یا دوم۔"

"غالباً رعمسیس دوم۔"

"فرعون کی خفگی کی کئی وجوہات بتائی گئی ہیں۔ اصلی وجہ کیا تھی؟"

"شاید یہ کہ جب حضرت موسیٰ چھوٹے سے تھے تو انھوں نے فرعون کی داڑھی کھینچ لی تھی

"لیکن فرعونوں کی داڑھی بھی تو عجیب ہوتی تھی۔ چہرہ صاف، مونچھیں ندارد اور ایک لمبی سی رسی نما داڑھی ٹھوڑی سے لٹکی ہوئی ہے۔۔۔۔"

"یہ داڑھی مصنوعی ہوتی تھی۔ بعض اوقات اس میں موتی پروئے جاتے تھے۔ اس زمانے میں داڑھی کو دانائی کا نشان سمجھا جاتا تھا۔"

"مصنوعی داڑھی سے اصلی دانائی آنی مشکل ہے۔ اس قسم کی چیز لٹکتی ہوئی نظر آجائے تو ہر بچہ اسے پکڑنے کی کوشش کرے گا۔ غلطی فرعون کی تھی کہ ایسی داڑھی لگا کر بچے کے قریب گیا۔"

چاند چھپ چکا تھا۔ اب تارے تھے اور نیل تھا۔

تارے جتنے آسمان پر تھے اتنے ہی دریا میں جھلملا رہے تھے۔ درختوں کے جھنڈ چپ چاپ منتظر کھڑے تھے۔ فضا میں خنکی تھی اور نامعلوم سی خوش بو جو دریا سے منسوب ہوتی ہے۔

"آج تم کچھ بھی نہیں دیکھ سکے۔" وہ بولا۔

"آج میں نے تقریباً سب کچھ دیکھ لیا۔۔۔ اہرام، نیل اور سمیعہ کمال۔۔۔ فقط قلوپطرہ کا ذکر رہ گیا ہے۔۔۔۔"

"قلوپطرہ پر ابھی ریسرچ ہوئی ہے۔ محققین کہتے ہیں کہ جب سیزر یہاں آیا تو پچاس سے اوپر کا تھا۔ اس کے گنجے سر پر جو چند بال تھے وہ سیاہ نہیں تھے۔ ادھر انطونی بے حد پلا ہوا تھا۔ اس کے گول مٹول چہرے پر ہر وقت ایک احمقانہ مسکراہٹ رہتی تھی۔ اور چوڑی گچھے دار گھنی داڑھی سے شکل کوئی خاص بہتر نہیں معلوم ہوتی تھی۔ قلوپطرہ بھی اتنی نوخیز نہیں تھی جتنی کہ شیکسپیئر اور دیگر حضرات نے بتائی ہے۔ دراصل وہ اچھی خاصی پختہ عمر کی عورت تھی چوں کہ نصف یونانی تھی اور نصف مصری، اس لیے اس کا رنگ مشکی ہوگا۔ لہٰذا رومان وغیرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

"ان دنوں ریسرچ کا مقصد ہی یہ رہ گیا ہے کہ کسی مسلمہ حقیقت یا اچھی بھلی شخصیت کا ناس مار دیا جائے۔ محققین تو یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ شیکسپیئر تھا ہی نہیں۔ اور یہ کہ نپولین کو کم از کم پچاس یا ساٹھ بیماریاں تھیں۔ ایسی باتوں پر یقین نہ کیا کرو۔ ریسرچ کرنے والے اپنی پبلسٹی بھی چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں قلوپطرہ بڑی اچھی لڑکی تھی۔ حسین، انٹلکچوئل اور سوشل۔ اگر رومن بار بار آکر ادھم نہ مچاتے تو وہ زیادہ خوش رہتی۔"

"لیکن اتنی مشہور نہ ہوتی۔"

"اس کی شہرت تمھارے اور میرے لیے ہے۔ اسے اپنی زندگی میں تو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔

"شہرت مرنے کے بعد ہی ہوا کرتی ہے۔"

ہم پتھروں پر بیٹھ گئے۔ وہ پانی میں ہاتھ ڈال کر چھینٹے اڑانے لگا۔

"سب کہتے ہیں کہ نیل کا پانی جلد سے چھو جائے تو ایک خطرناک بیماری لاحق ہو سکتی ہے

جو پیچھا ہی نہیں چھوڑتی ۔ اس پانی میں Bilharzia ہوتا ہے۔ سارے ملک میں لے دے کر ایک ہی دریا ہے، اسی کا پانی خطرناک ہے۔ بے چارے فلاحین ہزاروں برس سے اس بیماری میں مبتلا ہیں۔" اس نے افسوس سے کہا۔

یہ دبلے پتلے محنتی کسان جنھیں فلاحین کہا جاتا ہے، صدیوں سے نیل کے کنارے ہل چلاتے رہے ہیں۔

قاہرہ، سکندریہ، پورٹ سعید، لکسر، مصر کے کسی بھی شہر سے ڈیڑھ دو میل باہر نکلتے ہی منظر یک لخت بدل جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کچے مکان، اڑتی ہوئی دھول، مکھیاں، کتے، ریت کے ٹیلے اور لمبی لمبی قمیضیں نظر آنے لگتی ہیں۔ زمانہ دفعتہً تین چار ہزار سال پیچھے چلا جاتا ہے۔

جنگ کے زمانے میں جب پہلی مرتبہ مصر کے گاؤں دیکھے تو سب کچھ مانوس سا معلوم ہوا۔

دریا میں کشتیاں تیر رہی تھیں۔ کناروں پر پانی بھرنے والیوں کے ہجوم تھے۔ کسان رسّے اور ڈول سے پانی نکال رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ ان دنوں کسی گاؤں میں جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ہمارے چند انگریز ساتھی بار بار کہتے کہ واپس چلو۔

حام بولا۔ " دیکھتے نہیں، ان کا رویہ ہر روز بد لتا رہتا ہے۔ ہم جرمنوں کو دھکیلتے ہیں تو ہماری خواہ مخواہ آؤ بھگت ہوتی ہے۔ جب جرمن آگے بڑھتے ہیں تو ہماری موٹروں پر یہی پبلک پتھراؤ کرتی ہے۔ ان کا کچھ پتہ نہیں۔" نابی نے اسے بتایا کہ " پبلک کا کوئی قصور نہیں۔ جب غیر ملکی ہزاروں میل دور سے فوجیں لا کر ان کے ملک کو لڑائی کے گراؤنڈ کے طور پر استعمال کر رہے ہوں تو مقامی باشندوں کی پوزیشن کچھ عجیب سی ہو جاتی ہے۔ اور یہ تو دیہاتی ہیں۔ ان بے چاروں کو بین الاقوامی سیاست کا کوئی علم نہیں۔ شہروں میں کچھ ہوتا رہے، ان کے شب و روز ویسے ہی کٹھن رہتے ہیں۔"

لڑائی کے ذکر پر حام اپنا محبوب فقرہ ضرور سناتا۔ "ہم یہ جنگ آئندہ کی تمام جنگوں کو ختم کر دینے کے لیے لڑ رہے ہیں۔"

اس پر نابی کہتا" تاکہ اس کے بعد جو امن آئے وہ آئندہ کے تمام امنوں کو ختم کر دے۔"

موٹے تازے، چکنے چپڑے، شہریوں کے مقابلے میں فلاحین تن درست نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ بخاروں، بلہارزیا، ککروں کے دائمی مریض ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے سانولے چہروں پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اور ایک گہری اداسی اور تھکاوٹ مسلط تھی لیکن اس کے باوجود وہ مسکرا رہے تھے۔ یہ وہ محزوں مسکراہٹ تھی جو دیکھنے والے کی آنکھوں میں آنسو لے آتی ہے۔

جب انھیں بتایا کہ ہم میں سے بیش تر کسان گھرانوں سے ہیں تو بیٹھنے کے لیے ریت پر چادر بچھا دی گئی۔ ایک کسان کھجوریں لے آیا، دوسرا پتوں سے مکھیاں جھلنے لگا۔

دیکھتے دیکھتے ہمارے انگریز ساتھیوں کا رویہ بدل گیا۔ وہ ہاتھ کے اشاروں سے فلاحین سے گفتگو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

دراصل انگریز ان لاتعداد چوریوں سے نالاں تھے جو شہروں اور کیمپوں میں آئے دن ہوا کرتیں۔

بازاروں میں اکثر یہ ہوتا کہ پھیری والے کسی فوجی کے پیچھے لگ جاتے کہ ہماری چیزیں خریدو، اگر وہ انکار کرتا تو خواہ مخواہ بحث شروع کرکے اس کا تعاقب کرتے ۔۔۔۔ حتیٰ کہ وہ تنگ آکر انھیں ڈانٹنے لگتا۔ اس لمحے کا ان سب کو انتظار رہتا تھا۔

فوراً چند مقامی حضرات بیچ بچاؤ کرنے آجاتے۔ کوئی فوجی کو ایک طرف کھینچتا اور کوئی پھیری والے کو۔ جب مجمع منتشر ہوتا تو فوجی کی گھڑی، قلم، بٹوہ (اور اکثر شناختی کارڈ بھی) غائب ہو چکے ہوتے۔

سامان سے لدی ہوئی لاریاں قطار میں روانہ ہوتیں تو کسی منظم گروہ کے افراد طے شدہ پروگرام کے مطابق بیش تر سامان غائب کر دیتے۔

پہلی ٹولی جو درختوں کی ٹہنیوں میں چھپی ہوئی ہوتی، چلتی لاریوں پر چھلانگ لگاتی اور چپکے چپکے رسے اور ترپال کاٹ کر فوراً نیچے کود جاتی۔ اگلے جھنڈ میں دوسری ٹولی درختوں سے کود کر پھرتی سے بکس کھولتی اور غائب ہو جاتی۔ پھر تیسری ٹولی کارآمد چیزیں سڑک پر پھینک کر اتر جاتی۔ چناں چہ جب منزلِ مقصود پر پہنچتے تو لاریوں میں صرف پیکنگ کا سامان ملتا۔ ادھر ڈرائیور قسمیں کھاتے کہ انھوں نے تو نہ کہیں چور دیکھا اور نہ کہیں ہالٹ کیا۔ چناں چہ ملٹری پولیس کی ہدایات کے مطابق شہر جانے سے پہلے سب اپنی قیمتی چیزیں کیمپ میں چھوڑ جاتے اور فقط کرنسی کے چند نوٹ مٹھی میں دبا کر بڑے محتاط انداز میں نکلتے۔

مگر نابی کہا کرتا کہ جس شہر کے قریب جنگ ہو رہی ہو، وہاں یہی ہوتا ہے، خواہ وہ پیرس ہو، روم ہو یا قاہرہ۔

اگلے روز میرے دوست نے پھر کسی مہاتما کی طرح پوچھا۔ "بتاؤ کیا دیکھو گے؟" یعنی دوسری خواہش بیان کرو۔

میں نے میوزیم دیکھنے کی خواہش کی۔ جنگ کے دنوں میں اسے بند کر دیا گیا تھا اور بمباری کے ڈر سے ساری قیمتی چیزیں کہیں بھیج دی گئی تھیں۔

میرے دوست نے فوراً ٹیلیفون کرکے ایک نہایت قابل گائیڈ کا انتظام کیا جسے تاریخ پر مکمل عبور حاصل تھا۔ پروگرام کے مطابق اسے زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں آجانا چاہیے تھا۔ جب تین گھنٹے گزر گئے تو میرے اصرار پر دوبارہ ٹیلیفون کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ گائیڈ تو کسی

یورپین کے ساتھ ابھی ابھی باہر نکل گیا ہے لیکن اس کی بھتیجی یا بھانجی) فون پر Niece سنا تھا) جو تاریخ کی سکالر ہے جسے اسکالر شپ بھی ملتا ہے، ہماری طرف آرہی ہے۔

تھوڑی دیر میں ایک شخص آیا جو خفیہ پولیس کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ جس نے سر سے پاوں تک مختلف کپڑوں سے جسم کو ڈھانپ رکھا تھا۔

اس نے زنانہ آواز میں علیک سلیک کی اور ہمارے پاس آکھڑا ہوا۔

غور سے دیکھا تو یہ عورت تھی۔

یہ آنسہ ثانیہ تھی، جس نے Skirt ، لبادہ، تہمد، شال وغیرہ سب کچھ لپیٹ رکھا تھا۔ سادہ عینک پر سیاہ شیشے چڑھا رکھے تھے اور چہرے پر اس قسم کی جالی تھی جو دکان دار عموماً مٹھائیوں کو ڈھانپنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

رسمی تعارف کے بعد ہم میوزیم پہنچے۔

ثانیہ نے بڑے عالمانہ انداز میں بتایا کہ ۔۔۔۔ "جب تک کسی ملک کے جغرافیائی حالات کا علم نہ ہو تاریخ کا مطالعہ بے سود ہے۔ غالباً آپ مصر اور نیل کے متعلق کچھ نہ کچھ تو جانتے ہی ہوں گے؟"

میں نے سفری تھیلے سے کئی کتابچے اور پمفلٹ نکال کر سامنے رکھ دیے۔ ان میں سے کچھ سیر و سیاحت کی کمپنیوں کے تھے اور چند قاہرہ میں طبع ہوئے تھے۔

"میرا جغرافیہ اور تاریخ، بلکہ سارے مضامین ۔۔۔ ہمیشہ کمزور رہے ہیں۔ تم ہی ان میں سے کچھ پڑھ کر اسے سنا دو۔" میرے دوست نے سرگوشی کی (نہ جانے کیوں اسے بلاوجہ کی سرگوشیوں کی عادت ہے)۔

میں نے پمفلٹ کھولے اور صفحوں کو الٹنا شروع کیا۔ "Kipling نے کہا تھا کہ مصر کے ملک کو درحقیقت ملک نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو ایک بل کھاتا ہوا ابھرا ابھرا بازار ہے۔ اور کپلنگ نے بالکل سچ کہا تھا! مصر میں بارش بہت کم ہوتی ہے، بلکہ ہوتی ہی نہیں۔ سارے ملک کا فقط اٹھائیسواں حصہ قابل کاشت ہے، وہ بھی نیل کی بدولت کیوں کہ اگر نیل نہ ہوتا تو مصر سو فیصد صحرا ہوتا اور یہ اپنے دہانے سے چار ہزار میل دور جھیل وکٹوریہ سے نکلتا ہے۔ اس شور مچاتے ہوئے نیل کو بحرالغزل کہا جاتا ہے۔ ایک اور جھاگ اڑاتی ہوئی پہاڑی ندی بحرالجبل اس سے ملتی ہے تو بحرالارزق یعنی چتا نیل ظہور میں آتا ہے، جو فقط خرطوم تک سفید رہتا ہے کیوں کہ وہاں نیلا نیل یعنی بحرالارزق اس کا منتظر ہوتا ہے۔ جب دونوں ملتے ہیں تو اصلی نیل بنتا ہے۔ اس طرح نیل بننے کے عمل میں اسے کافی مسافت کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا مصر کے میدانوں میں بہنے کے لیے اسے فقط پانچ سو میل ملتے ہیں۔ قاہرہ سے آگے یہ دو شاخوں میں بٹ جاتا ہے جو ایک دوسری سے دور ہوتی جاتی ہیں حتیٰ کہ جب بحیرۂ روم میں گرتی ہیں تو ان کے درمیان ڈیڑھ سو میل کا فاصلہ ہوتا ہے

اور یہ کہ کتابوں میں نیل کو کھجور کے درخت سے تشبیہہ دی گئی ہے جس کی جڑیں سمندر میں ہوں اور ٹہنیاں پہاڑوں پر لیکن میری حقیر رائے میں نیل کھجور سے ہرگز نہیں ملتا اور نہ کھجور نیل سے ملتی ہے۔ اگر زبردستی اس تشبیہہ کو صحیح مان لیا جائے تو پھر اس قسم کی کھجور کافی ٹیڑھی ترچھی ہوگی۔ لہٰذا کھجور نہیں کچھ اور چیز ہوگی۔ نیل نے مصر کی جغرافیائی پوزیشن کو کافی خراب کر رکھا ہے۔ یعنی نقشوں میں مصر کا اوپر والا حصہ نچلا نیل کہلاتا ہے اور زیریں حصہ بالائی مصر! یہ اس لیے ہے کہ شاید مصر اتنا اہم نہیں جتنا کہ نیل۔ طلبہ کی سہولت کے لیے اسے درست کر دینا چاہیے، ورنہ پھر نیل کو الٹی سمت میں بہانا چاہیے۔ جنوبی گرم ہوائیں خمسین اپریل مئی میں شروع ہو جائیں تو جیسا کہ نام سے ظاہر ہے پچاس دن چلتی ہیں اور نیل کے گرد و نواح میں اتنی خوش گوار تبدیلی لے آتی ہیں کہ لوگ نہایت چڑچڑے اور جھگڑالو ہو جاتے ہیں۔ ترک اتنے سمجھ دار ہیں کہ جب وہ مصر کے حکم ران تھے تو استنبول سے یہاں کے مجسٹریٹوں کو ہدایات ملی ہوئی تھیں کہ خمسین کے دوران جو جرائم ہوں ان کی سزائیں اس منحوس موسم کو مدنظر رکھتے ہوئے دی جائیں۔ باقاعدہ گرمیوں میں حبشہ سے مون سون آتی ہیں تو نیل میں سیلاب آتا ہے اور راتوں رات دریا کی سطح بیس پچیس فٹ اونچی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد پندرہ بیس میل تک سرخی مائل پانی پھیل جائے گا اور ہر جگہ نیل ہی نیل ہو گا۔ گرم ملکوں میں کسان بارش کے انتظار میں عمودی رخ میں، یعنی آسمان کی طرف دیکھتے ہیں کہ بوندیں کب پڑتی ہیں لیکن مصریوں کی نگاہیں آسمان کی طرف نہیں بلکہ افقی سمت میں ہوتی ہیں کہ طغیانی کب آتی ہے۔ ہمارے ہاں نماز مغرب کی طرف منہ کر کے پڑھتے ہیں لیکن مصر میں جنوب مشرق کی طرف۔ مصر کے سکندریہ کے علاوہ سکندر اعظم نے ہمارے ہاں بھی دو تین سکندریہ آباد کیے ہوں گے۔ بہرحال ایک سکندریہ اب باقی ہے۔ یہ زمانے کی گردش سے چھوٹا ہوتا چلا گیا اور اب اچ کی شکل میں پنج ند کے قریب دیکھا جا سکتا ہے۔"

"تم نے حیوانات و جمادات کا ذکر نہیں کیا۔۔۔۔" میرا دوست بولا۔

"وادیِ نیل میں اونٹ اور گدھے افراط سے ملتے ہیں۔ اونٹ تو خیر اوسط درجے کے ہیں لیکن گدھے نہایت مضبوط، صحت مند اور مسرور ہیں۔ ایسے تن درست و توانا گدھے کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتے۔ قاہرہ میں چوک کا سپاہی چند چمکیلی لمبی امریکن کاروں کو گزار چکتا ہے تو دوسری طرف اشارہ کرتا ہے کہ اب وہ گدھے گزر جائیں جن پر سوٹ اور ہیٹ پہنے ہوئے حضرات بیٹھے ہوئے ہیں۔ فرعون کے مقبروں میں اونٹ کی تصویر نہیں ہے، نہ ان کے لٹریچر میں اس کا ذکر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ یہاں عربوں نے رائج کیا تھا۔ فرعون کے زمانے میں یہاں لوگ چھوٹا سا تہمد باندھتے تھے۔ لیکن اب ایک نہایت ہی لمبی قمیض کا رواج ہے جو دور سے نارمل قمیض اور تہمد کا مرکب معلوم ہوتی ہے چوں کہ سارے جسم پر فقط ایک ڈھیلا ڈھالا کپڑا ہوتا ہے لہٰذا گرمیوں میں بدن کو ایر کنڈیشن کرنے کے لیے اس سے بہتر لباس نہیں ہو سکتا۔"

"بس بس کافی ہے۔" ثانیہ نے ٹوکا۔ "چلیے اندر چلیں۔"
اس نے لبادہ اتارا، اور سر سے لپٹا ہوا رومال کھینچ لیا۔
اب تاریخ کا سبق شروع ہوا۔ ثانیہ نے ایک کتاب کے صفحے الٹے اور کہنے لگی۔
"اس سے پہلے کہ آثار قدیمہ کا باقاعدہ ذکر ہو اہرام اور ابوالہول کے متعلق جاننا ضروری ہے۔ خوفو کے ہرم کی بنیاد تیرہ ایکڑ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی تعمیر پر اڑھائی اڑھائی ٹن کے تیئس لاکھ پتھر استعمال ہوئے۔ اگر یہ سب پتھر خط استوا کے ساتھ ایک قطار میں رکھ دیے جائیں تو دو تہائی دنیا کو محیط کر لیں۔ ہرم کی چوٹی ہواؤں اور آندھیوں سے گھس گھس کر تیس فٹ کم ہو چکی ہے پھر بھی یہ ساڑھے چار سو فٹ بلند ہے۔ ایک لاکھ انسانوں نے بیس برس تک محنت کی تب یہ مکمل ہوا۔۔۔۔"
"بیس برس تک کھیتی باڑی بند رہی ہو گی؟" میں نے پوچھا۔
"نہیں۔ خوفو فلاحین سے ہر سال فقط تین مہینے کام لیتا تھا۔ جب نیل میں طغیانی آتی تھی تب۔۔۔۔"
"بڑا اچھا فرعون تھا۔ سیلاب کے دنوں میں فلاحین ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہوں گے۔ ان کی ضیافت طبع کے لیے خوفو نے اچھا مشغلہ بہم پہنچایا۔۔۔۔" میرے دوست نے کہا لیکن ثانیہ نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ ہمیں بتا رہی تھی کہ "خوفو کے ہرم کے بعد خفرے نے اپنا ہرم ایک اونچے ٹیلے پر بنوایا، اس استادی سے کہ اس کا ہرم جو در حقیقت خوفو کے ہرم سے چھوٹا ہے، دیکھنے میں بڑا دکھائی دیتا ہے۔۔۔۔"
"بے حد ذہین فرعون تھا۔ اس طرح پچیس تیس فٹ بھی بچا گیا اور ناک بھی اونچی رکھی۔" میں نے لقمہ دیا۔ ثانیہ نے برا سا منہ بنایا اور گلے میں بندھا ہوا ایک سکارف اتار کر اپنے بیگ میں رکھ لیا۔
میرے دوست نے شرارتاً میری طرف دیکھا۔
ثانیہ بیان کر رہی تھی۔۔۔۔ "تیسرا ہرم منکرے کا ہے۔ ویسے نیل کے کنارے چھوٹے بڑے سب ملا کر ستر اہرام ہیں۔۔۔۔"
"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر فرعون کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ ممی بن کر ہرم میں دفن ہو تو جیون سپھل ہو جائے۔ یعنی لافانی بننے کے لیے فانی جسم کی حفاظت اشد ضروری تھی۔ لہٰذا فرعون شروع سے اسی چکر میں رہتا ہو گا کہ جوانی ہی میں اپنے ہاتھوں اپنا مقبرہ تیار کر لے۔ ہرم مکمل ہونے پر شاید چیف انجینیر مؤدبانہ عرض کرتا ہو گا کہ حضور مقبرہ تیار ہے اور حسب منشا ذرا سے نوٹس پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔۔۔۔"
ثانیہ کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے اور میرے دوست کے چہرے پر مسرت کے۔

وہ کہہ رہی تھی ---- "اہرام فنِ تعمیر کا شاہ کار سمجھے جاتے ہیں۔آج تک کوئی یہ معلوم نہ کر سکا کہ یہ کیوں بنائے گئے تھے۔"

"لیکن کچھ لوگ انھیں نرے پتھروں کے ڈھیر سمجھتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ ہر شخص ہرم بنا سکتا ہے۔پتھروں کی تہیں اس طرح جمائی جائیں کہ ہر اوپر والی تہہ نچلی تہہ سے طولاً عرضاً ذرا چھوٹی ہو، تو لازمی طور پر ایک مخروطی عمارت بن جائے گی جس کے گرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"کون ہیں وہ لوگ؟" ثانیہ پوچھا۔

"میں ان میں سے نہیں ہوں۔ یوں ہی سنی سنائی کہی ہے۔ لیکن فرعونوں کے بعد جو فاتحین آئے انھوں نے ہر مرتبہ انھیں ملبے کے ڈھیر سمجھا اور ان کے پتھر اکھاڑ اکھاڑ کر عمارتوں کے لیے استعمال کیے۔"

"آپ نے اور کیا کیا سنا ہے؟"

"یہ کہ فرعون دن بھر فرعونیت سے کام لیتا تھا۔ لیکن رات کی تنہائی میں سجدے میں گر کر گڑگڑاتا کہ خدایا معاف کرنا، یہ سب دکھاوا ہے اور مجبور آکر نا پڑتا ہے----"

"اور----؟"

"اور یہ کہ قدیم مصری باشندے خوفو اور خفرے سے بے حد خفا تھے کہ ان سے زبردستی اہرام بنوائے اور سب کو مدتوں عذاب میں گرفتار رکھا۔ ان دنوں ان دونوں کا نام لینا بھی گناہ سمجھا جاتا تھا۔ خفرے کا لڑکا منکرے ذرا رحم دل نکلا اور رعایا کی بہبودگی کی طرف متوجہ ہوا۔ چناں چہ اس کا ہرم اپنے باپ کے ہرم سے نصف رہا۔ منکرے کا بیٹا اور بھی زیادہ شریف تھا۔ لوگوں نے اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا کہ فرعون ہو کر اتنی اچھی طرح پیش آتا ہے۔اس غریب کا کوئی ہرم نہ بن سکا۔ویسے مضبوط اور بڑھیا کوالٹی کے اہرام وہی ہیں جو شروع کے فرعونوں نے اپنی ذاتی نگرانی میں بنوائے۔ بعد میں معیار گرتا گیا۔یہاں تک کہ کئی اہرام ایسے بھی بنے جن میں باہر ذرا سا پتھر لگایا ہے، ورنہ اندر ریت اور مٹی ہے۔یہ ضرور ٹھیکیداروں سے بنوائے گئے ہوں گے اور عرض یہ ہے کہ فرعون نہ میرے کچھ لگتے تھے، نہ آپ کے بھلا آپ خفا کیوں ہو رہی ہیں۔؟"

"شاید کسی کے کچھ لگتے ہوں۔" میرے دوست نے کہا۔ "ان فرعونوں کو بڑی لفٹ مل رہی ہے۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ ایک فرعون کا بڑا سارا مجسمہ ریگستان سے لا کر قاہرہ کے ریلوے سٹیشن کے سامنے نصب کیا جا رہا ہے۔ یہ نیا رجحان ہے۔ غالباً ہم سارے حملہ آوروں کو یک لخت بھلا دینا چاہتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ سب سے پہلے مصریوں نے کہا کہ ہم کسی اور ملک سے یہاں آئے تھے۔ جب یونانیوں کے بعد رومن آئے تو انھیں بتایا کہ ہم یونانی النسل ہیں۔ فرانسیسی آئے تو انھیں یقین دلایا کہ دراصل ہمارے بزرگ عرب تھے۔ ترکوں سے بھی کچھ کہا ہو گا انگریزوں کو

یہ بتایا تھا کہ ہمیں تقریباً فرانسیسی سمجھو۔۔۔۔"
ثانیہ نے باقاعدہ ناراض ہو کر اپنی عینک سے کالے شیشے اتار لیے۔ چہرے کی جالی ایک طرف کی اور سر سے لپٹا ہوا رومال نمبر دو کھول دیا۔۔۔۔ اب وہ تقریباً تقریباً لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔

"اگر آپ دونوں نے صحیح طریقے سے تاریخ پڑھی ہوتی۔" وہ منہ پھیر کر بولی۔ "تو آپ کو پتہ چلتا کہ یا تو فرعونوں کے زمانے میں ہماری اپنی حکومت تھی یا اب ہے۔ ورنہ یہاں ہزاروں برس غیر ملکی حکمران رہے ہیں۔ فاروق کا بزرگ محمد علی بھی تو البانیہ کا سوداگر تھا۔"

"مان لیا کہ فرعون ہی اصلی بزرگ تھے لیکن انھیں گزرے پانچ ساڑھے پانچ ہزار سال ہو چکے ہیں۔ اس طویل عرصے میں کئی قومیں مخلوط ہوئی ہیں۔ ویسے دیکھا جائے تو فرعونوں کی وجہ سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔ دور دور سے سیاح آتے ہیں۔" میرے دوست نے اقوامِ متحدہ کے نمائندے کی طرح بیان دیا۔

"پرانے زمانے کی طرف لوٹ جانے کی خواہش کچھ اتنی عجیب بھی نہیں۔ ان دنوں مشرق میں یہ تمنا عام ہے۔" میں نے اپنے دوست کی تائید کی۔

"فرعونوں کو بزرگ بنا لینے سے اب کوئی خاص نقصان نہیں پہنچ سکتا۔" میرے دوست نے کہا۔ "لیکن اس زمانے کا رسم الخط کہیں رائج نہ ہو جائے۔ چڑیا، سانپ، مچھلی، دریا، گیدڑ، الو سورج، لومڑی وغیرہ کی تصویروں کو پڑھنا اور ان کا مطلب سمجھنا بہت مشکل ہو جائے گا۔"

ثانیہ نے عینک اتار دی اور ایک اور لبادہ بھی۔ اب وہ کہیں بہتر لگ رہی تھی۔

"یہ بتائیے کہ آپ تاریخ اسی طرح پڑھتی ہیں؟" میں نے اسے چھیڑا۔

"تو اور کس طرح پڑھتے ہیں؟"

"آپ تو جغرافیہ بھی ساتھ ملا لیتی ہیں۔ ناپ، لمبائی، چوڑائی، بلندی وغیرہ۔۔۔۔ یہ سب کچھ جغرافیے میں ہوتا ہے۔ تاریخ کو کسی اور زاویے سے لینا چاہیے۔ اس میں طرح طرح کے موڑ آتے ہیں۔ مثلاً اب مجھ سے کہا جائے کہ آنسہ ثانیہ کا جغرافیہ بیان کرو، تو میں کہوں گا کہ ثانیہ کا قد پانچ فٹ چار انچ کے لگ بھگ ہے۔ وزن نو سٹون ہو گا۔۔۔۔ بے شمار رومال سکارف ہٹا دیے جائیں تو خوش شکل ہے۔ انگریزی بولتی ہے۔ لیکن تاریخ بیان کی جائے تو پھر ثانیہ کی سبز آنکھوں کا بھی ذکر ہو گا جو مصر میں نہیں ہوتیں۔ بالوں کی سنہری جھلک کا حوالہ بھی دیا جائے گا اور یہ کہ اس کا نام ثانیہ نہیں اوّلہ ہونا چاہیے۔ یہ بھی کہا جائے گا کہ ثانیہ بنت النیل ہے۔ ویسے یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تک کسی کے جغرافیے میں جاذبیت نہ ہو اس کی تاریخ دل چسپ نہیں ہو سکتی۔۔۔۔" وہ مسکرانے لگی۔

"آنکھوں کا یہ رنگ ایک بزرگ خاتون سے ملا جو یورپ سے آئی تھی۔ بالوں کی رنگت

آرمینیا سے نانی لائی تھیں۔ آپ کے ہاں بھی تو لوگ مغربی قوموں میں شادیاں کرتے ہوں گے؟"

"بہت کم۔۔۔۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ مغربی بیویوں کو گرمیوں میں پہاڑوں پر بھیجنے کی بڑی مصیبت رہتی ہے۔ ادھر سب یہی کہتے ہیں کہ لڑکا ولایت سے میم بھگالایا ہے۔ میم خواہ ہوائی جہاز سے آئی ہو یا سمندری راستے سے، مگر بھاگنے بھگانے کا حوالہ عمر بھر دیا جاتا ہے اور ساتھ یہ امید بھی ظاہر کی جاتی ہے کہ انشاء اللہ میم کسی دن ضرور واپس بھاگ جائے گی۔ فائدہ ہے تو ایک۔۔۔۔ وہ یہ کہ بیوی اور خاوند کے رشتہ دار ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور رہتے ہیں۔"

"تاریخ کی باتیں کرو" میرے دوست نے کہا۔ "میوزیم کا وہ آدمی ہمیں گھور رہا ہے۔ اہرام ختم ہو چکے، ابوالہول رہ گیا۔ تم ابوالہول کے متعلق کیا جانتے ہو؟ وضاحت سے بیان کرو۔"

"کتابوں میں لکھا ہے کہ جب عرب مصر میں آئے اور اہرام کے پاس ایک عجب الخلقت شبیہہ دیکھی جس کی سرخ آنکھیں چمک رہی تھیں تو دل میں ہول اٹھا۔ فوراً ابوالہول نام تجویز ہوا جو غالباً البدبہہ تھا۔ دراصل خوفو کے ہرم کی تعمیر ختم ہونے پر ایک طرف پتھریلا سا ٹیلہ رہ گیا تھا جسے دیکھ کر آرٹسٹ ناک بھوں چڑھاتے کہ سارے منظر کو تباہ کر دیتا ہے۔ خفرے اپنے ہرم کے سلسلے میں وہاں آیا اور یہ باتیں سنیں تو خفا ہوا۔ اس نے متعلقہ آرٹسٹ پکڑے اور انھیں حکم دیا کہ اس ٹیلے کو تراش کر ہمارا مجسمہ بناؤ۔ پرانا بادشاہ تھا اور پھر فرعون تھا۔۔۔۔ خدوخال تراشتے وقت سنجیدگی اور دبدبے کا خاص خیال رکھا گیا اور نہایت ڈراؤنا چہرہ ظہور میں آیا۔ آرٹسٹوں کو کبھی خفا نہیں کرنا چاہیے۔ یوں بھی بادشاہت اور مسکراہٹ دو متضاد چیزیں سمجھی جاتی تھیں۔ چہرہ جو کہ چودہ پندرہ فٹ چوڑا ہوگا، انسانی ہے لیکن دھڑ کسی شیر کے جسم سے متاثر ہو کر بنایا گیا ہے۔ ایک مرتبہ یہ ریت میں دب گیا تھا مگر لوگوں نے کھود کر نکال لیا۔ ایسی چیزیں زیادہ دیر تک دبی نہیں رہ سکتیں۔ یونانی، رومن، عرب، فرانسیسی، ترک۔۔۔۔ جو بھی یہاں آیا اسے دیکھ کر متعجب ہوا، سوائے انگریزوں کے جو کہ اس کی تصویر پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ نپولین تو گھنٹوں کھڑا اسے تکتا رہتا تھا۔ اسی زمانے میں توپ کے گولوں سے اس کی ناک توڑ دی گئی۔ مملوک کہتے تھے کہ فرانسیسیوں نے توڑی ہے۔ فرانسیسی کہتے تھے کہ مملوک چاند ماری کر رہے تھے، ہم تو قریب بھی نہیں گئے بلکہ ہمیں تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ یہاں کوئی ابوالہول ہے بھی۔ بہرحال جس نے بھی توڑی اچھا نہیں کیا ممکن ہے کہ اس کی وجہ رشک یا حسد ہو کیوں کہ صدیوں پہلے رومن بادشاہ Caligula نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ مصر جا کر ابوالہول کے چہرے کے نقوش بدلوا کر اپنی شبیہہ بنوائے گا، لیکن عمر نے وفا نہ کی اور یہ کہ ابوالہول کی خاموشی ضرب المثل بن چکی ہے۔ اکثر سننے میں آتا ہے کہ فلاں شخص ابوالہول کی طرح چپ چاپ اور گھنا ہے۔ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ

ابوالہول سمیت تمام بت خاموش رہتے ہیں، کیوں کہ وہ بول نہیں سکتے۔"

"شاباش!" میرے دوست نے میرا کندھا تھپتھپایا۔

"آپ ریسرچ کر رہے ہوں گے۔ کون سی صدی قبل از مسیح پر کام کر رہے ہیں؟" ثانیہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"جی نہیں، میں ریسرچ بالکل نہیں کر رہا۔"

"تاریخ کے متعلق آپ کے نظریے عجیب سے ہیں۔"

"اس کی ذمے دار تاریخی ہستیاں ہیں۔ میں بے قصور ہوں۔"

اب ثانیہ سارے زاہد لبادے اور رومال وغیرہ اتار چکی تھی اور بالکل نارمل لڑکی لگ رہی تھی۔

میرے دوست نے بتایا کہ ثانیہ کے خاندان والے پرانے خیالات کے ہیں اس لیے اسے باہر جاتے وقت اس قسم کے کپڑوں کی وردی پہننی پڑتی ہے۔ پھر اس نے ثانیہ کو پوری طرح یقین دلایا کہ تاریخ کے موضوع سے میرا دور کا بھی واسطہ نہیں اور میں معمولی سا سیاح ہوں۔ تب ثانیہ کی خفگی دور ہوئی۔

"اب میں کلاس لوں گا۔" میرے دوست نے فیصلہ کیا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

قدیم مصری تصویر کشی اور بت تراشی زیادہ تر مقبروں کے توسط سے میوزیم تک پہنچی ہے۔ تصویروں میں زندگی سے زیادہ موت کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کا مذہب انھیں صحیح موت کے لیے تیار کرتا تھا کہ اگلی زندگی نہایت شان دار ہو (خواہ پہلی زندگی کتنی ہی بری گزرے)۔ یہ فلسفہ کچھ زیادہ غیر مانوس نہیں معلوم ہوتا۔ دنیا کے کئی حصوں (خصوصاً مشرق) میں اس پر اب بھی عمل کیا جاتا ہے۔

تصویروں میں ہر شخص کا سائز اس کے مرتبے کے مطابق ہے۔ ایک ہی تصویر میں فرعون کئی ہاتھ لمبا ہے، وزیر ڈیڑھ فٹ کا، سفید پوش حضرات نصف فٹ کے اور عوام ڈیڑھ دو انچ کے ہیں۔ غالباً اس کا یہ فائدہ تھا کہ گروپ کے نیچے لوگوں کے عہدے لکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہوگی۔

میوزیم میں بے شمار پٹیوں میں لپٹی ہوئی ممیاں ہیں۔ سونے کے تابوت ہیں۔ بڑے بڑے بت، بیش قیمت زیورات اور پرانا لٹریچر بھی ہے جو پرندوں، جانوروں اور دیگر چیزوں کی چھوٹی چھوٹی تصویروں کے قدیم رسم الخط میں مرقوم ہے۔

بابائے تاریخ ہیرو ڈوٹس نے اپنی مشہور کتاب میں ممی بنانے کے چند آسان اور زود فہم طریقے بیان کیے تھے۔ اس انداز میں کہ انھیں پڑھ کر بچہ بھی ممی بنا سکے گا لیکن یہ کام کافی مشکل ہوتا

ہو گا۔

کتاب میں ممیوں کی قسمیں بھی درج ہیں ---- یعنی ممتاز شخصیتوں کی، بورژوا طبقے کی اور پرولتاریوں کی ممیاں۔ جتنی لاگت آتی اتنے ہی ذوق و شوق سے ممی تیار کی جاتی اور اسی کے مطابق گارنٹی دی جاتی تھی۔ غالباً مہنگی ممی کے ساتھ سرٹیفیکٹ ملتا ہو گا کہ شرطیہ دو ہزار سال تک چلے گی ورنہ دام واپس۔ ساتھ ہی زیادہ داموں کے عوض تابوت پر مرحوم کی نہایت دیدہ زیب رنگین شبیہہ بنائی جاتی تھی۔ اوسط درجے کے تابوت پر اصلی شکل ہوتی تھی اور سستے تابوت پر یا تو کچھ بھی نہیں ہوتا تھا، یا جلدی سے کارٹون سا بنا دیتے تھے۔

اس زمانے میں مصریوں کی پختہ عادت بن چکی تھی کہ جب انسان نہ ملتے تو جانوروں کو پکڑ پکڑ کر ممیاں بنا ڈالتے۔ چناں چہ میوزیم میں بلیوں، کتوں، مگرمچھوں اور پرندوں کی بھی ممیاں ہیں ---- یہ سراسر زیادتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جانور وغیرہ دیوتا تھے۔ ہر فرعون کے ساتھ دیوتا بھی بدلتے رہتے تھے۔ اگر ایک نے سانپ اور گیدڑ چنے ہیں، تو دوسرا طوطے اور لومڑی کو نامزد کرتا اور تیسرے کے عہد میں مگرمچھ اور بھیڑیے کی پرستش ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ ایک ایک کرکے سارے جانور اور پرندے ختم ہو گئے۔ غالباً تب انھیں خدا کی موجودگی کا خیال آیا ہو گا۔

اگر کوئی غیر ملکی مصر میں انتقال کر جاتا تو آس پاس کے حضرات چندہ جمع کر کے اس کی ممی بنوا دیتے کہ کہیں یہ پردیسی اس اعزاز سے محروم نہ رہ جائے ---- تبھی ان دنوں مصر میں سیاح بہت کم جاتے ہوں گے۔ ممی بناتے وقت دماغ، دل، جگر وغیرہ نکال دیے جاتے تھے۔ شاید قدیم مصریوں کا خیال تھا کہ اگلی زندگی میں اعضائے رئیسہ کی ضرورت نہیں ہو گی۔

ممی کو دفن کرتے وقت سونا، چاندی، فرنیچر، زیورات، سب ضروریاتِ زندگی کے ساتھ رکھی جاتیں تاکہ آئندہ فوراً کام آسکیں۔ ادھر چور منتظر رہتے کہ ان چیزوں کو اسی زندگی میں استعمال کیا جائے۔ لہٰذا ملک دو فریقوں میں بٹا ہوا تھا ---- ایک فریق ممی بنانے میں مصروف رہتا دوسرا ممی چرانے میں۔

فرعون بادشاہ بھی ہوتا تھا اور مذہبی پیشوا بھی۔ اس لیے کہ مذہب کے نام پر لوگ سب کچھ مان لیتے ہیں۔

فرعونوں کو روایات کا خیال رہتا تھا۔ اسی سلسلے میں انھیں عنانِ حکومت سنبھالتے ہی کئی کئی رشتہ دار لڑکیوں اور خواتین سے شادی کرنی پڑتی تھی، تاکہ زندگی میں تخت کے دعوے داروں سے واسطہ نہ پڑے۔ بارہا یوں ہوا کہ کنبے میں جتنی بن بیاہی عورتیں تھیں بادشاہ بنتے ہی ان سب سے خواہ مخواہ شادی ہو گئی ---- تبھی فرعون اپنا زیادہ وقت شکار کھیلنے اور اہرام بنانے میں صرف کرتے تھے۔

شادیاں کر کے اور اپنا مقبرہ تیار کرا کے کبھی کبھی فرعون دوسرے ملکوں کی جانب

متوجہ ہوتا (یعنی ان پر حملہ کرتا)۔ ططمس سوئم نے ایشیا پر سترہ حملے کیے، تاکہ انواع و اقسام کی قوموں کے زیادہ سے زیادہ لوگ مار کر بین الاقوامی شہرت حاصل کر سکے۔ دیکھا جائے تو اس کا یہ نظریہ بالکل ماڈرن تھا۔ (چند سال ہوئے ممیوں کا ایکسرے اور دیگر ٹسٹ کیے گئے تو معلوم ہوا کہ فرعونوں کو سرطان، تپ دق، بلہارزیا اور کئی ماڈرن بیماریاں بھی تھیں)۔

۱۵۰۰ قبل از مسیح تک تو اہرام بنتے اور لٹتے رہے۔ پھر ایک مرد عاقل ططمس اول نے (وہ اول تب کہلایا جب ططمس دوئم نے تخت سنبھالا) اپنے لیے نیا راستہ چنا۔ اس نے سوچا کہ لاکھوں فلاحین سے مقبرہ بنوا کر یہ توقع رکھنا کہ ممی اور خزانے کا راز محفوظ رہے گا، سراسر بے وقوفی ہے۔ اس نے Thebes کے غیر آباد پہاڑوں میں خفیہ طور پر غار کھدوا کر مقبرہ تیار کروایا اور اس طرح "بادشاہوں کی وادی" کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد تقریباً پچاس فرعونوں نے اس دور اندیش کے نقش قدم پر چلنے میں بہتری سمجھی اور اپنے آپ کو اسی وادی کے غاروں میں دفن کروایا۔

ططمس اول کی تھیوری یہ تھی کہ اہرام تو چوروں کو میلوں سے نظر آجاتے ہیں۔ غاروں میں دفن ہونے کا یہ فائدہ ہے کہ چوروں کو کم از کم ڈھونڈنا تو پڑے گا لیکن چوروں کو تب تک پریکٹس ہو چکی تھی۔ انھوں نے سوائے طوطن خامن کے باقی تقریباً سارے فرعونوں کے مقبرے ڈھونڈ نکالے (جو چند بچ گئے تھے ان مقبروں کو تہس نہس کرنے کا سہرا آثار قدیمہ کے ماہرین کے سر رہا)۔

جب تک ملک کی حالت اچھی رہی فرعونوں کے لیے نہایت بڑھیا اور کشادہ زمین دوز مدفن تیار ہوتے رہے لیکن جب فینانس والوں نے معذوری ظاہر کی تو ایک ایک مقبرے میں آٹھ آٹھ نو نو فرعونوں کو دفن ہونا پڑا۔۔۔۔ ہر چیز کی حد ہوا کرتی ہے۔

بالائی نیل کے کنارے مشہور فرعونوں کے نہایت اونچے اونچے مجسمے ہیں جن پر یونانی اور رومن سپاہیوں نے اپنے نام کھرچ رکھے ہیں اور وہ فقرے بھی لکھے ہیں جو تاریخی عمارتوں پر اکثر نظر آیا کرتے ہیں۔ مثلاً۔۔۔۔ "ہم تینوں دوست آج یہاں آئے تھے۔۔۔۔

ملتوس۔

لیو۔

اینڈریک۔"

"جسٹینیا جان، زندہ باد!"

"سکندریہ کی ناچنے والیوں کو مارکس بہت یاد کرتا ہے۔"

"میں یہاں ہوں لیکن دل ایتھنز والی جینا کی مٹھی میں ہے۔"

"پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔" وغیرہ وغیرہ۔

میوزیم میں طوطن خامن کے مقبرے سے نکلی ہوئی بیش قیمت اشیار کھی ہیں۔ یہ فرعون اپنے دور میں مشہور نہیں تھا اور جوانی ہی میں اس کا انتقال ہو گیا لیکن اب اسے سب جانتے ہیں کیوں کہ فقط اسی کا مقبرہ ٹھیک حالت میں مل سکا۔

سونے کا نہایت وزنی تابوت، سنہرا رتھ، کرسیاں، صندوق، میزیں، سب سونے کے۔ اتنا سونا کہیں اور نہیں دیکھا۔

کارٹر نے اس کا مقبرہ محض اتفاقاً دریافت کیا۔

"بادشاہوں کی وادی" میں ایک جگہ جھونپڑیوں کے قدیم آثار ملے۔ اس نے سوچا کہ ممکن ہو سکتا ہے کہ یہاں وہ مزدور رہے ہوں جنھوں نے شاہی مقبرہ تعمیر کیا ہو چناں چہ کھدائی شروع کرائی۔ ایک دروازہ ملا، پھر زینے کی سیڑھیاں۔ وہ آخری دروازے تک پہنچا۔ جب اسے کھولا تو فرش پر سوکھا ہوا الوداعی ہار پڑا تھا جسے فرعون کے عزیز و اقارب چھوڑ گئے تھے۔ کونے میں بجھا ہوا چراغ رکھا تھا۔ جس کی کونے کی دیوار کا ایک حصہ سیاہ کر دیا تھا۔ اس کالک پر ان انگلیوں کے نشان بالکل واضح تھے جنھوں نے دروازہ بند کرتے وقت چراغ بجھادیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے چراغ ابھی ابھی گل کیا گیا ہے۔

دروازے کے کھلنے پر اس قدر طویل مدت کے بعد روشنی کی کرنیں اس ظلمت کدے میں داخل ہوئیں۔

کارٹر اور اس کے رفقا اس ہوا میں سانس لے رہے تھے جو ہزاروں برس سے مقبرے میں بند رہی۔ جس ہوا میں فرعون کو دفن کرنے والے سانس لے چکے تھے۔

اور کارٹر کو یوں محسوس ہوا کہ اتنے گہرے استغراق میں مخل ہو کر اس نے بڑی گستاخی کی ہے۔

"یہ دیکھو کیا لکھا ہے؟" میرا دوست چونک کر بولا۔

میوزیم کی دیوار پر قدیم مصری رسم الخط میں لکھی ہوئی عبارت کا ترجمہ کچھ یوں تھا۔

"کبھی مے خانے میں جا کر مت پیو۔ اگر وہاں پی تو تم سا بے وقوف کوئی نہ ہو گا۔ خوب الٹی سیدھی ہانکو گے اور تمھیں پتہ تک نہ ہو گا کہ کیا بک رہے ہو۔ دوسرے سنیں گے تو مذاق اڑائیں گے اور اگلے روز جگہ جگہ ان باتوں کا چرچا ہو گا۔ جب دھت ہو کر کسی سے لڑو گے تو ناحق پٹو گے۔ اگر مدہوشی کے عالم میں گر پڑے تو ایک آدھ ہڈی تڑوا بیٹھو گے اور دوسرے تمھیں اٹھا کر گھر بھی نہیں پہنچا سکیں گے کیوں کہ وہ بھی تمھاری طرح آؤٹ ہوں گے۔"

"دیکھا؟ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے دو اڑھائی ہزار سال پہلے بھی لوگ جانتے تھے کہ شراب خوری بری ہوتی ہے۔" ثانیہ نے خوش ہو کر کہا۔

"اس نصیحت سے صرف ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ شراب پینی ہو تو تنہائی میں پیو۔ مے خانے

کے قریب نہ پھٹکو۔ ویسے بھی مے خانے میں دوسروں کی خاطر بھی کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا انسان مالی طور پر بھی خسارے میں رہتا ہے۔" میرے دوست نے جواب دیا۔

ایک طرف بڑے بڑے خم رکھے تھے جنھیں پرانے مصری غم غلط کرنے کے سلسلے میں استعمال کر چکے تھے۔

"یہ تو بہت بڑے ہیں۔" میں نے اپنے دوست سے کہا۔ "یا تو وہ آدمی بڑے سخت تھے اور یا بادہ ہلکا ہوتا ہوگا۔ ورنہ ایسے خم میں آج کل کی شرابیں ڈالی جائیں تو ایک ہی پیگ سے پہلوان بھی آؤٹ ہو سکتا ہے۔"

"وہ بھی آؤٹ ہو جاتے ہوں گے۔ زمانہ بدل گیا ہے لیکن انسان نہیں بدلا۔ ذرا اسے پڑھو ---- یہ نظم کئی ہزار سال پرانی ہے" میرے دوست نے ایک ترجمے کی طرف اشارہ کیا۔

ان اشعار میں پانچ ہزار سال پہلے کا کوئی مصری اپنے آپ سے مخاطب تھا ----

آخر میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟
سارے عزیز و اقارب لفنگے نکلے
دوستوں کے دل محبت سے بالکل خالی ہیں
کس سے کہوں؟ کیسے کہوں؟
جو شریف تھے وہ تباہ ہو چکے ہیں
رذیل پھل پھول رہے ہیں
کیسا زمانہ آگیا ہے؟
کوئی بھی غلطیوں سے سبق نہیں سیکھتا
برے بھلے کی تمیز نہیں رہی
بغیر مطلب کے کوئی کسی سے بھلائی نہیں کرتا
آخر کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟

"اگر یہ نظم اپنے نام سے آج کسی رسالے میں چھپوا دوں تو پبلک سمجھے گی کہ میں نے زمانہ حاضرہ کا صحیح جائزہ لیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ نہ انسان بدلا ہے نہ اس کی حرکتیں اور اس کی فطرت!" میرے دوست نے ایک اور عبارت دکھائی جو کسی قدیم مصری کہاوت کا ترجمہ تھی۔

"ہماری کامیابیوں کی وجہ دیوتا ہوتے ہیں
ناکامیوں کی وجہ ہم خود ہیں۔"

واقعی یہ سب کچھ چار پانچ ہزار سال پرانا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔

ان دنوں بھی لوگوں کو پیروں فقیروں سے یہی خوش فہمی رہتی ہے کہ اتفاق سے کچھ ہو جائے تو پیر صاحب کی کرامات ہے اور اگر نہ ہو تو اپنی بدنصیبی تھی۔

ایک کمرے میں تصویروں سے دکھایا ہوا تھا کہ غیر ملکی لوگ جنگ میں ہاتھی استعمال کرتے تھے اور مصریوں کے پاس اس سائز کا کوئی جانور نہیں تھا لہٰذا رعمسیس دوئم کو بہت غصہ آیا۔ جب شام پر حملہ کرنے گیا تو اپنا پرائیویٹ شیر ساتھ لے گیا ادھر شامیوں کے پاس شیر نہیں تھا۔ شامی فوج کے سپاہی پہلی مرتبہ شیر کو دیکھ کر اتنے ڈرے کہ فرعون کو نرغے میں لے کر بھی کوئی دشمن سپاہی اس کے قریب نہ آسکا۔ رعمسیس کی فتح دراصل اس کے شیر کی فتح تھی۔

اگلے ہال میں ملکہ خطشپ سط کے کارناموں کا ذکر تھا۔ جب یہ خاتون بہ طور فرعونہ تخت پر بیٹھی تو اس نے ملکہ کی طرح حکومت کرنی چاہی لیکن لوگوں نے اس کا بالکل نوٹس نہیں لیا کیوں کہ پہلی مرتبہ کسی خاتون نے تاج پہنا تھا۔

ملکہ نے پہلے تو ضبط سے کام لیا۔ پھر تنگ آکر ایک دن مصنوعی داڑھی لگالی اور اعلان کردیا کہ یوں ہے تو یوں ہی سہی۔ اگر یہ مردوں کی دنیا ہے تو آج سے مجھے بھی مرد تصور کیا جائے اور فرعون کہہ کر مخاطب کیا جائے۔

رعایا اس قدر مرعوب ہوئی کہ جب تک ملکہ نے داڑھی لگائی سب فرماں بردار رہے (رعایا مصنوعی داڑھی کی اس قدر عادی ہو چکی تھی کہ اگر کہیں فرعونوں نے اصلی داڑھی رکھی ہوتی تو ملکہ کو حکومت کرنی مشکل ہو جاتی)۔

ایک جگہ آداب ضیافت کا ذکر تھا۔ سب سے پہلے مہمانوں کو غسل کرایا جاتا تھا۔ لیکن پانی کی جگہ تیل استعمال کیا جاتا تھا یعنی (پہلوانوں کی طرح) سارے جسم کی مالش کی جاتی تھی۔ اس کے بعد چکنے چپڑے مہمانوں کو لکڑی کی چھوٹی سی ممی دکھائی جاتی تھی اور مشورہ دیا جاتا تھا کہ ابھی وقت ہے کھاپی لو، ورنہ ایک دن یہ حالت ہوگی۔ شدید مالش کروانے اور ممی دیکھنے کے بعد جتنی بھوک رہ جاتی ہوگی اس کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔

اہرام کی عظمت کا اندازہ زمین سے لگانا مشکل ہے۔

خوفو کے ہرم کی چوٹی پر چڑھ کر نیچے دیکھا تو یوں لگا جیسے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہوں۔ چوٹی کی نوک اب بالکل سپاٹ ہے اور اتنی جگہ ہے کہ آسانی سے بیڈمنٹن کھیل سکتے ہیں۔

اوپر تک کی چڑھائی کافی کٹھن ہے۔ کھانے کی میز جتنے بڑے پتھروں کی ایک سو چھتیس یا سینتیس سیڑھیاں طے کرنی پڑتی ہیں۔

میں نے دوربین سے نیل کو دیکھا۔۔۔۔ ریت کے وسیع سمندر میں افق کے اس کنارے سے اس کنارے تک ایک سبز لکیر کھنچی ہوئی تھی۔

ایک طرف ممفس اور سقرہ کے اہرام ہیں۔ پھر فسطاط نظر آتا ہے جہاں فاتح مصر عمرو بن العاص کی مسجد ہے۔ بائیں کو ہٹ کر قاہرہ شروع ہو جاتا ہے۔ ایک اونچے ٹیلے پر سلطان صلاح

الدین ایوبی کا قلعہ ہے اور محمد علی مسجد (جو ۱۸۵۷ء میں مکمل ہوئی۔ ہمارے طلبہ کو کم از کم یہ سنہ ہمیشہ یاد رہتا ہے) وہیں چاہِ یوسف بھی ہے جہاں ایک روایت کے مطابق حضرت یوسف کو قید کیا گیا تھا۔ قریب ہی زلیخا کے روایتی محل کے نشانات ہیں۔ پرانے شہر میں بے شمار تاریخی مسجدیں ہیں جنھیں جامعہ کہا جاتا ہے ---- سادہ اور پرشکوہ جامعہ ابن طولون ہزار سال پرانی مسجد ہے اور جامعہ ازہر ہزار برس پرانی یونیورسٹی۔ ایک طرف مملوک حکمرانوں کے مقبروں کے پیاز نما گنبد نظر آتے ہیں۔ ان حضرات نے جب محسوس کیا کہ خالی مقبروں پر لوگ کبھی کبھار ہی آتے ہیں تو انھوں نے ہر مقبرے کے ساتھ مسجد بھی تعمیر کرنی شروع کر دی تاکہ لوگوں کی آمد و رفت جاری رہے۔ آگے الجزیرہ کا خوش نما علاقہ ہے۔ جزیرے عموماً سمندر میں ہوا کرتے ہیں لیکن الجزیرہ نیل میں ہے یا یوں کہیے کہ اس کے دونوں طرف دریا کی شاخیں بہتی ہیں۔

پھر نیا شہر آتا ہے جس میں مجسمے ہیں، چوک ہیں اور ڈربوں جیسے بے شمار فلیٹ۔ دن میں شہر اور دریا دونوں مٹیالے سے نظر آتے ہیں۔ جیسے ہلکی ہلکی گرد میں اٹے ہوئے ہوں لیکن رات کی ظلمت اور بجلی کی روشنیاں قاہرہ اور نیل کو بے حد خوش نما بنا دیتی ہیں۔

نیچے ابوالہول اتنا ذرا سا دکھائی دیتا ہے کہ دفتروں میں کام کرنے والے معنک حضرات کو شاید ہی نظر آئے۔ ابوالہول کے قریب میرا دوست دوربین سے شاید مجھے اوپر ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ثانیہ کھڑی کتاب پڑھ رہی تھی۔

گائیڈ جو مجھے کھینچ کھینچ کر اوپر لایا تھا بڑی بے صبری سے بار بار گھڑی دیکھتا۔ وہ مجھے فوراً نیچے پہنچا کر نئی سواریاں اوپر لانا چاہتا تھا۔

پہلے تو وہ الصبر! کہنے پر مان گیا لیکن پھر اس کی حالت ناگفتہ بہ ہوتی گئی۔ آخر ہم اترنے لگے۔ ہرم کی چوٹی سے نیچے اترنا ایسا ہے جیسے تقریباً ڈیڑھ سو دیواروں سے کودنا۔

میں ماتھے سے پسینہ پونچھ رہا تھا کہ ثانیہ نے ہرم کے اندر جانے کی تجویز پیش کی۔ میرے دوست نے احتجاج کیا لیکن وہ نہ مانی۔

ذرا سی دیر میں، ہم نہایت تنگ اور تاریک سرنگ میں کمر دوہری کیے پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد ایک ٹمٹماتی روشنی آتی یا کوئی لڑکھڑاتا ہوا آدمی ملتا جو واپس آ رہا ہوتا اور ہماری آہٹ سنتے ہی زور سے کھانستا کہ کہیں ٹکر نہ ہو جائے۔

سستانا یا سیدھا ہونا بالکل ناممکن تھا کیوں کہ سر تقریباً گھٹنوں کو چھو رہا تھا۔ کافی دیر کی چڑھائی کے بعد یہ مژدۂ جاں فزا ملا کہ مدفن قریب ہی ہے۔

ایک آخری ہلے میں یہ مہم بھی سر ہو گئی۔

ہم سیاہ پتھروں کے ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچے جہاں ایک طرف پتھر کا ٹب سا بنا ہوا تھا۔ بالکل یہیں کبھی فرعون کا تابوت رکھا گیا تھا۔

باقاعدہ کر سیدھی ہونے میں تقریباً پندرہ منٹ لگے۔ اوپر نیچے دائیں بائیں بڑے بڑے وزنی پتھر تھے۔ اندر آنے اور باہر نکلنے کا فقط ایک تنگ اور دشوار گزار راستہ تھا۔

دفعتہً کھڑبڑ ہوئی اور دس بارہ سیاح اندر آگئے۔ کمرے میں ایک دم کافی بھیڑ ہو گئی۔ اگر کچھ اور لوگ اس وقت اندر آنا چاہتے تو انھیں اندر آنے میں اور اندر والوں کو باہر نکلنے میں بڑی دقت ہوتی۔

"اگر بجلی فیل ہو جائے تو کیا ہوگا؟" میرے دوست نے پوچھا اور ثانیہ گھبرا گئی۔

"اس وقت ہم تئیس لاکھ پتھروں کے بیچ میں پھنسے ہوئے ہیں۔" میں نے اسے خوش خبری سنائی۔

"مجھے کچھ ڈر سالگ رہا ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"اور ہر پتھر اڑھائی ٹن کا ہے۔" میں نے یاد دلایا۔

"للّٰہ ایسی باتیں مت کیجیے۔"

"لیکن اگر کوئی پتھر دفعتہً آگرے یا لڑھک کر راستہ روک دے۔ پھر؟"

"بھئی لڑکی کو ڈراؤ مت۔ دراصل میں بھی گھبرایا ہوا ہوں۔ تمھیں کچھ نہیں ہو رہا؟" میرے دوست نے پوچھا۔

"اس وقت کچھ نہیں ہو رہا کیوں کہ میں پہلے ڈر چکا ہوں۔"

"کب؟ کہاں"

"جب Dissertation کے سلسلے میں اسکاٹ لینڈ میں کوئلے کی کانوں میں جانا پڑتا تھا اس وقت۔ لیکن تب ہم سطح سمندر سے نیچے ہوا کرتے تھے، اس وقت اوپر ہیں۔"

بڑی مشکلوں سے باہر نکلے، کیوں کہ راستے میں کافی ٹریفک تھا۔ سرنگ میں بار بار کھانسنے اور گلا صاف کرنے کی آوازیں آتی تھیں۔

ذرا سی دیر میں ہم مینا ہاؤس ہوٹل کے ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں بیٹھے پسینہ سکھا رہے تھے۔ ہمارے ساتھ دو یورپین نما مصری بھی تھے جو میرے دوست کے دوست تھے۔ وہ فرفر عربی بول رہے تھے اور غٹ غٹ پی رہے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ دو گیلن پی کر وہ اٹھے اور ایک خوش نما رومال میرے دوست کو دے کر چلے گئے۔

میں نے اس معطر رنگین رومال کے بارے میں پوچھا۔

"یہ تبرک ہے۔ میرے یہ دونوں دوست الحاگ (یعنی الحاج) ہیں۔ تھوڑا عرصہ ہوا بذریعہ ایئر میل Air Mail واپس آئے ہیں۔" (میرے دوست کی انگریزی کمزور ہے۔ مثلاً کیفے میں فرمائش کرتے وقت Strong Coffee کو وہ عربی میں مضبوط کافی کہا کرتا ہے)

"تعارف کراتے وقت تو تم نے ان کے حاجی ہونے کا ذکر نہیں کیا۔"

"تو کیا اس کا بھی ذکر ہوا کرتا ہے؟" اس نے بڑے تعجب سے پوچھا۔
میں نے جواب نہیں دیا کیوں کہ مجھے وہ قوال یاد آرہے تھے جو لہک لہک کر گایا کرتے ہیں۔

حج پر چلے ہو
ضرور کوئی بات ہے۔

واپسی پر ثانیہ نے بتایا کہ وہ وادی نیل پر تھیسس لکھ رہی ہے۔
"کافی مشکل کام ہے، اب تو اور مشکل ہو گیا ہے۔ تاریخ پر جو مواد میں نے اتنے عرصے میں اکٹھا کیا تھا، جو نظریے اتنی محنت اور مطالعے کے بعد قائم کیے تھے وہ آپ دونوں نے بالکل درہم برہم کر دیے ہیں۔ انھیں دوبارہ ترتیب دینے اور سب کچھ درست کرنے میں کم از کم دو مہینے لگیں گے۔" اس نے شکایت کی۔
"صرف دو ہی مہینے لگیں گے؟"
"شاید تین چار لگ جائیں۔" وہ بولی۔
"اچھا یہ بتاؤ کہ تم مصر کی ثانیہ ہو یا بحیرۂ روم کی سونیا؟" میں نے پوچھا۔
"دونوں۔" میرا دوست ہنسا۔ "یہی مصیبت ہے۔"

ہوٹل میں تار ملا۔ سکندریہ سے مام نے بھیجا تھا۔۔۔۔ "کل شام کو پہنچ رہا ہوں۔"
مام سکاٹ لینڈ کا تھا اور ہوائی جہازوں کی کسی کمپنی میں ملازم تھا۔ ہماری دوستی محفلوں، کلبوں یا ہوٹلوں کی دوستی نہیں تھی جو تعارف اور پرتکلف آداب کی محتاج ہوتی ہے اور جسے برقرار رکھنے کے لیے بار بار ملنا اور لگاتار خط و کتابت ضروری ہے۔ یہ سپاہیوں کی دوستی تھی ۔۔۔۔ خندقوں، بمباریوں، صحراؤں اور خیموں کی دوستی ۔۔۔۔ جہاں خوف بھی برابر بنتا ہے اور فکر بھی۔ اس کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں۔ کتنے ہی سال گزر جائیں لیکن دوبارہ ملتے ہی وہ پرانا احساسِ رفاقت عود کر آتا ہے۔
پہلے سے موٹا اور قدرے گنجا مام چلایا ۔۔۔۔ "او مشرق کے چار بیویوں والے غریب نواب!"
او سکاٹ لینڈ کے ان پڑھ، کنجوس ۔۔۔۔ کیا حال ہے تیرا؟"
ہم نیل کے کنارے اسی کیفے میں بیٹھے تھے جہاں کبھی بہت سی شامیں اکٹھے گزاری تھیں۔
بالکنی کا وہ مخصوص کونا، وہی میز، تین کرسیاں، بہتے ہوئے دریا کا دل کش نظارہ اور دوسرے کنارے پر کھجور کے پانچ درخت ۔۔۔۔
ملازم تیسری کرسی ہٹانے لگا تو مام نے منع کر دیا ۔۔۔۔ "اسے یہیں رہنے دو۔ یہ اولمپیا کی

کرسی ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟ کبھی ملی؟" میں نے پوچھا۔

"میری طرح اس کی بھی شادی ہو چکی ہے۔ ایک دفعہ بیروت میں دور سے دیکھا تھا۔"

ہم ان ہی پرانی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ مام نے دریا کی طرف پشت کر رکھی تھی ----

"یاد ہے؟ وہ اصرار کیا کرتی کہ میں اس کرسی پر بیٹھوں تاکہ دریا کو نہ دیکھ سکوں۔ کہا کرتی" تم بس میری طرف دیکھتے رہو۔"

"مردوں کی طرح باتیں کرو۔ یہ کیا زنانے قصے لے بیٹھے ہو۔"

"یاد ہے یہ نشان ---- جب حملے میں مجھے گولی لگی۔ تمہارے علاج کے باوجود اب تک زندہ ہوں۔"

"میں نے کوشش تو بہت کی تھی لیکن سکاٹ لینڈ والے بڑے سخت جان ہوتے ہیں۔ ہمیشہ بچ جاتے ہیں۔"

"سچ ہے کہ شیپرڈ ہوٹل جل چکا ہے۔ اب وہاں خالی میدان پڑا ہے۔ وہ دن بھی کیسے تھے جب ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ جب ہمیں کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ ہمیشہ مفلس رہا کرتے۔ تنخواہ پہلے ہفتے میں ختم ہو جاتی پھر نابی سے قرض لینا پڑتا۔" نابی مام کا ہم وطن تھا اور اس کی کفایت شعاری بلکہ کنجوسی مشہور تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ جو چیز نابی لے لیتا واپس نہیں کرتا تھا۔

وہ اپنی منگیتر کو انگوٹھی پہنا کر محاذ پر آیا تھا۔ جنگ کے چند سال بعد اڈنبرا میں اس سے ملاقات ہوئی تو میں حیران رہ گیا کہ اتنے دبلے پتلے نابی کی بیوی بے حد موٹی تھی۔ شاید وہ بھانپ گیا اور اس نے علاحدگی میں مجھے بتایا کہ جب تک یہ منگیتر رہی بالکل چھریری تھی۔ پھر شادی قریب آئی تو یک لخت موٹی ہو گئی۔ میں نے اسے چھیڑا کہ شادی سے پہلے اس نے جتن تو کیے ہوں گے کہ اس قدر پلی ہوئی لڑکی سے منگنی ٹوٹ جائے لیکن وہ اتنی موٹی تازی انگلی میں پھنسی ہوئی انگوٹھی نہ اتار سکا ہوگا۔ آخر سکاٹ مین تھا اور اس انگوٹھی پر پورے دس پونڈ خرچ کر چکا تھا۔ لہٰذا ---- زرِ خورم ---- کے سلسلے میں مجبوراً شادی کرنی پڑی ہوگی۔ قاہرہ کے ٹیکسی ڈرائیوروں کے متعلق مشہور تھا کہ اہرام کی سیر کی ترغیب دیتے وقت اکثر کہا کرتے ---- " اہرام چلیے۔ چار میل فاصلہ ہے لیکن فوجیوں سے خاص رعایت، ان کے لیے صرف تین میل!" نابی کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ سنتے ہی ذرا سی رقم بچانے کے سلسلے میں اہرام جانے کے واسطے فوراً تیار ہو جاتا۔

"نابی اور میں پیرس میں اکٹھے تھے۔" مام نے بتایا۔ "فرانس میں کچھ عرصہ رہ کر میں نے یہاں تبادلہ کرا لیا۔ شاید یہ نیل کا فسوں ہے جو بار بار کھینچ لاتا ہے۔ کوئی اور جگہ اتنی پر کشش نہیں معلوم ہوتی۔ غالباً میں پہلے سے کافی بدل گیا ہوں۔"

"لیکن یہ تغیر قدرتی ہے۔ ہم سب بدل رہے ہیں۔ ہر گزرا ہوا دن، ہر نیا تجربہ، ہر وہ انسان جو زندگی کی شاہ راہ پر ہمیں ملتا ہے، ہم پر اثر ڈالتا ہے اور پھر تم تو ہو بھی ایسی جگہ جہاں طرح طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہوگا۔"

"لیکن اب مجھے لوگوں سے نفرت ہو گئی ہے۔ جب ہوائی جہاز آتا ہے تو اس میں سے نہایت ہونق بے ہنگم ہجوم اترتا ہے ---- خود غرض، جلد باز، خود پرست لوگ۔ ہر ایک اپنے آپ کو سب سے اہم سمجھتا ہے۔ شرارتی بد تمیز بچے، بنی ٹھنی ادھیڑ عمر کی عورتیں، بے حد دبلے یا پھر ضرورت سے زیادہ موٹے تازے ہانپتے ہوئے مرد۔ انھیں یا تو کہیں پہنچنے کی سخت جلدی ہے اور یا مسرت کی تلاش ہے۔ کون سی مسرت؟ یہ نہیں جانتے۔ بس کم سے کم عرصے میں زیادہ سے زیادہ انبساط کے متلاشی ہیں۔ شور، بد کلامی، طنزیہ گفتگو۔ چلاتے، غل مچاتے ہجوم۔ جہاں دیکھو وہاں لوگ موجود ہیں۔ پہلے شکاریوں کو جانوروں کی تلاش میں دور دور جانا پڑتا تھا، لیکن اب جہاں جاؤ انسان ملیں گے۔ دنیا کی آبادی کس تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ وہ دن دور نہیں جب کرۂ ارض پر کھڑے ہونے تک کو جگہ نہیں ہوگی اور نہ اناج کا ایک دانہ ہوگا۔"

"تمھیں کسی خاص قوم یا طبقے سے نفرت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ مجھے سب سے نفرت ہے۔ نابی، تم اور چند دوستوں کے سوا۔۔۔"

"تو گویا تمھیں کسی سے بھی نفرت نہیں ہے۔ تم تو نہایت مرنجاں مرنج لڑکے تھے اور مہاتما بدھ کی تعلیم تمھیں خاص طور پر پسند تھی۔"

"وہ سب غلط نکلا۔ اگر کسی کو بنی نوعِ انسان کی باہمی محبت یا نیکیوں کے متعلق ذرا سی غلط فہمی ہو جائے تو اسے چاہیے کہ بسوں، ٹرینوں میں اترتے چڑھتے ہجوم کو غور سے دیکھے۔ جہاں اتنا سا بھی مقابلہ ہو انسانیت رخصت ہو جاتی ہے۔ اب تو مجھے انسانوں سے زیادہ حیوانوں کی پرواہ ہے جو کم از کم خاموش تو رہتے ہیں۔"

"تم نے اب تک پالتو جانور دیکھے ہیں یا چڑیا گھر کے حیوان۔ جنگل کے درندوں سے واسطہ نہیں پڑا۔ نہ میں ماہرِ نفسیات ہوں، نہ بنی نوعِ انسان کا عاشق لیکن سنتے یہی ہیں کہ جس چیز سے جتنی شدید نفرت ہو اس سے اتنی ہی محبت بھی ہو سکتی ہے۔ کچھ اچھا نہ لگے تو اسے نظر انداز کیا کراتے ہیں، بے رخی برتتے ہیں مگر شدید نفرت بالکل بے سود ہے۔ شاید تم کسی دن بڑے انسان دوست بن جاؤ۔ میاں خوش رہا کرو! خواہ مخواہ نفرت کرنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے خود اپنی بھوک اور نیند تباہ ہوتی ہے، بلڈ پریشر بھی بڑھتا ہے ---- لہٰذا عمر کم ہوتی ہے اور جس سے نفرت کی جائے اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اس کے سر میں اتنا سا درد تک نہیں ہوتا۔ جنگ کے دنوں میں ویرانوں کے وہ کیمپ یاد ہیں؟ جہاں کئی کئی ہفتے مکمل تنہائی میں گزرتے جہاں نہ دوست نظر آتا تھا نہ دشمن۔ کئی کئی دنوں کے بعد کوئی بدو دور سے گزرتا تو کتنی

خوشی ہوا کرتی؟ ایک دوسرے کو بلا بلا کر دکھاتے کہ وہ آدمی جا رہا ہے اور تم ہی تو کہا کرتے تھے کہ ایک دفعہ جنگ ختم ہو لے پھر ہمیشہ خوش رہا کریں گے ـ ـ ـ ـ"

"ہاں یاد ہے ـ"

"تم تو خوش نصیب ہو ـ تمھارے پاس سب کچھ ہے ـ دنیا میں کروڑوں انسان ایسے ہیں جو بے مقدور ہیں ـ یہاں تک کہ نفرت کی توفیق بھی نہیں رکھتے ـ"

"مجھے پتہ ہے ـ"

"ہمارے ملک کی ایک حسینہ بھی اسی دور سے گزری تھی ـ اس کی شادی غلط شخص سے ہو گئی تھی ـ ـ ـ ـ"

"میں نے مرزا صاحباں کے چند اشعار کا ترجمہ سنایا ـ ـ ـ ـ

پیر کی درگاہ پر حسینہ یوں ملتمس ہوئی:

میں قربانی چڑھاؤں اگر میرے خاوند کا انتقال ہو جائے

کاش کہ چار پانچ پڑوسنیں بھی سرگباش ہوں

اور باقیوں کو بخار چڑھ جائے

بنیے کی وہ دکان بھسم ہو جہاں رات بھر چراغ جلتا ہے

فقیر کا وہ کتا مرے جو ہر وقت بھونکتا رہتا ہے

سب کے سب کہیں دفع ہو جائیں

گلیاں بالکل سنسان ہو جائیں

اور ان میں میرا محبوب چہل قدمی کیا کرے ـ

"چناں چہ تم پہلے انسان نہیں ہو جس نے یوں محسوس کیا ہو لیکن وہ تو محبت میں ناکام رہی تھی ـ تمھاری شادی تو مرضی کے مطابق ہوئی ہے ـ تمھارا محبوب دریائے نیل بھی یہیں ہے ـ موسیقی کی تانیں بھی وہی ہیں ـ جوانی بھی ہے ـ کیا نہیں رہا؟"

ٹام چپ ہو گیا ـ اس نے جیب سے ایک آویزہ نکالا جس میں بڑا سا سفید موتی دمک رہا تھا ـ میں نے اسے پہچان لیا ـ

ہمارا ایک دوست خلیج فارس کے ایک چھوٹے سے جزیرے سے واپس آیا تو اس کے پاس نہایت قیمتی موتیوں کی پوٹلی تھی ـ یہ موتی اس نے غوطہ خوروں کا چھوٹا موٹا علاج کر کے حاصل کیے تھے ـ ادھر وہ قاہرہ پہنچا ادھر جیسے شہر بھر کو موتیوں کا علم ہو گیا ـ اس کا ارادہ تھا کہ موتیوں کے عوض قیمتی کیمرہ، گھڑی، قالین وغیرہ خریدے گا لیکن عجیب عجیب لوگ اس کے پاس آتے ـ اسے پر اسرار جگہوں پر لے جاتے اور نہایت سستے داموں کے عوض موتی خریدنا چاہتے یا ڈرا دھمکا کر موتی مانگتے ـ

گلیوں میں اس کا تعاقب کیا جاتا ۔ جو ملتا علیک سلیک کے بعد پہلا سوال ہوتا جب لی اللولو ۔

کیبرے میں رقاصہ اسے ایک طرف لے جا کر کہتی ۔۔۔۔ اعطنی اللولو ۔ کبھی اسے موٹے تازے لوفر پکڑ لیتے اور نعرہ لگتا ۔۔۔۔ سلم اللولو الیہ ۔

غرض یہ کہ لولو کی وہ گردان ہوتی کہ ہم نے اس کا نام لولو رکھ دیا (عربی لولو نہیں، بہاولپوری لولو)

موتیوں کے سلسلے میں اسے دو چار مرتبہ زدو کوب بھی کیا گیا۔ یہ اہلِ قاہرہ کی سراسر زیادتی تھی۔

اس کے موتی ختم ہونے کو آئے تو ہم نے زبردستی دو اس سے چھین لیے۔ ان کے آویزے بنے اور اولمپیا کو دیے گئے۔ اچھا، تو یہ اولمپیا تھی!

"میں نے سنا تھا کہ انگریز کبھی عاشق نہیں ہوتے۔ غلطی سے اگر ہونے لگیں تو اپنے آپ سے بحث مباحثہ کر کے دلیلوں کی بنا پر سارا معاملہ منسوخ کر دیتے ہیں۔"

عامر خاموشی سے اس آویزے کو دیکھ رہا تھا۔

"تمھیں چھٹی کے وہ دن یاد ہیں جو ہم نخلستان میں گزارا کرتے۔ صحرا کے ان دیکھے راستوں اور سرسبز خطوں میں کتنی جاذبیت تھی۔ ڈھلتے سورج کی پیلی پیلی دھوپ، نور میں ڈوبی ہوئی وادیاں، دریا کے کناروں کا ملائم لہلہاتا ہوا سبزہ، چمکتا ہوا نیلا آسمان اور حسین پراسرار دنیا۔ جب ویرانے نغموں سے گونج اٹھتے۔ ایک ایک ذرے میں زندگی سانس لیتی تھی اور زندگی کہاں نہیں تھی؟ ۔۔۔۔ سورج سے لے کر زمین تک ۔۔۔۔ دریا سے صحرا تک ۔۔۔۔ اس افق سے ۔۔۔۔ اس فق تک! ہر شے میں کتنی تازگی تھی۔ کتنا نکھار تھا۔ ایسے دن پھر نہیں آئیں گے۔ وہ راتیں کبھی نہیں آئیں گی جب آسمان کے تارے چمکتے چمکتے بالکل نیچے آجاتے تھے اور وہ لڑکی کیسی تھی۔ کتنی پیاری، من موہنی، معصوم اور صابر! کسی بات کا برا نہ مانتی۔ میں لڑتا جھگڑتا، اسے ناحق برا بھلا کہتا۔ اور وہ خاموش بیٹھی مسکراتی رہتی۔ کہا کرتی کہ محبت کرنے والوں کے ایک دوسرے پر بڑے حقوق ہوتے ہیں۔ آئندہ ملاقات کا وقت طے ہونے لگتا تو ہمیشہ کہتی کہ ۔۔۔۔ اگر تم دیر سے آئے تو میں انتظار کروں گی۔ اگر نہ آسکے تو خفا نہیں ہوں گی۔ نہ کبھی اس نے گلہ کیا، نہ کبھی شکایت کا ایک لفظ اس کے ہونٹوں پر آیا۔ ان دنوں نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ بار بار یہی سوچتا کہ یہ اجنبی ہے۔ بچپن سے مصر میں رہی ہے۔ اس میں یونانی اور لاطینی خون کی آمیزش ہے۔ وطن لے جاؤں گا تو دوست مذاق اڑائیں گے۔ سوسائٹی اسے قبول نہیں کرے گی۔ میں نے ہمیشہ اسے اپنے سے کم تر سمجھا۔ اس سے اکثر جھوٹ بولا لیکن وہ میری ہر بات کا یقین کر لیتی۔ پھر اس کی توجہ اور پیار سے میں گھبرانے لگا۔ پیچھا چھڑانے کے لیے بہانے تلاش کیے کہا کہ میرا تبادلہ ہونے

والا ہے۔ پہلے ایک کورس پر جانا ہوگا پھر دمشق پہنچوں گا۔

میں نے اصرار کیا کہ وہ میری روانگی سے پہلے دمشق جاکر وہاں یونیورسٹی میں داخلہ لے لے۔ اور میں عن قریب آملوں گا۔ کوئی انگریز لڑکی ہوتی تو فوراً تاڑ جاتی لیکن وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر چلی گئی۔ جدا ہوتے وقت نہ وہ روئی نہ غم کا اظہار کیا۔ بس مستقبل کی باتیں کرتی رہی، مجھ پر مکمل اعتبار ہے ـــــ"

"مجھے یاد ہے۔ چلتے وقت اس نے تمھیں یہ آویزہ دیا تھا۔"

"اور آویزہ ہاتھ میں تھما کر کہنے لگی کہ ہمارے ہاں عقیدہ ہے کہ دو آویزے بچھڑ جائیں تو ایک نہ ایک دن ضرور آملتے ہیں۔ اسے کیا خبر تھی کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ پھر کبھی نہیں ملیں گے

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"میں وطن پہنچا۔ وہاں کئی لڑکیاں ملیں۔ ایک سے تھوڑی سی واقفیت بھی تھی۔ اس نے فوراً ان خطوط کا حوالہ دیا جو وہ مجھے لکھا کرتی تھی اور جن میں فقط سکاٹ لینڈ کے گیلے اور سرد موسم کا ذکر ہوا کرتا۔ میں اور وہ غالباً رواداری کے سلسلے میں ملنے لگے۔ دراصل جنگ کے اختتام پر لڑکے واپس گئے تو کٹے ہوئے پتنگوں کی طرح جس کے ہاتھ میں ڈور آئی اس نے دبوچ لیا۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ ہمارے ہاں شناسائی برائے نام ہی ہوتی ہے۔ نہ کسی ایک لڑکی کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ کسی واحد لڑکے کا۔ کچھ عرصہ تو میں ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ پھر اسی موسم کے خطوط لکھنے والی لڑکی سے منگنی کر لی۔ منگنی کے اگلے دن نہ جانے کہاں سے ایک پرانی ہم جماعت آنکلی۔ اس نے ضد کی کہ چھٹی کے دن باہر لے چلو۔ شہر میں کہیں جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا کہ جسے انگوٹھی پہنائی ہے کہیں وہ نہ دیکھ لے چنانچہ اسے چند میل دور سمندر کے کنارے لے گیا۔ جب ہم چٹانوں پر دھوپ سینک رہے تھے تو سامنے سے ایک جوڑا گزرا۔ لڑکی کو میں نے فوراً پہچان لیا۔ یہ میری منگیتر تھی جو اپنے کسی پرانے دوست کے ساتھ وہاں آئی ہوئی تھی۔ مجھے اس سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی، لیکن میں نے کر لی ـــــ"

مام نے کرسی کا رخ دریا کی طرف موڑ لیا اور باہر تکنے لگا۔

"جب رومن بادشاہ Hadrian نے اپنے پیارے دوست Antonius کی لاش گہرے غار میں دفن کی تو بقیہ لوگوں کو باہر بھیج کر الوداع کہنے کے لیے غار میں اکیلا رہ گیا۔ غار کی تاریکی، تنہائی اور ایک بے جان جسم کی موجودگی نے ہیڈرین پر ایسا اثر کیا کہ کچھ دیر کے بعد وہ تھر تھر کانپنے لگا اور جلدی سے باہر نکل آیا۔ جب روشنی دکھائی دی اور تازہ ہوا کا جھونکا آیا تو اس نے شکر ادا کیا کہ وہ زندہ ہے۔ یہ واقعہ مصر میں ہوا تھا اور انطی نوس نیل میں ڈوب گیا تھا۔ یہ مردہ یادیں ہیں، انھیں بھلا دو۔ ان پر زندہ رہنا بہت مشکل ہے۔"

"اگر وہ مر جاتی تو آہستہ آہستہ صبر آجاتا لیکن زندہ ہے۔ اب بھی اس کے چہرے پر

معصومیت ہے وہ دل کش مسکراہٹ، آنکھوں کا سحر، ہونٹوں کی دل آویزی ۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں بدلا ۔ بیروت میں اسے دور سے دیکھا تھا ۔"

"یہ آویزہ دریا میں پھینک دو ۔ یہ سب نیل کا جادو تھا ۔ یہیں شروع ہوا تھا یہیں ختم ہو جائے گا ۔"

"نہیں یہ آویزہ تو ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا ۔"

" تو کم از لوگوں سے نفرت تو نہ کیا کرو ۔ پہلے زمانے میں نامراد عاشق یا تو جنگلوں ویرانوں میں نکل جاتے تھے، یا آہیں بھر کے چپکے چپکے رو کر خاموش ہو جاتے تھے ۔ تم عجب دہشت پسند عاشق ہو ۔ دیکھتے نہیں یہ دل کا اندھیرا ہے ۔ ورنہ سب کچھ جوں کا توں ہے ۔ سورج اسی طرح چمکتا ہے ۔ پھول اسی طرح کھلتے ہیں ۔ لوگ جان بوجھ کر محبت کے چکر میں پڑتے ہیں ۔ اس دریا کے کنارے آج شاید تم اور میں دو انسان اداس ہیں، ورنہ سب مسکرا رہے ہیں، قہقہے لگا رہے ہیں ۔

" اگر کسی محبت کرنے والی لڑکی سے شادی ہو جاتی تو شاید پچھلی یادیں بھلا دیتا لیکن وہ مردوں کی طرح اکڑ کر چلنے والی، بات بات پر دلیلوں کی بحث کرنے والی، میری بیوی، بالکل اجنبی ہے ۔ گھر میں ہم اس طرح رہتے ہیں جیسے ہوٹل میں دو مسافر ۔ گرمیوں میں انگریز بیویوں کے غول کے غول اٹلی جاتے ہیں ۔ وہاں موٹے موٹے باتونی اطالوی لفنگے گائیڈوں کا بہروپ بھرے منتظر ملتے ہیں ۔ وہ ان عورتوں کو لیے لیے پھرتے ہیں ۔ ان کے حسن و جمال کے جھوٹے قصیدے پڑھتے ہیں ۔ انھیں گانا سناتے ہیں ۔ میری بیوی بھی بار بار اٹلی جاتی ہے ۔"

مجھے ایک نظارہ یاد آگیا ۔۔۔۔ میں نیپلز کے ایک نائٹ کلب میں اپنے اطالوی دوست کے ساتھ بیٹھا تھا ۔ یکایک میرا دوست چونکا ہو کر ایک پلے ہوئے پستہ قد شخص کو گھورنے لگا جو سیاہ ڈنر جیکٹ پہنے ایک لمبی تڑنگی عورت کے ساتھ ناچ رہا تھا ۔

"پہچانا اس مردود کو ؟ یہ ہمارا باورچی رومیو ہے ۔ ایسے بڑھیا کپڑے پہن کر یہاں ناچنے آیا ہے ۔ ضرور چوری کی ہوگی ۔ "میرے دوست نے جھلا کر اسے بلایا ۔ واقعی یہ باورچی رومیو ہی تھا ۔ باز پرس کی تو رومیو نے جیب سے بٹوہ نکال کر دکھایا جو نوٹوں سے بھرا ہوا تھا ۔

"یہ نوٹ کہاں سے اڑائے ؟" میرے دوست نے پوچھا ۔

"سینور نیا انگلیز ۔۔۔" اس نے لمبی انگریز عورت کی طرف اشارہ کیا اور آنکھ ماری ۔

مام خاموش بیٹھا کھوئی کھوئی نگاہوں سے دریا کو دیکھ رہا تھا ۔

" تم واقعی بدل گئے ہو ۔ میرے کہے کا خیال نہ کرنا ۔ نصیحت کرنا دنیا کا آسان ترین کام ہے ۔ میں اب تک نصیحتیں کر رہا تھا ۔ اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو پتہ نہیں کیا کرتا ۔ فلسفی Spinoza نے مثال دی تھی کہ اگر کسی اینٹ کو ہوا میں پھینک دیا جائے اور متحرک اینٹ

سے پوچھا جائے کہ کیا کر رہی ہو؟ تو وہ یہی کہے گی کہ میں اپنی مرضی سے جا رہی ہوں۔ یہی حال انسانوں کا ہے۔۔ہم جو کچھ بھی ہیں اور جس حال میں ہیں، اس کا سبب وہ واقعات اور حالات ہیں جن پر ہمارا قابو نہیں، جن کی رو ہمیں بہائے لیے جا رہی ہے۔۔ہم پر طرح طرح کے دباؤ ہیں۔۔ہم مجبور ہیں اور پھر زندگی کا کوئی خاص فارمولا تو ہوتا نہیں کبھی سب کچھ درست ہو جاتا ہے، کبھی نہیں ہوتا۔ کسی خوش بو کا ہلکا سا جھونکا، کسی رنگ کی جھلک، کوئی نغمہ ۔۔۔۔۔۔ یہ بڑے ظالم ہو سکتے ہیں۔ بھولی بسری یادیں دفعتہً تازہ ہو جاتی ہیں۔ کبھی خوش گوار ہوتی ہیں، کبھی از حد کرب ناک اور پھر محبت کی یادیں ۔۔۔۔Alamein کا میدانِ جنگ ایک وسیع قبرستان ہے، جہاں ہر سال دنیا کے مختلف حصوں سے لوگ آتے ہیں اور مٹھی بھر خاک ساتھ لے جاتے ہیں ۔۔۔۔ وہ خاک جس میں پیاروں اور محبوبوں کا خون بہا تھا۔"

ہوائی جہاز اڑنے لگا۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ تاحدِ افق چمکتی ہوئی ریت تھی یا مٹیالی چٹانیں۔ شمالاً جنوباً ایک گہری سبز لکیر کھنچی ہوئی تھی۔ بیچ میں روپہلا تار تھا اور دونوں طرف ہریالی کا حاشیہ۔ جہاں دریا سیدھا بہتا تھا وہاں یہ حاشیہ بھی سیدھا چلتا تھا، جہاں دریا مڑتا وہاں یہ بھی مڑ جاتا۔

کسی جگہ زندگی اور ویرانی کا امتزاج اتنا نمایاں نہیں جتنا کہ اس ملک میں ہے۔ جہاں جہاں سے نیل گزرتا ہے وہاں روئیدگی ہے، گہما گہمی ہے۔ جو حصے اس سے دور ہیں وہاں تپتے ہوئے سورج کی شعاعیں ہر چیز کو جھلس دیتی ہیں، ریت کے انبار ہیں، بادِ سموم ہے اور وحشت ناک خاموشی۔

یہی وہ ملک ہے جہاں ریگستان اور سبزے کے درمیان یوں خط کھینچا جا سکتا ہے کہ ایک قدم ہریالی پر ہو اور دوسرا ریت پر۔

○ ○ ○

۵۱۰
شفیق الرحمٰن

دھند

کیمپ میں اس مرتبہ جو جھڑی لگی ہے تو ہفتے گزر گئے سورج دکھائی نہ دیا۔ بارش ہلکی ہوتی تو جھکڑ چلنے لگتے۔ ان کے مدھم ہوتے ہی بادل کمروں میں آگھستے۔ دھند لاہٹ اور نمی بڑھ جاتی۔ ٹین کی چھت پر بوندا باندی جاری رہتی۔

جب مہینے تک دھوپ نہ نکلی تو دل خوش کرنے کے لیے مشہور ہستیوں کے اقوال پڑھنے شروع کیے۔ دانش مند کا مقولہ تھا کہ حالات خراب ہونے کی بھی انتہا ہوتی ہے ---- ایک حد مقرر ہے جہاں سے انھیں بہتر ہونا پڑتا ہے۔

لیکن فلاسفر کو شبہ ہوا ---- "یہ بھی ممکن ہے کہ اس حد کے بعد برے حالات واقعی بہتر نہ ہوتے ہوں بلکہ تب تک محسوس کرنے کی صلاحیت ہی کند ہو چکی ہو۔"

ایک جگہ لکھا تھا "اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے۔" مگر انجینیر کی رائے میں اس کی جگہ "اگر آسانیاں ہوں زندگی آسان ہو جائے، یا اگر دشواریاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے،" زیادہ پریکٹیکل ہوتا۔

کہاوتیں پڑھتے اور دہراتے رہے لیکن کچھ نہ ہوا۔

پھر خوش فہمی کا سہارا لیا کہ بارش ہمیشہ تو نہیں رہے گی۔ کبھی نہ کبھی بادل چھنٹیں گے ہی۔ تب شعاعوں سے سب کچھ روشن ہو جائے گا اور اگر سورج نکلنے میں واقعی کئی مہینے یا سال باقی ہیں تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بانکی البیلی ہستی آکر اس گیلے اور نیم تاریک ماحول میں ایک دم نور پھیلا دے، رنگ بھر دے۔

آخر ہماری آرزو پوری ہوئی اور ایک ہستی نہیں آئی ---- بلکہ دو۔

تلہٹی کے نچلے قصبے سے پیغام ملا کہ آپ کے ملاقاتی آئے ہیں۔ ان میں ایک تو ٹھیکے دار سا معلوم ہوتا ہے مگر دوسرے کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اجنبیوں کو کیمپ میں بھیجنے کی ممانعت ہے اس لیے آپ انھیں شناخت کر کے ساتھ لے جائیں۔

ہم نے جواب بھیجا کہ ضرور غلطی ہوئی ہے کیوں کہ ہمیں کسی ملاقاتی کا انتظار نہیں۔

کچھ دیر کے بعد اطلاع آئی کہ نہ صرف پیغام صحیح ہے بلکہ وہ دونوں آدمی بھی صحیح ہیں۔

نیچے پہنچ کر دیکھا تو وہاں مقصود گھوڑا کھڑا تھا ---- جسے ٹھیکے دار سمجھا گیا اور اس کے ساتھ شیطان تھے جنھیں کچھ نہیں سمجھا گیا۔

"یہاں آکر تمھارا حلیہ اس قدر بدل چکا ہے کہ پہچان تک نہ سکے۔" مقصود گھوڑے نے شکایت کی۔ "حالاں کہ یہاں بلایا بھی تم ہی نے ہے۔" (احباب کی رائے میں مقصود گھوڑا ان لوگوں میں سے ہے جن سے جتنا کم ملا جائے اتنے ہی زیادہ وہ اچھے لگتے ہیں) میں نے اسے مدعو ضرور کیا تھا لیکن ڈیڑھ دو برس پہلے اور وہ بھی کافی دور سمندر کے کنارے سے۔ ادھر شیطان ایک عرصے سے مکمل طور پر لاپتہ تھے۔

کیمپ کی بلندی سے ہری بھری وسیع وادی کے حسین نظارے دکھائی دیے تو دونوں بہت خوش ہوئے۔ کبھی دوربین سے اونچی برفانی چوٹیوں کو دیکھتے تو کبھی ان پہاڑی درختوں، بیلوں، پودوں کو جو ان کے لیے بالکل نئے تھے۔

موسم صاف ہوتے ہی سب کچھ چمک اٹھا۔ ہریالی نے پہاڑیوں میدانوں پر سبز مخمل پھیلا دی۔ خودرو پھولوں کے رنگ برنگے تختے، چاندی کے تار جیسے نالے اور چشمے، خوش نما کنج۔۔۔۔ سارے منظر پر یوں کشیدہ کاری کرتے کہ دل کشی دوبالا ہو جاتی۔

انھوں نے اوپر کے گھنے جنگل کی سیر بھی کی۔ وہیں مقصود گھوڑے نے پہلی بار لومڑی، مارخور اور مرغ کو دیکھا۔ (ادھر لومڑی، مارخور اور مرغِ زریں نے بھی مقصود گھوڑے کو پہلی مرتبہ دیکھا)

پھر آہستہ آہستہ شوق کم ہونے لگا۔ وہ حسین نظاروں کے عادی ہوتے گئے۔

ناشتے کے بعد سب کام پر نکل جاتے تو یہ دونوں اکیلے رہ جاتے اور سہ پہر تک واپسی کا انتظار کرتے۔ کچھ دنوں کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ قدرتی نظاروں کے علاوہ انھیں انسانی مناظر کی بھی تلاش تھی۔

ایک دن مقصود گھوڑا بھیگا ہوا آیا اور بغل میں دبائی چھتری کھولتے ہوئے مژدۂ جاں فزا سنایا۔۔۔۔ کہ ذرا دیر پہلے بادلوں اور کہرے کے اوپر اسے دوربین سے کچھ دکھائی دیا ہے۔ ایسا پرجوش نعرہ شاید کولمبس نے امریکہ کے ساحل کو ہندستان سمجھ کر بھی نہیں لگایا ہوگا۔

اسے دوسرے پہاڑ پر ملغوبہ، تہمیدہ وغیرہ نظر آگئی تھیں۔۔ہم ان کو جانتے تھے، چناں چہ اس دریافت پر کسی نے اشتیاق ظاہر نہیں کیا۔

اس پہاڑ پر ان لڑکیوں کے کنبوں کے علاوہ کافی لوگ گرمیاں گزارنے آتے۔ دوسرے پہاڑی مقامات سے یہ جگہ سستی تھی۔ ہر سال مئی جون میں خواتین و حضرات کی آمد شروع ہو جاتی۔ پیدل چلنے، بلندیوں پر چڑھنے اور سبزی سے لطف اندوز ہونے کی بجائے ان میں سے بیش تر موٹے ہو کر ستمبر اکتوبر میں واپس لوٹتے اور میدانوں میں فخر سے بیان دیتے کہ پہاڑ پر صحت بنا کر آئے ہیں۔ پھر شیطان اور مقصود گھوڑے نے ہماری مصروفیات سے تنگ آکر (یا شاید مطمئن

ہو کر) ادھر ادھر چکر لگانے شروع کر دیے۔ وہ دوسرے پہاڑ پر جاتے۔ جہاں تحیفہ تھی، تہمیدہ، ملفوبہ اور اس کی بہنیں۔ نچلے قصبے میں، آس پاس کے باغات اور بستیوں میں بھی، جہاں پتہ نہیں کس کس سے ملاقات ہوتی۔

چناں چہ اب سہ پہر کو ان دونوں کی واپسی کا انتظار ہمیں کرنا پڑتا۔ دیر ہو جاتی تو مجھے اور انجینیر کو ان کی تلاش میں بھیجا جاتا۔ ہمارے پاس دو ہلکی پھلکی (سیکنڈ ہنڈ) جیمز موٹر سائیکلیں تھیں اتنے چھوٹے سائز کی کہ جب لمبا آدمی سوار ہوتا تو دیکھنے والوں کو یوں لگتا کہ جیسے السیشن کتے پر بیٹھا ہو۔ لیکن سستی مل گئیں اس لیے خرید لیں۔

ایک اتوار کو پروگرام بنا کہ چل کر دیکھیں تو سہی کہ یہ کہاں جاتے ہیں۔

لاری سے دوسرے پہاڑ پر پہنچے۔ وہاں چند ہم عمر مل گئے جنھیں چائے پر مدعو کیا۔ اگلے اتوار کو وہ آئے تو بڑی عالمانہ اور کار آمد گفتگو ہوئی۔ کئی انٹلکچوئل موضوع زیرِ بحث رہے۔ مثلاً ---- معاشرتی اصلاحات، شاعری کی پرانی قدریں اور لڑکیاں ---- کاشت کاری میں مشینوں کی اہمیت، لڑکیاں اور مغرب میں جذباتیت کا زوال ---- داستان حاجی بابا اصفہانی، لڑکیاں اور مشرق میں جذباتیت کا عروج ---- لڑکیاں، برنارڈ شا، اور لڑکیاں ----

پھر انھوں نے بلایا، ایک آسیب زدہ سی عمارت میں جہاں کبھی اچھے وقتوں میں کلب ہوا کرتا تھا۔ ہال میں داخل ہوتے ہی لڑکیوں کی تعداد دیکھ کر حیران رہ گئے ---- دہنے، بائیں، سامنے، جدھر نظر جاتی لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔

کچھ دیر میں جب کیمپ کی مسلسل تنہائی کا اثر کم ہوا اور انھیں گنا تو لڑکیاں صرف چھے نکلیں۔

مقصود گھوڑے کے برعکس شیطان نے (واسکوڈی گاما کی طرح) ایک صحیح دریافت بھی کی تھی ---- انھوں نے نچلے قصبے میں ایک بے حد کثیر العیال شخص ڈھونڈ نکالا۔

کیمپ کی خاموشی یا جمود سے تنگ آکر جب کسی کو شادی کا خیال آتا یا منگنی بیاہ کی باتیں ہونے لگتیں تو وہ فوراً سب کو اس کے گھر لے جاتے۔

وہاں پہنچتے ہی یوں معلوم ہوتا جیسے کسی عالمی ٹورنمنٹ کے فائینل میں پرانے حریفوں کا تابڑ توڑ مقابلہ ہو رہا ہے۔ وہ ریفری کی طرح انھیں بار بار گھر کتا، ڈانٹتا اور باہر بھی بھیج دیتا۔

علیک سلیک کے بعد کوئی خیریت پوچھ بیٹھتا تو وہ چمک کر کہتا ---- "خیریت؟ خیریت ہو تمھارے ہاں ---- جہاں بیوی ہے نہ بچے۔ اتنی نفری میں خیریت کیسی؟ کسی نہ کسی کو کچھ نہ کچھ رہتا ہی ہے۔" پھر آہستہ آہستہ ان دونوں کی کوہ نوردی کم ہوتی گئی۔ حتی کہ جب اطلاع ملی کہ قریب ہی چائے کے باغات میں ایک حسینہ دیکھی گئی ہے جو لوکل لڑکیوں سے (جنھیں ڈاکٹر Local Anaesthesia کہا کرتا) کہیں بہتر ہے تو شیطان نے پوچھا ---- "یہ باغات

کتنی دور ہیں؟"

"تقریباً بیس میل ہوں گے ۔۔۔۔"

"بیس میل زیادہ ہیں۔ حسین سے حسین لڑکی کو چھ سات میل سے زیادہ دور نہیں ہونا چاہیے۔ اگر فاصلہ ہی طے کرنا ہے تو ولایت چلو جہاں چپے چپے پر نازنینیں پائی جاتی ہیں۔"

انجنیر، فلاسفر، کیمسٹ اور ڈاکٹر کسی سروے کے سلسلے میں وہاں تھے جس کا اصل مقصد انھیں پوری طرح معلوم نہیں تھا۔ کبھی کبھی انھیں شبہ ہوتا کہ جنھوں نے انھیں بھیجا ہے وہ بھی نہیں جانتے ہوں گے۔ میں ان سے کہیں پہلے پہنچا تھا۔ ایک ایسے انگریز فوجی افسر کی جگہ جو کبھی لمبی چھٹی لے لیتا۔ کبھی تبادلے کی کوشش کرتا، تو کبھی دونوں۔

اس چھوٹے سے کیمپ میں ہم گنے گنائے تھے۔ ان چاروں سے جلدی ہی واقفیت ہو گئی۔ یہ کام پر نکلتے تو کبھی کبھی مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ انھیں عجیب و غریب معلومات کی تلاش رہتی۔ مثلاً جمادات، معدنیات، نباتات کے اعداد و شمار۔ انسانوں، حیوانوں کے رویے پر ماحول کے اثرات۔ ماحول پر جان داروں کا اثر، موسم کا زلزلوں سے تعلق، کیمیائی کھاد اور جرائم کا باہمی تناسب، ہواؤں کے رخ کا صحت سے واسطہ، وغیرہ وغیرہ۔

اور یہ گول مول سی سروے حسبِ معمول نہایت اہم تھی۔ تبھی مہینے کی پہلی کو یہ چاروں اپنی اپنی رپورٹ کی کئی کئی کاپیاں ٹائپ کرا کے رجسٹری کراتے (اگر پہلی کو نہ بھیج سکتے تب بھی تاریخ پہلی ہی درج کرتے)۔ ہر مرتبہ "پہنچنے کی رسید دیں" کا فقرہ بھی لکھا جاتا لیکن ہیڈ آفس سے جوابِ جاہلاں باشد خموشی، پر عمل ہو رہا تھا۔ جیسے وہاں کسی کو یہ سب کچھ پڑھنے کی فرصت نہ ہو۔ یہ اس طویل و عریض وادی میں دورے کرتے، نقشے بناتے، چائے کے باغوں، تھانوں، ڈسپنسریوں، دکانوں، ڈاک خانوں، دفتروں میں جاکر کاغذات اور ریکارڈ سے نہ جانے کیا اخذ کرنے کی کوشش کرتے۔ لوگوں سے ایسے ایسے ذاتی سوال پوچھتے جن کا سچا جواب کبھی نہ ملتا۔ حیوانات میں فقط پالتو چوپایوں، پرندوں ہی کا مطالعہ کیا جا سکتا تھا کیوں کہ جنگل کے پرندے پھر سے اڑ جاتے اور درندے کافی بلندی پر رہتے تھے۔ ان سے ڈر بھی لگتا۔

اس علاقے میں ان پر طرح طرح کے شبہے کیے جاتے۔ دفتروں میں انھیں Auditor تصور کیا جاتا۔ دکان داروں کو ان پر انکم ٹیکس والوں کا گمان ہوتا، طبیب، کمپاؤنڈر انھیں خفیہ پولیس کے افراد سمجھتے۔ ادھر پولیس والوں کو یقین تھا کہ یہ بات بات پر جرح کرنے والے ضرور وکیل ہوں گے۔ ویسے اکثر باشندوں کا یہی خیال تھا کہ یہ کسی انتشار پسند گروہ کے ممبر ہیں جنھیں پبلک کو خواہ مخواہ تنگ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے یا پھر یہ کہیں سے خود آ گئے ہیں۔ جب میں پہلے پہل کیمپ میں پہنچا تو سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ کئی مرتبہ برف باری ہوئی۔ برف سے چھپے ہوئے کیمپ اور سفید چادر سے ڈھکی ہوئی وادی کے فوٹو ساتھیوں کو دکھاتا تو انھیں یقین نہ آتا کہ

یہ خوش نما مناظر ہمیں کے ہیں۔

پہلی برف باری اچھی طرح یاد تھی۔ مختصر سی چھٹی کرسمس کی گہما گہمی میں گزار کر شہر سے واپس لوٹا تو میدانوں میں برفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ سطح مرتفع شروع ہوتے ہی وہ اسٹیشن آیا جہاں گاڑی بدل کر کھلونے جیسی ننھی منی ٹرین میں سوار ہوا۔ چھک چھک کرتا انجن پورا زور لگا کر چڑھائی طے کر رہا تھا۔ دھندلی برفانی چوٹیاں، ہری بھری پہاڑیاں اور جنگل نظر آنے لگے۔ یہ نظارے کھڑکیوں میں سے اور اچھے لگتے جیسے فریم کرانے سے تصویر کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ گھاٹیوں، ندیوں کے پلوں، سرنگوں کے بعد آخری اسٹیشن آیا۔ وہاں گھٹا تھی اور نہایت سرد پھوار۔ کیمپ جانے والی لاری روانہ ہوئی تو بل کھاتی ہوئی سڑک پر بارش شروع ہو گئی، جس کی تیزی بڑھتی گئی۔ ہلکی سی دھند آئی جو گہری ہونے لگی۔ سامنے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ڈرائیور کو یا تو راستے کا ایک ایک موڑ زبانی یاد ہو گا یا بیشتر لاری ڈرائیوروں کی طرح انجن اسٹارٹ کرتے ہی گردوپیش سے قطعاً بے خبر ہو چکا تھا۔

پھر اولے پڑنے لگے۔ اتنی تیزی سے آتے کہ گرتے ہی ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ اس سے آگے سفید سے برادے کی بوچھاڑ آئی۔ یہ نہ تو اولوں کی طرح نہ برف جیسا، دونوں کے درمیان کچھ بجری سی تھی جو بڑی شدت سے پڑ رہی تھی۔ کچھ اور چڑھائی کے بعد نہ تیز جھکڑ تھے نہ آسمان سے گرنے والی چیزوں کا جوش و خروش۔ وہاں بالکل خاموشی تھی۔ اوپر سے برف کے لاکھوں ننھے منے گالے یوں گھومتے ہوئے آتے جیسے بے شمار چھوٹے چھوٹے پر فضا میں تیر رہے ہوں۔ بلندی پر گالے بڑے ہو گئے جو بالکل سیدھ میں آہستہ آہستہ گر رہے تھے۔ برفانی تہہ دبیز ہوتی گئی اور اس نے سڑک کو چھپا لیا۔ ڈرائیور نے کسی نہ کسی طرح ہمیں نچلے قصبے تک پہنچا دیا۔ آگے لاری پھسلنے لگی۔

مجھے ابھی اور اوپر جانا تھا۔ سوٹ کیس اور تھیلا سنبھال کر گھٹنے گھٹنے گہری برف میں چڑھنا شروع کیا۔ راستوں کا کوئی نشان نہ رہا تھا، محض اندازے سے چلنے لگا۔ ایک جگہ تو کندھوں تک برف میں دھنس گیا۔ شاید یہ کوئی گڑھا تھا۔

آخر جب ٹھٹھرتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا تو خیال آیا کہ آج ٹھنڈے جھونکوں سے لے کر برف باری تک کی مختلف کیفیتیں دیکھنے کا موقع ملا۔ یعنی جب میدانوں میں خنک جھکڑ چلنے لگیں اور سطح مرتفع پر گھٹا ہو تو پہاڑوں اور چوٹیوں پر کیا ہوتا ہے۔

برف گرتی رہی۔ رات بھر ہر طرف نور ہی نور تھا۔ کبھی یوں لگتا جیسے باہر چاندنی پھیلی ہوئی ہے تو کبھی گمان ہوتا کہ یہ صبح صادق کی جلا ہے۔

سپ سپ، سپ سپ، سک سک، سک سک، ـ ـ ـ ـ گالے ہولے ہولے گر رہے تھے۔

کبھی ٹہنیوں دیواروں سے برف کا وزنی تودہ دھڑام سے گرتا۔ اس کے بعد پھر سپ سپ سک سک کی دھیمی صدا آنے لگتی۔ صرف گھڑی سے پتہ چل سکا کہ صبح ہو گئی ہے۔ برف باری میں دن

اور رات میں بہت تھوڑا فرق تھا۔

برفانی مناظر کے علاوہ بادلوں کی بھی تصویریں اتاری تھیں، کیمرے پر رنگین Filters لگاکر۔ پہاڑ کے بادل میدانی بادلوں سے کچھ اور طرح کے لگے۔ یہ طرح طرح کے روپ بدلتے، عجب سماں باندھتے۔ برف باری سے پہلے آسمان میں اکادکا بادل ہوتا۔ پھر آہستہ آہستہ کئی بادل گٹھ جوڑ کر کے یوں اکٹھے ہوجاتے جیسے ہر طرف فقط ایک ہی بادل چھا یا ہوا ہے۔ پھر سب کچھ دھندلا ہوجاتا اور گالے گرنے شروع ہوجاتے۔ برف باری کے بعد بھی یہ گھٹاٹوپ دھواں دیر تک رہتا۔

سردیاں کم ہونے پر بڑے بڑے دو دو تین تین منزلہ شفاف بادل آسمان کے ایک گوشے میں یوں جم جاتے جیسے سنگِ مرمر کے محل ہوں۔ جب تیز جھونکوں سے ہلتے تو جانوروں کی سی شبیہیں بن جاتیں جو آپس میں چھیڑخانی کرتیں، لڑتیں۔

گرمیوں میں جوں ہی ہوا رکی فوراً اودی اودی گھٹائیں آپہنچیں۔ نیلے کالے گھنگھور بادل پانی سے بالکل لب ریز ----- اگر یوں رک جاتے جیسے اب یہیں رہیں گے۔ ان میں بجلیاں چمکتیں، کڑاکے دار دھماکے ہوتے، تاریکی اور روشنی ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیلتیں۔ کبھی تو گرج گرج کر برسے بغیر چلے جاتے لیکن ایک دفعہ بوندیں شروع ہوجاتیں تو مینھ ختم ہونے میں نہ آتا۔ بارہا یہ بھی دیکھا کہ نیچے وادی میں سیاہ گھٹا ہے، بجلیاں کڑک رہی ہیں، موسلا دھار بارش ہورہی ہے اور اوپر کیمپ میں دھوپ نکلی ہوئی ہے۔

جھڑی ختم ہونے پر برسے ہوئے ہزاروں سفید براق بادل رواں دواں آتے اور چلے جاتے۔ دھلی ہوئی بدلیاں ایک دوسرے کا تعاقب کرتیں۔

اور خزاں کے وہ اداس مٹیالے بادل، جو دن بھر محزوں اور ساکن تھے، غروبِ آفتاب پر شفق پھولتے ہی رنگوں میں یوں کھیلتے کہ میلہ سا لگا جاتا۔ یقین ہی نہ آتا کہ یہ وہی بادل ہیں جو کچھ دیر پہلے بالکل پھیکے اور خاموش تھے۔

دیکھنے میں وہ فلاسفر بالکل نہیں لگتا تھا۔ فقط ہم ہی جانتے تھے کہ اس پر کبھی کبھی بے خبری کے دورے پڑتے ہیں۔ جیسے اس دن جب اس کا پاؤں کتے کے پنجے پر پڑ گیا۔ کتے نے نعرہ لگایا تو اسے فوراً ڈانٹا ----- "ننگے پیر پھروگے تو یہی ہوگا۔" یا سہ پہر کو سیر کرتے ہوئے پہاڑ پر بے نور چاند نظر آیا تو بولا ----- "عجب بات ہے کہ دن میں تو کبھی کبھی چاند سامنے آجاتا ہے لیکن رات کو سورج کبھی نہیں دکھائی دیا۔" پھر دعوت پر قصبے کے ہوٹل میں بیرے نے Menu کا کارڈ اس کے سامنے رکھا۔ کھانوں کی لمبی فہرست پڑھ کر معذرت کرنے لگا کہ اتنی ساری چیزیں تو وہ ہرگز نہیں کھاسکتا۔ تب اسے یاد دلانا پڑا کہ کارڈ سے دو تین کھانے چنے جاتے ہیں۔ اسی طرح چک پڑجانے پر ڈاکٹر نے اسپرین دی تو اس سے پوچھا ----- "یہ اسپرین درد کو خود بہ خود کیسے

ڈھونڈ لیتی ہے؟ سرد کھ رہا ہو، کمر، گھٹنا یا کندھا۔۔۔۔ یہ تیر کی طرح سیدھی وہیں پہنچتی ہے۔"

جب بار بار فلسفیوں کے نام لیتا تو سب تاڑ جاتے کہ ٹھوس کتابوں کا مطالعہ ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی پڑھ کر سناتا۔۔۔۔ "سقراط کا قول ہے کہ اس درہم برہم دنیا میں انسان تھوڑا بہت خبطی نہ ہو تو بالکل پاگل ہو جائے۔" یا یہ کہ "اگر کسی طرح سب عورتوں کی شادی ہو سکتی اور سب مرد کنوارے رہ سکتے تو دنیا کتنی بہتر جگہ ہوتی۔"

شیطان کا خیال تھا کہ فلاسفر یا تو ایسا قنوطی ہے جو مسخرہ بھی ہے، ورنہ پھر ایسا مسخرہ ہے جسے قنوطیت نے قابو کیا ہوا ہے۔

جب سنجیدہ مطالعے کا بوجھ بڑھنے لگتا تو شیطان اس کے لیے لائبریری سے چن کر کتابیں لاتے۔۔۔۔ "ایسی ہلکی پھلکی تحریریں بھی پڑھا کرو۔ اگر افاقہ ہو تو واپس کر دینا۔ فائدہ ہوا تو تقدیر، حسنِ اتفاق، نطشے، کانٹ یا جس کے بھی تم معتقد ہو اس کا شکریہ ادا کر دینا۔"

ناشتے پر جب وہ خوش نظر آتا تو ہم فوراً سمجھ جاتے کہ رات اس نے اپنا محبوب خواب دیکھا ہے۔

اس طویل خواب میں پہلے ایک بیل گھومتا۔ بعد میں وہ کولھو بھی سامنے آجاتا جس میں بیل جتا ہوا ہے۔ پھر دور افق پر ایک تارہ چمکتا، جو آہستہ آہستہ قریب آنے لگتا۔ اس بڑے سارے روشن سیارے پر جب برّاعظم اور سمندر دکھائی دیتے تو معلوم ہوتا کہ یہ دنیا ہے جو بیل کی طرح دائیں سے بائیں گھوم رہی ہے۔ کرۂ ارض اور کولھو کے بیل کی جنبش میں ہم آہنگی آجاتی اور دونوں اکٹھے گردش کرنے لگتے۔

ایک دن کیمسٹ پوچھ بیٹھا۔۔۔۔ "اس میں خوش ہونے کی کیا بات ہے؟"

"یہی کہ فلسفہ۔ حیات کی اس سے بہتر کیا تفسیر ہو سکتی ہے۔" فلاسفر نے جواب دیا۔

"لیکن ایک ہی خواب بار بار دیکھ کر اکتا نہیں جاتے؟"

"نہیں۔ کیوں کہ اس میں ردوبدل ہوتی رہتی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"بیل کبھی سفید ہوتا ہے۔ کبھی چتکبرا اور بعض اوقات سیاہ۔۔۔۔"

لڑکیوں میں اسے کوئی خاص بلکہ کوئی عام دل چسپی نہیں تھی۔ ملغوبہ اور جمیدہ کی باتیں سن کر وہ حیران ہوا کرتا کہ جو لڑکی اپنی ذہنی عمر یوں کھلم کھلا ظاہر کر دے وہ اصلی عمر بھی بتا دے گی اور جو اپنی صحیح عمر بتا دے وہ کوئی بھی راز افشا کر سکتی ہے۔ اس پر بالکل بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔

جمیدہ کے ہاں اگر لڑکیوں کے سامنے بیٹھنا پڑ جاتا تو نیچے دیکھتا رہتا یا چھت کی طرف۔ انجینیر چھیڑتا کہ اس وقت نگاہیں زاویہ قائمہ بناتی ہیں۔ ملغوبہ کی دعوتوں میں نظریں ایسے ٹیڑھے

ترچھے زاویے بناتیں جن کے نام کافی مشکل ہوتے ---- مثلاً زاویہ حادہ - زاویہ منفرجہ اور جب ملغوبہ سامنے ہوتی تو وہ زاویے بھی بنتے جن کے نام انجینیر تک کو نہیں آتے تھے - ایسی ہی ایک تقریب سے واپسی پر اسے یکایک خیال آیا کہ "پارٹیاں نہ ہوں تو بنے ٹھنے لڑکوں اور بجی سجائی لڑکیوں کی بار بار ملاقات کیوں کر ہو - ٹیلیفون نہ ہو تو گھنٹوں کسی (سوائے آپریٹر) کی مداخلت کے بغیر جھوٹی سچی باتیں نہیں کی جا سکتیں - نہ ایک دوسرے کی پسند ناپسند (خاص طور پر ناپسند) کا اندازہ ہو سکتا اور کار نہ ہو تو سست یا فربہ محبوب سے لگاتار ملنا جلنا مشکل ہے ---- پتہ نہیں ڈیڑھ دو سو سال پہلے لوگ کس طرح محبت کر لیا کرتے تھے - "

محبت کے بارے میں اس کی رائے تھی کہ اکثر مردوں کی زندگی میں کم از کم تین لڑکیاں آتی ہیں - ایک تو وہ جس سے شادی نہ ہو سکی - دوسری وہ جو بیوی بن جاتی ہے اور تیسری جس کے فقط خواب دیکھے تھے لیکن نظر کبھی نہیں آئی -

فلسفے کے بعد اسے موسیقی سے دل چسپی تھی - اپنے ساتھ گراموفون ریکارڈوں کے کئی ڈبے لایا تھا - یہ ریکارڈ عموماً چھٹی کے دن لگائے جاتے - برسات شروع ہوئی تو بار بار بجنے لگے اور جب لمبی لمبی جھڑیاں لگیں تو ہر وقت ----!

موسیقی سب کو پسند تو تھی لیکن اتنی نہیں کہ صبح سے رات تک اور کوئی آواز نہ آئے اور وہ نغمے تو اتنے غمناک تھے کہ انھیں مسلسل سن کر تندرست سے تندرست انسان ، یہاں تک کہ دنیا کا ہیوی ویٹ چیمپین بھی بھوں بھوں کر کے رونے لگے -

سب سے پہلے مقصود گھوڑے نے ہتھیار ڈالے -

اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ موسیقی سے بے بہرہ (یا کانوں سے بہرہ) تھا - فقط اسے کسی چیز کو دہرانے سے چڑ تھی - کالج کے دنوں میں بھی اس نے نہ کبھی سبق رٹا تھا ، نہ کسی کھیل کی مشق کی (تبھی کہیں تیر نہیں مارے) -

لیکن اس مرتبہ مقصود گھوڑے نے جو حرکت کی اس میں جدت تھی - جب فلاسفر حجامت کرتا ، نہانے لگتا یا کپڑے بدلتا ، یعنی تقریباً بے بس ہوتا تو وہ گراموفون کی رفتار یا تو بالکل آہستہ کر دیتا یا بہت تیز - اس سے گانے کی آواز کبھی تو یوں نکلتی جیسے بڑے سائز کا چوپایہ ڈکرا رہا ہو - یا پھر مختلف پرندے چوں چوں کر کے آپس میں لڑنے لگتے - جتنی دیر میں فلاسفر آکر رفتار درست کرتا تب تک نغمے کا لطیف تاثر ختم ہو جاتا -

جب بار بار یوں ہوا تو اپنے پسندیدہ ریکارڈوں سے فلاسفر کا بھی جی بھرنے لگا - ایک ایک کر کے وہ واپس ڈبوں میں بند کر دیے گئے - "اب پتہ چلا ہے کہ موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے لیے جہاں اعلیٰ فن کار اور صحیح موڈ ضروری ہیں وہاں سازگار ماحول اور موزوں رفتار بھی اتنے ہی اہم ہیں ---- " اس نے بتایا -

پھر وہ نچلے قصبے سے (کرائے پر) ہارمونیم لے آیا۔ سب خوش ہوئے کہ اب شوخ چنچل سروں کی فرمائش کیا کریں گے لیکن جوں ہی وہ ہارمونیم بجانا شروع کرتا نہ جانے کیوں پڑوسیوں کا کتا رونے لگتا۔ لے مسرور ہو، سنجیدہ، یا کیسی بھی لیکن کتا ساتھ دیتا۔

آخر شیطان کو ٹوکنا پڑا۔۔۔۔ "تم وہ دھن کیوں نہیں بجاتے جو کتے کو نہ آتی ہو۔"

اس پر ہارمونیم واپس بھیجنا پڑا۔

کیمسٹ کی ٹریننگ امریکہ میں (جسے وہ ہمیشہ States کہا کرتا) ہوئی تھی۔ وہیں کچھ عرصہ ملازمت کی اور ریسرچ بھی، چناں چہ اب اسے ذرے ذرے میں کیمسٹری کے جلوے نظر آتے۔

"کچھ سیکھنا ہے تو علم پڑھو۔" وہ کہا کرتا۔ "جو حیات پر اتنا حاوی ہے کہ آکسیجن کے بغیر کوئی سانس تک نہیں لے سکتا اور جن سیاروں پر آکسیجن نہیں وہاں زندگی بھی نہیں۔ کوئی کیمیکل کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو اس کے ہونے یا نہ ہونے سے انسان کے رویے پر کس قدر اثر پڑتا ہے۔ ذرا سا غصہ آتے ہی Adrenalin خون میں گردش کرنے لگتی ہے۔ اسی سے پٹھے اکڑتے ہیں۔ یہی جوش دلاکر چیخم دھاڑ اور مار کٹائی کراتی ہے۔ ادھر بے زاری کی وجہ دماغی یا جسمانی تھکاوٹ نہیں، عموماً گلوکوز کی کمی ہوا کرتی ہے۔ تبھی یہ (میری طرف اشارہ کرکے) ڈیڑھ دو میل کی دوڑ، ایک سو ایک ڈنڑ اور اتنی ہی بیٹھکیں نکال کر جب گنڈیریاں چوستا ہے تو گلوکوز وصول کرتے ہی دوبارہ چست ہو جاتا ہے۔"

وہ جو کچھ دیکھتا، سنتا، محسوس کرتا اس کا ذمہ دار کیمسٹری کو ٹھہراتا۔

کوئی ولایتی حسینہ نظر آتی (دراصل وہاں حسیناؤں کی اتنی کمی تھی کہ ہماری لوکل چمپئین یعنی ملغوبہ کو بھی بین الاقوامی معیار پر کوئی گریڈ نہیں مل سکتا تھا) تو وہ کہتا۔۔۔۔ "خواتین و حضرات! میرا مطلب ہے حضرات۔ خواتین یہاں ہیں ہی کہاں۔ سچ بھی ہے کہ یہ دیدہ زیب چہرہ فقط وٹامن بی کا ممنون ہے، جسے بیوٹی وٹامن کا رتبہ مل چکا ہے۔۔۔۔"

ہم اسے بتاتے کہ جہاں کی یہ رہنے والی ہے وہاں اس عمر میں تقریباً سارے نسوانی چہرے پرکشش ہوتے ہیں۔ کسی تن درست بچے کو دیکھتے ہی نعرہ لگاتا۔۔۔۔ "بچے میں کوئی خاص خوبی نہیں فقط اس کی کیمسٹری درست ہے۔ اگر اس میں لوہا، کیلشیم، فاسفورس وغیرہ صحیح مقدار میں نہ ہوتے تو اس کی طرف کوئی بھی نہ۔۔۔۔" اسے یقین دلاتے کہ ہم بچے کو بالکل نہیں دیکھ رہے تھے۔ نہ دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے۔

"دنیا بھر میں ایک کیمسٹری ہی رہ گئی ہے کیا؟" فلاسفر کبھی ٹوکتا۔ "علوم لاتعداد ہیں۔ اس سے کہیں اہم۔"

"یعنی ۔۔۔؟"

"یعنی فلسفہ ۔۔۔ اور ۔۔۔"

"فلسفہ کیا کرتا ہے ۔۔۔؟"

"بہت سی گتھیاں سلجھاتا ہے۔"

"مثلاً ۔۔۔"

"مثلاً مجھے تیز بھوک لگی ہوئی ہے۔ مزے دار کھانا سامنے رکھا ہے اور کیمیکل جو سب کا گیسٹرک جوس ہے مگر تمہارا ہائیڈرو کلورک ایسڈ ۔۔۔ وہ بھی غذا کا منتظر ہے۔ اتنے میں کسی منحوس کا ٹیلیفون آجاتا ہے۔ اس کی منافقانہ باتوں کے بعد بھوک آدھی بھی نہیں رہ جاتی۔ لذیذ غذا، اشتہا، کیمیکل ۔۔۔ سب کے سب موجود تھے۔ پھر کیا ہوگیا؟"

"تم جیسا کم خوراک بھوک کا ذکر کرے۔ تعجب ہے۔"

"اچھا۔ فرض کرو کہ کوئی لڑکی میک اپ کرکے یعنی کئی کیمیکل تھوپنے کے بعد، بن سنور کر نکلی۔ ادھر وہ جو بڑے شوق سے اس کا انتظار کر رہا ہے، اسے ڈاکیے نے ایک خط تھما دیا جس میں بری خبر تو نہیں لیکن ایسی ہے جس پر یقین نہیں آرہا۔ کیفے میں لڑکی سے باتیں کرتے ہوئے اس کے ذہن پر یہ خط سوار رہا۔ وہ اسے بے رخی سمجھ کر چڑ گئی اور چائے ختم کیے بغیر ہی چلی گئی۔ وہی مقوی حسن کیمیکل جو لڑکے کو پہلے لبھایا کرتے اس مرتبہ کیوں نکمے ثابت ہوئے؟ اس کا جواب کوئی فلاسفر ہی دے سکتا ہے، کیمسٹ نہیں ۔۔۔"

"مگر اس طرح یکایک آزردہ ہوجانے کی بجائے لڑکی کو وجہ پوچھنی چاہیے تھی۔ یوں بھی خواتین کے موڈ بہت جلد بدلتے ہیں۔ اس کا سبب بائیو کیمسٹری میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی چند روز مسرور رہ کر یکایک خواہ مخواہ زود رنج ہوجائیں گی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اتنی فراخ دل کہ بڑے سے بڑا قصور بھی معاف ہوجائے گا۔ ذرا دیر کے بعد بالکل چھوٹی سی بات پر اس قدر خفا ہوں گی کہ منانا محال ہوجائے گا۔ کچھ عرصے تک مسکراہٹیں پھر عود کر آئیں گے ۔۔۔ اس ساون بھادوں انداز پر حیران ہونے والے یہ نہیں جانتے کہ تغیر کی اصلی وجہ ہارمونز ہیں جو مردوں کے خون میں بھی ہوتے ہیں لیکن خواتین کے ہارمونز میں مسلسل کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ جس سے یہ تبدیلیاں آتی ہیں۔"

"تغیر مردوں کے موڈ میں بھی آتا ہے ۔۔۔" فلاسفر بتاتا۔ "کئی تو پارے کی طرح مچلتے رہتے ہیں۔ قصور تمہارا نہیں۔ تم نے مضمون ہی ایک پڑھا ہے۔ اگرچہ اس میں سائیکالوجی، فزکس، میڈیسن اور دیگر سائینسوں کو زبردستی گھسیٹ لیتے ہو۔ اگر کہیں آرٹس لیے ہوتے تو شاید ان ہی کے گن گایا کرتے۔ جغرافیے یا تاریخ میں ایم۔ اے کرنے سے ۔۔۔"

"لیکن کیمسٹری کا اثر ہر مضمون پر پڑا ہے۔ تاریخ پر بھی۔ کتنوں کو پتہ ہے کہ اپنے

زمانے کا سدا بہار فاتح نپولین اپنی واٹر لو کی واحد شکست سے پہلے بھی ایک جنگ ہار چکا تھا؟ وہ محاذ کا معائنہ کر رہا تھا کہ کسی سپاہی نے یوں ہی کہہ دیا ـ ـ ـ ـ "مارشل ایک ادنیٰ سے جنگ جو کا راشن بھی چکھیے ـ ـ ـ ـ ـ" اس نے وہ خشک نمکین گوشت کھالیا جو بسا ہوا تھا اور جس میں مضر کیمیکل تھے ـ چناں چہ قولنج میں مبتلا ہوا ـ ایک وقفہ آیا جب اسے نہ لڑائی سے کوئی دل چسپی رہی نہ ان کمانڈروں سے جو بار بار آرڈر لینے آتے ـ سب سے یہی کہتا کہ جو دل چاہے سو کرو ـ جب یہ بہ ظاہر معمولی سی لڑائی ہارا تو مخالفوں کے حوصلے بلند ہوگئے کہ نپولین جیسے سورما کو بھی شکست دی جاسکتی ہے ـ اس کا مجموعی نتیجہ واٹر لو میں نکلا، جس کے تھوڑے بہت ذمے دار وہ مضر کیمیکل بھی تھے ـ ـ ـ ـ"

"تم نے اس سپاہی کی خیریت نہیں بتائی جس غریب کا سارا راشن بھو کا مارشل کھا گیا ـ ـ ـ ـ" فلاسفر نے پوچھا ـ

"کیمسٹ کا کیا مقام ہے؟ اور مستقبل میں کیا ہوگا؟" کیمسٹ نے کہا ـ "افسوس ہے کہ یہاں کسی نے اس کا رتبہ نہیں پہچانا ـ کسی کو اندازہ ہی نہیں کہ کیمسٹ کی صحیح جگہ کہاں ہے ـ ـ ـ ـ ـ؟"

"یہاں کے کیمسٹ کا مستقبل نہایت روشن ہے لیکن کیمسٹری میں نہیں ـ رہ گیا اس کا صحیح مقام ـ ـ ـ ـ" فلاسفر نے اٹھتے ہوئے اپنی کرسی کی طرف اشارہ کیا ـ "تو وہ یہ جگہ بہ خوشی لے لے ـ میں اسے خالی کر رہا ہوں ـ"

ڈاکٹر کو یوں تو سب پسند کرتے تھے لیکن کبھی کبھار کوئی پوچھ ہی بیٹھتا کہ یہ کام کیا کرتا ہے ـ شاید اس لیے کہ کیمپ میں کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں تھی، یہاں تک کہ پی ایچ ـ ڈی قسم کے ڈاکٹر کی بھی نہیں ـ بار بار یہی جواب دوہرایا جاتا کہ جب کوئی ٹیم کہیں جاتی ہے تو رواج کے مطابق ایک ڈاکٹر بھی ساتھ ہوتا ہے ـ تبھی انجینیر، فلاسفر اور کیمسٹ کو ٹیم سمجھ کر ہیڈ آفس کے کسی کلرک نے اس کا نام بھی شامل کر دیا ہوگا ـ

شروع شروع میں کبھی کبھار وہ ہماری صحت کے بارے میں پوچھ لیا کرتا ـ بعد میں وہ مایوس ہو کر خاموش ہو گیا ـ پھر وقت گزارنے کے لیے قصبے کے ہسپتال میں جانے لگا ـ ـ ـ ـ

اسے دو فقرے بہت پسند تھے ـ

"اچھا ہوا کہ میں وقت پر پہنچ گیا ورنہ پتہ نہیں کیا ہو جاتا ـ"

اور "ابھی تک نہیں ہوا (یا نہیں ہوئی) ـ"

جب اس کے علاج کے باوجود سینما کے مینیجر کا خرگوش انتقال کر گیا تب بھی اسے (مینیجر کو) یہی تسلی دی کہ شکر کرو کہ میں وقت پر پہنچ گیا تھا ورنہ پتہ نہیں کیا ہو جاتا ـ

پھر کیمسٹ کے پاؤں میں (چلے پھرے بغیر) شدید موچ آ گئی۔ اسے ایکس رے کے لیے نیچے ہسپتال میں لے گیا اور جب کچھ دیر کے بعد گیلی فلم پکڑے باہر نکلا تو بے حد افسردہ تھا۔ سب یہی سمجھے کہ ضرور کوئی ہڈی ٹوٹ گئی ہے لیکن اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔۔۔۔ "ایک فلم بھی ضائع کی لیکن افسوس ہے کہ کچھ نہیں نکلا۔ ابھی تک سب ہڈیاں ٹھیک ہیں۔ وہ تو اچھا ہوا میں وقت پر آ گیا ورنہ خبر نہیں کیا ہو جاتا۔"

اپنا طبی معائنہ کراتے ہوئے کہتا۔۔۔۔ "سب کچھ درست ہے نا؟"

"ابھی تک تو درست ہے۔" وہ ٹمپریچر، نبض اور بلڈ پریشر لے کر بتاتا۔

"کوئی پوچھتا۔۔۔۔ "جناب میرے جسم میں خون کی کمی تو نہیں؟"

"ابھی تک تو نہیں ہوئی۔" وہ لیبارٹری کی رپورٹیں دیکھ کر کہتا۔

"لیکن بار بار کھانسی آتی ہے۔ کہیں برانکائٹس نہ ہو۔"

وہ سینے کو ٹھونک بجا کر بتاتا۔ "برانکائٹس ابھی تک تو نہیں ہوا۔"

جب فلاسفر کو متواتر ہلکی ہلکی حرارت سے طرح طرح کے وہم رہنے لگے تو ڈاکٹر نے اسے ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ مرض کی تشخیص سے پہلے ہی اتنی ساری دوائیاں ملنے لگیں کہ شفا کے بعد یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس دوائی سے ٹھیک ہوا ہے؟ اور اسے تھا کیا؟ ویسے ڈاکٹر نے بتایا کہ فلاسفر کو ملیریا، ٹائیفائیڈ، نمونیہ، تپ دق، یرقان، کینسر اور مالیخولیا، ابھی تک نہیں ہوا۔ ہسپتال سے واپس آ کر فلاسفر ماڈرن دوائیوں کی اکثر شکایت کیا کرتا کہ اتنی سخت اور تیز ہیں کہ انھیں استعمال کرنے سے پہلے انسان کو پوری طرح فٹ اور مضبوط ہونا چاہیے۔

مقصود گھوڑا ڈھیلا ڈھیلا سا رہنے لگا تو سب نے مشورہ دیا کہ تم بھی ہسپتال جاؤ۔ اگلے ہفتے اس نے بتایا کہ وہ ہسپتال جاتا رہا ہے اور وہاں ڈاکٹروں اور عملے کی صحت بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ ملغوبہ کا ایک وہمی اور باتونی رشتے دار ڈاکٹر کے پاس آیا کرتا۔ اسے دیکھتے ہی شیطان ہم سب کو کھسکنے کا اشارہ کر کے اس سے پوچھتا۔۔۔۔ "سنائیے قبلہ! بینائی، دماغ اور سینے کی کمزوری۔ بھوک، نیند اور بشاشت کی کمی۔۔۔۔ گردن، کمر، دانت اور جوڑوں کے درد۔۔۔۔ اور ناطاقتی ۔۔۔۔ کے علاوہ آپ کا کیا حال ہے؟"

انجینیر کے ہاتھوں پر دانے نکل آئے۔ علاج کے لیے کہا تو بولا۔ "معمولی بیماریاں عموماً چھ سات روز تک خود بہ خود ٹھیک ہو جاتی ہیں۔" اس نے زکام کی مثال دی کہ چھ دن میں چلا جاتا ہے لیکن علاج کرو تو سات آٹھ روز لگتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر نے زبردستی نسخہ لکھ کر نیچے بھیج دیا۔ شاید ہسپتال والے بھول گئے۔ چوتھے پانچویں روز جب دانے غائب ہونے لگے تو ڈاکٹر نے ارجنٹ پیغام بھیجا کہ "نسخے کی چیزیں اسی وقت روانہ کرو، کہیں مریض دوائی کے بغیر ہی تندرست ہو جائے

سینما کا مینیجر اپنے خسر کو چیک اپ کے لیے لایا۔
"ان کا اچھی طرح معائنہ کر کے طبی رائے دیجیے کہ کسی علاج کی ضرورت تو نہیں؟ اور یہ بھی کہ اگلی سردی یہاں گزاریں یا میدانوں میں؟ آپ کے دوستانہ مشورے سے ہم سب کی تسلی ہو جائے گی۔"
"پہلے یہ بتائیے کہ آپ کو دوستانہ مشورہ چاہیے یا طبی رائے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔
شیطان کہا کرتے کہ ڈاکٹر جیسے ہونہار نوجوانوں کی ہر ملک کو ضرورت ہے۔

ولایت میں پڑھا ہوا انجینیر اپنے علمی رجحان کی وجہ سے ہر وقت مستعد اور چوکس رہتا اس کی گھڑی درست وقت بتاتی۔ اس کا کیلنڈر بھی صحیح دن اور مہینہ دکھاتا۔ اس کی ٹیبل ڈائری پر آئندہ کے نہ صرف ضروری پروگرام درج ہوتے بلکہ غیر اہم اور نکمے لمحات کا بھی ذکر ملتا۔ مثلاً:
منگل ـ ـ ـ ـ آدھا دن بیکاری میں گزرے گا۔
بدھ ـ ـ ـ ـ سینما کے مینیجر کی دعوت پر روٹی کو سالن سے نہیں چاولوں سے لگا کر کھانا۔ سالن اور رائتے میں مرچیں بہت ہوں گی۔
جمعہ ـ ـ ـ ـ شام کو تکلف تکلف میں گھنٹہ بھر بیگار کرنی پڑے گی۔
سنیچر ـ ـ ـ ـ سہ پہر کے وقت خرافات سننے کے لیے تیار رہنا۔ وغیرہ وغیرہ۔
کبھی کبھی یوں لگتا جیسے اسے سارے جواب آتے ہیں، فقط سوالوں کا انتظار ہے۔
جس کسی کو مشکل پیش آتی سیدھا اس کے پاس جاتا۔ چھٹی سے واپسی میں دیر ہو جاتی تو بہانہ اس سے پوچھتے کہ اب وجہ کیا لکھیں؟ کسی کا قلم کھو جاتا تو اس کے پیچھے پڑ جاتا کہ کدھر گیا؟ اور کیسے تلاش کیا جائے؟ ملغوبہ کے منگیتر کو معمے حل کرنے کا شوق تھا۔ جب وہ مشکل الفاظ پر اٹک جاتا تو دوسرے پہاڑ سے فارم اسے پہنچاتا کہ مکمل کر کے خود بھیج دے۔ عمر کی تصدیق کے لیے مقصود گھوڑے سے میٹرک کا سرٹیفکیٹ مانگا گیا جو کبھی کا گم ہو چکا تھا۔ اس نے بھی انجینیر کا تعاقب کیا کہ تمھیں ضرور معلوم ہوگا کہ سرٹیفکیٹ کہاں ہو سکتا ہے؟ ورنہ پھر اب کیا کرنا چاہیے؟
بحث مباحثے سے وہ اکثر کتراتا۔ کسی نے کم گوئی پر اعتراض کیا تو بولا ـ ـ ـ ـ "دوسرے تمھارے بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں جتنا کہ تم خود انھیں بتاتے ہو اور پھر عقل مندوں کا کہنا ہے کہ جو کچھ مخالف کو معلوم نہیں اس کا ذکر واقف سے بھی مت کرو۔"
لیکن فلاسفر کا خیال تھا کہ "سن لینے اور اس پر غور میں کوئی ہرج نہیں۔ کی ہمیشہ تعریف کی گئی۔"
"مصیبت یہ ہے کہ اگر Mind کو ہر وقت Open رکھا جائے تو طرح طرح کے لوگ اس میں اوٹ پٹانگ مشورے پھینک جاتے ہیں ـ ـ ـ ـ لیٹر بکس کی طرح! اور مشورے جتنے

کم ہوں اتنا ہی بہتر ہے۔ بلکہ جو کچھ میں نے ابھی کہا ہے اسے بھی بے شک مت مانو۔"

کوئی کسی کی بار بار تعریف کرتا تو انجینیر پوچھتا۔۔۔۔ "موصوف سے اب تک کوئی کام پڑا؟ اس نے تمھیں کچھ کرنے کو کہا؟"

نفی میں سرہلانے پر بتایا۔۔۔۔ "تو ابھی تعریف ملتوی رکھو۔ کام پڑنے پر اصلی آزمائش ہوگی۔ اس سے پہلے سب عموماً ایک دوسرے سے اچھی طرح پیش آتے ہیں۔"

آداب محفل کا اسے ہمیشہ خیال رہتا۔ دعوتوں پارٹیوں کے اختتام سے ذرا دیر پہلے جانے کی اجازت مانگتا۔ کسی نے وجہ پوچھی تو اس نے انگلینڈ میں طالب علمی کے دنوں کا واقعہ سنایا۔ تب ایک نہایت مشہور کھلاڑی نے جس کی ہر جگہ مانگ تھی اسپورٹس چھوڑ دینے کا اعلان کیا۔ سب حیران ہوئے۔

انٹرویو میں جب یہ سوال کیا گیا کہ اب جب کہ وہ پورے عروج پر ہے کیا یہ فیصلہ قبل از وقت نہیں؟ اس پر کھلاڑی کا یہ مختصر سا جواب انجینیر کو اب تک یاد تھا۔

"عروج کی چہل پہل اور رونق کو اس وقت چھوڑنا بہتر ہے جب سب پوچھیں کہ جا کیوں رہے ہو؟ نہ کہ جب سب کہنے لگیں کہ یہ چلا کیوں نہیں جاتا۔"

ایسی پرسکون صبح کو کوئی گمان تک نہ کر سکتا کہ آج کچھ ہونے والا ہے۔

ناشتے پر فلاسفر مسکرا رہا تھا۔ رات اسے بیل اور دنیا والا خواب پر دکھائی دیا۔ انجینیر کو تسلی تھی کہ رپورٹ کے لیے آج کہیں سے بنے بنائے نقشے مل جائیں گے۔ کیمسٹ مسرور تھا کہ عن قریب اس کا روغنِ مونچھ پہنچ جائے گا جس میں مطلوبہ کیمیکل ہے۔ مقصود گھوڑا مقصود گھوڑے سے خوش تھا کہ دیوالی کی چھٹی کی وجہ سے آج اخبار نہیں آئے گا اور شیطان اس لیے مطمئن نظر آرہے تھے کہ بقیہ حضرات ناخوش نہیں تھے۔

انجینیر اور میں موٹر سائیکلوں پر نکلے۔ نقشے تو مل گئے لیکن پورا دن لگا۔ واپسی پر اندھیرا ہو چکا تھا۔ نچلے قصبے سے گزرتے ہوئے دیسی فلم کا اشتہار دیکھا جس پر بڑا اسا ڈیم بنا ہوا تھا۔ ایک کونے میں کئی ٹھوڑیوں والا گول مٹول مرد تھا، دوسری طرف لحیم و شحیم حسینہ اور ڈیم کے پیچھے ایک چھریرا سا نوجوان۔ انجینیر خوش ہوا کہ عرصے کے بعد ٹیکنیکل فلم لگی ہے۔ اس میں دریا کے پانی کو سٹور کرنے کے جدید طریقے دکھائے ہوں گے۔ میں نے بتایا کہ ابھی تک پہلا شو ختم نہیں ہوا، بھوک لگی ہوئی ہے اور پھر دیسی فلم میں کچھ پتہ نہیں کیا دکھائیں گے کیا نہیں لیکن اس کے اصرار پر سیکنڈ شو دیکھنا پڑا۔ دیر تک نہ کوئی دریا نظر آیا نہ ڈیم۔ مکالمے نارمل انداز میں بولنے کی بجائے اداکار چلا چلا کر تقریریں کر رہے تھے جیسے ابھی ووٹ مانگیں گے۔ سیدھے سادے معمولی واقعات کو توڑ مروڑ کر وہ بنا دیا جاتا جسے ٹریجیڈی کہا اور سمجھا جاتا ہے۔

ہنس ہنس کر انجینیر کا برا حال ہو گیا۔ آس پاس کے لوگ یوں گھورتے جیسے ہم ان کا مزہ

خراب کر رہے ہوں۔ کسی کی شکایت پر ہمارے ٹکٹ دوبارہ چیک کیے گئے کہ کہیں ہم پاس لے کر مفت تو نہیں آئے۔

آخر مبارک سین آیا جس کا انجینیر کو انتظار تھا۔ پردے پر ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا دکھائی دیا لیکن فوراً ہی پتھر تراشنے والوں نے ہتھوڑے وغیرہ پکڑ کر ناچنا شروع کر دیا۔ دوسری سمت سے لڑکیاں سمنٹ کی ننھی ننھی ٹوکریاں تھامے آئیں اور رقص میں شامل ہو گئیں۔ کسی قسم کی تعمیر کے بغیر ہی ہر ناچ کے بعد ڈیم خود بہ خود کچھ اور اونچا ہو جاتا۔ ہر بار وہ پلی ہوئی خاتون ایک نیا لباس پہن کر ہونٹ ہلاتی اور کسی مشہور گانے والی کے نغمے سنائی دیتے۔ وہ تہمد پوش پہلوان (ریٹائرڈ) جو ایا گاتا۔ کبھی کبھی تھرکتا بھی۔ اس کے ایک ناچ پر تو انجینیر گھبرا گیا کہ ایسی پرجوش اچھل کود اور کشش ثقل کا اثر ڈھیلے ڈھالے تہمد پر کسی وقت بھی پڑ سکتا ہے لیکن خیریت رہی اور رقص ختم ہوتے ہی انجینیر نے اطمینان کا سانس لیا۔ شاید اس نے دیسی فلمیں بہت کم دیکھی تھیں۔ تبھی اسے حیرت ہوئی کہ جو پھرتیلا نوجوان سب سے سمارٹ لگا وہ ولین نکلا، اور دونوں ہیوی ویٹ ہستیاں ہیرو ہیروئین ثابت ہوئیں۔ ان کی شادی پر اسے سچ مچ افسوس ہوا کہ اتنی مضحکہ خیز فلم کو آخر میں خواہ مخواہ ٹریجک بنا دیا۔

باہر نکلے اور آٹھ آٹھ آنے دے کر موٹر سائیکلیں وصول کیں۔ جنھیں ان کے سائز کے مطابق سائیکل اسٹینڈ میں رکھا گیا تھا۔ اگلے چوک کی روشنی میں دیکھا کہ ایک بھاری بھر کم آدمی کو پولیس کے دو سپاہیوں نے گھیر رکھا ہے۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے واویلا شروع کر دیا۔ پہلے سوچا کہ سیدھے نکل جائیں کیوں کہ موٹر سائیکلوں کا نیا ٹوکن ابھی تک نہیں لیا تھا لیکن یہ سپاہی ٹریفک کے نہیں بلکہ گشت لگانے والے نکلے۔ اس لیے ہم رک گئے۔

جوں جوں سپاہی آگے بڑھتے وہ بازو پھیلا کر کچھ بتاتا ہوا پیچھے ہٹتا جاتا۔ تاریک گوشے تک جا پہنچتے تو جیسے اباؤٹ ٹرن لے کر پوزیشن بدلتا۔ اس طرح کہ سپاہی ہر بار سیدھے چلتے اور وہ پسپا ہوتا۔ قریب گئے تو کانسٹبل اس سے پوچھ رہا تھا۔۔۔۔ "تم کہاں رہتے ہو؟ اور کیوں؟"

انھوں نے بتایا کہ یہ شخص مشکوک حالات میں آوارہ گردی کرتے ہوئے پایا گیا، اس لیے تفتیش کی جا رہی ہے۔ ادھر اس نے پائیں پائیں پائیں پائیں کی لے میں فریاد سی کی۔

ایسے سائز کے آدمی کی آواز اتنی نلپخت ہو، اس پر تعجب ہوا۔

چہرے کا اظہار بھی عجیب سا لگا۔ جیسے کسی تیکھے چالاک اچکے کا سر ایک سن رسیدہ بے ہنگم جسم پر رکھ دیا گیا ہو۔ اس نے ہماری طرف دیکھ کر ہیلو کہا اور عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے دو تین دفعہ ہنسنے کی کوشش کی۔

یہ ہنسی بھی کچھ اور طرح کی تھی۔ نہ یہ قہقہہ تھا نہ قہقہے سے ملتی جلتی کوئی اور صدا۔ بلکہ ۔۔۔۔ کھی کھی کھی ہی ہاپ ۔۔۔۔ کی سی تیز آواز جو بالکل بناوٹی معلوم ہوتی تھی۔

"پہلے خوشامد سی کر رہے تھے۔ ان صاحبان کے آتے ہی لہجہ بدل گیا۔" کانسٹبل بولا۔ "اچھا اب جلدی سے بتادو کہ اتنی رات گئے اندھیرے راستوں میں کیا کر رہے تھے؟"

"اس پر پھر میں میاؤں میاؤں کی سی آوازیں آئیں جن کا لب لباب یہ تھا کہ ہر شخص کو ہر جگہ چلنے پھرنے کی آزادی ہے، خواہ دن ہو یا رات۔

"یہ پوچھ گچھ اس لیے کرنی پڑتی ہے کہ کہیں چور آجائیں، کوئی اور واردات ہو، تو سب پولیس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ پہرہ کیوں نہیں دیا۔"

اس پر کچھ یاؤں یاؤں سی ہوئی۔ پھر سپاہیوں نے کچھ کہا۔ آخر انجینیر آگے بڑھ کر بولا "اس کے وزن اور تن و توش کو دیکھ کر یقین آجانا چاہیے کہ اس قسم کا شخص کوشش کے باوجود بھی آوارہ گردی نہیں کر سکتا۔" میں نے بھی تائید کی آوارہ گردی کے لیے بھی کئی خوبیوں کی ضرورت ہے۔ ایسے حلیے کے آدمی اور جو چاہیں کر لیں لیکن آوارہ گردی کی شرائط پر پورے نہیں اترتے۔

اس پر کانسٹبل نے فیصلہ سنایا۔ "کافی دیر ہو چکی ہے اور یہ دونوں تمھاری ضمانت دینے کو تیار ہیں (ہم بالکل تیار نہیں تھے)۔ اس لیے مشکوک صاحب تم جا سکتے ہو۔ لیکن سورج ڈوبنے کے بعد اس طرف کبھی نظر مت آنا۔ بلکہ دن کو بھی نہ دکھائی دینا۔"

غلط نام لیے جانے پر اس نے احتجاج کیا، اپنا نام بھی دوہرایا لیکن سپاہی جا چکے تھے۔

معلوم ہوا کہ وہ ڈیڑھ دو میل دور ڈیری فارم میں مقیم ہے۔ یہاں کے مشہور حلوائی نے اسے اور اس کے دوست کو رات کے کھانے پر بلایا تھا لیکن میزبان کے دروازے پر قفل دیکھ کر شبہہ ہوا کہ شاید تاریخ یاد نہیں رہی۔ اس کا دوست سواری کی تلاش میں نکلا کہ اتنے میں سپاہی آگئے۔

ہم نے باری باری اسے ساتھ بٹھانے کی کوشش کی لیکن ٹاپ گیئر میں بھی موٹر سائیکل تھوڑی دور جاکر پھٹ پھٹ کر کے رک جاتی۔ بڑی مشکل سے اسے رخصت کیا اور آدھی رات کے بعد کیمپ پہنچے۔ اگلے سہ پہر کو کیا دیکھتے ہیں کہ کینٹین کی لاری سامنے رکی اور وہی شخص اترا۔ آتے ہی بتانے لگا کہ کس طرح ادھر ادھر سے پتہ پوچھ کر پہنچا ہے اور آئندہ بھی آیا کرے گا۔

بعد میں اسے کئی ناموں سے یاد کیا گیا لیکن جو نام سپاہیوں نے دیا تھا وہی مقبول رہا۔ سب کی رائے میں مشکوک ہی وہ جامع لفظ تھا جو اس کی خصوصیتوں کو بہ خوبی اجاگر کرتا تھا۔

دراصل شروع شروع میں خصوصیتیں اچھی طرح معلوم نہیں تھیں ورنہ ضرور کوئی تدارک کرتے۔

محبت کے معاملے میں مقصود گھوڑے کے ریکارڈ کو تسلی بخش تو نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن یہ Nil Report سے قدرے بہتر تھا۔

اس کارومانی کیریر کچھ یوں تھا۔۔۔۔

جب وہ ایف۔ ایس سی کے پہلے سال میں تھا تو شاید محض تجسس کے سلسلے میں پہلی مرتبہ محبت سے آشنا ہوا۔ یا یہ کہ محبت اس سے آشنا ہوئی۔ جس لڑکی سے وہ مرعوب ہوا تھا اس کا نام عظمت جہاں تھا (دراصل وہ مرعوب زیادہ ہوا تھا اور عاشق کم)۔

اپنے جیب خرچ سے روپے بچا کر لڑکی کے لیے رومالوں، جرابوں اور خوش بوؤں کا پیکٹ تیار کیا۔ اسے رنگین کاغذ میں لپیٹ کر چمکیلا ربن باندھا اور کئی دن یہی سوچتا رہا کہ پیکٹ پر کیا لکھے۔ پھر لائبریری سے خط و کتابت کے فن پر پتہ نہیں کب کی چھپی ہوئی کتاب اٹھالایا اور اس کا سرسری طور پر مطالعہ کر کے کچھ اس قسم کی عبارت لکھی:

بے مایہ، ناچیز، مقصود عفی عنہ، کا تحفہ، حقیر، بہ صد عقیدت و احترام، بہ خدمت عظمت من!

گر قبول افتد زہے عزو شرف!

لڑکی کانونٹ میں پڑھتی تھی۔ ایسا رنگ برنگا پیکٹ دیکھ کر پہلے تو اسے فادر کرسمس کا خیال آیا اور بہت خوش ہوئی لیکن کرسمس میں ابھی کئی مہینے رہتے تھے۔ جب عبارت پڑھنے کی کوشش کی تو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ یہی اندازہ لگا سکی کہ پیکٹ غلطی سے ادھر آگیا ہے اور غالباً پڑوس کے الحاج شیخ عظمت اللہ کنٹریکٹر و جنرل مرچینٹ کے لیے ہو گا چناں چہ ان کی دکان پر بھیج دیا۔ عظمت اللہ اس وقت مصروف تھا۔ جلدی میں یہ سمجھے کہ کسی گاہک نے خریدی ہوئی چیزیں واپس کی ہیں، لہٰذا اپنے منیم کے حوالے کر دیا۔ منیم نے پیکٹ کے ساتھ وہی سلوک کیا جو منیم کیا کرتے ہیں۔

جب مقصود گھوڑے کو عرصے تک تحفے کی رسید نہ ملی تو وہ خاموش ہو گیا۔

سیکنڈ ایر میں پہنچ کر ایک اور لڑکی سے دل چسپی ہوئی۔ اتفاق سے لڑکی کو موتیا اور چنبیلی کے پھولوں سے شدید الرجی ہو جاتی تھی لیکن الرجی کا علم نہیں تھا۔ ادھر مقصود گھوڑا سر کے بال گھنے کرنے کے لیے روغن چنبیلی درجۂ اول اور موتیا ہیر آئیل درجہ، خاص (درجہ، اول اور درجہ، خاص میں پتہ نہیں کیا فرق ہوتا ہے) کی دبادب مالش کیا کرتا۔ چناں چہ جب کبھی سر راہے ان کی ملاقات ہوتی تو لڑکی کا چھینک چھینک کر برا حال ہو جاتا۔ بار بار "معاف کیجیے" الگ کہنا پڑتا اور بیش تر چھینکیں سیدھی مقصود گھوڑے کے اوپر آتیں۔ بعد میں کئی دن کھانستی رہتی اور کبھی کبھی حرارت بھی ہو جاتی۔

شروع شروع میں محبت اور الرجی دونوں برابر رہے۔ پھر الرجی نے محبت پر غلبہ پالیا اور آہستہ آہستہ ملاقاتیں ختم ہو گئیں۔

بی۔ ایس سی میں داخل ہوتے ہی وہ ایک نئی لڑکی پر فریفتہ ہوا جو اسے کچھ زیادہ ہی حسین

وجمیل معلوم ہوئی (اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ لڑکی کے چچا انگلینڈ میں تھے اور بھتیجی کے لیے میک اپ کا اعلیٰ ترین سامان بھیجا کرتے۔ لڑکی بھی مغربی ممالک کا چکر لگا چکی تھی، تبھی اس کا رویہ مقصود گھوڑے یا کسی اور لڑکے کے لیے ---- گاؤ آمد و خر رفت ---- قسم کا تھا)۔

لمبی چھٹیاں تھیں اور مقصود گھوڑے کو فرصت ہی فرصت تھی۔ لہٰذا اس مستعدی اور تن دہی سے تعاقب کیا کہ لڑکی کو مجبوراً ہینڈز اپ کرنے پڑے اور اس کے کنبے والوں نے مقصود گھوڑے کو چائے کا دعوت نامہ بھیجا۔ ڈاکیہ وہ لفافہ اس کے کمرے میں پھینک گیا لیکن اتفاق سے ان دنوں وہ کسی پیر صاحب کو تسخیرِ حب کے سلسلے میں اکاون روپے، ایک تھان اور مٹھائی کی ٹوکری پیش کرکے ان کا تیر بہ ہدف چلّہ کر رہا تھا۔ جب یہ طویل عمل ختم ہوا تب خطوط پڑھنے کی مہلت مل سکی۔ دعوت نامہ دیکھتے ہی اسی وقت لڑکی کے مکان کی طرف ایسا سرپٹ بھاگا کہ بڑی سڑک چھوڑ کر شارٹ کٹ کی تلاش میں ایک ایسی گلی میں ہو لیا جس میں مخالف سمت سے ایک جلوس آرہا تھا۔ یہ احتجاجی اینٹوں، پتھروں اور ریت کی قیمتوں کے کم ہو جانے یا شاید زیادہ ہو جانے پر نکلا تھا۔ حسبِ معمول اس میں زیادہ لوگ ایسے تھے جنھیں نہ احتجاج کی وجہ کا علم تھا اور نہ جلوس کے متعلق کچھ پتہ تھا کہ یہ کون ہیں؟ کہاں جارہے ہیں؟ اور اگر وہاں پہنچ گئے تو کیا کریں گے؟ چوں کہ سہ پہر کے بعد بیشتر لوگوں کو کوئی خاص کام نہیں ہوتا اور کھیلوں اور ورزش سے کوئی خاص دل چسپی نہیں، لہٰذا اسی کو تفریح سمجھ کر نکل کھڑے ہوئے تھے۔

مقصود گھوڑے کو زبردستی کے دھکوں اور دھینگا مشتی کی وجہ سے نہ صرف جلوس میں شامل ہونا پڑا بلکہ مجبوراً طرح طرح کے غیر فہم اور اوٹ پٹانگ نعرے بھی لگانے پڑے اور جیب کتروں کے ڈر سے دونوں ہاتھ جیبوں میں رکھنے پڑے۔

جلوس کسی زخمی سانپ کی طرح دیر تک دائیں بائیں، آگے پیچھے، ہر سمت میں رواں دواں رہا لیکن جب نہ تو اتنا سا لاٹھی چارج ہوا، نہ کوئی اخبار والا کسی کا بیان لیتے دیکھا گیا، یہاں تک کہ فوٹو بھی نہیں اترے، تو مایوس ہو کر پہلے رفتار آہستہ کی پھر منتشر ہو گیا۔ رات کے دس بج چکے تھے اور مقصود گھوڑے کی قمیض بھی پھٹ چکی تھی۔ اس لیے اسے واپس جانا پڑا۔ اتفاق سے اس روز تھانیدار صاحب کوئی خاص ہفتہ جو خوش لباسی، خوش فہمی یا شاید خوش خوراکی سے متعلق تھا، منانے میں مصروف تھے۔ ادھر اخباروں کے رپورٹر اور فوٹوگرافر ریلوے سٹیشن پر جمع تھے کیوں کہ کسی مشہور ایکٹرس کی آمد آمد تھی، جس کی ٹرین اس لیے لیٹ تھی کہ ریلوے میں پابندیِ وقت کا ہفتہ منایا جارہا تھا۔

اگلے دن جو وہ ملاقات کے لیے پہنچا تو دیکھا کہ ہجوم کے جوش و خروش سے محبوبہ کے مکان کو کافی نقصان پہنچ چکا ہے۔ دروازوں، کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے ہیں اور ہونے والے خسر کا موڈ بالکل آف ہے، بلکہ انھیں کچھ شبہ سا بھی ہے کہ مقصود گھوڑا اس پتھراؤ میں شامل تھا۔ تبھی

نقصان کا اندازہ لگانے آیا ہے (اپنے سادے سے لباس میں مقصود گھوڑا کچھ کچھ پرولتاری سا لگتا تھا ویسے وہ بالکل مرنجان ومرنج ہے۔ اگرچہ اسے مرنجان ومرنج کے نہ ہجے آتے ہیں نہ معنے)۔

بی۔ ایس سی پاس کر کے وہ پھر عاشق ہوا۔ محبوب نے مشرقی روایات کے مطابق ہدایت کی کہ مجھ سے اظہارِ محبت کرنے کی بجائے روئے سخن قبلہ والد صاحب کی جانب ہو تو زیادہ بہتر ہوگا۔

لڑکی مقامی ہوسٹل میں رہتی تھی لیکن اس کے والدین پانچ چھ سو میل دور تھے۔ وہ اس سلسلے میں کوئی پروگرام بنا ہی رہا تھا کہ کہیں کسی ملک کی حکومت کا تختہ الٹ گیا۔

مقصود گھوڑے کو بین الاقوامی حالات کا زیادہ علم نہیں ہے اور نہ مقامی سیاست کا۔ مثلاً جب وہ تختہ لٹنے کے بارے میں سنتا ہے تو اس کے تخیل میں کچھ ایسا نظارہ آتا ہے۔ جیسے کوئی حکمران گرمیوں میں تہمد باندھے ہوئے بالٹی سے پانی نکال کر مزے سے نہا رہا ہو کہ دفعتہً کوئی حریف اس کے پاؤں تلے سے لکڑی کا تختہ کھینچ لے اور نہانے والا اپنا توازن قائم نہ رکھ سکے۔

جیسے کہ دیکھنے میں آیا ہے، تختہ کہیں الٹتا ہے اور ہڑتالیں کہیں ہوتی ہیں۔ چناں چہ اس خبر سے بلا کسی وجہ کے ایک ہڑتال شروع ہوئی۔ پھر دوسری پھر تیسری۔ یہ سلسلہ مہینوں جاری رہا۔ حتیٰ کہ جب ہڑتالوں کے ختم ہونے کا آفیشل اعلان ہوا تب بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔

مقصود گھوڑے کو اخباروں کی ہڑتال پر خاص مسرت ہوتی۔ جب کبھی وہ یہ سطر پڑھتا ---- آج کی تعطیل کی وجہ سے کل اخبار نہیں چھپے گا ---- تو اس کا جی چاہتا کہ فوراً ایڈیٹر کو ٹیلیفون پر شاباش دے۔ اور جب کسی احتجاج کے سلسلے میں اخبارات بند ہو جاتے تو اس کی یہ خواہش ہوتی کہ باری باری سب کو مبارک باد دے۔ ویسے بھی دوپہر سے پہلے کسی اخبار کو پڑھنا تو ایک طرف رہا وہ اسے ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ اسے یقین ہے کہ کوئی نہایت اہم خبر ہوئی تو کہیں نہ کہیں سے اس تک بائی بھی پہنچ جائے گی۔ لہٰذا علی الصبح جب چمکیلا امید افزا دن طلوع ہوتا ہے تو اخبار خریدنے اور اسے پڑھ کر خواہ مخواہ اپنا ناشتہ اور موڈ خراب کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ دوپہر یا سہ پہر کے بعد وہ اخبار کھولتا۔ پہلے کرکٹ کا اسکور، ہاکی، فٹبال وغیرہ کی ہار جیت پڑھتا۔ اس کے بعد سینما کے اشتہار دیکھتا اور پھر جلدی سے پہلے اور آخری صفحوں کی سرخیاں سونگھ کر اخبار بند کر دیتا۔ دوپہر سے پہلے اگر کوئی زبردستی اسے اخبار پڑھنے کو کہتا تو اس کا پہلا سوال یہ ہوتا ---- "سب سے منحوس خبر کون سی ہے؟" اور دوسرا یہ کہ ---- "چیدہ چیدہ بھیانک خبریں تم ہی کیوں نہیں سنا دیتے؟"

لیکن اس کی یہ خوشی عارضی تھی۔ کیوں کہ جب ریلوے، ٹیلیفون، ٹیلیگراف، بسوں وغیرہ کی ہڑتالیں شروع ہوئیں تو نہ وہ خود پہنچ سکا اور نہ پیغام بھجوا سکا۔ اس کی طویل خاموشی پر وہ بدگمان ہو گئے اور جب گرمی بڑھی تو اپنی کار میں پہاڑ پر چلے گئے ---- مقصود گھوڑے کو بتائے

بغیر۔

ہڑتالوں کے اثرات مکمل طور پر زائل ہونے تک وہ ایم۔ایس سی میں داخل ہو چکا تھا اور سینیر ہو کر بی۔ایس سی کے زمانے کی لڑکی کو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

لیکن اس مرتبہ پھر:

اک بے وفا سے چاہ کیے جارہا ہوں میں

اور یوں ہی خواہ مخواہ کیے جارہا ہوں میں

کی قسم کا عشق مسلط ہو گیا کیوں کہ لڑکی نے روزِ اول سے کسی قسم کے بھی مذاکرات سے قطعاً انکار کر دیا تھا۔ اچانک انفلوئنزا پھیل گیا۔ لڑکی بیمار ہوئی پھر اس کے کنبے والے یہاں تک کہ پڑوسی تک صاحبِ فراش (صاحبِ فراش کے معنے جو کچھ بھی ہوتے ہیں) ہوگئے۔ مقصود گھوڑا اس مرتبہ نہایت سنجیدہ تھا اور لڑکی کے بزرگوں پر ڈورے ڈالنے پر تلا ہوا تھا۔ پھر کسی نے ڈرا دیا کہ انفلوئنزا کھانسنے، چھینکنے، یہاں تک کہ باتیں کرنے سے بھی فوراً لگ جاتا ہے۔

چند ہفتوں کے بعد جب وہ فائنل امتحان کی تیاری کر رہا تھا تو لڑکی کے دل میں (غالباً انفلوئنزا کے مضر اثرات کی وجہ سے) ترس پیدا ہوا اور وہ خود ملتفت ہوئی۔ مگر تب تک مقصود گھوڑا بدک چکا تھا۔ تاہم اس کے رومانی کیریر میں یہ پہلا موقع تھا۔ جب اس کا اسکور One All یعنی ۱-۱ رہا۔ ایم۔ایس سی پاس کر کے اسے نوکری تلاش کرنی پڑی۔ جو اس نے اپنے مخصوص انداز میں کی ---- اس طرح جیسے ڈر رہا ہو کہ کہیں سچ مچ ملازمت نہ کرنی پڑ جائے۔ ساتھ ساتھ وہ ایک نئی لڑکی کے متعلق بھی سوچ رہا تھا۔ جیسے کہ بار بار ہوتا ہے پہلے تو خشک سالی کے ڈر سے بارش کا بے صبری سے انتظار کیا جاتا ہے۔ برسات کے لیے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ پھر دھما دھم وہ مینھ برستا ہے کہ چاروں طرف جل تھل ہو جاتا ہے۔ دریاؤں میں ایسا سیلاب آتا ہے جو ختم ہو نہیں ہوتا اور دافعِ سیلاب دعائیں شروع ہو جاتی ہیں۔ چناں چہ ان دنوں ہر ایک کی توجہ طغیانی کی طرف تھی۔ اسی لیے اس کے رومانی پروگرام کا کوئی نوٹس نہ لیا گیا۔

اس کے بعد ایک طویل وقفہ آیا جس میں اسے بار بار یہ کہتے سنا گیا کہ جب کبھی کسی ایسی لڑکی سے ملاقات ہوتی ہے جو اچھی بیوی بن سکے تو اتفاق سے وہ پہلے ہی بیوی ہوتی ہے۔

جب گھر والوں نے ڈانٹ ڈپٹ کی تو مجبوراً ملازمت کرنی پڑی۔ جہاں پہلی پوسٹنگ ہوئی وہاں ایک غیر ملکی دوشیزہ پر (جو اس قدر تن درست و توانا تھی کہ مقصود گھوڑے کے ساتھی اسے چہار شیزہ کہا کرتے) فریفتہ ہو گیا۔ لڑکی کا رویہ بالکل مغربی تھا۔ یعنی نہ تو اسے مقصود گھوڑے کا کوئی خاص اشتیاق تھا اور نہ اس سے ملنے میں کوئی اعتراض لیکن وہ اس پر لٹو ہو چکا تھا۔ فوراً شادی کی اجازت کے لیے اپنے گھر ارجنٹ خط لکھا۔ پیش تر اس کے کہ وہاں سے جھاڑ موصول ہوتی ایک واقعہ پیش آیا جو اس کے لیے عجیب تھا۔

جب وہ غیر ملکی لڑکی کو موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بٹھا کر دس پندرہ میل دور ایک مشہور غیر ملکی فلم دکھانے لے جا رہا تھا تو روانہ ہونے سے پہلے اس نے لڑکی کے خوش نما لباس، سہانی خوش بو اور مسکراہٹ کی تعریف کی۔ دیر سے چلے تھے اس لیے موٹر سائیکل تیز دوڑانی پڑی۔

راستہ طے کر کے سینما پہنچا تو دیکھتا کیا ہے کہ پچھلی سیٹ خالی تھی۔

پہلے تو اسے حیرت ہوئی کہ لڑکی بغیر اجازت کے کیوں اتر گئی۔ پھر اس حرکت کو بے مروتی سے منسوب کیا۔ راستہ ناہموار اور پے چیدہ تھا۔ تیز ہوا بھی چل رہی تھی لیکن پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکی کس جگہ یوں چپ چاپ اتر گئی؟ اس کے لیے یہ راز ہی رہا۔

وہ مزید چیکنگ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ دوسرے یا تیسرے روز اس کا فوری تبادلہ ہو گیا۔ اب تک جو کچھ ہوا وہ میدانی علاقوں میں پیش آیا تھا۔۔۔۔۔

پھر دفعتہً سطح سمندر سے تقریباً ساڑھے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر اس نے نحیفہ کو دیکھا چوں کہ مسرور مقصود گھوڑے اور اداس مقصود گھوڑے کی صورت میں انیس بیس کا بھی فرق نہیں ہوتا اس لیے یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ وہ نحیفہ کو دیکھ کر خوش ہوا یا نہیں۔ البتہ یہ آمنا سامنا جس ماحول میں ہوا وہ کچھ ایسا تھا کہ اگر مقصود گھوڑے کی مونچھیں ہوتیں تو وہ ضرور انھیں تاؤ دیتا۔

نحیفہ کا اصلی نام حنیفہ یا کچھ اسی قسم کا تھا لیکن دھان پان ہونے کی وجہ سے سب نحیفہ کہتے اس کا چہرہ چھوٹا سا تھا لیکن خدوخال کافی بڑے بڑے تھے۔

اجاڑ کیمپ کی تنہائی اور کیمپ والوں کی شولری کے باوجود اسے چوبیس پچیس سے زیادہ نمبر نہیں مل سکتے تھے۔ یعنی تھرڈ ڈویژن میں پاس کرانے والے تینتیس فیصد نمبروں سے بھی کم۔ سنا تھا کہ وہ کسی کو بھلانے کے سلسلے میں اپنے عزیزوں کے ساتھ پہاڑ پر آئی تھی اور اس بے وفا (یا شاید باوفا) کو بھلانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ بلکہ اوروں کو بھی بھلانے میں منہمک تھی۔

یہ بھی سنا تھا کہ ایم۔ اے لٹریچر میں اس کا کمپارٹمنٹ آیا ہے اور وہ اپنے ساتھ کہیں زیادہ وزنی کتابیں ساتھ لائی ہے۔ اس نے یہ بھی مشہور کر رکھا تھا کہ لٹریچر کی خدمت اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ لیکن شیطان کا خیال تھا کہ وہ لٹریچر کی سب سے زیادہ خدمت اس طرح کر سکتی ہے کہ لٹریچر کو اس کے حال پر چھوڑ دے۔

ویسے جتنے لڑکے وہاں تھے ان میں نحیفہ نے فقط مقصود گھوڑے کا نوٹس لیا۔ شاید اس کے چہرے کے اظہار کی وجہ سے کیوں کہ کافی دنوں سے وہ ایسی پر سکون، شائستہ اور جامد زندگی گزار رہا تھا جیسے کہ چڑیا گھر میں تنہا اود بلاؤ یا اکیلا زیبرا۔

مقصود گھوڑے نے پہلا کام یہ کیا کہ فوراً درخواست بھیجی جس میں لکھا کہ ایک ہی مقام

پر تیس برس کی معیاد پوری کر چکا ہوں جس کے بعد عموماً تبادلہ ہو جاتا ہے۔ ذاتی حالات کی بنا پر التماس ہے کہ خاک سار کو میدانوں سے اس پہاڑی کیمپ میں بھیج دیا جائے۔ یہاں جو شخص تعینات ہے وہ بھی تین سال پورے کر چکا ہے اور میدانوں کا خواہش مند ہے۔ نیز یہ کہ فدوی یہاں خوش رہے گا اس لیے خوب دل لگا کر کام کرے گا۔

اوپر سے وہی ٹکسالی جواب آیا کہ درخواست پر پوری ہم دردی سے غور کیا گیا لیکن افسوس ہے کہ سروس کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ کو فی الحال موجودہ جگہ سے نہیں بلایا جاسکتا۔ بہ ہر حال آپ کی خواہش کو نوٹ کر لیا گیا۔

سینما کا مینیجر جو دفتروں میں کئی برس ملازمت کر چکا تھا، اس کے مشورے پر نئی درخواست ٹائپ کی گئی جس میں یوں ظاہر کیا جیسے پہلی عرضی کا ابھی تک جواب نہیں ملا۔ اس دفعہ یہ لکھا کہ امیدوار جواب کا منتظر ہے۔ لیکن جن حالات کے تحت تبادلے کی التجا کی گئی تھی اتفاق سے وہ بالکل بدل چکے ہیں۔ دوست یہاں سے چلے گئے، عزیزوں سے غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں، لہٰذا اب پہاڑی کیمپ سے کوئی دل چسپی نہیں رہی بلکہ جہاں متعین ہوں خوش نصیبی سے وہاں کچھ زمین مل گئی ہے، جس پر مکان بنانے کا ارادہ ہے۔ لہٰذا پہلی درخواست کو منسوخ سمجھا جائے اور ازراہِ کرم مجھے ابھی نہ بلایا جائے۔

اس پر فوراً تبادلہ ہو گیا۔

تیس اکتیس سیر پہلے کا ذکر ہے کہ ملغوبہ خوب صورت تھی۔ اتنی کہ کسی کمرے میں ہوتی تو برآمدے بلکہ صحن تک حسن کی تمازت پہنچتی لیکن اب بس روایتی محمل نشینوں والی دل آویزی رہ گئی تھی ---- یعنی فقط پردے سے جھانکتا ہوا چہرہ عیاں لگتا یا اگر پانچ فٹ اونچی دیوار یا جھاڑی کے پیچھے کھڑی ہو، جھروکے سے باہر دیکھ رہی ہو یا اونچی سی میز کی آڑ میں بیٹھی ہو تب ---- ورنہ سالم ملغوبہ کو دیکھ لینے سے چہرے کے حسن پر وہی اثر پڑتا جو بہ قول کیمسٹ تیزاب اور الکلی کا ایک دوسرے پر ہوا کرتا ہے۔

اب اس کا وزن (میک اپ سمیت) تقریباً ڈھائی من پختہ تھا۔

تہمیدہ کہا کرتی کہ سترہ سالہ ملغوبہ پچیس چھبیس برس پہلے پیدا ہوئی تھی۔ کبھی کبھی یوں لگتا جیسے اس کی دو عمریں ہوں ---- ایک تو ہر وقت بنے سنورے تر و تازہ چہرے کی بہ ظاہر کم سنی اور دوسری تن و توش اور جسامت کی پختہ سالی۔

شاید اس میں ملغوبہ کا بھی قصور نہیں تھا۔ مشرق میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ حسن و جمال رخِ روشن تک ہی محدود ہے (جسم اور جثہ خواہ کیسا بھی ہو)۔ حالاں کہ صبح شام گھنٹوں میک اپ کرنے کے ساتھ ساتھ روزانہ تیس چالیس منٹ ورزش بھی کر لی جائے تو مجموعی جاذبیت اور بہتر

ہو سکتی ہے۔ مگر اس کا ابھی تک رواج نہیں ہوا۔
جب وہ آئینے کے سامنے آرائش میں مصروف ہوتی تو طرح طرح کے خیالات آتے۔ کبھی یہ سمجھتی کہ وہ نہایت عظیم آرٹسٹ ہے جسے اب تک کسی نے نہیں پہچانا۔ یقین سا ہو تا کہ کسی راج دھانی کی اکلوتی وارث ہے جسے جیتنے کے لیے کئی بانکے البیلے سورما آپس میں لڑ رہے ہیں۔ بعض اوقات اپنے آپ کو اس قدر ہلکی پھلکی محسوس کرتی کہ فضاؤں میں پرواز کرنے لگتی حتیٰ کہ چاند تاروں کو چھو کر وہیں نور کا ہیولیٰ بن جاتی۔ تو کسی روز یوں لگتا جیسے شفقت اور دردمندی کا پیکر بن گئی ہو کہ غم زدوں کی دل جوئی کر سکے۔ انھیں نت نئی امیدوں کا تحفہ بخشے ------ وغیرہ وغیرہ

دن دھاڑے دیکھے ہوئے اس قسم کے خواب جب اوروں تک پہنچتے تو وہ انھیں مسلسل بے کاری سے منسوب کرتے یا خوش خوراکی سے۔
یوں بھی ملغوبہ کی ذہانت پر کسی کو خوش فہمی نہیں تھی۔ شیطان کہا کرتے کہ اگر اس کا آئی۔ کیو ٹسٹ کیا جائے تو وہ نقطہ انجماد سے بھی نیچے ہو گا۔ بلکہ ایک ہی سانس میں یہ دونوں نام لینا سراسر زیادتی ہے ----آئی کیو کے ساتھ۔
کیمسٹ کے خیال میں ملغوبہ کو حسین بننے کے لیے اب تقریباً سوا ڈیڑھ گھنٹہ لگتا ہو گا۔
انجنیر بتاتا کہ ملغوبہ کو آسانی سے، یا مشکل سے بھی، کسی سے محبت نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ وہ پہلے ہی دل و جان سے فریفتہ ہو چکی ہے ---- اپنے آپ پر۔ ہر حسین تصور، ہر خوش نما شے، ہر دل کش نظارہ اسے فقط ایک چیز کی یاد دلاتا ہے ---- خود اپنی! اور ایسی الفت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کسی رقیب سے واسطہ نہیں پڑتا۔ ویسے بھی خود پسندوں کو محبت وغیرہ کے لیے بہت کم فرصت ملتی ہے۔ واقعی ملغوبہ کو عشق وشق کی جھنجھٹ سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ اگر کبھی کبھار اس قسم کے معاملات میں زبردستی شامل ہونا پڑتا تو ذرا دیر کے لیے بہ طور آبزرور شریک ہو جاتی۔
لیکن اسے پختہ یقین تھا کہ آج تک پندرہ سال سے پینسٹھ تک کے جس مرد نے بھی اس کی جھلک دیکھی ہے وہ فوراً عاشق ہو گیا ہو گا۔
سوشل بننے کے سلسلے میں ہر تیسرے چوتھے ہفتے اس کے ہاں نہایت پر تکلف تقریب ہوتی۔ ان عمدہ دعوتوں کی شہرت ساری وادی بلکہ گرد و نواح میں بھی پھیل چکی تھی۔ اتنی کہ جب بھی وہ بیس اکیس مہمانوں کو بلاتی تو ان میں سے تیس پینتیس ہمیشہ پہنچ جاتے۔
یوں تو اس کے سارے رشتے داروں کو مزے دار کھانوں کا شوق تھا لیکن وہ خود اس میں سپیشلسٹ بلکہ Consultant کا رتبہ حاصل کر چکی تھی۔ اس کی تقریبوں پر طرح طرح کے لوگ آتے جن سے مل کر کبھی خوشی ہوتی کبھی حیرت، کہ ایسے دور دراز خاموش سے علاقے میں

انکم ٹیکس ایڈوائیزر بھی پائے جاتے ہیں۔ ادبی نقاد، طبلہ نواز، امپورٹ ایکسپورٹ کے ماہر بھی اور ریڈیو سنگر، آنریری مجسٹریٹ، پولٹری فارم والے بھی۔ اس رنگ برنگی برادری میں کوئی چیز مشترک تھی تو وہ لذیذ غذاؤں کا شوق۔ ملغوبہ جب یخنی یا زردے کی کھرچن اور بالائی وغیرہ منگوانے کچن میں جاتی تو کیمسٹ بتاتا کہ دنیا میں بھوک کو ہر کام پر فوقیت ہے۔ سارے جاندار وں کی اہم ترین طلب فقط ایک ہے۔ کھانے کی لگن! عشق، محبت اور دیگر باتیں بعد میں سوجھتی ہیں۔ تبھی پچھلی صدی کی یورپین مائیں بیٹیوں کو کامیاب شادی شدہ زندگی کے لیے فقط ایک گر بتایا کرتیں۔ رخصتی پر دلہن کے کان میں کہا جاتا کہ "Feed the Brute "

اندھیرے میں ملغوبہ کے ڈنر پر جاتے ہوئے جہاں یکایک یارڈلے کی خوش بو اور تازہ بھنگار کی مہک آتی یا، شمامۃ العنبر اور مچھلی تلنے کے جھونکے، تو ہم فوراً چست ہو جاتے کہ منزل بالکل قریب ہے۔ پھر یہ خوش بوئیں آپس میں مدغم ہو جاتیں اور یہ پتہ چلانا مشکل ہو جاتا کہ اس وقت ملغوبہ میک اپ کر رہی ہے یا باورچی خانے میں نگرانی۔

اسی طرح جب وہ کچن سے آتی تو فضا میں گشتابوں، قتلموں کی مہک پھیل جاتی اور جب کچھ کہنے کے لیے واپس لوٹتی تو فرانسیسی لیونڈر کی نکہت سے کمرہ معطر ہو جاتا۔ بعد میں تو یہ بھی معلوم نہ ہو سکتا کہ کوئی بھینی بھینی نفیس خوش بو دراصل کہاں سے آرہی ہے ---- ملغوبہ سے؟ یا ڈونگوں اور پلیٹوں سے؟

آہستہ آہستہ اس کے نستعلیق میک اپ، خوش پوشاکی اور عمدہ کھانوں کا اثر روزمرہ کی گفتگو پر بھی پڑنے لگا۔

پہاڑ کی سخت چڑھائی کے بعد بھوکے کیمسٹ نے جب موڑ پر چودھویں کا چاند دیکھا تو اسے تلا ہوا انڈا یاد آیا اور فلاسفر نے کسی دوست کے ناکام رومان کی داستان یوں ختم کی ----
"قصہ مختصر، وہ حسینہ میرے ساتھی کی زندگی میں قنوج کے مخمور کن عطر نرگس کی طرح آئی۔ اس کی کشش اعلیٰ درجے کے نرگسی کوفتوں سے کم نہ تھی۔ پھر حالات نے ایک دم پلٹا کھایا اور جیسے عطر اڑ گیا۔ کوفتے بکھر گئے۔"

ایک دن شیطان نے مقصود گھوڑے کی صحت (یعنی صحت کی کمی) پر نکتہ چینی کی ----
" دن بدن دبلے ہوتے جا رہے ہو۔ بھورے لباس میں کچھ Hunter.s Beef سے لگتے ہو اور پیلے کپڑوں میں پاپڑ کا گمان ہوتا ہے۔"

یہاں تک کہ ملغوبہ کی تعریف بھی اسی انداز میں کی جاتی ----

" یہ لباس تو خوب جچ رہا ہے۔" شیطان کہتے " خصوصاً قمیض کا ڈیزائن ---- ہرا اور سنہرا ---- جیسے آلو میتھی کا سالن۔ وہی مرغوب مہک بھی آرہی ہے۔"

یا یہ کہ ---- " ذوق کی داد دینی پڑتی ہے۔ قرمزی، سرخ، زرد لہریوں کی ساڑی اور سبز

چھینٹوں والا بلاؤز ----- گویا گاجر کے مفرح حلوے پر پستے کی ہلکی سی جنبہ ۔"

پھر کسی روز ----- "آج تو حد ہو گئی ۔ آپی ، کاسنی سوٹ اور نارنجی دوپٹے نے لذیذ حریے کی یاد دلادی جس پر ابھی ابھی لہسن اور پیاز کا کڑاکے دار بھنگا لگا ہو ۔ کیا بات پیدا کی ہے ----- ؟"

دوسرے پہاڑ سے نیچے آنے والی لاری دیر سے تیار تھی ۔ ڈرائیور بار بار ہارن بجاتا ۔ معلوم ہوا کہ کوئی سواری آنے والی ہے ۔

جس ہستی کا انتظار ہو رہا تھا اس کا قد لمبا اور کندھے مضبوط تھے ۔ چہرے پر دلیری اور بے باکی تھی اور چال ڈھال میں مردانہ وجاہت ----- یہ اور بات تھی کہ اسے مس کہا جاتا تھا ۔

لیکن اس کے ہونٹوں سے تین چار فقرے سنتے ہی محسوس ہونے لگا کہ اس نے کچھ زیادہ مس نہیں کیا تھا ۔ اس کا نام دہمیدہ ، ہمیدہ یا رحمیدہ وغیرہ ہو گا ۔ لیکن حلیہ کچھ ایسا بنالیا تھا کہ شلوار قمیض ٹخنے یا غرارہ ، ساڑی ہو یا کوئی اور لباس ، دور سے یوں معلوم ہوتا جیسے جمد باندھ رکھا ہے ۔ چناں چہ سب اسے جمیدہ کہا کرتے ۔

کبھی وہ عورت نما لڑکی نظر آتی تو کبھی لڑکی نما عورت ۔ بہر حال لڑکی وہ کبھی نہیں لگی ۔ ہر وقت کے بناؤ سنگار کی وجہ سے یہ بتانا مشکل تھا کہ کتنے برس کی ہوگی ۔ مگر جب اسے غصہ آتا تب چہرہ اصلی عمر کی چغلی کر دیتا ۔ لوگوں کو وہ اچھی نہیں لگتی تھی ، لیکن بری بھی نہ لگتی ۔ مقصود گھوڑا کہا کرتا کہ جمیدہ کی واہی تباہی اور کرخت پن کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس میں کوئی نہ کوئی جاذبیت ضرور ہے ۔ اس کے کزن نے بتایا کہ وہ ایک طرح کا ریکارڈ بھی قائم کر چکی ہے ----- آج تک کسی لڑکے نے بھی اس میں دو تین ہفتے سے زیادہ دل چسپی نہیں لی ۔ ہمیشہ چوتھے ہفتے تک ضرور لڑائی ہو جاتی ہے ۔ نہ جانے قصور ان سب لڑکوں کا تھا یا پھر جمیدہ کا ----- لیکن وہ پہلی وجہ کو ہی صحیح مانتی ہے ۔ اناپ شناپ بانکنے کا یہ عالم تھا کچھ کہے بغیر وہ گھنٹوں بول سکتی تھی ۔

جب کبھی اس سے ملنا پڑتا تو ذرا سی دیر کے بعد یوں لگتا جیسے ہر ایک خود اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو ۔ یعنی کیمسٹ کا روئے سخن کیمسٹ کی جانب معلوم ہوتا ۔ جمیدہ جس کی تعریف کر رہی ہے وہ جمیدہ ہوتی اور شیطان شیطان سے مخاطب لگتے ۔

مصوری ، موسیقی ، ادب وغیرہ کا اسے قطعاً شوق نہیں تھا ۔ بلکہ کزن نے تو یہ بتایا کہ جمیدہ کے لیے ادب وہ کچھ ہے جو پرانے زمانے میں بزرگوں کا کیا جاتا تھا ۔ ویسے افواہوں کے معاملے میں وہ بالکل بے تعصب تھی ----- افواہ اہم ہو یا نکمی ۔ واقف کے بارے میں ہو یا اجنبی کے ، معقول ہو یا نامعقول ----- ہر افواہ اسے پسند آتی لیکن تنقید کے لیے فقط ملغوبہ کو چن رکھا تھا ۔ کبھی یہ انکشاف کرتی کہ کسی زمانے میں ملغوبہ اپنے منگیتر کو انکل کہا کرتی تھی ۔ یہ کزن کا ریکٹ بعد میں شروع ہوا ۔ کبھی بتاتی کہ ملغوبہ کی چھوٹی بہن کو گلہ رہتا ہے کہ آپا ثابت قدمی سے

ایک عمر پر ڈٹی ہوئی ہیں۔ پچھلے مہینے جب انھوں نے اپنی سترھویں سالگرہ منائی تو در حقیقت وہ سترھویں سالگرہ کی آٹھویں یا نویں برسی تھی۔ تبھی بے چاری چھوٹی بہن اپنی عمر نہیں بتا سکتی لیکن بالغ ہونے کے لیے کسی نہ کسی روز مجبوراً اسے ملغوبہ سے آگے نکلنا پڑے گا۔

تنگ آکر کسی نے پوچھ لیا---- "تو کیا ملغوبہ میں ایک بھی خوبی نہیں؟"

تہمیدہ نے جو گول مول سا جواب دیا اس کا مطلب یہ تھا کہ---- "بالکل نہیں! اور جب تک میں موجود ہوں کبھی ہوگی بھی نہیں۔"

افواہوں کے سلسلے میں اکثر اس کی کھسر پھسر سنا کرتے----

"بس۔ جو کچھ معلوم تھا اس سے کئی گناہ زیادہ تمھیں بتا چکی ہوں۔"

یا---- "فی الحال تو یہی چند سکینڈل ہیں۔ جب تم سے اور خوش ہوں گی تو اور بھی سناؤں گی۔"

چائے کے باغوں کی حسینہ کے متعلق مقصود گھوڑا کہیں تہمیدہ سے پوچھ بیٹھا۔

"اسے جانتی تو نہیں۔" وہ بولی "لیکن اس کے بارے میں کافی کچھ بتا سکتی ہوں۔"

ملغوبہ سے جہاں خواہ مخواہ کی نوک جھونک رہتی وہاں اس کی ہر بات کی نقل بھی کیا کرتی۔ آرائش، لباس، خوش بوئیں، یہاں تک کہ اس کی دعوتوں کی بھی ریس کرتی۔ رقعے بھی ویسے ہی ہوتے اور خواتین و حضرات کو "ساڑھے سات بجے۔ برائے آٹھ بجے" کا وقت دیا جاتا۔ مگر وہاں نو بجے کے بعد آمد شروع ہوتی اور ایسے ایسے لوگ آتے جنھیں خواتین و حضرات کہنے سے پہلے کئی مرتبہ سوچنا پڑتا۔ ہمارا گروپ اس کی تقریبوں سے دور رہتا۔ پہلی وجہ تو وہ عامیانہ گنوار و باتیں تھیں جو وہاں سننے میں آتیں۔ دوسرے یہ کہ وہ دعوت ہی تب کرتی جب بہت سی باسی چیزیں اکٹھی ہو جاتیں۔ یعنی فریجیڈیر، نعمت خانہ، کچن وغیرہ کی صفائی کرتے وقت مہمان نوازی کا پروگرام بنتا۔ یہاں تک کہ دعوت والے روز جو کچھ پکتا اسے ایک طرف رکھ دیا جاتا اور کئی ہفتوں کے بچے ہوئے سالن، چاول، شوربے وغیرہ خوب گرم کیے جاتے اور وہ پرانا گاجر کا حلوہ یا فرنی جسے اب کوئی بھی نہیں چکھتا تھا۔ وہ پھل رکھے جاتے جو بہت پک چکے تھے۔

ایسی ہی ایک دعوت پر کسی نے تہمیدہ کی سرگوشی سنی جو اس نے اپنے کزن کے ہاتھ سے ڈونگا چھینتے ہوئے کی۔ "اس میں سے کچھ نہ لیں۔ یہ فقط مہمانوں کے لیے ہے۔"

چناں چہ اس کی دعوتوں میں یا تو وہ سخت جان اور دبنگ قسم کے لوگ پہنچتے جنھیں تازگی اور باسی پن میں تمیز نہیں تھی، یا وہ جو پھکڑ پنے کے شوقین ہوتے۔

شیطان اور میں لمبی سیر سے واپس آرہے تھے کہ انھوں نے اوپر والی سڑک پر سب سے لمبے سفیدے کے درخت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "درخت ایک ہے، مگر تنے دو ہیں۔ یہ کیسے

ہو سکتا ہے؟"

میں نے مشورہ دیا کہ عینک کے شیشے صاف کر کے دوبارہ دیکھو چناں چہ انھیں نظر آیا کہ پتلے سے تنے کے ساتھ دبلی پتلی نحیفہ کھڑی ہے اور بار بار گھڑی دیکھ رہی ہے جیسے کسی کی منتظر ہے۔

پتہ نہیں اسے کس کا انتظار تھا۔ غالباً مقصود گھوڑے کا جس نے اسے چھ بجے کا وقت بتایا ہو اور پھر بھول چکا ہو کہ شام کے چھ بجے ملنا تھا یا صبح کے چھ بجے اور اس کے تاریخ یاد نہ رہی ہو۔

شیطان تیزی سے ڈھلان پر اتر رہے تھے لیکن اب انھیں رک کر گیئر بدلنا پڑا۔ اوپر جانے والی پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ چڑھنے لگے۔

ہمیں دیکھ کر وہ رسماً مسکرائی۔ شیطان نے بھی مصنوعی بشاشت پیدا کی اور بولے: "تمھاری مسکراہٹ کلاسیکی مسکراہٹوں سے کس قدر ملتی جلتی ہے جن مسکراہٹوں کو دیکھ کر قافلے راہ بھول جایا کرتے تھے یعنی قافلے کا سب سے اگلا اونٹ سیدھا راستہ چھوڑ کر خواہ مخواہ کسی اور طرف ہو لیتا۔"

نحیفہ نے پھر گھڑی دیکھی اور زیرِ لب بولی "لاحول ولا۔" ساتھ ہی بجلی چمکی اور زور کا دھماکا ہوا۔

"لاحول ولا ہرگز نہیں۔" شیطان نے کہا۔ "دراصل ہمارے پاس ذرائع ہی نہیں ہیں۔ ابھی ابھی بادلوں میں بجلی کے تقریباً نو یا دس کروڑ دولت ضائع ہوئے ہیں۔ اگر ہم انھیں محفوظ کر سکتے تو ان سے مدتوں تک لمبی لمبی سڑکوں پر قمقمے جلتے۔ بہ ہر حال مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ آسمانی بجلی کو سٹور کرنے کا کوئی نہ کوئی بندوبست ہو ہی جائے گا۔"

"آپ کہاں تھے؟ مہینے بھر سے آپ کو نہیں دیکھا۔" اس نے محض گفتگو جاری رکھنے کے لیے کہا۔

"اسے اتفاق سمجھیے یا کچھ اور۔ میں نے بھی تمھیں ایک مہینے سے نہیں دیکھا۔"

"روفی صاحب، آپ ہمیشہ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ کیا کسی کی تلاش میں ہیں۔ جو آپ کو مل نہیں رہا؟" نحیفہ نے گھڑی دیکھتے ہوئے پوچھا۔

شیطان نے پہلے گھڑی دیکھی، پھر جواب دیا۔ "مل نہیں رہا کی جگہ مل نہیں رہی زیادہ صحیح ہوگا۔"

"یعنی آپ کی آئیڈیل ۔۔۔ آپ کے خوابوں کی شہزادی نہیں ملی؟"

"بالکل! نہ صرف خوابوں کی شہزادی غائب ہے بلکہ دن میں بھی جب کہ خواب نظر نہیں آنے چاہئیں کوئی غیر شہزادی یا اور لڑکی بھی اس علاقے میں نہیں ملی۔"

"تو گویا ان دنوں آپ مسرت سے محروم ہیں۔"

"اگر مسرت کسی لڑکی کا نام ہے مثلاً مسرت آغا، مسرت شیخ، مسرت خان وغیرہ تو اس سے بھی محروم ہوں اور دوسری قسم کی مسرتوں سے بھی۔ دانش مندوں نے شاید سچ کہا ہے کہ دنیا بھر میں اگر کہیں مسرت کا وجود ہے تو وہ فقط ڈکشنری میں ہے جہاں اس کے معنے بھی درج ہیں۔"

"میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ کسی کی تمنا کرنے سے پہلے اپنے آپ کو اس کے قابل بنانا چاہیے۔ اور مستحق ہونے کے بعد خواہش کرنی چاہیے۔"

"اور میرا تجربہ یہ ہے کہ قابل اور مستحق ہمیشہ رہو لیکن تمنا کبھی مت کرو کیوں کہ خواہش کرنے والا اکثر خوار ہوتا ہے۔"

اتنے میں مقصود گھوڑا کہیں سے آگیا۔

اس نے شیطان اور نحیفہ کا اس طرح معائنہ کیا جیسے وکٹ گرنے پر نیا بیٹس مین میدان میں آکر قریب کے فیلڈرز کو غور سے دیکھتا ہے۔ پھر بولا "بڑے افسوس کی بات ہے۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی۔"

کچھ دیر خاموشی رہی جسے مقصود گھوڑے نے سازگار سمجھ کر بتایا۔ "اگر واقعی دیر ہوئی ہے تو اس لیے کہ راستے میں بلیاں اور کتے لڑ رہے تھے اور لڑتے ہی جا رہے تھے۔ انھوں نے راستہ ہی نہیں دیا۔ اس لیے مجھے رکنا پڑا۔"

"آپ اردو ہمیشہ غلط بولتے ہیں۔" نحیفہ نے حقارت سے کہا "در حقیقت مایوسی تو مجھ کو ہونی چاہیے جس نے اتنی دیر انتظار کیا۔ آپ کو اس موقعے پر حیرت ہونی چاہیے تھی۔ اس کے علاوہ مجھے مایوسی کی جگہ مجھ کو مایوسی کہنا چاہیے۔ سخت مایوسی کی جگہ شدید مایوسی بہتر ہے اور "ہی" کا استعمال کم کیا کریں۔ "لڑتے ہی جا رہے تھے" کی جگہ "لڑتے جا رہے تھے" سے بھی مقصد بیان کیا جا سکتا ہے اور بلیاں اور کتے کی جگہ کتے اور بلیاں، کہنا چاہیے کیوں کہ کتے کا رتبہ اور سائز بلی سے اونچا ہے۔"

شیطان (جو کافی تھکے ہوئے تھے) انگڑائی لیتے ہوئے بولے۔ "جو کچھ ابھی کہا گیا وہ درست ہو سکتا ہے، یا صحیح ہو سکتا ہے۔ اب مثال کے طور پر مقصود کو لیں ــــ اور اسے بے شک لے لیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا ــــ"

"تم کچھ پڑھ رہی تھیں؟" مقصود گھوڑے نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ "ذرا دیر پہلے نیچے دیکھتیں تو وادی میں نہایت دل کش سبزی ہو رہی تھی ــــ"

"افوہ! پھر وہی غلط اردو ــــ سبزی نظر آیا کرتی ہے، ہوا نہیں کرتی اور میں کیا پڑھ رہی تھی؟ انگریزی کا یہ ناول جس میں سکاٹ لینڈ یارڈ کے حیرت انگیز کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔"

"تعجب ہے کہ ایسی معمولی چیز پر کسی نے پوری کتاب لکھ ماری ہے۔" مقصود گھوڑے نے عقل مند نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟" نحیفہ نے پوچھا۔
"یہی کہ سکاٹ لینڈ کا یارڈ بھی دوسرے ملکوں کے یارڈ کی طرح چھتیس انچ ہی کا تو ہوتا ہے۔ ایک گز میں تین فٹ اور فی فٹ بارہ انچ محض اتنے انچوں پر ناول لکھ دینا سراسر زیادتی ہے اور یہ دوسری کتاب کون سی ہے؟"
"اس میں Tim Maruna کی پراسرار سرگرمیوں کا نہایت عبرت آموز تذکرہ ہے " لیکن یہ حضرات تو بہت اچھے میسن ہوتے ہیں جو خدمتِ خلق کے جذبے سے پبلک کے لیے مکان بالکل Free تعمیر کرتے ہیں۔ ان کا وجود غنیمت ہے۔"
نحیفہ نے ناک بھوں بلکہ کان تک چڑھائے اور دونوں کتابیں اس کے ہاتھ میں پکڑا کر چلی گئی۔
دراصل شروع ہی سے مقصود گھوڑے کا جنرل نالج بلکہ معمولی نالج بھی نہ ہونے کے برابر رہا ہے اور انگریزی تو اس سے بھی کم اور ہے۔ مثلاً وہ بتایا کرتا کہ ملازمت کرتے کرتے کافی وقت گزر جائے تو انسان لازمی طور پر Tired ہوجائے گا۔ جب اس کے بعد اور تھکے گا تب Retired ہوتا ہے اور یہ کہ علم و فن کے شائقین پہلے تلاش یعنی Search کرتے ہیں جب پوری طرح تسلی نہیں ہوتی یا علوم اچھی طرح قابو میں نہیں آتے پھر دوبارہ بلہ بول کر Research کرنی پڑتی ہے۔
جس سلسلہ۔ کوہ پر ہمارا کیمپ تھا وہ سارے کچے پہاڑ تھے۔ ان میں مٹی زیادہ تھی اور چٹانیں کم۔ بارشیں ہوتیں تو چھوٹے چھوٹے پتھر اور مٹی کے تودے نیچے لڑکنے لگتے۔ اس پر مقصود گھوڑا جو ہمیشہ شہروں میں رہا تھا شکایت کرتا کہ ان پہاڑی باشندوں کو اعلیٰ کوالٹی کے پہاڑ بھی بنانے نہیں آتے۔ پہاڑ تعمیر کرتے وقت باقاعدہ مشقت اور نگرانی سے پوزیشن کہیں بہتر ہو سکتی تھی۔ اگر محنت کی ہوتی تو اتنی سی مٹی بھی ضائع نہ ہوتی۔
اسی طرح Inferiority Complex کو وہ وٹامن بی کامپلیکس کی قسم کا کوئی ٹانک سمجھتا، جسے ڈاکٹر کا نسخہ دکھائے بغیر بازار سے خریدا جا سکتا تھا۔
نحیفہ بار بار ٹوکتی کہ اگر انگریزی مشکل لگتی ہے تو کم از کم اردو ہی اچھی طرح سیکھ لو لیکن اردو میں بھی وہ کافی بخشا ہوا تھا۔ جب اس نے پہلی مرتبہ کسی تقریب کے دعوت نامے پر ج س۔ م۔ ف پڑھا تو جسمف کے معنے لغت میں ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ کسی نے بتایا کہ یہ ایک لفظ نہیں بلکہ چند حروف ہیں جو ایک فقرے کے مخفف ہیں، تو اس نے بڑے غور کے بعد مطلب ـــــ جواب سے معاف فرمائیں اخذ کیا۔ چناں چہ ایسے دعوت نامے پر وہ خاموش رہتا لیکن تقریب میں ضرور جا پہنچتا۔
مگر مقصود گھوڑے پر جب عشق کا دورہ پڑا ہوا ہو تو اس کا ٹمپریچر سائے میں ایک سو دو یا

ایک سو تین فارن ہیٹ سے کم نہیں ہوتا۔ لٰہذا نحیفہ کے کہنے پر اس نے میدانی قصبے میں اردو کی مطلوبہ کتابوں کی تلاش شروع کر دی جو دیر تک جاری رہی لیکن پتہ نہیں کیوں اسے فقط کورس کی کتابیں ہی مل سکیں۔ انھیں پڑھ کر اس کے علم میں کسی قسم کا اضافہ ہوا یا کمی ہوئی ---- اس کے متعلق کہنا مشکل ہے۔ کیوں کہ اس کی حرکات کے بارے میں بھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا، نہ اسے خود پتہ ہوتا ہے۔ البتہ اتنا فائدہ (یا نقصان) ضرور ہوا کہ جو الفاظ اسے مشکل لگتے (اور ایسے الفاظ بے شمار تھے) ان کے معنے پوچھنے کے بہانے بار بار نحیفہ سے ملنے جاتا۔ پہلے فقروں اور الفاظ کے نیچے نشان لگاتا، پھر ملاقات کے لیے مواد اکٹھا کرتے ہی فوراً پہنچتا۔

ایک دن شیطان نے مجھے بتایا کہ مقصود گھوڑا ابھی ابھی کتابوں کا وزنی بستہ اٹھا کر نحیفہ کے ہاں گیا ہے۔ جب وہاں پہنچے تو وہ دونوں برآمدے میں بیٹھے تھے، اس لیے درختوں کی آڑ لینی پڑی۔

وہ خوب چہک رہا تھا ---- "یہاں لکھا ہے کہ ---- آخر ہاتھی اس ویرانے میں لقمہ اجل بن گیا۔ ---- ہاتھی کے سائز کا لقمہ یقیناً بہت ہی بڑا لقمہ ہے اور شاید عالمی ریکارڈ ہے۔ اگر مصنف صاف صاف لکھ دیتا کہ ہاتھی بھوک سے مر گیا تو اتنا گہرا تاثر پیدا نہیں ہو سکتا تھا اور پچاسویں صفحے پر درج ہے کہ ---- تپتے ہوئے صحرا میں اونٹ اور سوار موت کے گھاٹ اتر گئے۔ ظاہر ہے کہ پیاس سے ان کا انتقال ہوا ہو گا۔ لیکن صحرا میں گھاٹ کسے نصیب ہوتا ہے؟ خصوصاً اونٹ کو تو کوشش کے باوجود بھی میسر نہیں ہو سکتا اور یہاں بتایا گیا ہے کہ ---- "دودھ میں پانی ملاتے ہوئے وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا" ---- سب کو پتہ ہے کہ دودھ اور پانی کو ملانے سے کسی قسم کا رنگ نہیں بن سکتا۔ رنگینی پیدا کی ہے تو اس فقرے نے۔ اور یہاں لکھا ہے کہ ---- "لکڑیوں کے سارے ذخیرے کو وہ شیرِ مادر سمجھ کر ہضم کر گیا" ----- اس پر ہاضمے کی دوا کا وہ اشتہار یاد آگیا "لکڑ ہضم، پتھر ہضم" اور یہ بھی سنیے ---- "فزکس اور کیمسٹری نیوٹن کے در کی لونڈیاں تھیں ---- "اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لونڈیاں صرف مشرق ہی میں نہیں پائی جاتی تھیں بلکہ مغرب میں بھی ان کا رواج ہو چلا تھا۔ ویسے کچھ لوگوں نے یہ افواہ بھی اڑائی کہ وہ لوگ جو زیادہ سوچتے ہوں مثلاً سائنس داں وغیرہ، انھیں لونڈیوں یا دیگر خواتین میں دل چسپی نہیں رہتی مگر نیوٹن نے یہ افواہ غلط ثابت کر دی۔"

اس پر شیطان نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ اس انداز سے جیسے انھیں مقصود گھوڑے سے اس قسم کی گفتگو کی توقع نہیں تھی۔

"اور اس جگہ سانپ اور نیولے کی لڑائی بیان کی گئی ہے جس کا خاتمہ یوں ہوتا ہے "مقابلہ بڑا سخت تھا لیکن آخر کامیابی نے نیولے کے قدم چومے اور فتح کا سہرا اس کے سر رہا۔"

یہاں یہ بھی لکھا جا سکتا تھا کہ نیولے نے سانپ کو مار دیا۔ مگر یہ فقرہ سادہ تھا لہٰذا دیگر سادہ فقروں کی طرح استعمال نہیں کیا گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ نیولے کے قدم کس طرح چومے گئے اور سہرا کہاں سے آیا تھا؟ اور کس نے باندھا؟ اس کا ذکر غالباً اگلی قسط میں ہوگا اور اس فقرے کا تو جواب ہی نہیں۔۔۔۔ "اس کا کاروبار زیادہ دیر نہ چل سکا اور اسے کوئلے کے ٹھیکے سے ہاتھ دھونے پڑے۔۔۔۔ "اب تک تو یہی سنا تھا کہ کوئلوں کی دلالی سے منھ پر کالک لگ سکتی ہے مگر ان سے ہاتھ دھو کر صاف کرنا واقعی معرکے کا کام ہے۔"

نحیفہ نے خفا ہو کر ڈانٹا اور پرانے کلاسیکی اسلوب بیان کے نستعلیق پن، مسجع نثر، محاوروں کی دل فریبی، ادب کی شان دار روایتوں اور ان کے احترام وغیرہ وغیرہ پر طویل لکچر دیا جو مقصود گھوڑے کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا، کیوں کہ وہ اتنی دیر ان مچھروں کو بھگانے کی ناکام کوشش کرتا رہا جو ان دونوں کے گرد بھنبھنا رہے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ مچھر تقریباً آٹھ دس فٹ دور تھے۔

لیکن جب نحیفہ نے یہ کہا کہ سائنس اور ادب میں زمین اور آسمان کا فرق ہے اور جہاں سائنس داں (نہ جانے وہ مقصود گھوڑے کو سائنس داں کیوں سمجھتی تھی) کا منھ شمال کی جانب ہوتا ہے وہاں لٹریچر کے شیدائی کا جنوب کی طرف (وہ مشرق اور مغرب بھی کہہ سکتی تھی)۔ تو اسے مقصود گھوڑے نے چیلنج سمجھا اور فوراً قصبے میں کسی لائبریری، کسی اور چیز کا ممبر بن کر اردو ادب پر باقاعدہ بلہ بول دیا۔ چناں چہ جب وہ میدانی علاقے سے واپس آتا اور اپنا تھیلا کھولتا، تو کبھی سنگتروں، کیلوں کے ساتھ تاریخ اردو (مطبوعہ ۱۸۹۵ء) کی جلدیں ہوتیں۔ کبھی صابن، بوٹ پالش فینائل کی گولیوں کے ہم راہ محاوروں اور کہاوتوں کے مجموعے، تو کبھی ڈرائی کلین شدہ کپڑوں میں تنقیدی جائزے۔ غالباً ابتدا اس نے محاوروں سے کی۔ اس کا شبہ تب ہوا جس دن ملغوبہ نے شاید اپنے منگیتر کو چڑانے کے لیے اپنی بڑی بہن کے منگیتر کی تعریفیں شروع کیں تو سننے والوں کی جمائیوں، چھینکوں اور کھانسنے کے باوجود ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ آخر مقصود گھوڑے نے طالب علم کی طرح ایک ہاتھ اٹھا کر سوال کیا۔ "یہ منگیتر صاحب اس وقت کہاں ہیں؟ تاکہ ہم بھی ان کا دیدار کر سکیں۔"

ملغوبہ نے بتایا کہ وہ جزائر انڈیمان میں ہے جہاں اس کا کنبہ سال ہا سال سے آباد ہے۔

"اور اس منگیتر کو آخری مرتبہ تم نے کب دیکھا تھا؟" اس نے شرلاک ہومز کے انداز میں پوچھا۔

ملغوبہ خاموش ہو گئی۔

اس پر مقصود گھوڑے نے۔ "یہ تو وہی معاملہ ہوا کہ۔۔۔۔ دیکھا نہ بھالا، صدقے گئی خالہ۔۔۔۔"

بعد میں معلوم ہوا کہ ملغوبہ کو اس پر فخر تھا کہ وہ اور اس کی سب بہنیں، ان کے منگیتر ہی منگیتر ہیں اور یہ کہ ابھی تک شادی کسی کی بھی نہیں ہوئی۔

شام کو فلم دیکھنے گئے، سینما ہال کے تنگ سے دروازے کی طرف جاتے ہوئے شیطان نے لیڈیز فرسٹ کے سلسلے میں لڑکوں کو روک لیا۔ لڑکیاں آگے بڑھیں۔ انھوں نے اندر جاتے ہوئے ایک دوسری کو قطعاً نہیں دھکیلا تھا لیکن نہ جانے کیوں مقصود گھوڑے کو وہم سا ہوا کہ ہر ایک پہلے اندر پہنچنے کی کوشش میں ہے۔ فوراً بولا۔

"آٹھ جلا ہے دس حقے، اس پر بھی دھکم دھکے۔"

اتوار کی پک نک پر مشکوک کی الل ٹپ باتوں کی طوالت سے تنگ آکر تہمیدہ نے گھڑی دیکھنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی کیوں کہ وہ گھڑی باندھنا بھول گئی تھی۔ مشکوک بولے گیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد تہمیدہ نے پھر خالی کلائی کی طرف دیکھا۔ اسے فکر تھا کہ دوسرے پہاڑ پر جانے والی لاری نہ نکل جائے۔ کچھ اور دیر ہوئی تو وہ بسوں کے اڈے کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھ کر چل دی۔ مقصود گھوڑے نے نعرہ لگایا۔

"ایک دل یاروں میں، ایک چوکی داروں میں۔"

یہ سن کر مشکوک جیسے آدمی نے بھی منھ بنایا اور تقریر ختم کر دی، لیکن مقصود گھوڑا محاورے کو برجستہ سمجھ کر خوش ہوا۔ پھر ملغوبہ کے ڈنر کے بعد پہلی مرتبہ اسے پیلے رنگ کا الائچی والا قہوہ پیش کیا گیا۔ جس کا اس نے معائنہ کیا، سونگھا، چکھا اور نا تسلی بخش پا کر واپس کر دیا۔ ملغوبہ وضاحت کر رہی تھی کہ روغنی نان، حریسہ، نرگسی پلاؤ، گشتابوں جیسے قوت بخش کشمیری کھانوں کے بعد یہ ہاضم قہوہ پرانی رسم ہے۔

"خصم چھوٹے، پر رسم نہ چھوٹے۔" مقصود گھوڑے کے ہونٹوں سے آواز آئی۔

اس کے بعد وہ اکثر حیران ہوتا کہ ملغوبہ کی مشہور دعوتوں پر اسے کیوں نہیں بلایا جاتا۔ ادھر ملغوبہ کے سدا کے سست الوجود اور ڈھیلے ڈھالے منگیتر (کرسی ہو، صوفہ، بنچ یا گھاس کا قطعہ ---- وہ ہمیشہ نیم دراز ملتا) سے ہماری بات چیت مقصود گھوڑے کے اس محاورے ---- "کھڑا بنیا پڑے برابر، پڑا بنیا مرے برابر" ----- کے بعد تقریباً ختم ہو گئی۔

آخر ایک دن نحیفہ کے صبر کا پیمانہ بلکہ بڑا سارا گھڑا، لب ریز ہو گیا۔ آپس میں یوں ہی باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک طرف حسن و جمال کا موضوع اور دوسری طرف رفاقت اور دوستی کا۔ نحیفہ موضوع نمبر دو کی حمایت میں بول رہی تھی ---- جب دوستی کا لفظ بار بار آیا تو مقصود گھوڑے نے اعلان کیا ---- "بندر کی دوستی، جی کا جنجال" اس پر نحیفہ نے کھلم کھلا طنز کیا۔ "آپ اردو نثر کا ایسا عجیب و غریب مطالعہ کر کے اس پر اتنے حاوی ہو چکے ہیں، یا یہ اس قدر پسپا ہو چکا ہے کہ اب اردو شاعری آپ کی توجہ کی منتظر ہے۔" حسبِ معمول یہ فقرہ بھی اس کے سر سے

گزر گیا۔ اس کے بعد ایک وقفہ آگیا جس میں اردو شعرا کے دیوان آگے آگے تھے اور مقصود گھوڑا پیچھے پیچھے۔

اس بے رونق سے کیمپ میں ہم اگر بہت خوش نہ تھے تو اداس بھی نہیں تھے۔ گزرتے ہوئے دنوں کے ساتھ ماحول اور گرد و پیش سے واقفیت بڑھتی گئی۔ وہاں کی خوش بوؤں کو بھی پہچاننے لگے۔ چیڑ کے درختوں کی مہک آتی تو اندازہ ہوجاتا کہ اوپر جنگل میں بارش ہورہی ہے۔ سائیں سائیں کرتے جھونکے گھاس، جھاڑیوں، چشموں کی ملی جلی طراوت لاتے تو یہ وادی کی سمت سے آندھی آنے کی اطلاع ہوتی۔ خشک موسم میں گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی خوش بو فوراً بتادیتی کہ قریب ہی کہیں بوندیں پڑرہی ہیں۔ صبح صبح ہوا بند ہوتی تو فضا میں گرد و غبار اور دھوئیں کی آمیزش سے پتہ چل جاتا کہ نچلے قصبے میں گہما گہمی شروع ہوچکی ہے۔ نمناک گرمی میں ادھر حبس شروع ہوا ادھر طوفان آیا۔ آندھی سے بجلی فیل ہوجاتی۔ لالٹینیں جلتیں۔ ان کی روشنی میں اسکول کا زمانہ یاد آجاتا۔

پھر جھینگر بولتے، میس کی چھت پر ٹپ ٹپ بوندیں گرتیں اور رم جھم رم جھم بارش شروع ہوجاتی۔ جب رکتی تو قوس قزح نکلتی جس کے برابر ایک اور ہلکی سی دھنک ہوتی ۔۔۔۔ بالکل اس کی نقل۔ اس دن کا اختتام بھی دل آویز ہوتا ۔۔۔۔ غروب آفتاب کی چکاچوند، جیسے آتش بازی کا عکس پڑ رہا ہو۔ جہاں قدرت کے ساتوں رنگ جھلمل جھلمل کرتے وہاں ان کی باہمی آمیزش سے نت نئی رنگ آرائیاں دیکھنے میں آتیں۔

مطلع صاف ہونے پر علی الصبح برفانی چوٹیوں سے چمکتی دمکتی کرنیں پھوٹتیں۔ درخشاں دھوپ سے پہاڑیوں، درختوں کے لمبے لمبے سائے بنتے جو دن چڑھنے پر گھٹتے جاتے۔ چاروں طرف نور برسنے لگتا اور وادی کے دل کش نقوش اور واضح ہوجاتے، جیسے رنگ برنگا شوخ قالین بچھا ہوا ہو۔ خزاں آتی تو اوپر کے جنگل سے لے کر تلہٹی تک جگہ جگہ آگ سی لگ جاتی۔ درختوں کے پتے زرد سرخ ہوکر وہ تاثر پیدا کرتے کہ موسم بہار بھول جاتا۔

سہ پہر کو دھوپ ہلکی ہوکر زمین و آسمان کو سنہری بنادیتی۔ ہر طرف تھکا تھکا سا خمار پھیل جاتا۔

چاندنی پھیلتی تو بادلوں کے ٹکڑے سارا آسمان چھوڑ کر چاند کی طرف سیدھے دوڑے آتے اور کرنیں مدھم کرکے طرح طرح کی شبیہیں بناتے۔ جب آگے نکل جاتے تو روشنی پہلے سے بھی تیز ہوجاتی۔ اور وہ اندھیری راتیں بھی پرفسوں ہوتیں جب برسے ہوئے بچھڑے بادلوں سے تارے تک چھپ جاتے۔ سب کچھ یوں ساکن ہوجاتا کہ پتا تک نہ ہلتا۔ تب نہ جانے کہاں سے وہ دھیمی دھیمی جلا آجاتی جو سارے نظارے پر چاندی کا ملمع چڑھادیتی۔

ہوا کے جھونکے عجیب عجیب آوازیں پیدا کرتے۔

کبھی رات بھر درختوں، جھاڑیوں، پودوں میں ہلکی ہلکی سرگوشیاں ہوتیں جو کبھی سنائی دیتیں کبھی نہیں۔ پھر جھونکے منت سماجت سی کرتے جیسے کچھ منوانا چاہتے ہوں۔ ہوا تیز ہوتے ہی ٹہنیوں سے ایسی افسردہ سیٹیاں بجتیں کہ کسی کے چلانے کا گمان ہوتا۔

جھکڑ چلنے لگتے اور صدائیں بھیانک ہوتی جاتیں، جیسے گھپ اندھیرے میں درندے رو رہے ہوں۔ تندی میں اور اضافہ ہوتا۔ آندھی کی وہ چیخم دھاڑ مچتی کہ سونا محال ہو جاتا۔ طوفان ختم ہو چکتا تو صبح کو وہی جھونکے یوں ہنستے کھیلتے چہلیں کرتے جیسے رات کو کچھ بھی نہیں ہوا۔

شام کو بادل نہ ہوتے تو سورج ڈوبتے ہی وادی کی بستیوں میں روشنیاں چمکنے لگتیں۔ جیسے دفعتہً کہیں سے لاتعداد جگنو آ گئے ہوں۔ گیلے جھونکے فضا میں ارتعاش پیدا کرتے تھے تو یہ جگنو بھی متحرک ہو جاتے۔ بدلتے ہوئے موسموں کا پرندوں پر بھی اثر پڑتا ---- کسی مہینے چمکیلے پروں، رنگین چونچوں، کلغیوں والے خوش نما طیور کے پرے کے پرے آ کر وہاں کے پرندوں میں شامل ہو جاتے اور کچھ عرصہ رونق بڑھا کر چپکے سے اڑ جاتے۔ ان کے بعد کچھ اور طرح کے جھرمٹ آتے۔ ننھی چڑیاں، بھورے مٹیالے بڑے بڑے پرندے۔ ان کی روانگی کا مہینہ بھی مقرر ہوتا۔ پھر کوئی اور گروہ آتا۔ موسمی پرندوں کی یہ آمد و رفت جاری رہتی۔

وہاں مقامی پرندے بھی لاتعداد تھے۔

پہاڑ چڑھتے ہوئے کئی دفعہ یہ ہوا کہ چاروں طرف مکمل خاموشی ہے لیکن درختوں پر بے شمار پرندے بیٹھے ہیں۔ ایک بھی نہیں بول رہا اور کبھی چہچہوں سے جنگل گونج رہا ہے لیکن ٹہنیاں خالی پڑی ہیں بہ مشکل دس بارہ پرندے گن سکے۔

کیمپ کے پرندوں کا ٹائم ٹیبل کچھ یوں تھا ----

علی الصبح کبھی کبھی تو قوالی سی ہوتی جس میں پہلے لیڈر کی تان سنائی دیتی پھر ہم نواؤں کی آوازیں آتیں۔ کسی روز سب مل کر کورس سا الاپتے جیسے حمد و ثنا میں مصروف ہوں۔

سورج نکلتے ہی ایک موٹی آواز والا پرندہ کئی دفعہ پھرررر، ---- پھررر ---- کی لمبی سیٹی بجاتا۔ گویا کوئی ریفری فاؤل کا اعلان کر رہا ہو۔ دس بجے کے قریب ایک لٹھ مار قسم کا پرندہ جیسے ڈانٹنے لگتا ---- "کون ہے؟ کون ہے؟ کون ہے؟"

دوپہر کے لگ بھگ کوئی مستری نما پرندہ آدھ آدھ گھنٹے تک ٹھک ٹھک، ٹھک ٹھک، کرتا رہتا۔ ذرا دیر سانس لے پھر ٹھک ٹھک۔ اس کی روانی میں ایک اور پرندہ مخل ہوتا۔ جو ہوک ہوک کر کے ہارن سا بجاتا۔ کسی اور سمت سے اس سے بھی اونچی آواز میں ہوک ہوک کی جاتی۔ پھر ایسی ٹھک ٹھک اور ہوک ہوک مچتی کہ کسی ورکشاپ کا گمان ہونے لگتا۔

دن ڈھلے ایک قنوطی سا پرندہ بڑی بے دلی سے کہتا ---- "مت کرو، مت کرو، مت کرو۔"

پھر اور بھی غمگین لہجے میں ----"یہاں کچھ نہیں، کچھ نہیں، کچھ نہیں" ----"یہاں کچھ نہیں، کچھ نہیں۔" ساتھ ہی کہیں آس پاس سے یو کلپٹس، یو کلپٹس، یو کلپٹس کی صدا آتی۔ سورج ڈوبنے سے پہلے کبھی کبھی شوخ سی آواز میں ---- ٹھا ٹھیو سا ٹھیو آگیا، ---- دوہرایا جاتا۔ ہر چوتھے پانچویں روز کانا باقی کررر، ---- کانا باقی کررر، ---- کا وظیفہ کرنے والا پرندہ آتا اور وہ سب کو پسند تھا کبھی کبھی نمودار ہوتا۔ آتے ہی بڑی ملائمت اور شستگی سے کہتا ---- اچھا جی، دو تین منٹ کے بعد ---- اچھا جی، پھر وقفہ۔ اور اچھا جی۔

لیکن سب سے زیادہ انتظار Meet the Girl Meet the Girl کی خوش خبری سنانے والے پرندے کا رہتا جو بہت ہی کم آیا کرتا۔

مغرب تک سب دانا دنکا چن کر واپس پہنچتے تو رونق بڑھ جاتی۔ پہلے چند تماش بین سے پرندے لمبی تان لگا کر اوئے، اوئے، اوئے، کرتے۔ جیسے کہ کسی کو ہوٹ کر رہے ہوں۔ ان کے خاموش ہونے سے پہلے پچاس ساٹھ گز دور سے بالکل یہی صدا آتی۔ جس کا جواب ادھر ملتا۔ تھک کر یا اکتا کر وہ ذرا دیر چپ رہتے لیکن تازہ دم ہوتے ہی پھر وہی اوئے اوئے اوئے ---- آخر میں ایک مختصر سی قوالی ہوتی اور اندھیرا چھانے پر آہستہ آہستہ آوازیں آنی بند ہو جاتیں۔

ساڑھے تین میل فی گھنٹہ کی عام پیدل رفتار بھاری بھرکم کاہل مشکوک کے کیس میں الٹ تھی، یعنی ساڑھے تین گھنٹے فی میل۔ فلاسفر کو شبہ تھا کہ جب یہ اکیلا ہو گا تو اتنی سست چال پر پرندے ضرور اس کے سر اور کندھوں پر آ بیٹھتے ہوں گے۔

مشکوک کو دبلے پتلے انسان ناپسند تھے۔ دراصل اسے وہ بھی اچھے نہ لگتے جو چست نہ ہوں۔ اسے سب پر شبہ تھا۔ فقط دبلوں پر ذرا زیادہ۔ اس نے چھریرے مقصود گھوڑے پر شیکسپیئر کے ڈرامے جولیس سیزر کا یہ فقرہ چسپاں کیا ----

"Cassius لاغر اور حریص لگتا ہے یہ سوچتا بہت ہے اور ایسے آدمی خطرناک ہوا کرتے ہیں۔"

مقصود گھوڑا سوچنے لگا کہ جولیس سیزر نامی شخص کس فلم میں دیکھا تھا؟ شیکسپیئر سے البتہ تھوڑی بہت واقفیت تھی۔ بلکہ شکایت بھی تھی کہ انگریزی ہو یا اردو، نثر ہو یا نظم، اس آدمی کا نام بار بار کیوں آجاتا ہے۔

"کتنے احمق ہو سکتے ہیں یہ فانی انسان ----" شیطان نے Puck کا مشہور فقرہ سنایا۔

"کس نے کہا تھا ----؟" مقصود گھوڑے نے چونک کر پوچھا۔

"شیکسپیئر کے کیریکٹر نے۔"

"شیکسپیئر کے چال چلن کے متعلق ----"

"نہیں۔ یہ اس کے ڈرامے کے کردار نے کہا تھا۔"

"وہ کردار ضرور کیفر کردار کو پہنچا ہوگا۔" اس نے نحیفہ کی طرف عالمانہ انداز سے دیکھا۔

"اور جب اسپی صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ نے جہالت کس سے سیکھی؟ تو انھوں نے فرمایا کہ عقل مندوں سے۔۔۔۔"

"یہ کس نے کہا تھا؟" مقصود گھوڑا دوسری دفعہ چونکا۔

"میں نے۔" شیطان بولے۔

ایک روز فلاسفر نے اپنی وزنی کتاب سے سنایا۔۔۔۔ "اب ثابت ہوچکا ہے کہ دنیا بھر کے موٹوں میں ایک بات مشترک ہے۔ یہ کہ۔۔۔۔ وہ کچھ بھی تو نہیں کھاتے پھر نہ جانے کیوں وزن بڑھ جاتا ہے۔۔۔۔ کم از کم اوروں کو وہ یہی بتاتے ہیں۔"

"لیکن یہاں کا موٹا آدمی دو طرح کا ہے۔" کسی نے کہا۔ "داؤ لگ جانے پر کچھ بھی نہیں چھوڑتا۔ دکانوں کی مٹھائیوں، پیسٹریوں کو ایسی للچائی ہوئی نگاہوں سے تکتا ہے کہ فرہاد بھی شیریں کو یوں نہیں دیکھتا ہوگا۔"

مشکوک کے اور طرح کے ہونے میں کسی کو شبہہ نہیں تھا۔

جب اس کی لمبی کتھا شروع ہوتی تو شروع میں رخ دوسروں کی طرف ہوتا۔ بعد میں کچھ گفتگو اوروں سے ہوتی کچھ اپنی ذات سے۔ پھر جمائیاں لینے لگتا۔۔۔۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھے۔۔۔۔ ان کا تانتا بندھ جاتا۔ دیکھتے دیکھتے یہ پھیلنے لگتیں اور یوں محسوس ہوتا جیسے کھڑکیاں دروازے جمائیاں لے رہے ہوں۔ کھلی ہوئی الماریاں، صندوق جمائی لیتے۔ آس پاس کی ہر چیز جمائی پر جمائی لیتی اور جب بول نہ رہا ہو تو اس کی خاموشی بھی عجیب سی لگتی۔ چپ چاپ ہوتا تو یہ تاثر دیتا کہ کسی فتنے فساد کے متعلق سوچ رہا ہے۔ یا ابھی کسی پر طنز کرے گا۔ یہاں تک چاند تاروں کی طرف دیکھتا تو اس طرح جیسے یا تو اجرام فلکی کی آپس میں لڑائی کرائے گا، یا انھیں کوس رہا ہے۔

اس کے نظریے بھی عجیب تھے۔ مثلاً اسے خبر تب ہی دل چسپ لگتی اگر وہ بری ہو۔ اس کی رائے میں خیر و عافیت کی اطلاع فقط وہاں سے آسکتی ہے جہاں نرا جمود ہو۔ رہ گئی خوش خبری، سو اسے خبر نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ اس کا تعلق کسی اتفاقیہ واقعے سے ہوتا ہے جس سے فقط گنے گنائے لوگ وقتی طور پر خوش ہوگئے ہوں۔

انجینیر Statistics کا حوالہ دیتا کہ بری اور اچھی خبروں میں تقریباً ساٹھ اور چالیس فی صد کا تناسب ہوتا ہے۔

"میں نہیں مانتا۔۔۔۔" مشکوک کہتا۔ جو نہ ماننے کا پہلے ہی سے فیصلہ کرچکا۔

ایسی باتیں سننے کی بیگار سے سب اکتاگئے۔ مگر مقصود گھوڑے کو یہ مہارت تھی کہ جب چاہتا اپنے کانوں کا Switch بالکل آف کرسکتا تھا۔ یا پھر سننے کی Wave Length

تبدیل کر کے کوئی اور سٹیشن لگالیتا۔
ادھر مشکوک کی گفتگو شروع ہوئی ادھر مقصود گھوڑا سماعت کا کنکشن بدل کر کسی پرانے مہاتما کی طرح دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا۔ حاضرین یہی سمجھتے کہ نہ صرف وہ سب کچھ سن رہا ہے بلکہ اس پر غور بھی کر رہا ہے۔
آدھا پون گھنٹے کی جھک جھک کے بعد مشکوک اس کی رائے پوچھتا۔ تو پر سکون لہجے میں جواب ملتا۔۔۔۔ "ایں!" "یا" "کیا؟"
یہ گھنا پن شروع ہی سے اس کا ٹریڈ مارک رہا ہے۔
ایک شام کو جب مشکوک کینٹین کی لاری کا انتظار کر رہا تھا تو اندھیرا گہرا ہونے پر فلاسفر نے مقصود گھوڑے سے کہا کہ اسے موٹر سائیکل پر چھوڑ آئے۔
"مجھے موٹر سائیکل چلانی نہیں آتی۔"
"تو سیکھ لو۔۔۔۔۔"
"سیکھنا بھی نہیں آتا۔"
یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ کینٹین کی لاری پر مشکوک کو ہر روز لفٹ نہ مل سکتی۔ ڈرائیور اسے تبھی ساتھ بٹھاتا جس دن آٹے کی بوری نہ لانی پڑتی۔ پرانے ماڈل کی لاری جب مشکوک کو کھینچتی تو اکثر گرم ہو کر رک جاتی کیوں کہ ڈھائی من کی بوری سے وہ کہیں وزنی تھا۔
اسے بحث مباحثے کا اتنا خبط تھا کہ آتے ہی کوئی اول جلول موضوع چھیڑتا۔ پھر دوسرا، تیسرا، حتیٰ کہ سوال جواب شروع ہو جاتے۔ اگر کوئی تسلیم شدہ دلیلوں سے تردید کر بیٹھتا تو میز یا کرسی یا گھٹنے پر مکا مار کر (جو کبھی کبھی اس کی توند پر بھی لگ جاتا۔" وہی پرانی باتیں دہرائی جاتی ہیں۔ تبھی تو آگے بڑھنا مشکل ہو گیا ہے۔ ارتقاء کا ہوا ہے۔ انفرادیت ختم کر کے لکیر کے فقیر بن چکے ہیں۔ ریوڑ والی ذہنیت اختیار کر لی ہے۔۔۔۔"
فلاسفر سمجھتا کہ "جب بندر ارتقا کی منزل طے کر کے انسان بنے تھے تب ان میں کہاں کی انفرادیت تھی۔ جنگلوں میں اکٹھے ہی رہا کرتے تھے اور اب بھی یہی پوزیشن ہے۔ انفرادیت ہے تو صرف چڑیا گھر کے جانوروں میں جو الگ الگ رہتے ہیں۔ اس کے باوجود ان میں سے کوئی بھی انسان نہیں بن رہا۔"
وہ ایک اور مکا کہیں لگا کر پوچھتا۔۔۔۔ "کیا جانور انسان سے بہتر نہیں؟ ساری مخلوق میں فقط انسان ہی ہے جسے مسکرانے، ہنسنے کی صلاحیت ملی ہے لیکن کتنے انسان خوش رہتے ہیں۔۔۔۔؟" یہ پوچھنے کو جی چاہتا کہ وہ خود خوش کیوں نہیں رہتا۔
کیمسٹ بتاتا کہ جنوبی امریکہ کے گھنے جنگلوں میں کئی بلیاں ہیں جنھیں مسکراتے ہوئے دیکھا گیا ہے اور لکڑ بگڑ یعنی چرخ تو رات بھر بلا وجہ ہنستا رہتا ہے۔

مشکوک سر ہلا کر کہتا ۔۔۔۔ "تم سمجھے نہیں۔ جب جنگ ہوتی ہے تو انسان پہلے جتھے بنا کر منظم ہوتے ہیں۔ پھر دوسرے انسانوں کے بڑے سارے گروہ سے لڑتے ہیں۔ کبھی یہ بھی سنا کہ کسی جنگل کے پانچ چھ شیر آپس میں صلاح مشورہ کر کے دوسرے جنگل کے شیروں پر حملہ آور ہوئے ہوں یا چالیس پچاس ہاتھی ساز باز کر کے دیگر ہاتھیوں سے مقابلہ کرنے نکلے ہوں یا ساٹھ پینسٹھ اونٹوں نے ٹریننگ کر کے مخالف اونٹوں پر دھاوا بول دیا ہو ۔۔۔۔؟"

فلاسفر کہتا کہ جانوروں کو ابھی تک روپے پیسے کا پتہ نہیں ہے۔ جب ان میں تنخواہ اور الاؤنسوں کا سسٹم رائج ہو گیا تو وہ بھی جتھے بنا کر منظم ہونے لگیں گے۔

آہستہ آہستہ عادی ہوتے گئے۔ جو کچھ وہ کہتا، یا تو فوراً مان لیتے یا خاموش رہتے چناں چہ جب وہ لمبے لمبے وعظ کرتا تو ہم کسی گل دان، لیمپ یا جگ کی آڑ لے کر کتابیں پڑھا کرتے اور ذرا ذرا دیر کے بعد "درست ہے" "یا صحیح ہے" کہہ دیتے۔

بعد میں اسے شبہ ہو گیا ۔۔۔۔ "مجھے 'ہاں' نہیں چاہیے۔ تعجب ہے کہ پڑھے لکھے انسان اتنی آسانی سے متفق ہو جاتے ہیں۔ تم بحث کیوں نہیں کرتے؟ شاید اس لیے کہ سب کے ذہنوں کو زنگ لگ چکا ہے ۔۔۔۔"

"کل ضرور بحث کریں گے۔" کوئی صفحہ الٹتے ہوئے تسلی دیتا۔

"شاید یہ سچ کہہ رہا ہے۔" کیمسٹ سرگوشی کرتا۔ "جب سے یہ ملا ہے جو تھوڑے بہت ذہن رہ گئے تھے ان پر واقعی زنگ لگ چکا ہے۔ بلکہ کائی بھی اگنی شروع ہو گئی ہے۔"

فلاسفر بھی مباحثوں سے کترانے لگا۔ اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ ہر بحث کے تین پہلو ہوتے ہیں ۔۔۔۔ میری رائے، تمھاری رائے اور صحیح رائے۔

"اب سے مجھے وکیل سمجھا جائے جو تبھی بحث کرتا ہے جب کوئی معقول معاوضہ دے۔" اس نے اعلان کیا۔ "لہٰذا آئندہ میں مفت بحث نہیں کروں گا اور جو کچھ کہوں گا اس سے میرا متفق ہونا ضروری نہیں۔" کبھی کبھی شیطان مشکوک کی طرف داری سی کرتے ۔۔۔۔ "لگاتار انٹ کی سنٹ ہانکنا، حقائق کی توڑ مروڑ اور ہر چیز سے بےزاری ۔۔۔۔ شاید یہی ماڈرن رجحان ہو کیوں کہ ان دنوں لٹریچر، ریڈیو، فلمیں وغیرہ سب اسی کی عکاسی کر رہے ہیں۔"

مقصود گھوڑے نے اعتراف کیا کہ مشکوک سے پہلے نہ اسے بور ہونے کا پتہ تھا نہ بورنگ لوگوں کا۔ کبھی یہ لفظ سنا کرتا تو وہ بورنگ یاد آتی جو پٹرول نکالنے کے سلسلے میں کی جاتی ہے۔ تب یہ اندازہ تک نہ تھا کہ کسی کے پاس بیٹھنا پڑ جائے تو ایک گھنٹہ کم از کم چار پانچ سو منٹ کا معلوم ہوتا ہے۔

اور ایسے شخص کو دریافت کرنے کی ذمے داری انجنیر اور مجھ پر عاید ہوتی تھی۔

تہمیدہ، ملغوبہ کے بارے میں جو فقرے کہا کرتی وہ اس کی شان (بلکہ کسی کی شان) کے

شایان نہیں تھے۔
جب کبھی آمنا سامنا ہوتا اکثر چشم چٹ ہوا کرتی۔
"آج تو کسی کا میک اپ حد سے گزر چکا ہے۔" وہ ملغوبہ کی سج دھج دیکھ کر بتاتی۔ "اتنا زیادہ کر لیا ہے کہ عمر دس گیارہ برس سے بھی کم لگ رہی ہے۔"
اگر کوئی میرے متعلق جھوٹ نہ بولا کرے تو میں بھی اس کے بارے میں سچ نہیں بولوں گی۔" جواب ملتا۔ یا یہ کہ ۔۔۔۔ "یہاں ایک لڑکی ایسی ہے جس سے نہ ملنے کا موقع میسر آئے تو کبھی نہیں گنوانا چاہیے۔" تہمیدہ طنز کرتی۔
"اور ایک ایسی بھی ہے جو کانوں کی بجائے ہونٹوں سے سنتی ہے۔"
یا پھر کھلم کھلا تم اور میں کر کے گفتگو ہوتی ۔۔۔۔
"معاف کرنا۔ مصروف تھی اس لیے تمھاری پارٹی میں نہ آسکی۔" ملغوبہ کہتی۔
"تو کیا واقعی تم نہیں آئی تھیں؟" تجاہل عارفانہ برتا جاتا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ اگر تمھاری اگلی دعوت پر معذرت نہ کروں تو برا تو نہ مانو گی؟"
"ابھی ابھی معلوم ہوا کہ پندرہ بیس دن تمھاری طبیعت خراب رہی۔ تبھی سب حیران تھے کہ پندرہ بیس دن کوئی افواہ کیوں نہیں پھیلی۔"
اس قسم کی باتیں سن کر شیطان کو افسوس ہوتا۔ فلاسفر سے کہتے کہ معاشیات کے ماہر Man Power کے تحفظ کی سفارش کیا کرتے ہیں۔ یہاں سب کے سامنے ان دونوں کی اور بقیہ لڑکیوں کی ہر وقت کی جھڑپ سے Women Power ناحق ضائع ہو رہی ہے اور کوئی کچھ نہیں کرتا۔ اس چپقلش کی وجہ کیا ہے؟ رشک یا حسد ۔۔۔۔ جو غالباً ایک ہی جذبے کے دو اظہار ہیں۔ یا پھر دشمنی؟ اور رقابت تو ہو نہیں سکتی کیوں کہ اس کے لیے محبت پہلی شرط ہے۔ تو پھر یہ کیا ہے؟ اور پہل ہمیشہ تہمیدہ کی طرف سے کیوں ہوتی ہے؟ فلاسفر بتاتا کہ اس کا سبب ہر وقت کی بے کاری ہے لیکن شیطان تجسس سے مجبور ہو کر ایسے معاملوں میں خواہ مخواہ سینگ اڑا لیتے ہیں۔
وہ تہمیدہ میں خالی خولی دل چسپی لینے کی بجائے رازداں بنیں گے پھر اصل سبب معلوم کیا جائے گا۔ فلاسفر کو بھی یہ خوش خبری سنائی۔ "اس طرح ایک نئے Thesis کے لیے تمھیں بالکل انوکھا مواد مل سکے گا" لیکن تہمیدہ تھی کہ انھیں دیکھتے ہی ملغوبہ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیتی۔ شیطان کو دیر تک بولنے کا موقع نہ مل سکتا۔ تہمیدہ نے اپنے ناقابل اشاعت جملوں کا ذخیرہ پانچ چھے ملاقاتوں میں ختم کر لیا۔ پھر ان ہی کو بار بار دہرانے لگی۔
شیطان ٹوکتے، کھانستے، ہاتھ کے اشارے سے موضوع بدلنے کی کوشش کرتے لیکن اتنا سا اثر نہ ہوتا۔ یہ اتنی مرتبہ ہوا کہ انھیں ہار ماننی پڑی اور پسپا ہوتے ہوئے کہا۔ "جی تو بہت چاہتا تھا

کہ خلوت میسر ہو اور دل کھول کر باتیں کی جائیں۔ واقفیت اتنی بڑھے کہ وہ مقام بھی آئے جہاں یہ شعر پڑھا جاتا ہے:

کہاں وہ خلوتیں دن رات کی اور اب یہ عالم ہے
کہ جب ملتے ہیں جی کرتا ہے کوئی تیسرا بھی ہو

مگر یہ تیسرا روزِ اول سے موجود رہا، یا رہی، ہم دو کبھی نہیں تھے، ہمیشہ تین رہے۔ تم ملغوبہ اور میں! اور آئندہ بھی تین ہی رہیں گے۔"

تہمیدہ نہ شعر کے معنے سمجھ سکی نہ ان فقروں کا مفہوم۔ البتہ شبہہ سا ہوا کہ شاید اس کی تعریف کی گئی ہے۔

"اچھا اب پتہ چلا۔" وہ خوش ہو کر بولی۔ "آبشار سے واپسی پر آپ کھوئی کھوئی نگاہوں سے کبھی چاند دیکھتے کبھی مجھے اور اس چیز کی طرف آپ کی نگاہیں ایک دفعہ بھی نہیں گئیں جسے ملغوبہ کہا جاتا ہے (اس شام شیطان عینک بھول آئے تھے اور اٹکل پچّو ادھر ادھر جھانک رہے تھے کہ سب کہاں جارہے ہیں) اور میری دعوت پر بھی آپ نے مجھے زیادہ دیکھا اسے کم۔ بلکہ آپ اتنے محو تھے کہ کھانے تک کو ہاتھ نہیں لگایا۔ (تب بھی شیطان کی عینک نہیں تھی اور جب تہمیدہ کی دعوت پر جانا پڑتا تو ہم کھانا کھا کر پہنچا کرتے) لیکن آپ اس کی طرف دیکھتے ہی کیوں ہیں؟ آخر کیا ہے اس میں؟" اور پھر وہی Censor کی زد میں آنے والے الفاظ اور فقرے شروع ہوگئے۔ مجبوراً شیطان نے تجسس کے اس حصے کو وہیں چھوڑا اور سوچنے لگے کہ ملغوبہ میں دل چسپی لیں تو شاید وہی کچھ بتاسکے۔

لیکن فلاسفر نے منع کر دیا۔ "بہت سی باتیں اب تک انسانی عقل سے بالاتر ہیں۔" اس نے سمجھایا۔ "شاید یہ بھی ان میں سے ہو۔ میں تھیسس کسی اور موضوع پر لکھوں گا۔"

ملغوبہ کی دعوت پر ڈاکٹر کو پہلی مرتبہ بلایا گیا تو وہ غلطی سے بتائے ہوئے وقت پر پہنچ گیا۔ وہاں نہ کوئی میزبان تھا نہ مہمان، مکمل خاموشی طاری تھی۔

ملازم نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا جہاں بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں جو غالباً ملغوبہ کے رشتے داروں کی ہوں گی۔ سب کے آنے تک اس نے ایک ایک تصویر کو بڑے غور سے دیکھا۔ پھر کسی نے ایک رنگین پینٹنگ کے مصور کی تعریف کی تو ڈاکٹر نے تائید میں کہا ---- "دمے کے پرانے مریض کی اتنی عمدہ نقاشی کوئی استاد ہی کر سکتا تھا اور اس کے بائیں طرف جو تصویر ہے اس کا خالق بھی کافی تجربہ کار ہوگا۔ تبھی مالیخولیا اور خفقان کی علامات اس قدر صحیح دکھائی ہیں۔ انگیٹھی کے اوپر جو ضرورت سے زیادہ تن درست خاتون ہیں آرٹسٹ نے ان کے بائی بلڈ پریشر، اختلاجِ قلب اور گٹھیا کو بہ خوبی واضح کیا ہے۔ دروازے کے قریب تپِ دق کی پہلی اسٹیج

نہایت عمدگی سے کھینچی گئی ہے اور کھڑکی کے ساتھ سیاہ فریم میں جھانکتے ہوئے ڈھیلی موچھوں والے کاہاضمہ مدت سے جواب دے چکا تھا۔ محض کھینچا تانی سے گزارا ہوتا ہو گا۔۔۔۔"

ہم۔۔۔۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میں وقت پر پہنچ گیا،۔۔۔۔۔ والے فقرے کے منتظر تھے کہ پکے راگ کے کسی شوقین نے گھڑی دیکھی اور "میاں کی ٹوڈی ہو رہی ہوگی" کہہ کر ریڈیو اونچا کر دیا۔

جس قسم کی صدائیں آئیں ان سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جوشیلا تند خو کسی سے بدلا لینے پر تلا ہوا ہے۔ کچھ دیر وہ اور راگنی آپس میں الجھتے رہے۔ پھر اس نے وہ بھرپور حملہ کیا کہ بے چاری ٹوڈی کو بے بس کر کے چاروں شانے چت گرا لیا۔ راگنی نے توہین کے باوجود بھی ہمت نہ ہاری اور مدافعت کی بہت کوشش کی لیکن کچھ نہ ہوا۔ تھوڑی سی اور دھینگا مشتی کے بعد گویا اس کے سینے پر سوار ہو کر میاں یعنی تان سین کو چیلنج کر رہا تھا۔

اتنے میں دروازہ کھلا۔ پہلے ولایتی سینٹ کی دل آویز مہک آئی، پھر مرغ پلاؤ کے اشتہا انگیز جھونکے اور ان دونوں خوش بوؤں کے عقب سے ملغوبہ برآمد ہوئی۔

نہ کسی کو موسیقی کا خیال رہا نہ مصوری یا کسی اور فن کا۔ فوراً ساری نگاہیں پہلے ملغوبہ کی طرف پھر پلاؤ کی جانب مڑ گئیں۔

کھانے کی میز پر حسب معمول طرح طرح کے حضرات سے ملاقات ہوئی۔ ایک صاحب سیاحوں کے لیے سرائے تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ دوسرے کا ارادہ چھوٹی پہاڑیوں پر زیتون اور تربوز اگانے کا تھا۔ تیسرے نے بتایا کہ وادی کی کچھ ندیوں میں روپہلی چمک ہے اور چند میں سنہری لہٰذا وہ ان پہاڑوں میں سونے چاندی کی کانوں کی تلاش میں ہے۔

پھر ایک اور نے جو نچلے قصبے کی انجمن کے سکریٹری یا صدر یا خزانچی تھے، ہماری غیر حاضری کا گلہ کیا۔ اس انجمن کے ممبر گاہے گاہے میٹنگ سی کیا کرتے۔ جس میں نثر و نظم کے ذریعے یہ عہد کیا جاتا کہ ہم جیالے، چھبیلے، دلیر نوجوان اس قصبے، اس خطے، اس ملک کے گوشے گوشے پر نثار۔ فضاؤں کو جگ مگا کر ہم اس کے در و دیوار سونے کے بنا دیں گے۔ وہ عروج لائیں گے کہ آسمان تک ہماری زمین پر رشک کرے گا۔ سب کو خوش اخلاقی، امداد باہمی سکھائیں گے، یہ کریں گے، وہ کریں گے۔

بار بار یہی دوہرایا جاتا لیکن اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود مقامی باشندے بالکل ویسے کے ویسے تھے اور قصبہ، خطہ، ملک، کسی میں بھی ذرہ برابر فرق نہیں آیا تھا۔ یہاں تک کہ جس ہال میں یہ مجلسیں ہوا کرتیں اس کے جتنے بلب فیوز ہو چکے تھے ایک بھی نہیں بدلا گیا۔ شکستہ کھڑکیاں، دروازے مرمت کے منتظر رہے اور ٹوٹی ہوئی صراحیوں میں پینے کا پانی تک نہیں تھا۔

فلاسفر کی رائے تھی کہ انجمن کو کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ایسے دعوے یہ سمجھ کر کیے جاتے ہیں کہ ان کی تکمیل کرنا دوسروں کا فرض ہے۔ تبھی عہد کرنے والا اپنی تقریر یا تحریر کے بعد فوراً

ایک طرف ہو جاتا ہے کہ اب اس پر عمل کرنا نہ کرنا پبلک کا کام ہے۔

انجینیر نے اعتراض کیا کہ ایسے وعدے پریکٹیکل نہیں ہیں۔ شیطان نے ایضاً کہا اور ہم نے وہاں جانا چھوڑ دیا۔ ایک دفعہ تو انھوں نے قاصد بھی بھیجا لیکن مقصود گھوڑے نے دعوت نامہ پڑھ کر وہیں کھڑے کھڑے معذرت کر لی اور یہ بھی کہہ دیا کہ تقریب میں شامل نہ ہو سکنے کی وجہ بعد میں سوچ کر انھیں مطلع کر دیں گے۔

دوسرے پہاڑ پر جہاں لاری رکتی ملغوبہ کا مکان وہاں سے قریب تھا۔ سہ پہر کو اس طرف جانا ہوتا تو ملغوبہ، اس کی بہنیں، منگیتر، ایک آدھ رشتے دار ــــ سب آرام کرسیوں پر تقریباً اونگھتے ہوئے نظر آتے۔ مرغن لنچ چڑھ جانے سے ان پر وجدانی کیفیت طاری ہوتی۔ آپس میں کوئی گفتگو ہوتی ہوگی تو باتوں کی بجائے ان جمائیوں کے ذریعے جو وہ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر لیا کرتے۔ ایک دن ہم نے سڑک سے ہاتھ ہلائے، ہیٹ اچھالے، لیکن وہ اسی طرح مراقبے میں رہے۔

جب زور سے منگیتر کا نام لیا تب چونکے۔ اس نے ہمیں چائے پر ٹھہرالیا۔ ملغوبہ کے ہاں چائے بھی نہایت پر تکلف تھی۔ اسے پی کر بلکہ کھا کر باہر نکلے تو ڈھلتے ہوئے سورج کی ترچھی شعاعوں سے ساری وادی سنہری ہو چکی تھی۔ ہوا کے جھونکے سفیدے اور صنوبر کے درختوں کو چھیڑ رہے تھے۔

ایسے سہانے سماں میں ملغوبہ کو کچھ یاد آگیا۔ ایک طرف اشارہ کر کے اپنے الکسی اور جھکے ہوئے منگیتر سے رومانی لہجے میں بولی: "بھولے تو نہ ہوگے جب دسویں جماعت کا امتحان دیا تو اسی درخت پر چڑھ کر تمھیں دیکھا کرتی تھی ــــ"

منگیتر نے پہلے اسے دیکھا پھر درخت کو۔ "جواب چڑھنے کی کوشش کرو تو درخت سمیت نیچے آؤ گی۔" ایسے جواب پر کسی نے شولری کا حوالہ دیتے ہوئے احتجاج کیا۔

"وزن گھٹتا بڑھتا رہتا ہے ــــ" منگیتر نے بتایا۔ "اور دسویں جماعت میں انھوں نے کتنا عرصہ گزارا؟ یہ اب یاد نہیں رہا۔"

ہمیں منگیتر پنے کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا لیکن یہ منگیتر جو کزن بھی کہلاتا تھا کچھ ہونق سا لگا۔

جب چند دنوں کی بارش کے بعد روشن دن طلوع ہوتا تو سب خوش ہو کر اپنے پسندیدہ پروگرام بناتے۔ انجینیر اور میں ایک چوٹی کو فتح کرنے کی تیاری کرتے (جو فقط آٹھ نو سو فٹ اونچا ٹیلا تھا)۔ فلاسفر اور کیمسٹ اپنی وزنی کتابوں کی نمی دور کرنے کے لیے برآمدے میں دری بچھاتے کیوں کہ دھوپ میں رکھنے سے صفحے سکڑ جاتے تھے۔ تہمیدہ نئی (اور پرانی) افواہوں کی تلاش میں نکل جاتی۔ ملغوبہ کو دعوت کا خیال آتا۔ مہمانوں کی فہرست مرتب ہوتی جس میں زیادہ مرد ہوتے اور خانہ پری کے لیے چند بخشی ہوئی لڑکیاں (کسی خوب صورت لڑکی کو اس نے کبھی سہیلی نہیں

بنایا تھا) لیکن منگیتر جیسے قطب نما کو جدھر بھی گھمالو سوئی کا رخ شمال ہی کو رہے گا۔۔۔۔ اسے ایسے روز بھی چٹورپن کی دھن رہتی۔

ملغوبہ شکایات کرتی ۔۔۔۔ "انھیں سمجھائیے۔ دن بھر نیم دراز ہو کر سگر میں پیتے رہتے ہیں۔ کوئی قریب آبیٹھے تو دھویں سے لگاتار کھانستا ہے۔ تقریبوں پر مہمانوں کے سامنے آتے ہوئے اپنے حلیے کا خیال نہیں رکھتے۔ کھانے کی میز پر تو کسی کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔"

موقع ملنے پر منگیتر سے ذکر کیا تو جواب ملا۔ "مگر مجھے اس سے محبت ہے۔"

"وہ کہتی ہے کہ تم کئی کئی روز شیو نہیں کرتے۔"

"لیکن میں اس پر عاشق جو ہوں۔"

"اسی کو یہ شکایت ہے کہ دعوت پر مہمانوں کے سامنے سے بھی چیزیں اٹھالیتے ہو۔"

"مگر وہ مجھے اتنی اچھی لگتی ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔"

اسے یہ بھی گلہ ہے کہ سگریٹ بہت پیتے ہو اور اب تمھاری کھانسی پر بزرگوں کے کھنکارنے کا گمان ہونے لگا ہے۔"

"کہہ جو دیا کہ اس پر فریفتہ ہوں۔ اسے اور کیا چاہیے؟"

اس قسم کے منگیتر کو اور کیا کہا جا سکتا تھا۔

مگر روزانہ اسی سگریٹ پھونکنے پر ڈاکٹر نے پہلے تو حقہ تجویز کیا۔ اس کے انکار پر سگریٹ کے کاغذ اور Tar سے ڈراتے ہوئے صلاح دی کہ اگر بالکل نہیں چھوڑ سکتے تو کم ہی کر دو۔ اگلی ملاقات پر دیکھا کہ تعداد تو کم نہیں ہوئی تھی لیکن اب وہ قینچی سے کاٹ کر سگریٹ کا سائز ذرا کم کر لیا کرتا۔

"سگریٹ کی لمبائی نہیں سگریٹ نوشی کم کرنے کو کہا تھا۔" ڈاکٹر نے یاد دلایا۔ "بہتر تو یہی ہوگا کہ سگرٹوں سے دور رہو ۔۔۔۔"

بعد میں پتہ چلا کہ وہ کہیں سے لمبا سا سگریٹ ہولڈر لے آیا چناں چہ کش لگاتے وقت سگریٹ اور وہ ایک دوسرے سے واقعی دور ہوتے۔

پھر فلاسفر نے مشورہ دیا کہ "ہر شخص کو قوت ارادی عطا ہوئی ہے۔ تم بھی اسے آزماؤ۔"

منگیتر نے اپنی قوت ارادی استعمال کی اور آخر کار سگریٹ چھوڑنے کی ترغیب پر غلبہ پانے میں کامیاب ہو گیا۔

نہایت چمکیلے اتوار کو ہم پک نک پر نکلے۔ قہقہے لگاتے ہوئے چڑھائی طے کی۔ ایک طرف سامان رکھ کر کھیلوں کا پروگرام بنا رہے تھے کہ لاری نظر آئی اور بن بلایا مشکوک آ پہنچا۔ آتے ہی وہی باتیں شروع کر دیں۔ اتفاق سے موسم نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ہلکے ہلکے بادل اٹھے اور نظاروں

کو چھپانے لگے۔ روشنی کم ہوتی گئی۔

ہمیں بے توجہ پاکر وہ لڑکیوں کی طرف چلا گیا۔ نہ جانے کیا کہا، کیا نہیں کہا، ان کے مسکراتے ہوئے چہرے سنجیدہ ہو گئے۔ پھر ناک بھوں چڑھا کر گویا بھول گئیں کہ پک نک پر اس لیے آئی ہیں کہ ہنسیں بولیں، خوش ہوں۔ جیسے پہلوان اکھاڑے میں کودنے سے پہلے ڈنٹر بیٹھکیں نکالتے ہیں اسی طرح باقاعدہ لڑنے سے پہلے زیرِ لب طعنے تشنے شروع ہو گئے کہ کون کون کس کس پر ملتفت ہے۔ کن کن کی پوشیدہ ملاقاتوں سے ان سب کی باہمی دوستی پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ روئے سخن ہماری طرف بھی تھا۔ دبادب چوٹیں ہو رہی تھیں جو سراسر بے تکی تھیں۔

بادل گہرے ہوتے گئے اور اندھیرا چھانے لگا۔ شیطان نے مشورہ دیا کہ روشنی کم ہونے پر بیٹس مین امپائر سے کھیل ختم کرنے کی اپیل کر سکتے ہیں کیوں نہ اسی بہانے واپس چلیں۔

سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کیا جائے۔ اتنے میں کہیں سے ایک پھیری والا آ گیا جس کی کمر پر تھان تھے اور ہاتھ میں گز۔ اس نے لڑکیوں کو دیکھتے ہی گٹھڑ کھولا اور رنگ برنگے کپڑے پھیلا دیے۔ وہ ان پر ٹوٹ پڑیں اور یوں منہمک ہوئیں کہ پھر ہماری طرف ایک بار نہیں دیکھا۔

وہی لڑکیاں جو ذرا دیر پہلے ایک دوسری پر ناخن تیز کر رہی تھیں اب سگی بہنوں کی طرح بڑے پیار سے کپڑوں کے ڈیزائن، شیڈ، قیمت پر آپس میں باتیں کرنے لگیں اور ہم بے وقوفوں کی طرح یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

محض اس بزاز کی آمد سے پک نک نہ صرف کامیاب رہا بلکہ اگلے اتوار کا پروگرام بھی بنایا گیا۔ واپسی پر شبہہ سا ہوا کہ کہیں یہ لڑکیاں اور مشکوک ہماری رفاقت پر تو اثر نہیں ڈال رہے۔ اس کا احساس دیر سے ہوا لیکن واقعی ہم میں تبدیلیاں آ رہی تھیں۔

کیمسٹ کی بوسیدہ، چوہوں کی کتری ہوئی، قابلِ اعتراض مونچھیں اب معقول اور نوک دار نظر آتیں۔ دوسرے تیسرے روز حجامت کرنے والا مقصود گھوڑا روزانہ اتنی سنجیدگی سے شیو کرتا کہ ریزر سے دو تین خراشیں بھی لگا لیتا۔ پہلے اس کی پہاڑی واسکٹ سے بھیڑ بکریوں کی بو آیا کرتی لیکن اب وہ لکس صابن کا اشتہار بنا رہتا۔ شیطان کی عینک کے موٹے موٹے شیشے جن پر مکھن دہی اور سالن کے چھینٹے ہوا کرتے۔ اب صاف اور چمکیلے رہنے لگے۔ میری قمیض کے بٹن کھلے رہتے۔ آستینیں کہنیوں تک بلکہ کھینچ کھونچ کر کندھوں تک چڑھائی جاتیں۔

ہم ایک دوسرے کی ذرا ذرا سی بات کی جانچ پڑتال کرنے بیٹھ جاتے اور عموماً نتیجہ غلط نکالتے۔ یعنی کچھ کچھ نقاد سے بنتے جا رہے تھے جو ہر چیز پر نکتہ چینی کرتے ہیں، خواہ وہ اچھی ہی ہو۔ ناشتے پر مقصود گھوڑے کے چہرے پر خراش نظر آتی تو قیاس آرائیاں شروع ہو جاتیں۔

"شاید کنجوس ہے۔ پرانے بلیڈ استعمال کرتا ہوگا۔"

"بینائی کم زور ہو سکتی ہے، عینک لگا لینی چاہیے۔"

"نحیفہ کی فکر میں رعشہ لاحق ہو گیا۔ جس سے ہاتھ کانپتے ہیں۔"
"ریڈیو لگا کر حجامت کرتا ہو گا۔ یہ سیاسی خبروں کا اثر ہے۔"
حالاں کہ یہ مقصود گھوڑے کا پرائیویٹ معاملہ تھا۔ چہرہ اس کا تھا اور بلیڈ اس کا۔ خراش بھی اسی کو آئی تھی۔

"دوسروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے ڈھنگ ہیں۔" مشکوک کہتا۔ "حجامت وغیرہ محض بہانے ہیں۔" ایک دن انجینیر نے خبردار کیا۔۔۔۔ "خیال رکھنا۔ کہیں ان لڑکیوں کی وجہ سے، ہم میں پھوٹ نہ پڑ جائے۔" اس پر دیر تک خاموشی رہی۔

اگلے روز جب مٹیالے بادلوں کی بھاپ سے کمرہ بھرا ہوا تھا تو کسی کو انجینیر کا فقرہ یاد آگیا اور لڑکیوں کی باتیں شروع ہو گئیں۔

"میرے خیال میں تو ان سے ملنے میں کوئی خاص فائدہ نہیں۔" ایک کونے سے سنائی دیا۔
"کوئی نقصان بھی نہیں۔"
"مگر یہ فقط گرمیاں گزارنے آتی ہیں۔ ان کی حیثیت بیروں کی سی ہے۔" دوسری سمت سے صدا آئی۔ تیز جھونکا تھوڑے سے کہرے کو ساتھ لے گیا۔ جس نے بولنا شروع کیا اس کی شکل بھی دکھائی دی۔ فلاسفر کہہ رہا تھا۔ "کم از کم مجھے ایسی منطقی باتوں میں مت الجھاؤ۔ سن سن کر یوں ہی کہیں اشتیاق نہ ہو جائے اور خواہ مخواہ اس قیل و قال میں حصہ لینے لگوں۔"
پھر دھندلاہٹ بڑھ گئی۔
"فلاسفر نے سچ کہا ہے۔ یہ میرے ٹائپ کی بھی نہیں ہیں۔" کیمسٹ کی آواز آئی۔
"تو تمھیں کیسی لڑکیاں پسند ہیں۔"
"کسی اور طرح کی۔۔۔۔"

دھواں ہلکا ہوا اور شیطان کہتے ہوئے نظر آئے۔ "محض اتفاق سے ایسی لڑکیوں سے واسطہ پڑا ہے جن سے ملنے کی کسی نے درخواست نہیں کی تھی۔ ہمارے بارے میں ان کے خیالات بھی ایسے ہی ہوں گے یا شاید اور بھی گئے گزرے ہوں لیکن یہاں اتنی تنہائی ہے کہ کسی قسم کی بھی لڑکیوں کا دم غنیمت سمجھنا چاہیے۔ لہٰذا ان سے سفارتی تعلقات برقرار رکھنے میں کوئی ہرج نہیں۔ البتہ بین الاقوامی اداروں کی طرح جو کچھ دل میں ہو اس کا زبانی یا تحریری اظہار کبھی مت کرو۔" سیاہ بادل کا بھپارہ آیا جس سے سب کچھ چھپ گیا، لیکن گفتگو جاری رہی۔ جب باتیں تیز بحث میں تبدیل ہوئیں تو انجینیر بولا۔ "جس خدشے کا کل ذکر کیا تھا آج اس کا مظاہرہ تو نہیں ہو رہا؟ کبھی کبھی خراب موسم بھی تو تو میں میں کرا دیتا ہے۔ لہٰذا اس موضوع کو یہیں ختم کر کے ایک کیس پر مشورہ دو۔"

اس نے فائل کھولی۔

۵۵۵

اس کے تین ماتحتوں کے کاغذات ہیڈ آفس سے آئے تھے۔ ان میں ایک کو ٹریننگ کے لیے پانچ چھ سو میل دور بھیجنا تھا۔

"تعلیمی لحاظ سے تینوں یکساں ہیں۔" اس نے بتایا۔ "سروس بھی تقریباً برابر ہے اور سالانہ رپورٹ میں بھی ملتی جلتی ہیں۔ اس لیے چننے میں دقت ہو رہی ہے۔"

"اگر انھیں واقعی کچھ سکھانا ہے تو States بھیجو۔ ورنہ رہنے دو۔" کیمسٹ نے رائے دی۔

"تینوں ایک جیسے ہیں تو تینوں کو بھیجو، ورنہ کسی کو بھی نہیں۔" شیطان بولے۔

"مزید پڑھنے سے کچھ فائدہ ہوگا بھی یا نہیں۔" فلاسفر کہنے لگا۔ "کیوں کہ سروس کی قدریں بدل چکی ہیں۔ وہ دن گئے جب قابلیت کی قدر ہوتی تھی۔ اب تو تم کیا کچھ جانتے ہو، کی جگہ تم کس کس کو جانتے ہو، کی اہمیت رہ گئی ہے۔"

میں نے انٹرویو کرنے کو کہا لیکن وہ کافی دور تھے اور جواب کی جلدی تھی۔

ان کی تصویریں دیکھیں جنھیں فوٹو گرافر اس قدر ری ٹچ کر چکا تھا کہ تینوں بالکل سپاٹ لگے۔ میں نے دوبارہ مشورہ دیا کہ ایک میل کی دوڑ لگواؤ جو جیتے اسے چن لو۔

"یہ نام کے ہی نوجوان ہیں۔" انجینیر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "دوڑنا تو ایک طرف یہ درشنی پہلوان ایک میل تیزی سے نہیں چل سکتے۔"

"پچھلے سال مجھے بھی کچھ ایسا ہی انتخاب کرنا پڑا تھا۔ شاید میں مدد کر سکوں۔" مقصود گھوڑا بولا۔ پھر اس نے فائل کے صفحات بار بار الٹ کر یہ فیصلہ سنایا۔ "ایک امیدوار۔ ایم۔ آئی۔ میاں ہے۔

دوسرا آئی۔ ایم۔ شیخ اور تیسرا وائی۔ آغا۔ جہاں یہ بہ ظاہر ایک سے ہیں۔ وہاں ان میں فرق بھی ہے۔ ایم۔ آئی۔ میاں کو اپنے اوپر اعتماد نہیں اور وہ الجھن میں ہے کہ کیا میں واقعی میاں ہوں؟ ایم۔ وائی۔ آغا کی حالت اور بھی مخدوش ہے۔ وہ تو باقاعدہ خلجان میں مبتلا ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں کہ وہ آغا کیوں ہے؟ البتہ آئی۔ ایم۔ شیخ کو پورا یقین ہے کہ میں شیخ ہوں اور شیخ ہی رہوں گا لہٰذا میں اس کی سفارش کرتا ہوں۔"

چند دنوں بعد شیطان نے شکایت کی کہ کوئی ان کی طرف سے ریکارڈوں کی فرمائش کر دیتا ہے اور ریڈیو نام اور پتہ شیطان کا سناتے ہیں۔

ہم نے یہ فرمائشی پروگرام سنا۔ خاتون اناؤنسر نے آواز کو زبردستی شرمیلی اور سریلی بناتے ہوئے پہلے کیمپ کا نام لیا پھر کہا۔۔۔۔ "وہاں سے رومانی صاحب نے اپنے ڈاکٹر دوست کی سال گرہ پر اس ریکارڈ کی فرمائش کی ہے جس میں یہ شعر ہے:

آگئی آپ کو مسیحائی

مرنے والوں کو مرحبا کہیے !

تورومانی صاحب عرض یہ ہے کہ ہم داغ کی ---- "کیسے کیسے کیسے مجھے برا کہیے" ---- والی غزل سناتو رہے ہیں لیکن شاید آپ کے ڈاکٹر دوست "آگئی آپ کو مسیحائی ، کے شعر سے خوش نہ ہوں ۔ کہیں یہ گانا رنگ میں بھنگ نہ ڈال دے ۔"

دوسرے ہفتے سب آدھ گھنٹہ پہلے ریڈیو کے سامنے موجود تھے ۔ خاتون اناؤنسر نے پھر نارمل آواز مصنوعی بنائی اور مٹک مٹک کر بتایا ---- "ہمارے جانے پہچانے پہاڑی کیمپ سے روفی صاحب کی ڈاکٹر دوست اس مرتبہ روفی صاحب کی سال گرہ پر انھیں یہ غزل سنانا چاہتے ہیں:

رات شیطاں کو خواب میں دیکھا

ساری صورت جناب کی سی تھی

روفی صاحب کو سال گرہ مبارک ہو! لیکن ہم معذرت خواہ ہیں کہ ایسا کوئی نغمہ ریکارڈ نہیں ہوا لیکن کہیں آپ مایوس نہ ہوں ، اس لیے بڑی تلاش کے بعد فارسی سیکشن سے ایسی غزل مل سکی جس میں شیطان کا ذکر یوں ہے کہ یزداں دارد و شیطان نہ دارد ---- امید ہے کہ ----"
شیطان نے فوراً ریڈیو بند کر دیا اور جو بزدل ان کی طرف سے خط لکھتا تھا اس کی شان میں کئی گستاخیاں کیں ۔

تیسرے ہفتے ایک کرخت سی آواز آئی ----

پہلے تو اس نے یہ خبر سنائی کہ ---- "پروگرام کی ہر دل عزیز اناؤنسر اب ہم سے دور جا چکی ہیں ۔ (ہم یہی سمجھے کہ وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں) ان کی منگنی دیہاتی پروگرام چوہدری باغ دین سے ہو گئی ہے ۔" پھر چند ریکارڈ سنانے کے بعد ہمارے کیمپ کا ذکر کیا" نہ جانے یہ کون سی جگہ ہے ، اور ہے بھی یا نہیں ، جہاں ہر ہفتے کسی نہ کسی کی سال گرہ ضرور منائی جاتی ہے ۔ اب وہاں سے مقصود اسپی مس نحیفہ کی سال گرہ پر ، جو عید کو ہو گی ، یہ گانا سنانا چاہتے ہیں:

خوشی سال بھر کی مُنا کر ملے

کہ وہ عید بھی کسمسا کر ملے

اسپی صاحب ، اگرچہ پوری غزل ہم نے نہیں سنی لیکن یہ شعر پسند آیا ۔ ایسے نغمے ریکارڈ ہونے لگے تو سارے سابقہ ریکارڈ توڑ دیں گے ۔ معاف کیجیے ، یعنی مقبول ہوں گے ۔"

اور اگلے ہفتے اسی اناؤنسر نے تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا ---- "اسی پہاڑی کیمپ سے جو فرمائش اس مرتبہ آئی ہے ، ہم سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں کہ یا تو پروگرام بند کر دیں اور یا ایسے خطوط پر آئندہ کوئی ایکشن نہ لیا کریں ۔"

مشکوک جب آتا کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑ جاتا ۔

بعد میں ہم چوکنے رہنے لگے لیکن وہ یہ سب ایسی چالاکی سے کرتا باہر کسی نہ کسی کو ضرور تشویش ہو جاتی۔

"کل ایک اجنبی تمھارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔" وہ چلتے وقت کہتا۔

"کون تھا؟"

"پتہ نہیں۔ لیکن لہجہ کچھ ایسا تھا جیسا خفیہ پولیس والوں کا ہوا کرتا ہے۔"

کبھی بتاتا کہ "نچلے قصبے میں سنا کہ تمھارے لیے کسی شہر سے ٹرنک کال آئی تھی اور ڈھونڈنے کے لیے ہرکارہ بھی اوپر بھیجا گیا۔"

"کس کے لیے تھی؟"

"بھول گیا۔ یاد آیا تو بتادوں گا۔"

نیچے جاکر پوچھتے اور کئی روز تک کال کا انتظار رہتا۔

یا پھر ---- "کوئی کہہ رہا تھا کہ تمھارے ذمے انکم ٹیکس نکلتا ہے۔"

ہمیں پتہ تھا کہ جو معمولی سا انکم ٹیکس لگتا ہے وہ باقاعدگی سے وصول کر لیا جاتا ہے، پھر بھی سوچنے بیٹھ جاتے کہ شاید کچھ ادائیگی رہ گئی ہو۔

ملغوبہ کی دعوت پر شیطان کو لڑکیوں نے گھیر لیا۔

"میری عمر زیادہ ہے یا ملغوبہ کی؟" تہمیدہ نے کھلم کھلا پوچھا۔

"تم ملغوبہ سے کم عمر نظر آتی ہو اور یہ تم سے چھوٹی دکھائی دیتی ہے۔" شیطان کو کہنا پڑا۔

"اور میں ----؟" نحیفہ بولی۔

"تم جتنے برس کی ہو اتنے کی بالکل نہیں لگتیں۔"

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بھی مشکوک کی کارستانی تھی۔ شیطان کے سر یوں ہی منڈھ دیا کہ وہ لڑکیوں کی عمر جان بوجھ کر زیادہ بتاتے ہیں۔

انجینیر اپنی رپورٹ ٹائپ کرا رہا تھا۔ مشکوک نے بہ مشکل ایک صفحہ دیکھا ہوگا کہ بولا "ایسی رپورٹیں عموماً ہیڈ آفس سے اعتراضات کے ساتھ واپس کر دی جاتی ہیں۔"

انجینیر جانتا تھا کہ ٹیکنیکل باتیں مشکوک کی سمجھ میں بالکل نہیں آسکتیں، پھر بھی کئی روز اس کے ذہن پر بوجھ سا رہا۔

وہ جھوٹی خوش خبریاں بھی سنایا کرتا جنھیں بعد میں غلط پاکر دگنا افسوس ہوتا۔

مثلاً کیمسٹ کو بتایا کہ اسے لمبے کورس پر امریکہ بھیجا جا رہا ہے۔ وہ حیران ہوا کیوں کہ سروے (جو کچھ بھی وہ تھی) ابھی تک مکمل نہیں ہوئی تھی لیکن مشکوک نے اصرار کیا کہ اس کی عمدہ کارکردگی پر یہ انتخاب ہوا ہے۔ کافی انتظار کے باوجود کوئی اطلاع نہ آئی۔

"پوری ٹیم کو سردیوں سے پہلے واپس بلایا جا رہا ہے۔" اگلی خبر یہ تھی۔

اس پر سب خوش ہوئے۔ مگر دن گزرتے گئے اور کچھ نہ ہوا۔

"تمھاری ترقی کی خبر گرم ہے" ----انجینیر سے کہتا۔ وہ خاموش رہتا لیکن ہم پوچھتے کہ اسی جگہ ہو گی یا کہیں اور جانا ہو گا؟

"پتہ نہیں۔"

ایسی باتوں پہ سب جھنجلاتے لیکن وہ یہی دوہرایا کرتا کہ "جو کچھ سنا تھا کہہ دیا کچھ اور معلوم ہوا تو وہ بھی بتادوں گا۔

کبھی کبھی یوں لگتا کہ ہماری خوش فکری اسے پسند نہیں اور جیسے چیلنج سا کرتا رہتا ہے کہ اس کی موجودگی میں ہمیں مسرور رہنے کا کیا حق ہے۔

مغرب کے بعد کینٹین کی لاری اسے لے جاتی۔ پھر وہ نظر تو نہ آتا لیکن ذہن پر سوار رہتا دیر دیر تک اس کی باتیں ہوا کرتیں ----

انجینیر بتاتا کہ مشکوک اسے ان مشتبہ ہستیوں کی تصویروں کی یاد دلاتا ہے جو مغربی ممالک کے عجائب گھروں کی زینت ہیں اور جن کے چہروں پر اس مسلسل ایذا اور تشدد کے آثار نمایاں ہیں جو وہ اپنے آپ کو پہنچاتے رہے اور غالباً اپنے رفیقوں، شاگردوں اور مریدوں کو بھی اور یہ کہ وہیں اس نے یہ بھی سنا تھا کہ پچاس سال کی عمر عبور کر کے ہر ایک کا چہرہ بالکل ویسا ہی ہو جاتا ہے جس کا وہ واقعی مستحق ہو لیکن نہ جانے کیوں مشکوک کو اس عمر سے پہلے ہی وہ چہرہ مل چکا ہے۔

ڈاکٹر نے اب تک مشکوک سے مشابہت رکھنے والے فقط چار پانچ کیس دیکھے تھے ---- اعصابی امراض کے وارڈوں میں لیکن جس علامت سے تشخیص پر شبہ ہونے لگا وہ تھی ---- کھی کھی کھی ہی ہائپ ---- کی کھو کھلی آواز۔ جسے مشکوک تو ہنسی سمجھتا ہو گا لیکن ڈاکٹر نے ایسی صدا کہیں نہیں سنی تھی ---- یہاں تک کہ چڑیا گھر میں بھی نہیں ----

کیمسٹ جو جڑی بوٹیوں کے چکر میں گھنے جنگل کی سیر اکثر کیا کرتا، کہنے لگا "وہاں ایک روز جھاڑیوں میں سے بالکل ایسا ہی چہرہ جھانک رہا تھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ چہرہ کسی درمیانے سائز کے چوپائے کا تھا یا بہت بڑے پرندے کا لیکن اس پر عینک نہیں تھی۔"

شیطان دوہراتے کہ مشکوک موجودہ مشینی دور کی بے چینی، افراتفری، چھینا جھپٹی کی نمائندگی بلکہ وکالت کرتا ہے۔ وہ دن گئے جب طلوعِ آفتاب دیکھ کر انسان خوش ہوا کرتا کہ ایک اور دن دیکھنا نصیب ہوا۔ اب تو جگمگاتی خوش گوار صبح کا استقبال مسرت کی بجائے چڑچڑے پن سے کیا جاتا ہے۔ ویسے ہر برائی کا ذمے دار مشینوں کو بھی نہیں ٹھہرایا جا سکتا ---- کیوں کہ مشینیں نہ ایک دوسری سے بات کر سکتی ہیں نہ انسان کو ورغلا سکتی ہیں۔

مگر مقصود گھوڑا یہی کہتا کہ بار بار دیکھو تو مشکوک نارمل نظر آنے لگتا ہے۔ دراصل مقصود کو ہر واقعہ، نظارہ، ہر جان دار ---- سب کچھ نارمل معلوم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے

آپ کو بھی نارمل سمجھتا ہے۔

دھند طرح طرح سے آتی ----- جھاڑیوں میں سے دھنکی ہوئی روئی کا بڑا سا بھپکا نکلتا۔ ایک کے بعد دوسرا، پھر تیسرا چوتھا ----- پہلے چوٹیاں چھپتیں پھر درختوں کے جھنڈ، کیمپ کی سڑکیں، مکان اوجھل ہو جاتے اور یوں لگتا جیسے بالکل سپاٹ میدانوں میں بیٹھے ہیں۔

یہی دھند جب نیچے سے اٹھتی تو وادی کئی کئی دن غائب رہتی۔ تب ایسی گھٹن محسوس ہوتی کہ چاروں طرف سے پہاڑوں نے گھیر لیا ہو۔

کبھی یہ اوپر کے گھنے جنگلوں سے اترتی، ڈھلان پھر پھسلتی بہتی جاتی حتیٰ کہ اتنی بڑی وادی سمٹتے سمٹتے ذرا سی رہ جاتی یا پھر نشیب میں پہنچ کر اس طرح بکھرتی کہ وادی کے کئی بڑے حصے کر دیتی ---- ایک طرف چھوٹا سا گاؤں اکیلا رہ جاتا۔ ادھر چند باغ اور کھیت۔ یہاں آپس میں ملتی ہوئی دو شفاف ندیاں، تو وہاں صرف بل کھاتی سڑک اور گہرے کھڈ۔

جوں ہی دھند نظر آتی ہم فوراً روشن دان، کھڑکیاں، دروازے بند کر دیتے لیکن کمروں میں سب کچھ دھندلا ہونے لگتا۔ آہستہ آہستہ ہم میں سے ہر ایک بھاپ سے گھرا ہوا تنہا جزیرہ بن جاتا۔ قمقمے جلاتے تو روشنی ایک ڈیڑھ فٹ سے آگے نہ جاتی۔ گراموفون یا ریڈیو بجاتے تو یہ پتہ نہ چلتا کہ آواز کس سمت سے آرہی ہے۔ یہ کیفیت دیر تک رہتی تو کبھی کبھی دھند میں مبہم سے ہیولوں کا دھوکا ہوتا۔ پھر یوں لگتا جیسے وہ محض سائے نہیں سچ مچ کے پیکر ہوں۔ ان پر طرح طرح کے وہم ہوتے۔

ایسے موسم میں زیادہ وقت اپنے اپنے کمروں میں گزرتا جو کیبن جتنے چھوٹے تھے ادھر مشکوک آدھمکتا۔ اس کی متواتر موجودگی سے ہماری چھ سات فی صد افسردگی ستر اسی کے ہندسوں کو چھونے لگتی اور کئی مرتبہ یہ بھی ہوا کہ کسی نے جی بہلانے کی کوشش کی تو اس کی طرف مجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں، ہم بے زار بیٹھے ہیں ---- کے انداز میں دیکھنے لگے۔

جب دھند اور بادل کئی روز تک نہ چھٹتے تو لوگ تنگ آکر چھتری، برساتی، چوڑے ہیٹ، جو کچھ ملتا لے کر سڑکوں پر نکل آتے۔

گہری دھند میں صرف تین چار فٹ تک دکھائی دیتا۔ چلتے چلتے دفعتہً ایک شکل سامنے آجاتی اور فوراً ہی دھند میں غائب ہو جاتی۔ نیم تاریک کہریلی فضا میں قسم قسم کے چہرے سامنے آتے جن پر مختلف اظہار ہوتے۔

کوئی ایسی نگاہوں سے تکتا ہوا گزر جاتا جن میں شک و شبہ ہوتا اور افسوس بھی کہ ایک اور انسان کیوں نظر آگیا۔ اس کے بعد ہنس مکھ سی صورت جھلک دکھا کر خوش آئند اثر چھوڑ جاتی۔ پھر کسی کے نظریں بچا کر ٹیڑھی سمت میں نکل جاتے یا سامنا ہوتے ہی نگاہیں موڑ لینے پر حیرت

ہوتی۔ کوئی اتنا اداس اور فکر مند دکھائی دیتا کہ اس پر ترس آتا۔ ذرا دیر میں ایک بے باک، نڈر سا بانکا سیٹی بجاتا گزر جاتا۔ کبھی پل بھر کے لیے ایسی من موہنی شکل سامنے آتی جسے دوسری دفعہ بلکہ بار بار دیکھنے کو جی چاہتا لیکن دھند ہر ایک کو چھپا لیتی۔

شروع شروع میں یہ عجب سا لگتا۔ پھر خیال آیا کہ یہ نظارہ اس پہاڑ تک محدود نہیں۔ ازل سے ابد تک چھائی ہوئی دھند میں بھی یہی پیش آتا ہے۔

زندگی کی غیر واضح راہوں میں جب دھندلاہٹ کم ہوتی ہے تو طرح طرح کی شبیہوں سے واسطہ پڑتا ہے ---- کوئی بھولا، سہما سہما سا، چپ چاپ گزر جاتا۔ کوئی مسکراتا، ہنستا، خوش باش ہر ایک سے دوستی کو تیار، تو کوئی مطلب پرست گھاگ، مکر اور چالاکی کی تصویر، دغابازی پر تلا ہوا اور پھر کوئی نک چڑھا مغرور اور اس کا تکبر ---- یہ اور دوسرے آتے ہیں اور باری باری اوجھل ہو جاتے ہیں۔

نحیفہ نے چائے پر بلایا۔ وہاں ایک میز پر ناشتے سے ڈنر تک کے سارے لوازمات سجا رکھے تھے۔ کسی چیز کی کمی تھی تو چائے کی۔

مقصود گھوڑا دیر سے پہنچا۔ وہ پیاسا تھا یا بھوکا، یا دونوں۔ ادھر ادھر جھانک کر سامنے کھڑی ہوئی لڑکی سے بولا۔ "محترمہ کہیں چائے دانی تو نہیں دیکھی؟"

بڑی ہو، ہم عمر یا چھوٹی ---- اس کے لیے ہر لڑکی محترمہ ہے۔ اصلی وجہ صنفِ نازک کا احترام نہیں، بلکہ وہ نام بھول جاتا ہے۔

اس نے چائے دانی اٹھائی تو وہ ہلنے لگی کیوں کہ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

سادی سی نحیفہ نے دیدہ زیب بھڑکیلے میک اپ کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی ملغوبہ کی طرف دیکھا اور مقصود گھوڑے سے سرگوشی کی ---- "حسن و جمال کے رعب سے تھرا رہے ہو کیا؟"

اس نے دونوں ہاتھوں سے چائے دانی قابو میں کرتے ہوئے کہا۔ "کون سا حسن و جمال؟ اور کیسا رعب؟ ابھی ابھی ایک سو ایک ڈنٹر نکال کر آیا ہوں۔ بازو ذرا اتھکے ہوئے ہیں۔"

اس کی ورزش پر سب کو حیرت ہوئی کیوں کہ شروع ہی سے اس کا اصول رہا ہے کہ زندگی میں کچھ نہ کرو اور کچھ نہ کرنا بھی ہو تو آہستہ آہستہ کرو۔

"یعنی تم لوگ چائے سے پہلے بھی کسرت کرنے لگے ہو؟" مشکوک نے فوراً پوچھا۔

مشکوک کو ہر اس جنبش پر جس سے سانس چڑھتا ہو اعتراض تھا۔ وہ بار بار کہتا کہ انسان اور خصوصاً انٹلکچوئل آدمی کو جسمانی کسرت نہیں ذہنی ورزش ہی زیب دیتی ہے۔

اس موضوع پر اکثر بحث ہوا کرتی -----

وہ تمہید باندھتا کہ سست جانور اور پرندے مثلاً ہاتھی، کچھوا، گدھ وغیرہ طویل عمریں پاتے ہیں لیکن جو زیادہ پھرتیلے ہیں جیسے ہرن، شکرا وغیرہ ان کی زندگی مقابلتہً کم ہے۔ سادھو

سنیاسی مدتوں سے تلقین کر رہے ہیں کہ جو دنیا میں آتا ہے اس کے سانسوں کی تعداد مقرر ہو چکی ہے چناں چہ سانس آہستہ آہستہ لیے جائیں تو زندگی طویل کی جا سکتی ہے۔ اگر اچھل کود سے سانس چڑھاتے رہے تو یہ ٹوٹل قبل از وقت ختم ہو جائے گا اور پھر جوانی میں تو ورزش برداشت کی جا سکتی ہے، بعد میں نہیں۔ تبھی پہلوانوں کا بڑھاپا اکثر خراب ہوتا ہے۔۔۔۔"

"اگر چہ مجھے ابھی تک بڑھاپا نہیں ہوا۔" ڈاکٹر بتاتا "لیکن سب جانتے ہیں کہ بڑھاپا خود ایک بیماری ہے۔ اس عمر میں پہلوانوں اور غیر پہلوانوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہونا چاہیے۔ بڑھاپا تو ایکٹروں ایکٹرسوں کا بھی اچھا نہیں ہوتا حالاں کہ وہ ورزش نہیں کرتے۔ ان کا انحطاط شاید پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے۔"

"ایکٹر تو خیر داڑھی مونچھ لگا لیتے ہیں۔" کیمسٹ کہتا "لیکن ایکٹرسوں کی عمر اس لیے زیادہ لگتی ہوگی کہ انھیں قسم قسم کے کیمیکل تھوپنے پڑتے ہیں جو چہرے کی نرم جلد کو کھردرا کرتے ہیں حتیٰ کہ وہ جلد کی جگہ کچھ اور چیز بن جاتی ہیں۔"

انجینیر بھی مشکوک سے اختلاف کرتا۔۔۔۔ "مشینری کو ٹھیک حالت میں رکھنے کا پہلا اصول یہ ہے کہ اسے مسلسل استعمال کیا جائے۔ اس طرح دیکھ بھال ہوگی اور حفاظت بھی۔۔۔۔ لہٰذا انسانی جسم سے لگاتار کام نہ لیا جائے تو گھن لگ سکتا ہے۔"

"اگر سانس لیتا ہوا جسم اور بے جان مشینری ایک جیسے ہیں تو ان پر زائد بوجھ ڈالنا کہاں کی دانش مندی ہے؟" مشکوک کہتا۔ "فالتو وزن کھینچ کھینچ کر کوئی بھی مشین رہ جائے گی۔ جیپ کے پیچھے ٹریکٹر کا ٹریلر باندھے پھر تو کیا جیپ کا انجن چست ہو کر زیادہ دیر چلے گا؟ رہ گئے تمھارے کھیل۔۔۔۔ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ بالغ اور سمجھ دار نوجوان ہر وقت اپنے سے کہیں چھوٹی گیندوں کے پیچھے کیوں لگے رہتے ہیں؟ فٹبال ہو، بیس بال یا والی بال یا کرکٹ، ہاکی، اسکواش وغیرہ کی گیندیں، بھاگ بھاگ کر انھیں ٹھوکروں، مکوں اور بلوں سے یوں دبادب پیٹتے ہیں کہ تفریح کی بجائے افسوس ہوتا ہے۔۔۔۔"

"چچ چچ چچ۔۔۔۔ حد ہو گئی۔" فلاسفر سر ہلاتا۔ "گیند کو پیٹنا ہی تو نہیں ہوتا۔ اصلی چیز ہے مہارت کہ کس زاویے پر کتنی رفتار اور کیسے انداز سے۔۔۔۔ گیند کو پھینکنا ہے۔ مقابلہ حریفوں سے ہوتا ہے جس کے لیے ہمت اور پھرتی کی بھی ضرورت ہے۔"

"بیس بال اور کرکٹ میں بیٹس مین ہٹ لگاتے ہی دوڑ جاتا ہے۔ جو مار کر بھاگ جائے اسے تم ہمت والا کہتے ہو؟" مشکوک پوچھتا۔ "اور تمھارا یہ دعویٰ صحیح مان لیں کہ فلسفہ قدیم ترین علم ہے تو اپنے دلائل سے مجھے قائل کیوں نہیں کر سکتے؟"

"ایسے سوال کا جواب صدیوں پہلے دیا جا چکا ہے۔" فلاسفر بتاتا "جب ایتھنز میں تمھاری قسم کے لوگوں نے سقراط سے پوچھا کہ تم جو اپنے آپ کو ہم سے عقل مند سمجھتے ہو، بتاؤ کہ وہ کیا

ہے جو تمھیں معلوم ہے اور ہمیں نہیں؟" اس نے کہا کہ "فرق صرف اتنا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ لیکن تم نہیں جانتے کہ تم کچھ نہیں جانتے ۔۔۔۔۔"

۔۔۔۔ اور جہاں تک تمھاری اس عمر بڑھانے والی تھیوری کا تعلق ہے، سو اگر زندگی کو نوے پچانوے سال تک کھینچ دیا جائے تو اس طرح جوانی کا دور طویل نہیں ہوگا بلکہ بڑھاپا لمبا ہو تا جائے گا۔ لہٰذا یہ گننے کی بجائے کہ زندگی کے سال کتنے ہیں یہ جانچنا چاہیے کہ ان برسوں میں مستعدی اور چستی کتنی ہے۔۔۔۔"

مقصود گھوڑا جو ان دنوں ورزش کی طرفداری کرنے لگا تھا، کہتا "غالباً یہ شعر تو سنا ہوگا

لق لق نصیب خفتہ کو کیوں رو رہے ہیں آپ
اپنے جگر کے فعل کو بیدار کیجیے

"ظاہر ہے کہ بھاگ دوڑ سے اعضائے رئیسہ ورکنگ آرڈر میں رہتے ہیں۔ بلکہ اعضائے غریبہ کو بھی فائدہ پہنچتا ہے اور سب کو پتہ ہے کہ ذہنی تن درستی کا جسمانی صحت سے گہرا تعلق ہے لیکن مشکوک پر اتنا سا اثر نہ ہوتا۔ وہ جس کان سے سنتا اسی سے باہر نکال دیتا۔

جب بھی وہ آتا تو ہمارے کھیل کود کے وقت ۔۔۔۔ تاکہ مجبوراً اس کے ساتھ بیٹھنا پڑے۔

ملازم چائے کے برتن اٹھاتا تو اسے یاد آتا کہ یہ چائے گرم نہیں تھی۔ دوبارہ منگاتے۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ بھی نیم گرم لگتی۔ وہ بتاتا کہ دودھ ٹھنڈا ہوگا۔ دودھ گرم کراتے تو شاید شکر سرد رہ جاتی۔ ساتھ ہی کھڑکی سے باہر جھانکتا رہتا۔ اس انتظار میں کہ اندھیرا خوب گہرا ہو جائے اور آج کسی ورزش کا امکان نہ رہے۔

پھر کسی کتاب سے سناتا "وزن پر مستقل کنٹرول ناممکن ہے۔ میل بھر پیدل چلو تب تقریباً تین سو کیلوری بھسم کی جا سکتی ہیں، یعنی فقط نصف اونس وزن کم ہوگا۔ آدھ سیر وزن گھٹانا ہو تو بتیس تینتیس میل اور ایک سٹون کے لیے لگاتار ساڑھے چار سو میل پیدل چلنا ہوگا اور ورزش چھٹ گئی تو نہ صرف گھٹائے ہوئے سیر فوراً واپس مل جائیں گے بلکہ وزن پہلے سے بھی بڑھ سکتا ہے۔" یا یہ کہ ۔۔۔۔ "دودھ مکھن پر تنقید کی جاتی ہے کہ بھاری اور سست کر دیتے ہیں۔ کبھی یہ بھی سوچا کہ چھوٹا سا ناتواں بچھڑا گائے کے خالص دودھ سے ایسا تن درست و توانا بیل بنتا ہے جو دن بھر ہل چلانے کے بعد بھی نہیں تھکتا۔"

"وزن اور کیلوری وغیرہ کی باتیں فربہ لوگوں سے کرنی چاہئیں۔" کیمسٹ تنگ آکر ٹوکتا "یہاں ہمارے ساتھ نہ کوئی موٹا رہتا ہے نہ آرام طلب۔"

نچلے قصبے میں کھیلوں کے میدان تھے۔ کام سے واپسی پر ہم سیدھے وہاں جانے لگے لیکن اسے پتہ چل گیا۔ اب وہ سہ پہر کو وہیں منتظر ملتا اور فوراً کھینچ کر کیفے میں لے جاتا جہاں کسی نہ کسی

طرح شام کرادیتاچناں چہ پروگرام ترک کرنا پڑا۔

مقصود گھوڑے نے بتایا کہ سیمنا کا مینیجر اکثر شکایت کیا کرتا ہے کہ جن جن کو فلمیں ادھار دکھائی پڑیں ان میں سے کسی نے بھی قرض نہیں چکایا، بلکہ ایک ایک کرکے روپوش ہوگئے۔ہیں تو وہ یہیں لیکن سیمنا نچلے قصبے میں دیکھتے ہیں۔

اس مشورے کو آزمایا گیا۔ پہلی تاریخ کو چندہ اکٹھا کرکے مشکوک سے کہا کہ اتفاق سے ہمیں کئی مہینوں کا T.A.D.A اکٹھا مل گیا ہے۔اسے ضرورت ہو تو ایک ماہ کے لیے کچھ ادھار دے سکتے ہیں۔اس نے فوراً روپے لے لیے۔

مہینہ گزر گیا لیکن کوئی فرق نہ پڑا۔ یہ سوچ کر کہ شاید اسے یاد نہ رہا ہو، اگلے مہینے پھر قرض دیا۔ تیسرے مہینے ادھار لوٹانے یا روپوش ہونے کی بجائے جب اس نے اشارۃً یہ ظاہر کیا کہ تیسری قسط کا منتظر ہے تو اس پروگرام کو بھی منسوخ کرنا پڑا۔

کبھی کبھی فلاسفر اس کی طرف داری کیا کرتا۔ "کچھ بھی کہہ لو۔آدمی دل چسپ ہے۔"

ایک دن شیطان نے اعتراض کیا۔ "پتہ نہیں تمھارے لیے کیا دل چسپ ہے، کیا نہیں۔ شاید یہ تمھارے ان دل چسپ لوگوں میں سے ہو جنھیں دیکھتے ہی جی چاہتا ہے کہ آج ہی ان کی الوداعی پارٹی ہونی چاہیے، جن سے ملنا پڑے تو ہیلو کے ساتھ خدا حافظ بھی منہ سے نکل جاتا ہے، جو کبھی عبادت کریں تو اصل نیت یہ ہوتی ہے کہ گڑگڑا کر کسی کے لیے بری دعا مانگ سکیں، جن کی تعریف کرنا ان کے Image کو تباہ کرنا ہے۔"

"اگرچہ ابھی تک میں نے اس کا بلڈ پریشر چیک نہیں کیا۔" ڈاکٹر بولا "لیکن یا تو بہت زیادہ ہوگا یا بالکل کم کیوں کہ اسے دیکھتے ہی یہ لگتا ہے کہ یا تو یہ بہت زیادہ سو کر آیا ہے یا رات بھر نہیں سویا۔"

"لیکن اس کی اس کوشش کو کسی نے نہیں سراہا۔" فلاسفر مسکرانے لگا۔ "کہ قبل از مسیح بعد از مسیح، کی طرح یہ سب کے خیالات نظریات کو آہستہ آہستہ قبل از مشکوک، بعد از مشکوک میں تبدیل کر رہا ہے۔"

"مگر اس کی سب سے بڑی خوبی سب بھول جاتے ہیں۔" انجینیر نے کہا "یہ کہ اس کی جدائی کتنی خوش گوار ہے۔جب یہ رخصت ہوتا ہے تو یہی بوسیدہ نیم تاریک کرے کیسے جگمگا اٹھتے ہیں۔"

قصور ہمارا بھی تھا۔ پہلے پہل تو مشکوک کی باتیں آدھی سنا کرتے آدھی نہیں۔ جب برسات شروع ہوئی تو کھیل کود، سیر سپاٹے پر اثر پڑا اور ہماری مدافعت بھی گھٹنے لگی۔

کبھی کبھی یہ شبہ ہوتا کہ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے اگر صحیح نہیں تو شاید غلط بھی نہ ہو۔

پھر مسلسل بارش اور مسلسل مشکوک نے ورزش بالکل ختم کر دی۔ کام سے واپس آکر تاش کھیلتے یا کیرم، شطرنج یا کچھ بھی نہیں۔

ورزش چھوڑنے کے بعد جو کچھ ہوا اسے چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا تھا۔۔۔۔

سب سے پہلے طمانیت کا دور آیا۔ کسی کو دوڑتے بھاگتے یا پہاڑ پر چڑھتے دیکھتے تو اطمینان ہوتا کہ کم از کم ہم اس کی طرح سانس چڑھا کر عمر کم نہیں کر رہے، نہ بھوک بڑھا کر موٹاپے کو دعوت دے رہے ہیں۔

دوسرا مرحلہ ایسا تھا جیسے چاروں طرف خلا ہی خلا ہو۔ اس کی مثال کچھ یوں دی جا سکتی تھی کہ دن بھر موٹر چلا کر شام کو منزل سے فقط چند فرلانگ پہلے "ہالٹ! ہنر نوٹ جانے سے سڑک زیرِ آب ہے۔" کا بورڈ نظر آجائے یا کسی جاسوسی فلم کے آخر میں جب پیچیدہ گتھی سلجھنے میں چند منٹ رہتے ہوں تو یکایک بجلی فیل ہو جائے اور فیل رہے یا کسی دل چسپ رومانی ناول کے آخری دس بارہ صفحے غائب ملیں۔ چناں چہ ہم کھوئے کھوئے سے رہتے اور غالباً دوسروں کو دیسی فلموں کے ایکٹر معلوم ہوتے ہوں گے۔ بار بار اپنے بازوؤں کندھوں کے پٹھوں کو ٹٹولتے جو ڈھیلے ہوتے جا رہے تھے۔ چاروں طرف مکمل سناٹا طاری ہو گیا۔ ایک روز تو بہت ڈرے کیوں کہ شوپنہار کی تحریریں پسند آنے لگی تھیں۔ تیسری منزل غور و فکر کی آئی۔ ایسی کہ جب سوچ چکتے تو پھر سوچنے لگتے۔ زندگی کے نادر موقعوں کے متعلق جو گنوا دیے اور وہ موقعے جو ابھی تک نہیں گنوائے۔ یہاں تک کہ ان موقعوں کے بارے میں بھی فکر کرتے جو کبھی پیش ہی نہ آسکے۔ غلطیاں بھول چوک، زیادتیاں۔۔۔۔ دوسروں کی اور اپنی۔۔۔۔ بار بار یاد آتیں۔

شیطان ان بارہ روپے پندرہ آنوں یا پندرہ روپے بارہ آنوں کا اکثر ذکر کرتے جو انھوں نے کسی پڑوسی کے بر تھ ڈے پر خرچ کیے تھے لیکن اس نے ان کی کسی سال گرہ کا نوٹس نہیں لیا۔ یہ واقعہ نو دس برس پہلے کا تھا۔ کیسٹ عہد کرتا کہ میدانوں میں واپس پہنچ کر اس شخص کو ضرور زدوکوب کرے گا جس نے اس کے امریکن لہجے کی کئی مرتبہ نقل اتاری۔ افسوس تھا تو یہ کہ اپنی شرافت یا سستی، یا دونوں کی وجہ سے وہ اب تک خاموش کیوں رہا۔ ڈاکٹر بار بار ان کتابوں کا ذکر لے بیٹھتا جنھیں مانگتے ہوئے اس کے ہم جماعتوں نے وعدہ کیا تھا کہ پڑھ کر واپس کر دیں گے لیکن لوٹانے کے بجائے کباڑیوں کو بیچ دیں، جن سے ڈاکٹر کو دوبارہ خریدنی پڑیں۔ فلاسفر اپنے اس جونیر کی شکایت کیا کرتا جو یوں تو چہیتا دوست بنا ہوا تھا لیکن محض ہیرپھیری سے اس نے اپنی تنخواہ فلاسفر سے زیادہ کرالی تھی ویسے یہ جونیر کئی برس پہلے ملازمت چھوڑ چکا تھا۔

ڈاکیہ نظر آتا تو اندیشہ ہوتا کہ وی۔پی لایا ہوگا یا بیرنگ خط۔ حالاں کہ وہ عموماً رجسٹری لاتا۔ ایک دفعہ تو منی آرڈر بھی لایا۔ ڈاک آتی تو لمبا سا لفافہ دیکھتے ہی یقین ہو جاتا کہ اس میں کوئی بل ہے جو اب تک ادا نہیں کیا۔ پولیس کا سپاہی دکھائی دیتا تو شبہ کرتے کہ کچھ پوچھنے کے لیے بھیجا

گیا ہے، جب کہ وہ اپنی مقررہ گشت پر ہوتا۔

دوسروں سے ملنے میں جھجک ہوتی کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ کسی کام سے آئے ہیں۔ ایک دن ہمت کر کے بینک مینیجر سے (جو کئی مرتبہ ہمارے ہاں آچکا تھا) ملنے نکلے تو یکایک مقصود گھوڑے کو اپنی بیاض یاد آگئی جسے نکال کر اس نے صفحے الٹے اور بولا:

انشا خیالِ محض ہے ہرگز نہ بھولیو
ہرگز کسی کے ساتھ نہ ڈالے خدا غرض

سید انشاءاللہ انشا سنہ ۱۷۵۶ سے ۱۸۱۷ تک۔۔۔۔"

اس پر یاد آیا کہ بینک سے تو کبھی کبھی قرض لیتے رہتے ہیں۔ اگرچہ فی الحال مقروض نہیں تھے لیکن راستے ہی سے واپس آگئے۔

پھر طرح طرح کے وسوسے مسلط رہنے لگے۔ کبھی آدھی رات کو اچانک خیال آتا کہ پانی کا نلکا بند کر دیا تھا یا نہیں؟ کچن کا بلب اب تک تو نہیں جل رہا؟ جو لفافے لیٹر بکس میں ڈالے تھے ان پر ٹکٹ کس نے لگائے تھے؟ کبھی فکر لاحق ہو جاتا کہ رات گئے جو عجیب و غریب آواز آتی رہی وہ کہیں بھیڑیے کی تو نہیں تھی؟ بھیڑیے بھونکتے ہیں یا کچھ اور کرتے ہیں؟ کسی کو کاٹ لیں تو وہ پاگل تو نہیں ہو جاتا؟ اور جو چھت سے لٹکا ہوا بلب ہل رہا ہے، شاید زلزلہ آنے والا ہو۔ یہ علاقہ زلزلوں کے لیے مشہور ہے۔

ان ہی دنوں سیلاب سے دو پل ٹوٹ گئے۔ ٹریفک بند ہوا اور باہر سے چیزیں نہ آئیں تو کیمپ میں سگریٹ، چاکلیٹ، شکر وغیرہ کو راشن کر دیا گیا۔ اس پر شیطان نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ اس افسردگی بے زاری کو بھی راشن کیا جائے یعنی فی شخص روزانہ ایک گھنٹہ اور بے زار رہنے کے لیے کوئی مقرر کر لیں۔ اس سے پہلے یا بعد میں بے زار ہونے والے پر جرمانہ کیا جائے۔ یہ تجویز سب نے پسند تو کی لیکن پھر چپ ہو گئے۔ آہستہ آہستہ ہم اور بھی وہمی ہوتے گئے۔ اپنی صحت پر شبہ کرنے لگے، بلکہ دوسروں کی صحت پر بھی اور پھر وہ حد آئی جب ہم نے دن میں سونا شروع کر دیا۔

اب اس سے زیادہ زوال ناممکن تھا۔۔۔۔ اور چوتھی یعنی فائنل اسٹیج لازمی تھی!

اس کی بشارت فلاسفر نے ناشتے سے انکار کر کے دی۔ وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ کرۂ ارض اور کولھو کے بیل والا خواب پھر نظر آیا ہے۔ جب یاد دلایا کہ اس پر تو وہ خوش ہوا کرتا ہے تو سر ہلا کر بولا۔۔۔۔ "رات بیل ایک سمت گردش کر رہا تھا اور دنیا دوسری طرف گھوم رہی تھی۔ اب تک یوں کبھی نہیں ہوا۔"

"دنیا صحیح رخ میں گھوم رہی تھی یا بیل۔۔۔۔؟" انجینیر نے دریافت کیا۔

"یہ یاد نہیں رہا۔"

"اگرچہ خواب اور تعبیر دونوں سائنٹیفک چیزیں ہیں۔" انجینیر بولا۔ "پہلی وجہ اس کی

شرپسندی اور مخالفت تھی۔ دوسری وجہ بھی یہی ہو سکتی تھی اور تیسری، چوتھی، پانچویں بھی۔

لوگ اکثر شکایت کرتے کہ وہ جو بھاری ساگدھوس آپ کے ہاں آیا کرتا ہے اس نے بلاوجہ فلاں کو فلاں سے لڑوایا۔ اس کی اس سے ناچاقی کرادی۔ یہ کردیا، وہ کردیا۔

سینما کے مینیجر کو گلہ تھا کہ اس کے عملے میں مشکوک نے پھوٹ ڈلوائی۔ ٹکٹ فروخت کرنے والے کو اکسایا کہ تمھیں سب پر اپنی چوہدراہٹ جمانی چاہیے۔ جب تک پورے ٹکٹ نہ بکیں کھیل شروع نہ ہونے دیا کرو۔ ادھر پروجیکٹر والے کے کام میں پھونک دیا کہ ٹکٹ تو مشین سے بھی خریدے جاسکتے ہیں، لیکن تم نہ چاہو تو فلم کوئی بھی نہیں چلاسکتا۔ گیٹ کیپروں اور چوکی داروں کو الگ ورغلایا۔ ہیڈماسٹر پریشان تھا کہ اس کے دو ٹیچر اگلے گریڈ کے لیے دبادب درخواستیں دے رہے ہیں۔ ایک کہتا ہے میری قابلیت زیادہ ہے، دوسرا کہتا ہے میرا تجربہ زیادہ ہے اور عرضیوں کے ڈرافٹ مشکوک لکھواتا تھا۔ تحصیل دار نے شکوہ کیا کہ مشکوک نے اس کے پٹواری اور گرداور کاآپس میں جھگڑا کرادیا اور دونوں ہوٹلوں کے مینیجر جو اچھے دوست تھے، ان میں کاروباری رقابت شروع کرادی۔ حالاں کہ ایک ہوٹل نچلے قصبے میں تھا اور دوسرا اگلے پہاڑ پر۔

کبھی کبھی مقصود گھوڑا بلند آواز سے سوچا کرتا کہ بہ حیثیت ایک گینڈاویٹ (جسے وہ ہیوی ویٹ سے برتر سمجھتا) مشکوک کو کسی اور طرح کا ہونا چاہیے تھا۔ اب تک تو یہی سنا ہے کہ ایسے بھاری بھرکم لوگ نہ تو کسی سے لڑ سکتے ہیں، لڑائی ہوجائے تو تیزی سے بھاگ بھی نہیں سکتے لہٰذا انھیں صلح پسند اور خوش مزاج رہنا پڑتا ہے لیکن یہاں پتہ نہیں کس جگہ کسر رہ گئی کیوں کہ یہ پلے ہوئے آدمیوں کی نمائندگی ہرگز نہیں کرتا بلکہ اپنے رویّے سے بعض اوقات تو ایک فرسٹ کلاس ساس معلوم ہوتا ہے اور یہ کہ اس گیلے دھندلے موسم سے دور رہنا تو ممکن نہیں، لیکن اس آدمی سے فاصلہ رکھا جاسکتا ہے۔

پہل بھی مقصود گھوڑے نے کی۔

وہ کسی کباڑیے سے یوگا پر پھٹی پرانی کتاب خرید لایا اور تعریفیں شروع کردیں کہ جب موسم یا مشکوک کی وجہ سے آؤٹ ڈور ورزش ممکن نہ ہو تو بنی نوعِ انسان بلکہ بنی نوع حیوان تک کی سب سے بڑی ضرورت یوگا ہے جس سے چودہ طبق روشن ہوجاتے ہیں۔ باقی ماندہ طبق بھی دکھائی دینے لگتے ہیں۔ فلاسفر نے اعتراض کیا کہ اس میں جو سر کے بل کھڑے ہونا پڑتا ہے یہ انسان کی سراسر توہین ہے۔ ڈاکٹر نے تائید کی۔

"اگرچہ مجھے ابھی تک یوگا نہیں ہوا اور Horizontal ہوکر ڈنٹرو غیرہ نکالنے میں کوئی ہرج نہیں، کیوں کہ ڈارون کی تھیوری کے مطابق پہلے ہم اسی پوز میں چلتے پھرتے تھے۔ مگر سر کے بل تو کوئی جانور یا پرندہ تک کھڑا نہیں ہوتا۔ یوں لیٹے ہوکر ورزش کرنے سے سارے

جان داروں کی پوزیشن اک ورڈ ہو سکتی ہے۔

باتیں ہوتی رہیں لیکن مقصود گھوڑا کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ وہ اپنے کانوں کا کنکشن آف کر چکا تھا۔ چند دنوں کے بعد جب وہ یوگا کی مشق نمبر تین کرتے ہوئے سر کے بل ہو کر سارا خون اپنے دماغ میں جمع کر رہا تھا تو ملازم چائے لایا۔ اس نے وہیں سے ڈانٹا کہ سر نیچے پاؤں اوپر کر کے چائے کے برتن الٹے مت پکڑو۔ کسی نے بتایا کہ برتن سیدھے ہیں اور ملازم بھی، جس کے قدم زمین پر ہیں۔ کوئی چیز الٹی ہے تو وہ ہے مقصود گھوڑا لیکن تب تک ذہن میں اتنا خون اکٹھا ہو چکا تھا کہ اس نے الٹی چائے پینے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد پھول آسن یا تتلی آسن یا شاید پنچھی آسن اختیار کرنے کے لیے اپنا دہنا ٹخنہ کھینچ کر گردن کے پیچھے رکھنے کی کوشش کی۔ بائیں پاؤں کا انگوٹھا کمر سے چھوا کر داہنے بازو سے لگایا اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو سر کے پیچھے لے جا کر دایاں کان پکڑا۔ پھر کچھ اور کیا۔ اس کے بعد کچھ اور۔

دفعتہً درد کی شاید لہر آئی اور وہ بالکل جڑ کر رہ گیا۔ اصلی حالت میں آنے کی بڑی کوشش کی لیکن جیسے سارے اعضا کو قفل لگا چکا تھا۔

شیطان دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور تعریف کی کہ اس طرح وہ کافی ہینڈسم لگتا ہے۔ کاش کہ وہ سدا اسی حالت میں رہا کرے۔

جب درد بڑھا تو اس کے ہاتھ پاؤں کھینچے۔ مگر کچھ نہ ہوا۔ آخر مجبور ہو کر گدگدی کی گئی۔ اس نے قلابازیاں سی لگائیں جن کے بعد اعضا اپنے پرانے مقامات پر پہنچے لیکن کئی روز تک اسے بستر میں لیٹنا پڑا۔

موٹر سائیکل کو اوور ہال کرانے قصبے کے ورک شاپ میں چھوڑ کر پیدل آ رہا تھا کہ تھوڑی سی چڑھائی کے بعد مشکوک خوانچے والے سے جلیبیاں کھاتا ہوا ملا۔ مجھے ہانپتے ہوئے دیکھ کر اس نے یوں گھورا جیسے میں نے عمداً ورزش کا ارتکاب کیا ہو۔ پیچھا چھڑانے کے لیے کہنا پڑا کہ اوپر جاتے وقت آئندہ لاری میں لفٹ لیا کروں گا۔

پیدل چڑھائی جاری رہی۔ اتنے طویل جمود کے بعد آج اچھی طرح سانس چڑھا تھا۔ خوب پسینہ آیا۔ ہاتھ پاؤں کھلے اور پھر وہی پرانی چستی اور بشاشت آ گئی۔ ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوا کہ اتنے دنوں کی کاہلی کے بعد اب جسم کو بھی باقاعدہ اوور ہالنگ کی ضرورت ہے ---- چناں چہ اسی سہ پہر سے ورزش شروع کر دی۔

مقصود گھوڑے کو یوگا سے تھوڑا بہت فائدہ ضرور پہنچا ہو گا۔ کیوں کہ وہ اب روزانہ کسرت کرنے لگا تھا جب مشکوک سے کسی نے مخبری کی تو وہ نحیف کو ساتھ لے کر موقعے پر پہنچا۔ دیکھا کہ مقصود گھوڑا کھلم کھلا سڑک کے کنارے ڈنٹر نکال رہا ہے ----

"اکتالیس، بیالیس، تینتالیس، ہیلو! کیا حال ہے؟" اس نے گنتی جاری رکھتے ہوئے نحیف

کی طرف دیکھا۔ "چھیالیس، سینتالیس، اڑتالیس، آج تو بہت اچھی لگ رہی ہو۔ اکاون، باون، بلا کا نکھار ہے۔ چون، پچپن، عجب دل کشی ہے۔ ستاون، اٹھاون، غالباً شہر سے میک اپ کا سامان پہنچ گیا ہوگا۔ باسٹھ، ترسیٹھ، کئی روز سے تمھیں یاد ہی کر رہا تھا۔ چھیاسٹھ، سڑسٹھ سچ مچ! اہتر، ستر، اکہتر، نہ جانے تم کہاں بہتر تھیں۔ پچھتر چھہتر، جا کیوں رہی ہو؟ کہیں جلد پہنچنا ہے کیا؟ اسی، اکیاسی، اچھا تراسی، چوراسی، پچاسی ----" اور مطلوبہ تعداد مکمل کرنے سے پہلے اس نے مشکوک کی جانب دیکھا تک نہیں۔ بعد میں اس کے سامنے کھڑے ہو کر بیٹھکیں شروع کیں جنھیں گنتے ہوئے گفتگو کرنی چاہی لیکن بیسویں ہی بیٹھک پر دیکھا کہ مشکوک آہستہ آہستہ جا رہا ہے۔

اس چوتھی سٹیج کو حکومت آپا کے آجانے سے بھی کافی مدد ملی۔

پہلی نگاہ کی محبت کے تعلق سے سنا کرتے تھے لیکن حکومت آپا کو مشکوک سے پہلی نظر پر چڑ ہو گئی۔

`

کیمپ کے سینما میں انگلش پکچر آتی تو اس کا اوٹ پٹانگ سا ترجمہ بھی کیا جاتا جو بہ طور عرف ساتھ لگتا۔ جب ہالی وڈ کی رومانی فلم Moon Over Miami کو "عرف میاں میر کا چاند" بنا کر جگہ جگہ اشتہار لگائے گئے تو ہم بھی میٹنی پر پہنچے۔ ٹکٹ لیتے وقت شیطان نے اشارہ کیا۔ "مجھے جو نظر آرہا ہے کیا تمھیں بھی نظر آرہا ہے؟" لڑکیوں کے جھرمٹ میں ایک شکل دکھائی دی، ہو بہو حکومت آپا کی نقل۔

قریب گئے قیاس درست نکلا۔ ملتے ہی شیطان نے پوچھا۔ "رضیہ کیسی ہے؟"

"بالکل ویسی ہی جیسی پہلے تھی۔"

"پہلے کیسی تھی؟"

"پتہ نہیں۔"

اتنے میں آخری گھنٹی بجی اور دروازے بند ہونے لگے۔

لڑکیاں پھرتی سے لپکیں اور شیطان نے تعاقب کیا۔ وہ حکومت آپا کے ساتھ بیٹھنا چاہتے تھے لیکن اندھیرا ہو چکا تھا۔ کسی اور کو حکومت آپا سمجھ کر اس کے برابر جا بیٹھے۔

تاریکی کا اثر زائل ہوا تو ---- "معاف کیجیے سامنے لمبا سا آدمی بیٹھا ہے۔ اسکرین صاف نہیں دکھائی دے رہا۔" کہہ کر اٹھے اور مجھ سے سیٹ بدل لی لیکن وہاں سے حکومت آپا پانچ چھ لڑکیاں دور تھیں۔

انھوں نے حکومت آپا کی طرف جھانک کر اور خوش گوار ملاقات پر مسرت کا اظہار کیا۔

"خوشی وشی کیسی ----" جواب ملا۔ "اس اجاڑ کیمپ کی تنہائی ہے جو یہ کہلوا رہی ہے۔"

فوراً "ہشت" اور "چپ رہیے" کی آوازیں آئیں۔

فلم سے پہلے ٹریلر دکھائے جارہے تھے۔

"تمھیں اندازہ ہو یا نہ ہو۔ لیکن آج کل تم اس ایکٹرس جیسی لگتی ہو۔" شیطان نے اونچی سرگوشی کی۔

اس ایکٹرس نے لباس تو خوب پہن رکھا تھا لیکن پینتالیس پچاس کی ہوگی۔ میں نے ٹوکا تو انھوں نے عینک بدلی۔ ان دنوں وہ کبھی ایک عینک لگاتے تو کبھی دوسری۔ بعد میں پتہ چلا کہ دونوں ایک جیسی ہیں۔

"بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کافی اچھی معلوم ہو رہی ہو۔"

"تم بھی کچھ اتنے برے نہیں لگ رہے۔"

"خاموش رہیے ـــ یا بالکل آہستہ بولیے۔" کسی نے احتجاج کیا۔

"دراصل تم اس نئی حسینہ جیسی اسمارٹ ہو۔" شیطان نے پھر سرگوشی کی۔

اس وقت پردے پر ایک بنی ٹھنی عورت (جو کسی کی آنٹی نکلی) مٹکتی ہوئی جارہی تھی۔

"اسے وہی اسمارٹ سمجھ سکتا ہے جس کی عینک کے نمبر غلط ہوں۔" حکومت آپا چمک کر بولیں۔ شیطان نے دوسری عینک اتار کر پہلی لگائی اور ـــ "معاف کیجیے سامنے بالکل چھوٹا سا آدمی بیٹھا ہے۔ سکرین صاف نظر آرہا ہے۔" کہتے ہوئے کسی اور لڑکی سے سیٹ بدل لی۔

اس ادلا بدلی میں مجھے بھی اٹھنا پڑا۔ اپنے لیے جگہ ڈھونڈنے نکلا تو انھیں بتاتا گیا کہ اب تک نہ اصلی فلم شروع ہوئی ہے اور نہ کوئی خوب صورت ایکٹرس آئی ہے۔ جب آئی تو کھانس دوں گا۔

"یہ غل غپاڑہ ختم کیجیے ـــ کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔" کسی نے مایوسی سے کہا۔

اگلی دفعہ شیطان نے یوں جگہ بدلی کہ حکومت آپا کے قریب آنے کے بجائے اور دور ہوگئے۔ جب تک ہیروئن آئی اتنی دفعہ سیٹ بدلنی پڑی کہ میں گیٹ کیپر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اتنے فاصلے سے کھانسنا بے کار تھا، اس لیے زور سے بتانا پڑا ـــ "روفی! یہ ہے ـ اصلی ہیروئن!"

شیطان کی بینائی اس قدر کم زور ہے کہ صحیح عینک کے بغیر نہ صرف انھیں کچھ نظر نہیں آتا بلکہ کچھ سنائی بھی نہیں دیتا لیکن یہ فقرہ کسی طرح سن لیا اور فوراً حکومت آپا سے کہا۔

"اوہ! یہ ایکٹرس تو بالکل تمھاری کاربن کاپی ہے ـــ"

"یہ ایکٹرس؟ یہ تو ہمیشہ مجھے زہر دکھائی دیتی ہے۔"

"آخر یہ ہڑبونگ کب ختم ہوگی ـــ" پچھلی سیٹوں سے کسی نے نعرہ لگایا۔

کچھ دیر کے بعد ایک لڑکا چلایا ـــ "آپا! لاری نیچے جارہی ہے۔"

اس پر حکومت آپا لڑکیوں سمیت فوراً چلی گئیں۔ دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ بلانے والا ان کا چھوٹا بھائی ننھے میاں تھا۔ جس پھرتی سے وہ غائب ہوئے، ہم یہ بھی نہ پوچھ سکے کہ اس علاقے میں کیسے آنا ہوا اور قیام کہاں ہے۔

چند روز بعد انجینیر اور میں موٹر سائیکلوں پر جارہے تھے کہ نچلے بازار میں ننھے میاں نے روک لیا جو کیمرہ پکڑے فوٹو گرافی کی دکان کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔

معلوم ہوا کہ حکومت آپا بہ طور مانیٹر اپنے کالج کی لڑکیوں کے ہمراہ وادی کی سیر پر آئی

ہیں۔ ساتھ چند استانیاں بھی ہیں۔ تبھی شام کو واپسی کی جلدی ہوتی ہے۔ اندھیرا ہونے سے پہلے سب کی حاضری لگتی ہے۔

"اور بالکل پڑوس میں ایک عجیب سا آدمی عجیب سے لوگوں میں گھرا رہتا ہے۔" وہ بتا رہا تھا "بار بار ایسے خوفناک فقرے سنائی دیتے ہیں کہ بہت ڈر لگتا ہے۔ اسی لیے آپ کو ڈھونڈ تا رہا ہوں چلیے، اس وقت وہ ضرور ہو گا۔"

وہاں پہنچ کر دیکھا کہ ریسٹ ہاؤس کے لان میں ایک شخص موڑھے پر بیٹھا پان کی جگالی کر رہا ہے۔ سامنے حقہ ہے اور بہت سارے ملاقاتی۔ ایک کے اٹھنے پر دو اور آجاتے ہیں۔ تانتا بندھا ہوا ہے۔

"آپ نے کئی دفعہ یقین دلایا لیکن دو کی جگہ تین مہینے ہو گئے اور اب تک میرا انتقال نہیں ہوا۔" کسی نے شکایت کی۔

"دنیا امید پر قائم ہے، حوصلہ رکھو، انتقال ہوا ہی چاہتا ہے۔" اس نے کش لگاتے ہوئے تسلی دی۔

آپ کی نوازش سے تو ایسوں ایسوں کا انتقال ہو چکا ہے جو بالکل مستحق نہیں تھے۔ نہیں ہوتا تو بس ہمارا انتقال نہیں ہوتا۔ دوسرے نے گلہ کیا۔

"پوری کوشش کر رہا ہوں کہ نہ صرف آپ کا بلکہ کے قریبی رشتے داروں کا بھی انتقال ہو جائے۔ جس خاندان کے مجھ پر احسان ہوں اسے میں کیوں کر بھول سکتا ہوں۔"

ایک نے تو باقاعدہ الٹی میٹم دے دیا۔۔۔۔ "برا نہ مانیں تو ایک عرض کروں۔ اگر واقعی میرا انتقال نہیں کرا سکتے تو صاف صاف بتا دیجیے تاکہ کوئی اور وسیلہ ڈھونڈوں۔"

"اگر مہینے کے اندر اندر تمہارا فوری انتقال نہ کرا سکا تو مجھ پر چار حرف۔"

پہلے تو ہم بھی چونکے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ پھر چوکی دار نے بتایا کہ گفتگو کا تعلق انتقالِ اراضی سے ہے اور اس محکمے کا یہ افسر دورے پر اکثر آیا کرتا ہے۔

اس پر ننھے میاں کی تشویش کم تو ہو گئی لیکن پوری طرح اطمینان نہ ہوا۔ پوچھنے لگا کہ آپ کہاں رہتے ہیں؟ بتایا کہ سب سے اوپر جو تین متوازی سڑکیں ہیں، ان میں بیچ والی سڑک پر۔ لیکن وہ کیمپ کے سینما سے آگے نہیں گیا تھا، اس لیے ساتھ لے جا کر گھر دکھانے پڑے۔

پھر ایک انوکھا تماشا شروع ہوا۔۔۔۔

آہستہ آہستہ ان سب ایکٹرسوں اور حسیناؤں کی تصویروں پر جنھیں رسالوں سے نکال کر کمروں میں آویزاں کیا تھا، مونچھیں لگنے لگیں۔ ان کی مقناطیسی آنکھوں پر موٹی عینکیں سوار ہو گئیں۔ پھر سب نازنینیں سگار بھی پینے لگیں۔

شروع شروع میں نقاش صرف پنسل استعمال کیا کرتا چناں چہ ہم ربڑ سے چہروں کو اصلی حالت پر لے آتے۔ شاید چڑ کر وہ پکی سیاہی لے آیا، بلکہ داڑھی بھی لگانی شروع کر دی۔ کیمسٹ نے کئی ترکیبیں آزمائیں لیکن یہ سیاہی نہ مٹ سکی۔

قصبے سے اور رسالے لائے۔ نئی تصویریں تراش کر لگائیں لیکن ان کا بھی یہی حشر ہوا

اچھے بھلے حسین چہروں کو بار بار اس حالت میں دیکھ کر سب کا جی اتر نے لگا اور وہ ساری تصویریں گودام میں بند کرنی پڑیں۔

پھر باورچی نے بتایا کہ جب ہم باہر تھے تو اس نے آہٹ سنی۔ لپک کر پہنچا لیکن لڑکا کھڑکی سے کود کر بھاگ گیا۔ اس نے لڑکے کا جو حلیہ بیان کیا وہ ننھے میاں سے ملتا تھا۔

ملغوبہ کے ڈنر پر مقصود گھوڑے کے ذہن میں یا تو یہ واقعہ تازہ تھا، یا یہ کہ وہ ٹکٹکی باندھے ایک لمبی لمبی مونچھوں والے مہمان کو یوں تک رہا تھا جیسے ہپناٹزم کا سبق لے رہا ہو۔ (مونچھیں اتنی بڑی تھیں کہ پشت سے بھی دکھائی دیتیں) جب برتنوں چمچوں کے کھڑکنے پر چونکا تو لڑکیوں سے پوچھنے کی کوشش کی کہ یہ کون ہے۔ باتوں کے شور میں ملغوبہ نے تو سنا ہی نہیں، تہمینہ دوسری طرف دیکھنے لگی اور نحیفہ جو فرش پر کچھ ڈھونڈ رہی تھی اس کی نظریں نیچی رہیں۔ مقصود گھوڑے نے کاپی نکالی اور سنایا:

جاتے ہی بزم میں جو اس نے جھکائی مونچھیں
جب تلک بیٹھے رہے ہم نہ اٹھائی مونچھیں

نحیفہ نے ٹوکا تو جلدی سے تصحیح کی ---- "مونچھیں نہیں، آنکھیں! ---- یعنی جو اس نے جھکائی آنکھیں ---- نہ اٹھائی آنکھیں ----"

جب سے برسات شروع ہوئی فلاسفر کہا کرتا کہ ایسے ماحول میں انسان Introvert بن سکتا ہے۔ لہٰذا Extrovert رہنے کی کوشش کیا کرو۔
مقصود گھوڑا ایکسٹروورٹ بننے کے لیے تیار تھا۔ کسر تھی تو اتنی کہ نہ اس لفظ کے معنے آتے تھے نہ دوسرے کے۔ فلاسفر نے تشریح کی جو رائیگاں گئی۔ پھر مقصود گھوڑا قصبے سے ڈکشنری لایا اور فلاسفر کو وہ صفحے دکھائے جہاں انٹروورٹ کے سامنے لکھا تھا ---- مطالعہ، باطن کا عادی۔ ادھر ایکسٹروورٹ وہ تھا جو اس کے الٹ ہو۔ "یہ مطالعہ، باطن کیا ہوتا ہے؟" اس نے پوچھا۔ "اور ڈکشنری میں آسان لفظ کیوں نہیں ملتے؟"
"یہاں لٹریچر کی باریکیاں فقط نحیفہ جانتی ہے۔ وہی بتا سکے گی۔" فلاسفر نے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا۔ نحیفہ نے یہ سن کر ہنسی ہنسی میں مقصود گھوڑے کو Simpleton کہہ دیا جسے سب سادہ لوح سمجھے لیکن اس نے وہیں لغت کھولی ---- "اس لفظ کا مطلب ہے جلد بے وقوف

بن جانے والا۔ باؤلا۔ آسانی سے پھانسے میں آجانے والا۔ گاؤدی۔ خوش فہم۔"

"ہر لفظ کے کئی معنے ہوتے ہیں۔" وہ بولی "اصلی چیز ہے وہ موقع جس پر لفظ استعمال کیا گیا۔ اگر ضرورت پڑے تو ڈکشنری کی مدد لی جاسکتی ہے۔"

مقصود گھوڑے نے فقرے کا دوسرا حصہ سنا اور فوراً جیبی لغت خرید کر مطالعہ شروع کر دیا۔ جب شیطان کو ڈاکٹر سے زکام لگا (جو اسے کسی مریض سے ملا تھا) اور نحیفہ نے مقصود گھوڑے سے حالت پوچھی تو اس نے لغت نکال کر بتایا۔ "ایسی ہے جیسے پژمردہ، غمگین، مایوس، ملول، کہا جاسکتا ہے۔"

"معمولی ساز کام ہی تو ہے، چند دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تمھارے اس فقرے میں استحسان پسندی ہے اور خوش امیدی، لطف غائبانہ بھی ہے۔"

پھر ملغوبہ نے اپنے منگیتر کو چھیڑنے کے لیے فقط حضرات کی دعوت کی۔ نحیفہ کہیں پوچھ بیٹھی کہ یہ مردانہ پارٹی کیسی رہی۔

"وہاں ملغوبہ غلو اور تعلی سے کام لے رہی تھی، نمک مرچ لگا رہی تھی، بڑھا چڑھا کر بیان دے رہی تھی۔" مقصود گھوڑے نے بتایا۔ "اور قصبے کے لڑکے اتو پتو کر رہے تھے، چاپلوسی سے خلوص جتا رہے تھے، غلامانہ خوشامد کر رہے تھے لیکن ملغوبہ کے منگیتر کا رویہ وہ نہیں تھا جس کی توقع کی جاتی۔ یعنی کڑی نظر رکھنا، چو کسی دکھانا، کسی سے الو نہ بننا۔ تقریب پھیکی پھیکی سی رہی۔ کاش کہ وہاں کوئی ایسا بھی ہوتا جیسے بے باک، من چلا، جان پر کھیل جانے والا، بے دھڑک، کہہ سکتے۔ جو سب کو سیدھا کرتا۔"

اس سے اگلی دفعہ جب مقصود گھوڑے نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو نحیفہ نے وہیں ٹوک دیا۔

"ڈکشنری کے متعلق اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔ آئندہ اس کا حوالہ کبھی مت دیں۔"

"یہ پہاڑ چھ ہزار فٹ اونچا ہے، لہٰذا اسے ہل اسٹیشن سمجھنا چاہیے۔ کمال ہے کہ اتنی بلندی پر بھی تم اور لڑکیوں کی طرح شوخ بھڑکیلے کپڑے نہیں پہنتیں۔"

"یہ قول حمیدہ اس پر سیزی کے سوا اور دھرا ہی کیا ہے؟ طرح طرح کے لباس ساتھ لائی تھی لیکن ان کا فائدہ؟ کیا بندروں، پرندوں، ریچھوں کو دکھانے کے لیے پہنوں؟"

"یہ بھولپن فوراً بتا دیتا ہے کہ تم اوروں سے بالکل مختلف ہو۔" اس نے مزید ستائش کی

"جو حساس ہوں وہ مختلف ہوا کرتے ہیں۔۔۔۔ کیسے کیسے طوفان دل میں اٹھتے ہیں؟ کتنی امیدیں امنگیں پنپنے سے پہلے کہرے کی طرح اڑ جاتی ہیں۔ یہ کیسے بیان کروں۔ ان کا ذکر بے سود ہے۔"

"بے سود ہے تو رہنے دیجیے۔" مقصود گھوڑے نے اپنے آپ کو کہتے ہوئے سنا۔

"اگر برا نہ مانو تو ایک مشورہ دوں؟" وہ بولی۔

"جو فقرہ اگر برا نہ مانو، سے شروع کیا جائے اس میں ضرور کوئی برا ماننے والی بات ہوتی ہے بہ ہر حال فرمایئے ۔۔۔۔"

اس نے جواب کا انتظار کیا۔

جھینگروں کی آواز کے علاوہ چاروں طرف خاموشی رہی۔ تب اسے معلوم ہوا کہ نحیفہ جا چکی ہے۔ اس کے بعد مقصود گھوڑے کو دوسرے پہاڑ کی آب شار کے پاس اتوار کو تنہا ٹہلتے دیکھا گیا۔ حالاں کہ پہلے اس طرح جاتا تو بڑے اہتمام اور ساز و سامان کے ساتھ، جو عموماً دوربین، تھرماس، سینڈوچز، نحیفہ اور کیمرے پر مشتمل ہوتا۔

پھر سنا کہ دونوں میں شکر رنجی ہو گئی ہے اور یہ کہ وہ ان دنوں خودی یا خودداری پر کوئی کتاب پڑھ رہا ہے۔ لکھی ہوئی ہدایتوں پر عمل کرتے ہوئے پہلے اکڑفوں دکھائی۔ جب کوئی اثر نہ ہوا تو نحیفہ کو چڑانے کے لیے ملغوبہ کے ہاں جانے لگا۔

کبھی کبھی ساٹھ میل دور شہر سے آرائشی سامان اور خوش بوئیں لاتا لیکن ملغوبہ جیسی ایکسپرٹ ان میں کوئی نہ کوئی خامی نکال دیتی ۔۔۔۔ "یہ شیشیاں دراصل سانولی رنگت کے لیے ہیں اور ایسی خوش بوئیں فقط سردیوں میں لگائی جاتی ہیں۔" "یا ۔۔۔۔" "یہ لوشن، پاؤڈر اور کریم وہ لڑکیاں استعمال کرتی ہیں جن کے چہرے پر کوئی نشان ہوں اور یہ سینٹ بھی موسم خزاں کے لیے ہے۔" بار بار یہی ہوتا۔ مجبوراً ملغوبہ کی پسند نمبر دو یعنی کھانے پکانے پر ہلہ بولنا پڑا۔

"برطانوی شاہی دسترخوان" "روسی پرولتاری دسترخوان" "چین کے عوامی پکوان" جیسی کتابیں ادھر ادھر سے ڈھونڈ کر لاتا لیکن ملغوبہ جو پڑھائی لکھائی سے ہمیشہ دور رہی تھی یہی کوشش کرتی کہ کہیں کچھ پڑھنا نہ پڑ جائے اور پھر کھانوں کے موضوع پر تو اسے پوسٹ گریجویٹ کا رتبہ مل چکا تھا جب کہ مقصود گھوڑا رنگروٹ بھی نہیں تھا۔

اب فقط حسن و جمال کی تعریف باقی رہ گئی تھی ۔۔۔۔

اگلے ڈنر پر ملغوبہ سے سرگوشی کی "تم سے کچھ کہنا ہے، جسے ہر دفعہ بھول جاتا ہوں۔"

اور اسے ایک طرف لے گیا۔

"میں بھی کیا ہوں ۔ یہ بتانا یاد ہی نہیں رہا کہ تمھاری آنکھیں ستاروں کی طرح چمکتی ہیں۔ ہونٹ گلاب کی پتیاں ہیں اور دانت موتیوں کی طرح ۔۔۔۔"

"مجھے خوشامد ذرا اچھی نہیں لگتی۔"

"مجھے پتہ ہے۔ تبھی تو چاپلوسی کی بجائے سچ بول رہا ہوں۔"

ایسی چکر دار خوشامد سے وہ بے حد خوش ہوئی۔

"خاموش کیوں ہو گئے؟ کچھ کہہ رہے تھے۔"

اچانک ٹوک دیے جانے پر شاید اسے رٹا ہوا سبق بھول گیا۔
"یہی کہ تمہارے چہرے پر ایسی چلا رہتی ہے۔۔۔۔ ایسی۔۔۔۔ بالکل دودھ جیسی۔ بلکہ دودھ کی بالائی جیسی۔ (ذرا دیر پہلے اس نے زردے کی کھرچن پر بالائی ڈالی تھی) اور تمہاری ناک۔۔۔۔ ناک پتہ نہیں کس سے مشابہت رکھتی ہے اور کان۔۔۔۔"
"چچ چچ چچ۔۔۔۔ ناک کو تو ستواں کہا جا سکتا ہے لیکن نسوانی کانوں کی دل کشی کا ذکر کبھی نہیں سنا۔"
اب مقصود گھوڑے نے اپنی طرف سے ترپ کا پتا چلنا چاہا۔ اپنی کاپی نکال کر "شکل صورت" کا سیکشن ڈھونڈنے لگا لیکن جلدی میں شعر پڑھ گیا۔
"ہمارا دل ہمارا دل کبھی تھا۔ تری صورت کبھی تھی۔۔۔۔ نواب مرزا خاں داغ سنہ ۱۸۳۱ سے سنہ ۱۹۰۵ تک۔"
اگرچہ ملغوبہ کو شاعری سے اتنا لگاؤ تھا جتنا کہ اس کے منگیتر کو چسنی اور زندہ دلی سے، تاہم اس شعر کا وہی اثر ہوا جو کہ ہونا چاہیے تھا۔

اگلی مرتبہ نحیفہ کے ہاں چائے پر گئے تو مقصود گھوڑا غائب تھا۔
وہ بار بار شیطان سے کچھ پوچھنا چاہتی جسے وہ ٹال جاتے۔ جب باہر نکلے تو بوندیں رک گئی تھیں۔ پرے غروب آفتاب پر شفق پھولا اور ساری فضا گلابی ہو گئی۔ خنک ہوا کے جھونکوں سے پودے اور درخت جھوم رہے تھے۔ روشنی کم ہوئی تو کہیں کہیں تارے ٹمٹمانے لگے۔
شیطان کو عینک کے بغیر ایسے سہانے نظارے اور بھی زیادہ سہانے معلوم ہوتے ہیں۔۔۔۔ اتنے کہ خواہ مخواہ جھوٹ بولنے کو جی چاہتا ہے۔
"تمہارے ہاتھ میں پیکٹ سا تھا۔ اس میں کیا ہے؟" شیطان نے بات کاٹی۔
"تصویریں۔"
"دیکھیں۔۔۔۔"
اس نے ایک تصویر نکالی۔
"اس میں تم کتنی حسین معلوم ہو رہی ہو۔ اور۔۔۔۔"
"تصویر الٹی پکڑ رکھی ہے۔۔۔۔" نحیفہ نے بتایا۔
شیطان نے تصویر سیدھی کی اور پوچھا۔۔۔۔ "یہ جو پیچھے سلسلہ۔ کوہ نظر آرہا ہے، آتش فشاں معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔؟"
"یہ پہاڑ نہیں ملغوبہ کھڑی ہے۔ عینک لگا لو تو بہتر ہوگا اور یہ جو مقصود۔۔۔۔"
"اچھا بتاؤ۔" شیطان نے جلدی سے کہا "آج تمہارے ہاں جو نئی لڑکی تھی، وہی جو ہمیں

اپنے کالج کی باتیں سناتی رہی۔ وہ دیکھنے میں دراصل کیسی ہے؟"

عینک لگاتے ہی انھیں ساری وادی نظر آئی تو خوش ہو کر بولے "آہاہا۔۔۔۔ دن بھر کی بارش کے بعد کچھ نکھر گیا ہے۔ وادی اتنی صاف ستھری لگ رہی ہے جیسے ابھی ابھی ڈرائی کلین کرائی ہو۔ ایسے ہی مناظر تو حیاتِ ابدی، صداقت، شرافت، شائستگی وغیرہ وغیرہ جیسی چیزوں کو یاد دلاتے ہیں۔۔۔۔"

لیکن نحیفہ مقصود گھوڑے پر تنقید کرنے لگی۔ اسے یہ بھی شکایت تھی کہ لوگ تو بس چہرے پر فریفتہ ہونا جانتے ہیں، دیگر خوبیوں کو کوئی نہیں پرکھتا۔ "ظاہری رنگ روپ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔۔۔۔" اس نے کہا "ظاہری رنگ روپ بہت کچھ ہوتا۔" شیطان نے بتایا "چہرے سے محبت نہ ہو تو اور کس چیز سے کی جائے؟ آج تک نہیں سنا کہ کوئی کسی کے بازو، ٹخنے یا کہنی پر عاشق ہوا ہو۔"

"مطلب یہ تھا کہ خوب صورت شکل سے تو ہر ایک دبیں متاثر ہو جاتا ہے لیکن طبیعت، ذہانت قابلیت کو جانچنے میں جان بوجھ کر دیر لگائی جاتی ہے۔"

"شاید اس لیے کہ شکل تو فوراً نظر آجاتی ہے لیکن عقل، مزاج، تحمل وغیرہ دکھائی نہیں دیتے۔" ویسے بھی مقصود گھوڑے اور نحیفہ کے باسی رومان کی باتیں سن سن کر سب تنگ آچکے تھے، خصوصاً شیطان جن کی دلی خواہش تھی کہ کوئی اور بھی کسی اور پر عاشق ہو تاکہ کم از کم موضوع تو بدلے۔ انھوں نے نحیفہ کو چیونگ گم پیش کیا کہ اسے چباتے ہوئے باتیں کم ہوں گی لیکن اس کی شکائتیں جاری رہیں اور شیطان اتنی مدھم روشنی میں بھی اخبار پڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔

"تو آپ مجھ سے متفق ہیں نا؟" انھیں خاموش پا کر نحیفہ نے پوچھا۔

"ہاں"

"شکریہ روفی بھائی! آپ سے یہی امید تھی۔ مگر آپ دونوں کی دوستی جوں کی توں ہے، پھر کیسے متفق ہو گئے؟"

"شاید اس لیے کہ میں متوجہ نہیں تھا۔" انھوں نے لفظ بھائی پر چونک کر جیبیں ٹٹولیں (ایسے موقعوں پر شیطان کے رومال اکثر غائب ہو جاتے ہیں۔ تبھی دعوتوں کے بعد وہ یا تو پردوں سے انگلیاں پونچھتے ہیں یا کوئی بچہ مل جائے تو پیار کے بہانے اس کے سر پر دونوں ہاتھ پھیر لیتے ہیں۔ عذر یہ ہوتا ہے کہ رومال بھول آیا ہوں اور میزبان کے واحد گیلے تولیے سے بے شمار آدمی ہاتھ پونچھ چکے ہیں۔) پھر نحیفہ کا رومال مانگ کر عینک چمکائی۔۔۔۔ "معاف کرنا تمھیں پورے غور و خوض سے دیکھنا پڑا۔ اگرچہ خوض کا پتہ نہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ اب تک حالات کچھ ایسے رہے ہیں کہ جو اصول مجھے جھوٹ بولنے سے منع کرتے وہی سچ کہنے سے بھی روکتے تھے۔ مگر اب جب کہ بہ قول انگلش محاورے کے۔۔۔۔ بلی تھیلے سے باہر آچکی ہے۔۔۔۔ تمھارے جنرل نالج میں اضافہ کرنے

کے لیے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ بھائی کا دم چھلانہ تمھیں فائدہ پہنچائے گا نہ کسی اور کو۔ اس سے تو بہتر ہو گا کہ تم مجھے رو فی ماموں یا رو فی چچا کہہ لیا کرو اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنے آپ کو کم عمر تو سمجھو گی ممکن ہے کہ سن سن کر دوسروں کو بھی یہی غلط فہمی ہونے لگے۔"

مقصود گھوڑا خودی یا خودداری پر وہ کتاب واپس کرنے گیا تو لائبریرین نے اسی موضوع پر ایک اور کتاب دکھائی۔ اس کے انکار پر بولا۔ "کھوئے کھوئے سے لگتے ہو، جیسے کسی شش و پنج میں ہو۔ ایسی حالت میں ہمیشہ فال نکالنی چاہیے۔"

مقصود گھوڑے کی خاموشی پر لائبریرین نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر کہا کہ الماری سے کوئی کتاب نکالے اور اس کے ایک صفحے پر کہیں انگلی رکھ دے۔

انگلی جہاں رکھی گئی وہاں لکھا تھا:

دلوں کا حال تو یہ ہے کہ ربط ہے نہ گریز
محبتیں تو گئی تھیں عداوتیں بھی گئیں

نہ جانے کس فارمولے سے لائبریرین نے یہ نتیجہ نکالا کہ "شگون اچھا ہے۔ مگر بہتری اسی میں ہوگی کہ اپنا ارادہ بدل دیں۔"

چناں چہ مقصود گھوڑے نے نحیفہ کو منانے کا پروگرام بنایا۔

اگلی مرتبہ جب دوسرے پہاڑ پر آمنا سامنا ہوا تو بلند آواز سے پڑھا:

کچھ رنج دلِ میر جوانی میں کھنچا تھا
زردی نہیں جاتی مرے رخسار سے اب تک

میر تقی میر سنہ ۱۷۱۸ سے سنہ ۱۸۱۰ تک۔"

مگر وہ سیدھی نکل گئی۔ مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

"سڑک پر یوں آوازے کسنا آداب کے خلاف ہے۔" فلاسفر کو برا لگا۔

"نری ہلڑ بازی ہے۔" شیطان بولے۔ "اور اگر موقع بے موقع، یعنی اکثر بے موقع شعر سنانے ہی ہیں تو شاعر کی عمر کو ساتھ کیوں گھسیٹ لیتے ہو؟"

"شعر کے نیچے جو لکھی ہوتی ہے، اس لیے ۔ ۔ ۔ ۔" مقصود گھوڑے نے بتایا۔

اب اس نے تہمیدہ کے ہاں جانا شروع کر دیا لیکن تہمیدہ کو وہ زیادہ اچھا نہیں لگتا تھا، بلکہ کم اچھا بھی نہ لگتا۔ شاید اس لیے کہ باسی کھانوں کو پسند کرتا تو ایک طرف رہا وہ تازہ چیزوں سے بھی ہچکچاتا۔ نہ اسے پھکڑپنے اور شستگی میں تمیز تھی (تبھی تہمیدہ کی واہی تباہی پر ویسی داد نہ دے سکتا جس کی اسے توقع ہوتی) اور نہ یہ اندازہ تھا کہ کب بات کرنی چاہیے اور کب چپ رہنا بہتر ہوگا کیوں کہ ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب خاموشی گویائی سے کہیں زیادہ موثر ہوتی ہے۔

تہمیدہ تک کی بے رخی کا اس پر کیا اثر ہوا؟ اس کا کسی نے نوٹس نہیں لیا۔

شاید اس لیے کہ مشکوک کی وجہ سے وہاں بے زاری کا معیار کافی اونچا ہو چکا تھا۔

آخر ایک دن شیطان نے اسے گھیر لیا ۔۔۔۔ "یہ کیا ہر وقت سنڑباف کی طرح بے فائدہ چاروں طرف بھاگتے رہتے ہو؟ ہر بار اس طرح ناکام ہوتے ہو کہ افسوس کی جگہ غصہ آتا ہے۔ تم جیسے لوگوں نے ہی ناکامی کو اتنا بدنام کر رکھا ہے۔ مقصود میرے دوست، میرے عزیز گھوڑے، یعنی پرانے رفیق ۔۔۔۔ سچ مچ تم ان میں سے ہو جو لاٹری کا ٹکٹ لیے بغیر اول انعام کے منتظر رہتے ہیں، اور جن کا رویہ سمجھنا بے حد مشکل ہے۔ مثلاً سنجیدہ محفلوں میں تم شوخ بننے کی کوشش کرتے ہو لیکن جہاں سب چہک رہے ہوں وہاں تمھیں سانپ سونگھ جاتا ہے ۔۔۔۔"

"لیکن تم ہی نے تو کہا تھا کہ مجھ جیسے لوگ ہر جگہ مقبول ہوتے ہیں۔" مقصود گھوڑے نے شکایت کی۔

"میری مراد تم جیسے افراد سے تھی، نہ کہ تم سے۔ وہ یقیناً مقبول ہوتے ہوں گے۔ عجب تماشا ہے۔ تم تو مجھے اچھے لگتے ہو لیکن تمھارے نظریے اور حرکتیں بالکل پسند نہیں ۔۔۔۔ زندگی کتنی پے چیدہ ہے۔"

"میں تو کوشش کرتا ہوں کہ چست، ذہین، محنتی اور خوش باش بنوں ۔۔۔۔ لیکن دوسرے نہیں بننے دیتے۔"

مقصود گھوڑے میں یہ خوبی ہے کہ سمجھانے یا نصیحتوں سے کبھی متاثر نہیں ہوتا۔ ان موقعوں پر وہ ایسا امپائر نظر آتا ہے جو بولر کی اپیل سے پہلے ہی ناٹ آؤٹ دینے کا فیصلہ کر چکا ہو۔

چوتھے پانچویں روز شیطان کا پیغام ملا کہ مقصود گھوڑا بستہ باندھ کر نحیفہ کے مکان کی طرف نکلا ہے فوراً آؤ۔

سڑک پر وہ منتظر ملے۔ جب تک ہم وہاں پہنچے اور آڑ لے کر قریب جاسکے تو مقصود گھوڑا تمہید ختم کر چکا تھا اور اب بتا رہا تھا کہ انسان جہاں جانوروں سے زبردستی کام لیتا ہے وہاں لٹریچر میں بھی ان بے چاروں سے انصاف نہیں برتتا۔ نثر ہو یا نظم، اپنی حرکتوں کو حیوانوں کے سر تھوپنا سراسر زیادتی ہے۔ کوئی آہستہ چلے تو اسے الکسی کہنے کی بجائے کچھوے کو کھینچ لاتے ہیں کہ اس کی طرح سست ہے۔ دشمن کے بغض پر اونٹ کو بدنام کیا جاتا ہے کہ نرا شتر کینہ ہے۔ مغرور محبوبہ کی ادائیں بھی اونٹ کے کھاتے میں لکھی جاتی ہیں کہ یہ شتر غمزے تھے۔ بناوٹی دوست بے وفائی نہیں کرتے طوطے کی نقل اتارتے ہوئے طوطا چشمی دکھاتے ہیں۔ کوئی مکار جھوٹی دل جوئی کرنے آئے تو قصور وار مگرمچھ ٹھہرایا جاتا ہے جس کے آنسو وہ بہانے لگتا ہے اور گدھے کی آئی۔ کیو۔ ٹسٹ کیے بغیر اس پر خرد ماغی کا بہتان لگایا گیا۔ رہ گئی خرمستیاں، کم از کم میں نے تو آج تک کسی گدھے کو چہلیں کرتے نہیں دیکھا۔ مثالیں اور بھی دی جاسکتی ہیں لیکن افسوس ہے تو اس پر کہ حیوانوں کو بیان کرتے ہوئے انسان نے اپنی خصوصیات کا کہیں حوالہ نہیں دیا ۔۔۔۔ مثلاً یہ کہ

بھیڑیے میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ وہ آدمی کی طرح ہٹ دھرم ہے ---- یا یہ کہ کوا اشرف المخلوقات کی طرح احسان فراموش ہے ---- یا یوں کہ چیتے انسان سے بھی زیادہ چالاک اور مکار ہوتے ہیں ----"

پھر ہم نے دیکھا کہ نحیفہ نے وہ سالم بستہ ضبط کر کے اپنے ملازم کو دیا اور مقصود گھوڑے کو خبردار کیا کہ آج لٹریچر کی کسی بھی صنف پر کوئی گفتگو نہیں ہوگی۔

"اور اگر آپ نے پہل کی تو یقین دلاتی ہوں کہ اسی دن واپس چلی جاؤں گی۔"

Miller ملر سے پہلی ملاقات کچھ اس طرح ہوئی جیسے فلموں میں دکھائی جاتی ہے۔
لگاتار بارش کا چھٹا یا ساتواں دن تھا۔ کمرے میں رکے ہوئے بادلوں اور ان کی نمی سے تنگ آکر چوڑے گھیرے کا گورکھا ہیٹ پہنا اور باہر نکلا۔ تیز جھکڑوں میں چھتری بے کار تھی۔ راستے پر پانی بہہ رہا تھا۔ چڑھائی آئی تو رفتار تیز کی۔ ورزش شروع ہوتے ہی جسم میں چستی آگئی۔ قدم خود بہ خود اٹھنے لگے۔

سڑک پر ایک جگہ بھیگا ہوا رومال دیکھا جس کے کونے پر انگریزی کے حروف G. M. کڑھے ہوئے تھے۔ کچھ دور آگے چمڑے کا بٹوہ ملا جس سے پائپ کی بڑھیا تمباکو کی مہک آئی۔ اس پر بھی G.M. لکھا تھا۔ پھر دو کیلے پڑے تھے اور ذرا آگے سنگترے۔ انھیں بھی اٹھایا لیکن ان پر کوئی نشان نہیں تھا۔

دھند گہری ہوتی گئی۔ کسی سے ٹکر نہ ہو جائے، اس لیے بار بار کھانسنا بلکہ کھنکارنا پڑتا۔
ایک موڑ کے بعد کہیں دور کھانسی سنائی دی۔ خیال آیا کہ اپنی ہی کھانسی کی گونج نہ ہو۔
دوبارہ کھانس کر انتظار کیا لیکن کوئی صدا نہیں آئی۔

کچھ دیر کے بعد پھر ویسی ہی آواز سنائی دی۔ آگے ایک سیب ملا اور اس کے قریب پاؤں کے نشان جو کسی چوپائے کے تھے۔ ذرا آگے جا کر ان کا رخ ایک غار کی طرف مڑ گیا۔
سوچنے لگا کہ ایسا چوپایہ کون سا ہو سکتا ہے جس کے پاس فالتو رومال اور پھل ہوں اور پائپ کا تمباکو بھی۔ غار میں جھانکا۔ اندر مکمل تاریکی تھی۔ کسی جانور کی چمکتی ہوئی آنکھیں دکھائی نہیں دیں۔

جانے ہی لگا تھا کہ آچھیں سے غار گونج اٹھا۔ یہ چھینک کسی حیوان کی ہرگز نہیں تھی کیوں کہ ساتھ ہی انگریزی کا ایک ترقی پسند لفظ بھی سنا۔
اندر جا کر دیکھا تو ایک چاق و چوبند شخص مسکرا رہا تھا۔ تمباکو کا بٹوہ لیتے ہی اس نے پائپ بھرا۔ لمبے لمبے کش لگا کر بولا۔ "شکر یہ کہ میرے پھٹے ہوئے تھیلے سے اور چیزوں کے ساتھ ماچس نہیں گری۔ ورنہ اس وقت تمباکو کے لطف سے محروم رہ جاتا۔"

پائپ پی کر پھل مانگے ۔ سنگترہ کھاتے ہوئے ہنسا۔ "اس ندیدے پن کو سکاٹس مین کی کنجوسی مت سمجھنا اس وقت سخت بھوک لگی ہے ۔ ویسے میرا تعلق پسماندہ ایبرڈین سے ہے، جسے لندن والے اتنا ہونق سمجھتے ہیں کہ پچھلے سال انھوں نے اپنے ایک معمے کا اول انعام ----
"گرمیوں میں ہرے بھرے ایبرڈین میں دو ہفتے کی مفت سیر" رکھا۔ جب کہ دوئم انعام ----
"گرمیوں میں ہرے بھرے ایبرڈین میں ایک مہینے کی مفت سیر۔"

میں نے چوپائے کے پنجوں کا ذکر کیا تو اس نے ایسا قہقہہ لگایا کہ غار ہلنے لگا۔

"وہ میرے ربڑ کے جوتوں کے نشان ہیں۔ میرے پاؤں کے نہیں۔"

معلوم ہوا کہ GM جارج ملر کا مخفف ہے لیکن یار دوست اس کی جہاں گردی کی وجہ سے اسے Gypsy ملر کہتے ہیں۔۔ جپسی ملر سن کر وہ تار یاد آگیا جسے ڈاکیہ لیے لیے پھرتا رہا۔ سینما کے مینیجر کے سامنے جی ۔ ایم ۔ کو جلدی میں ایم ۔جی کہہ بیٹھا۔ مینیجر نے مقصود گھوڑا سمجھ کر اسے ہماری طرف بھیج دیا۔

مقصود گھوڑا تار لے کر بہت خوش ہوا، کیوں کہ یہ لندن سے آیا تھا اور اس میں تتلیوں پرندوں اور سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کا حوالہ تھا لیکن پانچ ہزار میل دور سے یہ کس نے کیوں بھیجا؟ اس کا نہ اسے علم تھا نہ وجہ معلوم کرنے کی ضرورت سمجھی۔

شیطان نے تار دیکھا تو بولے۔ جپسی زنانہ معلوم ہوتا ہے۔ ضرور یہ کوئی فرنگی حسینہ ہے جو سیر کے لیے یہاں آئی ہے۔ "مقصود گھوڑا کئی دن اس ولایتی نازنین کی تلاش میں سرگرداں رہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

ملر سے اس تار کا ذکر کیا تو کہنے لگا کہ وہ تتلیوں، خوش نما پرندوں اور دل آویز قدرتی نظاروں کے رنگین سکیچ بنا کر ایک ولایتی کمپنی کو بھیجتا ہے جو وال پیپر اور دیگر آرائشی چیزوں کے ڈیزائن بناتی ہے۔

غار سے باہر نکلے تو دھند اتنی ہی گہری تھی اور بوندیں بھی ویسی ہی تیز۔ پھر یوں لگا جیسے اس کے قہقہے مینھ کو ہلکا کر رہے ہیں اور دھند بھی چھنٹی جا رہی ہے۔

"یہ موسم کا بھی خوب تماشا ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔ "برطانیہ میں تقریباً سب باشندے دھوپ والے چمکیلے ملکوں کے لیے آہیں بھرتے رہتے ہیں لیکن دنیا کے جس گوشے میں بھی کسی انگریز سے ملاقات ہوگی وہ گیلے دھندلے Home کو یاد کر رہا ہوگا۔"

مشکوک یہاں کیوں آیا تھا؟ کس لیے ٹھہرا ہوا ہے؟ کب جائے گا؟ اس پر قیاس آرائی ہوا کرتی ۔ اس کا اصلی نام کیا تھا؟ پھر کسی نے بتایا کہ میدان میں اس کے واقف اسے FB کہتے ہیں (پتہ نہیں یہ کس نام کا مخفف تھا) سب کو اس کی روانگی کا اشتیاق تھا لیکن فلاسفر نے بتایا" دیکھنے

میں یہی آیا ہے کہ جس واقعے کا جتنی بے صبری سے انتظار کیا جائے اتنا ہی وہ آگے سرکتا جائے گا۔"
باتوں باتوں میں مشکوک سے پوچھنے کی کوشش بھی کی مگر ہر دفعہ وہ کھی کھی ہی ہاپ سے ٹال دیتا۔
جہاں بالغ معلوم نہ کر سکے وہاں ننھے میاں کو کامیابی ہوئی۔ اس نے انکشاف کیا کہ مشکوک اپنی محبوبہ کے سلسلے میں یہاں آیا تھا اور تب تک رہے گا جب تک ایم۔ ایم (ننھے میاں نے محبوبہ۔ مشکوک کو مخفف کیا) یہاں ہے۔ ثبوت چاہیے تو ڈیری فارم کے اونچے مکان کا گیٹ دیکھ لیں۔ پہلے وہاں ایک تختی لگی ہوئی تھی۔ مشکوک کے میزبان کے نام کی۔ اب دو ہیں اور دوسری پر مشکوک کا نام لکھا ہے۔

انجینیر نے بتایا کہ اس نے بھی وہاں دو بورڈ دیکھے ہیں۔ ایک پر کسی کا نام ہے اور دوسرے " پر کتے سے خبردار رہیں۔" کی تنبیہہ۔ ننھے میاں نے کہا کہ اگلی دفعہ ذرا غور سے پڑھیں۔

بعد میں پتہ چلا کہ واقعی مشکوک کی تختی بھی لگ چکی ہے۔ پھر کسی نے دیکھا کہ "کتے سے خبردار رہیں، سے لفظ کتے کو کھرچ کر اسے دونوں تختیوں کے بعد اس طرح آویزاں کیا گیا کہ اب یوں پڑھا جاتا تھا کہ مشکوک اور اس کے میزبان سے خبردار رہیں۔

ضرور یہ ننھے میاں کی کرتوت ہوگی۔

چند دنوں کے بعد سب کچھ اتار دیا گیا، کتے والی تنبیہہ بھی۔ غالباً وہاں کوئی کتا تھا ہی نہیں۔ وہ بورڈ چوروں یا پھیری والوں پر رعب ڈالنے کے لیے لگایا گیا تھا۔

پھر ننھے میاں نے دور سے وہ محبوبہ دکھائی۔ اس کے متاپے، چھوٹے قد اور سست روی سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ ہماری طرف آرہی ہے یا ہم سے دور جارہی ہے۔

ننھے میاں جس پر ان دنوں جیومیٹری کی میوشن سوار تھی، کہنے لگا۔۔۔۔ "وہ رہی ایم۔ ایم جو کبھی گنبد نما معلوم ہوتی ہے تو کبھی مستطیل ناقص۔ اسے متوازی الاضلاع بھی کہا جا سکتا ہے اور چہرہ ایسا دائرہ کامل ہے جیسے باقاعدہ پرکار سے کھینچا گیا ہو۔"

پہلے سب یہی کہا کرتے کہ مشکوک جیسے انسان میں کوئی بھی صحیح الدماغ لڑکی دل چسپی نہیں لے سکتی۔ لیکن اسے دیکھا تو سوچنے لگے کہ کیا واقعی کوئی مرد بہ قید ہوش و حواس ایسی ہستی کا بھی گرویدہ ہو سکتا ہے۔ متفقہ رائے یہی تھی کہ مردوں میں جو حیثیت مشکوک کی ہے۔ مونث طبقے میں وہی مقام اس کی محبوبہ کا ہوگا۔

یہ راز راز ہی رہتا اگر ایم۔ ایم کی ننھے میاں سے جھڑپ نہ ہوتی۔

وہ میٹنی دیکھنے آئی تو ننھے میاں حکومت آپا سے جیومیٹری پڑھنے کا بہانہ کر کے وہاں پہنچا ہوا تھا۔ فلم سے پہلے خبرنامے میں کسی محاذ پر ٹینکوں کی لڑائی دکھائی گئی۔ اچانک ننھے میاں کو یوں لگا کہ جیسے ایک چھوٹے سے ٹینک نے مڑ کر گیٹ کیپر پر حملہ کر دیا ہو لیکن غور سے دیکھنے پر یہ

ایک عورت نکلی جو گیٹ کیپر سے بحث کر رہی تھی کہ اس نے اتنے بڑے صوفے پر بیٹھنے کو کیوں کہا؟ کیا وہ اس کی صحت مندی اور تن و توش سے حسد کرتا ہے؟

پھر خوانچے والے سے مافیاں، چوسنے کی گولیاں، چاکلیٹ خرید کر آلو کے قتلوں اور فرنچ ٹوسٹ کا آرڈر دیا۔ ذرا سی دیر ہو گئی تو مینیجر کو بلا کر شکایت کرنے لگی۔ ادھر خوانچے والا بار بار کہتا کہ میں تو پلیٹیں لیے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں، آپ کہیں نظر ہی نہیں آئیں۔ اس فقرے کو اپنے چھوٹے قد پر چوٹ سمجھ کر اسے ڈانٹنا شروع کر دیا۔

اب ننھے میاں کی باری آئی جو بالکل آگے بیٹھا تھا۔ پہلے ٹوکا کہ "سر جھکاؤ، فلم نظر نہیں آ رہی۔" سر نیچے کیا تو "دہنی طرف ہو جاؤ" سنائی دیا۔ پھر "نچلے کیوں نہیں بیٹھتے؟" اور اس کے بعد "ذرا بائیں ہو جاؤ۔"

اس بے انصافی پر وہ چڑ گیا۔ فلم ختم ہوئی تو کسی طرح اس لڑاکا خاتون کا تعاقب کر کے اس کا مکان دیکھا اور جاسوسی شروع کر دی۔

وہ ہمیں پہلے بھی کئی بار نظر آئی تھی لیکن کبھی توجہ نہیں کی۔ تب ہمیں مشکوک کی محبت کا علم نہیں تھا اور وہ رہتی بھی تھی کافی دور۔

ننھے میاں نے بتایا کہ پہلے اس کا کنبہ نچلے قصبے میں تھا لیکن اس کی جھگڑالو عادت کی وجہ سے بار بار رہائش بدلنی پڑی۔ آخر بن باس ملا اور اب یہ جنگل میں رہتے ہیں۔

بعد میں اسے قریب سے بھی دیکھا۔ پتہ نہیں اس کی نگاہیں ہم تک پہنچ سکیں یا نہیں کیوں کہ چہرہ اتنا فربہ تھا کہ آنکھیں کبھی نظر نہیں آئیں۔ البتہ ان پر بغیر فریم کی عینک خوب چمکتی۔ اچھے خاصے میک اپ کے باوجود اس کے چہرے پر عجیب سبزی مائل یا کچھ نیلی سی جھلک ہوا کرتی، خصوصاً سہ پہر شام کو۔ انجینیر کا خیال تھا کہ شاید مغرب کا یہ فیشن یہاں ابھی ابھی پہنچا ہے۔ وہاں چہرے کی آرائش اب طرح طرح کے رنگوں سے کی جاتی ہے۔ زلفیں بھی سیاہ، سرخ اور سنہری ہی نہیں رہیں بلکہ سبز، کاسنی، نیلی بھی رنگی جاتی ہیں۔ مقصود گھوڑے کی رائے تھی کہ شاید یہ اپنے چہرے کے ہلکے ہلکے بالوں کی حجامت کرتی ہو۔

"مغرب میں نسوانی شبیہہ کو جو انچوں میں بیان کیا جاتا ہے، یعنی ۳۸ - ۲۲ - ۳۶ یا ۳۸ - ۲۲ - ۳۹ وغیرہ، اسے یاد رکھنا مشکل ہوتا ہو گا۔" فلاسفر نے کہا "لیکن اس محبوبہ کے پیکر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا تناسب بالکل آسان ہے۔ یہ ۴۵ - ۴۵ - ۴۵ ہو گا یا ۴۶ - ۴۶ - ۴۶۔"

"شاید اس کے خدوخال اور طرح کے لگیں۔" کیمسٹ سمجھانے لگا۔ "ان پہاڑوں سے آگے جو بلندیاں ہیں یہ وہاں کی معلوم ہوتی ہے۔ دراصل اتنی اونچائی پر کیمیائی اثرات سے حیوانوں انسانوں میں تبدیلیاں آجاتی ہیں۔ شاید تبھی اس کے اصلی حسن کو ہم اچھی طرح نہ سمجھ سکیں۔۔۔۔

ادھر ننھے میاں نے بتایا کہ ایم۔ ایم پہاڑی نہیں میدانی ہے، ادھر ڈاکٹر بولا "اگرچہ اب تک اصلی

حسن سے میرا واسطہ نہیں پڑا لیکن اگر حسن ایسا ہی ہوتا ہے تو کیا کیمسٹ اس سے شادی کرنے پر رضامند ہے؟"

اور کیمسٹ "ابھی آیا" کہہ کر ایسا غائب ہوا جیسے وہاں تھا ہی نہیں۔

یہ خبر بھی ننھے میاں کی تھی کہ ایم۔ ایم کنبہ نہایت مال دار بارسوخ ہے۔ مشکوک کو دولت کا لالچ ہے یا کسی عہدے کا، کیوں کہ یہ اکلوتی بیٹی ہے۔ جب بھی جنگلات والوں کی لاری میں لفٹ مل جائے یہ ان کے ہاں پہنچتا ہے اور واپس آتے وقت چہرے پر وہ مسکراہٹ ہوتی ہے جو الف لیلیٰ کے عمر عیار کے منھ پر دکھائی جاتی ہے۔

"شاید جنگلات والوں سے کچھ سیکھنے جاتا ہو۔" فلاسفر بولا۔

مگر ننھے میاں کو پورا یقین تھا کہ یہ ایم۔ ایم ہی ہے جو اسے پڑھاتی سکھاتی ہے۔ جیسے فلم شروع ہونے پر ایکٹروں، موسیقاروں، مددگاروں وغیرہ کے ناموں کے بعد آخر میں سب سے اہم نام آتا ہے ---- اس کا جس نے فلم ڈائرکٹ کی ہے۔ اسی طرح ایم۔ ایم ہی مشکوک کی اصلی ڈائریکٹر ہے۔

"ممکن ہے کہ وہ اسے اچھی اور مفید باتیں بتاتی ہو۔" فلاسفر نے کہا۔

لیکن ننھے میاں نے نہیں مانا۔ اس لیے کہ تہمیدہ جب بھی افواہیں پھیلاتی تو ایک دن پہلے اسے ایم۔ ایم کے ساتھ دیکھا جاتا۔ ملغوبہ جیسی خوش مزاج اور خوش خوراک کا موڈ محض تب خراب ہوتا جب ایم۔ ایم سے ملاقات ہو جائے۔

"محبوبہ کی یہ خوبی کسی نے نوٹ نہیں کی کہ بعض اوقات وہ اتنی بدمزاج نہیں ہوتی جتنی کہ عموماً رہتی ہے۔" فلاسفر نے ایک اور کوشش کی۔

ننھے میاں نے چھپ کر یہ بھی دیکھا کہ صبح صبح وہ مشکوک کو خوب ڈانٹ رہی تھی اور وہ ہیں ہیں کر رہا تھا۔ اس پر کمیٹوں کو یقین نہ آیا۔ شاید اس لیے کہ مشکوک قد میں محبوبہ سے دگنا تھا۔

"لیکن یہ علی الصبح کیوں؟"

"اس لیے کہ وہ اتنی دور پیدل تو جا نہیں سکتا، خواہ کوچہ یار ہی کیوں نہ ہو۔ اس طرف صرف جنگلات کی لاری جاتی ہے اور جو پروگرام لاری کا ہوتا ہے وہی مشکوک کا۔ کسی دن آپ کو لے چلوں گا۔"

میٹنی پر تیز آندھی سے بجلی فیل ہو گئی۔ اعلان کیا گیا کہ ان ہی ٹکٹوں پر فلم کل دکھائی جائے گی۔ ہال سے باہر نکلتے ہوئے ملر نظر آگیا۔ اپنے ساتھیوں سے اس کا تعارف کرایا اور چائے کے لیے کہا۔

"تمھاری چائے بعد میں ہوگی۔ آج میری پسندیدہ دکان پر چلو۔"

وہ ہمیں نچلے بازار کے سرے پر ایک بیکری میں لے گیا جو کیفے کا حصہ تھی۔

"اس میدان میں ہمارے خیمے نصب تھے۔" اس نے کھڑکی سے باہر اشارہ کیا۔ "کئی برس ہوئے سڑکیں بنانے کے سلسلے میں اس وادی کے سارے حصوں میں قیام رہا۔ اسی لیے چپے چپے سے واقف ہوں۔ پگڈنڈیاں تک یاد ہیں۔ یہ دکان بھی تب کی ہے۔ ہمارے ماہر بیکر نے انھیں ٹریننگ دی تھی۔ بسکٹوں کے بعد ان کی ڈبل روٹی بھی چکھو۔"

واقعی ڈبل روٹی کیک سے بھی زیادہ مزے دار تھی۔

"ان دنوں کی ایک اور چیز دکھاؤں ----" ہم ایک پرانی سی عمارت کے پاس پہنچے تو اس نے پوچھا" دروازے کے پاس سفید پتھر پر سیاہ الفاظ نظر آئے؟"

وہاں انگلش میں لکھا ہوا تھا کہ فلاں تاریخ کو ڈپٹی کمشنر اینڈرسن نے کرکٹ پویلین کا سنگ بنیاد رکھا۔

"اب اسے قریب سے بھی دیکھتے ہیں۔"

نزدیک پہنچ کر پڑھا تو جلی الفاظ کے ساتھ ساتھ باریک حروف بھی تھے ----

کرکٹ پویلین کا یہ سنگ بنیاد

مسٹر بی۔ ایف۔ اینڈرسن ایم۔ بی ای، آئی سی۔ ایس، ڈپٹی کمشنر

اپنے دست خاص سے نصب

نہ کر سکے۔ کیوں کہ موصوف کو اتنی گرمی لگی کہ ہمیں بتائے بغیر کشمیر چلے گئے۔

"اینڈرسن نے وعدہ کیا تھا لیکن آیا نہیں۔ اس لیے ہمیں اس قسم کا کتبہ لگانا پڑا۔ بعد میں ایک کرکٹ میچ ڈپٹی کمشنر الیون سے رکھا۔ موسم اچھا تھا اس لیے اینڈرسن بھی کھیلا۔ کتبہ دیکھ کر دیر تک ہنستا رہا۔ اس کے سامنے کھڑے ہو کر تصویر اتروائی ---- کالج کے دنوں میں ضرور سپورٹس مین رہا ہو گا۔"

آگے کی طرف چبوترہ سا تھا۔

" ہمارے سینئر افسر نے یہاں قد آدم آئینہ لگوا دیا۔ کام پر نکلتے تو آئینے کے سامنے سے گزرتے، جس پر یہ فقرے لکھے ہوئے تھے ----

باہر جا رہے ہو تو پہلے اپنا لباس چیک کرو

پھر اپنی مسکراہٹ چیک کرو

اور اپنا موڈ چیک کرو۔"

مشکوک جیسے آدمی سے ملنے کے بعد ہم اجنبیوں سے کترانے لگے تھے لیکن ملر کو سب نے پسند کیا۔ خصوصاً اس کی زندہ دلی کو اور بشاش گفتگو کو بھی جو ہمیشہ نپی تلی اور مختصر ہوا کرتی۔

اس نے بتایا کہ ہر سال جب مشرق کا چکر لگاتا ہے تو اس خوش نما وادی کی سیر بھی ہوتی

ہے۔

"اگلی دفعہ لمبی جھڑی لگی تو تمھارے ہاں چائے پیوں گا۔"

جھڑی کی شرط عجیب سی لگی۔ پوچھا تو کہنے لگا "تب ایک خاص نظارہ دیکھیں گے۔"

کچھ دنوں کے بعد بارش شروع ہوئی تو اس کا وعدہ یاد آیا۔ روزانہ لاری کے ڈرائیور سے اسی بیکری کے بسکٹ منگاتے اور انتظار رہتا۔

پھر سوچا کہ شاید بھول گیا ہوگا لیکن برستے مینھ میں وہ پہنچا۔ پلاسٹک کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ ہاتھ میں مڑا تڑا اڈنڈا اور کندھے پر تھیلا۔

سب سے پہلے اسے ہماری رہائش کی زبوں حالی پر افسوس ہوا کہ ایسے بوسیدہ، اندھیرے کمروں میں رہنا مایوسی اور بے زاری کو خوش آمدید کہنا ہے۔ فوراً ان کی مرمت کرانی چاہیے۔

"لکڑی کی دیواروں پر سفیدی کراؤ اور جس قسم کے بلب لگا رکھے ہیں ان سے روشنی کی جگہ اداسی پھیلتی ہے۔ انھیں ابھی بدلو۔ پردے بھی ہلکے رنگ کے ہونے چاہئیں تاکہ اجالا ان سے منعکس ہو سکے، نہ کہ ان میں جذب ہو کر رہ جائے۔ کمروں میں شوخ و شنگ تصویریں لگاؤ۔۔۔۔ اگر یہ نہیں کر سکتے تو اسی وقت اپنا سامان اٹھا کر کسی صاف ستھرے اور روشن ریسٹ ہاؤس میں چلے جاؤ کیوں کہ ایسی جگہ رہ کر کسی قسم کی شادمانی یا جولانی کی توقع رکھنا نری بے وقوفی ہے۔"

ہم نے وعدہ کیا جب وہ اگلی مرتبہ آیا تو کمرے بہتر ہوں گے۔

چائے کے بعد بارش میں ہم سب باہر نکلے۔ ایک بالکل نئے شارٹ کٹ سے اس نے ہمیں پہاڑ کے بالکل دوسری طرف پہنچا دیا جہاں سے ایک درہ شروع ہوتا تھا جو آگے جا کر کھل جاتا۔

"جب اس وادی میں پہلی مرتبہ آنا ہوا تو ہمیں پتہ تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ بارش آسام میں ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہ پہاڑ تیسرے یا چوتھے نمبر پر ہے۔ گرمیوں میں لگاتار برسات اور سردیوں میں برف باری کی طوالت سے تنگ آتے اور سورج دیکھے ہوئے کافی عرصہ گزر جاتا تو سیدھے اس درے کا رخ کرتے جو پرلے میدانوں کی طرف کھلتا ہے۔ وادی میں موسم کتنا ہی خراب ہو لیکن یہاں سے ہمیشہ وہ دور دراز چمکیلا ہرا بھرا علاقہ نظر آتا ہے۔۔۔۔"

درے کے پار نہایت خوش نما منظر دکھائی دیا۔ سبز و شاداب کھیت تھے، ایک بل کھاتی ہوئی ندی چمک رہی تھی۔ دہنے بائیں نالے آ کر اس میں گرتے۔۔۔۔ یہ دریا کا منبع تھا۔

"اور اس دل کش نظارے پر نگاہیں جماتے ہی روشنی کی دمک، دھوپ کی تمازت، سچ مچ محسوس ہونے لگتی۔ بچپن میں پڑھی ہوئی وہ کہانی یاد آ جاتی۔ کسی برفانی ملک کے حکم ران کے سامنے ایک آدمی پیش کیا گیا جس پر جرم کا شبہ تھا۔ جب کوئی ثبوت یا چشم دید گواہ نہ مل سکا تو یہ فیصلہ ہوا کہ شہر سے باہر بڑے حوض میں وہ رات بھر کھڑا رہے۔ اگلے دن زندہ ملا تو بے قصور

بجھیں گے۔ جب اسے کچھ نہ ہوا تو سب کو حیرت ہوئی۔ وجہ پوچھنے پر بتانے لگا کہ جوں ہی تخ پانی میں اترا تب اندھیرے میں کہیں دور ٹمٹماتی روشنی نظر آئی۔ فوراً اس پر نظریں جمالیں اور پھر نہ ہٹائیں۔ آہستہ آہستہ یوں لگا جیسے روشنی کی گرمی آنکھوں سے ہوتی ہوئی سارے جسم میں حلول کر رہی ہے اور امید دلا رہی ہے کہ کچھ دیر کے بعد صبح بھی ہوگی اور سورج نکلے گا۔۔۔۔"

ملر نے پائپ سلگایا۔ مرمت شدہ تھیلے سے پھل نکال کر بانٹے اور فلاسفر کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ "خوش رہا کرو۔ پریشان رہنے والوں کو کبھی کچھ نہیں ملا۔ اگر ملا بھی تو وہ اس سے لطف اندوز کبھی نہیں ہو سکے۔"

جب اسے یاد دلایا کہ یہ تو فلاسفر ہے، اس پر ایسا قہقہہ سنا کہ پہاڑوں سے کئی مرتبہ گونج واپس آئی۔

"صرف اس لیے کہا تھا کہ میں خود اس دور سے گزر چکا ہوں۔ برسوں تک خوب دل لگا کر پریشان رہا۔ شاید اس لیے کہ پریشان ہونا بے حد آسان ہے لیکن سوائے اس کے کہ چہرے پر غلط جگہ لائنیں پڑ گئیں، کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ چہرے پر لائنیں پڑنی ہی ہیں تو فقط وہاں پڑنی چاہئیں جہاں مسکراہٹ سے بنتی ہیں۔"

چھٹی کے دن موسم نہایت اچھا تھا۔ شیطان کو دفعتہً یاد آگیا کہ ہماری Pin - up تصویریں بگاڑنے پر ننھے میاں کو ڈانٹنا باقی ہے۔

پگڈنڈیوں سے اترتے ہوئے ہم کافی نیچے آچکے تھے کہ حکومت آپا اوپر آتی دکھائی دیں۔ پیچھے پیچھے چند لڑکیاں تھیں اور آخر میں ننھے میاں۔

"آئیے آئیے ۔۔۔۔ اوپر آجائیے۔" شیطان بولے" اور اپنا حسین و جمیل چہرہ بھی ساتھ لائیے۔"

لڑکیوں کے سامنے وہ شرما سی گئیں۔ "سنا ہے یہیں کہیں سرکس آیا ہوا ہے۔ سوچا کہ ننھے میاں کو وہاں لے چلیں۔"

"ہم کیوں لے چلیں؟ سرکس والوں کو ضرورت ہوگی تو خود آکر اسے لے جائیں گے۔" شیطان نے کہا۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے۔" ننھے میاں آہستہ سے بولے۔ (شیطان کے قد کے سلسلے میں فقرہ کبھی کبھی سننے میں آتا) مگر شیطان نے یوں ظاہر کیا جیسے کچھ نہیں سنا اور تصویروں پر پوچھ گچھ شروع کر دی۔

"اگر واقعی وہ گودام تک پہنچ چکی ہیں تو ان میں کبھی کشش تھی ہی نہیں کیوں کہ چہرہ سچ مچ حسین ہو مونچھ، داڑھی، عینک اور سگار کے باوجود بھی اچھا لگے گا۔" ننھے میاں نے اپنی ٹھوری

پیش کی۔

"شاید سرکس وہ ہے ۔۔۔۔" انجینیر نے رنگین خیمے اور قناتوں کی طرف اشارہ کیا جہاں ڈھول بج رہا تھا۔

"آپ کس قسم کے انجینیر ہیں؟" ننھے میاں نے پوچھا۔

"جیسے ہوا کرتے ہیں۔"

"لیکن امریکہ میں تو ریلوے انجن کے ڈرائیور کو بھی انجینیر کہا جاتا ہے۔"

سرکس کے احاطے میں وہ ضد کرنے لگا کہ جانوروں کو بیک گراؤنڈ میں رکھ کر ہماری تصویریں اتارے گا۔ آٹھ فوٹو لے کر اس نے لڑکیوں سے کہا" باکس کیمرے کی فلم ختم ہو چکی ہے اس لیے آپ مسکرانا بے شک بند کر دیں۔"

"بڑوں کے ساتھ تمیز سے پیش آنا چاہیے۔" شیطان نے ڈانٹا۔

"چھوٹوں سے بار بار کہا جاتا ہے کہ اچھے آداب سیکھو لیکن کس سے سیکھیں، یہ کوئی نہیں بتاتا۔

"بہر حال تمہارا رویہ مایوس کن ہے۔" شیطان بولے۔

"مگر مایوس تو مجھے ہونا پڑتا ہے۔" جواب ملا۔

شیطان خفا ہونے کا ارادہ کر رہے تھے کہ سرکس کا شو شروع ہو گیا۔ بالکل معمولی سا تھا۔ ایک تو جانور بہت کم تھے اور پھر انھوں نے قسم کھا رکھی تھی کہ رنگ ماسٹر کا حکم نہیں مانیں گے۔ باہر نکلے تو آئس کریم والے کو دیکھتے ہی مشکوک جو ہمیں سرکس میں ملا تھا، سڑک پار کر گیا۔

"کون ہے یہ بد تمیز؟" حکومت آپا نے پوچھا" اتنا باتونی ہے کہ اس کی آواز سن سن کر میرا گلا بیٹھ گیا۔"

"اسے مشکوک کہتے ہیں۔" شیطان نے بتایا۔

"یہ شخص جو خود اپنا کارٹون معلوم ہوتا ہے، کیا اس کے بغیر تمہارا گزارا نہیں ہو سکتا؟ مجھے پہلے ہی سے پتہ تھا کہ یہاں بھی تم نے کوئی ہم ذوق ضرور ڈھونڈھ لیا ہوگا۔"

"ڈھونڈا نہیں۔ آپ ہی تسمہ۔پیر کی طرح مسلط ہو گیا ہے۔"

"لیکن جس کے ہاں مقیم ہے وہ اسے جینیس سمجھتا ہے۔" فلاسفر نے حمایت کی۔

"جینیس کا پتہ نہیں۔ البتہ جن ضرور لگتا ہے۔" حکومت آپا نے کہا۔

چائے پر سب سے حکومت آپا کا آفیشلی تعارف کرایا گیا۔

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" مشکوک بولا۔

"کسی اجنبی سے بات کیے بغیر یکایک کیسے خوشی ہو سکتی ہے؟" حکومت آپا نے پوچھا۔

"ملاقات پر واقعی خوشی ہوئی ہے۔" مشکوک نے محض رسماً کہہ دیا۔

"اگر مان لیا جائے کہ آپ سچ کہہ رہے ہیں تو جھوٹ کے سر میں سینگ ہوتے ہوں گے۔"
شیطان نے موضوع بدلنے کے لیے مشکوک کی انگلی میں بندھی ہوئی پٹی کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے بتایا کہ صبح صبح مسوڑھوں پر منجن رگڑتے وقت انگلی دانتوں میں آگئی۔
حکومت آپا نے ڈاکٹر کو مشورہ دیا کہ Anti - Rabib ٹیکوں کا کورس شروع کرانا کیسا رہے گا؟ مشکوک نے منھ اور بھی برا بنالیا۔
شیطان نے پھر بات ٹالی ----"ہم پہاڑ پر ہیں اور رضیہ میدانوں میں۔ پتہ نہیں وہاں کتنی گرمی ہوگی۔"
"میں پوچھنا بھول گئی ---- اس وادی میں موسم عموماً کیسا رہتا ہے؟"
"جولائی اگست ستمبر موسلادھار بارش کے مہینے ہیں۔ البتہ جون میں تمھارے مزاج جیسی تمازت ہوتی ہے اور نومبر سے فروری تک سب کچھ یوں یخ رہتا ہے جیسے تمھارا دل ----"
"دیر ہوگئی ----" حکومت آپا نے گھڑی دیکھی۔ "آج کافی وقت ضائع کرنا پڑا۔"
"جو کہتے رہتے ہیں کہ وقت ضائع مت کرو، شاید یہ نہیں جانتے کہ وقت بھی آہستہ آہستہ انھیں ضائع کر رہا ہے۔" شیطان بولے۔
حکومت آپا اور لڑکیاں جانے لگیں تو ہم دونوں انھیں چھوڑنے نکلے۔
راستے میں بہت کم باتیں ہوئیں۔ جب لڑکیاں اندر چلی گئیں تو حکومت آپا نے شیطان سے کہا "یہ دیکھ لینے کے بعد کہ میرا قیام کہاں ہے، کبھی اس طرف آنے کو جی چاہے تو بے شک تشریف مت لانا۔"
"بڑے افسوس کی بات ہے۔" شیطان نے شکایت کی۔ "خصوصاً جب تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تقریباً آٹھ برس سے مجھے پہلے رضیہ کا اور بعد میں تمھارا خیال رہا ہے۔ مگر ان آٹھ برسوں میں پہلے رضیہ اور بعد میں تمھاری طرف سے مکمل بے توجہی رہی۔ یہ آٹھ سال اداسی کے تھے۔ یہ آٹھ سال مایوسی کے تھے ----"
"انھیں جمع کرنے پر میزان چوبیس سال بنتا ہے یعنی جب تم ننھے سے بچے تھے تب سے بلا دیکھے میرا خیال رہا ----"
"اور رضیہ کا بھی۔" شیطان نے لقمہ دیا۔ "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رضیہ کی غیر موجودگی میں تم اس وادی کی سب سے دل کش لڑکی ہو۔ یعنی اس ٹیلے، اس مکان اور سڑک کے درمیان جو علاقہ ہے، اس کی سب سے دل کش ----"
"اور تمھارا چہرہ اس وادی کے خوش نما مرغزاروں کے کسی مرجھائے ہوئے پھول کی طرح تر و تازہ دکھائی دے رہا ہے۔" حکومت آپا نے کہا۔
"شاید پرانا زمانہ بہتر تھا۔" شیطان ٹھنڈا سانس بھر کر بولے۔ "تب نہ تو لڑکیوں سے

ملاقات کے موقعے ملتے تھے ۔ نہ ان کے ایسے ایسے فقرے سننے پڑتے ہوں گے ۔ بس کسی تنہا گوشے میں آہیں بھر بھر کے یاد کر لیا۔ جدائی میں محبوبہ کے خوش گوار تصور کو برقرار رکھنا کتنا آسان ہے ۔ مگر ان دنوں محبت بھی دیرپا ہوتی ہوگی کیوں کہ محبوبہ کا چہرہ صابن سے دھلنے کے بعد بھی پہلے جیسا ہی رہتا ہوگا ۔"

"بعض اوقات تمھاری باتیں اتنی معقول لگتی ہیں کہ تعجب ہوتا ہے کہ کبھی کبھی تم ایسے شاعر معلوم ہوتے ہو جس نے شاعری کبھی نہ کی ہو ۔"

"مجھے بھی حیرت ہوتی ہے ۔ خصوصاً اس پر کہ تم مجھا تو سب کچھ سکتی ہو لیکن سمجھ بالکل نہیں سکتیں۔ تم جہاں ناز سے قدم رکھتی ہو وہاں کیلے کے چھلکے بچھانے کو جی چاہتا ہے ---- جاؤ مت ---- ابھی ٹھہرو ------ میں کچھ اور دیر تمہارا بنا چاہتا ہوں ۔"

گیٹ کی طرف جاتی ہوئی حکومت آپا کو یہ بھی بتایا ---- "یاد رکھنا کہ مجھے پہلے رضیہ کا انتظار رہے گا، بعد میں تمھارا میں ابد تک منتظر رہوں گا ---- اور اس کے بعد Extension مانگوں گا ---- " دفعتہً تیز جھونکے سے حکومت آپا کے دوپٹہ اڑ گیا جسے شیطان نے پھرتی سے دوڑ کر دبوچ لیا اور واپس دیتے ہوئے گلہ کیا ---- "تم نے میری فیلڈنگ کی داد نہیں دی ۔"

اگلے پک نک پر حکومت آپا اور ننھے میاں کو بھی بلایا گیا۔

مشکوک ان سے پرے پرے رہا۔ کھیلوں کے بعد چائے تقسیم ہو رہی تھی کہ حکومت آپا سے آمنا سامنا ہو گیا۔

"آپ پہلے سے بہتر لگ رہے ہیں۔ ان دنوں کیا بیمار رہے تھے ؟" انھوں نے مشکوک سے پوچھا۔

"محترمہ میں آپ کو بالکل نہیں جانتا ۔" اس نے احتجاج کیا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے ۔ میں بھی تو آپ کو بالکل نہیں جانتی ۔ مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ کچھ بتانا ہو تو صاف صاف کہا کریں ، کیوں کہ آدھی یا پونی نامکمل بات تب کی جاتی ہے جب دوسرے کو پریشان کرنا ہو اور اتنی تیز گفتگو بھی اچھی نہیں لگتی کہ الفاظ مشین گن سے فائر کیے جا رہے ہوں۔ سننے والوں کو چھینک آجائے یا کھانسی تو فوراً تین چار فقرے گزر جاتے ہیں۔ ذرا دیر پہلے آپ نے ڈیموکریسی کہا لیکن Democrazy سنائی دیا اور فلاسفی بالکل فولوسفی لگی ۔ کئی لفظ تو سمجھ میں ہی نہیں آئے ۔"

"اگر آپ ذکی الحس اور وسیع النظر ہوتیں تو سمجھاتا۔ جب یہ خصوصیتیں غائب ہوں تو کچھ کہنا سننا بے کار ہے ۔"

"اگر میں ذکی الحس اور وسیع النظر ---- ان کے معنے جو بھی ہوں گے ---- ہوتی تب بھی یہی کہتی کہ باتیں کم کی جائیں تو بہتر ہوگا۔ جیسے گوالے دودھ میں پانی ملاتے ہیں، اسی طرح

زیادہ بولنے سے گنے گنائے خیالات اور ہلکے ہوتے جاتے ہیں۔ یعنی اگر اصلی مطلب معلوم کرنا ہو تو ساری گفتگو کو نویا دس پر تقسیم کرنا پڑتا ہے۔"

اتنے میں ننھے میاں نے وہ فوٹو نکالے جو سرکس میں اتارے تھے۔ تصویریں یوں ہی سی تھیں۔ مشکوک کو بالکل پسند نہیں آئیں۔ "اتنی دور سے اتاری ہیں کہ چہرے پہچانے نہیں جاتے Close up لینے چاہئیں تھے۔" اس نے کہا۔

حکومت آپا نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر Pansy کا پھول تلاش کر کے توڑا۔

"کلوز اپ دیکھنا ہو تو اس پر بنا ہوا ہے۔" انھوں نے پھول دکھایا۔ واقعی اس پر رنگوں سے جو ڈیزائن بنا ہوا تھا مشکوک کے معنک چہرے کا عکس لگتا تھا۔

وہ کچھ کہنے لگا تھا۔ بات اس کے ہونٹوں تک آئی پھر جیسے یک تخت ہالٹ کر لیا۔ شاید اپنی بات کا جواب حکومت آپا کے چہرے پر پڑھ لیا تھا۔

اس کے یوں خاموش ہو جانے پر سب کو اطمینان ہوا۔ پہلی مرتبہ کسی نے اسے چپ کرایا تھا۔

اتوار کو ننھے میاں دو تین دفعہ آیا اور کھسر پھسر ہوتی رہی۔ معلوم ہوا کہ وہ پروگرام بن رہا ہے جس کے لیے صبح چار بجے اٹھ کر کئی میل پیدل چلنا ہو گا۔ سوچا کہ بونڈا باندی میں ایسے وقت کون جائے گا۔ یہ واپس آئیں گے تو بتا دیں گے کہ کیا ہوا تھا لیکن ان کی آوازوں سے آنکھ کھل گئی۔

چاروں طرف تاریکی تھی۔ بادلوں کے گالے نیچے اتر رہے تھے۔

ہم چلتے گئے حتیٰ کہ ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے لگی۔ تیسرے چوتھے موڑ کے بعد مشکوک کی محبوبہ کا مکان تھا۔ کہرا اور بادل نہ ہوتے تو سورج کبھی کا نکل آیا ہوتا۔ آخری نکڑ پر ننھے میاں ملا۔ وہ ان درختوں تک لے گیا جن کے پیچھے ہمیں چھپنا تھا۔

وہاں سے جو نظارہ دیکھا وہ اس سے مختلف نہیں تھا جب مشکوک کو سپاہیوں نے مشتبہ سمجھ کر گھیرا۔ فرق تھا تو اتنا کہ وہاں دو مرد تھے اور یہاں ایک عورت، جو اسے ڈانٹ بھی رہی تھی۔ عورت کے ہاتھ میں Shave کرنے کا برش تھا جس پر صابن کا جھاگ تھا اور دوسرے ہاتھ میں ریزر۔ پسپا ہوتے ہوتے وہ پھاٹک تک پہنچ جاتا۔ پھر رخ بدل کر الٹا گیر لگاتا۔ محبوبہ سیدھی چلتی چلتی اسے برامدے تک لے جاتی۔ وہاں سے پھر واپس لوٹتے۔

فاصلے کی وجہ سے باتیں نہ سن سکے لیکن اس کے چہرے اور ہاتھ پھیلانے کے انداز سے یہی لگتا تھا کہ وہی بائیں بائیں ہو رہی ہو گی۔

"بھیڑ کی کھال میں سے بھیڑیا شاذ و نادر ہی برآمد ہوا ہو۔" انجینیر نے میرے کان میں کہا

"وہ رات یاد آگئی جب نچلے قصبے میں اسے پہلی مرتبہ دیکھا۔ تب اس سے واقفیت کا آغاز ہوا تھا۔
اب اختتام کا انتظار ہے ----"

لاحول پڑھتے ہوئے تیزی سے واپس لوٹے۔ کیمپ پہنچتے پہنچتے موسم کھل گیا۔ راستے میں
جیپی ملر ملا جو پانچ چھ سیر وزنی ٹیڑھا ترچھا ڈنڈا اٹھائے سیر کر رہا تھا۔

ایک کونے پر اس نے قوس قزح دکھائی ----" دھنک جھڑی ختم ہونے پر نکلی ہے۔
اب مطلع صاف رہے گا۔" سب مسکرانے لگے۔

پھر دیکھا کہ وادی سے گہری دھند اٹھ رہی ہے تو مسکراہٹیں رک گئیں۔

مگر ایک اور نظارے نے حوصلے بلند کر دیے ---- سب سے نچلی سڑک پر مشکوک
لاریوں کے اڈے کی طرف جا رہا تھا اور پیچھے پیچھے اس کا سامان اٹھائے ہوئے دو قلی۔

یہ افسوس بھی عارضی ثابت ہوا۔ وہ دونوں آدمی ایک طرف مڑ گئے اور مشکوک دوسری
جانب۔ جب چھینک لیتے ہوئے اس نے منہ اوپر کیا تو دیکھا کہ یہ تو کوئی اور تھا جو ہمیں محض
خوش فہمی سے مشکوک نما دکھائی دیا۔

آگے چل کر شیطان نے اشارہ کیا ----اس مرتبہ واقعی مشکوک تھا جو آہستہ آہستہ ہانپتا
ہوا نیچے سے آرہا تھا۔ پھر ترچھی پگڈنڈی پر ایک لڑکی چڑھائی طے کرتی نظر آئی۔ اگلے چوک پر ان
دونوں کی مٹھ بھیڑ لازمی تھی۔ مشکوک نے پہلے تو چھپنے کی کوشش کی لیکن جھاڑیاں اس کے سائز
سے چھوٹی تھیں۔ اس لیے فوراً سڑک چھوڑ کر نیچے جانے والی پگڈنڈی پر ہولیا۔ اب وہ لڑکی سے
دور جا رہا تھا۔

وہ ذرا اوپر آئی تو حکومت آپا نکلی جو شاید ننھے میاں کی تلاش میں تھی۔ مشکوک کے اس
طرح فرار ہونے پر سب کے چہرے روشن ہو گئے۔

" ایک عظیم سائنس داں نے کہا تھا کہ کرۂ ارض پر طرح طرح کے خطرناک
Pathogens ہیں۔" ملر بولا " جراثیم، وائرس، زہریلی چیزیں ----- مگر یہ حقیقت ہے
کہ ان سب میں خطرناک اور سفاک ترین پیتھوجن خود انسان ہے۔" وہ شارٹ کٹ سے ہمیں
پہاڑ کے اس طرف لے جا رہا تھا۔

" اسے اتفاق سمجھ لو۔ تقدیر یا قدرت کی ستم ظریفی کہہ لو۔" وہ بتانے لگا۔ " لیکن مشکوک
جیسے آدمی ہر Set up میں ملتے ہیں۔ ان سے بچنے کی کتنی ہی کوشش کر و لیکن یہ کہیں نہ کہیں
سے آجاتے ہیں۔ آبادی ہو یا ویرانہ، بزنس، ملازمت، زمین داری یا کوئی اور دھندا ----ہر جگہ
اس طرح کا کوئی نہ کوئی ضرور ملے گا۔ اگر ایسوں کو دور نہیں رکھ سکتے تو کڑھنے کی بجائے انھیں نظر
انداز کرنا سیکھو۔ جیسے کسی برے پڑوسی یا پرانے عارضے سے بھی بے اعتنائی برتی جاتی ہے اور یہ
آدمی تو منصوبہ باز معلوم ہوتا ہے۔ ضرور کسی چکر میں یہاں آیا ہے۔ میں پھر وہی دوہراؤں گا جو

پہلے بھی کہہ چکا ہوں ----یہی کہ ایسے ماحول اور حالات سے بے تعلق رہنے کی کوشش کیا کرو۔ ان سے بے گانگی بہتر ہے اور پھر اس سیارے پر کچھ بھی تو نہیں جو بہت زیادہ اہم ہو۔ نہ واقعات کی مستقل اہمیت ہے نہ افراد کی۔ اتنی بڑی کائنات میں یہ سب معمولی اور عارضی ہیں۔ بس کسی طرح یاد دہانی ہوتی رہا کرے کہ یہ گھڑی بھی گزر جائے گی ---- جو آج محسوس کر رہے ہو وہ اگلے مہینے نہیں کرو گے۔ جو تب بے حد ضروری لگے گا وہ اگلے سال تک بدل چکا ہو گا ----"

اب ہم اس موڑ پر پہنچ چکے تھے جہاں سے وہ درہ شروع ہوتا تھا۔

اس نے دریا کے منبع کی طرف اشارہ کیا جو دور جھلمل جھلمل کر رہا تھا، جہاں ہرے بھرے میدان دھوپ سے روشن تھے۔ "اور اس خطے کو بھی دیکھ لیا کرو۔ جہاں موسم مختلف ہے، تنہائی نہیں ہے اور دھند بھی نہیں ---- نہ اصلی دھند اور نہ انسان کی لائی ہوئی۔"

○ ○ ○

شفیق الرحمٰن

دجلہ

ایک ویرانے میں ٹامیون نے بورڈ لگا رکھا تھا۔

"بغداد کا راستہ ------ سو سوا سو میل شمال مغربی سمت میں جاکر پھر ڈیڑھ دو سو میل مغرب کی طرف نکل جاؤ۔ اس کے آگے پچاس ساٹھ میل تک دائیں بائیں جھانکتے جاؤ۔ جہاں آبادی نظر آئے..... یہی بغداد ہوگا"

بغداد جاتے وقت سفر بالکل اسی قسم کا تھا۔

مجھے بغداد سے زیادہ دجلے کو دیکھنے کا شوق تھا جیسے ------

اس کے سمندر کی موج دجلہ و دینیوب و نیل

والا دجلہ عام دریاؤں جیسا ہرگز نہیں ہوگا بڑی ممتاز شخصیت کا مالک ہوگا۔

کافی انتظار کے بعد ایک بھوری سی ندی نظر آئی۔ روز (Rose) بولا ---- "آبا دجلہ آگیا۔"

لاری ٹھہرا کر اسے قریب سے دیکھا۔ اوپر مٹیالا آسمان تھا، نیچے سوکھے ہوئے کناروں کے بیچ میں گارا سا بہہ رہا تھا اور دریاؤں کے قریب پہنچو تو پہلے ہریالی آتی ہے، پھر درختوں کے جھنڈ آتے ہیں اور کچھ تو نرسل یا گھاس ہی دکھائی دیتا ہے لیکن یہاں کناروں پر کچھ بھی نہیں تھا۔ کنارے بھی پانی کی سطح سے کافی اونچے تھے۔ اگر اندھیرا ہو تو انسان چلتا چلتا سیدھے دجلے میں دھم سے گرے۔ سعدی کا شعر:

اگر باراں بہ کوہستان نہ بارد
بسالے دجلہ گردد خشک رودے

یاد آگیا۔ میرا اور یونٹ کا ساتھ عراق تک تھا، پھر مجھے واپس آنا تھا۔ کئی دنوں کے سفر کے بعد ریت میں اٹے ہوئے منزل پر پہنچے تھے۔ وہاں معلوم ہوا کہ کیمپ کمانڈانٹ کی تقریر ہونے والی ہے۔ مجمع میں انگریز، عراقی، ہندستانی، کرد، آرمینی، سب موجود تھے۔ اچھا خاصا بین الاقوامی ہجوم تھا۔

سرخ رنگ کا ایک لمبا تڑنگا شخص نمودار ہوا۔ پچپن ساٹھ کا ہوگا تیر کی طرح تنا ہوا، بے تحاشا گھنی بھنویں اور بڑی بڑی بل کھاتی ہوئی مونچھیں جو سفید ہوتی جارہی تھیں۔ دور سے پتہ چلانا مشکل تھا کہ مونچھیں بڑی ہیں یا بھوئیں۔ جسم کی ہر جنبش کے ساتھ مونچھیں ہلتیں یا بھویں ---- یا دونوں۔

"میرا نام برٹن ہے اور میں آج صبح آیا ہوں بلکہ بھیجا گیا ہوں۔ مجھے اچھی طرح پتہ ہے کہ آپ غیر ملکیوں سے کیوں نفرت کرتے ہیں اور اس نکتے پر میں بھی آپ کا ہم خیال ہوں۔ آپ میرے لیے اجنبی ہوں تو ہوں لیکن یہ علاقہ اجنبی نہیں ہے۔ چوبیس پچیس سال ہوئے جب آپ میں سے بیش تر حضرات چھوٹے بچے ہوں گے، میں یہاں جنگ لڑنے آیا تھا اور کئی برس رہا۔۔۔۔"

"تب سے میں مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید میں رہا ہوں اور ان ملکوں کے چپے چپے سے واقف ہوں، لہٰذا میرے لیے یہ علاقہ پراسرار ہرگز نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ بصرے میں نسیم سحری چلتی ہے تو کیا اثرات پیدا ہوتے ہیں۔۔۔۔ گرد اڑتی ہے۔ بغداد کی بل کھاتی ہوئی سحر انگیز گلیوں میں کیا ہوتا ہے۔۔۔۔ شور و غل مچتا ہے اور مکھیاں بھن بھناتی ہیں۔ موصل کی چاندنی راتوں کے طلسم سے بھی شناسا ہوں۔۔۔۔
گیارہ بجے تک گپیں ہانکی جاتی ہیں اور اس کے بعد کتے چاند کی طرف منہ کرکے روتے ہیں۔ ساتھ ساتھ اپنے ملک کے شہروں سے بھی بخوبی واقف ہوں۔ جب مانچسٹر میں صبح ہوتی ہے تو دھویں اور کہرے کے مارے ہوئے پرندے چہچہانے کے بجائے کھانسنا شروع کر دیتے ہیں اور لندن میں صبح ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انگلستان میں سال بھر کے انتظار کے بعد ایک بدھ بہار آتی ہے اور پورے تین ہفتوں کے بعد بدھ ہی کے روز موسم بہار ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا آپ مجھے دوسرے اجنبیوں جیسا نہ سمجھیں کیوں کہ آپ کے محبوب جانور اونٹ سے میری پرانی آشنائی ہے۔ برسوں تک اونٹوں نے میرے قریب اور میں نے ان سے دور رہنے کی کوشش کی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے پیار سے اونٹ کے بے شمار نام رکھے ہوئے ہیں، تیس چالیس تو مجھے بھی یاد ہیں۔ لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ سائنٹفک نقطۂ نگاہ سے اونٹ کا ڈیزائن تسلی بخش نہیں ہے، یوں لگتا ہے جیسے اسے کسی کمیٹی کی سفارش پر بنایا گیا ہو۔ ساتھ ہی مجھے برطانیہ کے چہیتے جانور شیر کے بارے میں بھی زیادہ خوش فہمی نہیں۔ حکومتِ برطانیہ کی سرکاری مہر پر شیر ہے۔۔۔۔ لندن کی عظیم عمارتوں کا دبدبہ پتھر کے بڑے بڑے شیروں سے ہے۔۔۔۔ میری ٹوپی پر سنہرا شیر بنا ہوا ہے۔ حالاں کہ ہمارے چھوٹے سے جزیرے میں شیر تو ایک طرف رہا، چیتا یا معقول سائز کا بھیڑیا تک نہیں پایا جاتا اور میں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ میں یہاں محض کچھ عرصے کے لیے ہوں۔ پھر یہاں کے گرد و غبار، مکھیوں اور جھلستی ہوئی دوپہروں کو چھوڑ کر کسی دوسرے ملک کے گرد و غبار، مکھیوں اور جھلستی ہوئی دوپہروں میں زندگی گزارنے چلا جاؤں گا۔ یہ بھی واضح رہے کہ میں وہ سب کچھ کر سکتا ہوں جو آپ کر سکتے ہیں۔۔۔۔"

عربی میں ترجمہ ہوا تو ایک طرف سے آواز آئی۔۔۔۔ "واللہ یا ابو شوارب!"
"یہ کون تھا؟" برٹن نے پوچھا۔
مشکی رنگ کا ایک بدو کھڑا ہو گیا۔

"متشکر یا ابو ملاحت!" برٹن نے جھک کر شکریہ ادا کیا۔
واللہ واللہ کی صدائیں بلند ہوئیں اور ہجوم ہنسنے لگا۔ ہمیں بتایا گیا کہ جہاں بدو نے برٹن کو مونچھوں کا باوا کہا تھا وہاں اس نے بدو کو "نمکینی کے ابا" کہہ کر ظاہر کر دیا تھا کہ وہ یہاں کے رواج سے واقف ہے کہ انسان کی سب نمایاں خصوصیت کے ساتھ ابو لگا کر نام رکھ دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ لفٹننٹ کے کندھے پر ستار دیکھ کر اسے ابو نجوم اور میجر کے کراؤن Crown پر ابو تاج کا لقب مل جاتا تھا۔ اس دن سے برٹن کا نام ابو شوارب پڑ گیا۔

جو شخص ترجمہ کر رہا تھا وہ مقامی باشندوں سے بالکل مختلف تھا۔ ماتھے پر تیوری چڑھائے یوں بیٹھا تھا جیسے ماحول سے قطعاً بے گانہ ہو۔ بار بار نوک دار مونچھوں کو تاؤ دیتا اور عقاب کی سی آنکھوں سے ہجوم کو دیکھتا یوں لگتا تھا جیسے یہ لاپروا مغرور شخص ابھی کسی سے لڑ پڑے گا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ کردستان کا ہے۔ اس کا نام طویل تھا۔۔۔۔ تین چار ابن کچھ ابو اور چند ال آتے تھے تب جا کر مکمل ہوتا تھا لیکن سب اسے منصور کہتے تھے۔

شام کو دریا کے کنارے کرپچ کی کرسیاں بچھائی گئیں۔ آفتاب غروب ہوا تو برٹن آیا اور بوتلیں پہنچ گئیں۔ پہلے نوواردوں کا تعارف کرایا گیا پھر برٹن نے سب کی خیریت پوچھی اور بولا ۔۔۔۔ "حضرات Mess میں ہر موضوع پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ سوائے خواتین، مذہب اور سیاست کے۔ عورتوں کا ذکر جہاں روایتاً ممنوع ہے وہاں ایسے کیمپ میں تو بالکل بے کار ہے۔ یہاں کوئی خاتون ہے ہی نہیں۔ چناں چہ ویرانے میں بیٹھ کر عورتوں کے متعلق باتیں کرنا بالکل ایسا ہے جیسے ہوا میں تلوار چلانا۔ مذہب کا یہ ہے کہ سارے مذاہب اگرچہ خدا کو مانتے ہیں لیکن ان کے پیرو ایک دوسرے سے دھینگا مشتی کرتے رہتے ہیں اور ہر مبلغ پبلک کو فقط اپنے مذہب کے ذریعے زبردستی اپنے بہشت میں پہنچانا چاہتا ہے۔ رہ گئی سیاست تو سپاہی کو اس کی پیچیدگیوں کی سمجھ ہی نہیں اور پھر سیاست میں یہ عجیب بات ہے کہ لوگ لیڈر کی آہستہ آہستہ پیروی کرتے دفعتہً رفتار تیز کر کے اس کا تعاقب شروع کر دیتے ہیں۔ ویسے ان دونوں صورتوں میں لیڈر ہمیشہ آگے ہوتا ہے اور پبلک پیچھے پیچھے ۔۔۔۔ " گلاس سامنے رکھے گئے۔ میرے انکار پر روز بولا کہ "اسے کھیل کود کا بہت شوق ہے اور اس چیز سے Stamina پر برا اثر پڑتا ہے ۔۔۔"

"بالکل نو عمروں والی بات کی ہے، اس عمر میں طرح طرح کی باتیں سوجھتی ہیں۔" برٹن ہنسنے لگا۔ "اعتدال ہو تو توانائی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بڑے اچھے اچھے سپورٹس مین پیتے ہیں۔ بہر حال میں کسی کو مجبور نہیں کرتا۔" کھیلوں کا ذکر شروع ہو گیا۔۔۔۔

برٹن کہنے لگا "مجھے کرکٹ پسند نہیں۔ ایک مرتبہ بلا غلط گھما دو تو آؤٹ۔ اگر کوئی اچھے بھلے سٹروک پر نہایت ہی عمدہ کیچ کر لے تو آؤٹ۔ اپنا ساتھی بیٹس مین ذرا سستی دکھائے تو خواہ مخواہ رن آؤٹ! ہاکی فٹ بال وغیرہ میں غلطیاں کرنے کے باوجود کم از کم ایک گھنٹہ کھیلنے تو

دیتے ہیں اور پہلی ہی کوتاہی پر میدان سے باہر نکلنا نہیں پڑتا۔۔۔۔"

پھر پولو پر پہنچا۔۔۔۔" میں رسالے میں تھا۔ اب تک گھوڑے یاد آتے ہیں۔ گھوڑوں کی خوش بو یا بدبو ٹینکوں کے پٹرول کی بو سے کہیں بہتر تھی۔ مصیبت یہ ہے کہ مشینوں سے کام لینے کے لیے دماغ لڑانا پڑتا ہے۔ گھوڑے ڈانٹنے چمکارنے سے مان جاتے تھے۔ مشینوں کو جتنا گھماؤ مروڑو اتنی ہی بگڑتی چلی جاتی ہیں۔ ویسے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہارس پاور تب تک ٹھیک تھی جب تک وہ گھوڑے میں رہی۔۔۔۔"

پولو کے بعد نیزہ بازی، گھڑ دوڑ، لومڑی کا شکار، شہ سواری کے کرتب سے ہوتے ہوئے معاملہ مچھلیوں کے شکار پر اٹک گیا۔

جب سب کے سب جمائیاں لے رہے تھے تو وہ مجھے سمجھا رہا تھا کہ سامن اور ٹراؤٹ کی عادات و خصلات میں کیا فرق ہے۔ میں بالکل خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اس ریگستان سے کب چھٹکارا ملے گا۔ اگر پرسوں نجات مل جائے تو اگلے سنیچر کی رات کو اس وقت سٹیمر میں ہوں گا۔ چاندنی ہوگی اور سمندر کی لہریں۔۔۔۔

اگلے روز برٹن نے مجھے بلا کر کہا کہ۔۔۔۔" تمھاری کل شام کی گفتگو، مجھے پسند آئی۔ میں نے بغداد ٹیلیفون کر دیا ہے کہ تمھیں کچھ عرصے کے لیے یہاں رہنے دیا جائے۔"

اس کے بعد بتایا کہ رات کو اس خیمے میں چوری ہو گئی اور کوئی سارے سگار، وسکی کی بوتلیں اور کافی کی ٹین لے گیا۔

"باقی چیزیں تو بچ گئیں۔۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"ان کے علاوہ وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔۔۔۔"

گورے سارجنٹ میجر نے آکر سیلیوٹ کیا اور مخصوص انداز میں رپورٹ دی۔

"سر آج صبح جب میں چائے پی رہا تھا تو مجھے سارجنٹ ڈیوس نے بتایا کہ چوری سر ہو گئی۔ میں نے ملٹری سر پولیس کے کارپورل اور کوارٹر ماسٹر سارجنٹ کو سر رپورٹ کی۔ ہم سب اس سر نتیجے پر پہنچے ہیں کہ چور کوئی سر مقامی باشندہ ہے۔۔۔۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔۔۔۔" برٹن نے اسے واپس بھیج دیا۔

رات کو کیمپ میں بڑا سخت پہرہ ہوتا تھا۔ پھر بھی چور نالی میں سے سرکتا سرکتا آیا اور اسی طرح واپس چلا گیا۔ صبح کو نالی خطوط سے بھری ہوئی تھی جنھیں چور بے کار سمجھ پھینک گیا تھا۔

"کوئی پڑھا لکھا چور ہوگا۔ وہ خط میرے بھتیجوں کے تھے اور ان میں حسب معمول پاؤنڈوں کی فرمائش کی گئی تھی لیکن فقط میری ہی چیزیں کیوں چرائی گئیں؟ آس پاس بھی خیمے ہیں۔۔۔۔"

"شاید آپ کی کل والی تقریر کو چیلنج سمجھا گیا ہو۔۔۔۔"

"تمھارا قیاس صحیح ہے۔ پچھلی جنگ میں جب میں یہاں آیا تھا تب بھی میں نے مقامی باشندوں کے سامنے ایسی ہی تقریر کی تھی۔"

"تب کیا ہوا تھا۔۔۔۔؟"

"تب بھی چوری ہوئی تھی۔۔۔۔ اسی رات کو۔۔۔۔"

اگلے روز کسی نے شکایت کی کہ قریب کے ڈاک خانے سے ٹکٹ نہیں ملتے۔ پوسٹ ماسٹر سے پوچھا تو اس نے سر پیٹ کر بتایا کہ ٹکٹوں اور نقدی والا مقفل صندوق وزنی زنجیر سمیت غائب ہے۔

پھر اتنی چوریاں ہوئیں کہ ہم نے افسوس کرنا چھوڑ دیا۔

خوب گرمی پڑ رہی تھی۔ ہمیں بتایا جاتا کہ درجہ حرارت سائے میں ایک سو تیس تک پہنچ جاتا ہے، لیکن سایہ ندارد تھا۔ علی الصبح پانچ بجے اٹھ کر نو دس بجے تک کام کرتے اور پھر سہ پہر کے بعد باقی وقت خیموں میں چھپے رہتے۔

برمن بڑا محنتی اور سخت جان تھا۔ جس تن دہی سے خود کام کرتا اسی کی توقع دوسروں سے رکھتا۔ کام کے اوقات میں وہ ہم پر کڑی نظر رکھتا۔ نہ کسی کو پہچانتا، نہ کوئی فالتو بات کرتا۔ لیکن جہاں شام ہوتی ایسا بدل جاتا حیرت ہوتی کہ یہ وہی تلخ و جابر برمن ہے! کام کے اوقات کے بعد بالکل دوستوں کی طرح ملتا، مشورے دیتا، قہقہے لگاتا۔

لیکن دن بھر آندھی آئے، لو چلے، جب دیکھو پسینے میں شرابور، سینہ نکالے، کہنیاں پھیلائے چکر لگا رہا ہے۔ اسے قیلولے سے سخت چڑ تھی۔ کسی پر شبہ ہو جاتا کہ یہ لنچ کے بعد سوتا ہے تو اسے بڑی نفاست سے تنگ کرتا۔

سہ پہر کو اردلی آتا۔۔۔۔ "برمن صاحب نے سلام بھیجا ہے۔۔۔۔"

وہ اونگھتا ہوا غریب چھلانگ مار کر اٹھتا اور وردی پہن کر پہنچتا۔

"افوہ تمھیں نہیں ملر کو بلایا تھا۔" برمن کہتا اور اگر ملر ہوتا تو "افوہ تمھیں نہیں رچرڈ کو بلایا تھا۔ اردلی سے غلطی ہوئی۔"

ایک روز کسی کو پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ اس نے خیمے کا پلو اٹھا کر سیلوٹ کیا اور گڈ آفٹرنون کہا۔ برمن نے پہلے گھڑی دیکھی پھر خیمے سے باہر نکل کر سورج کی پوزیشن کا معائنہ کیا اور حقارت سے جواب دیا۔۔۔۔ "گڈ ایوننگ۔" آہستہ آہستہ سب نے قیلولہ بند کر دیا۔

ٹیلیفون پر گفتگو ختم کرنے سے پہلے چیرز Cheers ضرور کہتا، خواہ کیسا ہی موقع ہو۔ اس کے دفتر سے اکثر آواز آتی۔۔۔۔

"رابرٹ! تم سا سست اور نکما انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ اسی وقت واپس کیمپ پہنچو۔ تمھاری خبر لوں گا۔۔۔۔ چیرز!" "سمتھ! ابھی ابھی کرکوک سے اطلاع آئی ہے کہ تمھارا

سامان چوری ہو گیا ہے اور لندن سے خبر ملی ہے کہ تمھارے مکان پر بم پڑا ہے ---- چیرز! " اور ----- "جو حکم ملا ہے اسے فوراً بجالاؤ۔ بکومت۔ خوش رہو ---- چیرز! ----"

میں وطن سے پہلی مرتبہ باہر نکلا تھا۔ ہر چیز کو بڑے غور سے دیکھتا۔ ہر بات کو توجہ سے سنتا۔ برٹن کہا کرتا ---- "لڑکو! جہاں گردی اور قسمت آزمائی کے یہی دن ہیں۔ جگہ جگہ جاؤ، دنیا دیکھو، لوگوں سے ملو، تجربہ حاصل کرو۔ تجربے کا کوئی بدل نہیں ہے۔ غلطیاں کرو اور ان سے سبق سیکھو۔ یہ کتابیں نصیحتیں اور لیکچر، سب زبانی جمع خرچ ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ خون کی حرارت بھی جائے گی اور ایک مرتبہ نظریے پختہ ہو گئے تو پھر سارے دروازے بند ہو جائیں گے وہ سمجھتا کہ "جس طرح مقابلوں کے لیے کھلاڑی ٹریننگ لیتے ہیں، مشقت کرتے ہیں، اسی طرح حادثوں اور غیر متوقع واقعات کے لیے ذہن کو ٹریننگ ہونی چاہیے۔ ڈرنے یا پریشان ہونے کی بجائے ذہنی طور پر ان سے مقابلے کے لیے تیار رہو۔ مصیبتوں کا مزہ چکھے بغیر کوئی مرد نہیں بنتا۔"

اس کے دفتر میں حکیم بقراط کا یہ مشہور مقولہ آویزاں تھا ----

"زندگی محدود ہے اور علم و ہنر لامحدود۔ مواقع تیزی سے گزرے جارہے ہیں عقل خام ہے اور صحیح نتیجے پر پہنچنا بہت مشکل۔"

"اس میں ضرور صداقت ہوگی ----" وہ کہا کرتا۔ "ورنہ اتنی صدیوں تک یہ مقولہ زندہ نہ رہتا۔"

اس کی میز پر جدید مغربی شعرا کا مجموعہ کلام پڑا رہتا لیکن ہم نے کبھی اسے ورق گردانی کرتے نہیں دیکھا۔ کسی نے پوچھا تو بولا ---- "لٹریچر کو میز پر یا الماری میں رکھنا اور نہ پڑھنا فیشن میں شامل ہے۔ تبھی یہ کتاب یہاں رکھی ہے۔ پتہ نہیں لوگ شعر کس طرح کہہ لیتے ہیں؟ کیوں کہ اس کے لیے ان دیکھی، ان جانی، عجیب عجیب باتیں سوچنی پڑتی ہوں گی۔ بار بار فرضی باتیں سوچو تو ان پر یقین سا ہونے لگتا ہے۔ ویسے موجودہ شاعری میں رونے پیٹنے اور زندگی کی تلخیوں اور بے ثباتی کا لگاتار ذکر ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ انسان فانی ہے، زندگی میں مصیبتیں ہی مصیبتیں ہیں اور دنیا بری جگہ ہے ---- لیکن ساتھ ہی ایسی باتوں کے بارے میں بار بار ریمائنڈرز Reminders ہرگز نہیں پڑھنا چاہتا ----"

دجلے کے کنارے شام کو محفلیں جمتیں تو میں ان میں بہ طور طالبِ علم شریک ہوتا۔

روز اور ممبال کر میرے ساتھ تھے۔ کیمپ میں برٹن سے واقفیت ہوئی۔ پھر منصور اور جرجیس سے۔

آخر وہ گھڑی آئی جس کا اتنی دیر سے انتظار کیا تھا ---- ہم بغداد جارہے تھے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں جب لندن اور پیرس چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ تب خلافت کا

یہ مرکز کر دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا۔
اس زمانے کا بغداد ۔۔۔۔ پھر الف لیلیٰ کا بغداد ۔۔۔۔ اس کے بعد بلا کو کا بغداد پتہ نہیں اب کیسا ہو گا۔
کھجوروں کے جھنڈ آئے ۔ تہمد پوش حضرات ۔ گدھوں پر سوار تھے۔ عورتیں مٹی کے برتن لیے دجلے کی طرف آرہی تھیں۔ دجلے کا پانی اور بھی گدلا ہوتا گیا ۔۔۔۔ اب بغداد قریب تھا۔
لیکن جب بغداد آیا تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ عمارتیں، سبزہ، درخت ۔۔۔۔ ہر جگہ ریت کی ہلکی سی تہہ جمی ہوئی تھی اور بغداد کا دجلہ ایسا تھا جیسے چائے بہہ رہی ہو۔
شارعِ رشید دیکھ کر، ہم رسوائے عالم شاعر ابو نواس کی سڑک پر پھرے، سندباد ہوٹل کے سامنے سے گزرے، بے شمار بغدادیوں کے چہروں یا بازوؤں پر بغدادی ناسور دیکھے اور پھر دجلے کے کنارے آکھڑے ہوئے۔
"یہ دریا تو بس یوں ہی سا ہے ۔۔۔۔" روز نے بے زاری سے کہا۔
"دن میں اس دریا کو جانچنے کی کوشش کرو گے تو مایوسی ہوگی۔ یہ کسی کو نہیں پہچانتا۔ یہ اس مغرور مگر غمگین بزرگ کی طرح ہے جس نے کبھی بہت اچھے دن دیکھے ہوں اور جو اب گردو پیش سے بالکل بے نیاز ہو چکا ہو۔ تھوڑا سا انتظار کرو، رات ہو لے، پھر دیکھنا ۔۔۔۔" جر جیس نے دجلے کی طرف داری کی۔
"رات کو کیا ہوتا ہے ۔۔۔۔؟" روز نے پوچھا۔
"رات کو بزرگ خوش بو لگا کر رنگین عبا پہنتا ہے جو روشنیوں میں جگ مگ، جگ مگ کرتی ہے ۔۔۔۔"
دجلے میں طرح طرح کی کشتیاں تیر رہی تھیں ۔۔۔۔ گول، لمبوتری، مستطیل نما، نوک دار ۔۔۔۔ چند دخانی کشتیاں اور سٹیمر بھی نظر آرہے تھے۔
آخر اس سست اور بھورے سے دریا میں ایسی کیا خوبی ہے۔ سوائے اس کے کہ یہ تپتے ہوئے صحرا میں بہتا ہے۔
بچپن میں پڑھی ہوئی کہانی یاد آگئی ۔ صحرا کا دائمی پیاسا اور کھارے پانی کا عادی ایک بدو بغداد آیا۔ طباخی سے پہلی روٹی لی ۔ روٹی کے ٹکڑے کو دجلے کے پانی میں ڈبو کر چکھا۔ ایک روٹی کھائی ۔ دریا میں ڈبو ڈبو کر دوسری کھائی ۔ پھر تیسری ۔۔۔۔ جب آٹھویں پر پہنچا تو دکان دار نے جھنجھلا کر پوچھا ۔۔۔۔ "آخر کب تک کھاتے رہو گے ۔؟"
"جب تک دجلہ بہتا رہے گا۔" بدو نے جواب دیا۔
سائے لمبے ہوگئے ۔ سورج چھپ گیا اور بغداد چمکنے لگا۔
دجلے کے کنارے روشن ہوگئے ۔ پانی کی سطح پر نور کی بارش پڑی تو جیسے آگ سی لگ

گئی ۔ موسیقی کی دل کش تانیں فضا میں مرتعش ہوئیں ۔
قہقہے تھے ، گہما گہمی تھی اور متعدد حسین چہرے ۔۔۔۔ راگ رنگ کا طوفان آگیا ۔ دجلے کی سطح پر پھل جھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں ۔

جرجیس کی حالت مخدوش تھی ۔۔۔۔ ابھی ساتھ ہے ، ابھی غائب ہو گیا ، پھر آملا ۔ ادھر جھانک رہا ہے ، ادھر تاڑ رہا ہے ۔

"وہ دیکھو ۔۔۔۔" اس نے اشارہ کیا ۔ ہم نے دریچے سے دیکھا ۔ اندر رقص ہو رہا تھا ۔ ایک طرف منصور بیٹھا تھا اور اس کے ساتھ ایک شعلہ ، جوالہ ۔۔۔۔ جو مچل رہی تھی ، شرما رہی تھی ، مسکراہٹیں بکھیر رہی تھی ۔

"منصور کتنا خوش نصیب ہے ۔۔۔۔!" روز نے نہایت لمبی آہ بھری ۔
"منصور یہاں رہ چکا ہے اور لوگوں کو جانتا ہے ۔ اگلی مرتبہ میں بھی کسی کے ساتھ ہوں گا اور تم لوگ دور سے دیکھ دیکھ کر رشک کرو گے ۔۔۔۔" جرجیس نے بھی اچھی خاصی طویل آہ بھری ۔

کچھ دیر کے بعد ہم ایک ہوٹل میں بیٹھے کیبرے Cabaret دیکھ رہے تھے ۔
"ہائے یہ دھن کیسی اداس کن ہے ۔۔۔۔" ٹمبال کر نے بھی آہ بھری ۔ جسے دیکھو آہیں بھر رہا تھا ۔

"پتہ نہیں ان ناچنے والیوں کے قدم غلط کیوں پڑ رہے ہیں ۔۔۔۔؟" روز بھی غمگین ہو گیا ۔

"مجھے برٹن یاد آرہا ہے ۔ اسے ناحق کیمپ میں چھوڑ آئے ۔" جرجیس بڑبڑایا ۔
میں ماحول میں کھویا ہوا تھا کہ روز نے کندھا پکڑ کر ہلایا ۔۔۔۔ "لینکی Lanky تم چپ کیوں ہو؟ کچھ تو کہو ۔"

"ناحق رنگ میں بھنگ مت ڈالو ۔ یہاں سب مسکرا رہے ہیں اور تم منہ لٹکائے بیٹھے ہو ۔ نہ موسیقی میں خرابی ہے اور نہ ناچنے والیوں میں اور برٹن کا یہاں ہونا نہ ہونا بے معنی ہے ۔۔۔۔" میں نے جواب دیا ۔
"تو پھر یہ کیا ہے ۔۔۔۔؟"
"جانتے نہیں؟ یہ احساس تنہائی ہے ۔" جرجیس بولا ۔
"لیکن ہم تنہا تو نہیں ہیں ۔۔۔۔ اکٹھے ہیں ۔" روز نے نیم مردہ آواز میں کہا ۔ پھر ہم چپ ہو گئے ۔

صبح کو دیکھا تو وہی مٹیالا سا دجلہ تھا اور وہی گرد و غبار میں اٹا ہوا بغداد ۔
وہ سارا حسن و جمال کہاں گیا؟ وہ لطافتیں خوش بوئیں کیا ہوئیں؟ موسیقی کی دل ربا

باتیں کہاں کھو گئیں؟ رات ہر شئے سحر زدہ تھی۔
شاید الف لیلیٰ کے وقتوں کا طلسم اب تک باقی ہے۔
بغداد سے واپسی پر روز کہہ رہا تھا ---- "بڑے بڑے شہر تو میں نے بھی کئی ملکوں کے دیکھے ہیں لیکن دن اور رات کے سماں میں اتنا نمایاں تضاد کہیں محسوس نہیں کیا جتنا کہ بغداد میں ----"

میں ورزش کرتا تو وہ پوچھتے کہ دن بھر کے کام کے بعد اس کی کیا ضرورت ہے؟ میں بتاتا کہ معمولی روٹین کام سے تھکاوٹ ہوتی ہے لیکن ورزش سے چستی آتی ہے۔
جرجیس کی طبیعت اچھی نہ ہوتی اور مجھ سے دوائی مانگتا تو میں ورزش تجویز کرتا ---- بے زاری کا علاج ایک ڈیڑھ میل کا دوڑ۔ جس کے بعد بھوک لگے گی، نیند آئے گی اور بے زاری یاد تک نہ رہے گی۔ موڈ خراب ہو تو ایک سو بیٹھکیں اور ایک میل کی دوڑ۔ جی نہ لگتا ہو تو سو ڈنٹر اور سو بیٹھکیں۔ عشق ہو جائے تو بار بار دوڑ، ڈنٹر اور بیٹھکیں۔ جب تک کہ افاقہ نہیں ہوتا۔
"بس بس بد مذاقی کی انتہا ہو گئی۔ مجھے کسی علاج کی ضرورت نہیں ----" وہ ناراض ہو کر کہتا۔
جب کبھی کیمپ سے باہر جانے کی ڈیوٹی نکلتی تو جرجیس خاص طور پر میری سفارش کرتا کہ اسے بھیج دو۔ یہ بھاگ دوڑ ہی میں خوش رہتا ہے ----
برٹن اسے سمجھاتا ---- "جرجیس، خدوخال اور قد تو قدرت تراشتی ہے لیکن جسم انسان خود تراشتا ہے۔ بھدے جسم کے لیے کوئی قدرت کو ذمے دار نہیں ٹھہرا سکتا۔ لینکی کو دیکھو، دن بھر کا تھکا ہارا شام کو اورینج سکواش پی کر ایسا سوتا ہے کہ صبح کو بگل کی آواز بھی نہیں سنتا۔
ایک دن علی الصبح دوڑ لگائی تو منصور کے ماتحت نے پکڑ لیا۔ مجھے پہچانا تو معافی مانگی اور تنبیہہ کی ---- "واللہ یا ابو ریاضت! یہ کیا حرکت ہے؟ اتنے سویرے یا مغرب کے وقت اندھیرے میں اس قسم کی ورزش یہاں مت کیا کریں، ورنہ لوگوں کو مغالطہ ہو گا کہ کوئی بدو کیمپ میں چوری کر کے سرپٹ بھاگا جا رہا ہے ----"
چوروں کا ذکر اکثر ہوا کرتا۔ طرح طرح کے قصے بیان کیے جاتے۔ لوگ آپ بیتیاں سناتے مثلاً ---- "انھیں سفید چادروں کا بہت شوق ہے۔ کوئی سو رہا ہو تو چور صبح چار بجے کے لگ بھگ چپکے سے آتا ہے کیوں کہ اس وقت نیند گہری ہوتی ہے۔ بستر کا جو حصہ خالی ہو اس طرف سے چادر آہستہ آہستہ تہہ کی جاتی ہے پھر پر یا کسی ملائم چیز سے سونے والے کے گدگدی کی جاتی ہے جوں ہی وہ اپنی طرف سے مچھر اڑا کر کروٹ بدلتا ہے، بقیہ چادر تہہ کر کے اس کے نیچے سے نکال لی جاتی ہے۔ اگلے دن وہ اٹھ کر ملازم کو ڈانٹتا ہے کہ رات چادر کیوں نہیں بچھائی تھی۔ کوئی یقین ہی نہیں کر سکتا کہ لیٹے ہوئے انسان کے نیچے سے چادر نکل گئی۔"

کوئی اور بتاتا ۔۔۔۔ "پچھلی جنگ میں جب میں یہاں تھا تو عجب تماشا ہوا۔ ہر تیسری چوتھی شام کو ایک خچر غائب ہو جاتی۔ پہرہ سخت کر دیا گیا۔ سنتریوں کی تعداد بڑھا دی گئی۔

لیکن پھر بھی چند دنوں کے بعد یہی خوش خبری ملتی کہ ایک خچر کم ہے۔ آخر یہاں کے مخبروں سے رجوع کیا اور انھوں نے چور پکڑوایا۔ معلوم ہوا کہ جب جانور شام کو پانی پی کر واپس آتے تو چور کتے کی کھال اوڑھ کر ان کے ساتھ آجاتا۔ اندھیرا بڑھنے پر ذرا ذرا سی دیر کے بعد خچروں کو چھیڑتا وہ ہنہناتیں، دولتیاں جھاڑتیں۔ فوراً سپاہی آتا، لیکن خچروں کو محفوظ بندھے دیکھ کر واپس چلا جاتا۔ کچھ دیر کے بعد پھر شور مچتا۔ سنتری پھر بھاگ کر پہنچتا اور خچروں کو صحیح سلامت پاکر لوٹ جاتا۔ یہ عمل اتنی مرتبہ دہرایا جاتا کہ سنتری خچروں کے بلاوجہ شور و غل سے بالکل بے زار ہو جاتے۔ حتیٰ کہ جب چور سچ مچ ایک خچر کو لے بھاگتا تو سنتری نہ کسی کے ہنہنانے کی پرواہ کرتے نہ ان کی دولتیوں کی ۔۔۔۔ کچھ عرصے کے بعد اسی قسم کا واقعہ کسی اور یونٹ میں ہوتا اور پھر کسی اور میں۔"

پھر ایک طرف سے آواز آتی۔ "ایک مقامی باشندے کو آملیٹ بہت پسند آیا۔ اس نے پکانے کی ترکیب پوچھی تو میں نے بتایا کہ پہلے چار انڈے چراؤ، پھر تھوڑا سا مکھن اور نمک مصالحہ چراؤ اور پھر انڈوں کو خوب پھینٹ کر چرائے ہوئے چولھے پر ۔۔۔۔"

اور سب ہنسنے لگتے۔

برٹن پرانا جنگ جو تھا۔ اس کے آٹھ تمغوں میں چار ایسے تھے جو فقط میدان جنگ میں بہادری کے کارناموں پر دیے جاتے تھے۔ کسی نے پوچھ لیا کہ آپ نے کیا کیا تھا؟

"کچھ بھی تو نہیں۔ یہ تمغے ان معرکوں کی یادگار ہیں جن میں میرے رفیقوں کو جو مجھ سے کہیں دلیر اور فرض شناس تھے، کچھ نہیں ملا تھا۔ اور وہ مجھ سے زیادہ حق دار تھے۔"

ہمارے دو ساتھی تبادلے پر بھیج دیے گئے لیکن ان کی جگہ کوئی نہ آیا۔ برٹن سے شکایت کی کہ کام زیادہ ہے تو کہنے لگا ۔۔۔ "تعداد زیادہ ہونے سے کارکردگی نہیں بڑھتی۔ کسی بچے سے پوچھا گیا تھا کہ اگر دو آدمی ایک کام کو دو دن میں کر سکتے ہیں تو چار آدمی اسی کام کو کتنے دنوں میں کریں گے؟ بچے نے جواب دیا تھا ۔۔۔۔ چار دنوں میں! میرے خیال میں یہ جواب بالکل صحیح ہے۔ جتنے زیادہ لوگ ہوں گے اتنا ہی زیادہ وقت ضائع کریں گے ۔۔۔۔"

کیمپ کی بے کیف زندگی سے تنگ آجاتے تو مشورہ دیتا ۔۔۔۔ "اسی ماحول میں خوشیاں تلاش کرو۔ مسرت بھرے لمحے کسی پروگرام کے تحت نہیں ملتے۔ یہ تو ادھر ادھر سے چرانے پڑتے ہیں۔ خوش خبریاں باہر سے نہیں منگوائی جاتیں۔ نہ کبھی خود بہ خود آتی ہیں۔ یہ تو ڈھونڈنی پڑتی ہیں۔ جمود اور بے کیفی کے تالاب سے کھینچ کر نکالنی پڑتی ہیں۔ جس طرح لڑائی میں اپنی پسند کا

میدان جنگ، موزوں موسم، مطلوبہ ساز و سامان ملنے مشکل ہیں۔ اسی طرح مناسب وقت، صحیح موقع اور سازگار حالات کبھی اکٹھے نہیں ملتے ۔۔۔۔ کچھ کرنا چاہو تو مردوں کی طرح اٹھو اور مستعدی سے جٹ جاؤ۔ یہی ایک طریقہ ہے جو کام آسکتا ہے۔۔۔۔"

پھر کوئی پوچھ بیٹھا کہ آپ نے شادی نہیں کی۔۔۔۔؟

"شادی کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ جوانی جہاں گردی اور فیلڈ سروس کی نذر ہو گئی۔ ادھیڑ عمر کا ہوا تو پھر خیال چھوڑ دیا۔ دراصل محبت فقط نو عمروں کے لیے ہے۔ اس عمر میں ہر چیز خواہ مخواہ رنگین معلوم ہوتی ہے، ہر جذبے میں بے ساختگی ہوتی ہے اور بلا کا خلوص۔ محبوب ایک دفعہ مسکرادے تو ہفتے مہینے خوشی خوشی گزر جاتے ہیں اور یقین ہو جاتا ہے کہ امتحان میں ضرور کامیابی ہو گی۔ مالی حالت بھی بہتر ہو جائے گی، دوست دشمن سب مہربان ہو جائیں گے اور محبوب کی بے رخی سے سب کچھ تہس نہس ہو جائے گا۔ آئرلینڈ کی وہ جھلمل جھلمل کرتی ندیاں، وہ لہلہاتے کھیت، شاداب کنج، گھنے جنگل مجھے اب تک یاد ہیں۔ اگرچہ ان لڑکیوں کے نام اور چہرے یاد نہیں جو ان دنوں میرے ساتھ ہوا کرتیں۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کب بادل آئے تھے اور کب بوندیں تھم گئیں ۔۔۔۔ غروب آفتاب کے بعد اتنی جلدی چاند کیسے نکل آیا ۔۔۔۔ ذرا دیر پہلے گھپ اندھیرا تھا، دفعتاً یہ روشنی کہاں سے آگئی ۔۔۔۔ وہ جگ مگاتی صبحیں ۔۔۔۔ وہ رنگین شامیں ۔۔۔۔ وہ مستی کے شب و روز ۔۔۔۔ محبت کی اصلی عمر وہی ہوتی ہے۔ اس کے بعد بس دکھاوا ہے اگرچہ میں شادی کے قضیے سے بالکل مبرا ہوں اور تم لڑکوں کو بھی یہی مشورہ دوں گا کہ اپنی کمر پر زین نہ کسوانا لیکن اگر خدانہ خواستہ کبھی پھنسنے لگو تو جذبات کے دھارے میں مت بہہ جانا۔ ایسا چہرہ چننا جس کی کشش اور دل ربائی دیرپا ہو۔ شاید تم نہیں جانتے کہ گزرتے ہوئے ایام چہروں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں اور محض دس پندرہ سال کا وقفہ چہروں میں کیسی کیسی تبدیلیاں لا سکتا ہے۔۔۔۔"

ہم نے روز کو اشارہ کیا کہ یہی موقع ہے پوچھ لو۔ اس نے ڈرتے ڈرتے بغداد کا ذکر کیا۔ برٹن ترنگ میں تھا۔ کہنے لگا۔۔۔۔ "میں ڈیوٹی کے سلسلے میں سختی برتتا ہوں لیکن تفریح کے معاملات میں کوئی دخل نہیں دیتا۔ کیوں کہ تفریح بھی اتنی ہی اہم ہے جتنا کہ کام۔ سنیچر کی شام کو جو لڑکا بغداد جانا چاہے بہ خوشی جا سکتا ہے۔ لیکن محتاط رہنا۔ ان شہروں میں آئے دن فساد ہوتے رہتے ہیں۔ میں جنگ سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا کہ دنگے فساد سے۔ لڑائی میں دشمن کی تمیز کی جاسکتی ہے لیکن جب کوئی ہجوم مشتعل ہو جائے تو دوست دشمن کا پتہ نہیں چلتا اور کچھ اس قسم کی خبریں پڑھنے میں آتی ہیں۔۔۔۔ "جنوبی ملایا میں فساد۔ چار تماشائی جو اطالوی تھے ہلاک ہو گئے ۔۔۔۔ جنوبی افریقہ میں ہنگامے۔ تین فرانسیسی راہ گیروں کی حالت نازک ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ میکسیکو میں دو سیاست دان ڈوئل لڑے۔ دونوں کو خراش تک نہ آئی مگر آٹھ تماشائیوں کا مکمل انتقال

ہو گیا۔ بہ طور تماشائی مرنا بے حد بونق موت ہے۔۔۔۔"

ہم بغداد جانے لگے۔ سنیچر کی شام کو بغداد پہنچ کر خوش ہوتے اور اتوار کی شام کو واپس کیمپ آکر بھی اتنی ہی خوشی ہوتی کیوں کہ شہر میں دکان دار اور چور ہماری جیبیں خالی کر دیتے۔ برٹن اپنے رشتے داروں کے ذکر سے ہمیشہ گریز کرتا۔ ادھر جرجیس کا محبوب موضوع یہی تھا ۔۔۔۔دوسروں کے تایوں، چچاؤں، داداؤں، بھائی بھتیجوں کے متعلق پوچھتا اور اپنے عزیزوں کے بارے میں بتاتا۔ اسے سمجھایا بھی کہ انگریز ایسی باتوں میں قطعاً دلچسپی نہیں لیتے۔ پھر بھی برٹن سے پوچھ بیٹھا۔۔۔۔"آپ کے کتنے بھائی ہیں؟۔۔۔۔"

"ایک ہے۔۔۔۔لیزلی! بڑا شیطان ہے۔ ہم دونوں گہرے دوست بھی ہیں۔ ۳۳ء میں وہ لندن میں تھا۔ پھر آوارہ گرد ہو گیا اور مختلف ملکوں میں پھرتا رہتا ہے۔"

"تو گویا آپ اور وہ دس سال نہیں ملے؟" جرجیس نے پوچھا۔

"دراصل ہم ۲۲ء میں ملے تھے۔ پھر گیارہ برس کے بعد میں ایشیا کے علاقوں میں سروس کر کے چھٹی پر گیا۔ لندن میں کسی نے بتایا کہ لیزلی بھی وہیں ہے۔ بڑی مشکل سے اس کے کلب کی معرفت کھوج نکال کر اس کے فلیٹ پر پہنچا۔ آواز دی۔۔۔۔"لیزلی! لیزلی۔۔۔۔کون ہے؟" وہ اندر سے چلایا۔۔۔۔میں ہوں ایرک، میں نے جواب دیا۔ "ہیلو ایرک دنیا کا کیا حال ہے۔۔۔؟" ۔۔۔۔اچھا ہے!" کوئی تازہ خبر سناؤ۔۔۔۔"

"یوس میس کا انتقال ہو گیا ایرک"۔۔۔۔"کیسے ہوا لیزلی؟"۔۔۔۔"بس ایک دن سڑک پر چلا جا رہا تھا کہ دھڑام سے گرا اور مر گیا۔ تمھیں تعجب ہوا ایرک۔۔۔؟"

"بالکل نہیں! اس کے حجم اور وزن میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جب وہ سکندریہ میں ملا تو میں نے بتا دیا تھا کہ اولڈ بوائے تک تم ڈھیلے ہوتے جا رہے ہو۔ تمھارا وقت اب دور نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ ہمارے دوست نے یہ چار سال کیوں کر نکال لیے اور لیزلی تم باہر نکلو نا۔" ایرک مجھے کچھ دیر لگے گی۔ باتھ روم میں حجامت کر رہا ہوں۔ انتظار کرو۔"" میں انتظار نہیں کر سکتا۔ آدھ گھنٹے میں مجھے پکاڈلی سرکس پہنچنا ہے"۔۔۔۔"تو پھر ایرک تم فوراً سولہ نمبر بس پکڑ لو ورنہ لیٹ ہو جاؤ گے۔ پھر کبھی ملیں گے۔ گڈ بائی۔"چیرز لیزلی۔ اگلے روز اسے فون کیا تو وہ کہیں باہر جا رہا تھا۔ جب اس نے جواباً فون کیا تو میں ہوٹل میں نہیں تھا۔۔۔۔پھر میں نے فون کیا تو اس نے پوچھا۔ "گھڑ دوڑ پر جا رہا ہوں۔ چلو گے؟" میں چند ہفتے پہلے گھوڑوں پر سات سو پونڈ ہار چکا تھا۔ اس لیے گھڑ دوڑ سے کتراتا تھا۔ اس کا فون آیا تو میں نے اسے چڑیا گھر کی سیر کے لیے مدعو کیا لیکن اسے جانور اچھے نہیں لگتے چناں چہ وہ نہ آیا۔ اگلے ہفتے وہ سمندر کے ساحل پر چلا گیا۔ میں بھی مصروف رہا۔ اتنے میں چھٹی ختم ہو گئی اور واپس آگیا۔ لیزلی سے ملاقات ہو جاتی تو اسے آئرلینڈ چلنے کے لیے مجبور کرتا۔ دونوں گھر ہو آتے اور یہ بھی دیکھ آتے کہ اولڈ بوائے کا موڈ کیسا ہے۔۔۔۔

اولڈ بوائے بھی اب نوے پچانوے کا ہو گا۔ اس سے پہلی جنگ کے خاتمے پر ۱۹ء میں اتفاق سے ملاقات ہو گئی تھی۔۔۔۔"

"اور پوچھو انگریزوں سے ایسے سوالات۔۔۔۔" منصور نے سرگوشیوں میں ہرجیس کو ڈانٹا۔

موہن نمبالکر مرہٹا تھا۔ سانولا رنگ، پستہ قد، گٹھا ہوا جسم۔ کبھی نچلا نہ بیٹھتا۔۔۔۔ دن بھر کسی نہ کسی کام میں لگا رہتا۔ اس کا خیمہ بالکل قریب تھا۔ علی الصبح اس کا گانا سنائی دیتا۔۔۔۔ ہولے ہولے۔۔۔۔ "تم جاگو موہن پیارے" والا گیت گاتا۔ جیسے اپنے آپ کو جگا رہا ہو۔ پھر اٹھ کر دجلے کے کنارے سے طلوع آفتاب دیکھتا۔

صبح کے وقت اکثر اس کے خیمے سے جوگیا، بھیرویں اور آساوری کی تانیں سنائی دیتیں۔ کبھی اداس لے میں۔۔۔۔ "کرلے اس دن کی تدبیر جب ترا آوے گا پروانہ" گاتا۔ تو کبھی لہک لہک کر ــــ

جام گدائی ہاتھ میں لے نت سانجھ سویرے پھرتے ہیں
شمس و قمر یہ دونوں بھکاری حسن کے تیرے پھرتے ہیں
پنڈت پوچھو ہاتھ دکھاؤ فال کھلاؤ کوئی پر
دن جو ہوں برگشتہ اپنے کس کے پھیرے پھرتے ہیں

اور آخر میں۔۔۔۔

جوگ لیا آشفتہ ہم نے دیکھ لٹک ان زلفوں کی
گلیوں گلیوں حال پریشاں بال بکھیرے پھرتے ہیں

میں ورزش ختم کرتا تو دریا کے کنارے ملاقات ہوتی۔

"خان صاحب کیسی سہانی صبح ہے۔ دریا میں جیسے سونا بہہ رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم مغربی کنارے پر ہیں، ورنہ طلوع آفتاب کا یہ نظارہ نہ دیکھ سکتے۔"

ادھر برٹن، روز وغیرہ سب غروب آفتاب پر فدا تھے۔ جس کے لیے ریت کے ٹیلوں کی طرف دیکھنا پڑتا تھا۔

"سورج کو ڈوبتا اداس کن نظارہ ہے۔" وہ بتاتا۔ "لیکن طلوع، تخلیق کی یاد تازہ کرتا ہے اگر انسان صبح صبح مسرور ہو تو سارا دن اچھی طرح گزرتا ہے۔ میں نے آج تک کبھی شام کا انتظار نہیں کیا۔۔۔۔"

محبت مشقت کے علاوہ اسے فقط دو چیزوں کا شوق تھا۔۔۔۔ موسیقی اور کبھی کبھی ذرا سی وھسکی۔

"جو گیاری عبادت ہے خان صاحب ۔ انسان پہاڑ کی چوٹی اور سمندر کی تہہ ناپ سکتا ہے مگر راگ درباری کی وسعتوں کا اندازہ نہیں لگا سکتا ۔ جس شام کو وھسکی نہ ملے ایمن سے نشہ پورا ہو جاتا ہے ۔ دوسری ملہاروں اور میاں کی ملہار میں آپ نے فرق محسوس کیا ؟ استاد تان سین نے ذرا سی ترمیم و اضافے سے کیا سماں باندھ دیا ۔ اسے سنتے وقت جیسے بارش کی پھواروں اور جھینگروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں ۔ بھیگے بھیگے خنک جھونکوں کا لمس محسوس ہوتا ہے اور انسان کتنا ہی اداس ہو آساوری کی امید افزا تانیں سب کچھ بھلا دیتی ہیں ۔ میں نے زندگی کے پہلے اٹھائیس برسوں میں کبھی غم لگایا نہ کوئی نشہ کیا ۔ پھر والد کا انتقال ہو گیا ۔ شمشان میں انھیں جلانے کے فرائض بہ طور بڑے بیٹے کے مجھ کو سرانجام دینے پڑے ۔ اس دن جو کچھ مجھ پر بیتی بیان نہیں کر سکتا شام کو میں نے پہلی مرتبہ پی ۔ اس واقعے کو دس سال گزر چکے ہیں لیکن اس دن اور اس کریہہ منظر کا ایک ایک منٹ مجھے یاد ہے ۔۔۔۔ خان صاحب میں نے عجیب عجیب محفلوں میں پی ہے ۔۔۔۔ لچوں، شہدوں، لفنگوں کے ساتھ، جہاں گلاسوں کی جگہ بوتلوں سے حساب ہوتا تھا ۔ بات بات پر چاقو نکل آتے تھے (اس کے ماتھے پر زخم کا لمبا سا نشان تھا) یہ زخم ان خرمستیوں کی یادگار ہے ۔۔۔ پھر جب مہاراجے کی ملازمت میں تھا تو بار بار پری جمالوں کی جھرمٹ میں راجہ اندر کی طرح پی ۔ ایک ایک حسینہ ایسی تھی کہ اس کے لیے عمر گنوا دی جائے اور ذرا افسوس نہ ہو ۔۔۔۔
کچھ شراب کا نشہ، کچھ ان متوالی آنکھوں کا خمار ۔ کیا کیا کیفیتیں طاری ہوتی تھیں! اب یوں لگتا ہے جیسے بس ایک سہانا خواب دیکھا تھا ۔۔۔۔ پھر کبھی کبھی ایسے منحوس، مطلب پرستوں، خبیثوں کا بھی ساتھ دینا پڑا کہ گھنٹوں کی بادہ نوشی کے بعد بجائے سرور کے افسردگی ملی اور توبہ کرنے کو جی چاہا ۔۔۔۔ شدید صدمے کو برداشت کرنے کے لیے پی اور ہمیشہ صدمے کو شدید محسوس کیا ۔۔۔۔ شرط لگا کر پی ۔ بلانوشوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس کے فائدے بہت کم ہیں اور نقصان کہیں زیادہ ۔۔۔۔"

اس کی ازدواجی زندگی خوش گوار نہیں تھی ۔ بیوی ہمیشہ لکھ پتی باپ کے پاس رہتی ۔ کبھی کبھار اس سے ملتی تو غربت کے طعنے دیتی ۔ لڑنے کے بہانے تلاش کرتی ۔ سسرال والے حقارت آمیز سلوک کرتے ۔

یہ کہانی اور اپنی زندگی کے دوسرے المناک واقعات دوہرا کر وہ پوچھتا ۔۔۔۔ "دنیا میں کسی چیز کو بھی تو ثبات نہیں ۔ دوست بنانے میں کتنی دیر لگتی ہے لیکن کسی چھوٹی سی بات پر پرانی دوستی یوں ختم ہو جاتی ہے ۔ یہ بتائیے کہ یہاں ہمیشہ ڈر ڈر کر کیوں رہنا پڑتا ہے ؟ کوئی یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ جو آج رفیق بنا ہوا ہے اس کے دل میں کل بھی اتنی ہی محبت ہو گی ۔۔۔۔ ذرا سی جدائی، معمولی سی غلط فہمی، تخیل کی غلط پرواز، شب و روز کی یکسانیت، کسی تیسرے کی آمد ۔۔۔۔ بعض اوقات تو کوئی وجہ بھی نہیں ہوتی اور آناً فاناً سب کچھ ختم ہو جاتا ہے ۔ یہ

کیا تماشا ہے؟"

میں خاموش رہتا۔ پھر وہ پوچھتا ---- "اور یہ بتائیے کہ مجھ سا جذباتی اور حساس ہر وقت فکر مند رہتا ہے؟ وسوسے آتے ہیں۔ اپنے آپ کو بہتیرا سمجھاتا ہوں کہ یہ محض شبہات ہیں، غلط ہوں گے۔ کبھی ایسا نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی سوچ سوچ کر برا حال ہو جاتا ہے۔ مجھے خوش فکروں پر رشک آتا ہے جو کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتے۔ وہ ہر لحاظ سے مجھ سے بہتر ہیں ----"

میں تسلی دیتا کہ اگر انسان فکر نہ کرے تو زندگی کے کام کیوں کر ہوں؟ موجودہ اور آئندہ مسائل سے کس طرح نمٹا جائے؟

لیکن وہ سر ہلا کر کہتا ---- "مگر بے فکروں کے کام کس طرح ٹھیک ہو جاتے ہیں؟ نہیں غالباً یہ طفیل تسلیاں ہیں۔ فرضی اور اصلی پریشانیوں سے چھٹکارا پانے کے لیے میں نے کیا کیا جتن نہیں کیے۔ قدیم ہندی مفکروں کا سہارا لینے کی کوشش بھی کی جن کی تلقین تھی کہ انسان کی روح کا مقام بہت اونچا ہے اور دنیاوی خرافات بالکل نیچے ہیں اور ان دونوں کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ ہے۔ یہ بار بار دوہرا کر اپنے آپ کو حوصلہ دلانے کی بہت کوشش کی لیکن ہر بار نتیجہ یہی نکلا کہ روح بالکل نیچے تھی اور دنیاوی خرافات ہمیشہ بلند تھے ----"

پھر کسی دن کہتا ---- "زلزلوں، وباؤں اور جنگوں سے انسان کو اتنا نقصان نہیں پہنچتا جتنا کہ چال بازوں، جھوٹوں اور مکاروں سے اور اس قسم کے لوگ دنیا میں اتنے کامیاب رہتے ہیں۔ ہر فریب، ہر جرم، ہر منافقت ان کے لیے جائز ہے۔ نہ ان کا ضمیر ہے نہ ان پر جزا و سزا کا اطلاق ہے۔ دنیا میں یہ خوب پھلتے پھولتے ہیں ----"

"اگلی دنیا بھی تو ہے ----" میں ٹوکتا۔

"خان صاحب کیا پتہ کہ یہ لوگ وہاں ادھر ادھر مل ملا کر اپنا الو سیدھا نہیں کر لیں گے ----"

"کیوں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟ جب کہ بارش نیک اور بد دونوں پر پڑتی ہے اور سورج کی شعاعیں بھی دونوں کے لیے ہیں۔ اسی طرح قدرت کی نعمتیں اور حادثے سب کے لیے یکساں ہیں۔"

میں خاموش ہو جاتا۔

وہ شکایت کرتا ---- "آپ جان بوجھ کر ٹال جاتے ہیں۔"

اس کا رنگ سانولا تھا لیکن جب انگریزوں اور کالوں پر بحث ہوتی تو وہ غیر جانب دار رہتا اور کہتا کہ ---- "انسانوں کے یہ دونوں رنگ ہارمونیم اور پیانو کے سفید اور سیاہ پردوں کی طرح ہیں۔ جب تک دونوں میں ہم آہنگی نہ ہو نغمہ پیدا نہیں ہوتا ----"

برمن اس سے ہندستانی موسیقی کا ذکر اکثر کیا کرتا ۔۔۔۔ "دیوتاؤں کے سامنے رقص، موسیقی اور پھولوں کی پیش کش سے اپنی عقیدت کا اظہار کرنا دونوں پارٹیوں کے لیے کافی خوش گوار ہوتا ہوگا ۔۔۔۔ یعنی عقیدت مندوں کے لیے بھی اور اگر دیوتا واقعی کہیں ہیں تو وہ بھی اس راگ رنگ سے محفوظ ہوتے ہوں گے ۔۔۔۔" کیمپ میں ایک لٹکتی ہوئی مونچھوں اور فرنچ کٹ داڑھی والا ہیبت ناک شخص بھی تھا جو جزیرۂ مالٹا کا باشندہ تھا اور جس کے بے سرے گانوں سے سب نالاں تھے لیکن موہن اسے بھی ناپسند نہیں کرتا تھا۔

"یہ برا آدمی نہیں ہو سکتا، کیوں کہ اسے گانے کا شوق ہے ۔۔۔۔"

حالاں کہ وہ مغرب سے رات کے گیارہ بجے تک بڑی بھیانک آواز میں ایسے کرخت اور بے ہونق نغمے بلند کرتا کہ صورِ اسرافیل کا گمان بلکہ یقین ہو جاتا۔

آخر تنگ آکر منصور نے Mess میں سب کے سامنے اسے بتایا کہ ۔۔۔۔ "حکیم رازی کو اوئل عمری میں بانسری بجانے اور گانے کا بڑا شوق تھا۔ جب پختگی آئی تو گانا بجانا یک لخت ترک کر دیا اور فرمایا کہ جو نغمہ داڑھی اور مونچھوں کے درمیان سے نکلے اس میں کوئی جاذبیت نہیں رہتی ۔۔۔۔"

منصور کی نصیحت کارگر ثابت ہوئی اور اس شخص کی الل ٹپ نغمہ سرائی کم ہوتی گئی۔

جرجیس کا عیسائی نام جارجز تھا اور وطن آرمینیا۔ موٹا تازہ آرام طلب نوجوان تھا۔ پتہ نہیں نوکری کیوں کر رہا تھا کیوں کہ کام سے اسے بے حد نفرت تھی اور قواعد و ضوابط سے سخت چڑ۔ پیدل چلنے سے خاص طور پر گریز کرتا۔ کہیں چلنا پھرنا پڑ جاتا تو ۔۔۔۔ "میں فوجی نہیں ہوں مجھے کچھ نہ کہو۔" کہہ کر بیماری کے بہانے خیمے میں لیٹ جاتا۔

وہ ہر روز تقریباً نو دس بجے نہا دھو کر تیار ہوتا اور نعرہ لگاتا ۔۔۔۔ "اب جرجیس ہر چیز کے لیے تیار ہے سوائے کام کے ۔۔۔۔" چوں کہ ہم اس وقت کام سے فارغ ہو کر واپس خیموں کی طرف آرہے ہوتے لہٰذا وہ ہمارے ساتھ لوٹ آتا لیکن دائمی کاہلی کے باوجود جرجیس نہایت شدید قسم کا عاشق تھا اور تقریباً ڈھائی یا پونے تین عاشقوں کے برابر تھا۔ کسی لڑکی کو مغموم دیکھ کر اس سے رہا نہیں جاتا تھا۔ دراصل جو لڑکی مغموم نہ بھی ہو اسے دیکھ کر بھی بے تابو ہو جاتا چناں چہ وہ ہمیشہ دنیا کی حسین ترین لڑکی پر عاشق رہتا۔ یہ اور بات تھی کہ کبھی لڑکی کا نام امالیا ہوتا، کبھی الزبتھ، تو کبھی لوریتا۔

ساتھ ساتھ یہ گلہ بھی رہتا کہ اسے اتنی توجہ نہیں ملتی جس کا وہ مستحق ہے ۔۔۔۔

"آج ڈونا روزا نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ ہنریٹا نے دیکھتے ہی منھ پھیر لیا۔ باتیں تو ہوئیں لیکن پھیکی پھیکی سی۔ حالاں کہ اسی لڑکی نے پچھلے مہینے میرا دل اور کیمرہ چرا لیا تھا اور تو اور

وہ بے وقوف ڈور روٹھی خواہ مخواہ روٹھی ہوئی ہے ------
بائے ہمیں زندگی سے کچھ بھی تو نہیں ملا ----- "اور تم نے زندگی کو کیا دیا ہے؟" روز پوچھتا ---- "دراصل تم ان لوگوں میں سے ہو جو ہر ایک سے ہر وقت ہر قسم کی توجہ کے طالب رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کسی خوف ناک وبا سے بچ جانے پر جنھیں خوشی کی جگہ افسوس ہوتا ہے کہ وبا نے پوری توجہ نہیں دی بلکہ جان بوجھ کر نظر انداز کیا ہے ----"
ویسے روز اور جرجیس میں اکثر ٹھنی رہتی۔ روز کہتا ---- "جرجیس جانتے ہو کہ کائنات میں تقریباً دس کروڑ جھرمٹ ہیں۔ ہر جھرمٹ میں دس لاکھ کے قریب نظام شمسی ہیں۔ ہر نظام شمسی میں کئی کئی سیارے ہیں جن میں سے کچھ آباد بھی ہوں گے۔ ادھر تم ہو کہ سورج والے نظام شمسی کے ایک چھوٹے سے سیارے کے ننھے سے ملک میں بالکل ذرا ذرا سی باتوں میں غلطاں رہتے ہو----"
"جو چیزیں دوربینوں سے بھی دکھائی نہ دیتی ہوں ان پر میرا اعتقاد نہیں ----دنیا کا جو چھوٹا سا حصہ نظر آتا ہے اسی پر قانع ہوں ---- خصوصاً بغداد پر ----یہودنوں والے پل پر ----اور یہودنوں کے جھرمٹ پر ----"
یہ یہودنوں والا پل بڑی پرکشش جگہ تھی۔ شام ہونے سے پہلے ہی گہما گہمی شروع ہو جاتی۔ دریا کے دونوں کناروں سے ساری رونق سمٹ کر اس پل پر آجاتی۔
چہل قدمی کرتے ہوئے کسی نے معطر رنگین رومال گرا دیا کہ کوئی اٹھا کر واپس کرے تو تعارف ہو اور آئندہ ملاقات کا بہانہ ملے۔ کلائی پر گھڑی باندھ رکھی ہے، پھر بھی پوچھ رہی ہے کہ کیا بجا ہے؟ سرخ ہونٹوں میں سگریٹ دبا کر ماچس مانگنا۔ "اوئی!" کہہ کر کسی فرضی کیڑے مکوڑے سے ڈر جانا تاکہ ڈرنے کی وجہ دریافت کرے ----- یہ اور اس قسم کے سینکڑوں حربے۔ سیاہ زلفیں، زیتونی رنگ، بھرے بھرے لال ہونٹ، چست لباس اور بڑی بڑی آنکھیں۔ جرجیس بار بار کہتا ---- "یہ یہودی تو کچھ بھی نہیں ---- مگر یہودنیں (چٹکی بجا کر) ---- واللہ!" اس کے باوجود یہ یہودنیں جرجیس کے لیے سرکس کے جانوروں کی طرح تھیں۔ وہ انھیں بڑے انہماک سے دیکھتا اور بار بار ملنا چاہتا لیکن ان میں سے کسی ایک کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔
روز جرجیس سے پوچھتا ---- "تم شادی سے کیوں بھاگتے ہو؟"
"میرے خیال میں شادی فقط شادی شدہ لوگوں کے لیے مفید ہے۔" وہ جواب دیتا۔
"یعنی تم عورت کی مستقل رفاقت سے ڈرتے ہو؟"
"عورت کی رفاقت میں تو کوئی ہرج نہیں لیکن شادی کے بعد جو باقی ماندہ اتنی ساری عورتوں سے مجبوراً دور رہنا پڑتا ہے، یہ بہت مشکل ہے۔ یہ کیمپ تو اتنا برا نہیں۔ اس سے پہلے

میں جہاں تھا وہاں اتنی تنہائی تھی کہ شادی کرتے کرتے بال بال بچا۔۔۔۔"

اس کا عقیدہ تھا کہ ہر لڑکی کو کسی نہ کسی طرح یہ باور کرادو کہ وہ بے حد حسین ہے۔ اس کے بعد وہ تمھارے بقیہ جھوٹ بھی سچ مان لے گی۔

لیکن ہم اسے اکثر ٹوکتے کہ وہ لڑکیوں سے ملتے ہی انھیں خفا کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس کی تکنیک میں ضرور کوئی خرابی ہوگی۔

"یہ تو دل کے معاملے ہیں۔ جو سوجھتی ہے کہہ دیتا ہوں۔ قوانین و ضوابط سے مجھے سدا کی چڑ ہے۔" وہ کہتا۔ جرجیس کی تکنیک (اگر اسے تکنیک کہا جا سکتا تھا) کچھ اس طرح کی تھی۔۔۔۔

کوئی لڑکی کہتی "آج میری سالگرہ ہے۔۔۔۔"

"مبارک ہو! یہ بھی سچ سچ بتایئے کہ آج آپ کتنے سال کی نہیں ہوئیں۔"

"وہ چڑ جاتی۔

اس پر جرجیس سرگوشیوں میں پوچھتا۔۔۔۔ "جانتی ہو دنیا کی سب سے حسین لڑکی کون ہے؟"

"کون ہے۔۔۔۔؟" وہ خوش ہو جاتی۔

"گریٹا گاربو۔"

لڑکی پھر خفا ہو جاتی۔

جرجیس پھر ہانکنے لگتا۔ "کل سوزی تمھارے مٹاپے پر فقرے کس رہی تھی۔ میں نے اسے ڈانٹا اور سمجھایا کہ تم موٹی بالکل نہیں۔ فقط تمھارا وزن تمھارے قد سے مناسبت نہیں رکھتا۔ بھلا اس میں تمھارا کیا قصور ہے؟" اس پر وہ آگ بگولا ہو جاتی۔۔۔۔ "بڑے بدتمیز ہو۔ تمھارے متعلق میں سب کچھ جانتی ہوں۔ تم اول نمبر کے جھوٹے، لفنگے اور ہرجائی ہو۔"

ظاہر ہے کہ اس قسم کی گفتگو سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلتا لیکن جرجیس کا جوش و خروش کبھی کم نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ ایک مرتبہ تو وہ ایک پختہ عمر کی خاتون کے پیچھے ہو لیا۔ اس نے فوراً دھمکایا۔۔۔۔ "جانتے ہو میں تمھارے دوست کی چچی ہوں۔۔۔۔؟"

"لیکن چچی جان آپ کی آنکھوں میں بلا کی کشش ہے اور آپ کی چال خوب ہے۔۔۔۔"

"تمھیں میرا تعاقب کرنے کی جرأت کیوں کر ہوئی؟"

"اپنے دوستوں کے ہمراہ بابل، طاقِ کسریٰ اور دیگر آثارِ قدیمہ دیکھنے یہاں آیا تھا۔ سوچا کہ آپ کا دیدار بھی کر لوں۔۔۔۔"

"خبردار! آئندہ مجھ سے دور رہنا۔ تمھارے اور میرے خیالات بالکل مختلف ہیں۔۔۔۔"

"واقعی مختلف ہیں۔۔۔۔ آپ کو شاید لڑکوں میں دلچسپی نہ ہو لیکن اس خاکسار کو لڑکیاں بہت پسند ہیں۔۔۔۔"

جر جیس کی جیب اکثر خالی رہتی ۔ ایک شام کو دیکھا کہ شارعِ رشید کے ایک مہنگے سے ریستوراں میں وہ اور ایک لڑکی ڈنر کھانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ اس پر ہمیں حیرت ہوئی کیوں کہ مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔ تماشا دیکھنے کے لیے ہم ایک ستون کی آڑ لے کر قریب ہی جا بیٹھے ۔۔۔۔

جر جیس کہہ رہا تھا ۔۔۔ "اب جب کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم مجھے پسند کرتی ہو۔ میں یہ بتا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ تم خاصی حسین ہو۔ اپنی زندگی کی داستان سناؤ اور ضرور سناؤ لیکن مختصراً۔ شروع شروع کے بارہ تیرے سال اس میں بے شک شامل نہ کرنا کیوں کہ تب تم چھوٹی سی تھیں۔ اس کے بعد کیا ہوا وہ بتا سکتی ہو ۔۔۔۔"

اتنے میں ویٹر آگیا۔ لڑکی نے ضرور مہنگے کھانے چنے ہوں گے کیوں کہ جر جیس کاغذ پنسل لیے حساب لگا رہا تھا اور اپنی جیبیں ٹٹول رہا تھا۔ جب ویٹر نے اس کی فرمائش دریافت کی تو آہ بھر کر بولا ۔۔۔ "خاتون کا ڈنر لے آؤ ۔۔۔ میں کچھ نہیں کھاؤں گا کیوں کہ میں عشق میں مبتلا ہوں اور عاشق کو کبھی بھوک نہیں لگتی ۔۔۔۔"

جب کام کے اوقات ختم ہوتے اونگھتا ہوا جر جیس یک لخت چست ہو جاتا۔

خیمے میں داخل ہوتا تو جیسے زلزلہ آجاتا ۔۔۔۔۔

"چپ کیوں ہو؟ گراموفون بجاؤ۔ ریڈیو لگاؤ۔ شور مچاؤ اور کچھ نہیں تو تاش ہی کھیلو۔ یارو کچھ تو کرو! توبہ توبہ. کیسے سست الوجود دوستوں سے واسطہ پڑا ہے۔ زندگی تباہ ہو گئی ہے۔"

روز پوچھتا ۔۔۔۔ "جر جیس! ہر ملک میں عظیم انسان پیدا ہوئے ہیں لیکن آرمینیا میں کبھی کوئی ایسی ہستی وجود میں نہیں آئی ۔۔۔۔؟"

"اغیار ہمیں شہرت نہیں پانے دیتے۔ ویسے بھی عظمت بڑھاپے سے پہلے نہیں ملتی اور جر جیس ابھی نوعمر ہے۔ دیکھ لینا دوست، کسی نہ کسی دن میرا نصیبا ضرور جاگے گا۔ حالات خود بہ خود سازگار ہوتے چلے جائیں گے۔ جس کام میں ہاتھ ڈالوں گا کامیابی ہوگی۔ یکے بعد دیگرے خوش خبریاں ملیں گی اور تو اور میری جیبیں بھری رہا کریں گی اور ہر شام کو بغداد جا سکوں گا۔ دوسروں سے قرض مانگنے کی بجائے انھیں خوب ادھار دیا کروں گا۔ سب مجھ سے متاثر ہوں گے اور میری قابلیتوں کا اعتراف کیا کریں گے" لیکن روز اسے بتاتا ۔۔۔ "تمھاری حرکتوں اور تمھارے نظریوں سے میں ثابت کر سکتا ہوں کہ تم ہمیشہ زبوں حال رہو گے۔ اگر تمھاری مالی یا ذہنی حالت سدھر جائے تو میرا نام بدل دینا۔ اب تک جو کچھ میں نے سیکھا ہے اس پر لعنت بھیجوں گا ۔۔۔۔"

ایک شام کو برٹن نے بھی اسے ڈانٹا۔ "یہ کیا تم ہر وقت لڑکیوں کے پیچھے لگے رہتے ہو؟ دنیا میں اور کام بھی تو ہیں۔"

"جناب لڑکیوں کا تعاقب نہ کیا جائے تو ان سے ملاقات کیسے ہو؟ اور جو ملا نہ جائے تو ان

سے محبت کیوں کر ہو؟ محبت نہ کی جائے تو ناکامی کیسے ہو؟ اور محبت میں ناکامی کے بغیر غم غلط کرنے کے موقعے کس طرح مل سکیں؟" جرجیس نے جام خالی کرتے ہوئے بڑے ادب سے جواب دیا۔ اسے دوستوں کی خوش نودی کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ اکثر کہا کرتا کہ میں دوستوں کو ہمیشہ خوش خبری سنانے کا منتظر رہتا ہوں، بری خبر کبھی نہیں سناتا۔ ایسی ویسی خبر تو انھیں کسی اور سے بھی مل جائے گی لیکن کم از کم جرجیس تو اس خبر کا جزو نہیں بنے گا۔ ایک مہینے کی آخری تاریخ کو (شاید مفلسی سے مجبور ہو کر) اس نے برمن سے کہا۔۔۔۔ "جناب آپ کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ میں نے لڑکیوں کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا ہے۔" برمن خوش ہونے کی تیاری کرنے لگا تھا کہ روز جلدی سے بولا۔۔۔۔ "اب جرجیس ہر وقت عورتوں کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ اس کی دائمی بے چینی اور تفکرات کی فقط تین وجوہات ہیں۔۔۔۔ لڑکیاں، عورتیں اور خواتین۔۔۔۔"

روز پکا ریاضی دان تھا۔ بات بات پر سوال نکالنے بیٹھ جاتا۔

بغداد جانے سے پہلے یہ پوچھتا کہ بل ادا کرنے کا کام کس کے سپرد کیا جائے۔ پھر سب سے برابر چندہ لے کر اس کے حوالے کرتا۔

"جب وہ نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوہ دیکھیں گے تو ہم سب کو امیر سمجھیں گے۔ دوسرے یہ کہ ہر ایک کو اپنی اپنی جیب کی حفاظت نہیں کرنی پڑے گی۔۔۔۔"

وہ بالکل گنجا تھا۔ اپنی مدافعت میں طرح طرح کی مثالیں پیش کرتا۔۔۔۔

"چارلس دوئم گنجا تھا۔ موسم گرما میں سر کے مصنوعی بال اتار کر ٹہل رہا تھا۔ کہ اتفاق سے ملکہ نے دیکھ لیا۔ اسے اس حالت میں پہلی مرتبہ دیکھ کر ملکہ نے چیخ ماری۔ بادشاہ بڑے پیار سے بولا۔ جانِ من آج گرمی اتنی زیادہ ہے کہ مجبوراً بال اتارنے پڑے۔۔۔۔ فرانس کے لوئی چہارد ہم نے عمر بھر اپنے گنجے پن کو کامیابی سے چھپائے رکھا۔ ملکہ الزبتھ گنجی ہوئی تو محل اور دربار کے آئینے تڑوا دیے۔ اسکاٹ لینڈ کی حسین ملکہ میری اور فرانس کی مشہور میری انتوئنے قطعاً گنجی تھیں لیکن یہ راز ان کی موت کے بعد افشا ہوا۔۔۔۔ میں تو ایک معمولی سا سپاہی ہوں۔ بادشاہوں والی حرکتیں تو کر نہیں سکتا۔ گنجا ہوں تو بس گنجا ہوں۔ چھپاتا تو نہیں۔۔۔۔"

اس کی سال گرہ کی پارٹیاں مشہور تھیں۔ کوئی لڑکی کلب سے جلد گھر جانا چاہتی تو روز فوراً اعلان کر دیتا کہ آج تو اس کی سال گرہ ہے، اس لیے کسی کے جلد گھر پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔۔ کوئی بار بار بلانے پر بھی نہ آتی تو پیغام بھیجتا۔۔۔۔ "آج انگلستان میں عزیز و اقارب میری سال گرہ منا رہے ہوں گے۔ میں یہاں بے یار و مددگار ہوں۔ کم از کم آج تو مایوس نہ کیجیے۔۔۔۔"

غرض یہ کہ ہر دوسرے تیسرے ہفتے یہ مبارک دن آجاتا۔
لڑکیوں کو مدعو کرتے ہوئے بھی وہ ریاضی کے فارمولے استعمال کرتا۔۔۔۔
"پیر کو میرے ساتھ چائے پیجیے۔۔۔۔"
"نہیں، میں پیر کو نہیں آسکتی۔ اس دن میری دادی جان آرہی ہیں۔"
اگلے روز ٹیلیفون کرتا۔۔۔۔ "اچھا تو پھر بدھ کی شام کو رقص کے لیے چلیں؟"
"نہیں! بدھ کو نانا جان آرہے ہیں۔۔۔۔"
"تو پھر جمعرات کو پل پر انتظار کروں۔۔۔۔۔؟"
آخر تین چار مرتبہ انکار کرکے وہ سنیچر یا اتوار کے لیے مان جاتی۔
روز بڑی سنجیدگی سے ہمیں سمجھاتا کہ "لڑکی کے چند انکار ہر مرتبہ برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے بعد اسے مجبوراً یا لحاظاً ہاں کرنی پڑتی ہے۔ ویسے بھی سنیچر اتوار کے پروگرام مجھے موافق آتے ہیں اس لیے پیر کے دن سے پوچھنا شروع کردیتا ہوں۔"
وہ حساب لگاکر بتاتا کہ دجلہ جن پہاڑوں سے نکلتا ہے ان کی بلندی فرات والے پہاڑوں سے کم ہے۔ لہٰذا ان کی برف پہلے پگھلتی ہے۔ تبھی پہلے دجلے میں سیلاب آتا ہے۔ پھر فرات میں اور یہ کہ فرات کی سطح مقابلتاً اونچی ہے۔ اس لیے فرات سے نہریں دجلے میں گرتی ہیں اور راستے میں آب پاشی کرتی ہیں اور یہ کہ دونوں دریا سال میں پینتالیس لاکھ من مٹی بہاکر لاتے ہیں۔
"اور جو پینتالیس لاکھ ایک ہزار ایک سو ایک من یا چوالیس لاکھ ننانوے ہزار نو سو ننانوے من مٹی لاتے ہوں۔ پھر۔۔۔۔؟" جرجیس ٹوکتا۔
کوئی کسی ناخوش گوار واقعے سے افسردہ ہوجاتا یا غم لگالیتا تو روز اپنے فارمولے کے حوالے سے سمجھاتا۔
"ایسا واقعہ چار پانچ یا زیادہ سے زیادہ دس بارہ دن تک بھلا دینا چاہیے۔ رہ گیا یہ فکر کہ لوگ کیا کہیں گے؟ سو لوگوں کو ہر وقت اپنی ہی پڑی رہتی ہے۔ اس معاملے میں پبلک کا حافظہ بے حد کمزور ہے۔ لہٰذا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اپنے آپ سے سیدھا سا سوال پوچھنا چاہیے کہ آیا آج سے چھ مہینوں کے بعد مجھے یہ واقعہ سچ مچ یاد رہے گا؟ اور اگر یاد رہا بھی تو میری نظروں میں تب اس کی اہمیت کیا ہوگی؟"

منصور سب میں کم گو تھا۔ بالکل الگ تھلگ رہتا۔ بغداد اکیلا جاتا اور ہر مرتبہ وہاں اس کے ساتھ کوئی نئی حسینہ ہوتی لیکن محفلوں میں کبھی کسی لڑکی کا ذکر اس کے ہونٹوں پر نہیں آیا۔
اس کی باتوں سے ہم فقط اتنا اندازہ لگاسکے کہ ایک تو اسے میدانوں کے باشندے اچھے نہیں لگتے اور اسے اپنے وطن کی پہاڑیاں نہایت عزیز ہیں اور دوسرے یہ کہ اسے گھوڑے کی

سواری اور شکار کا بہت شوق ہے۔

"سب سے دل کش اور روح پرور وہ ہوا ہے جو گھوڑے کے کانوں کے درمیان سے گزر کر آتی ہے۔" وہ کہا کرتا۔ اسے اپنے گھوڑے سے اتنی محبت تھی کہ کیمپ کی لاتعداد موٹروں لاریوں کے باوجود اسے اپنے ساتھ رکھتا۔ اس کا ذکر اس طرح کرتا جیسے کسی دوست کی باتیں سنا رہا ہو۔۔۔۔ "اگر اس کے قصور پر سزا دو تو بے چارہ خاموشی سے برداشت کر لیتا ہے لیکن بلاوجہ مارو یا ڈانٹ دو تو روٹھ جاتا ہے اور کئی کئی دن چارہ نہیں کھاتا۔ اس کی ماں ہمارے گھر میں رہتی ہے۔ اب اس سے کوئی کام نہیں لیتے اور اس کی اتنی ہی عزت کی جاتی ہے جتنی کہ کنبے میں بڑی بوڑھیوں کی ہوتی ہے۔۔۔۔"

اور مجھے اپنے وطن کے بدنصیب گھوڑے یاد آجاتے۔ ان کی زبوں حالی پر افسوس ہوتا۔ آٹھ آٹھ نو نو موٹی تازی سواریاں بٹھا کر تانگے والے ہر دو منٹ کے بعد محض عادتاً گھوڑے کو چابک مارتے ہیں۔

ایک دن کسی نے مقامی زبان سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔

"یہاں رہتے ہوئے اتنے دن ہو گئے ہیں، کچھ نہ کچھ تو سمجھ لیتے ہوں گے؟" منصور نے پوچھا۔

"فقط گنے گنائے الفاظ آتے ہیں۔ لیکن گرامر بہت مشکل ہے۔"

"شہروں میں یقتل۔ قتلو۔ قتلت۔ یقتلون۔ تو بارہا سنے ہوں گے؟"

"ہاں سنے ہیں۔۔۔۔" روز نے کہا۔

"بس یہ قتل کی گردان ہے جو شہروں میں اکثر ہوتی رہتی ہے۔ اسی سے گرامر سیکھنے کی کوشش کرو۔" منصور مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔

ایک دفعہ پروگرام بنا کہ موٹر سے ہرن کا شکار کیا جائے۔ برٹن نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ بتانے لگا کہ "عرصہ ہوا مجھے شکار کا بہت شوق تھا لیکن ہندستان میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں مہاراجے کی پارٹی کے ساتھ جو ہاتھیوں پر سوار تھی، شیر کے شکار کے لیے گیا۔ اتفاق سے ہم ایک اور شکاری پارٹی کی زد میں آگئے جو ہاتھیوں کا شکار کرنے آئی ہوئی تھی۔ اس روز جو غدر مچا اس کے بعد میں نے شکار سے توبہ کر لی۔"

ان دنوں امریکن فوج صحرا میں نہیں پہنچی تھی۔ لہٰذا جیپ بھی نہیں ملی تھی۔ وہاں پرانے ماڈل کی جو موٹریں تھیں ان کی زیادہ سے زیادہ رفتار سے ہرن کی دوڑ کچھ تیز تھی۔ روز نے حساب لگا کر بتایا کہ دونوں کی رفتاروں میں تقریباً پانچ چھے میل فی گھنٹے کا فرق ہے۔ پھر بھی اس قسم کا شکار کسی کو بھی اچھا نہیں لگا۔ منصور بولا کہ اس سے تو بہتر ہوگا کہ ہم ہرن کو مشین گن یا Grenade سے ہلاک کر لیں۔ اس نے بھی موٹر سے کوئی فائر نہیں کیا کیوں کہ اس کا بھی

خیال تھا کہ پرندے یا جانور کو بچ کر نکل جانے کا پورا موقع ملنا چاہیے۔

پھر ایک اتوار کو پیدل شکار کا پروگرام بنا۔ اس روز ہمارے ساتھ سکاٹش ہائی لینڈرز رجمنٹ کا ایک تن درست و توانا افسر میک فارلین بھی تھا جو کبھی پہلوان رہ چکا تھا۔ دوپہر تک باوجود بھاگ دوڑ کے کچھ نہ ملا۔ دفعتہً روز نے ایک مرغابی گرائی۔ اس کے بعد دوسری، پھر ایک وزنی سا اوٹ پٹانگ قسم کا پرندہ۔ کچھ دور پیدل چل کر روز نے سکاٹ مین سے درخواست کی۔ "میک (Mac) تم ہم سب میں مضبوط ہو، ذرا دیر کے لیے یہ پرندے تو اٹھالو۔" پھر کچھ اور پرندے گرائے گئے وہ بھی میک کے حوالے کیے گئے۔ اس کے بعد تین چار بھٹ تیتر اور چند معمولی تیتر تھوڑی سی دیر کے لیے میک کو پکڑا دیے گئے۔ چناں چہ جب ہم لنچ کے لیے رکے تو اس کے کندھے اور بازو پرندوں سے لدے ہوئے تھے۔

ہم سینڈوچز اور پھل آپس میں بانٹ رہے تھے کہ اچانک ایک نعرہ سنائی دیا۔

"میک تمہارے پیچھے ہرن کھڑا ہے۔۔۔"

واقعی ایک اونچا سا ہرن بالکل اس ٹیلے پر کھڑا تھا جس کے ڈھلوان پر میک اپنی تھرماس سے چائے انڈیل رہا تھا۔ کئی آوازیں آئیں۔۔۔۔

"میک فوراً بندوق اٹھاؤ! فائر کرو!"

"جلدی کرو! شاباش!!"

لیکن وہ یوں ہی ادھر ادھر ہاتھ مار رہا تھا۔ کبھی بندوق تھامتا تو کبھی کارتوسوں کا تھیلا۔ ایک کارتوس بندوق میں ڈالتا۔ پھر نکال کر دوسرا کارتوس چنتا۔ غرض یہ کہ اس نے اتنی دیر لگادی کہ ہرن نے بڑے اطمینان سے ہم میں سے ایک ایک کو بہ غور دیکھا۔ پھر مڑا اور زقندیں بھرتا ہوا صحرا میں غائب ہو گیا۔

سب میک کو برا بھلا کہنے لگے کہ بالکل سامنے کھڑا ہوا ہرن محض سستی سے جانے دیا۔ پیش تر اس کے کہ وہ کوئی بہانہ پیش کرتا منصور نے کہا۔۔۔ "حضرات! آپ یہ نہیں سمجھتے کہ اگر یہ ہرن گرالیا جاتا تو یہ بھی بے چارے میک ہی کو اٹھانا پڑتا۔"

شام کو واپسی پر سکاٹ مین نے منصور سے ہاتھ ملایا اور چپکے سے بولا۔۔۔ "اس گروہ میں فقط میں اور تم ہی پہاڑ کے باشندے ہیں اور فقط کوہستانی ہی ایک دوسرے کے خیالات بھانپ سکتے ہیں۔" منصور اور میں گھوڑوں پر شکار کھیلنے نکلتے۔ وہ کردستان کے جانوروں اور پرندوں کی باتیں سناتا۔ شکار کے قصے سناتے ہوئے اس کی آنکھوں میں چمک آجاتی۔

"گھومتی ہوئی نیچے گرتی مرغابی۔۔۔ پتھر کی طرح دھم سے گرتا ہوا پرندہ۔۔۔ لڑکھڑاتا ہوا زخمی ہرن۔۔۔ کوئی اور نظارہ بھی اتنا دل کش ہو سکتا ہے۔۔۔؟" ہم لمبی سیر پر نکلتے تو آبادی سے باہر پہنچتے ہی وہ لمبے لمبے سانس لے کر ہوا سونگھتا۔۔۔

"اب ویرانے کی جاں پرور، فرحت بخش ہوا آئی ہے۔ اس کی تازگی تم نے بھی محسوس کی ہوگی۔ لوگ تنہائی اور ویرانی کا رونا روتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ انسان کے آنے سے پہلے دنیا اجاڑ ہی تو تھی۔ ساری گہما گہمی اور چہل پہل اسی کے دم سے ہے۔ مرد جس جگہ خیمہ گاڑ دے وہیں رونق ہو جاتی ہے۔۔۔۔"

آداب و تکلفات کا ذکر چھڑتا تو وہ بتاتا۔۔۔۔ "شاید تمھیں میری باتیں عجیب معلوم ہوتی ہوں۔ دراصل اس وقت پڑھا لکھا منصور نہیں بول رہا، ایک دیہاتی کرد تم سے مخاطب ہے۔ دنیا میں طرح طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ترشی، بد کلامی، دنگے فساد سے مجھے نفرت ہے، لیکن بعض اوقات زندگی کی شاہ راہ پر کوئی ایسا خبیث بھی سامنے کھڑا ہو کر راستہ روک لیتا ہے جو فطرتاً بدگو، بدخو اور بدکن ہوتا ہے۔ ایسے موقعے پر انسانیت اور شرافت کے درس دینا اور راستہ چھوڑ دینا نری بزدلی ہے۔ اس سے اسی زبان میں گفتگو کرنی چاہیے جسے وہ سمجھتا ہو اور ایسا سبق سکھانا چاہیے کہ عمر بھر نہ بھولے۔۔۔۔"

میں نے اسے کبھی غمگین نہیں دیکھا۔ اس کی وجاہت، گستاخ سی مسکراہٹ، اس کے حوصلے اور اولوالعزمی سے سب متاثر ہوتے۔ کوئی اداس ہوتا تو کہتا۔۔۔۔ "مرد کو نیوٹرل گیئر میں رہنا چاہیے۔ کڑھنا، اپنے اوپر ترس کھانا، ناکامیوں پر بہانے تراشنا بالکل بے سود ہے۔ زندگی میں بارہا شکست ہوگی۔ کئی مرتبہ ناحق ٹوکا جائے گا۔ بلاوجہ شبہ کیا جائے گا۔ بغیر قصور سزا ملے گی جیسے کیرم کھیلتے وقت اصلی نشانہ کسی اور رخ میں ہوتا ہے لیکن زد میں کوئی اور آتا ہے اور Tangent کسی اور طرف لگتی ہے۔۔۔۔ اسی طرح بغیر کچھ کیے مرد دوسروں کی زد میں کئی مرتبہ آتا ہے لیکن ایسے موقعوں پر سوچ لینا چاہیے کہ یوں ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے اور ہوا کرے گا۔ مرد کبھی ہراساں نہیں ہوتا اور کبھی ہار نہیں مانتا۔۔۔۔"

میں نے ان حسین لڑکیوں کے متعلق پوچھا جن سے وہ بغداد میں ملا کرتا۔

"ہاں کئی ہیں۔" وہ مسکرانے لگا۔

"کوئی منتخب کی؟"

"نہیں! دیر تک کنوارا رہنے میں یہی خرابی ہے۔ جب شوخ و شنگ موسیقی سنتا ہوں تو چنچل سلامہ یاد آتی ہے جس کی موجودگی راگ رنگ کو سہ آتشہ بنا دیتی ہے۔ پھیکی مٹیالی سی سہ پہر کو حزن کے مجسمے کیتھرین سے ملنے کو جی چاہتا ہے جو خشک و بے کیف فضا پر یوں چھا جاتی ہے کہ آنسو نکل آتے ہیں۔ بذلہ سنجی میں گل رخ کا کوئی جواب نہیں۔ جب محض خرافات بکنی ہو تو روزلین جیسا رفیق ملنا محال ہے۔ غضب کی پھکڑ اور واہی تباہی بکنے میں بے مثال ہے۔ زندگی کے اداس لمحوں میں جی چاہتا ہے کہ پر لگا کر رفعت کے پاس پہنچ جاؤں۔ دل جوئی کرنا کوئی اس سے سیکھے۔ بہت سے منصوبے باندھ لیے ہوں یا اپنے متعلق غلط فہمی ہونے لگی ہو تو زہرہ کی تمکنت اور حسن

بے پناہ کے سامنے سب کچھ بھسم ہو جاتا ہے ---- خود پسندی اور انا کا بھوت اترتے دیر نہیں لگتی اچھی چیزیں کھائے عرصہ گزر چکا ہو تو مستورہ بھلائے نہیں بھولتی جو اتنی نفاست پسندی سے خوش خوراکی پر آمادہ کرتی ہے کہ دیکھتے دیکھتے یوں وزن بڑھ جاتا ہے ---- بتاؤ میں کیا کروں؟ یہ سب خوبیاں یا برائیاں جو مجھے پسند ہیں فقط ایک لڑکی میں کیسے اکٹھی ہو سکتی ہیں؟ اور پھر مجھے شادی کا کوئی خاص شوق بھی نہیں ہے -----"

"یہ بتاؤ کہ اتنے گھمسان کے ایکشن کے باوجود اب تک کیوں کر بچے ہوئے ہو؟"

"تم بہ خوبی جانتے ہو کہ جنگی چالوں میں حملے کا پلان بناتے وقت پسپائی کا پلان بھی بنایا جاتا ہے۔"

سنیچر کی رات تھی۔ ہم رقص گاہ میں موسیقی سن رہے تھے۔

ایک لڑکی قریب سے گزری۔ جرجیس نے اسے ٹھہرالیا اور پوچھا ---- "معاف کیجیے آپ کی میز پر ایک خوب صورت لڑکی ہے۔ وہ کون ہے؟"

"میں ہوں ----" جواب ملا۔

"مگر اس کے رخسار پر تو تل تھا ----"

"سرے کا تل تھا۔ رومال سے اتر گیا ہوگا۔ فرمائیے ----"

"میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ شاید ملا بھی ہوں۔"

"آپ نے پتہ نہیں کیا کیا دیکھا ہوگا۔ ویسے میں آج پہلی مرتبہ بغداد آئی ہوں۔"

"لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ----"

"اب آپ فرمائیں گے کہ میری شکل جانی پہچانی سی ہے۔ میں آپ کو خوابوں میں نظر آتی ہوں یا آپ کو مدت سے میرا انتظار رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ ----" وہ آناً فاناً غائب ہو گئی۔

جرجیس بہت خفا ہوا۔ "میں نے دیکھا کسی اور کو تھا لیکن یہ خواہ مخواہ ڈانٹ گئی۔ اب اس پر باقاعدہ عاشق ہو کر نہ دکھایا تو جرجیس نام نہیں ----"

"رقص کے لیے کہا تھا لیکن نہیں مانی ----"

جب آرکیسٹرا نئی دھن شروع کرتا تو جرجیس تیزی سے اس طرف جاتا اور انکار کرا کے واپس آجاتا۔ ایک دفعہ جو گیا تو سرپٹ واپس آیا ---- "وہ کہتی ہے کہ یہاں اتنے لڑکے موجود ہیں جو تم سے ہزار درجے بہتر ہیں۔ بھلا تم میں ایسی کون سی خوبی ہے جس پر اترا رہے ہو؟ ---- للہ کوئی منھ توڑ جواب سوچیے تاکہ اسے خاموش کرا سکوں۔"

میں نے مشورہ دیا کہ اسی موضوع پر فارسی کا ایک شعر ہے کہ گلشن میں صبح صبح بلبل نے گلاب کے پھول سے کہا کہ چاروں طرف کتنے پھول کھلے ہوئے ہیں جو رنگ و روپ میں تجھ سے

کہیں بہتر ہیں۔ پھر تجھے کس بات پر ناز ہے؟ گلاب کے پھول نے جواب دیا کہ آپ کا فرمانا بجا ہے مگر یہ اندازِ گفتگو کیسا ہے؟ اپنے محبوب سے کوئی اس طرح کلام کیا کرتا ہے؟

وہ بھاگا گیا۔ پھر مشورہ لینے آیا۔ پھر چلا گیا۔ اس مرتبہ جو لوٹا تو پیچھے پیچھے وہ آئی ---- "تو آپ اسے پڑھا پڑھا کر بھیج رہے ہیں؟ خود میدان میں کیوں نہیں آتے؟" ہم سب پہلے سے تیار بیٹھے تھے۔ فوراً ان کی طرف چلے گئے۔

اتنے میں ایک نہایت پیاری لڑکی آئی اور گروہ میں شامل ہو گئی۔

"یہ آپ کا تِل ----" جرجیس اس کے چہرے کی طرف اشارہ کر کے کچھ ہانکنے لگا تھا لیکن روز نے آپس میں تعارف شروع کرا دیا، اس لیے اسے خاموش ہونا پڑا۔

"یہاں آنے سے پہلے آپ نے عراق کا نام سنا تھا؟" ایک لڑکی نے پوچھا۔

"بچہ بچہ اس نام سے آشنا ہے ----" میں نے ----- "تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ شود" کا ترجمہ سنایا۔

"اور یہاں کے شہر؟"

"الف لیلہ کی وجہ سے بغداد دنیا بھر میں مشہور ہے اور اپنے چوروں کی وجہ سے بھی ---- "بغدادی چور، نامی فلم بڑی مقبول ہوئی تھی۔" روز نے جواب دیا۔ پھر مجھ سے کہنے لگا۔ "جوان لمبے مارچ کرتے ہوئے ایک خاص گانا گایا کرتے ہیں جس میں بصرہ آتا ہے۔"

یہ خاص گیت ---- "چھمئی رن گئی، بصرے نوں گئی -----" تھا۔ اس کا ترجمہ سنانا پڑا جو کچھ یوں شروع ہوتا تھا کہ ایک حسینہ المعروف بہ چھمئی ہند سے بصرے کا رخ کرتی ہے۔ متعلقہ نوجوان ایک لٹھ باز بزرگ سے درخواست کرتے ہیں کہ کسی طرح گھیر گھار کر چھمئی کو واپس موڑ دے۔

"یہ تو کچھ نہیں بھے -----" تِل والی نے منہ بنا کر کہا۔

موہن میرے کان میں بولا "خان صاحب ترجمے میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ وطن کے ایک اخبار میں Dog Race کا ترجمہ ---- "کتوں کی گھڑدوڑ" ---- میں نے خود پڑھا تھا اسی طرح ایک اور جگہ Animal Census کو ---- "جانوروں کی مردم شماری" ---- بنا دیا گیا تھا ----"

"آپ کے ہاں رومانی گیت بھی تو ہوں گے ----" ایک اور لڑکی نے پوچھا۔

"پہلے ہوا کرتے تھے لیکن اب فقط فلمی گانے رہ گئے ہیں ----" میں نے جواب دیا۔

"پرانے گیتوں میں سے کوئی سنائیے ----"

"سہیلیاں آپس میں چھیڑ خانی کر رہی ہیں۔ ایک کہتی ہے ---- اس چھیل چھبیلے بانکے سپاہی کو دیکھا ---- ؟ اس رنگ رنگیلے جھوٹے ہرجائی کا کیا پوچھتی ہو۔ اس جیسا زمانے میں کوئی

نہیں ہے ۔۔۔۔"

"ہائے اللہ ، تمھارے ہاں جھوٹے محبوب کو بھی پسند کیا جاتا ہے ؟"

"من موہنا اور دل چسپ محبوب جھوٹا بھی ہو تو اس محبوب سے کہیں بہتر ہے جو سچ بولتا ہو مگر بونق اور ٹھس ہو اور پھر محبوب سے الفت محض اس کی خوبیوں کی بنا پر تھوڑا ہی کی جاتی ہے ، محبت تو اس کی برائیوں کے باوجود بھی ہو جاتی ہے ۔۔۔۔ یہ چھوٹی موٹی چالیں ، ذرا سا جھوٹ تھوڑی سی ہیرا پھیری ۔ ایک دوسرے کو غلط فہمی میں مبتلا کر کے پھر بھرپور حملہ اور جیتنے پر ساری شرطیں منوانا ۔۔۔۔ محبت اور جنگ دونوں میں جائز ہیں ۔"

"ہوتی ہوں گی ۔۔۔۔ لیکن نہ ہمیں جنگ پسند ہے اور نہ سپاہی ، سپاہیوں سے اس لیے بھی کترانا چاہیے کہ وہ بغیر بتائے کسی دن دور چلے جاتے ہیں ۔"

"اگر وہ چلتے پھرتے نہ رہیں تو ان سے ملاقات کیوں کر ہو ؟"

"لیکن ایک مشرقی لڑکی کسی ہرجائی کو کیسے پسند کر سکتی ہے ؟"

"یہ مشرقی لڑکی کیا ہوتی ہے ؟ مشرقی ، ایشیائی ، جنوبی ، مغربی وغیرہ کی اضافت محض دم چھلا ہے ۔ لڑکی ہر جگہ لڑکی ہوتی ہے اور محبوب محبوب ہوتا ہے ، ہرجائی ہو یا کچھ اور ۔۔۔۔" منصور نے جواب دیا ۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر تل والی کے نازک ہونٹ ہلے ۔۔۔۔ "ہمیں اپنے وطن کا کوئی اچھا سا گیت سنائیے ۔" فرید کی کافی ۔۔۔۔ "ڈیہنہ سہاگ دے آوندے ہن" ۔۔۔۔ کا بالکل آزاد ترجمہ سنایا ۔

"ایک حسینہ سوچ رہی ہے کہ ۔۔۔۔

یہ اچانک زیور کیوں بھانے لگے ہیں ؟
صحرا میں تتلیاں کہاں سے آگئیں ؟
ویرانوں میں شادابی کون لے آیا ؟
ایسی سہانی رت تو کبھی نہیں آئی ؟
میرے اللہ ! کیا ہونے والا ہے ؟

"ہائے یہ تو بے حد لطیف ہے ۔۔۔۔" اس کے رخسار سرخ ہو گئے ۔ تل اور بھی نمایاں ہو گیا ۔ اس کا نام سعدہ تھا ۔

موسیقی شروع ہوئی تو منصور اسے رقص کے لیے لے گیا ۔

جر جیس کو ڈانٹنے والی لڑکی کوئی لوئی زا تھی جس کے ہاتھ یوں سرخ سے تھے جیسے مہندی لگا رکھی ہو ۔ وہ ایک مرتبہ پھر اسے رقص کے لیے کہنا چاہتا تھا ۔ ہم سے مشورہ لینے آیا تو اس کی زبانی اس شعر کا ترجمہ لوئی زا کو سنوایا گیا ۔۔۔۔

مل کے مہندی کبھی دریا میں نہایا نہ کرو

آگ پانی میں مری جان لگایا نہ کرو
(آگ پانی میں ۔۔۔۔ کی جگہ ۔۔۔۔ آگ دجلے میں ۔۔۔۔ استعمال کیا گیا)

"ایسی ماڈرن لڑکیاں تو ہر شہر میں مل جاتی ہیں۔" روز بولا "یہاں کی اصلی لڑکیوں سے بھی کبھی ملنا چاہیے۔" ہم نے اسے بتایا کہ یہاں کی زبان بالکل سمجھ میں نہیں آتی۔ ملاقات کا وقت تک مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ دن تو آسان ہیں ۔۔۔۔ اتوار یوم الاحد ہے، اس سے آگے انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔ یہ بھی پتہ ہے کہ ایک بجے الساعۃ واحدہ ہوتی ہے۔ الساعۃ خمس پر پانچ بجتے ہیں لیکن جب کوئی الساعۃ واحدہ و نصف الا خمس دقائق کہہ کر چل دے تو فرشتوں تک کو خبر نہیں ہوتی کہ اس نے ایک بج کر پچیس منٹ کا وقت دیا ہے۔

"لیکن زبان تو سیکھنی پڑے گی ۔۔۔۔"

میں نے منصور سے کہا کہ مقامی باشندوں سے ملنا چاہیے۔ اس طرح زبان سیکھنے میں آسانی رہے گی۔

"اب تم سے کئی ملیں گے ۔۔۔۔" وہ مسکرا کر بولا۔

چناں چہ سلیم خود ملنے آیا۔ چھوٹے قد کا پلا ہوا ٹھکا ہوا چکنا سا نوجوان۔ ابھری ہوئی موٹی ناک۔ بازوؤں، گردن اور کانوں پر بال تھے مگر سر پر کچھ بھی نہیں تھا۔

"بزنس کے علاوہ اس سے کسی بھی موضوع پر گفتگو کرو ۔۔۔۔" منصور نے سرگوشی کی۔

"مسعودی نے لکھا ہے کہ بغداد میں ۔۔۔۔"

"مسعودی کون تھی؟" سلیم نے فوراً پوچھا۔

"مسعودی کون تھا ۔۔۔۔ اپنے زمانے کا مشہور عالم۔"

"عالم تھا؟ ۔۔۔۔ اچھا!"

"جب ابن بطوطہ بغداد آیا تو اسے یہ شہر پسند نہیں آیا ۔۔۔۔"

"کیوں ۔۔۔۔؟" وہ چونکا۔

"اس کے سفرنامے میں پڑھیے۔"

"ابن بطوطہ کون تھا ۔۔۔۔؟"

"سیاح تھا ۔۔۔۔"

"سیاح تھا ۔۔۔۔ اچھا!"

اسی طرح بار بار "کون تھا" اور "اچھا" دوہرائے گئے۔

جب وہ چلا گیا تو منصور نے بتایا کہ یہ بغداد میں رہتا ہے۔ "میں نے کہا جو تھا کہ شہریوں سے ملنا بے کار ہے۔"

"مگر یہ آیا کس سلسلے میں تھا؟"

"سعدہ کا عاشق ہے۔ تم سے ملنے آیا تھا۔"
"کہیں خفا تو نہیں ہو گیا۔۔۔۔؟"
"نہیں پھر آئے گا۔"

اگلی دفعہ آیا تو اپنے ساتھ ایک موٹا تازہ چکنا نوجوان لایا جو اسکول میں تاریخ پڑھاتا تھا۔ منصور نے فوراً چوٹ کی۔۔۔۔ "یہ بتایئے کہ ہمارے بڑے بڑے عالم البیرونی۔۔۔۔" الاصفہانی المصری، البلخی، الخوارزمی کیوں تھے؟ کوئی العراقی، البصری یا الموصلی بھی گزرا ہے؟"

"الکروی بھی کوئی نہیں تھا۔۔۔۔" سلیم کا دوست بولا۔

"پہلے میرے سوال کا جواب دیجیے۔۔۔۔"

"عربی ادب کی جامع فہرست کیا البغدادی نے مرتب نہیں کی تھی؟"

"لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ بزرگ بغداد کے تھے یا یہاں کچھ عرصے کے لیے مقیم رہے تھے کیوں کہ یہ کتاب قسطنطنیہ میں مرتب ہوئی تھی۔"

"اگر مان لیا جائے کہ بغدادیوں نے کچھ نہیں کیا تو کردوں نے کون سے تیر مارے تھے؟"

"کردوں نے چنگیز خاں کی فاتح فوج کو پہلی مرتبہ شکست کا مزہ چکھایا اور اس کے طولی خاں کو خوار کیا۔ اگر کرد اسے نہ روکتے تو اسی ریلے میں منگول شمالی افریقہ تک جا پہنچتے۔ پھر کردوں نے چنگیز کے پوتے ہلاکو خاں کو بغداد جانے والی شاہ راہ سے نہیں گزرنے دیا۔ مجبوراً اسے ایران سے ہو کر بغداد آنا پڑا۔ بغداد کو تباہ کر کے جب اس کی فوجیں ہماری پہاڑیوں کی طرف آئیں تو ہم نے مار مار کر ان کا بھرکس نکال دیا۔"

"یہ تو آپ ساری قوم کا ذکر کر رہے ہیں۔۔۔۔ کسی ایک کرد کا نام لیجیے۔۔۔۔"

"غازی صلاح الدین ایوبی جیسا عظیم انسان آج تک کسی اور ملک نے پیدا کیا ہے؟"

سلیم کا دوست خاموش ہو گیا، لیکن سلیم نے گلا صاف کرتے ہوئے شکایت کی۔ "جب جانتے ہو کہ ایسی باتوں سے دل چسپی نہیں تو پھر اس قسم کے سوال کیوں پوچھتے ہو؟ اگر میں تم سے پوچھنے لگوں کہ چمڑے کا بھاؤ کیا ہے؟ آج کل فولاد خریدا تو نفع ہوگا یا نقصان؟ کپاس اور چاول کے نرخ کس طرح جا رہے ہیں تو پھر۔۔۔۔؟"

واپسی پر منصور بولا۔۔۔ "ہمارا گاؤں بھی دجلے پر ہے لیکن وہاں اور یہاں کے لوگوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

فرات کی طرح دجلہ بھی ترکی کے پہاڑوں سے نکلتا ہے۔ کردستان کی پہاڑیوں کے بعد جب میدانی علاقہ آتا ہے تو دجلے میں دو دریا گرتے ہیں۔ جو ذرا لمبا ہے اسے الزاب الاعلیٰ کہا جاتا ہے اور دوسرے کو الزاب الاسفل۔ (محض پچاس ساٹھ میل کے فرق پر کسی دریا کا سفلہ کہنا

زیادتی ہے) شمال میں ایک جگہ ایسی ہے جہاں دجلہ و فرات تقریباً آپس میں مل جاتے ہیں۔ میدانوس میں نہریں انھیں ملاتی ہیں۔ پھر قرنا کے قریب دونوں واقعی مل کر شط العرب بن جاتے ہیں اور بالآخر خلیجِ فارس میں جا گرتے ہیں۔ شروع سے آخر تک ان کی یہی کوشش رہتی ہے کہ قریب قریب رہیں۔ دونوں میں طغیانی آتی ہے۔ دونوں ویرانوں سے گزرتے ہیں۔ دونوں کے کناروں پر قدیم ترین تہذیبوں کے آثار ہیں ---- فرق صرف اتنا ہے کہ فرات اور اس کے انگریزی نام Euphrates میں تھوڑی بہت مطابقت ہے لیکن دجلے کا Tigris سے قطعاً کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔

کہا جاتا ہے کہ طوفانِ نوح اسی علاقے میں آیا تھا اور یہ بھی کہ باغِ عدن، قرنا کے قریب واقع تھا (لیکن عدن والے اصرار کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں تھا)۔ پرانے زمانے میں دجلہ و فرات سمندر میں الگ الگ گرتے تھے۔ آہستہ آہستہ گارے سے دہانے اٹتے گئے، نئی زمین بنتی گئی اور سمندر دور ہوتا گیا۔ ان دریاؤں نے اور اس مٹی نے جو یہ ساتھ لاتے ہیں میسو پوٹیمیا یعنی دوآبے کو ہزاروں سال سے زرخیز بنائے رکھا۔

• تقریباً چھے ساڑھے چھ ہزار سال پہلے دنیا کی قدیم ترین قوموں کی ملاقات غالباً خلیجِ فارس کے ساحل پر ہوئی ---- تین مختلف قسم کے انسان آپس میں ملے۔ دراوڑ جو شاید ہندستانی تھا، مگر ان کی طرف سے آیا تھا۔ حامی افریقہ سے اور منگول وسط ایشیا سے۔ یہاں سبزہ تھا، پانی کی افراط تھی۔ ان دنوں نسل، رنگ اور نیشنلزم وغیرہ کا امتیاز نہیں تھا اور لوگ متحمل تھے۔ لہٰذا اکٹھے رہنے لگے اور خانہ بدوش انسان نے سب سے پہلے گاؤں دجلہ و فرات کے کناروں پر آباد کیے۔ بہت جلد دوآبے کی خوش حالی کی خبر ادھر ادھر پہنچ گئی اور اغیار کشاں کشاں آنے لگے۔

نسلِ انسانی آہستہ آہستہ مہذب ہوتی جا رہی تھی۔ چناں چہ چھوٹی موٹی جھڑپوں کی بجائے باقاعدہ جنگیں شروع ہو گئیں۔ ۴۰۰۰ قبل از مسیح کے لگ بھگ پہیہ ایجاد کیا گیا تاکہ حملہ کرنے اور بھاگنے میں آسانی رہے۔ تانبے کا استعمال شروع ہوا۔ آئینہ بنایا گیا اور اس کے ساتھ میک اپ کا سامان بھی تاکہ خواتین ہر جگہ لیٹ پہنچ سکیں۔

جنوبی علاقے میں سمیرین لوگوں نے اپنی حکومت کی بنیاد رکھی اور سیلابِ عظیم کی کہانی بھی بیان کی (جو طوفانِ نوح کے تذکرے سے ملتی جلتی ہے) پہلے اشیا کا مبادلہ اشیا سے ہوتا تھا لیکن انھوں نے چاندی رائج کر کے زر کا ریکٹ شروع کیا۔ زر کے ساتھ لکھا پڑھی بھی لازمی تھی چناں چہ میخی رسم الخط جاری ہوا اور روپے پیسے کے سلسلے میں انسان نے پہلی مرتبہ لکھنا پڑھنا سیکھا۔

ان باتوں کے قصے جہاں جہاں پہنچے وہاں سے حملہ آور لائے۔ شمال سے سامی لوگ آ دھمکے عکادیوں نے دیکھا دیکھی حملے شروع کیے جو چار سو برس تک جاری رہے (ایک دفعہ پہاڑوں کی سمت سے حملہ شروع ہو جائے تو ختم ہونے میں نہیں آتا)۔ آخر حالات اس قدر خراب ہو گئے کہ

تنگ آکر سمیرین لوگوں کو باقاعدہ جنگ آزادی لڑنی پڑی اور غیر ملکیوں کو بھگانا پڑا۔ دوبارہ آزاد ہو کر انھوں نے بابل شہر بسایا۔

بابل کے معنی تھے، دیوتا کا دروازہ، لیکن بعد میں یہودیوں نے بتایا کہ ان کی زبان میں بابل انتشار کو کہتے ہیں (یہودی ہمیشہ الٹا مطلب نکالتے ہیں)۔

بابل کی شہرت ہندستان تک پہنچی تو حملہ کرنے کی بجائے ہندی "چل بابل کے دیس" ---- "بابل مورا نیہر چھوٹو جائے" ---- وغیرہ گا کر محظوظ ہوئے۔

سمیرین لوگوں نے فریقین میں بیچ بچاؤ کرانے کے لیے پہلی مرتبہ ثالث مقرر کیے۔ تنازعے چکانے کا یہ طریقہ پانچ ہزار سال سے استعمال کیا جارہا ہے اور ہر مرتبہ فیل ہوتا ہے) ان لوگوں کو جنت و جہنم کے بارے میں کوئی علم نہ تھا چناں چہ ان کا مذہب فقط اسی دنیا تک محدود رہا۔

ان کے مشہور بادشاہ حمورابی نے مٹی کی تختیوں پر اپنے ماتحتوں کو خطوط لکھوائے۔ اسے اپنی زندگی میں شبہ تک نہ ہوا کہ "مکاتیبِ حمورابی" کے ذریعے وہ دنیا کے اول ترین قوانین وضع کر رہا ہے۔ ان دو سو بیاسی قوانین کے مطالعے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ لوگ کافی تہذیب یافتہ تھے کیوں کہ ان کے ہاں انکم ٹیکس بھی تھا اور رشوت و سفارش قبول کرنے والے افسر بھی۔

حمورابی نے سماج کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا ---- آزاد افراد، نیم آزاد اور غلام (یہ تقسیم مدتوں تک رہی، بلکہ اب بھی ہے) ہر چیز کی قیمت مقرر کی گئی اور پبلک سے کہا گیا کہ ایک سے زائد شادی نہ کریں۔ قافلوں کا ٹائم ٹیبل اور کرایہ نامہ بنایا گیا۔ قرض کے سلسلے میں سود رائج کیا گیا۔ سزائے موت کی قسمیں وضع کی گئیں۔ مثلاً زہر دینا۔ دریا میں ڈبونا وغیرہ۔ ٹھیکے داروں، طبیبوں اور آفیشل کارروائی کا خیال رکھا جاتا تھا۔ مثلاً مکان کے قبل از کار نئی گر جانے سے رہنے والے کا بچہ مرجائے تو مکان تعمیر کرنے والے ٹھیکے دار کے بچے کو مار دیا جاتا تھا۔ بے توجہی یا لالچ کرنے پر طبیب کو فوراً حکام پکڑ کر لے جاتے تھے۔ طبیبوں کے پاس مہریں ہوتی تھیں جنھیں وہ نسخوں پر لگاتے تھے (ویسے اس زمانے میں نسخے نہایت مختصر ہوتے تھے ---- مثلاً دانت میں درد ہو تو سورج مکھی پیس کر لگاؤ۔ پیٹ میں درد ہو تو دودھ پی لو۔ گنجے پن کے لیے سر پر شراب اور تیل کی مالش کرو۔ وغیرہ وغیرہ)۔ کسی کے پاس رقم جائیداد ہو مگر اس کا دفتری ثبوت نہ ہو تو سزائے موت ملتی تھی۔ تہمت لگا کر ثابت نہ کر سکنے پر بھی سزائے موت۔ جرمانے امیروں کے لیے زیادہ تھے اور غریب کے لیے کم ---- "آنکھ کے بدلے آنکھ۔ دانت کے بدلے دانت -----" والا مشہور قانون بھی حمورابی کا ہی تھا۔ ان سخت قوانین نے (جن میں غالباً سب سے نرم سزا سزائے موت تھی) رعایا کے حقوق اور ان کی ملکیت کی پوری طرح حفاظت کی اور عورتوں کو مردوں کے

برابر لا کھڑا کیا۔ وہ مردوں پر مقدمے دائر کر کے ان سے طلاق لے سکتی تھیں۔ جائیداد پر قبضہ کر سکتی تھیں۔

ان دنوں ایک خاص وضع کی عمارت بنانے کا رواج عام تھا۔ پختہ اینٹوں میں گھاس اور نرسل کی تہیں جما کر ایک نہایت چوڑا اور اونچا عظیم الشان چبوترہ تعمیر کیا جاتا تھا جس کی سات منزلیں ہوتیں جو بلندی کے رخ سکڑتی چلی جاتیں۔۔۔۔ اسے زگرت کہا جاتا اور رات کو اوپر والی منزل سے ستاروں کا مطالعہ ہوتا۔ مشہور و معروف "بابل کا مینار" جو عذاب آنے پر تباہ ہوا تھا اسی قسم کا تھا۔

چند زگرت اب بھی موجود ہیں۔ ان کے کھنڈروں کی تہوں میں جمی ہوئی خشک گھاس اونٹ کھاتے ہیں۔

بیسویں صدی قبل از مسیح میں پھر ہڑبونگ مچی۔ شمال سے خانہ بدوشوں نے ہلہ بول دیا۔ حطیطی آئے۔ پھر کیسی آئے اور سمیرین حکومت تباہ ہو گئی۔

اس مرتبہ حملہ آور گھوڑوں پر سوار ہو کر آئے تھے۔ بابل والوں نے پہلی مرتبہ اس جانور کو دیکھا تو اسے پہاڑی گدھا کہا (بابل والے شیر کو بڑا سارا کتا اور موتیوں کو مچھلی کی آنکھیں کہا کرتے تھے۔ غالباً انھیں غلط نام رکھنے کا شوق تھا)

ان ہی دنوں شمال میں دجلے کے کنارے ایک بڑی مشقت پسند اور توانا قوم آباد ہو گئی۔ یہ اشور کو دارالسلطنت بنا کر اشورین کہلانے لگے۔ ان کا مقولہ تھا کہ ہر وقت لڑتے رہنا ہی بہترین دفاع ہے، چناں چہ جنگ کا ایک نیا طریقہ ایجاد ہوا۔ وہ یہ کہ مار مار کر دشمن کا بھرکس نکال دو۔ پھر مفتوحہ شہروں پر اچھی طرح ہل چلا کر بیان دے دو کہ ہمیں تو دشمن سے خطرہ تھا۔ اسی ڈر سے ہم اپنا دفاع کر رہے تھے۔

شروع شروع میں تو یہ ڈنڈے مار نظریہ خاصا کامیاب رہا۔ بابل کو تلوار سے مطیع کرنے میں دیر لگی تو فرات کا رخ بدل کر شہر میں پانی چھوڑ دیا۔ مکانوں میں پانی آیا تو لوگ بھاگ نکلے۔ اس پایہ تخت کو تباہ کر کے نئے دارالحکومت کی فکر پڑی۔ افسوس بھی ہوا کہ اگر زیادتی نہ کی ہوتی تو مناسب ترمیم و اضافے کے بعد بابل اچھا بھلا اشوری شہر بن سکتا تھا۔ آخر واپس شمال کی طرف گئے اور دجلے کے کنارے نینوا چنا جو معمولی سا گاؤں تھا۔

نئے شہر کی تعمیر کافی مہنگی پڑی۔ جگہ جگہ دیواروں پر لمبی لمبی داڑھیوں والے شیر بنائے گئے جن کے کندھوں پر بڑے بڑے پر لگے تھے (ان میں سے کچھ شیر برٹش میوزیم میں رکھے ہیں) داڑھیوں والے صحت مند بیل بھی نصب کیے گئے (اشوریوں کو انسانوں سے زیادہ حیوان پسند تھے)۔

حمورابی کے قوانین منسوخ کرنے کے بعد انھوں نے دنیا کو تباہ کرنے کا پروگرام بنایا اور

اشوریوں کے طرف دار کہتے ہیں کہ بے چاروں کو اتنا کڑا ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا کہ ادائیگی کے سلسلے میں مجبوراً دوسرے ملکوں میں لوٹ مار کرنی پڑتی تھی) لیکن دوسرے ملکوں کو بھی اشوری فلسفۂ حیات معلوم ہو چکا تھا۔ چناں چہ اشوایوں کی سلطنت سو برس بھی نہ چلی۔

نینوا کی تباہی پر (جو اشوریوں کے پسندیدہ طریق سے شہر پر ہل چلوا کر کی گئی تھی) سارے ملک خوش ہوئے۔ اس واقعے کے دو سو سال بعد یونانی مورخ زینوفن نینوا سے گزرا تو وہاں نہ نینوا تھا نہ کوئی اشوری۔ ویسے اشوری اتنے برے بھی نہیں تھے۔ جب کبھی جنگ و جدل سے فرصت ملتی تو حطیطیوں کی لکھی ہوئی تختیاں اکٹھی کر کے فہرستیں بناتے۔ آخری اشوری بادشاہ اشور بنی پال نے دنیا کی پہلی لائبریری بنائی۔ لائبریری کے کھنڈر سے تقریباً بائیس ہزار پختہ مٹی کی تختیاں ملیں (جن میں سے بیش تر حسب معمول برٹش میوزیم میں ہیں) فہرست کے علاوہ لائبریری کے مختلف سیکشن تھے۔۔۔۔ مذہب، سائنس، تاریخ، ادب (لیکن مصنف اشوری نہیں تھے)۔ ہر تختی پر شاہی حکم درج ہے کہ اسے لائبریری سے باہر لے جانا منع ہے۔ ویسے بھی اس قسم کی تصنیف کا چرانا کافی مشکل ہوتا ہوگا۔ اتنی وزنی چیز کوئی چھپا کر نہیں لے جا سکتا خصوصاً جب کتاب کے گر کر پاش پاش ہو جانے کا بھی ڈر ہو۔

اب میڈین لوگوں کی باری آئی۔ یہ بڑی زبردست قوم تھی۔ جب سیتھین لوگوں نے ان پر حملہ کیا تو لگاتار لڑتے رہے۔ ہار نہیں مانی۔ حتیٰ کہ اٹھائیس برس گزر گئے اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ (آخر حملہ آور تنگ آ کر واپس لوٹے تو معلوم ہوا کہ عورتوں نے پہلے تو انتظار کیا۔ پھر غلاموں سے شادیاں کر لیں جن سے ایک نئی نسل ظہور میں آ چکی تھی۔ جب آقاؤں نے تلواریں نکالیں تو غلاموں اور غلام زادوں نے مقابلہ کیا۔ کئی دنوں کی شدید لڑائی کے بعد کسی جہاں دیدہ بزرگ نے مشورہ دیا کہ اپنے غلاموں سے برابر کا سلوک کرنا نری بے وقوفی ہے۔ کل تلواروں کی بجائے ڈنڈے، گالیاں اور درے استعمال کرو۔ لہٰذا اگلے روز آقا گالیاں دیتے ہوئے آگے بڑھے اور غلاموں کو ڈنڈوں اور ہنٹروں سے زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔۔۔۔ اس پر انھوں نے فوراً ہاتھ جوڑ دیے اور اس ذہنیت کا ثبوت دیا جو بعد میں غلامانہ مشہور ہوئی)۔

ساتویں صدی قبل از مسیح میں کلدانی آئے کیوں کہ کلدانی دستِ خاص سے نینوا پر ہل چلا چکے تھے۔ اس لیے انھیں بھی دارالحکومت کی فکر پڑی۔ نینوا کو از سرِ نو تعمیر کرنے میں جگ ہنسائی کا ڈر تھا اس لیے پرانے بابل کو چنا۔

چناں چہ بابل جدید بنا جہاں سے ان کے بادشاہ نبوکدنذر دوئم نے چالیس برس تک حکومت کی۔ جوانی میں کسی پہاڑی دوشیزہ سے شادی کر بیٹھا تھا جو ان تپتے ہوئے میدانوں میں وطن کو یاد کر کے آنسو بہایا کرتی۔ بادشاہ نے بہتیرا سمجھایا بجھایا، آخر مجبوراً اسے ایک مصنوعی

پہاڑی بناکر اس پر Hanging Gardens بنوانے پڑے جو بعد میں زمانہ قدیم کے سات عجائبات میں شامل ہوئے۔ ان معلق باغات کے بارے میں قیاس آرائیاں ہوتی رہتی ہیں کہ وہ در حقیقت کس وضع کے تھے۔ جو کچھ عراق کے ماہرین بتاتے ہیں اس سے یہی لگتا ہے کہ وہ لاہور کی شملہ پہاڑی سے ملتے جلتے ہوں گے۔ (بعد کے حملہ آور جو ایران سے آئے تھے۔ ان باغوں کو دیکھ کر بہت ہنسے کیوں کہ ایران میں لاتعداد ایسے باغ تھے جو معلق نہیں تھے۔ انھوں نے ان باغوں کو غیر فطری قرار دے کر تباہ کر دیا)

شاید ملکہ بھی معلق باغوں سے مطمئن نہیں ہوئی تھی کیوں کہ ان میں پھول، درخت، پرندے وغیرہ تو تھے لیکن خنکی نہیں تھی۔ کہتے ہیں کہ بیوی کی دائمی افسردگی سے تنگ آکر نبوکد نذر نے آسمان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا، چناں چہ اس کے عہد میں علم ہئیت کو بڑی ترقی ہوئی اور دنیا کا پہلا کیلنڈر مرتب ہوا۔ بعد میں بادشاہ نے مزید بے زار ہو کر دوروں پر جانا شروع کر دیا اور مصریوں کو شکست دی۔ پھر یروشلم کو تباہ کر کے اتنے سارے یہودی غلام ساتھ لے آیا کہ بغداد میں اب تک یہودی ہیں (یہودی ایک دفعہ کہیں پہنچ جائیں تو واپس نہیں جاتے)

ویسے یہ لوگ اشوریوں سے مختلف تھے اور مقابلتہً صلح پسند تھے۔ ان کے ہاں ایک کہاوت تھی کہ ---- "لوگ لڑ رہے ہوں تو کان دبا کر چپ چاپ نکل جاؤ ورنہ گواہ بننا پڑے گا اور عدالت میں جو درگت گواہ کی بنتی ہے، وہ سب کو معلوم ہے۔ نبوکد نذر نے دجلے پر بند تعمیر کیا، بہت سی نہریں کھدوائیں۔ جہاں اس میں کئی خوبیاں تھیں وہاں ایک عیب بھی تھا۔ وہ یہ کہ ہر وقت وہ بابل ہی کی توسیع کرتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ باقاعدہ آباد کر کے بسے بسائے شہر کو تین مرتبہ پھر بسایا۔ نئے محل بن رہے ہیں، عمارتیں ڈھاکر سڑکیں چوڑی کی جارہی ہیں بلکہ اچھی بھلی سڑکوں کے اوپر بلاوجہ نئی سڑکیں بن رہی ہیں۔ رعایا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا گیا اور شہر کی سطح اونچی ہوتی گئی۔ شاید گم نامی سے بچنے کے لیے اس نے ہر اینٹ پر اس قسم کے فقرے لکھوائے:

"میں شاہ نبوپلیسر کا بیٹا شاہ نبوکد نذر حکم ران بابل ہوں۔"

"کیا میرا تعمیر کردہ بابل دنیا کا عظیم ترین شہر نہیں ہے؟" وغیرہ وغیرہ۔

یہ اینٹیں اب بھی موجود ہیں۔ اس پروپیگنڈے سے سیاح اور مورخ کافی متاثر ہوئے۔ زینوفن متاثر ہوا۔ پھر بابائے تاریخ ہیروڈوٹس بھی۔ (ہیروڈوٹس بہت جلد متاثر ہوجاتا تھا۔ تبھی اسے بابائے جھوٹ بھی کہا جاتا تھا۔ مثلاً اس نے Marathon کی مشہور لڑائی میں شکست خوردہ ایرانیوں کی تعداد لاکھوں میں بتائی ہے لیکن چند سال گزرے وہاں فوجی مشقیں ہوئیں تو مراتھوں کے پورے میدان جنگ میں ایک بریگیڈ بھی اچھی طرح نہیں سما سکا) مگر اس ساری تشہیر کے باوجود فاتح کچھ اتنے متاثر نہیں ہوئے۔ ایرانیوں کے بنائے ہوئے طاق کسریٰ میں

بھی یہی اینٹیں لگی ہوئی ہیں۔ عربوں نے بھی تعمیر کے سلسلے میں بنوکدنذر کے شہر کا ملبہ استعمال کیا۔

بہر حال اتنی ساری اینٹوں پر آٹو گراف کرنے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ کلدانیوں کے دیگر بادشاہوں کے پے چیدہ سے ناموں سے لوگ مانوس نہیں ہوئے البتہ بنوکدنذر کو سب پہچانتے ہیں۔

محققین کا خیال ہے کہ اگر آج فرعون اپنے وطن مصر میں آئیں تو اپنے مخنتہ ابرام، مجسمے اور مندر دیکھ کر یقیناً خوش ہوں گے لیکن دجلہ و فرات کے قدیم بادشاہ اپنے دوآبے میں آئیں تو انھیں سخت مایوسی ہوگی کیوں کہ ان کے دور کی ایک نشانی بھی تو باقی نہیں رہی۔ مصر میں پتھر تھا اور یہاں فقط اینٹیں تھیں۔ وہ بھی آدھی پکی آدھی پکی اور ساتھ ساتھ حملہ آوروں اور سیلابوں کی یلغار۔ مصری الگ تھلگ رہتے تھے۔ اس لیے خوش تھے، انھیں مذہب اور اگلی زندگی کا شروع سے خیال تھا (مصری بلیوں کو متبرک مانتے تھے چناں چہ ایک مرتبہ حملہ آور جو کافی عقل مند ہوں گے، چار پانچ ہزار بلیاں ساتھ لے آئے اور جنگ شروع ہوتے ہی بلیوں کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا تو مصریوں نے لڑنے سے انکار کر دیا)۔

اب دوآبے کی تہذیب عروج پر پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا زوال ناگزیر تھا۔ تقریباً تین ہزار سال گزرے وہاں کے ایک شاعر کی نظم سے اس انحطاط کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ نظم کا عنوان تھا۔ "قنوطیت۔"

ایک آقا اور اس کا غلام باتیں کر رہے ہیں۔۔۔۔

"خادم! کچھ کہوں؟"

"ارشاد! آپ جو فرمائیں گے بجا فرمائیں گے۔"

"محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"ضرور کیجیے حضور! محبت دکھ درد بھلا دیتی ہے۔"

"نہیں میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔"

"بہت اچھا کیا۔ محبت تو ایک پھندا ہے۔ ایک بھیانک عمیق غار ہے اور عورت ایسی تیز تلوار ہے جو قریب آجائے تو موت یقینی ہے۔"

"خادم! کچھ کہوں؟"

"فرمایئے! میں حضور سے متفق ہوں۔"

"مقدس پانی لاؤ۔ عبادت کروں گا۔"

"ضرور کیجیے حضور! عبادت سے دل صاف اور دیوتا خوش ہوتے ہیں۔"

"نہیں میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔"
"بہت اچھا کیا۔ بار بار گڑگڑانے سے دیوتا اکڑنے لگتے ہیں اور پھر انھوں نے آپ کے لیے کیا کیا ہے جو آپ احسان مند ہوں؟"

"خادم کچھ کہوں؟"
"فرمائیے حضور! میں آپ کا ہم خیال ہوں۔"
"غریبوں کو خیرات نہ دی جائے؟"
"ضرور دیجیے حضور! اس سے کئی گنا آپ کو واپس ملے گا۔"
"نہیں میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔"
"بہت اچھا کیا۔ سخی کا دیوالہ بھی نکل جائے تب بھی سائل مطمئن نہیں ہوتے۔ قبرستان میں جاکر دیکھیے سخی اور کنجوس ایک ہی زمین میں دفن ہیں۔"
کئی موضوع آتے ہیں لیکن یہ اکتاہٹ، یہ بے زاری نہیں جاتی۔ آخر طے ہوتا ہے کہ ہر شے بے معنی ہے، بے کار ہے۔ آقا تنگ آکر کہتا ہے۔۔۔۔
"خادم! کچھ کہوں؟"
"ارشاد! میں حضور سے متفق ہوں۔"
"اگر یہی زندگی ہے تو کیا کریں؟ خودکشی کر لیں؟"
"ہم مجبور بندے ہیں۔ آج تک کسی نے دنیا کو بھی محیط کیا ہے؟ یا آسمان کو بھی چھوا ہے؟"
"اچھا تو پھر آج میں تمھیں مارتا ہوں۔ بعد میں خود مر جاؤں گا۔"
"بجا فرمایا جناب نے لیکن یہ خادم اپنے آقا کو دنیا کی مصیبتیں برداشت کرنے کیسے چھوڑ جائے؟ کیوں نہ ہم دونوں اکٹھے چلیں؟"

کلدانیوں نے ار بھی بسایا تھا جو حضرت ابراہیمؑ کا گاؤں تھا اور جہاں انھیں خدا تعالیٰ کی موجودگی کا خیال آیا۔ ار ہی سے وہ اپنے طویل سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ (مغربی مورخوں نے شام اور دیگر ملکوں کے سفر کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے لیکن عرب جانے کے بارے میں عموماً خاموش رہتے ہیں)۔
اس مرتبہ جو حملہ آور آئے تو نہ انھیں کلدانیوں سے کوئی خاص دشمنی تھی اور نہ نئے دارالحکومت کی تلاش۔ چناں چہ اخامینین (جنھیں ہخامنشی بھی کہا جاتا ہے) بابل کے پندرہ بیس

ہزار آدمی مار کر ، دس بارہ مندر اور سات آٹھ محل وغیرہ تباہ کر کے مطمئن ہوگئے ۔ دراصل (اتھاینین لوگوں نے اپنی اصلی قوت اور سارا جوش و خروش یونانیوں کے لیے مخصوص کر رکھا تھا ۔ (جس کا بدلہ بعد میں سکندر یونانی نے لیا) ۔

ملک کی حالت بری نہیں تھی ۔ اصلاحات وغیرہ کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی ۔ مگر حملہ آور جو ایران سے آئے تھے اہل بابل کی بہتری و بہبودی کے خواہاں تھے (جیسے کہ سب حملہ آور بیان دیا کرتے ہیں) ۔

انھیں جب کوئی نئی چیز ایجاد کرنے کو نہ ملی تو ناچار دنیا کی پہلی "گھوڑا ایکسپریس" شروع کی ۔ جگہ جگہ گھوڑے بدلے جاتے اور ایلچی ڈاک لے کر ڈیڑھ ہزار میل کا فاصلہ سات آٹھ دن میں طے کرتے (ایلچی بھی بدلے جاتے ہوں گے) ساتھ ساتھ آداب محفل ، تکلفات اور مسجع و مقفیٰ عبارت کا رواج شروع ہوا (مدتوں بعد جب چنگیز خاں نے ایک ایرانی کاتب سے کسی گورنر کے نام مختصر سا حکم نامہ لکھوایا تو کاتب فوراً دوسرے صفحے تک پہنچ گیا ۔ چنگیز کو شبہ ہوا اور بولا پڑھ کر سناؤ ۔ کاتب نے بہ خدمت جناب ، عالی مآب ، بلند اقبال ، حضور گورنر صاحب ، سے شروع کیا تھا ۔ مزاج گرامی ، موسم اور کنبے کا حال پوچھنے کے بعد درخواست کرنے لگا تھا کہ اگر بار خاطر نہ ہو تو ناچیز حقیر چنگیز کی اس معمولی سی گزارش پر غور فرمایا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ چنگیز جو مختصر چنگیزی حکم کا عادی تھا آگ بگولہ ہوگیا ۔ کاتب کو قتل کرنے کا پروگرام بنا رہا تھا کہ لوگوں نے بتایا کہ یہ تو یہاں کا رواج ہے ۔ چنگیز نے آداب و القاب فوراً بند کرا دیے جو اس کے جانے کے بعد فوراً واپس آگئے ۔ چنگیز نے یہ بھی نوٹ کیا ہر شام لوگ شراب پی کر مدہوش ہو جاتے ہیں چناں چہ اس نے حکم دیا کہ مہینے میں تین دفعہ سے زیادہ مدہوش ہونا جرم ہے ۔ اس کے جانے کے بعد یہ حکم بھی ختم ہوگیا) ۔

سکندر اعظم پہلی مرتبہ بابل آیا تو دارا کا تعاقب کر رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ یہ وہ دارا نہیں تھا جس کی فتوحات مشہور ہیں ۔ کتنے دن آپ جیا کس لیے دارا مارا ۔ ۔ ۔ ۔ والا بادشہ دارا سوئم تھا جس کے دربار میں بے شمار خواجہ سرا تھے ۔ سکندر جلدی میں تھا اس لیے بابل میں زیادہ نہ ٹھہر سکا (اگرچہ فوجی پریڈ اور سفیروں سے ملنے کے لیے اس نے کسی نہ کسی طرح وقت نکال لیا تھا) ۔ البتہ جب ہندستان سے واپس آیا تو فرصت ہی فرصت تھی لیکن اس عرصے میں پہلے سے کافی بدل چکا تھا ۔ اب ایرانی لباس پہنتا ، بات بات پر بگڑ جاتا ، وہمی بھی ہوگیا تھا ۔ جب اس کے استاد ارسطو کے پوتے کیلستھنیز نے اسے مشرقی انداز میں سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اسے مروا دیا ۔ اس سے پہلے اپنے جگری دوست اور محسن کلائی ٹس کو غصے میں آکر اپنے ہاتھوں قتل کر چکا تھا ۔

دجلہ عبور کیا ہی تھا کہ بابل سے وفد آیا اور درخوست کی کہ دیوتاؤں کی طرف سے اشارہ ہوا ہے کہ آپ مغرب کی جانب نہ آئیں ۔ کئی یونانیوں نے بھی پیشین گوئی کی کہ یہ سفر آخری سفر ہے ۔ سکندر بابل پہنچا تو فصیل پر کوے لڑ رہے تھے ۔ ایک کوا سکندر پر گر پڑا ۔ لوگوں نے شور

مچادیا کہ برا شگون ہے ۔ اتنا واویلا مچا کہ سکندر شہر میں داخل نہیں ہوا۔ کبھی دریا کے کنارے کیمپ لگاتا، کبھی کشتیوں میں ادھر ادھر پھرتا رہتا۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا ۔ ذرا ذرا سی بات منحوس بن جاتی، ہر واقعے سے بد شگونی اخذ کی جاتی۔ شروع شروع میں اس نے ایسے بد گو لوگوں کو زدو کوب بھی کیا لیکن اس قماش کے انسان کبھی باز نہیں آتے ۔ ان سب نے مل ملا کر سکندر کو یقین دلادیا کہ آخری وقت قریب ہے ۔

پھر جون کے مہینے میں بخار چڑھا۔ بخار پہلے بھی کئی مرتبہ چڑھا تھا لیکن تب اسے ایسی اوٹ پٹانگ پیشین گوئیوں پر یقین نہیں ہوا کرتا تھا۔ نقاہت بڑھتی گئی ۔ مرنے سے پہلے ساری فوج بسترِ مرگ کے قریب سے گزری ۔ سکندر نے آنکھوں سے ہر سپاہی کے سلام کا جواب دیا۔

پر دیکاس نے مہر نکالی اور پوچھا ۔ "شاہی مہر کس کمانڈر کو دی جائے ؟"

"جو سب سے دلیر اور قوی ہو ۔۔۔۔ اسے ۔" یہ اس کے آخری الفاظ تھے ۔

مغرب کے وقت سکندر انتقال کر گیا۔ چند روز بابل کے باشندے سہمے سہمے رہے کہ اب کوئی زبردست مصیبت نازل ہونے والی ہے لیکن تھوڑے ہی دنوں میں وہ اس جوانا مرگ فاتح کو بھول گئے جس نے اس زمانے کی دریافت شدہ دنیا کا بیش تر حصہ فتح کر لیا تھا۔ اس زمانے میں نہ اخبار تھے نہ ریڈیو۔ پھر بھی سکندر کا نام ہر شہر ہر قصبے میں بچے بچے کی زبان پر تھا۔ سکندر کو یاد کر کے جولیس سیزر اپنے گنجے سر پر ہاتھ مار کر کہا کرتا ۔۔۔۔ "میں تو کچھ بھی نہ کر سکا ۔۔۔۔ اس عمر میں سکندر دنیا فتح کر چکا تھا ۔"

سکندر کے جانشین سلیوکس نے سکندر کے آباد کیے ہوئے اٹھارہ انیس سکندریہ دیکھے تھے ۔ وہ مدت سے انتظار کر رہا تھا کہ کبھی اپنا پرائیویٹ شہر بھی بسائے ۔ اس نے بابل کو خیرباد کہا اور فوراً دجلے کے کنارے اپنا سلوکیا آباد کیا لیکن یہ شہر زیادہ دیر تک نہیں چلا۔ دراصل سکندر کی عظمت سے سلیوکس کا تحت الشعور بالکل تباہ ہو چکا تھا۔

یونانیوں نے دجلہ عبور کیا تھا اس لیے یہ ناممکن تھا کہ رومن پیچھے رہ جاتے ۔

ویسے بھی اپنی تہذیب و تمدن کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں دوسرے ملکوں پر حملے کرنا رومنوں کی پرانی عادت تھی ۔ دیکھا جائے تو یہ ان کی انتہائی شرافت تھی ورنہ پسماندہ ملکوں کو کون پوچھتا ہے ۔ لہٰذا مجبوراً انھیں دجلہ و فرات کی وادی میں آنا پڑا۔

ویسے اس زمانے میں چین اور ہندستان سے اس دوآبے کے راستے گرم مصالحے، ریشم اور خوش بوئیں روم بھیجی جاتی تھیں ۔

تب کے مورخ Pliny نے لکھا تھا "آج کل روم میں لونگ، جائفل، دارچینی اور کالی مرچ کا بڑی بے صبری سے انتظار کیا جاتا ہے ۔ ادھر عورتیں ریشم اور سرمے کی منتظر رہتی ہیں ۔۔۔۔"

سلطنت روما کے اس رپورٹر نے اس سالانہ رقم کا بھی ذکر کیا ہے جو رومن لوگ گرم مصالحوں اور سامانِ آرائش پر صرف کرتے تھے۔۔۔۔ یعنی تقریباً دس گیارہ لاکھ پونڈ کے لگ بھگ رومن کرنسی۔ (ان دنوں بھی کچھ کم خرچ نہیں ہوتا)۔
کہتے ہیں کہ رومن بادشاہ تراجن کو سکندر ثانی بننے کا بڑا شوق تھا۔ (یوسف ثانی بننے کی خواہش نے بھی بہتیروں کو خوار کیا ہے)۔
تراجن اسی راستے سے آیا جس سے سکندر آیا تھا۔ بالکل اسی سٹائل سے لڑتا ہوا دوآبے میں داخل ہوا۔ وہاں اسے یاد آیا کہ سکندر ثانی بننے کے لیے ہندستان پر بھی حملہ کرنا ہوگا۔
بیماریوں اور گرمی سے فوج کی بری حالت تھی لیکن بادشاہ کے حکم پر حملے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ آخر وہی تراجن جس نے ڈینیوب کے کنارے چٹانوں پر جگہ جگہ یہ الفاظ کھدوائے تھے۔۔۔۔ "اس کٹھن علاقے کے سرکش اور جنگ جو قبیلوں کو شہنشاہ تراجن نے اپنی تلوار سے زیر کیا۔" (یہ چٹانیں اور الفاظ اب تک موجود ہیں)۔ وہ تراجن خلیج فارس کے ساحل پر بھوں بھوں کر کے رو دیا۔ بادشاہ کے رونے کا ذکر مورخین نے بڑی وضاحت سے کیا ہے۔ (واپس وطن جاتے وقت غالباً تراجن کو یہ اطمینان ضرور ہو گا کہ وہ پہلا رومن بادشاہ تھا جو اس علاقے میں تہذیب پھیلانے گیا تھا)۔

ساسانی اپنے عروج کے لیے کافی عرصے سے منتظر بیٹھے تھے چناں چہ وہ سٹیج بھی آئی جب دجلے کے کنارے خسرو اعظم اپنے محل طاق کسریٰ میں سارے غیر ملکی سفیروں کو اکٹھا کر کے اپنی عظمت کے قصے سناتا۔ (سفیروں نے یہ کہانیاں اتنی مرتبہ سنی تھیں کہ انھیں کچھ کچھ یقین ہو چلا تھا کہ سچی ہیں)۔
طاق کسریٰ کی محراب اتنی اونچی ہے کہ آج تک اسے دنیا کی بلند ترین محراب کہا جاتا ہے۔ (نہ جانے اس میں کیا کشش تھی کہ ہر ایک کا یہی جی چاہتا تھا کہ اسے ڈھا کر برابر کر دے۔ فتح کے بعد عربوں نے اسے مسمار کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن کسی نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ بعد میں خلیفہ منصور نے قریب ہی بغداد بسانے کا پروگرام بنایا تو اینٹوں کے لیے اس محراب کو تڑوانا شروع کیا، لیکن فنانس والوں نے سمجھایا کہ اس طرح توڑ پھوڑ کر کے بیس میل سے اینٹیں منگانے کی بجائے بغداد میں نئی اینٹیں بنانا سستا رہے گا۔ لہٰذا یہ محراب بچ گئی)۔
پھر ساسانی بادشاہ سردیاں یہاں گزارنے لگے اور گرمیاں ایران کے پہاڑوں میں۔ جیسا کہ دیکھا گیا ہے کہ جب بادشاہ موسم کے الٹ پھیر میں دارالحکومت بدلنے لگیں تو ضرور کچھ ہو کے رہتا ہے چناں چہ عرب آ گئے۔
خالدؓ بن ولید نے تیرہ مہینوں میں پندرہ جنگیں لڑیں اور ہر بار فتح پائی۔

کچھ ساسانیوں کی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی اور خوش فہمی لے ڈوبی ۔ ہرمز جب خالد سے لڑنے آیا تو بے شمار زنجیریں ساتھ لایا کہ عرب قیدیوں کو پکڑ کر لے جانے میں آسانی رہے ۔ دجلے کے کنارے ابلہ کے مقام پر نہ صرف ہرمز کو شکست ہوئی بلکہ ان ہی زنجیروں سے ساسانی باندھے گئے (جنگ قادسیہ میں ساسانیوں کا کمانڈر مشہور پہلوان رستم تھا۔ سب جانتے ہیں کہ اکھاڑے کی پہلوانی ایک چیز ہے اور جنگ الگ چیز) ۔ دلیری اور شجاعت کا زمانہ تھا۔ اصلی جنگ سے پہلے Singles ہوا کرتے ۔ کوئی سورما نکل کر مخالف لشکر کو للکارتا ۔۔۔۔ "ہل مبارز من کمُ " یعنی کوئی ہے جو سامنے آئے ۔ ادھر سے بھی کوئی نکلتا۔ پھر دونوں فوجوں کے سامنے مقابلہ ہوتا۔

(یورپ نے نقل شروع کی تو Duel رائج ہوئی لیکن بعد میں انھوں نے ڈوئل کا مذاق بنالیا اور جرمنی کے اخباروں میں ایسے اشتہار نکلنے لگے ۔ "بہادرو! چہرے پر ڈوئل کے نشان لگوانا چاہتے ہو تو ہمارے سرجن کی خدمات حاضر ہیں۔ جو آپ کے ماتھے یا رخسار پر تلوار کے زخم بڑی مہارت سے بنادے گا، ان دنوں یورپ میں چاروں طرف یہ بانکے سورما جو Knigths کہلاتے تھے پھیل گئے ۔ ان میں سے بیش تر جعلی یعنی Bogus تھے ۔ پبلک ان سے بے زار ہوتی جارہی تھی ۔ آخر ہسپانوی مصنف Cervantes کو Don Quixote لکھ کر ان سورماؤں اور شولری کی پیروڈی کرنی پڑی۔ جس کا اثر خاطر خواہ ہوا اور شولری ختم ہو گئی) ۔

اس زمانے میں بادشاہ لڑتا تو اگلی صف میں ہوتا تاکہ سپاہیوں کے حوصلہ بلند رہیں۔ بادشاہ کے زندہ رہنے یا مرجانے سے جنگ پر فیصلہ کن اثر پڑتا تھا لیکن بعد میں بادشاہ غالباً اس لیے پچھلی صفوں میں رہنے لگے کہ کہیں ان کی موت پر لشکر بددل ہو کر بھاگ نہ نکلے ۔

عرب فاتح جلدی میں تھے ۔ دوآبے کو عراق عرب اور عراق عجم میں بانٹ کر، بصرے اور کوفے میں چھاؤنیاں بناکر، تیزی سے شمال کی طرف نکل آئے ۔ آرمینیا اور کاکیشیا میں عرب سپاہیوں نے پہلی مرتبہ سنہرے اور سرخ بالوں والی لڑکیاں دیکھیں ۔ بعد میں کاکیشیا کے پہاڑ کوہ قاف اور یہ لڑکیاں کوہ قاف کی پریاں مشہور ہوئیں۔ عربوں کی سلطنت پھیلتی گئی اور رومن سلطنت سے بھی بڑھ گئی ۔

عرب خانہ بدوش تھے ۔ اونٹ کے بالوں سے بناہوا خیمہ ان کے لیے بہترین عمارت تھی ابن خلدون نے لکھا ہے کہ عرب اپنے خیموں کے لیے مفتوحہ علاقے کی نفیس ترین عمارتوں کے شہتیر کھینچ لیا کرتے تھے ۔

ابن خلدون نے بڑی کام کی باتیں لکھی ہیں ۔۔۔۔ مثلاً یہ کہ آرٹ کبھی تخلیق نہیں ہوتا جب تک کہ آرٹسٹ نہ ہوں ۔۔۔۔ اور یہ کہ قوم بننے میں تین پشتوں کا عرصہ یعنی تقریباً نوے، سو برس لگتے ہیں ۔۔۔۔ اور فقط جفاکش اور جنگ جو قوم ہی حکومت کر سکتی ہے ۔ فتح کے بعد جب جاہ و حشمت اور مال و دولت اس قوم کو تن آسانی اور آداب و تکلفات کی طرف لے جاتے ہیں تو فوراً

کوئی توانا اور جیالی قوم ان سے حکومت چھین لیتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ کہ مفتوح قوم فاتحین کی ہر بات کی نقل کرتی ہے ۔ ہارے ہوئے لوگ فاتحین کا لباس، ان کی غذا، رسمیں، آداب ہر چیز غیر شعوری طور پر قبول کر لیتے ہیں کہ شاید ان ہی کی بدولت جیتنے والوں نے انھیں شکست دی تھی ۔

کھلی ہوا میں رہنے والے عربوں کو فتوحات شہروں اور قصبوں میں لے آئیں تو وہ بہت پریشان ہوئے ۔ یہ پریشانی بجا تھی کیوں کہ آبادیوں میں کاشت کاری ہوتی تھی ۔ پانی کی وجہ سے مچھر تھے جن سے بخار چڑھتا اور شہروں میں شور و غل تھا اور طرح طرح کی بیماریاں تھیں ۔

خلفائے بنی امیہ دمشق میں رہے لیکن صحراؤں اور نخلستانوں کی محبت ان کے دل سے نہ گئی ۔ شکار یا دورے کے بہانے وہ اکثر ریگستانوں میں نکل جاتے ۔ ان کے صحرائی محلوں کے آثار اب تک موجود ہیں لیکن عباسیوں نے بغداد بسا کر مکمل طور پر شہری سکونت اختیار کر لی ۔ آہستہ آہستہ بود و باش، طرز تعمیر، ہر چیز پر ساسانی رنگ آگیا ۔ دیوانِ عام کی جگہ دیوانِ خاص نے لے لی ۔ افسروں سے ملنے سے پہلے درخواست دینی پڑتی تھی اور ان کے سامنے درباری آداب کو ملحوظ رکھنا پڑتا تھا ۔

پھر بغداد بین الاقوامی شہر بن گیا ۔

ہارون الرشید نے یورپ کے شارلین کو ایک کلاک اور ہاتھی بھجوایا ۔ مورخ لکھتے ہیں کہ ہاتھی نے ۸۱۰ء میں جرمنی میں انتقال کیا (شارلمین کا انتقال بعد میں ہوا) ۔

ہارون الرشید نے بازنطینیوں سے بھی جنگیں لڑیں ۔ بازنطینی ہر بار صلح کر لیتے اور عرب فوج کے واپس بغداد پہنچنے سے پہلے صلح نامہ منسوخ کر کے پرانی حرکتوں پر اتر آتے (شاید اس لیے کہ یہ فاصلہ کافی طویل تھا اور کئی مہینوں میں طے ہوتا تھا) عرب پھر حملہ کرتے ۔ ایک اور صلح نامہ ظہور میں آتا جس کے بعد فوراً بازنطینی لڑکیوں کی شادیاں عربوں سے کی جاتیں (یہ موقع شناس لڑکیاں بڑے سلیقے سے سسرال والوں کو رواداری کی تلقین کرتیں) ۔

ایرانی سول عہدوں پر تھے ۔ عراقی تجار تھے یا طالب علم ۔ اس لیے خلیفہ معتصم نے مجبوراً غیر ملکیوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا ۔ اس نئی فوج کے لیے جو مملوکوں اور وسط ایشیا کے قبائلیوں پر مشتمل تھی، ساٹھ میل اوپر دجلے کے کنارے سامرہ آباد کیا گیا جو بعد میں دارالخلافہ بن گیا ۔ ان دنوں ریت سے اٹا ہوا سامرہ ہوائی جہاز سے بالکل ماڈرن شہر دکھائی دیتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اس میں Race course بھی ہے ۔ شاپنگ سنٹر ہیں اور ماڈل ٹاؤن بھی ۔ یہاں دائرہ، ادھر مربع، وہاں تکون ۔ ۔ ۔ ۔ جگہ جگہ جیومیٹری کے خطوط نظر آتے ہیں ۔

مورخوں کا کہنا ہے کہ سامرہ کے بسنے کے ساتھ ہی خلافت کا زوال شروع ہو گیا ۔

ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو لیکن آج تک جتنی سلطنتیں قائم ہوئی ہیں دو تین سو برس سے زیادہ نہیں رہیں ۔ شاید قدرت نے اتنی ہی عمر مقرر کر رکھی ہے ۔ اس کے بعد اقتدار کم ہوتا چلا

جاتا ہے ۔ بہانے سینکڑوں بن جاتے ہیں ۔۔۔۔ باہمی خانہ جنگی ، کسی نئی قوم یا فرقے کا عروج ، بعض اوقات تو کوئی بھی وجہ نہیں ہوتی ۔ سلطنتِ روما کے زوال پر کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دراصل ہوا کیا تھا ۔ کئی سلطنتیں تو بڑی بڑی جنگیں جیتتے جیتتے ختم ہو جاتی ہیں ۔

تیرھویں صدی کے وسط میں ہلاکو نے بغداد کی بیس لاکھ آبادی میں سے سولہ لاکھ کو قتل کیا ۔ دریا رواں رہے ، نہریں بہتی رہیں ، لیکن ہل چلانے والا کوئی نہ رہا ۔ زرخیز زمین دوبارہ بنجر ہو گئی (بیسویں صدی کے شروع میں مشہور ماہر سر ولیم ولکاکس نے حکومتِ ترکیہ کو رپورٹ بھیجی کہ عراق میں نئی نہریں کھودنے کی بجائے اتنی ہوئی قدیم نہروں کو ٹھیک کر لیا جائے) ۔

تین سال تک کوئی خلیفہ نہ تھا ۔ آخر خلافت بغداد سے قاہرہ منتقل کی گئی اور وہاں سے قسطنطنیہ اور پھر خلافت بالکل ختم ہو گئی ۔

خلافتِ بغداد کو تباہ کرنے کے بعد ہلاکو کی اولاد نے پچاس سال کے اندر اندر اسلام قبول کر لیا ۔ پھر ایرانی آ گئے ۔ ان کے بعد ترک آئے جو کئی سو برس رہے ۔ ان ہی دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بصرے میں دفتر کھول لیا ۔

رائل نیوی کا ایک جہاز Sea Horse بصرہ پہنچا ۔ اس کا ایک جہاز راں گرمی کی شدت سے اس قدر نڈھال رہنے لگا کہ ڈاکٹری مشورے پر مجبوراً اسے واپس انگلستان بھیجنا پڑا ۔۔۔۔ یہ Nelson تھا جو بعد میں لارڈ نیلسن بنا ۔ یعنی فاتحِ جنگ Trafalgar ۔

پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی تو عربوں کو لڑتے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا ۔ وہ ترکوں کے خلاف لڑے ۔ جب انگریز جنرل ایلن بی Allenby دمشق میں فاتحانہ داخل ہوا تو خوش فہم باشندوں نے ال نبی ! ال نبی ! کے نعرے لگا کر اس کا استقبال کیا ۔

۱۹۱۹ء میں برطانوی ایجنٹ Gertrude Bell نے بغداد سے اپنے رشتے داروں کو خط میں لکھا کہ ۔۔۔۔ " آپ حیران ہوں گے کہ میں بغداد میں اتنی مقبول ہوں کہ سب مجھے ام المومنین کہتے ہیں ۔ لہٰذا یہاں میرا قیام بے حد ضروری ہے ۔ فی الحال میں انگلینڈ نہیں آ سکتی ۔۔۔۔ "

پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے درمیانی وقفے کے حالات ذرا پیچیدہ ہیں اور انھیں فقط سیاست دان ہی سمجھ سکتے ہیں ۔

بغداد کا شہر دجلے کے ساتھ ساتھ یوں چلا گیا ہے کہ اس کے عرض و طول میں ایک اور تیرہ کی نسبت ہے ۔ فقط شمالی حصے کاظمین میں کہیں کہیں قدیم شہر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ورنہ بالکل بغداد الجدید بن چکا ہے ۔ پرانی عظمت کی نشانیاں گنی گنائی رہ گئی ہیں ۔۔۔۔ منہدم محل ، چند مینارے یا وہ زمین دوز لائبریری جس میں ہلاکو نے دریا کا پانی چھوڑ دیا تھا ۔

مشہور جغرافیہ داں یعقوبی نے لکھا کہ خلیفہ منصور دورے پر تھا کہ ایک گاؤں کے پاس رکا اور اپنے ہم راہیوں سے گویا ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ "یہ گاؤں بہت بڑی تجارتی منڈی بن سکتا ہے ۔ دجلے کے ذریعے آرمینیا اور آذربائیجان سے سامان آئے گا اور فرات کے ذریعے شام اور شمالی افریقہ سے ۔ ہند اور چین کے جہاز یہاں لنگر انداز ہوں گے ۔ اصفہانی اور خراسانی تجار سڑکوں سے پہنچیں گے ۔ خدا کا شکر ہے کہ ایسے اہم شہر کا بسانا میرے سپرد ہوا ہے ورنہ مجھ سے پہلے کتنے یہاں سے گزرے اور کسی کو خیال تک نہ آیا ۔ ۔ ۔ ۔"

منصور نے دجلے کے مغربی کنارے پر مدینتہ السلام کی بنیاد رکھی ۔ شہر آباد ہوا تو لوگ اسے منصور یہ کہنے لگے (منصور کا شہر تھا تو دجلے پر لیکن پانی فرات سے آتا تھا) ۔ پبلک نے فوراً سیٹلائیٹ ماؤن اور ماڈل ماؤن بنائے ۔ مشرقی کنارے پر مہدیہ آباد ہوا پھر رصافہ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھتے دیکھتے منصور کا اصل شہر بالکل گم ہو گیا ۔

لفظ بغداد کو کچھ لوگ تو نوشیروان کے پرانے شہر باغ داد سے ملاتے ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ بابل کے وقتوں میں یہاں ایک گاؤں بغداد آباد تھا ۔

جب معتصم نے ڈھائی لاکھ فوجیوں کے لیے سامرہ بسایا تو بغداد کی اہمیت کم ہو گئی (معتصم کے زمانے میں ہندستان سے تقریباً سترہ ہزار جاٹ بغیر بلائے یا اطلاع دیے آگئے تھے ۔ عربوں نے انھیں الزط کہا اور ان کی الٹی سیدھی حرکتوں سے تنگ آکر سیلشیا کی سرحد پر بھیج دیا جہاں وہ خانہ بدوشوں میں خلط ملط ہو گئے ۔ ۔ ۔ ۔ یا خانہ بدوش ان میں خلط ملط ہو گئے ہوں گے) ۔

خلیفہ المتوکل نے سامرہ میں پونے تین سو گز لمبی اور پونے دو سو گز چوڑی مسجد تعمیر کی جسے دنیا کی سب سے بڑی مسجد کہا جاتا ہے مسجد سے کہیں خوش نما اس کا مینار تھا جو "بابل کے مینار" کی نقل تھی ۔ دو سو فٹ اونچے مینار کی چوٹی پر پہنچنے کے لیے ایک بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی تھی جس پر سوار گھوڑے سمیت اوپر چڑھ سکتا تھا ۔ یہ مینار اب بھی ہے لیکن کٹہرہ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر چڑھتے وقت لوگوں کو چکر آتے ہیں ۔

لیکن پھر المتوکل نے شمالی سمت میں ایک اور دار الخلافہ الجعفریہ تعمیر کر لیا تو سامرہ یکایک سنسان ہو گیا ۔

نئی جگہ دنگے فساد رہتے تھے ۔ سال بھی نہ گزرا تھا کہ متوکل کو پھر سامرہ آنا پڑا اور وہاں سے بچاس سال اور آٹھ حکم رانوں کے بعد سب واپس بغداد آگئے ۔

بغداد نے بڑی ترقی کی ۔ عرب ملاح دور دور تک نکل گئے (چند سال ہوئے روس ، سویڈن اور جرمنی کے ساحلی علاقوں میں قدیم عربی سکے ملے) ۔

یونیورسٹیاں اور دار الحکما قائم ہوئے ۔ یونانی علما کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا ۔ بغداد علوم و فنون کا مرکز بن گیا ۔

افواہ ہے کہ مارکو پولو نے اس علاقے کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ سنی سنائی باتوں پر مبنی تھا۔ مثلاً اس نے بغداد کے سامنے ایک بہت بڑے پہاڑ کا ذکر کیا ہے حالاں کہ وہاں اتنی سی پہاڑی بھی نہیں ہے اور جو الاؤ کے حملے اور بوداز کی تباہی کی داستان بیان کی ہے وہ کسی سنسنی خیز جاسوسی ناول کا حصہ معلوم ہوتی ہے اور مارکو پولو نے یہ حقیقت نگاری، تیرھویں صدی میں کی تھی۔ اس کے باوجود ابن بطوطہ کے سفرنامے کو مغرب میں شک و شبے سے دیکھا جاتا ہے۔

ابن بطوطہ چودھویں صدی کے شروع میں اس طرح آیا۔ پہلے بصرہ پہنچا، پھر خلیج فارس کے ساحل پر۔ وہاں سے جب بغداد کا پروگرام بنانے لگا تو معلوم ہوا کہ اسی بصرے والے راستے سے دوبارہ گزرنا ہوگا۔ لہٰذا ایران کی طرف سے سینکڑوں میل کا فالتو چکر لگا کر بغداد پہنچا۔

"جس راستے سے ایک دفعہ گزر جاؤں اس پر دوبارہ قدم نہیں رکھتا۔۔۔۔" اس نے سفرنامے میں لکھا ہے بغداد پہنچ کر دیکھا کہ قدیم عمارات منہدم ہو چکی ہیں اور لوگوں نے غلط عربی بولنی شروع کر دی ہے۔ یہ بھی نوٹ کیا کہ تاتاری اور ترک حکم ران فرمان جاری کرتے ہیں تو اس طرح شروع کرتے ہیں "سلطان اور خاتونوں (بیویوں) کے حکم سے جاری ہوا۔۔۔۔" (جیسے دورِ جدید میں بھی ہوتا ہے)۔

ابن بطوطہ جیسا سیاح آج تک پیدا نہیں ہوا۔ اس نے جو سیاحت چودھویں صدی میں کی تھی اس پر بیسویں صدی میں بھی رشک آتا ہے۔ ایک دن گھر سے نکلا تو لگاتار بیس سال سیر کرتا رہا۔۔۔۔ مشرقِ وسطیٰ، ہندستان، لنکا، چین۔ وسط ایشیا اور قسطنطنیہ دیکھ کر واپس گھر پہنچا تو یاد آیا کہ سپین نہیں دیکھا اور افریقہ کے اندرونی علاقے بھی رہ گئے ہیں۔ چھ برس کے لیے پھر نکل گیا۔

بغداد میں ان دنوں دو سلطان دورے پر آئے ہوئے تھے۔ ابن بطوطہ نے اپنے قیام کا اتنا ذکر نہیں کیا جتنا ان سلطانوں اور ان کی باہمی چپقلش کا۔ آخر ایک دن وہ سلطان ابو سعید (جس کی بیوی کا نام بغداد خاتون تھا) کے محلے کے ساتھ چل کھڑا ہوا۔ محلہ ان دنوں چلتے پھرتے کیمپ کو کہا جاتا تھا۔

دورانِ سیاحت اس نے لیکچر دیے۔ ملازمت کی۔ بادشاہوں کا سفیر بنا۔ جگہ جگہ شادیاں کیں لیکن جہاں کوئی باہر جانے والا قافلہ یا جہاز نظر آجاتا تو فوراً رتبہ، دولت، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ساتھ ہولیتا۔ سیاحت اسے سب چیزوں سے زیادہ عزیز تھی۔

بصرے سے سندباد نکلتا اور خلیج فارس کا رخ کرتا۔ ان دنوں سندھ السند تھا۔ ہندستان الہند اور قلات کیکان۔ یہاں تک کہ دریا اٹک نہرِ مہران تھا۔

نہ زرِ مبادلہ کی بندشیں تھیں اور غالباً Customs والے بھی اچھی طرح پیش آتے ہوں گے۔ تبھی سندباد اتنے سفر کر سکا ہوگا۔

اس عہد زریں کے محققوں اور عالموں کے نام تاریخ کی دھند میں ستاروں کی طرح چمکتے ہیں۔

بیسویں صدی میں سارٹن نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ سائنس" میں الفارابی کو دنیا کا سب سے بڑا فلسفی، ابو کامل (جس نے الخوارزمی کے الجبرے کی تکمیل کی) اور ابراہیم بن سنان کو سب سے بڑے ریاضی دان، المسعودی کو عظیم ترین جغرافیہ دان اور طبری کو سب سے ممتاز مورخ قرار دیا ہے۔

عربوں کا رائج کردہ موتیے کا آپریشن اٹھارویں صدی تک جرمنی اور انگلستان میں مقبول رہا۔

یورپ کی یونیورسٹیوں میں سترویں صدی تک حکیم بوعلی سینا اور حکیم رازی کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔

بوعلی سینا کی معرکتہ الآرا تصنیف "القانون فی الطب" کو ڈاکٹر اوسلر نے طبی انجیل کا درجہ دیا ہے اور کہا ہے کہ کسی اور طبی کتاب نے دنیا پر اس قدر اثر نہیں ڈالا جتنا کہ اس نے۔

اس زمانے کے جینئیس بڑے عظیم انسان ہوتے تھے۔ بہ یک وقت سائنس داں، مہندس، فلسفی بھی ہوتے تھے۔ شاعری، موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ پر بھی عبور ہوتا تھا۔ (آج کل کے انٹلکچوئل حضرات کی طرح نہیں کہ من ڈیڑھ من کتابیں پڑھ کر موٹی سی عینک لگائی، بال بڑھائے اور چڑچڑے بن کر ہر چیز کی مخالفت شروع کر دی)۔

بغداد کی دھاک دور دور تک بیٹھ چکی تھی۔ یہاں سے حکم نامے جاری ہوتے تھے۔ خطابات عطا ہوتے تھے۔ شمس الدین التمش نے ہندستان سے اپنا نمائندہ بھیجا اور حکومت کرنے کی اجازت مانگی۔ جب خلیفہ نے سیاہ عبا، انگوٹھی اور عصا بھیجے تب التمش نے اپنے نام کے ساتھ سلطان لگانا شروع کیا۔ مملوکوں نے خراسان فتح کیا تو خلیفہ نے مبارک باد بھیجی اور یمین الدولہ اور امین الملت کے خطابات عطا فرمائے۔ بعد میں طغرل بیگ کو ملک الشرق والغرب کا اعزاز دیا (لیکن پتہ نہیں پبلک کو کیوں شبہ ہے کہ اعزازات و خطابات محض انگریزوں نے شروع کیے تھے۔ مسلمانوں نے بھی تاج پہنے ہیں لیکن لوگ Crown سے اب تک خفا ہیں)۔

بغداد سے کئی سیاح گزرے۔ بارھویں صدی میں ابن جبیر آیا تو اسے گرد و نواح میں جگہ جگہ نہریں اور پل ملے مگر بغداد میں زیادہ رونق نہیں تھی۔ باشندے بھی خشک سے لگے۔ لیکن وہ نسوانی حسن سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے ---- "بغداد میں حسن کی وہ فراوانی ہے کہ خوف خدا نہ ہو تو انسان فوراً غلط راستے پر پڑ سکتا ہے۔"

مارکوپولو نے پتہ نہیں کیوں موصل کے تاجروں کو موصیلینی لکھا ہے (جو مسولینی سے ملتا جلتا ہے) اور بغداد کو بوداز، بصرے کو بلصرہ اور ہلاکو کو الاؤ۔

ایک دن منصور کسی مصنف جعفر کی کتاب لایا جو الف لیلہ کی پیروڈی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ وہی جعفر ہے جو ہمارے ہاں جعفر زٹلی کے نام سے مشہور ہے۔ ہمیں پہلے علم نہ تھا کہ الف لیلیٰ کی بھی پیروڈی ہو چکی ہے لیکن جعفر کی تحریروں میں وہی جانے پہچانے الف لیلوی کردار ملے ۔۔۔۔ مثلاً ایک باغ میں کچھ لوگ پکنک پر آئے ہوئے ہیں۔ دفعتہً ایک بیل بھاگا بھاگا آتا ہے جس کے تعاقب میں ایک بوڑھا لگا ہوا ہے۔ باغیچے کو دیکھ کر تھکا ہوا بوڑھا ایک طرف بیٹھ کر پسینہ پونچھنے لگتا ہے اور بیل اگلے قطعے میں گھاس چرنا شروع کر دیتا ہے۔

لوگوں نے بوڑھے سے علیک سلیک کی کوشش کی لیکن اس نے منھ پھیر لیا۔ پھر کھانے کی دعوت دی۔ اس پر بھی خاموش رہا۔ آخر انھوں نے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے؟ اس نے بسورتے ہوئے جواب دیا کہ اس کی کہانی اس قدر غمناک ہے کہ خاموش رہنا ہی بہتر ہوگا۔

سب نے اصرار کیا تو بوڑھے نے بتایا کہ ایک بادشاہ کے تین بیٹے تھے۔ تینوں وزیر کی حسین و جمیل لڑکی پر عاشق تھے لیکن لڑکی اتنی رحم دل تھی کہ کسی ایک سے شادی کر کے بقیہ دو شہزادوں کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی چناں چہ وہ تینوں لگاتار شادی کے طلب گار رہے اور لڑکی خاموش رہی۔

اتفاق سے تینوں شہزادے وجاہت، تعلیمی قابلیت، توانائی، شہسواری، تیر اندازی اور فنون سپہ گری میں ایک دوسرے کے ہم سر تھے۔ جب انھوں نے کام کاج چھوڑ کر آہ و بکا میں وقت ضائع کرنا شروع کر دیا تو بادشاہ نے وزیر کو بلایا اور حکم دیا کہ اب شادی کا فیصلہ فوراً ہو جانا چاہیے لیکن لڑکی بہ دستور خاموش رہی۔ ادھر شہزادوں کی حالت اور خستہ ہوتی گئی۔ آخر بادشاہ کو طیش آیا اور اس نے وزیر کو خبردار کیا کہ اگر کل شام تک فیصلہ نہیں ہوا تو نیا وزیر اس سے چارج لے لے گا۔ وزیر شہزادوں کو شہر لے گیا۔ ان کا تحریری اور زبانی امتحان لیا۔ تینوں برابر نکلے۔ پھر نیزہ بازی کرائی، چھلانگیں لگوائیں، دریا میں تیرایا۔ سارے جتن کیے لیکن اگلے سہ پہر تک تینوں کے نمبر یکساں تھے۔ کچھ اور ٹسٹ بھی لیے مگر معاملہ وہیں رہا۔ جب سورج ڈوبنے لگا تو وزیر بہت گھبرایا۔ پریشانی میں ادھر ادھر دیکھا تو ایک بچھڑا دکھائی دیا جو گھاس چر رہا تھا۔ وزیر نے بوکھلا کر نعرہ لگایا ۔۔۔۔ "جو اس بچھڑے کو پکڑ لے وہ جیت گیا۔"

تینوں شہزادے سرپٹ بھاگے۔ ادھر بچھڑے نے ڈر کر زقند بھری اور تعاقب شروع ہو گیا۔ آگے گیلا کھیت تھا جس میں ایک کا پاؤں پھسلا اور وہ پیچھے رہ گیا۔ پھر جنگل آیا۔ اس میں بچھڑے نے دونوں شہزادوں کو خوب چکر دیے۔ اونچی اونچی جھاڑیوں میں ایک شہزادہ کسی اور رخ میں نکل گیا۔ اب ایک شہزادہ رہ گیا جو پوری مستعدی سے تعاقب کر رہا تھا۔ ادھر بچھڑا تھا کہ قریب نہ آنے دیتا تھا ۔۔۔۔ "وہ دن اور آج کا دن ۔۔۔۔ مدتیں گزر چکی ہیں ۔۔۔۔ وہ بچھڑا پورا بیل بن چکا ہے اور آپ کے سامنے گھاس چر رہا ہے ۔۔۔۔ میری بھی عمر بڑھتی جا رہی ہے لیکن

تعاقب جاری ہے ۔۔۔۔"

سب نے دیکھا کہ بیل گھاس چرنے کے بعد تازہ دم ہو کر بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا۔

"اچھا خدا حافظ!" بوڑھے نے نعرہ لگایا اور بیل کے پیچھے ہو لیا۔

یہ اور ایسی کئی کہانیاں ہم نے پڑھیں۔

ایک دن میں اور دو مقامی حضرات ڈیوٹی سے واپس کیمپ آرہے تھے۔ یکایک انھوں نے گھبرا کر بتایا کہ ہم شدید خطرے میں ہیں۔ بڑی مصیبت آنے والی ہے۔

میں نے لاری کی رفتار تیز کرنی چاہی تو انھوں نے چلتی لاری سے کودنے کی دھمکی دی۔ آخر رکنا پڑا۔ چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کی لیکن کچھ بھی نظر نہیں آیا۔

وہ دونوں جھاڑیوں میں چھپ چکے تھے۔ میں نے ایک ٹیلے کے اوپر لاری چڑھانی چاہی تاکہ اونچی جگہ سے اچھی طرح دیکھ سکیں۔

"آگے مت جاؤ ۔۔۔۔ خطرہ ہے!" وہ دونوں چلائے۔

ٹیلے کے اوپر چڑھ کر دیکھا تو دور ایک وادی سی نظر آئی جہاں کچھ درخت اور خیمے تھے۔ ایک طرف سے غبار اٹھا۔ نعرے سنائی دیے اور گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ پھر ریت کے بادلوں میں سب کچھ چھپ گیا۔ چند لمحوں کے بعد کچھ سوار بندوقیں لہراتے ہوئے تیزی سے ایک طرف نکل گئے اور غدر سا مچ گیا۔ پھر دس بارہ اونٹ اور پانچ چھ گھوڑے دوسری سمت جاتے دکھائی دیے۔ چند گولیاں چلیں اور گرد کے غبار میں سوار اور بھیڑیں نظر آئیں۔ کبھی اونٹ اور آدمی سامنے آجاتے، کبھی بھیڑیں اور آدمی، تو کبھی اونٹ اور بھیڑیں ۔۔۔۔ ساتھ ساتھ نعرے اور گولیوں کی آواز۔ پھر یہ سب آپس میں خلط ملط ہو گئے۔

کچھ دیر کے بعد جب گرد صاف ہوئی تو ایک طرف اونٹ کھڑے تھے۔ دوسری طرف بھیڑیں اور آدمی گھوڑوں کو تھپتھپا رہے تھے۔ نہ کوئی زخمی نظر آیا نہ کسی کا انتقال ہوا تھا۔

کیمپ پہنچ کر یہ واقعہ منصور کو سنایا۔ وہ حقارت سے بولا۔ "شہری ہوں گے۔ یہ لوگ ڈینگیں مارنے کی غرض سے بناوٹی لڑائیاں سٹیج کرتے ہیں جو درحقیقت لڑائی کی پیروڈی ہوتی ہے کبھی تمھیں پہاڑ کے باشندوں کی اصلی لڑائی دکھائیں گے تم یقیناً خوش ہو گے۔"

روز مجھ سے کہنے لگا۔ "عجب اتفاق ہے ۔۔۔۔ پچھلے ہفتے تم نے الف لیلہ کی پیروڈی پڑھی تھی اور آج تم نے ایک اور پیروڈی کا نظارہ کر لیا ۔۔۔۔"

"یہ فقط بغداد کے گرد و نواح ہی میں ہو سکتا ہے ۔۔۔۔" منصور مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔

اگلے سنیچر کی شام کو منصور بھی ہمارے ساتھ بغداد گیا۔ آج خاص پروگرام تھا۔ پبلک

کے پرزور اصرار پر عفیفہ مجیدہ اپنے ہر دل عزیز نغمے سنانے والی تھی۔

وہ مائیکروفون کے سامنے آئی تو خوب تالیاں بجیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس میں گانا کم تھا اور مٹکنا اور تھرکنا زیادہ۔

مجیدہ کی صحت ماشاء اللہ بہت اچھی تھی اور لباس ضرورت سے زیادہ چست۔ بازو تھرکتے گردن ہلتی، کمر مٹکتی، سارا جسم بل کھاتا۔۔۔۔ اور کبھی کبھی نغمے کا کوئی چھوٹا سا مصرعہ بھی زبان پر آجاتا۔

"کیا جذبات ہیں! ۔۔۔۔ واللہ! ۔۔۔۔ کیا اظہار ہے ۔۔۔۔!" جرجیس جھوم جھوم جاتا۔

"کون سے جذبات؟ اور کون سا اظہار؟" میں نے تنگ آکر پوچھا۔

"یہ دجلے کا رقص ہے اور اسی طرح ہوتا ہے جیسے ہو رہا ہے ۔۔۔ واللہ!" جرجیس نے جواب دیا۔

گانا ختم ہوا تو خاموشی طاری ہو گئی۔ مجیدہ ہجوم کی طرف دیکھ رہی تھی کہ اب شاباش ملے گی۔ ادھر سارا ہجوم ایک اور خاتون کی طرف دیکھ رہا تھا جو مجیدہ سے کہیں تن درست و توانا تھی جس نے اور بھی زیادہ پھنسا ہوا لباس پہن رکھا تھا اور جو کسی موزوں کرسی کی تلاش کے بہانے بالکل آہستہ آہستہ ادھر سے ادھر جا رہی تھی، اور ادھر سے ادھر آ رہی تھی۔

جب وہ کہیں بیٹھ گئی تو ہجوم دوبارہ مجیدہ کی جانب متوجہ ہوا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر آرکیسٹرا کے سامنے والی میز سے ایک فلک شگاف ڈکار بلند ہوئی۔

یہ ڈکار اس امر کا زندہ ثبوت تھی کہ کوئی صاحبِ دل کسی آرٹسٹ کو خراجِ تحسین پیش کرنے میں پیچھے نہیں رہ سکتا۔ مجیدہ نے بے زار ہو کر ایک اور لے چھیڑی اور کمر کے پٹھوں کی ورزش شروع کر دی۔

باہر دو شیخ اپنے اپنے اونٹوں سے اترے، اندر آئے اور گانے والی کا بہ غور معائنہ کیا۔ کھڑے کھڑے کچھ دیر اسے تکتے رہے۔ پھر آپس میں ہاتھ ملا کر ایک نعرہ لگایا اور اونٹوں کی طرف چلے گئے۔

"انھوں نے کیا کہا تھا؟" روز نے پوچھا۔

"انھوں نے اطمینان کا اظہار کیا تھا کہ ۔۔۔۔ الحمد للہ عفیفہ مجیدہ ابھی تک فربہ ہے ۔۔۔" منصور نے بتایا۔

"ضرور دیہاتی ہوں گے ۔۔۔۔"

ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سلیم چند چکنے چپڑے نوجوانوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد وہ ہماری پارٹی میں شامل ہو گئے۔ سلیم بتانے لگا:

"اس پہاڑیئے کا قصہ تو سنا ہو گا جو عبادت کر رہا تھا کہ اچانک کوئی مسافر نظر آگیا۔ فوراً

عبادت ملتوی کر کے بندوق سنبھالی اور مسافر کو لوٹ لیا۔ واپس آکر پھر عبادت شروع کر دی۔ کوئی مہذب شخص دیکھ رہا تھا۔ اس نے برا بھلا کہا تھا کہا تو پہاڑیے نے خفا ہو کر جواب دیا ۔۔۔۔
"یہ دین کا کام ہے اور وہ دنیا کا ۔۔۔۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔"

سلیم کے دوستوں نے قہقہہ لگایا۔

منصور نے جواب دیا ۔۔۔۔ "جی ہاں یہ قصہ میں نے سنا ہے اور شہروں میں تقتیل، قاتلون، مقتل والی گردان بھی سنی ہے۔ ایک بالکل سچا واقعہ بتا رہا ہوں۔ ایک شہری اور ایک دیہاتی چائے خانے میں بیٹھے تھے کہ دفعتہً شہری کچھ دیکھ کر چونکا اور بولا ۔۔۔۔ وہ دیکھو۔ اس کونے میں میرا جانی دشمن چار آدمیوں کے ساتھ بیٹھا ہے۔ دیہاتی کے تجسس پر اس نے اشارے سے بتایا ۔۔۔ میرا دشمن وہ ہے جس کی مونچھیں سیاہ ہیں ۔۔۔۔ "اتفاق سے پانچوں کی مونچھیں سیاہ تھیں۔ "وہ جو موٹا اور گنجا ہے" اس نے وضاحت کی، لیکن وہ پانچوں موٹے اور گنجے تھے۔ "وہ جس کی توند نکلی ہوئی ہے۔" ادھر پانچوں کی توندیں نکلی ہوئی تھیں۔ آخر دیہاتی کو اپنا دشمن دکھانے کے لیے شہری نے پستول نکالا۔ ڈز ڈز ڈز ڈز کی آوازیں آئیں اور چشم زدن میں چار آدمی مرے پڑے تھے ۔۔۔۔ "وہ جو رہ گیا ہے وہ میرا دشمن ہے" ۔۔۔۔ اب سمجھے؟" شہری نے فاتحانہ انداز میں کہا" ۔۔۔۔ اس مرتبہ قہقہہ لگانے کی ہماری باری تھی لیکن سلیم کے ایک اور دوست نے بات کاٹی ۔۔۔۔ "ویرانوں اور وسعتوں میں بسنے والوں کے دل ہمیشہ وسیع نہیں ہوتے۔ یہ سنی سنائی نہیں ہے سچا واقعہ بیان کر رہا ہوں ۔۔۔۔ صحرا کے ایک شیخ نے اپنے قبیلے کو کسی اور نخلستان پہنچانے کے سلسلے میں اپنے دوست سے اونٹ ادھار مانگے۔ جب جواب نہ آیا تو یاددہانی کرائی۔ اس پر اطلاع آئی کہ اونٹ تو اچھی حالت میں ہیں لیکن ان کی نکیل ٹھیک نہیں ہے ورنہ ضرور بھیج دیے جاتے۔ پہلا شیخ چپ ہو گیا مگر جب اگلے سال دونوں کی اتفاقاً ملاقات ہوئی تو بڑا گلہ کیا کہ اے برادر کہاں اتنے قیمتی اونٹ؟ اور کہاں چند سکوں کی نکیل؟ ۔۔۔۔ بھلا اس معذرت میں کوئی تک بھی تھا؟ اس پر جواب ملا کہ یا برادر ایسے معاملوں میں اشارہ کافی ہوتا ہے۔ جب نیت نہ ہو تو بہانہ چھوٹا سا ہو یا بہت بڑا ۔۔۔۔ سمجھ لینا چاہیے۔"

اس پر منصور نے جوابی حملہ کیا ۔۔۔۔ "شہری دکان دار صبح صبح منہ اندھیرے دودھ کے مٹکے میں پانی کی بالٹی ڈالنے لگا تو عادتاً دائیں بائیں جھانکا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ اس کے ایمان دار ملازم نے اس کا منہ پکڑ کر آسمان کی طرف کر دیا اور مؤدبانہ عرض کی کہ دہنے بائیں تو کوئی ہو یا نہ ہو اوپر والا ہمیشہ تکتا رہتا ہے۔ اس لیے اوپر بھی دیکھ لینا چاہیے ۔۔۔۔"

مجیدہ کا گانا دفعتہً ختم ہو گیا۔ اندر ہال میں رقص شروع ہو چکا تھا اور لوگ اس طرف جا رہے تھے۔ منصور اور سعدہ کو وہیں چھوڑ کر ہم اندر چلے گئے۔

جرجیس تین پختہ عمر بنی ٹھنی خواتین کو لیے آ رہا تھا۔ پیچھے پیچھے ایک لڑکی بھی تھی۔ یہ

جرجیس کی نئی محبوبہ تھی جو تین مہینے کی پروبیشن پر تھی۔

دراصل جرجیس کو فقط منگنی کا شوق تھا۔ جو لڑکی پسند آتی (اور اسے سب لڑکیاں پسند آجاتی تھیں) تو بار بار کہتا ---- "بس تم میری منگیتر بن جاؤ۔ سدا محبت رہے گی۔ بڑی قدر کروں گا۔ تم ہمیشہ میری عزیز ترین منگیتر رہو گی۔"

اور شادی سے اتنا ڈرتا تھا کہ جب لوئی زا سے بڑی مشکلوں کے بعد دوستی ہوئی اور دونوں اکٹھے نظر آتے تو روز ان کا ہمیشہ یوں تعارف کراتا ---- "یہ ہے ہمارا دوست جرجیس اور اس کے ساتھ ہے اس کی ہونے والی مس لوئی زا ----"

ایک شام وہ لوریتا کو ساتھ لایا ---- "یہ ہے ہمارا دوست جرجیس اور اس کے ساتھ ہے آئندہ کی منگیترِ مس لوریتا ----" روز بولا۔

اور جب کافی منت سماجت کے بعد رونا روزا آئی تو روز نے خوش ہو کر سب کو بتایا کہ اس وقت جرجیس کے ہم راہ مستقبل کی منگیترِ مس رونا روزا ہے۔

جرجیس نے پہلے تو اپنی نئی محبوبہ کی تعریف (اپنے مخصوص انداز میں) کی پھر محبوبہ سے کہنے لگا ---- "تمھارا منگیتر بڑا خوش نصیب ہے۔"

"مگر میری منگنی تو کہیں نہیں ہوئی۔" وہ شرما گئی۔

"تبھی تو خوش نصیب ہے۔" جرجیس نے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا ----

"آج اس شدید قسم کے میک اپ کی وجہ سے اتنی حسین معلوم ہو رہی ہو کہ پہلے تو میں پہچان نہ سکا کہ یہ تم ہی ہو ----" وہ خاموش ہو گئی تو جرجیس نے ٹوکا ---- "کم از کم آداب مجلس کا ہی کچھ خیال رکھو۔ ابھی تم نے اپنی تعریف سنی ہے۔ لہٰذا تھینک یو کہو ----"

روز نے جرجیس کی تینوں سہیلیوں کو غور سے دیکھ کر حساب لگایا اور اس کا کندھا ہلا کر بولا۔

"جانتے ہو؟ ان تینوں کی مجموعی عمر تقریباً سوا سو برس ہوگی اور تم صرف پچیس سال کے ہو۔"

"لیکن اگر ان کے جثے اور چہروں کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ خاصی کیوٹ ہیں۔ ویسے فی الحال میں ان تینوں میں سے دو سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہا ہوں ----"

روز نے ایک لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور رقص کرنے چلا گیا۔

"جس لڑکی کو دیکھو کسی یورپین پر فریفتہ ہے ----" جرجیس نے جھلا کر کہا۔

"روز انگریز ہے اور انگریز یورپین کہلانا پسند نہیں کرتے۔ اتنی دیر کسی اور کے ساتھ ناچ لو۔" میں نے مشورہ دیا لیکن وہ بار کی طرف چلا گیا اور جب غم غلط کر کے واپس لوٹا تو لڑکی پر برس پڑا۔ "یہ کیا حرکت تھی؟"

"حرکت ورکت کچھ نہیں تھی۔ ناچنا ہے تو چلو ناچتے ہیں، ورنہ اپنا راستہ لو۔" وہ بولی۔
جرجیس شام کو اسے چند قیمتی تحفے دے چکا تھا۔ اس لیے اپنا لہجہ بدلنا پڑا اور خوشامد شروع کر دی۔
"کاش کہ تمھیں احساس ہو تا کہ میں ہر وقت تمھیں یاد کرتا رہتا ہوں ----" "قاسم بھی یہی کہتا ہے۔" وہ بولی۔
"لیکن میں قاسم سے کہیں پہلے اٹھتا ہوں اور بہت دیر میں سوتا ہوں، لہٰذا تمھیں یاد کرنے کے گھنٹوں کا میزان کیا جائے تو میں جیت جاؤں گا ---- اور یہ قاسم ہے کون؟"
"یہ دیکھو ---- یہ آج ہی ملی ہے۔" اس نے بایاں ہاتھ سامنے کر دیا۔ ایک انگلی میں انگوٹھی چمک رہی تھی۔
"درمیانی انگلی میں انگوٹھی؟" روز حیران رہ گیا۔ "یہ انگوٹھی تو غلط انگلی میں ہے۔"
"منگنی بھی تو غلط آدمی سے ہوئی ہے ---- لیکن اگر یہی ارادہ تھا تو تم نے مجھے غلط امیدیں کیوں دلائیں؟ اور دو ہفتوں سے میرے ساتھ کیوں پھرتی رہی ہو؟"
"میں قاسم کی محبت آزما رہی تھی ---"
"اس وقت تم دو انسانوں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہو اور ان میں سے ایک تم خود ہو ----"
"جرجیس! تمھیں کوئی بے وقوف نہیں بنا سکتا ----"
وہ اسے تعریف سمجھ کر مسکرانے لگا۔
لیکن لڑکی نے بات جاری رکھی ---- "کیوں کہ تم پہلے ہی سے بے وقوف ہو۔"
ان کی تو تو میں میں شروع ہو گئی اور ہم باہر نکل آئے۔
منصور ابھی تک بحث میں مشغول تھا۔ سعدہ بھی ساتھ بیٹھی تھی۔
وہ ایک اور واقعہ سنا رہا تھا۔ "علی الصبح شہر میں ایک انقلاب آیا اور کافی غدر مچا۔ کسی ناکامیاب لیڈر کی ناکامیاب زندگی کو ختم کرنے کی ناکامیاب کوشش کی گئی۔ دوپہر کے بعد ایک اور انقلاب آیا۔ اسی افراتفری میں آدھی رات کے بعد جیل کی چھوٹی سی کوٹھری میں تین آدمیوں نے ایک دوسرے کی موجودگی کو محسوس کیا چوں کہ مکمل اندھیرا تھا اس لیے خاموش رہے۔ صبح کے دھندلکے میں انھوں نے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھیں اور گرفتاری کی وجہ پوچھی۔ ایک نے بتایا کہ مجھے اس لیے پکڑا گیا ہے کہ میں جبار بن عطار کا سب سے بڑا حامی ہوں۔ دوسرے نے کہا کہ "مجھے اس لیے قید کیا گیا کہ میں جبار بن عطار کا جانی دشمن ہوں۔" اب دونوں نے تیسرے سے پوچھا کہ آپ کی تعریف؟
"میں جبار بن عطار ہوں ----" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ "حضرات یہ ہے شہروں

کی سیاست ۔۔۔۔اگر اسے سیاست کہا جا سکتا ہے تو ۔۔۔۔"

"لیکن دیہاتی ان پڑھ ہیں ۔۔۔۔" سلیم بھنّا اٹھا "اور ان پڑھوں کو نہ اچھے برے کی تمیز ہو سکتی ہے اور سچ جھوٹ کی ۔۔۔۔"

"نہ ہمارے ہاں پولیس ہے نہ طرح طرح کے محکمے ۔ پھر بھی ایمان داری اور انصاف ہے شہری عدالت میں کوئی بڑی قسم کھا کر بھی جھوٹ بول سکتا ہے لیکن اپنے گاؤں میں عزیزوں دوستوں کے سامنے غلط بیانی کافی مشکل چیز ہے ۔ تبھی ہمارے ہاں پنچایت منٹوں میں صحیح فیصلہ کر دیتی ہے ۔ تمہاری خفیہ پولیس کی طرح نہیں کہ تین برس تک تفتیش ہوتی رہی ۔ کیس ایک محکمے سے دوسرے اور پھر تیسرے کے پاس جاتا رہا ۔ آخر فائل میں یہ فیصلہ لکھا گیا کہ پوری تحقیقات کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دال میں کچھ کالا ہے ۔"

"تمہارے امن و انصاف کے کیا کہنے ؟ کسی صحرائی نے اپنے ہمسایوں کی تعریف کی کہ بڑے نیک اور شریف ہیں ۔ جب اس سے پوچھا کہ اگر یہ درست ہے تو ہر وقت بندوق کیوں لیے پھرتے ہو ؟ ۔۔۔۔ تو کہنے لگا کہ ہمسایوں کو نیک اور شریف رکھنے کے لیے ۔ اچھا یہ بتاؤ کہ قبائلی ہر وقت بندوق کیوں لٹکائے پھرتے ہیں ؟"

"اور شہری ہر وقت پستول کیوں چھپائے پھرتے ہیں ؟" منصور نے پوچھا ۔

اتنے میں لوی زا آ گئی ۔ جر جیس اسے دیکھتے ہی بھاگا بھاگا آیا لیکن تب تک روزا اسے رقص کے لیے بڑے ہال میں لے جا چکا تھا ۔

جر جیس کو کوئی اور نہ ملا تو مجھ پر خفا ہونے لگا ۔۔۔۔ "دیکھا تم نے ؟ یہ انگریز ہر موقعے پر من مانی کرتے ہیں اور کوئی کچھ نہیں کہتا ۔ رہ گئے تم، تو تم میں مشرقیت نام تک کو نہیں ۔۔۔۔"

"کیا ہوا ۔۔۔۔؟"

"انگلش منہ مروڑ کر انگریزوں کی طرح بولتے ہو ۔ ایک لفظ پلّے نہیں پڑتا ۔ چائے انگریزوں کی طرح پیتے ہو ۔ چھوٹی سی پیالی سے آدھ گھنٹے تک کھیلتے رہتے ہو ۔ ناچتے بھی ان ہی کی طرح ہو ۔ رقص نہیں پریڈ کرتے ہو اور اپنے مشرقی ساتھیوں کا کوئی لحاظ نہیں ۔ اس لیے کہ تمہارا نظریہ حیات بھی ان ہی سے ملتا جلتا ہے ۔۔۔۔"

"یعنی ۔۔۔۔؟"

"یعنی یہ کہ میں خوب صورت یا بد شکل، نو عمر یا بوڑھی، یہاں تک کہ کالے چور کو بھی بہلا پھسلا کر لاؤں تو روزا اسے چھین کر لے جاتا ہے اور تم کچھ نہیں کہتے ۔"

"لیکن وہ ایک یا دو ڈانس کے بعد اسے واپس بھی تو لے آتا ہے ۔۔۔۔"

"مگر لے کیوں جاتا ہے ؟"

"جر جیس تمہارے نام سے نسوانیت ٹپکتی ہے ۔ ویسے بھی تم میں مردوں والی کوئی خاص

بات نہیں ہے۔ ہمارے ہاں بر جیس جر جیس جیسے نام لڑکیوں کے ہوتے ہیں۔"

لوی زا واپس آرہی تھی۔ جر جیس سرپٹ بھاگا۔

ادھر منصور اور سلیم اینڈ کمپنی کی بحث جاری تھی۔

منصور کہہ رہا تھا۔۔۔۔ "ہر ملک میں دو قسم کے باشندے ہوتے ہیں۔۔۔۔ شہری اور دیہاتی۔ یعنی کسی بھی ملک میں ایک قوم نہیں دراصل دو قومیں رہتی ہیں۔"

مجھے دیکھ کر سلیم بولا۔۔۔۔ "آپ بھی تو کچھ کہیے۔ ہند کا کیا حال ہے؟"

"ہند میں کئی صوبے ہیں اور ہر صوبے میں کم از کم چار پانچ دریا ہیں جو آپ کے دونوں دریاؤں سے کہیں چوڑے اور تیز رو ہیں۔" میں نے بتایا۔

"لیکن آپ کے ہاں نہ دجلہ ہے نہ فرات۔۔۔۔"

"اسے یہ بھی بتاؤ۔" منصور نے لقمہ دیا" کہ ہند میں جب لوگوں کو جوش آتا ہے تو جلوس نکالتے ہیں۔ کھلے میدانوں میں تقریریں ہوتی ہیں۔ پھر نعرے لگا لگا کر اور پیدل چل چل کر لوگ اتنے تھک جاتے ہیں کہ اپنے اپنے گھروں میں جاکر سو جاتے ہیں۔ یہاں کے شہریوں کی طرح نہیں کہ جب کچھ ہونا ہو تو پہلے سناٹا چھا جاتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو عجیب نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ پھر مکمل خاموشی میں دفعتہً ایسی حرکت کر بیٹھتے ہیں کہ بعد میں مدتوں پچھتاتے ہیں۔۔۔۔ صدیوں سے یہاں یہی ہوتا رہا ہے۔۔۔۔"

اچانک سب کو اس حقیقت کا احساس ہوا کہ جر جیس کو چڑھ رہی تھی۔ وہ سلیم سے تین چار مرتبہ اس طرح مل رہا تھا جیسے اسے پہلی مرتبہ دیکھا ہو۔ اب وہ سلیم سے پانچویں دفعہ بڑے تپاک سے مل رہا تھا۔۔۔۔ "آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔ میرا نام جر جیس ہے آپ کی تعریف؟"

پھر جر جیس نے ہم سب سے باری باری پہلی مرتبہ ملنا شروع کیا اور اپنا تعارف کرا کے رسمی گفتگو شروع کر دی۔

جر جیس آؤٹ ہو چکا تھا۔ محفل برخواست ہوئی۔

ہماری لاری تیزی سے واپس کیمپ کی طرف جا رہی تھی۔

موہن سرگوشیوں میں مجھے بتا رہا تھا۔۔۔۔ "خان صاحب ایک مشورہ دوں۔ جن سے ہم ابھی ملے تھے یہ لوگ یہاں رہتے ہیں اور یہیں رہیں گے۔ ہم پردیسی ہیں اور ہمیں محبت یا نفرت کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ یہ سعدہ وغیرہ من موہنی لڑکیاں ہیں لیکن آپ یہاں مسافر ہیں۔ میں کافی اونچ نیچ دیکھ چکا ہوں۔ جہاں ایک ہستی سے محبت ہوتی ہے وہاں دس بارہ آدمیوں سے خواہ مخواہ نفرت کرنی پڑتی ہے۔۔۔۔ اور نفرت نہایت ہی منحوس جذبہ ہے۔ اس سے سیدھی سادی زندگی میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ کسی انوکھے مشاہدے یا عجیب و

غریب واقعے پر کم از کم پردیس میں متعجب نہ ہوا کریں۔ غیر ملک میں جو اوٹ پٹانگ چیز نظر آئے یوں منھ پھیر لیا کریں جیسے نظری نہیں آئی۔ مجھے دیکھیں ---- میں اہنسا، شانتی، عدم تشدد، بھوک ہڑتال، آواگون، پرمودھرما، یاشاید دھرمو پرما، کا قائل ---- انگریزوں کی فوج میں بھرتی ہو کر عراق میں لڑنے مرنے کے لیے بالکل تیار بیٹھا ہوں۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟ ---- اور تیسری بات یہ ہے کہ نشہ آور چیزیں سب استعمال کرتے ہیں۔ ہندستان میں تاڑی، گانجا، افیم، بھنگ وغیرہ کھلم کھلا بکتی ہیں۔ شمالی علاقوں میں نسوار بھی اتنی ہی مقبول ہے اور ہر جگہ تمباکو جیسی مضر چیز کو عوام پان کے بہانے کھاتے ہیں۔ یہ سب نشے معاف ہیں لیکن جہاں شراب کا نام آجائے لوگ پیچھے لگ جاتے ہیں حالاں کہ دیگر منشیات کہیں زیادہ غیر سائنٹفک ہیں، اس لیے زیادہ نقصان دہ ہیں لیکن پبلک کا زلزلہ شراب ہی پر گرتا ہے۔ تان ہمیشہ یہیں ٹوٹتی ہے۔ بتائیے ایسا کیوں ہے ----؟"

موہن بھی تقریباً آوٹ ہو چکا تھا۔

ہم خیمے میں تاش کھیل رہے تھے۔ باہر ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ خیمے کا پردہ ہلا اور جرجیس جھانکنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں تصویروں کا پلندہ تھا، چال میں لڑکھڑاہٹ اور آنکھوں میں خمار۔

"اس تصویر میں ہم چاروں ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھے مسکرا رہے ہیں۔ لیکن یہ تصویر کیمپ میں لی گئی تھی۔ اگر بغداد میں اتاری جاتی تو ایک دوسرے کی کمر میں خنجر بھونکتے ہوئے نظر آتے ----"

"کیا ہوا ----؟" سب حیران رہ گئے۔

"ابھی ابھی بغداد سے آ رہا ہوں۔ جو جو باتیں سنی ہیں تم سب سے نفرت ہو گئی ہے ---- لڑکیوں سے ----"

اسے بہتیرا چپ کرانے کی کوشش کی لیکن وہ بکے گیا۔

آخر مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے وہ رقص گاہوں، ہوٹلوں میں لی ہوئی تصویریں باہر پھینک دیں ----

اس نے ہر ایک کو باری باری گھورا اور باہر نکل گیا۔

پردے سے جھانک کر دیکھا تو وہ تصویریں اکٹھی کر رہا تھا۔ ایک ایک تصویر کو جھک کر اٹھاتا، رومال سے پونچھتا اور جیب میں رکھ لیتا۔

اس واقعے کے بعد جرجیس سے بول چال ختم ہو گئی۔ اسے دیکھ کر ہم راستہ کترا جاتے۔

ایک ہفتہ گزرا، دوسرا، پھر تیسرا ----

ایک دن وہ خود آیا۔ ہمیں سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔
کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر وہ ہماری طرف دیکھ کر بڑے عجز سے کہنے لگا۔ "آئندہ جرجیس دوستوں کو کبھی نہیں آزمائے گا۔ اتنے دنوں تک یہی سوچتا رہا کہ شاید دوستوں کو میری کمی محسوس ہوگی اور وہ مجھے منالیں گے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اب میں معافی مانگنے آیا ہوں۔۔۔۔"
شاید برٹن تک اس واقعے کی اطلاع پہنچ گئی تھی۔ سینیچر کی شام کو جب ہم بغداد کے دجلے کی جگہ کیمپ کے دجلے کو تک رہے تھے تو اس نے ہمیں ڈانٹا۔۔۔۔ "کئی ہفتوں سے تم منھ پھلائے بیٹھے رہتے ہو۔ اگر ایک دوسرے کی بہبودگی کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تو نالائقو کم از کم ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا ہی لیا کرو۔"
پھر مشورہ دیا کہ "اگر ایک لڑکی کے لیے چند مرد آپس میں لڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر تین چار لڑکیاں ایک دوسری سے جل کر چار پانچ مردوں میں ناچاقی کرادیں تو قصور مردوں کا ہے۔ بعد میں یہی لڑکیاں آپس ملیں گی تو فوراً شیر و شکر ہو جائیں گی اور مرد بے وقوفوں کی طرح دیکھتے رہ جائیں گے، لہٰذا آئندہ لڑکیوں کے گروہ میں فالتو باتیں مت کیا کرو۔۔۔۔"
ساتھ ہی موسم بہتر ہو جانے کے بہانے برٹن نے سب کو ڈرل اور پریڈوں میں جوت دیا۔ شام کو تھکے ہاروں کے سامنے ورزش کی تعریفیں کیا کرتا۔۔۔۔
"اضطراب دور کرنے والی، سکون اور طمانیت کرنے والی کوئی اور شے اتنی عمدہ نہیں۔ ورزش دنیا کا بہترین ٹرانکولائزر Tranquillizer ہے اور پھر مثل مشہور ہے کہ جو کھاؤ پیو اسے جلاؤ بھی۔۔۔۔"
کبھی کبھی روز گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتا اور کہتا۔۔۔۔ "لگاتار مشقت اور پریشانی سے ایسی خستہ حالت ہو جاتی ہے کہ پتہ چلانا مشکل ہو جاتا ہے کہ آرہا ہوں یا جارہا ہوں۔۔۔۔"
ایک روز برٹن نے پوچھا۔۔۔۔ "ریگستان کی ڈیوٹی نکلی ہے۔ کون جائے گا؟"
جرجیس میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے ہاں کہہ دی اور اگلے روز نئی جگہ پہنچ گیا۔
چلنے سے پہلے منصور بولا۔۔۔۔ تمھارے جانے پر افسوس تو ہے لیکن یہ اطمینان ہے کہ کچھ نئے تجربے ہوں گے۔ فوجی زندگی کا یہ پہلو مجھے پسند ہے۔ سپاہی کا بستر ہمیشہ گول رہنا چاہیے۔ بلکہ سپاہی اور بستر دو متضاد چیزیں ہیں۔ ہمارے ہاں ایک کہاوت ہے کہ بھیڑیے نے دم دبائی اور ستائیس کوس جاکر دم لیا۔۔۔۔ غالباً اس لیے بھیڑیا ہلکا پھلکا تھا اور اس کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ کچھ دیر رہنے کے بعد معمولی سے معمولی جگہ سے بھی انس ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب کسی بہتر جگہ جانے کا موقع ملے تب بھی انسان پہلے ٹال مٹول کرتا ہے۔ جامد رہنے کے لیے بہانے تلاش کرتا ہے۔ بیش تر لوگوں کو جمود پسند ہے۔ میں نے ایسے انسان بھی دیکھے ہیں جنھیں ترقی کے زینے پر بھی گھسیٹ گھسیٹ کر زبردستی چڑھانا پڑتا ہے"۔

یہ اصلی صحرا تھا جہاں دور دور تک ویرانی تھی ۔ اوپر مٹیالا آسمان، نیچے ریت، اکے دکے جھلسے ہوئے درخت اور جھاڑیاں ۔۔۔۔ اور ہو کا عالم!

میرے ساتھ جو چند آدمی تھے وہ کئی کئی دن کام پر باہر رہتے ۔ جب کبھی لاری، راشن اور دیگر چیزیں لاتی تو کچھ رونق ہو جاتی ورنہ چاروں طرف ہولناک سناٹا تھا اور دل دوز خاموشی جو میرے لیے بالکل نئی تھی ۔

پھر آہستہ آہستہ میں صحرا اور تنہائی سے مانوس ہوتا گیا ۔ کچھ فاصلے پر بستیاں تھیں ۔ وہاں جانے لگا اور صحرا کے اصلی باشندوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ۔

تب معلوم ہوا کہ جسے میں اجاڑ ویرانہ سمجھتا رہا تھا وہاں روئیدگی کی کمی نہ تھی ۔ جہاں ریت کے تودے تھے وہاں چند فٹ نیچے اچھی بھلی زمین تھی ۔ کہیں سرخ چٹانیں تھیں تو کہیں بھوری اور کہیں سیاہ ۔ کہیں لاوے کے جمے ہوئے ڈھیر تھے تو کہیں سوکھے ہوئے نالوں ندیوں کی گزرگاہ (جسے مقامی باشندے وادی کہتے) سراب دیکھ دیکھ کر ہر نظارے سے اعتقاد اٹھ جاتا ۔ کبھی بہتے ہوئے دریا سامنے آجاتے ۔ کبھی جھیلوں کی سطح پر درختوں کا عکس نظر آتا ۔ لیکن یہ سب دور دور رہتے ۔ قریب جاؤ تو اور آگے چلے جاتے ۔ میلوں تک یہ دوڑ جاری رہتی ۔

سراب دیکھ کر نہ جانے کیوں ایک شعر یاد آجاتا (جو سراب کے بالکل الٹ ہوتا)

بحرِ ہستی ہے مری نظروں میں اِک دشت سراب
ریت کا ہوتا ہے دھوکا دیکھ کر پانی مجھے

صحرا کی لڑائیوں کو سراب اس قدر پے چیدہ بنا دیتا ہے کہ کبھی محض پانچ چھ جھاڑیاں دشمن کی پوری پلاٹون معلوم ہوتی ہیں ۔ کبھی چرتی ہوئی بھیڑوں پر دشمن کے Patrol کا گمان ہوتا ہے جہاں فقط تیس چالیس آدمی کئی سو کا جتھہ دکھائی دیتے ہیں وہاں بعض اوقات دشمن کی پوری بٹالین پانچ چھ سو گز سے بھی نظر نہیں آتی ۔

کبھی افق سے ایک سیاہ بادل اٹھتا ۔ اس سے پہلے کہ آندھی کا شبہہ ہو نصف سے زیادہ آسمان تاریک ہو جاتا ۔ کالے مرغولے، اٹھلاتے، کھیلتے، یوں آتے جیسے لاتعداد غبارے ہوا میں چھوڑ دیے گئے ہوں ۔ ان کے نیچے ریت کے ٹیلوں سے بگولے اٹھتے اور جیسے چاروں طرف ستون ہی ستون اگ آتے ۔

پھر سیٹیاں بجاتے ہوئے تیز جھکڑ، پہلے تو ان ستونوں کو منہدم کرتے اس کے بعد ان ٹیلوں کو بھی اڑا لے جاتے ۔

یہاں سے وہاں تک تیرہ و تاریک پردہ پھیل جاتا ۔ بھورے فوارے ابلتے اور ریت کی پھواریں پڑتیں ۔ آہستہ آہستہ پردہ ہٹتا تو جیسے متلاطم سمندر میں سورج کی چھوٹی سی ٹکیا تیرتی ہوئی نظر آتی ۔ ساتھ ساتھ طرح طرح کی شبیہیں اور ہیولے دکھائی دیتے ۔۔۔۔ ایک سمت میں بھاگتا ہوا

ہجوم ---- تھر تھراتی کانپتی ہوئی عمارتیں ---- زلزلے کی زد میں آیا ہوا گھنا جنگل ---- کبھی یوں لگتا جیسے ساری کائنات کانپ رہی ہے ---- کبھی ذرا سی دھند رہ جاتی ---- اور پھر سب صاف ہو جاتا۔ جیسے ابھی کچھ نظر آیا تھا، ابھی غائب ہو گیا۔

یہ شدید طوفان جس تیزی سے آتا اسی طرح اتر جاتا۔ ٹیلے، افق، سب دوبارہ دکھائی دینے لگتے اور ذرا سی دیر کے بعد سب کچھ یوں ساکن ہو جاتا کہ یقین نہ آتا کہ ابھی ابھی آندھی آئی تھی۔

ریگستان میں دن کا درجہ، حرارت ایک سو تیس پینتیس فارن ہیٹ ہو جائے لیکن راتیں بے حد خوش گوار ہوتی ہیں۔ دن بھر جانور غاروں اور بلوں میں چھپے رہتے ہیں۔ سہ پہر کے بعد جب دھوپ پیلی پڑتی ہے تو ہلچل سی مچ جاتی۔ گلہریاں جھانکنے لگتی ہیں، پرندے نکل آتے ہیں پھر سب کچھ سنہرا ہو جاتا ہے ---- ریت کے ٹیلے آسمان ڈھلتے سورج کی کرنیں ---- ہر طرف سونا برسنے لگتا ہے۔

غروب آفتاب اپنی تمام سادگی کے باوجود بے حد حسین ہوتا ہے۔ پہلے بڑی ساری چمکیلی گیند افق کی سی جھاڑی میں الجھ جاتی ہے۔ پھر یک لخت کوئی اسے نیچے کھینچ لیتا۔

اگر کوئی بھولا بھٹکا بادل مغرب سے گزر رہا ہو، تو شفق پھولتی ہے۔

اب تارے نکلتے ہیں ---- لرزتے، ٹمٹماتے، سہمے سہمے سے۔ پھر ایک ایسا مختصر وقفہ آتا ہے جس میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ شام کا دھندلکا ہے یا صبح کا اجالا ہے۔

کچھ دیر کے بعد زمین و آسمان روشن ہو جاتے ہیں۔ پہلے بڑے بڑے تارے شعلوں کی مانند ہالہ بناتے ہیں، پھر لاتعداد ننھے منے تارے خودرو پھولوں کی طرح ہر طرف نکل آتے ہیں۔

جوں جوں رات بڑھتی ہے۔ یہ جگ مگ جگ مگ کرتا چراغاں زمین سے قریب تر ہو جاتا ہے ---- جیسے ہاتھ بڑھاؤ اور تاروں کو چھو لو۔

سب تارے روپہلے نہیں ہوتے۔ کئی نیلے ہوتے ہیں۔ کئی سبز، تو کئیوں سے سرخ رنگ جھلکتا ہے۔ جب سارا صحرا آباد ہو جاتا ہے تو قسم قسم کی آوازیں آتی ہیں۔ ہر طرف زندگی ہی زندگی ہوتی ہے۔ آسمان کا نور چکنے پتھروں اور ریت کے ذروں سے منعکس ہوتا ہے اور چاروں طرف روشنیاں نظر آتی ہیں ---- ساکن روشنیاں، ٹمٹماتی، جھلملاتی روشنیاں اور کچھ ایسی قندیلیں جو بجھ بجھ کر روشن ہوتی رہتی ہیں۔

اگر چاند ہو تو چاندنی طرح طرح کے روپ دھارتی ہے۔ آج کی محزون چاندنی نے تاروں کو بھی اداس کر دیا۔ کل شوخ اور مست چاندنی تاروں سمیت نظارے پر اس طرح چھا جائے گی کہ نہ افق کی تمیز رہے گی، نہ زمین آسمان کی ---- سب مل کر ایک ہو جائیں گے۔ کسی دن چنچل سی چاندنی فضاؤں کو یوں مخمور کر دے گی کہ جامد و بے حس چیزیں رقصاں ہو جائیں گی۔ افق پر تنہا کھجور کا درخت ---- بادل کا چھوٹا سا ٹکڑا ---- ڈوبتا یا ابھرتا چاند ---- مٹیالی ابھری ابھری سی

رات اور اس کے بے نور تارے ۔۔۔۔ یہ اور کئی ایسی تصویریں ذہن میں یوں محفوظ ہو جاتی ہیں کہ مدتوں نہیں بھولتیں۔

پھر پچھلے پہر دھند سی چھا جاتی ہے۔ آنکھیں پھر سراب دیکھتی ہیں ۔۔۔۔ اسی دھند کے پیچھے کبھی برسنے والی گھٹا جھومتی ہے۔ کبھی پہاڑوں کا سلسلہ نظر آتا ہے تو کبھی آبادیاں۔

صبح کاذب کی آمد پر مشرق میں مدھم سی روشنی یوں پھیلتی ہے کہ یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ واقعی اجالا ہے یا اندھیرا کچھ دیر کے لیے کم ہو گیا ہے فوراً ہی یہ جھلک غائب ہو جاتی ہے۔ اور تاریکی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

ستارۂ صبح طلوع ہونے پر جو نور کل شام مغرب میں جا سمایا تھا اب مشرق سے ہویدا ہوتا ہے۔ ہوا کے خنک جھونکے اپنے ساتھ کبھی ریت پر جمی ہوئی شبنم کی خوش بو لاتے ہیں تو کبھی گیلے کانٹوں کی مہک۔ نسیم سحری آہستہ آہستہ سارے ستاروں کو بجھا دیتی ہے۔ ایک مرتبہ پھر صحرا میں ہلچل مچتی ہے۔ پرندے فضاؤں میں زقندیں بھرتے ہیں۔ ہرن اوس چاٹتے ہیں۔ سب جان دار دن بھر کی قید کی تیاریاں کرتے ہیں۔

کسی ٹیلے کے پیچھے سے سورج جھانکنے لگتا ہے۔ بے حد دل کش اور سہانی صبح جلوہ گر ہوتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جس نے یہ سب کچھ تخلیق کیا تھا وہ دیکھ رہا تھا۔

جب جنگلوں، پہاڑوں اور آبادیوں میں دن چڑھتا ہے اور مخلوق جاگتی ہے تو صحراؤں میں خاموشی طاری ہونے لگتی ہے۔ تپش بڑھتی جاتی ہے اور سہ پہر تک جمود طاری رہتا ہے۔

لیکن دن بھر کی کلفتوں کا انعام صحرا کی رات ہے ۔۔۔۔ ایسی رات اور کہیں نہیں آتی۔

ویرانے کو البادیہ کہتے ہیں اور جو وہاں گھومتا ہوا نظر آئے وہ لازمی طور پر البادی یا البدوی ہو گا۔ لیکن بدوؤں کو یہ نام پسند نہیں۔ وہ اپنے آپ کو عرب کہلانا پسند کرتے ہیں۔

بدو کی زندگی کافی کٹھن ہے۔ لیکن بین الاقوامی ماہرین کی رائے کے مطابق اس کی غذا نہایت قوت بخش ہوتی ہے اور اگر ان ماہرین کو عمر بھر اونٹنی کے دودھ اور کھجوروں پر گزارا کرنا پڑے تو یقیناً یہ اپنی رائے بدل دیں گے، دنیا بھر میں جتنی کھجوریں کھائی جاتی ہیں ان میں سے پچھتر فی صد دجلہ و فرات کے کنارے اگتی ہیں۔

گرمیوں میں جب صحرا تنور کی طرح دہکتا ہے تو بدو کو اتنی پروا نہیں ہوتی، لیکن سردیوں میں جب منجمد کر دینے والی ہوا چلتی ہے تو وہ بہت گھبراتا ہے کیوں کہ اس کے پاس گرم کپڑے نہیں ہوتے۔

تبھی وہ مضبوط اور سخت جان ہوتا ہے۔ کوئی بدو کمزور یا روگی ہو تو صحرا میں نہ وٹامن کی گولیاں ملتی ہیں نہ مقوی معجون ۔۔۔۔ چناں چہ جو بچپن میں بیماریوں کے حملوں کا مقابلہ کر لیں وہ واقعی توانا ہوتے ہیں۔

لوگوں کا خیال ہے کہ بدو محض تفریحاً خانہ بدوشی پر تلے رہتے ہیں۔ حالاں کہ گرمیوں میں قبیلوں کو کنوؤں، چشموں اور نخلستانوں کے گرد ضرور تا جمع ہو جانا پڑتا ہے اور سردیوں میں اونٹوں اور بھیڑوں کی خاطر چراگاہوں کا مجبوراً طواف کرنا پڑتا ہے۔

لڑائی جھگڑا عموماً گرمیوں میں ہوتا ہے۔ کیوں کہ ہر قبیلہ جانتا ہے کہ کون سا قبیلہ کہاں سے پانی لیتا ہے۔ لہٰذا اس موسم میں سردیوں کے تنازعے چکانے کا موقع ملتا ہے۔ موسم گرما بے شک تبدیل ہو جائے، لیکن بدوؤں کے لیے سرگرمیاں آفیشلی تب ختم ہوتی ہیں جب علی الصبح آسمان پر ستارۂ سہیل نظر آنے لگتا ہے سب ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہیں کہ ایک اور گرمی بہ خیر و عافیت گزر گئی۔

نومبر سے اپریل تک چراگاہوں کے چکر لگتے ہیں۔ عموماً دس بارہ دن سے زیادہ ایک جگہ نہیں رہتے۔

بدوؤں کی شاعری اور موسیقی عموماً محبت اور جنگ کے متعلق ہوتی ہے۔

مثلاً۔۔۔۔ "آدھی رات کی ہوائیں، چمکتے ہوئے ستارے مجھے جانتے ہیں۔
صبح صادق کا اجالا، تپتا ہوا سورج اور بادِ سموم مجھ سے آشنا ہیں۔
جلتی چٹانیں، اڑتی ریت اور نخلستان کا سبزہ، میرے گھوڑے کے سموں کو پہچانتے ہیں۔۔۔۔"

کبھی کبھی ایسی نظموں سے یہ پتہ چلانا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ اشعار ایک جنگ جو نے کہے ہیں یا کسی بے قرار صحرانورد عاشق نے (ویسے عشق کے سلسلے میں بھی کافی خون خرابہ ہوتا ہے) گھوڑے کی بہت تعریف کی جاتی ہے۔۔۔۔

"تیری پیشانی میدانِ جنگ کی طرح کشادہ ہے
تیری پیاری آنکھیں جواہر کی مانند چمکتی ہیں
تیری حسین گردن کے بال ریشم جیسے ملائم ہیں
تیرے کانوں کی نوکیں بالکل جڑواں بھائیوں کی سی
میرے پاس ہتھیار ہیں زرہ بکتر ہے،
مگر تو بے ہتھیار ہوتے ہوئے بھی اتنی پھرتی سے مجھے رزم گاہ میں پہنچاتا ہے۔۔۔
تو میرا گھوڑا نہیں بلکہ بھائی بھی ہے۔
حقیقت تو یہ ہے کہ تو مجھے بھائیوں سے بھی زیادہ عزیز ہے"

اور عنطارا کی وہ نظم۔۔۔۔

"وہ رہا عنطارا۔۔۔۔! دیکھو جانے نہ پائے۔۔۔۔! دشمنوں نے نعرہ لگایا اور

مجھے گھیر لیا۔۔۔۔،
کئی نیزے میرے سیاہ گھوڑے کے سینے میں اتر گئے۔
اس کی گردن اور چھاتی سے خون کے چشمے ابل رہے تھے۔
پھر بھی اس نے بار بار دشمنوں پر تابڑ توڑ حملے کیے۔
بہتے ہوئے خون نے جیسے اسے سرخ قبا پہنا دی
اور وہ بالکل نڈھال ہو گیا۔
اگلے پل پر دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور چہرے پر کرب۔
اگر وہ بول سکتا تو مجھے اپنا درد بتاتا۔
اور انسانوں کی طرح روتا۔۔۔۔!"

صحرا میں تحریری ریکارڈ یا رجسٹر نہیں رکھے جاتے۔ اس لیے اپنے نام کے ساتھ بزرگوں اور اولاد کا ذکر ابن ابو وغیرہ لگا کر کیا جاتا ہے تبھی نام لمبے ہو جاتے ہیں۔ منصور نے بتایا کہ اس کے علاقے میں عموماً پہلے بڑے لڑکے کا نام آتا ہے• پھر اپنا اور بعد میں والد کا نام مثلاً ناصر کچھ یوں کہلائے گا۔ ابو ابراہیم ناصر بن عبدالرحیم۔

بدو کافی پی کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ یہ بے حد گاڑھا، تلخ اور رقیق مادہ جانی پہچانی نارمل کافی سے بالکل مختلف ہوتا ہے اور محض دو تین گھونٹوں ہی سے طبق روشن ہو جاتے ہیں اور پھر بھوک نہیں لگتی۔۔۔۔ اور یہی دونوں کیفیتیں بدوؤں کو پسند ہیں، چناں چہ جب موقع ملے اس کافی کا دور شروع ہو جاتا ہے۔

ان کے ہاں کہاوتوں کا استعمال بہت ہوتا ہے اور کہاوتوں میں کافی بے ساختگی ہے ۔۔۔۔ "کتے کو پیٹو تو شیر دم ہلانے لگتا ہے" ۔۔۔۔ "میرے دشمن کا دشمن در حقیقت میرا دوست ہے" ۔۔۔۔ "دشمن کنویں کے قریب کھڑا ہو تو اسے فوراً اندر دھکیل دو" ۔۔۔۔ "شہروں سے بچو بابل کا مینار اس لیے تباہ ہوا تھا کہ اس کے گرد شہر آباد تھا" ۔۔۔۔ "دشمن کو ہمیشہ خوار کرو۔ اگر ابھی توفیق نہیں تو حالات ساز گار ہوتے ہی اسے ذلیل کرو۔"

کسی بات کو اہم ثابت کرنا ہو تو پہلے ایک آدھ قصہ ضرور بیان کریں گے۔
مثلاً۔۔۔۔ "کسی نے اونٹ کو بد دعا دی کہ خدا کرے تجھے چور لے جائیں۔ اونٹ بولا بے شک لے جائیں، کیا فرق پڑتا ہے؟ مجھے تو ہر جگہ محنت کرنی پڑے گی اور جو محنت کرائے گا وہ چارہ بھی دے گا۔۔۔۔! تو حضرات کچھ اسی قسم کے حالات میرے بھی ہیں۔ یعنی۔۔۔۔"

دوران گفتگو انکساری دکھاتے ہیں اور اپنے آپ کو الفقیر کہتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر مخاطب کو انھیں جنابکم کہنا پڑتا ہے۔

کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہو تو لوگ ملنے آتے ہیں اور فقط ایک فقرہ کہتے ہیں۔۔۔۔ "اللہ

تعالیٰ اگلی مرتبہ آپ پر کرم فرمائے۔"
دوسرے ملکوں کے متعلق ان کی معلومات کچھ ایسی ویسی ہی ہیں۔ مجھ سے خوش ہوتے تو اکثر دعا دیتے ۔۔۔۔
"خدا کرے تمھارا قبیلہ فتح یاب ہو اور دشمن قبیلے جلد از جلد غارت ہوں۔ تمھاری چراگاہیں اور چشمے آباد رہیں اور تمھارے اونٹوں کی تعداد ایک ہزار ہو جائے۔"
بدو اور اونٹ کی یاری بہت پرانی ہے لیکن اونٹ پاگل ہو جائے (اور سردیوں میں اکثر اونٹ تھوڑے بہت پاگل ضرور ہو جاتے ہیں) تو ساربان ارواح خبیثہ کا اثر سمجھ کر اونٹ کو زدوکوب کرتے ہیں (جو کہ بالکل غلط علاج ہے)۔
طویل سفر سے پہلے جیسے موٹر کے پٹرول، ٹائروں وغیرہ کو چیک کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اونٹ کی بھی چیکنگ ہوتی ہے۔ اس کے پاؤں ٹٹولے جاتے ہیں۔ منھ کا معائنہ ہوتا ہے۔ کھال پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔
اونٹ میں پچیس گیلن پانی سماسکتا ہے، لیکن وہ اتنا سارا پانی کبھی خوشی سے نہیں پیتا، لہٰذا خشک صحرا عبور کرنے سے پہلے اونٹ کو ڈھاکر بالٹیوں سے اس کے منھ میں پانی ڈالا جاتا ہے (اور اس کے بعد اس سے شتر غمزوں کی توقع بھی کی جاتی ہے)۔
رات کا سفر تاروں کی مدد سے ہوتا ہے۔ حدی خوانی بھی کی جاتی ہے (کہا جاتا ہے کہ رات کو جب ساربان اونٹ کے کانوں کے قریب بلند آواز میں گاتا ہے تو اونٹ خوش ہوتا ہے اور غالباً جاگتا بھی رہتا ہے)۔
بہ ظاہر اطمینان سے چلتا ہوا اونٹ دفعتہً چست ہو کر بھاگنے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ نخلستان قریب ہے۔ کیوں کہ نخلستان تلاش کرنے میں اونٹ سے بہتر گائیڈ کہیں نہیں مل سکتا تبھی وہ خود صحرا عبور کر لیتا ہے۔
ایک مرتبہ رات کے سفر پر میں نے ساربان سے پوچھا کہ کون سا ستارہ چنا ہے؟
اس نے ایسی نگاہوں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو ۔۔۔۔ "ستارہ کیسا؟ اونٹ جانے اور منزل۔ مجھ کچھ اندازہ نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔"
آسمان صاف ہو تو رات کو قطبی ستارے سے سمت معلوم ہو سکتی ہے لیکن گرد و غبار میں کچھ پتہ نہیں چلتا (اگر اونٹ ساتھ نہ ہو)۔ صحرا میں انسان دن کو بھی راستہ بھول جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ناک کی سیدھ میں چلے تب بھی۔ بدوؤں کی تھیوری ہے کہ جیسے دونوں بازوؤں کی لمبائی بالکل ایک جتنی نہیں ہوتی، اسی طرح دونوں ٹانگوں میں بھی ذرا سا فرق ہوتا ہے۔ خواہ تہائی یا چوتھائی انچ ہی کا کیوں نہ ہو چناں چہ پیدل چلتے وقت آہستہ آہستہ مقابلتہً چھوٹی ٹانگ کے رخ میں گھومتا جاتا ہے۔ اگر پانچ چھ میل میں نصف فرلانگ کا فرق بھی پڑ جائے تب بھی منزل پر پہنچنا

مشکل ہے۔

صحرا میں جگہ جگہ کھنڈر ملتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ کبھی دریا نے رخ بدل لیا، کبھی گزرتی ہوئی فوج کچھ عرصے کے لیے ٹھہر گئی، کبھی چشمے سوکھ گئے ---- اور صحرا کا ایک اور قصبہ اجڑ گیا۔ پھر آندھیاں اور ریت کھنڈرات کو یوں دفن کر دیتے ہیں کہ وہاں سے گزرنے والے کو شبہہ تک نہیں ہو سکتا کہ یہاں کبھی آبادی تھی۔ البتہ صبح اور سہ پہر کو جب سائے لمبے ہوں تو پانچ چھ ہزار فٹ اونچے اڑتے ہوئے ہوائی جہاز سے اجڑے قصبوں، شہروں کے نقشے جگہ جگہ بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن اب تو بستے ہوئے گاؤں اور کھنڈرات اس قدر خلط ملط ہو چکے ہیں کہ ایک پر دوسرے کا گمان ہوتا ہے۔ (پچھلی صدی میں ایک کشتی میوزیم کے لیے اشوریوں کے زمانے کی برآمد شدہ چیزیں لے جارہی تھی کہ دجلے میں ڈوب گئی۔ قریب کے گاؤں والوں نے دریا سے سب کچھ نکال لیا اور ان ہزاروں برس پرانے بیلچوں، کلہاڑیوں، ہلوں اور تسہاگوں کو مدتوں استعمال کیا بلکہ اپنے بنائے سامان سے انھیں کہیں زیادہ مضبوط پایا)۔

بارشوں کا مختصر سا موسم آتا ہے۔ کتنی دفعہ نیلے نیلے بادل ترسا ترسا کر چلے جاتے ہیں۔ آخر بوندیں پڑتی ہیں اور ایسی بارش ہوتی ہے کہ خشک جھلستی ہوئی وادیوں میں ندیاں بہنے لگتی ہیں۔ مدتوں کے پیاسے درخت گرد و غبار اتار کر تر و تازہ ہو جاتے ہیں۔ سوکھی زمین سے طرح طرح کی خوش بوئیں آتی ہیں۔

پانی طرح طرح کے تماشے کرتا ہے۔ کہیں مچلتے ہوئے بھنور بنائے، کہیں تالاب بنا کر ساکن ہو گیا، خار دار جھاڑیوں سے موتی ٹپکائے، یہاں آب شار گرائی وہاں دلدل بنائی اور پھر غائب ہو گیا لیکن نگاہیں سراب کی اس قدر عادی ہو چکی ہیں کہ پانی کے وجود پر یقین ہی نہیں آتا۔

بہار آتی ہے تو میلوں تک رنگ و بو کا طوفان بپا ہو جاتا ہے۔ رنگ رنگ کے خودرو پھول کھلتے ہیں۔ کہیں سے بے شمار تتلیاں آجاتی ہیں۔ نیلے پھولوں پر گلابی تتلیاں، زرد کلیوں پر قرمزی تتلیاں ---- رنگوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ رونق صرف چند ہفتوں تک رہتی ہے، پھر بھی اس مختصر سے وقفے میں جو کچھ نظر آجاتا ہے وہ سال بھر کے لیے کافی ہوتا ہے۔

بدوؤں کو ساری نباتات میں فقط کھجور سے الفت ہے۔ اس کا ذکر بڑے پیار سے کرتے ہیں کہ حضرت آدمؑ کے ساتھ بہشت سے زمین پر تین پودے آئے تھے ---- گیہوں، چنا اور کھجور اور کھجور سارے پودوں اور پھلوں میں افضل ہے اور یہ کہ کھجور کا درخت تب خوش رہتا ہے اگر اس کی چوٹی جہنم میں ہو اور جڑیں بہشت میں (ماہرین کا خیال ہے کہ اس علاقے میں جتنے درخت تھے آہستہ آہستہ سب برباد ہو گئے۔ کھجور اس لیے رہ سکی کہ یہ بکریوں اور اونٹوں کے لیے ذرا اونچی تھی)۔

ہزاروں برس سے کھجور سے آٹا، سرکہ اور نبیذ بنائے جاتے ہیں ---- نبیذ کے

متعلق مختلف روائتیں ہیں لیکن مقامی حضرات کا اصرار ہے کہ یہ قطعاً بے ضرر ہے (یعنی اگر اسی دن پیو تو کچھ نہیں کہتی لیکن چوبیس گھنٹے یا زیادہ عرصہ پڑی رہے تو پینے سے کچھ ہوتا ہے)۔

جنوبی علاقے کے ریگستان میں جھیلیں اور دلدل ہیں۔ وہاں ایسے لوگ رہتے ہیں جو سرکنڈوں، کشتیوں اور بھینسوں پر فریفتہ ہیں (انگریزوں نے ہمیشہ بھینسوں کو Water Buffalo کہا ہے ---- یعنی آبی بھینس! لیکن انھوں نے کبھی بری یا ہوائی بھینس کا ذکر نہیں کیا)۔

یہ سرکنڈے بیس سے چالیس فٹ تک اونچے ہوتے ہیں اور دلدل بے حد خطرناک ہیں۔ اوپر سے یوں لگتا ہے جیسے ریت کا معمولی ٹیلہ ہو۔ غلطی سے وہاں پاؤں پڑجائے تو پھر محسوس ہوتا ہے کہ زمین، افق اور سب کچھ اوپر کی طرف جارہے ہیں حالاں کہ انسان دھنستا ہوا نیچے کی طرف جارہا ہوتا ہے)۔

ایک دن لاری سے خط آیا جس میں میرے تبادلے کا ذکر تھا۔

واپس کیمپ پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایک یونٹ کے ساتھ محاذ پر جاؤں گا۔ روانگی کے متعلق اطلاع بغداد سے آئے گی۔ موہن نے بتایا کہ اس کے بیٹے نے دسویں جماعت پاس کرلی ہے اور بڑا اچھا خط لکھا ہے۔ اس نے لڑکے کی تصویر دکھائی ---- "والد صاحب مجھے بہت چاہتے تھے مگر جب یہ پیدا ہوا تو انھوں نے مجھے بالکل بھلا دیا۔ ہر وقت پوتے کو اٹھائے اٹھائے پھرا کرتے۔ مثل مشہور ہے کہ اصل سے سود زیادہ پیارا ہوتا ہے۔ کاش کہ یہ لڑکا مجھ سے بہتر ثابت ہو ---- منصور اور میں لمبی سیروں پر جاتے۔ وہ کہتا ---- "مجھے تم پر رشک آتا ہے کہ محاذ پر جارہے ہو۔ میں اپنی پرامن زندگی سے مطمئن نہیں ہوں۔ خطروں اور حریفوں سے نبرد آزمائی کیے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ ایسے دو یا تین تجربے ہی کافی نہیں ہوتے۔ جب موقع ملے الجھ جانا چاہیے ورنہ اپنی خامیوں کا صحیح اندازہ ہوتا ہے نہ خوبیوں کا۔ جہاں تم جارہے ہو وہاں انتظار اور تشویش سب سے بڑے دشمن ثابت ہوں گے لیکن جوں ہی پہلی گولی چلے گی تو سب کچھ بھول جاؤ گے۔ نہ ماضی یاد رہے گا نہ مستقبل۔ بس ایک دھن سوار ہوگی کہ اگر اس وقت ذرا سی چوک ہوئی تو کہیں خود اپنی نظروں میں نہ گرجاؤ۔ اگلی آزمائش مقابلتہً آسان ہوگی اور پھر ماحول کے اتنے عادی ہوجاؤ گے کہ خطرہ خطرہ نہیں رہے گا ----"

اس نے ایک واقعہ سنایا ---- "کردستان کی پہاڑیوں میں سات گڈریے طوفان میں گھر گئے۔ وہ سب ایک وادی میں تھے اور باہر نکلنے کا فقط ایک راستہ تھا جو درے سے ہوکر جاتا تھا۔ دوپہر سے شام تک درے پر بجلی کڑکتی رہی لیکن طوفان کی تیزی میں کمی نہیں ہوئی۔ سب سے زیادہ عمر کے گڈریے نے کہا کہ بجلی آج ہم میں سے کسی کی جان لے کر ملے گی۔ اس لیے یہاں

انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ باری باری وادی سے نکلیں۔ جو درہ عبور کر گیا وہ بچ جائے گا۔

قرعہ اندازی ہوئی۔ جس گڈریے کا پہلا نمبر آیا تھا وہ اپنا ریوڑ لے کر ڈرتا ڈرتا نکلا اور وادی عبور کر کے درے سے دوسری طرف چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ دوسرا گڈریا بھی کانپتا ہوا گزر گیا لیکن بجلی نہیں گری۔ تیسرا، چوتھا، پانچویں سب نکل گئے۔ پھر چھٹا لرزتا ہوا روانہ ہوا اور چلنے سے پہلے اس نے ساتویں کو خدا حافظ کہا۔ وہ بھی درے سے گزر گیا ---- بجلی پھر بھی نہیں گری۔ جب درے کو عبور کر کے وہ چھے کے چھے قہقہے لگا رہے تھے تو ساتواں موت کا انتظار کر رہا تھا۔ یکایک بجلی کڑکی۔ زور کا دھماکا ہوا ---- درے کے اس طرف چھے گڈریے مرے پڑے تھے۔ ساتواں بچ گیا۔ لہٰذا جو قسمت میں لکھا جا چکا ہے وہ نہ تو ایک لمحہ پہلے ہوتا ہے اور نہ ایک لمحہ بعد میں ---- یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔"

بغداد سے اطلاع آگئی اور میں یونٹ کے ساتھ ایک طویل سفر کے بعد محاذ پر پہنچا۔

محاذ کا پہلا تجربہ نہایت عجیب تھا۔

جب بٹالین کو حملے کا حکم ملا تو میں اور دوسرے ناتجربہ کار رات بھر جاگتے رہے اور ساری رات ہم نے پرانے سپاہیوں کے خراٹے سنے۔ صبح پانچ بجے بتایا گیا کہ حملہ دو گھنٹے کے لیے ملتوی ہو گیا ہے۔ ذرا سی دیر میں رابرٹس کے چلانے کی آواز آئی۔ دیکھا تو وہ خندق میں بڑے اطمینان سے ناشتہ کر رہا ہے۔ شور اس لیے مچا رہا تھا کہ چائے میں چینی کم تھی۔

دوپہر تک لڑائی ہوئی۔ پھر سہ پہر کو دشمن کی توپوں نے ایسی شدید گولہ باری کی دور دور تک زمین ہلنے لگی۔ چاروں طرف گولے پھٹ رہے تھے اور درمیان میں کمانڈنگ افسر ایک اونچی ٹیکری پر کھڑا پائپ پی رہا تھا۔ کبھی کبھی دوربین سے ادھر ادھر تاک لیتا۔ پھر بڑے مزے سے لمبے لمبے کش لگاتا۔

گولہ باری ہلکی ہوئی تو زخمیوں کو دیکھنے آیا بار بار گلہ کر رہا تھا کہ آج کل اچھی دیا سلائیاں نہیں ملتیں۔ پائپ سلگاتے سلگاتے آدھی ڈبیہ ختم ہو جاتی ہے۔

شروع شروع میں تو بڑی حیرت ہوئی۔ دشمن کے ہوائی جہاز بمباری کر رہے ہیں یا مارٹر چل رہے ہیں اور خندق میں فلپ بڑے انہماک سے اپنی اڈنبرا والی جائیداد کے انکم ٹیکس کا حساب لگا رہا ہے۔ ٹام ایک لڑکی کو رومان انگیز خط لکھ رہا ہے کہ تین ماہ کے بعد جو دس روز کی چھٹی ملے گی تب ملاقات کون سے شہر میں ہونی چاہیے۔ سیکنڈ ان کمانڈ بڑی حیرت سے ہمیں بتا رہا ہے کہ اسے کبھی شبہ تک نہیں ہوا تھا کہ گبسن Drunk رہا کرتا ---- حتیٰ کہ ایک دن اس نے گبسن کو Sober حالت میں جا پکڑا ---- تب یہ غلط فہمی دور ہوئی -----

لڑائی کی حدت اور شور و غل میں ایڈجوٹنٹ ایک ایک Return کو غور سے پڑھتا۔ ہجوں اور گرامر کی غلطیاں درست کر کے انھیں دوبارہ نقل کرواتا۔ میرے تجسس پر وہ مسکراتے

اور کہتے کہ بہت جلد تم بھی عادی ہو جاؤ گے۔
چناں چہ آہستہ آہستہ میں لڑائی کے میدان اور لڑائی کی آوازوں سے مانوس ہو گیا۔

کچھ عرصے کے بعد ایک اور یونٹ کے ہم راہ بغداد جانے کا موقع ملا۔
اس مرتبہ بغداد پہنچ کر یوں لگا جیسے چھوٹی سی بستی میں آگیا ہوں اور کیمپ تو بالکل ہی سنسان جگہ معلوم ہوئی۔ پرانے رفیق اب تک وہیں تھے۔ محفلیں بھی اسی طرح جمتی تھیں لیکن ان کی نوعیت میں فرق آگیا تھا۔ اب میں شریک ہوتا تھا مگر طالب علم کی حیثیت سے نہیں۔
منصور کہتا۔۔۔۔ "اب تمھیں بھی لڑائی کا تجربہ ہو چکا ہے۔ تم بھی تو کچھ بتایا کرو۔"
لیکن میں دوسروں کی باتیں سنتا رہتا۔
کیمپ میں ایک نیا چہرہ نظر آیا۔۔۔۔ سامرسٹ (جس کا ہندستانی اردلی اسے سمہ سٹ صاحب کہا کرتا۔ اردلیوں نے چند اور انگریزوں کے نام بھی رکھے ہوئے تھے۔۔۔۔ میجر میکنامارا کو میجر اللہ مارا کہا جاتا۔ لیفٹیننٹ کیلیہان، لیفٹیننٹ کالے خاں تھا اور کرنل Chelmsford کرنل چلم پھوڑ)۔۔۔۔ سامرسٹ ہر وقت منھ لٹکائے اپنے خیمے میں چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ شام کی محفل ہو یا کوئی خاص تقریب اس کے منھ سے ایک لفظ نہ نکلتا۔ جب کبھی بولتا تو فقط اپنے ماتحتوں کی شکایت کرنے کے لیے۔ اپنے ایک لیفٹیننٹ کے پیچھے تو خاص طور پر پڑا رہتا اور برٹن سے اس کی برائیاں کیا کرتا۔ ایک دن خاص طور پر اس کے برخلاف رپورٹ لکھ کر لایا اور برٹن سے کہا کہ زبانی شکایت کا تو آپ نوٹس نہیں لیتے ہیں اب اس تحریری شکایت پر تو آپ کو ضرور ایکشن لینا پڑے گا۔
برٹن مسکرانے لگا۔۔۔۔ "اس وقت میرے پاس عینک نہیں ہے۔ تم ہی پڑھ کر سنا دو۔"
رپورٹ میں درج تھا کہ یہ لڑکا اکثر گستاخی کرتا ہے۔ قدرے کام چور بھی ہے۔ ہر ہفتے دو تین مرتبہ کسی بہانے سے بغداد بھاگ جاتا ہے۔ چند مرتبہ کلب میں ہاتھا پائی پر بھی اتر آیا تھا۔ بڑا فضول خرچ ہے، تبھی مقروض رہتا ہے۔ گھڑ دوڑ کا بھی شوقین ہے۔"
"بس اتنا ہی؟ یا اور کچھ بھی کرتا ہے؟" برٹن نے پوچھا۔
"یہ کیا کم ہے؟ سامرسٹ نے چڑ کر کہا۔ "اس مرتبہ اسے ضرور سزا ملنی چاہیے۔"
"اسے کیوں کر سزا دوں جب کہ اس کی عمر میں میں اس سے بھی کہیں زیادہ الٹی سیدھی حرکتیں کیا کرتا تھا۔" برٹن نے قہقہہ لگایا۔ "ابھی لڑکا ہی تو ہے بڑا ہو گا تو زمانہ خود اسے سیدھا کر دے گا۔"
پھر برٹن نے اس گہری خاموشی اور بے زاری کی وجہ پوچھی۔ اس پر سامرسٹ کے چہرے

پر چند لمحوں کے لیے ایسی کیفیت طاری ہوئی جو کچھ کچھ مسکراہٹ سے ملتی تھی۔ اس نے بڑے فخر سے بتایا کہ چند سال پہلے وہ بالکل مختلف تھا ۔۔۔۔ موسیقی کا شوقین، رقص کا رسیا۔ سیر سپاٹے، پینے پلانے، پولو، گھڑ دوڑ اور پارٹیوں کا دلدادہ، مگر ان سب مشغلوں میں ساری تنخواہ ضائع ہو جاتی۔ آخر ایک دن اس نے ہمت کر کے توبہ کر لی اور سب کچھ ترک کر دیا چناں چہ اب اس کا بینک بیلنس کافی ہے ۔۔۔۔

"اب آپ ایک بالکل نئے سامرسٹ کو دیکھ رہے ہیں۔ جس میں ایک بھی برائی نہیں ہے۔" اس نے چھاتی پھلاتے ہوئے کہا۔

"سوائے ایک کے ۔۔۔۔ کہ اب تم مکمل طور پر نیم مردہ ہو اور تقریباً ختم ہو چکے ہو۔ ایسی توبہ کس کام کی جس سے انسان میں زندگی کی اتنی سی رمق بھی باقی نہ رہے۔ میرے خیال میں اس توبہ سے پہلے تم یقیناً بہتر انسان ہو گے اور یہ تمھیں کس نے سمجھایا تھا کہ فوج میں دولت کمانے کے لیے بھرتی ہوتے ہیں؟"

سنیچر کی شام کو بغداد جاتے تو وڈ سے ملاقات ہوتی۔ ورنہ ہفتے بھر نظر نہ آتا۔ کسی شام کو کوئی پوچھ بیٹھتا کہ وڈ نہیں آیا تو برمن کہتا ۔۔۔۔ "وہ اپنے آپ کو سکاٹ مین بتاتا ہے۔ تبھی سنیچر کی شام کی خاطر بقیہ چھ روز کنجوسی کرتا ہے۔"

وڈ کے الگ تھلگ رہنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ کیمپ میں بیش تر افسروں کا کمیشن ایمرجنسی تھا اور وہ Regular تھا۔ لہٰذا مزید ترقی اور شان دار کیریر کا مستقل خواہش مند۔ اکثر بتایا کرتا کہ جب میں بریگیڈ کمانڈ کروں گا تو یوں ہو گا۔ جب ڈویژن کا کمانڈر بنوں گا تو یہ یہ کروں گا۔

عموماً اس کی گفتگو کا آغاز سکاٹ لینڈ سے ہوتا۔ بڑے فخر سے کہتا کہ سکاٹ لوگ اتنے زندہ دل ہیں کہ اپنی شہرۂ آفاق کنجوسی کے قصے خود ہی گھڑتے ہیں۔ اس کے بعد تاریخ شروع ہوتی ۔۔۔۔ "نپولین کا قول ہے کہ بار بار دشمن سے مت لڑو، ورنہ وہ تمھاری ساری چالیں سمجھ جائے گا۔" اور "دشمن کے بارے میں برنارڈ شا نے کہا ہے کہ ہمیشہ اس کی قدر کرو کیوں کہ وہ تمھیں چست رکھتا ہے۔ نچلا نہیں بیٹھنے دیتا۔"

اتنی دیر میں نشہ چڑھنے لگتا۔ مخمور ہو کر اس کا لہجہ تلخ ہو جاتا اور بڑی طنز آمیز باتیں کرتا۔ "مشرق مشرق ہی ہے۔ یہاں کے باشندے فقط شاعری، منشیات، کاہلی اور قدیم عظمت کے سہارے زندہ ہیں۔ میں پہلی مرتبہ ہندستان گیا تو سونے چاندی کے ورقوں میں لپٹی ہوئی مٹھائیاں اور پان دیکھ کر بہت حیران ہو کر یہ لوگ ملک کا سارا سونا چاندی تو اس طرح کھا جاتے ہیں، غربت کیوں نہ ہو۔ انگریز جب ہندستان پہنچے تو باشندوں کو خون تھوکتے دیکھ کر بہت گھبرائے کہ

کیسا ملک فتح کیا ہے جہاں کا بچہ بچہ تپ دق میں مبتلا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ سب پان کی پیک تھوکتے تھے۔۔۔۔"

اس کی گستاخ باتیں دہریے پن کی غمازی کرتیں۔۔۔۔" بیش تر لوگ کسی نہ کسی مذہب کے پیرو ہیں اور اس زندگی میں نیک کام کر کے اگلی دنیا میں صلہ چاہتے ہیں۔ حضرات! کیا آپ نہیں جانتے کہ ہم سب جان دار یعنی درخت، پودے، کیڑے مکوڑے، جانور، پرندے، انسان۔۔۔۔ بالکل ایک جیسے ہیں۔ ہمیں اپنے وجود میں آنے سے پہلے کی باتوں کا کوئی علم نہیں۔ پیدائش بھی اتفاقاً ہوئی۔ ہم سب کی زندگی کی میعاد مقرر ہے۔ فنا ہوتے ہی سب جسمانی طور پر قطعاً مفقود ہو جاتے ہیں۔ لیکن آپ یہ کیوں کہتے ہیں کہ اگلی دنیا میں فقط انسان ہی کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا؟ سارے درندے، کیڑے، نباتات، پرند۔۔۔۔ یہ سب بھی کیوں نہیں جلائے جائیں گے؟ خصوصاً وہ جن کو حادثوں، قحط سالی، دباؤں اور شکاریوں نے عمرِ طبعی سے پہلے ختم کر دیا تھا۔ انسان اپنے لیے قبرستان بنا کر، قبروں پر کتبے لگا کر یہ توقع رکھتا ہے کہ فقط وہی اگلی زندگی کا حق دار ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر وہ سب جان دار بھی زندہ ہونے چاہئیں جو دنیا میں ایک مرتبہ سانس لے چکے ہیں۔۔۔۔"

"بہت اچھا۔۔۔۔" برمن ہنس کر کہتا۔ "اگلی دنیا میں وڈ کے پیچھے لگنے کے لیے دو تین شیر چند چیتے اور پانچ چھ سانپ لازمی طور پر پھر سے زندہ ہوں گے۔"

برمن کو اس کی باتیں ذرا نہ بھاتیں۔ اسے بتاتا۔۔۔۔" وڈ تمھارے چہرے پر ہر وقت بے رنگ لطافے والا اظہار رہتا ہے۔ تم اس نکمے باورچی کی طرح ہو جو ہر کھانے کو خراب کر دیتا ہو یہاں تک کہ دودھ اور Cornflakes تک کو بگاڑ کر رکھ دے۔ ہر چند تم سے دور رہ کر گزارے ہوئے یہ چھ دن اتنے خوش گوار ہوتے ہیں جیسے بحیرۂ روم کی کسی خوش نما بندرگاہ پر گزارے ہوئے کئی مہینے۔ خدا تمھارے گناہ معاف کر دے۔ لیکن تمھارا Nervous system کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوتا اور طنزیہ گفتگو جاری رکھتا۔۔۔۔" ایک اور دل چسپ بات سنیے۔ موصل کے شمال مشرق میں یزیدی بستے۔ بارھویں صدی میں ان کے شیخ نے تلقین کی تھی کہ کسی سے نفرت نہ کرو۔ یہاں تک کہ شیطان کو بھی برا بھلا نہ کہو۔ اور یہ اس پر عمل کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ فی الحال شیطان زیرِ عتاب ہے۔ کسی نہ کسی دن اسے معافی مل جائے گی، تب وہ گن گن کر بدلے لے گا۔"

"لیکن اپنے دوست وڈ کو کچھ نہیں کہے گا۔۔۔۔" برمن نے بات کاٹی۔

مگر وہ بولتا رہا۔۔۔۔" یہ یزیدی سلاد اور مولیوں سے نفرت کرتے ہیں۔"

بہت سے اور لوگوں کو جو یزیدی نہیں ہیں سلاد اور مولیوں سے چڑ ہے۔"

"پچھلے ہفتے بغداد میں روز نے ایک قالین کی قیمت پوچھی۔ پھیری والے نے پچاس پاؤنڈ مانگے۔

روز نے کہا دو پاؤنڈ دوں گا۔ تقریباً ایک گھنٹے کی بحث کے بعد پانچ پاؤنڈ پر فیصلہ ہوا۔ دراصل یہ جوڑی کا قالین تھا۔ دوسرے قالین کے لیے میں نے بھی پانچ پاؤنڈ نکالے تو پھیری والے نے خفا ہو کر کہا کہ یہ سودا تو ان صاحب سے ہوا ہے۔ آپ سے از سرِنو بحث ہوگی۔۔۔۔"

ہمیں غیر متوجہ پا کر وہ چڑ جاتا۔۔۔۔ "کچھ تو بولا کرو۔۔۔۔"

"تم درست ہی کہتے ہوگے۔۔۔۔" ہم اسے ٹالتے۔

"میں تمھیں ہم خیال نہیں بنانا چاہتا۔ بحث کرنا چاہتا ہوں۔ باقاعدہ جرح کیوں نہیں کرتے؟"

"وڈ تم ہر چیز کے خلاف ہو اور آئرلینڈ کے اس باشندے کی طرح ہو جو سمندری جہاز کے غرق ہونے کے بعد ایک تختے پر لیٹ کر بہتا بہتا تیسرے روز کسی نامعلوم جزیرے کے کنارے پہنچا۔ مقامی باشندوں نے اس کی دیکھ بھال کی تو ہوش میں آیا۔ ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اس نے پوچھا۔ "یہ کون سا ملک ہے؟ اور اگر یہاں کوئی حکومت ہے تو میں اس کے خلاف ہوں۔"

موہن بہت جھنجھلاتا۔۔۔۔ "خان صاحب، جن لوگوں کو موافق نہیں آتی وہ چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ لعنت ہے ایسے نشے پر۔۔۔۔"

وڈ بغداد جاتا تو کباڑیوں کی دکانوں کی چکر ضرور لگاتا۔ کئی گھنٹوں کی چھان بین کے بعد کوئی سستی سی کتاب خریدتا اور لائبریریوں میں جا کر ایسی کتابیں تلاش کرتا جن سے سنیچر کی شام تباہ کرنے کے لیے مواد مل سکے۔ منصور نے اسے بتایا کہ "مغرب نے مشرق سے بہت کچھ لیا ہے، اس لیے مغرب کے غیر جانب دار مصنفوں کو بھی پڑھا کرو۔ مثال کے طور پر انگلش میں عربی کے بہت سے الفاظ ہیں۔ ایڈمرل جو پرسوں کلب میں دیکھا تھا دراصل امیر البحر تھا۔ الکحل جسے پی کر واہی تباہی بکتے ہو عربی لفظ ہے۔ اسی طرح ال کیمیا، جسے اسکول میں کیمسٹری کے نام سے پڑھا تھا۔ موسیقی وہی میوزک ہے جس کی دھنوں پر ناچنے کی ناکام کوشش کیا کرتے ہو۔ یہاں تک کہ پاجامہ جو رات کو پہنو گے مشرقی لفظ ہے۔۔۔۔"

"نہیں پاجامہ تمھارا ہر جگہ نہیں ہو سکتا۔ باقی باتیں میں مان لوں گا، لیکن پاجامہ ہمارا ہے۔" اس نے جھلا کر کہا۔

لڑکیوں کے معاملے میں بھی وڈ بالکل نکما تھا۔

ایک دفعہ سڑک پر جاتی ہوئی یہودن نے اسے متوجہ کرنے کے لیے اشارے کیے، پھر مجبوراً اپنا رومال گرا دیا۔ وڈ نے (جسے زکام تھا) رومال اٹھایا۔ اس میں چھینک ماری اور ناک پر پھیر کر رومال یہودن کو بڑی حفاظت سے واپس لوٹا دیا۔

اسی طرح ایک نرس، جو نہایت مختصر عرصے کے لیے وڈ کی منگیتر رہی، اسے کھینچ کھونچ کر انگوٹھی کے سلسلے میں ایک جوہری کی دکان پر لے گئی۔ دیر تک انگوٹھیوں کا معائنہ ہوتا رہا۔ آخر ایک انگوٹھی نرس کو بہت اچھی لگی۔

"واقعی یہ تمھیں پسند ہے؟" وڈ نے پوچھا۔

"ہاں"! نرس خوش ہو کر بولی۔

وڈ نے انگوٹھی خریدی، پھر بڑے اطمینان سے اپنے انگلی میں پہن لیا۔ دکان سے باہر نکلتے ہوئے وہ آگے آگے تھا اور نرس پیچھے پیچھے۔

جرجیس پل پر کھڑی ہوئی لڑکیوں پر تبصرہ کر رہا تھا۔۔۔۔ "یہ حسین ہے مگر فربہ ہے۔۔۔۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہے۔ عینک بہت موٹے فریم کی لگا رکھی ہے۔۔۔۔ اور اسے ضرور احساس کمتری ہو گا جو اس قدر اونچی ایڑی کے جوتے پہننے پڑے اور اتنا میک اپ تھوپنا پڑا۔۔۔۔ مگر وہ جو مٹک مٹک کر چل رہی ہے واللہ خوب ہے۔۔۔۔"

"جرجیس یوں دور دور سے دل خوش کرنا بے کار ہے۔ سب سے اچھی وہ ہے جو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ساتھ ساتھ چلے۔" منصور بولا۔ اور میرا ماتھا ٹھنکا۔۔۔۔ فوراً سعدہ کا خیال آیا!

"ان دس گیارہ مہینوں میں کچھ ہوا تھا۔۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی۔۔۔۔" وہ مسکرانے لگا۔

"پھر یہ فقرہ کیسے زبان پر آگیا؟ ویسے ہمارے ہاں مثل مشہور ہے کہ ہمیشہ بھرے ہوئے میلے سے رخصت ہونا چاہیے۔۔۔۔"

منصور نے کوئی جواب نہیں دیا۔

شام کو رقص گاہ میں سب خاموش تھے سوائے جرجیس کے۔ منصور چپ تھا۔ سعدہ نظریں نیچے کیے بیٹھی تھی۔ سلیم اپنے پلے ہوئے دوستوں سمیت دو تین مرتبہ آیا لیکن ہم نے بھگا دیا۔

منصور رقص کرنے گیا تو سعدہ نے مجھ سے پوچھا۔ "ان چند مہینوں میں تمھیں فلسفی کون بنا گیا؟ کیا ہوا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں بلکہ تم اپنی بتاؤ۔ منصور سے تو ایک معنی خیز فقرہ ابھی ابھی سن چکا ہوں۔ اس کی نظریں نیچی ہو گئیں۔

پھر اس کی سہیلیاں آگئیں۔ لوئی زا نے ہتھیلی سامنے کر دی۔ "جنگل گردی اور صحرا نوردی کر کے آئے ہو، ہاتھ دیکھ کر پیشین گوئی کرو۔۔۔۔"

جرجیس سرپٹ بھاگا آیا۔ "اب پتہ چلا کہ تمھاری تکنیک کیا ہے۔ نرم اور نازک ہاتھوں

کو دیکھ چکے، سخت اور کھردری ہتھیلیاں بھی تھامو۔۔۔۔"

"جرجیس یہ لکیریں کہتی ہیں کہ خدانہ خواستہ تمھاری شادی ہوگی۔۔۔۔"

"مرحبا! کس سے ہوگی؟ اس کا نام کیا ہوگا" اس نے لوئی زا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ایک لڑکی سے ہوگی، جس کا نام مسز جرجیس ہوجائے گا۔ اور یہ کہ تمھاری شادی شدہ زندگی کے پہلے دو تین سال زیادہ خوش گوار نہیں گزریں گے۔"

"پھر۔۔۔۔؟"

"پھر تمھیں رنج و غم کی عادت پڑ جائے گا۔"

"جرجیس نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

پروگرام بنا کہ دجلے میں کشتی کی سیر کی جائے۔ چاند نکلا ہوا تھا۔ بڑی سہانی رات تھی۔ لولیتا ایک نئی لڑکی کو لائی اور مجھ سے کہا۔۔۔۔ "ہم دونوں آپ کی کشتی میں چلیں گے۔"

منصور نے بتایا کہ یہ گل نار ہے، سعدہ کی چھوٹی بہن۔ ابھی ابھی ایران سے آئی ہے۔

"اور یہ التفات اس لیے ہے۔" وہ میرے کان میں بولا "کہ ساری شام تم نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ لڑکیوں کے بھی عجیب موڈ ہوتے ہیں۔ آج خوشامد چاہتی ہیں تو کل بے رخی پر ریجھ جائیں گی۔"

جرجیس کو سواریاں نہیں مل رہی تھیں۔ لوئی زا کی منتیں کر رہا تھا۔ "انکار مت کرو۔ خدا کے لیے کچھ چاند تاروں کا ہی لحاظ کرو۔ آرٹسٹ ہوتے ہوئے بھی ایسی حسین رات سے کچھ فائدہ نہ اٹھاؤ گی؟ کیا تمھیں قدرتی نظاروں کا اتنا سا بھی پاس نہیں؟"

میں نے چپو سنبھالے۔ تھوڑی دور گئے ہوں گے گل نار نے کہا "ذرا کنارے تک چلیے۔ میں کچھ بھول آئی ہوں۔"

"واپس گئے۔ دونوں میں کھسر پھسر ہوئی اور لولیتا اتر گئی۔

میں نے چپو سنبھالے لیکن کشتی کے رخ کے متعلق ہدایتیں ملنے لگیں۔۔۔۔ اس طرف موڑیے۔۔۔۔ ذرا اس طرف چلیے۔۔۔۔ دراصل وہ چاہتی تھی کہ اس کا منھ چاند کے سامنے رہے لیکن اس طرح کشتی غلط رخ میں چلی جاتی۔

"جگمگاتے چہروں کو چاندنی کی کیا ضرورت ہے؟" مجھے مجبوراً کہنا پڑا۔

"کیا یہ صحیح ہے کہ لڑکیاں زیادہ تخیل پرست ہوتی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"صحیح تو ہے مگر درست نہیں۔"

"کیوں۔۔۔۔"

"سنا ہے کہ کچھ لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں جو جھاڑیوں میں پرندے تلاش کرنے کی بجائے کھیل شروع ہوتے ہی پتے میز پر رکھوا لیتی ہیں۔"

"یہ بتائیے کہ محبت کے لیے حسن و دل کشی کے علاوہ اور کیا کیا خوبیاں ضروری ہوتی ہیں؟"

"موقعے پر موجود ہونا نہایت ضرورت ہے۔ اگر فرصت نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا، اور ہوا بھی تو بہت دیر میں ہو گا۔"

اس نے سعدہ کا ذکر چھیڑا۔۔۔۔ "حالاں کہ وہ میری سگی بہن ہے لیکن ہم بچپن سے دور دور رہی ہیں۔ تبھی ایک دوسری کے لیے اجنبی ہیں۔ اس کے باوجود کہ وہ میری بہن ہے بھلا یہ کیسے بتاؤں کہ اسے آپ میں کوئی دل چسپی نہیں۔ سب کے منع کرنے پر بھی وہ سلیم سے ملتی ہے۔۔۔۔ اور یہ اتنی تیزی سے کہاں جا رہے ہو؟"

کنارے کی طرف۔۔۔۔"

"سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔" وہ چڑ گئی۔

"سب عورتیں بھی ایک جیسی ہوتی ہیں۔"

کنارے پر منصور بولا "جب کبھی دو بہنوں یا دو عزیز سہیلیوں سے واسطہ پڑ جائے تو عمل جانا چاہیے۔ ورنہ بڑی پے چیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ سعدہ کی نظریں تمھاری کشتی پر تھیں۔۔۔۔"

"میں اس مقولے کو جانتا ہوں اور ابھی ابھی اس پر عمل کیا ہے۔۔۔۔ لیکن جہاں تک سعدہ کی نگاہوں کا تعلق ہے وہ تمھارے لیے مخصوص ہو چکی ہیں۔۔۔۔"

"ایک کہاوت ہے کہ مرد اور عورت کی محبت کو چاند سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو گھٹتا بڑھتا رہتا ہے لیکن دوستوں اور بھائیوں کی محبت تاروں کی طرح ہے۔ اگرچہ جگمگاہٹ کم ہے [illegible] اور قابل یقین ہے۔۔۔۔" اس نے میرا کندھا تھپتھپایا۔

ایک شام کلب میں چند مہمان آئے ہوئے تھے۔ اچھی اچھی باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ آ گیا۔ سب خاموش ہو گئے۔ اس نے حسب معمول پہلے تو سکاٹ لینڈ کی باتیں کیں، جب نشہ چڑھا تو دو احمق لوگوں کا ذکر شروع کر دیا۔۔۔۔ "خلافت کے آخری دنوں میں یہاں کے حکم ران نے قسم کھائی کہ جب تک حریف ملک منگولیا کی خاک پاؤں تلے نہ روندوں گا چین سے نہ بیٹھوں گا۔ فوجی کامیابی تو کیا ہوئی تھی مگر درباریوں کی ہر روز شامت آتی۔ آخر تنگ آکر وزرا امرا نے منگولیا سے مٹی کی بیس پچیس بوریاں منگوائیں۔ یہ مٹی دربار میں بچھائی گئی جسے روند کر حکم ران مطمئن ہو گیا۔۔۔۔ ایسی ہی باتوں سے چڑ کر ہلاکو نے حملہ کیا تھا۔۔۔۔"

"اس مرتبہ بغداد سے کون سی کتاب لائے ہو۔۔۔۔؟" برٹن نے ہنس کر پوچھا۔

"تاریخ کی ایک نہایت دل چسپ کتاب ہے جس میں لکھا ہے کہ بغداد کے بستے ہی دو نئی شخصیتیں نظر آئیں۔۔۔۔ وزیر اور جلاد۔ وزیر خلیفہ اور رعایا کے درمیان کھڑا ہوا اور جلاد دربار

میں تلوار لیے منتظر رہتا۔۔۔۔"

"وزیر اور جلاد کس مغربی بادشاہ کے پاس نہیں تھے؟" برمن نے پوچھا "اور پھر مجرموں کو سیدھا بھی تو کرنا پڑتا تھا۔" لیکن وڈ کی تقریر جاری تھی۔۔۔۔ "حالاں کہ عربوں کی سلطنت بحر اوقیانوس تک پھیل چکی تھی، تاہم یورپ کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔۔۔۔"

"یورپ میں ان دنوں کچھ تھاہی نہیں۔ منصور بولا۔ "لہٰذا جاننے نہ جاننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"دسویں صدی میں جغرافیہ داں مسعودی نے لکھا کہ۔۔۔۔ شمال کے باشندے ایسے علاقوں میں رہتے ہیں جہاں سورج نصف النہار پر کبھی نہیں آتا۔ شدید سردی، نمی اور برف باری نے ان لوگوں کو گرم جوشی اور تپاک سے محروم کر دیا ہے۔ قوی الجثہ شمالی باشندے نہ لطیف جذبات سے آشنا ہیں نہ آداب گفتگو سے۔۔۔۔"

"یوں لگتا ہے جیسے مسعودی نے وڈ کی تصویر کھینچی ہے۔۔۔۔" برمن نے قہقہہ لگایا۔

"پھر گیارھویں صدی میں طلیطلہ کے قاضی نے کہا کہ یورپ کے باشندوں کے رنگ پیلے ہیں اور جسم بے ڈھنگے۔ وہ حجامت نہیں کراتے، نہ نہاتے ہیں۔ ان میں ذہانت، مستعدی، مفاہمت اور وسیع النظری کی کمی ہے اور وہ جہالت، تعصب، اور بد تمیزی کی طرف مائل ہیں۔ طلیطلہ کے قاضی کو یہ خیال نہ آیا کہ طلیطلہ سپین میں ہے اور سپین یورپ میں ہے۔ لہٰذا وہ خود بھی یورپین تھا اور ایک طرح سے اپنی ہی برائیاں کر رہا تھا۔"

"قاضی نے یہ بیان وڈ جیسے آدمیوں کو مدنظر رکھ کر دیا ہوگا۔" ایک طرف سے آواز آئی۔

برمن نے پہلے کسی مخمور کو نہیں ڈانٹا تھا لیکن اس رات غصہ ضبط نہ کر سکا اور بڑے تلخ لہجے میں بولا۔۔۔۔ "وڈ اول تو تم سکاٹ مین نہیں ہو کیوں کہ تمھارے بزرگ لگاتار جنوبی افریقہ میں رہے ہیں اور پھر تمھیں یہ علم نہیں کہ لوگ کسی دوسرے ملک کا اندازہ فقط وہاں کے ان چند باشندوں سے لگاتے ہیں جن سے اتفاقاً ملاقات ہو جائے۔ مجھے افسوس ہوتا ہے کہ تمھیں دیکھ کر یہاں کے یا کہیں اور کے رہنے والے ہم انگریزوں کے متعلق کیا سوچتے ہوں گے؟ میں جانتا ہوں کہ انسان متضاد عناصر سے بنا ہے۔۔۔۔ بے وقوفی، دانائی۔۔۔۔ بزدلی، دلیری، رذالت اور شرافت۔۔۔۔ کا مرکب ہے۔ اصل چیز ہے امتزاج۔۔۔۔ کہ ان عناصر کا توازن کیا ہے؟ اور اس کے لیے وہ خود ذمہ دار ہے۔ وہ چاہے تو اپنی خوبیوں میں اضافہ کر سکتا ہے اور برائیوں کو دبا سکتا ہے۔ خدا کے لیے تم بھی کبھی کوشش کیا کرو۔ رہ گیا تمھارا ریگولر کمیشنڈ افسر ہونا اور ترقی کے لیے بے چینی کہ جلد از جلد بریگیڈیر اور پھر جنرل بن جاؤ۔۔۔۔ اس سلسلے میں پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر کبھی کسی بریگیڈ سے تمھارا تعلق ہوا تو وہ فائر بریگیڈ سے ہوگا اور اگر کسی قسم کے جنرل بنے تو یا جنرل مرچنٹ بنو گے یا جنرل پریکٹیشنر، اور زیادہ سے زیادہ جنرل مینیجر۔ بہ ہر حال

اگر برٹش آرمی کا خاتمہ قریب ہی ہے اور انھوں نے تمھیں کسی ڈویژن کی کمانڈ دے دی تو تم یقیناً ایسے جنرل بنوگے جس کا نام صفر ہوگا۔۔۔۔"

اگلے ہفتے برمن نے ٹیلیفون کیا اور روڈ کا تبادلہ ہوگیا۔

کچھ عرصہ پھر ریگستان میں گزارنا پڑا۔ واپس کیمپ میں پہنچا تو روز نے بتایا کہ جرجیس لاپتہ ہے۔ اس کے محکمے والوں نے اسے موصل کی طرف ڈیوٹی پر بھیجا تھا۔ تب سے نہ کوئی خبر آئی نہ خط۔

مجھے یوں ہی وہم سا رہنے لگا کہ نہ جانے بے چارا کس حال میں ہوگا؟ سب کہتے کہ خواہ مخواہ فکر کرتے ہو۔ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے، وہ کہیں مزے کر رہا ہوگا۔ لیکن میری تشویش نہ گئی۔

آخر ایک دن میں روز کو ساتھ لے کر پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ اس کے گاؤں کو تلاش کیا۔ بڑی مشکلوں سے وہاں پہنچے۔ گھر تلاش کر کے آواز دی۔ سفید بالوں والی معصوم ضعیفہ باہر نکلی۔ بالکل روئی کی گڑیا معلوم ہوتی تھی۔

"آپ جرجیس کے دوست ہیں کیا؟" اس نے پوچھا۔

ہمارے ہاں کہنے پر اس نے بتایا۔۔۔ "وہ تو کتنے دنوں سے آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ ہر آہٹ پر چونک کر پوچھتا ہے کہ امی میرے دوست تو نہیں آئے؟ جب بتاتی ہوں کہ نہیں آئے تو خفا ہونے لگتا ہے کہ امی وہ ضرور آئیں گے۔ میرے دوست ایسے نہیں کہ انھیں یاد کروں اور نہ آئیں۔۔۔۔"

ضعیفہ رونے لگی۔ اس کی پُر شفقت آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو گرنے لگے۔

جرجیس اندر لیٹا ہوا تھا۔ اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ پہچانا نہ جاتا تھا۔

"دیکھا امی! میں نہ کہتا تھا کہ یہ آہٹ میرے دوستوں کی ہے۔۔۔۔"

میں نے بازوؤں کا سہارا دے کر اسے اٹھایا۔۔۔ "کیا ہوا جرجیس! میرے عزیز دوست یہ کیا حالت بن گئی؟" یقین نہ آتا تھا کہ یہ ہڈیوں کا پنجر وہی کھلنڈرا زندہ دل لڑکا ہے، جسے ہمیشہ بہتر دنوں کی توقع رہتی تھی اور اب یہ اچھی طرح باتیں بھی نہیں کر سکتا۔

اس چھوٹے سے گاؤں میں کوئی طبیب نہیں تھا۔ بوڑھی بے چاری کو جو کوئی الٹا سیدھا مشورہ دیتا اس پر عمل کرتی۔ جڑی بوٹیاں، ٹونے ٹوٹکے سب آزما چکی تھی لیکن لمبا بخار نہیں اترتا تھا۔

ضعیفہ رات بھر باتیں کرتی رہی۔۔۔ "عمر بھر کی پونجی چار بچے تھے۔ ان میں سے تین بچپن میں سدھار گئے اور خدا گواہ ہے کہ میری غفلت یا لاپروائی سے نہیں مرے جب رخصت ہوئے تو

موٹے تازے تھے پھر ان کے والد کا بلاوا آیا۔ مرتے وقت انھوں نے میری خدمت اور خلوص کا شکریہ ادا کیا اور دعائیں دیں۔ جر جیس کو جن مصیبتوں سے پالا ہے میں ہی جانتی ہوں۔ اس کی تنخواہ سے کبھی کچھ نہیں لیا۔ بلکہ اپنی محنت مشقت کی کمائی سے کچھ نہ کچھ اسے بھیج دیا کرتی کہ پردیس میں اسے کہیں تکلیف نہ ہو۔ جب سے یہ باہر گیا مجھے لمحہ لمحہ اس کا انتظار رہتا۔ اسے دیکھنے کے لیے بے قراری رہتی لیکن یہ مدتوں نہ آتا۔ اس کے پاس جاتے ہوئے ہچکچاتی۔ کہیں لوگ اس کا مذاق نہ اڑائیں کہ یہ افسر ہے لیکن اس کی ماں مزدوری کرتی ہے۔ یہ نہایت ہی اچھا بچہ تھا لیکن جب سے بیمار ہوا ہے بالکل بدل گیا ہے۔ جو کچھ اسے سکھایا تھا بھلا بیٹھا ہے۔ پہلے سچا اور نیک تھا، اب جھوٹ بولنے لگا ہے۔ بے ادبی، چغلیاں، خدا سے نہ ڈرنا ---- نئی نئی باتیں سیکھ گیا ہے ---- " اس کے پژمردہ چہرے کی جھریاں اور نمایاں ہو گئیں اور ان پر آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی رہیں۔

مصیبتیں ---- صدمے ---- بھی بھی امیدیں ---- مادرانہ خوش فہمیاں ---- صبر و تحمل ---- ایک ماں کی ساری زندگی سامنے آگئی۔

"تم تو اس کے دوست ہو، بتاؤ یہ کیوں اتنا بدل گیا ہے؟"

"بیماری بڑی ظالم چیز ہے۔ جہاں یہ جسم کو پھونکتی ہے وہاں ذہنی تبدیلیاں بھی لاتی ہے۔ خیالات اور عادتوں کو بدل ڈالتی ہے۔ ہم اسے اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں اور بہت جلد تمھارا پرانا جر جیس واپس گھر آجائے گا ---- " اسے ہسپتال لائے۔ خاصے طویل علاج کے بعد وہ تن درست ہوا تو پوچھنے لگا ---- " تمھارا شکریہ ادا کرنا تو مشکل ہے۔ دوستو کوئی حکم دو، میں بجالاؤں گا ---- "

"اب سے اپنی ماں کی خدمت کیا کرنا۔" ہم نے کہا۔

جب روز اور میں جر جیس کو لے کر گاؤں پہنچے تو ضعیفہ نے ہمیں دعائیں دیں۔

"تم نے میرا بجھتا ہوا چراغ روشن کیا ہے۔ اگلے جشنِ چراغاں میں تم دونوں کے لیے دیے جلاؤں گی اور جر جیس کی اولاد میں دو لڑکوں کے نام تمھارے ناموں پر رکھوں گی۔"

دجلے کے کنارے کرسمس منایا جا رہا تھا۔ کیمپ میں بڑی رونق تھی۔

دن میں افسروں اور سارجنٹوں کے درمیان فٹ بال کا میچ ہوا۔ مگر اس طرح کہ افسروں کے گول میں مشین گن نصب تھی اور سارجنٹوں کے گول میں بھی۔ گول کیپر ان دونوں مشین گنوں کے پیچھے مستعد تھے۔ چناں چہ کھیل ختم ہونے تک کوئی گول نہیں ہوا۔ پھر افسر سارجنٹوں کے میس میں گئے جہاں انھیں سوائے کرسمس کے، سال بھر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ اور بات تھی کہ میس ایک معمولی سا خیمہ تھا۔

شام کی روشنیاں جلائی گئیں۔ باجے بجے۔ بڑی شان دار محفل منعقد ہوئی لیکن وہ موجود

تھا۔ وہ اپنے نئے سٹیشن سے تہوار منانے آیا تھا۔

سب شور مچا رہے تھے اور وہ خاموش بیٹھا تھا۔

"وڈ منہ کیوں پھلار کھا ہے؟ ٹھیک تو ہو؟" کسی نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہوں۔"

"تو اپنے چہرے کو بھی مطلع کر دو ----"

گانے شروع ہوئے ---- سب سے جونیر افسر نے پہل کی۔ پھر منصور نے عربی کا ایک شعر گایا جس میں فضیلتاً آتا تھا۔ بعد میں اس کا ترجمہ کیا کہ ----

"کیا واقعی میرے محبوب میں دنیا بھر کی فضیلتیں اکٹھی ہو گئی ہیں؟

یا پھر میری ہی عقل ماری گئی ہے ----؟"

موہن کی باری آئی تو کچھ دیر سوچتا رہا پھر مالکوس میں یہ گایا ----

"بالک، ڈھول، پشو اور ناری ----ہیں سب تاڑن کے ادھیکاری ----

اس کے معنی بیان کیے گئے تو دیر تک تالیاں بجیں۔ سب سے زیادہ انگریز خوش ہوئے

آخر میں سب نے اصرار کیا کہ برمن بھی کچھ سنائے۔ وہ ترنگ میں تھا۔ اٹھ کر Opera کے گویوں کے انداز میں یہ نغمہ سنایا ----

"خواب میں دیکھا کہ ایک خوش نما جزیرے میں ہوں

جہاں پھول ہی پھول ہیں، خمار ہے اور موسیقی،

جہاں فقط لڑکیاں ہی لڑکیاں آباد ہیں!

تین چار سو حسین چنچل خوش گلو لڑکیاں،

اس کے باوجود مجھے بار بار رونا آتا!

کیوں کہ خواب میں میں بھی ایک لڑکی تھا۔"

اس پر پٹاخے چلائے گئے۔ غبارے چھوڑے گئے۔ جام بھرے گئے اور اگلا راؤنڈ شروع ہوا۔

کچھ دیر یہ قصے ہوتے رہے۔ موضوع بدلا اور آباؤ اجداد کے تذکرے ہونے لگے۔ نشے میں ہر ایک اپنا شجرہ کسی مشہور نام سے ملا رہا تھا۔

آخر تنگ آکر روز نے پوچھا ---- "حضرات! آپ نے Deadsea نام تو سنا ہو گا؟"

"سنا ہے ---- دیکھا ہے ---- جانتے ہیں ----" آوازیں آئیں۔

"اسے میرے دادا جان کے ماموں نے ہلاک کیا تھا ----" روز نے بڑے فخر سے بتایا۔

"وڈ خاموش ہے۔ اس سے بھی کچھ سنو ----" کسی نے فرمائش کی۔

"پروفیسر وڈ کی جگہ آج پروفیسر روز لیکچر دیں گے۔ طلبہ ٹائم ٹیبل میں ترمیم کر لیں ----" ایک طرف سے نعرہ سنائی دیا۔ روز گلاس تھامے اٹھا اور ایک میز پر چڑھ گیا۔

"میں نے بھی کباڑیوں سے کچھ بوسیدہ کتابیں خریدی ہیں لہٰذا مجھے بھی حق حاصل ہے کہ تاریخ پر گوہر افشانی کروں۔ میرا نام روز ہے۔ اس لیے کہ میرے باپ کا نام روز تھا۔ میرا مذہب بھی وہی ہے جو میرے باپ دادا کا تھا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ میں مغرب میں پیدا ہوا۔ پیدائش سے پہلے مجھ سے کسی نہ نہیں پوچھا کہ کس مذہب میں اور کس براعظم یا ملک میں جانا پسند کرو گے؟ پھر بچپن سے سننے میں آیا کہ مشرق کے باشندے کم زور اور سست ہوتے ہیں۔ وہمی اور ماضی پرست بھی ہیں۔ یہ بھی پڑھا کہ مشرق میں قالین اڑتے ہیں، رسّے سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بوتلوں میں جن نکلتے ہیں۔ ہر دوسرا شخص سادھو ہے، ہر تیسرا فقیر، ہر چوتھا علی بابا، ہر پانچواں نواب ہے یا مہاراجہ۔ چپے چپے پر سانپ سنپولیے اور شیر چیتے گھات میں رہتے ہیں۔ ہر چوراہے کے قریب خزانہ دفن ہے۔ دعا ہری خوش فہمی ہے لیکن بددعا فوراً لگ جاتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ تاثرات ان لوگوں کے تھے جنھیں ایسی باتیں لکھنے کا خاص شوق تھا۔ جو پہلے تو مشرق کے لوگوں کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے پھر واپس انگلستان یا امریکہ پہنچ کر ایسی کتابیں لکھ مارتے تھے۔ ان دنوں بھی میں نے مغربی حضرات کو فقط خاص خاص نظاروں کی تصویریں اتارتے دیکھا۔ فوٹوگرافی میں تضحیک کا پہلو ہوتا ہے۔ گرم سہ پہر کو اونگھتے ہوئے دکان دار ---- تھکے ہوئے کم زور جانور ---- کوڑے کرکٹ کے ڈھیر ---- فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا حجام ---- لولے لنگڑے اپاہج ----

غرض یہ کہ ہم فقط وہی تصویریں کھینچتے ہیں جو کھینچنا چاہتے ہیں۔ ان کی روٹی کو ملائم پلیٹ اور شلوار کو چھوٹا سا خیمہ کہہ کر ہمیں بڑی مسرت ہوتی ہے ---- کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اگر ہمارے سرسبز و شاداب ملکوں میں دن بھر تپش ہو، لو کے تھپیڑے ہوں، پیاس سے بار بار پانی پینا پڑے۔ تیز شعاعوں اور ریت کے ذروں سے آنکھوں کی چمک جاتی رہے۔ مکھیاں، مچھر، جراثیم جان کے لاگو ہو جائیں۔ ہماری روح پرور آب و ہوا بدل جائے تو کیا ہم کم زور اور سست نہیں ہو جائیں گے؟ یہاں کی چوریوں کا ذکر کرتے ہوئے ہم اپنے اخبار فروشوں کا حوالہ دیتے ہیں جو اخباروں کے ڈھیر اور سکے ڈالنے کے لیے اپنا ہیٹ سڑک پر چھوڑ کر اطمینان سے شراب خانے میں جا بیٹھتے ہیں اور کوئی اخبار نہیں چراتا۔ لیکن اگر سب کی جیبیں بھری ہوئی ہوں تو تانبے کے چند سکوں کے لیے کوئی کیوں بے ایمانی کرے گا؟ کیا وہاں ڈاکے نہیں پڑتے؟ بینک نہیں لوٹے جاتے؟ یہاں کے ظلم و تشدد پسندی کے قصے سناتے وقت وڈ جیسا مورخ بھی بھول جاتا ہے کہ انیسویں صدی کی شروع میں انگلستان میں سوا دو سو جرائم ایسے تھے جن کی سزا موت تھی ---- شلجم چرانا ---- خانہ بدوشوں سے میل جول ---- درخت کاٹنا ---- بلا اجازت شکار کھیلنا ----

ان شدید جرائم کی فہرست میں شامل تھے اور اٹھارویں صدی کے شروع میں انگلستان میں نہ پولیس

تھی نہ جیل خانے تھے۔ سن اٹھارہ سو کچھ میں سر رابرٹ پیل نے اعتراف کیا کہ جتنی وحشیانہ سزائیں انگلستان میں رائج ہیں، دنیا کے کسی اور حصے میں نہیں دی جاتیں۔ صلیبی جنگوں کو مدتیں گزر چکی ہیں لیکن ہمیں وہ شکست اب تک یاد ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں جب یروشلم فتح ہوا تو ہمارے وزیر اعظم نے ساری دنیا کے سامنے بیان دیا کہ "جو کام ہمارے سورما صلیبی جنگوں میں نہ کر سکے وہ ہم نے کر دکھایا ہے" ---- اور یہ بیان اسی صدی میں دیا گیا تھا۔ جس رفتار سے عربوں نے ملک پر ملک فتح کیے، دنیا کی عسکری تاریخ میں اس کا جواب نہیں۔ کبھی حساب لگائیے کہ کسی اور قوم نے اتنے قلیل عرصے میں کبھی اتنا وسیع رقبہ آج تک فتح کیا ہے؟ لیکن مغربی مورخ ان کارناموں کو سراہنے کی بجائے طرح طرح کے بہانے ڈھونڈتے ہیں ---- کہ سلطنت روما پہلے ہی زوال پذیر تھی۔ ہسپانیہ کے اندرونی حالات دگرگوں ہو چکے تھے۔ رچرڈ شیر دل کو وطن واپس پہنچنے کی جلدی تھی۔ باز نطینیوں کا دھیان کسی اور طرف تھا ---- اور اس پر طرہ یہ کہ ہم اپنے آپ کو اسپورٹس مین سمجھتے ہیں۔ ہم انھیں قبر پرست اور ماضی پرست کہتے ہیں۔ جنھیں صدیوں پہلے تلقین کی گئی تھی کہ بہترین قبر وہ ہے جو ہاتھ کی ہتھیلی سے مٹائی جا سکے۔ مذہب کے نام پر جنگ اور مذہبی تعصب کے الزام ان پر لگاتے ہیں جنھیں تعلیم دی گئی تھی کہ اچھا جہاد وہ ہے جو انسان اپنے نفس کے خلاف کرے۔ ہم انھیں عورتوں کی تعظیم نہ کرنے کا طعنہ دیتے ہیں جنھیں بتایا گیا کہ عورت کو کبھی ایذا نہ پہنچاؤ، یہاں تک اسے پھول تک نہ مارو۔ آخر میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ مشرقی ممالک نے کب درخواست کی تھی کہ مغربی تہذیب پھیلانے کے سلسلے میں ان پر حملہ کیا جائے؟ اور انھیں زیر کر لیا جائے؟ اب میں اپنے مورخ دوست وڈ سے درخواست کروں گا کہ میز پر تشریف لائیں اور پرانے وقعات پر روشنی ڈالیں ---- "لیکن وڈ خاموش رہا۔

موہن نے میرے کان میں کہا ---- "خان صاحب! میں نہ کہا کرتا تھا کہ وھسکی جہاں الٹی سیدھی باتیں کراتی ہے، وہاں کبھی کبھی سچ بھی بلوا دیتی ہے ----"

برٹن ریگستان سے واپس آیا تو تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ پہلے تو پاؤں میں کانٹا چبھا، پھر پاؤں سوجتا گیا۔ ٹانگ سوج گئی۔ ہسپتال جانے سے اسے نفرت تھی۔ بڑی مشکلوں سے منایا۔ بار بار یہی کہتا ---- "خدا کے لیے زیادتی مت کرو۔ میں پرانا سپاہی ہوں، آج تک ہسپتال میں نہیں لیٹا ----"

چند دنوں کے بعد میرے تبادلے کا حکم آگیا۔

برٹن سے ملنے گیا۔ اس کا بخار پہلے سے زیادہ تھا لیکن مونچھیں اور بھویں اسی طرح تنی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر تکیے کے نیچے چھپایا ہوا سگار نکالا ---- "اسے سلگا کر پیو۔ میرے لیے اس کی ممانعت ہے، کم از کم اس کی خوش بو ہی سونگھ لوں۔"

اتنی تکلیف اور نقاہت کے باوجود اس کی آواز میں وہی کرارا پن تھا۔ "مجھے قدیم چینیوں کا فلسفہ بہت پسند آیا۔۔۔۔کہ جب تک تن درست رہے ڈاکٹر کو باقاعدہ فیس دیتے رہے۔ جوں ہی بیمار ہوئے فیس بند۔ چینیوں کی ایک اور کہاوت بھی خوب ہے کہ سنی سنائی پر قطعاً بھروسا مت کرو اور جو کچھ آنکھوں کو دکھائی دے اس پر بھی فقط پچاس فی صد یقین کرو۔۔۔۔" میں نے تبادلے کا ذکر کیا۔

بہت اچھا ہوا۔ یہ اور آس پاس کا علاقہ دیکھ چکے ہو۔ جاؤ دوسرے ملک دیکھو۔ جب میں تمھاری عمر کا تھا تو تبادلے پر بڑی خوشی ہوتی تھی کہ ہیڈ کوارٹر والے مجھے بھولے نہیں۔ ایک جگہ دیر تک رہنے سے دیمک سی لگ جاتی ہے۔ جب میں چھٹی پر وطن جاتا تو دیکھتا کہ جن ساتھیوں کو گاؤں میں چھوڑ کر آیا تھا وہ کوشش کرتے کرتے شہروں میں پہنچ چکے تھے۔ ادھر شہر والے دوستوں کی سب سے بڑی یہی خواہش تھی کہ دیہات میں کوئی باغ ہو یا فارم۔ لیکن فوج میں سپاہی یہ سب جگہیں دیکھتا ہے۔۔۔۔" درد سے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ چہرے پر کرب کے آثار اور بھی نمایاں ہو گئے لیکن لبوں پر مسکراہٹ بدستور تھی۔

"ڈاکٹر نا امید ہو چکے ہیں لیکن میں موت اور اگلی زندگی کے بارے میں زیادہ نہیں سوچتا کیوں کہ مجھ سے پہلے مجھ سے کہیں بہتر اور کہیں دلیر اور اعلیٰ انسان اسی راستے سے چپ چاپ گزر گئے۔ جو کچھ ان پر بیتی ہو گی، بے شک مجھ پر بھی بیت لے۔۔۔۔"

اتنے میں ایک سرخ بالوں والی چھریری حسینہ آئی۔ برٹن کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ تھرمامیٹر سے ٹمپریچر لیا۔ نبض گنی۔ دو چار مذاق کیے اور چلی گئی۔

"یہاں لڑکیاں بہت تنگ کرتی ہیں، خصوصاً یہ گریس۔ یہ تو دس دس منٹ کے بعد آجاتی ہے۔ تبھی میں ہسپتال میں آنا نہیں چاہتا تھا۔ دراصل میں ڈاکٹروں سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا کہ نرسوں سے۔ تم ہی بتاؤ بھلا اس عمر میں چہلیں کرتا ہوا کچھ اچھا لگوں گا؟ جس دور سے یہ گریس گزر رہی ہے اس سے میں برسوں پہلے گزر چکا ہوں۔ تمھاری روانگی کب ہے؟"

"آج جانا تھا لیکن آپ تن درست ہو جائیں تب۔۔۔۔"

"نہیں۔ آج ہی روانہ ہو جاؤ اور نئی جگہ پہنچ کر ان کی دیکھ بھال کرو جو نو عمر ہیں اور جن سے ابھی امیدیں وابستہ ہیں۔ پختہ عمر والوں کے مقابلے میں ان کی اہمیت کہیں زیادہ ہے۔"

میں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا تو مسکرا کر بولا۔۔۔۔ "ہمیشہ پھرتیلے رہنا۔ جو سمارٹ نہیں وہ سولجر نہیں۔ ایک ترکیب بتاؤں۔۔۔۔ جو وردی ان دنوں پہنتے ہو اس کا ایک جوڑا کسی بکس میں محفوظ کر لو۔ ہر سال پہلی جنوری کو یہ وردی پہن کر دیکھنا۔ جب تک یہ فٹ آئی تم بھی فٹ رہو گے۔"

منصور سٹیشن پر چھوڑنے آیا۔ کچھ افسردہ سا تھا۔ پچھلے تبادلے پر اس نے کچھ اور طرح کی

باتیں کی تھیں ۔۔۔۔ میں نے وعدہ کیا کہ جب کبھی مشرقِ وسطیٰ سے گزر ا ضرور آکر ملوں گا۔
"اب تم دور چلے جاؤ گے ۔ بس بے جان خط رہ جائیں گے، لیکن تم نظر نہیں آؤ گے ۔ نئی نئی جگہوں میں نئے نئے دوست بنیں گے اور دجلے کے کنارے گزارے ہوئے یہ دن تمھیں یاد بھی نہیں رہیں گے ۔ آہستہ آہستہ خط و کتابت سست ہوتی جائے گی ۔ خطوط مختصر ہو جائیں گے ۔۔۔۔"
سعدیہ آتی ہوئی دکھائی دی ۔
منصور نے جلدی سے کہا ۔۔۔۔ "تم ناتجربہ کار ہو ۔ ایسے لمحے بڑے کٹھن ہوتے ہیں ۔ کچھ دیر کے لیے اپنا دل پتھر کا بنا لو ۔ جنگ کا زمانہ ہے ۔ ان دنوں کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہو گا اور کون کہاں جائے گا ۔۔۔۔ ہمت سے کام لو اور تم تو دوسرے محاذ پر جا رہے ہو ۔"
اور میں نے منصور کو بڑی حیرت سے دیکھا جو سعدہ کے لیے ایسے فقرے کہہ رہا تھا جن کی شاید مجھے توقع نہیں تھی ۔ سعدہ نے سلام کیا اور ایک ڈبہ دیا جس میں کھجوریں تھیں ۔
"پھر کب آؤ گے ۔۔۔۔؟" اس کے ہونٹ ہلے ۔ تل اور بھی نمایاں ہو گیا ۔
"پتہ نہیں ۔۔۔۔ شاید اب موقع نہ مل سکے ۔۔۔۔"
"کیوں ۔۔۔۔؟"
"اس لیے کہ وطن دور ہے ۔۔۔۔"
"تم وطن تو نہیں جا رہے ۔ وطن سے اور دور جا رہے ہو ۔ واپسی پر آؤ گے نا؟"
میں نے منصور کی طرف دیکھا ۔ اس نے منھ دوسری طرف پھیر لیا ۔
"جنگ کا زمانہ ہے ۔ ان دنوں کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہو گا اور کون کہاں جائے گا ۔" میں نے منصور کا فقرہ دہرایا ۔
"لیکن تم تو کہا کرتے تھے کہ جدائی کا اثر مختلف طبیعتوں پر جدا جدا ہوتا ہے ۔ وہی ہوا کے جھونکے جو ذرا ذرا سے چراغوں کو بجھا دیتے ہیں ۔ تیز آگ کے شعلوں کو کئی گنا بھڑکاتے ہیں ۔۔۔۔"
"ہاں ۔۔۔۔ یہ کسی مفکر کا مقولہ ہے ۔۔۔۔"
"جھوٹا وعدہ بھی نہیں کرو گے؟ یاد ہے نا وہ گیت؟"
گاڑی چل دی ۔

کئی برس کے بعد اتفاق پھر مجھے دجلے کے کنارے لے آیا لیکن اس دفعہ میں سیاح کی حیثیت سے آیا تھا اور قیام محض گنے گنائے دنوں کا تھا ۔
سیدھا کیمپ پہنچا ۔ جاننے والوں میں فقط چند آدمی ملے ۔ باقی کے سب جا چکے تھے ۔ برمن کے دور کا سارجنٹ میجر ابھی تک وہیں تھا اور اب مقامی زبان فر فر بولتا تھا ۔ وہ میرے ساتھ بازار

جاتا۔ جب کبھی ہمیں کوئی اوٹ پٹانگ بے مصرف چیز خرید نے کو کہتا تو وہ بڑے عجز سے "انا مسکین معافش فلوس" دہراتا۔ اس نے محاورے بھی سیکھ لیے تھے۔ کسی کو لمبی مدت کے لیے عالنا ہوتا تو بڑے اعتماد سے دونوں ہاتھ اٹھاکر بتاتا۔۔۔۔ "بقرہ المش مش!"

سڑک پر گرد اڑتی تو فوجی لاریوں کی جگہ خوب صورت بھڑکیلی کاریں نظر آتیں۔

بغداد کے دجلے میں روشنیاں اسی طرح جھلملاتیں۔ کناروں سے موسیقی کی تانیں بلند ہوتیں لیکن وہ چہل پہل رخصت ہو چکی تھی۔ شور و غل تھا لیکن قہقہے کہیں کہیں سنائی دیتے تھے۔

مجھے اپنا وعدہ یاد تھا۔ کیمپ سے شمال کا رخ کیا اور منصور کے گاؤں پہنچا۔

"دوست مجھے افسوس ہے کہ زیادہ چھٹی نہیں مل سکی۔ جلد واپس جانا ہوگا۔۔۔۔" میں نے معذرت کی۔

"ملاقات ایک دن کی بھی اچھی ہوتی ہے۔۔۔۔" وہ بہت خوش تھا۔ بار بار شکریہ ادا کرتا۔

اس کے چہرے پر تفکرات نے لکیریں کھینچ دی تھیں۔ کنپٹیوں کے بال سفید ہو چکے تھے پہلے تو مہمان نوازی میں ادھر ادھر پھرتا رہا بعد میں اس کے ساتھ کا ایک لڑکا اور لڑکی آئے۔

"میرے بچے ہیں۔۔۔۔"

"اور سعدہ کہاں ہے؟"

"پتہ نہیں کہاں ہے۔ شاید بغداد میں ہو۔ کیوں۔۔۔۔؟" اسے بڑا تعجب ہوا۔

منصور اور سعدہ کے متعلق میرا قیاس بالکل غلط نکلا۔

پرانے دنوں کی طرح سہ پہر کو ہم لمبی سیر پر نکلے۔ اس نے بتایا کہ اس کے والد اور بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔

"جس روز والد صاحب سدھارے اسی دن منصور کا لڑکپن بھی ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔ شاید اس لیے کہ سر سے سایہ اٹھ جانے کے بعد یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب اپنی باری ہے۔ وہ میرے نہایت عزیز اور گہرے دوست بھی تھے۔ تنہائی سے ڈر کر رفاقت چاہی اور شادی کی۔ پھر دو بچے چھوڑ کر وہ بھی چلی گئی۔۔۔۔"

میرے اظہار افسوس پر مسکرا کر بولا۔۔۔۔ "اور تو اور وہ سب جولانیاں بھی چلی گئیں۔

کئی مرتبہ جی چاہا کہ مرحومہ کے متعلق پوچھوں۔ کون تھی؟ کیا ہوا تھا؟ لیکن الفاظ ہونٹوں پر آکر رک جاتے۔

"کبھی کبھی مجھے اپنی زیادتیاں یاد آتی ہیں جو ان لوگوں سے کیں جو مجھ سے محبت اور شفقت کی توقع رکھتے تھے۔۔۔۔ لیکن تب محسوس تک نہ ہوتا تھا کہ یہ زیادتیاں ہیں۔"

"یاد ہے؟ بوڑھا برٹن نوعمروں کی ناتجربہ کاری کا ذکر کیا کرتا تھا۔۔۔۔" میں نے بتایا۔

" میرے خیال میں یہ تجربے کی کمی نہیں احساسات کی کمی تھی۔ حال ہی میں میں نے ایک بڑھیا کو دیکھا جو سردی سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے گرم کپڑا دیا تو عجز سے بولی۔ نہیں مجھے کوئی سستا سا پھٹا پرانا ٹاٹ دے دو۔ میرے اصرار پر کہنے لگی گرم کپڑے تو خوش نصیب پہنتے ہیں۔ میرے لیے ٹاٹ ہی بہت ہے۔ میں تھرا اٹھا۔ پہلے بھی ضرورت مندوں کو دیکھا تھا، بلکہ انھیں دیکھے بغیر قریب سے گزرا تھا، لیکن اب کسی ضعیف محتاج کو دیکھتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ اس میں اور مجھ میں کوئی فرق بھی تو نہیں ۔۔۔ اور اچھے دن بدلتے ہوئے کوئی دیر نہیں لگتی۔ شکار کا شوق بھی نہیں رہا۔ کبھی کبوتروں کے جھرمٹ یاد آتے ہیں۔ میں فائر کرتا جو چھروں سے بچ جاتے وہ اپنے زخمی اور مردہ ساتھیوں کے اوپر منڈلانے لگتے اور اگلے فائر کی زد میں آجاتے۔ کبھی کبھی بے شمار آنکھیں سامنے آجاتی ہیں ۔۔۔ ہرنوں کی پتھرائی ہوئی آنکھیں جن سے آنسو نکل رہے ہوں ۔۔۔ پرندوں کی متحیر آنکھیں ۔۔۔ جانوروں کی دہشت زدہ آنکھیں ۔۔۔ کچھ ایسی جیسے معصوم بچوں کی آنکھیں ہوں اور پوچھ رہی ہوں کہ میں نے کیا قصور کیا تھا؟ ۔۔۔ قطار در قطار یہ آنکھیں سامنے سے گزر جاتی ہیں۔"

ہم پتھر پر بیٹھ کر غروبِ آفتاب دیکھنے لگے۔

شاید اس نے میرا تجسس بھانپ لیا تھا ۔۔۔ " تم بالکل نہیں بدلے۔ آج تک تم نے کوئی ایسی بات نہیں پوچھی جس کے بتانے میں مجھے کوئی ہچکچاہٹ ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ بچوں کی خاطر دوسری شادی کر لو لیکن میں اس مخلص اور وفادار رفیق کو کیسے بھلا دوں جس نے میرے جھوٹ کو بھی سچ مانا۔ ہمیشہ میری ضد، لاپرواہی اور تلخ رویے کو ادائے دلبرانہ سمجھا۔ جس کی نگاہوں میں مجھ سا کوئی اور زمانے بھر میں نہیں تھا۔ اس کی علالت طویل ہوتی گئی۔ میں کچھ دیر پاس بیٹھتا تو کہتی جاؤ کسی سے مل آؤ، کہیں سیر کر آؤ، جی بہلے گا۔ مرنے سے دو روز پہلے اس نے میرے سارے کپڑے قرینے سے رکھوائے، ملازم کو تاکید کی کہ بغیر ناشتے کے مجھے کبھی باہر نہ جانے دے۔ پھر مجھ سے درخواست کی کہ اگر اس سے کوئی غلطی ہو گئی تو معاف کر دوں۔ مجھے یقین سا ہو جاتا ہے کہ وہ ان دونوں بچوں میں زندہ ہے ۔۔۔"

میں نے بیماری کے متعلق پوچھا۔

" ان دیہاتوں میں طبیب بہت کم ہیں۔ عطائی، مریض کی خوش فہمی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ غلط علاج سے موت واقع ہو جائے تب بھی عزیز و اقارب عطائی کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے پوری کوشش کی تھی لیکن تقدیر میں یوں ہی لکھا تھا ۔۔۔ تبھی میں اپنے بچوں کے متعلق سوچتا رہتا ہوں کہ جہاں انھیں تعلیم دینی ہے وہاں انھیں تن درست بھی رکھنا ہے۔ کہیں اپنی مرضی کے خلاف میدانوں میں نہ جانا پڑ جائے ۔۔۔"

پھر اس نے دوسرے محاذ کے تجربے کے بارے میں پوچھا۔

"پہلے تجربے سے ملتا جلتا تھا۔۔۔۔"

"اب تم ملک ملک پھر آئے ہو، بحث مباحثوں میں حصہ لیتے ہو گے؟"

"نہیں۔۔۔۔"

"موہن کو بھی یہی شکایت تھی کہ تم اپنی رائے چھپا جاتے ہو۔۔۔۔"

میں سوچ رہا تھا کہ میں نے دنیا ضرور دیکھی تھی لیکن زندگی کی بھٹی اسے کندن بنا رہی تھی۔ میرا ہم سفر مجھ سے بہت آگے نکل چکا تھا۔

"کبھی ضرور بتاؤں گا۔۔۔۔ وعدہ رہا۔" میں نے کہا۔

آفتاب غروب ہو گیا۔ آسمان شفق سے جگمگانے لگا۔

"زندگی کے رنج و الم کے متعلق کسی مدبر نے کہا تھا کہ اگر دن کے اختتام پر اداس پیلے بھورے مٹیالے بادل افق پر نہ ہوں تو غروب آفتاب رنگین کیوں کر ہو گا۔۔۔۔"

صبح صبح مجھے رخصت کرتے وقت اس نے دور میدانوں کی طرف اشارہ کیا۔۔۔۔ "شاید میں ان پر شور آبادیوں میں جا بسوں اور کچھ عرصے کے بعد ان لوگوں جیسا ہو جاؤں۔۔۔۔ تب ملے تو شاید تم منصور کو پہچان نہ سکو گے۔۔۔۔"

میں روانہ ہوا تو آسمان میلا سا تھا جیسے آئینے پر کئی دنوں کی گرد جمع ہو۔ دھندلاہٹ بڑھتی گئی۔ پہاڑیاں ختم ہوئیں تو زرد دھند چھا گئی اور سہ پہر شام میں تبدیل ہو گیا۔

"آندھی آنے والی ہے۔۔۔۔" ڈرائیور بولا۔

دیکھتے دیکھتے سب کچھ تاریک ہو گیا۔ موٹر کی روشنی فقط چار پانچ فٹ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ ہم سڑک پر بالکل آہستہ آہستہ جا رہے تھے۔ پھر دم گھٹنے لگا۔

"باد سموم معلوم ہوتی ہے۔۔۔۔" ڈرائیور نے بتایا۔

موٹر روک کر ہم دونوں نے منہ سر لپیٹ لیا۔ تیز جھکڑوں کے ساتھ ساتھ جھاڑیاں، گھاس پھونس، کنکریاں، نہ جانے کیا کیا اڑا جا رہا تھا۔ اتنی تیز ہوا کے باوجود سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔

کافی دیر میں آندھی کی شدت کم ہوئی اور ہم روانہ ہوئے لیکن تھوڑی دور جا کر معلوم ہوا کہ راستہ بھول گئے ہیں۔ کچے پکے راستے پہلے ہی اٹ چکے تھے۔ ہم صحرا میں اندھا دھند چکر لگا رہے تھے۔

گھڑی دیکھی تو نو بجے تھے۔ اس وقت ہمیں کیمپ میں ہونا چاہیے تھا۔ پھر ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شاید ہمارا رخ غلطی سے پہاڑیوں کی طرف بدل چکا تھا۔ سوچا کہ اب کہیں ٹھہرنا چاہیے۔

دور ایک روشنی نظر آئی۔ قریب پہنچے تو دو لمبی لمبی کاریں کھڑی تھیں۔ جن کے شیشے

ہماری موٹر کی روشنی سے چمک رہے تھے۔ سامنے چھوٹا سا مکان نظر آیا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا آوازیں دیں۔

کواڑ کھلے اور ایک گول مول چہرہ نظر آیا۔ جلتی ہوئی موم بتی ہوا کے جھونکے سے بجھ گئی۔

اسے دوبارہ روشن کیا گیا تو دو چہرے اور دکھائی دیے۔

جس نے دروازہ کھولا تھا اس کے دو ساتھی فرش پر بوتلیں تھامے بیٹھے تھے۔ وہ تینوں تقریباً ایک سے تھے۔ پھولے ہوئے جسم اور موٹے موٹے نقش۔

ڈرائیور نے مجھے چائے کی تھرماس اور سینڈوچز کا تھیلا دے دیا اور خود موٹر میں جا بیٹھا۔

باہر آندھی پھر شروع ہو چکی تھی۔ جھونکے تیز ہوتے تو ان تینوں کی باتیں ہوا کی سیٹیوں اور چیخوں میں گم ہو جاتیں۔۔۔۔۔ اس عجیب ماحول میں وہ غول بیابانی معلوم ہو رہے تھے۔

انھوں نے بہت سارا کھانا نکالا۔ میری طرف بھی دیکھا لیکن میں نے سینڈوچز نکال لیں۔

تقریباً سوا ڈیڑھ گھنٹے تک وہ بے تحاشا کھاتے رہے۔ پھر نئی بوتلیں کھول کر باتیں شروع کر دیں۔ وہ جلدی جلدی بولتے اور بار بار قہقہے لگاتے۔

کچھ آندھی کا شور، کچھ ان کا۔۔۔۔ ان کی گفتگو اچھی طرح سمجھ نہ سکا لیکن بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک جو اپنے بھتیجے کا واحد نگران تھا کہہ رہا تھا کہ وہ لڑکے کا لاکھوں کا بیمہ کرا چکا ہے اور لڑکے کو دانستہ طور پر خطرناک کام دیے جاتے ہیں، پُرخطر جگہوں پر بھیجا جاتا ہے۔ لیکن ابھی تک کچھ نہیں ہوا۔ تھوڑے انتظار کے بعد مجبوراً اس سے وہی سلوک کرنا پڑے گا جو اس کے بھائی سے پہلے کیا جا چکا ہے۔ یہ بتا کر وہ زور سے ہنسا۔

دوسرے نے یتیم خانوں اور ایسے دیگر منافع بخش اداروں کی باتیں کیں۔ دولت اور شہرت کے سلسلے میں امیر عورتوں اور بیواؤں کو ورغلانے کے قصے سنائے۔ جعلی دستخطوں، جعلی معاہدوں، مصنوعی دوستیوں، عارضی شادیوں اور دیگر چالوں کے متعلق بتایا۔

میں تھکا ہوا تھا۔ دیوار کے سہارے اونگھنے لگا۔

پھر جیسے خراٹوں نے چونکا دیا۔

آندھی کا شور ختم ہو چکا تھا۔ دروازہ کھولا تو چاندنی اندر آ گئی۔ باہر سب کچھ ساکن تھا۔ آسمان چاند تاروں سے جگمگا رہا تھا۔ چاندنی میں وہ تینوں نظر آ رہے تھے۔ ان کے منھ کھلے ہوئے تھے۔ سانس لیتے تو توندیں پھول جاتیں۔ سانس نکلتا تو بڑی بھیانک آواز آتی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے تین مردہ جسم شدید عذاب میں مبتلا ہوں۔

باہر نکل کر دیکھا تو دور تک قبریں تھیں۔ آندھی سے بچ کر جہاں پناہ لی تھی وہ اس قبرستان کی کوٹھری تھی۔ دفعتہً آنکھوں کے سامنے محاذ کا ایک نظارہ کوند گیا۔

محاذ پر ایک قبرستان بمباری کی زد میں آ گیا۔ دھماکوں کے ساتھ قبریں کھل گئیں۔

مردے دور دور جا پڑے۔ کچھ دیر کے بعد جگہ جگہ لاشیں پڑی تھیں۔ کچھ ان سپاہیوں کی تھیں جو ابھی ابھی مرے تھے، کچھ برسوں پرانی تھیں۔ نئی پرانی لاشیں، زخمی اور بے ہوش، سب آپس میں الجھے ہوئے پڑے تھے۔

موت کیسے کیسے روپ بدل کر آتی ہے؟ کبھی پہلے بیماری بھیج کر جسم کو اچھی طرح بھسم کر دیتی ہے، کبھی بے خبری میں آن دبوچتی ہے، کبھی ایذائیں دے کر ترسا ترسا کر جان لیتی ہے لیکن سب سے ذلیل موت وہ ہے جو زندہ جسم میں یوں حلول کر جاتی ہے کہ سانس آتا رہتا ہے، حواس درست رہتے ہیں، لیکن دل و دماغ مرجاتے ہیں، ضمیر مرجاتا ہے ---- انسانیت مرجاتی ہے۔ قبرستان کی یہ تین زندہ لاشیں بھی طبعی موت سے پہلے مرچکی تھیں۔

دور افق پر روپہلی لکیر کھنچی ہوئی تھی ---- یہ دجلہ تھا۔

میں اس سمت میں چلتا گیا حتیٰ کہ کنارا آگیا۔ دریا کی شفاف سطح پر تاروں کا عکس جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ پانی یوں ساکن تھا جیسے لہروں اور گرداب سے ناآشنا ہو۔ ہلکی ہلکی دھند اٹھ رہی تھی۔

دوسرا کنارا اوجھل ہو گیا۔ چاند بے نور ہو کر چھپنے لگا۔ نظارہ سمٹتے سمٹتے محدود ہوتا گیا اور میں ایک چھوٹے سے جزیرے میں رہ گیا۔ مشرق سے روشنی پھیل رہی تھی۔ خشک ہوا کے جھونکے آئے، طیور چہچہانے لگے۔

تخلیق تو روشنی، زندگی، رنگ و بو اور لطافتیں لے کر آئی تھی۔ انسان سے ہم دردی، پاکیزگی اور حسن و نفاست کی توقعات تھیں۔ دریا خشک ویرانوں کو سیراب کرنے کے لیے بہائے گئے تھے ---- پھر کیا ہوا کہ صدیوں سے ان کا پانی کبھی انسان کے خون سے سرخ ہوا ہے، کبھی کتابوں کی سیاہی سے گدلا بہا ہے اور ان کے کناروں نے ہریالی کی جگہ مایوس کن نظارے دیکھے ہیں۔

میں واپس پہنچا تو لمبی لمبی کاریں جا چکی تھیں۔ کوٹھری خالی تھی۔ ایک طرف چبائی ہوئی ہڈیاں پڑی تھیں، دوسری طرف خالی بوتلیں ----

ڈرائیور میرا انتظار کر رہا تھا۔

بغداد میں سعدہ سے ملنے اس کے گھر گیا۔ اس نے سادے کپڑے پہن رکھے تھے۔ بال بکھرے ہوئے، ننگے پاؤں، میک اپ کے بغیر ---- اس حلیے میں وہ چھوٹی سی لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔

"اسکول سے آئی ہو؟ تمھارا بستہ کہاں ہے؟"

وہ ہنسنے لگی ---- "میں تو اسی طرح رہتی ہوں۔ آرائش سے مجھے نفرت ہے۔ ان دنوں

پارٹیوں دعوتوں کے لیے مجبوراً بننا سنورنا پڑتا تھا۔۔۔۔"

میں نے منصور کا ذکر کیا۔

"وہ بھی چلا گیا۔۔۔۔دوسرے بھی چلے گئے۔۔۔۔"

"لیکن میں تو سمجھتا تھا کہ منصور اور تم۔۔۔۔"

"منصور سے میرا کوئی واسطہ نہیں تھا۔۔۔۔"

پرانے ساتھیوں کے متعلق پوچھا۔ اس نے بتایا کہ برٹن نے گریس سے شادی کر لی تھی جو اسے زبردستی اپنے ساتھ آسٹریلیا لے گئی۔ جب برٹن تن درست ہو کر ہسپتال سے نکلا تو اسے خود بھی علم نہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ مگر مہینے کے اندر اندر شادی ہو گئی۔ اس کا جوان بھتیجا قاہرہ سے تقریب میں شرکت کرنے آیا تو کئیوں نے مغالطے میں اسی کو دولہا سمجھا۔ موہن اپنے لکھ پتی خسر کے انتقال پر چھٹی لے کر ہندستان گیا۔ واپس آیا تو اور بھی غم گین تھا۔ خسر اتنا مقروض نکلا کہ ساری دولت قرضوں کی ادائیگی میں ختم ہو گئی۔ موہن کو امید تھی کہ بیوی کے سر سے امارت کا بھوت اتر چکا ہو گا لیکن مفلسی میں بھی بیوی کا رویہ انتہائی تلخ تھا۔

جرجیس بڑے مزے میں ہے۔ کہیں جا رہا تھا کہ موٹر الٹ گئی۔ اتفاق سے جس نے ترس کھا کر تیمارداری کی وہ بڑے مال دار شخص کی اکلوتی بیٹی نکلی۔ ترس دوستی میں تبدیل ہوا اور دوستی محبت میں۔ آخر لڑکی کے باپ نے جرجیس کو بیٹا بنا کر لڑکی اور دولت اس کے حوالے کر دی۔ اب وہ دوستوں اور جاننے والوں کو خوب قرض دیتا ہے۔ چند مہینے ہوئے بازار میں مل گیا، بار بار پوچھتا تھا کہ قرض لو گی؟ ان دنوں کسی بین الاقوامی کانفرنس میں شریک ہونے یورپ گیا ہوا ہے۔ روز نے ولایت پہنچ کر بزنس شروع کی تھی۔ بڑے فارمولے لگائے۔ ساری ریاضی صرف کر دی، لیکن کچھ نہ ہوا اکثر جواب غلط نکلے۔ آخر بزنس چھوڑنی پڑی اور ان دنوں کسی اسکول میں حساب پڑھاتا ہے۔ جرجیس نے بتایا تھا کہ وڈ اس قدر مذہبی ہو گیا ہے کہ سب محلے والوں کی زندگی تلخ کر رکھی ہے اور یہ کہ اس نے جرجیس سے تمھارا اور روز کا خاص طور پر ذکر کیا تھا کہ اگر وہ کہیں اتفاق سے مل جائیں تو بتانا کہ اب میں یہ خوبی سمجھ چکا ہوں کہ خالق نے جس صناعی سے انسانی جسم بنایا ہے اس کی تعریف ڈاکٹر زیادہ اچھی طرح کر سکتے ہیں اور یہ کہ جس ہنرمندی سے کائنات اور نظامِ شمسی کو ترتیب دیا گیا ہے یہ کسی عظیم ریاضی دان کا کام ہی ہو سکتا ہے۔"

"اور سلیم۔۔۔۔؟"

"سلیم کروڑپتی ہے اور پہلے سے کہیں فربہ۔۔۔۔"

"اور تم۔۔۔۔؟"

"سلیم اور دوسرے اکثر مجھ سے جذباتی قسم کی باتیں کیا کرتے۔ لیکن میں جانتی تھی کہ ان جذبات کی تہہ میں تنہائی کارفرما ہے یا شراب کا نشہ۔ تم بتاؤ، تمھارے ہونٹوں سے کبھی ایک لفظ

تک نہ نکلا۔۔۔؟"

"نہ احساسِ تنہائی تھا، نہ نشے کی ضرورت محسوس ہوئی۔۔۔۔"
"کوئی ہے جس نے تمھاری قوتِ گویائی سلب کر رکھی ہے؟"
"کوئی بھی نہیں۔۔۔۔سچ سچ۔۔۔۔!"
"اب بھی سوچ رہے ہو۔۔۔۔ کچھ تو کہو۔"
"یہی سوچ رہا ہوں کہ کبھی مشاہدے میں غلطی ہو جاتی ہے۔ کبھی فکر اور عمل میں مطابقت نہیں رہتی تو کبھی نظریے بھٹکنے لگتے ہیں۔۔۔۔"
دیر تک خاموشی رہی۔
سلیم کا ذکر پھر آگیا۔ وہ افسردہ آواز میں بولی۔۔۔۔ "جس سے واقفیت رہ چکی ہو اسے کیا برا بھلا کہنا۔ میں نے تو اوروں کے خلاف بھی ایک لفظ تک نہیں کہا۔ بس اندھیرے میں کبھی کبھی جگنو سے چمکتے تھے۔ چنگاریاں بھڑکتی تھیں اور بجھ جاتی تھیں۔"
اگلے روز مجھے اسٹیشن پر چھوڑنے آئی۔
"یاد ہے یہی پلیٹ فارم تھا، یہی وقت تھا۔ تب تم نے جھوٹا وعدہ تک نہ کیا اور اب تو تم وطن جا رہے ہو۔۔۔۔"
ٹرین چلنے لگی۔
"میں تمھیں بصرے سے خط لکھوں گا۔۔۔۔"
"سب یہی کہتے تھے۔ کسی نے دجلے کے کناروں سے خط نہ لکھا۔ بصرے سے تو سمندر شروع ہو جاتا ہے۔۔۔۔"
بصرے میں دریا کے کنارے ایک دکان سے چند کارڈ لیے جن پر دجلے کی رنگین تصویر تھی۔ ان پر سعدہ، منصور اور پرانے ساتھیوں کے پتے تحریر کیے، ٹکٹ لگائے، سوچنے لگا کیا لکھوں؟

کئی فقرے ذہن میں آئے لیکن قلم ساکن رہا۔ سٹیمر کی روانگی میں فقط چند منٹ رہ گئے تھے۔۔۔۔
دفعتہً حکیم بقراط کا وہ مقولہ یاد آگیا۔۔۔۔
زندگی محدود ہے اور علم و ہنر لامحدود۔ مواقع تیزی سے گزرے جا رہے ہیں، تجربہ خام ہے اور صحیح نتیجے پر پہنچنا بہت مشکل!

○ ○ ○

آلِ احمد سرور

نیر مسعود

مغنی تبسم

شان الحق حقی

حمید نسیم

ضیا جالندھری

مرزا نجیم بیگ چغتائی

آفتاب احمد خاں

شفیق فاطمہ شعریٰ

سید محمد اشرف

انور خاں

عرفان صدیقی

مسعود الحق

چودھری محمد علی ردولوی

جمال اویسی

خالد سعید

- کچھ لوگ ایسے ہیں ، خصوصاً شمالی ہند کے ، جو مدد نہ کریں گے ، مگر دوسروں کے کام پر اعتراض ضرور کریں گے ۔ "سوغات" کے ذریعے آپ جو کام کر رہے ہیں وہ یادگار رہے گا ۔ آپ کا انٹرویو آپ کے کھرے پن کو ظاہر کرتا ہے ۔ "

آلِ احمد سرور

"سوغات" کا نیا شمارہ مل گیا ۔ اس میں کلیم الدین احمد صاحب کے مضمون کے متعلق آپ نے لکھا ہے کہ "معاصر" کے علاوہ کہیں نہیں چھپا ۔ یہ مضمون میری فرمائش پر کلیم صاحب نے شعبہ ، اردو کے "فکشن" کے سمینار کے لیے لکھا تھا ۔ یہ سمینار ۱۹۷۳ء میں ہوا تھا اور اس کی روداد ۷۴ء میں شائع ہوئی ۔ کلیم صاحب خود نہیں آئے تھے ، مضمون بھجوایا تھا ۔ اس لیے اس کی پبلیسٹی نہیں ہوئی ۔ یہ بہرحال اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا ۔ معلوم نہیں "معاصر" میں کب شائع ہوا ۔

آپ کا خیال ہے کہ شفیق الرحمٰن پر گوشہ شائع کیا جائے ، مناسب ہے ۔ یہ لوگ صرف نوجوانوں کے ادیب مانے گئے تھے ۔ حالاں کہ اس سے زیادہ بہت کچھ ہے ، ان کے یہاں اچھی نثر بھی ہے اور ظرافت بھی ۔ عظیم بیگ سے شفیق الرحمٰن شاید بہتر فن کار ہیں مگر دونوں کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ۔ چودھری محمد علی ردولوی ، رفیق حسین ، عظیم بیگ اور شفیق الرحمٰن (شیطان والے) یہ سلسلہ اچھا رہے گا ۔

شمس الرحمٰن فاروقی سے متعلق مجھے آپ سے اتفاق ہے ۔ کیا رعایتِ لفظی ، صناعی اور مضمون آفرینی ہی سب کچھ ہے ؟ "

آلِ احمد سرور

"سوغات" میں عظیم بیگ چغتائی پر گوشہ اچھا ہی رہا ۔ آپ نے اپنی وضع نبھائی ہے "ادب نمبر ۱" ("ادب" خلیل مامون کی ادارت میں شائع ہوتا ہے ۔ م ۔ ا) میں نے آپ کے انٹرویو کو دیکھا ۔ آپ بڑے کھرے آدمی ہیں ۔ کتنے لوگ ادب کا کاروبار کرتے ہیں مگر آپ نے جس طرح جینا سیکھا اور ادب سے عشق کیا اور ذوقِ سلیم کے سہارے چلے وہ کتنے لوگوں کے دل گردے کی بات ہے ؟ "سوغات" نے ادبی صحافت میں اور اردو ادب میں جو جگہ بنائی ہے اسے صرف بازیافت یا بازگشت کہہ کر نہیں ٹالا جاسکتا ۔ ہم اس پر فخر کرسکتے ہیں ۔ شاید ٹریلنگ

نے مخلص اور کھرے آدمی کا فرق بتایا ہے اور کھرے پن کو خلوص پر ترجیح دی ہے ۔ اس انٹرویو سے اندازہ ہوا کہ آپ کتنے کھرے آدمی ہیں ۔ ادب آپ کا عشق ہے اور میرا مشاہدہ یہ ہے کہ "ادب" سے ممتاز ادیبوں اور اردو کے استادوں کو یہ عشق نہیں ہے ۔ اس انٹرویو سے بہت سی باتیں آپ کے مزاج کے متعلق معلوم ہوئی ہیں اور آپ سے محبت کے ساتھ آپ کا احترام بھی بڑھا ۔ اعجاز احمد کے خطبے کا افتتاح پڑھ کر تشنگی کا احساس رہتا ہے ۔ اس کے مقابلے میں آپ کا انٹرویو بھرپور ہے ۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے سلسلے میں آپ نے جو کچھ کہا ہے اس سے بڑی حد تک میں اتفاق کرتا ہوں "سوغات" پر محمود ہاشمی وغیرہ کا یہ ریمارک کہ یہ "بازگشت" ہو کر رہ گیا ہے ، بے انصافی ہے ۔ جیسا کہ آپ نے کہا ہے "سوغات" میں ۱/۳ حصہ پرانے ادیبوں کے خصوصی مطالعے پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کا جواز مسلّم ہے کیوں کہ یہ لوگ صاحبِ طرز ہیں اور اپنے دائرے میں ان کا مرتبہ بلند ہے ۔ لیکن اس کے علاوہ ہر پرچے میں معاصر ادب پر بہت کچھ ہے جو شاید کہیں اور نہیں ہے ۔ یہ بہرحال "سوغات" کا ادبی ذوق اور ادبی معیار کو عام کرنے میں جو شان دار رول رہا ہے اس سے انکار بڑی ناانصافی اور تنگ نظری ہوگی ۔"

آلِ احمد سرور ۔ علی گڑھ ۔

اس بار چغتائی کا خصوصی مطالعہ اور فاروقی صاحب کا مضمون "ایہام ، رعایت اور مناسبت" شمارے کی بہترین چیزیں ہیں ۔ اس بات کا کچھ افسوس ہے کہ انیس اشفاق کی فراہم کی ہوئی چیزیں طوالت کی وجہ سے شامل نہیں کی جاسکیں ۔ چکی کی تلخیص انھوں نے سلیقے سے کی ہے ۔ انھوں نے چغتائی کی کئی سنجیدہ اور المیہ کہانیاں بھی بھیجی تھیں ۔ خصوصی مطالعے میں صرف مزاحیہ کہانیاں شامل ہوسکیں ۔ اگر "مچھلی کا شکار" یا "غلیل" (یا دونوں) کے بجائے کوئی سنجیدہ کہانی شامل ہوتی تو چغتائی کا ایک اور رنگ سامنے آجاتا ۔

فاروقی صاحب کا مضمون ایسے موضوع کا احاطہ کرتا ہے جس پر ابھی تک سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا تھا ۔ ایہام محض لفظی بازی گری نہیں بلکہ شعر کی معنویت سے اس کا گہرا تعلق ہے ، اس بات کو فاروقی صاحب نے بہ خوبی ثابت کردیا ہے ۔ آپ کے اداریے اور مغنی صاحب کے محاکمے میں اس مضمون کے ساتھ زیادتی ہوگئی ہے ۔ ان کے مضمون سے کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ "شامی کباب ہوکے پسندِ اجل ہوئے" کو اصل شاعری سمجھتے ہیں اور شعر میں معنی آفرینی کے دوسرے وسیلوں بلکہ خود معنی ہی کی اہمیت کے منکر ہیں ۔ رعایت اور مناسبتِ الفاظ سے معنی کو کس طرح قوت ملتی ہے اس پر فاروقی نے تفصیلی بحث کی ہے اور

اس باب میں ان سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا ۔ ایہام ہمارے عتاب کا پرانا شکار ہے لیکن فاروقی صاحب نے ایسی مثالیں بھی پیش کی ہیں جہاں ایہامی لفظ کے ایک سے زیادہ مفہوم نکلتے ہیں اور ان میں سے ہر مفہوم مراد لیا جاسکتا ہے ۔ ایسے ایہام کو تو شعر کے محاسن میں رکھنا ہی ہوگا (بہ شرطے کہ ایک سے زیادہ مفہوم نکلنے کو شعر کے معائب میں نہ رکھ دیا گیا ہو) ۔ رہی ایہام کی وہ قسم جس میں ایہامی لفظ کا ایک ہی مفہوم مراد لیا جاسکتا ہے فاروقی صاحب نے اس کی بھی جو مثالیں پیش کی ہیں وہ کلام کو جالب تر بناتی ہیں اور معنی کو سنوار کر پیش کرتی ہیں ۔ لیکن ہمارا رویہ یہ رہا ہے کہ بھونڈے ایہام کی مثالیں پیش کرکے کہہ دیتے ہیں کہ ایہام شاعری کے لیے زہر ہے ۔ برے استعارے ، بری تشبیہ ، بری علامت وغیرہ کی بھی صدہا مثالیں ملتی ہیں ، لیکن یہ بات قرینِ انصاف نہ ہوگی کہ ایسی مثالیں پیش کر کے استعارے ، تشبیہ اور علامت کو شعر کے معائب کے خانے میں ڈال دیا جائے ۔

محمد خالد اختر صاحب کا بہت تفصیلی اور محبت بھرا خط آیا ہے ۔ آپ کی علالت سے وہ بھی بہت پریشان ہیں ۔ انھوں نے محمد کاظم صاحب کے خط (بہ نام خالد اختر) اور شفیق الرحمان کے خط (بہ نام محمد کاظم) کی فوٹو کاپیاں بھیجی ہیں جن سے معلوم ہوا کہ آپ سوغات میں شفیق الرحمان کا خصوصی مطالعہ دینا چاہتے ہیں ۔ مجھے نہایت خوشی ہوئی اس لیے کہ یہ میری بھی دلی خواہش ہے ۔ ۔

" ادب " پہنچ گیا ۔ آپ کا انٹرویو اب اطمینان سے پڑھا ۔ ایسے عمدہ انٹرویو اردو میں کم دیکھنے کو ملتے ہیں ۔ خلیل مامون صاحب نے یہ ایک ضروری اور بڑا کام کردیا ہے ۔ آپ کے بارے میں ایسی عمدہ دستاویزی چیز کوئی نہیں لکھ سکتا تھا ۔

خط کا زیادہ حصہ سوغات پر اظہار رائے نے لے لیا ۔ آپ سے ادھر ادھر کی باتیں زیادہ کرنا چاہتا تھا ، وہ پھر سہی ۔ اس وقت سر کا چکر ایسا ہے کہ معلوم ہوتا ہے بھنور میں ڈوب رہا ہوں ۔ لہٰذا اس کے سوا کیا لکھوں کہ آپ ٹھیک رہیے اور سوغات نکالتے رہیے ۔ اپنے مقصد سے لگن انسان کی زندگی کی ضامن بن جاتی ہے ۔ ایسا بہت ہوتا ہے اور آپ کے ساتھ بھی انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا ۔ فلپائین کی خاتون کے بارے میں آپ کو جو خط میں نے لکھا تھا اس پر بھی غور کرلیجیے ۔ بیگم صاحبہ کی خدمت میں آداب

آپ کا

نیر مسعود ۔ لکھنؤ ۔

خلیل مامون صاحب آپ کے پاس آتے رہتے ہوں گے ۔ " ادب " کی رسید اور شکریے کا خط ، انھیں طبیعت کچھ ٹھیک ہونے کے بعد لکھوں گا ۔

نیر مسعود

محمود ایاز صاحب نے نیر مسعود صاحب کے خط کا اقتباس مجھے بھیجا جو شمس الرحمٰن فاروقی کے مضمون " ایہام ، رعایت اور مناسبت " پر میرے اور ایاز صاحب کے تبصرے سے متعلق ہے ۔ ایاز صاحب کا تقاضا ہے کہ میں اس کا جواب دوں اس پر یہ بحث ہماری طرف سے ختم ہوجائے گی ۔

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے اپنے مضمون میں ایہام اور رعایت لفظی کی اہمیت جتانے کے لیے جو اشعار پیش کیے ہیں اور جن اشعار کا بڑی دقتِ نظر سے تجزیہ کیا ہے ان میں سے بہت سے شعر معمولی اور بعض تو ذوقِ سلیم پر گراں گزرتے ہیں ۔ پھر ایاز صاحب نے اپنے اداریے میں جو اشعار فاروقی صاحب کے تحسینی کلمات کے ساتھ پیش کیے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ فاروقی صاحب کیسی شاعری کے دل دادہ ہیں ۔

نیر مسعود صاحب کا خیال درست نہیں ہے کہ ایہام ہمارے عتاب کا پرانا شکار رہا ہے ۔ اصل بات یہ ہے کہ فاروقی صاحب نے خود ہی ایہام کی مخالفت کا ایک ہوّا کھڑا کیا ۔ وہ اس کا الزام " کتابی نقادوں " کے سر دھرتے ہیں ۔ لیکن یہ نہیں بتاتے کہ وہ نقاد کون ہیں ۔ کبھی وہ نام لیے بغیر عمومی انداز میں بات کرتے ہیں مثلاً " لوگ دو تین شعر پیش کرتے ہیں جن میں بہ ظاہر ایہام کی برائی یا ایہام کے زوال کا ذکر ہے " یا " عام طور پر مشہور ہے کہ ایہام اتنی قابل اعتراض اور غیر شاعرانہ چیز ہے کہ میر ، غالب ، انیس ، درد جیسے سنجیدہ شعرا نے اسے ہاتھ بھی نہ لگایا " ۔ فاروقی صاحب نے ایہام کے مخالفین میں جن اصحاب کے نام لیے ہیں ان میں حالی ، طباطبائی ، امداد امام اثر اور حسرت موہانی شامل ہیں جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے " ایہام " کا نام لے کر ان میں سے کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی ۔ ان ناموں میں عبدالرحمٰن اور مسعود حسین رضوی کے ناموں کا بھی اضافہ کروں گا ان سب کا صنائع کے تعلق سے (بہ شمول ایہام) یکساں موقف تھا ۔ وہ صنعت کے مخالف نہیں تھے ، تصنع کے خلاف تھے ۔ حالی نے لکھا تھا " صنائع بدائع پر کلام کی بنیاد رکھنے سے اکثر معنی کا سر رشتہ ہاتھ سے جاتا رہتا ہے ۔ اور کلام میں بالکل اثر باقی نہیں رہتا " (مقدمہ شعر وشاعری)

عبدالرحمٰن مراۃ الشعر میں لکھتے ہیں ۔ " لفظی بدیعی محاسن کی بہت سی قسمیں ہیں ۔ ۔ ۔ ان میں سے عام تر تجنیس ہے ۔ تجنیس کا التزام لاریب کلام کو معانی کی بلندی سے گرادیتا ہے الاً

باشاء اللہ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر کہیں کسی قسم کی تجنیس یا رعایتِ لفظی آجائے یا اس کے استعمال میں ایسا سلیقہ برتا گیا ہو کہ تزئینِ الفاظ نے معانی کے حسن کو اور بڑھا دیا ہو تو اس کو بھی نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے "۔

امداد امام اثر جن کو ایہام کا مخالف بتایا گیا ہے انھوں نے ایہام کا نام بھی نہیں لیا صرف یہ کہا کہ "اگر بے تکلف کسی شعر میں رعایتِ لفظی کی صورت پیدا ہو جائے تو ایسی رعایت خالی از لطف متصور نہیں ہے ۔ مگر بہ تکلف رعایت لفظی کا التزام صرف ناپسندیدہ ہی نہیں بلکہ سچی شاعری کے منافی ہے "۔

فاروقی صاحب نے حسرت موہانی کا بھی ایہام دشمنوں میں شمار کیا ہے ۔ حسرت نے بھی کہیں ایہام کا ذکر نہیں کیا ۔ انھوں نے مناسبت کو مستحسن قرار دیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں "مضمونِ شعر اور الفاظِ شعر میں مطابقت قائم کرنا من جملہ کمالاتِ شاعری بہت کچھ اہم سمجھا جاتا ہے اور عموماً بہت بڑی قوت اور مشق سخن کا نتیجہ ہوا کرتا ہے "۔ آگے مناسبت کی چند مثالیں دے کر وہ کہتے ہیں "مضمون و الفاظ کی اس مطابقت کو رعایتِ لفظی کے تحت میں نہ لانا چاہیے اس لیے کہ اربابِ نظر کے نزدیک رعایت کا تصنع ہمیشہ ناگوار اور مطابقت کی بے ساختگی ہمیشہ پسندیدہ ٹھہرا کرتی ہے (نکاتِ سخن ۔ باب : محاسنِ سخن)۔

مسعود حسین رضوی ادیب نے اپنی کتاب "ہماری شاعری" میں "صنعتوں کا حسنِ استعمال" کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے ۔ انھوں نے تفصیل کے ساتھ صنعتوں کی گروہ بندی کر کے شاعری میں ان کے استعمال کے حسن وقبح سے بحث کی ہے ۔ اس بحث سے قطع نظر ان کا موقف بھی بنیادی طور پر وہی ہے جو حالی، امداد امام اثر اور حسرت موہانی کا ہے ۔

ان بیانات کی روشنی میں ایک بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ ایہام ہو یا کوئی اور صنعت اگر وہ سلیقے سے برتی جائے تو یقیناً قابلِ قدر ہے لیکن ذریعے کو مقصد بنا لینا مناسب نہیں ہے ۔

مغنی تبسم ۔ حیدرآباد ۔

مشفقی ، تسلیم ۔ نیا سال مبارک ، یہ عیسوی کیلنڈر کا سال ہے ۔ حضرت عیسیٰ سے منسوب جنھیں مسلمان بھی روح اللہ کہتے ہیں ۔ اس کا جو بھی مطلب ہو ۔

میں ۱۹ / دسمبر کو ٹورنٹو سے روانہ ہو کر ایک دن کراچی ٹھہرتا ہوا دہلی آگیا ۔ یہاں غالب انسٹی ٹیوٹ میں مذاکرہ تھا ۔ اس کے بعد علی گڑھ میں بھی ایک مذاکرہ ہوا دونوں جگہ شرکت کی ۔ پھر چند روز کے لیے لکھنو بھی گیا ۔ مقصد چند دوستوں سے ملاقات اور گویا پاؤں پھیرنا تھا ۔ اب پاکستان

ہوتا ہوا واپس کینیڈا جا رہا ہوں۔

سوغات کا ۱۱ واں شمارہ نیر مسعود کے پاس سرسری طور سے دیکھا۔ یہ مجھے ابھی نہیں وصول ہوا۔ شاید کراچی واپسی پر ملے۔

آپ کی علالت کی اطلاع یہاں ملی اور بڑی پریشانی کا باعث ہوئی۔ صحت یابی کے لیے دعا گو ہوں۔ بھائی ڈٹے رہیے اور مرض کا جم کر مقابلہ کیجیے۔ دل کہتا ہے کہ آپ ابھی بہت جئیں گے اور بہت کچھ کریں گی۔ ادیبوں کا جو ایک حلقہ آپ کے دم سے قائم ہوا ہے قائم رہے گا۔ ویسے تلوار تو سبھی کے سر پر لٹک رہی ہے۔

دل کے تو تا ابد تھے پیمانِ زندگی سے
تولے ہوئے ہے خنجر دستِ قضا ابھی سے

شاید میں نے یہ شعر بھی آپ کو لکھ کر بھیجا تھا مع ترجمہ:

ابھی تو مل نہیں پایا وجود ہی کا سراغ
اجل دکھائے جو راہِ عدم، کہو کہ نہیں

Existence being it self obscure
How can you be of death so sure ?
So, when the angel knocks the door,
Say firmly no, or just ignore.

خیروعافیت کی اطلاع باعثِ شکر گزاری ہوگی۔ حلقہ، سوغات کی متفقہ دعائیں آپ کے اپنے عزمِ صمیم کے ساتھ مل کر ضرور کارگر ہونگی۔

چشمِ گریاں کو جھڑی اب نہ لگانے دینا
کچھ تو بھیگے ہوئے دامن کو سکھانے دینا

دوستو رکھنا یہ سمٹے ہوئے گوشے آباد
اب کوئی بزم سے جائے تو نہ جانے دینا

شان الحق حقی۔ دہلی

سوغات مجھے بھی مل گیا اور ضیا کو بھی۔ آج اس کا خط آیا۔ اس نے لکھا ہے کہ یہ شمارہ بھی آپ اپنی مثال ہے۔ وہ بھی اس بیش بہا کارگزاری پر آپ کے لیے سراپا سپاس ہے۔ نقشِ اول حسبِ سابق آپ کی دقتِ نظر اور آپ کی دیانت داری کی توانا لو سے جگمگا رہا ہے

ناصر بغدادی صاحب مجھے فاروقی کی نہایت ضخیم تصنیف " شعرِ شور انگیز " کی ساری جلدیں دے گئے ۔ میں ان کی ضخامت دیکھا تو دل نے بے اختیار داد دی ۔ اتنا کچھ لکھنے کے لیے بڑی ہمت چاہیے اور کلی وابستگی بھی ۔ نہ جانے کیوں مجھے فوراً مرحوم ڈاکٹر کلیم الدین یاد آگئے ۔ وہ بھی کلی وابستگی والے محقق تھے اور بڑے بسیار نویں تھے ۔ میں نے ایک دن بڑے ادب سے اس کتاب کی جلد اول کو اٹھایا اور بڑے ادب سے اس کا مطالعہ شروع کیا ۔ ذکر میر تقی میر صاحب کے شعرِ شور انگیز کا تھا (جہاں کتاب مطالعے کے لیے کھلی) میرا دل دھک سے رہ گیا ۔ کہاں میر تقی میر کہاں شورا شوری ۔ دھو میں تو کبھی کبھی رندانِ قدح خوار مچاتے ہیں جیسے خواجہ حافظؒ کہ فرماتے ہیں : " حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز " یا مولانا روم اپنی وحشتِ عشق کے زمانے میں ۔ وہ زمانہ جب انھوں نے دیوانِ شمس تبریز مکمل کیا ۔ جب وہ کہتے تھے :

یک دست جامِ بادہ ویک دست زلفِ یار
رقصے چنیں میانۂ میدانم آرزوست

لیکن آپ ان دو عشاقِ صادق کے کلام کا بھی سچے دل اور ذوقِ سلیم کے ساتھ مطالعہ فرمائیں تو گل بانگِ عاشقانہ کہیں کہیں ملتی ہے ۔ جہاں ۔ نیازِ عشق کی بات کرتے ہیں تو وہ بہت زیرِ لب ہوتی ہے اور محمود ایاز صاحب ۔ میر تقی میر تو سراپا ادب بزرگ تھے ۔ جیسے مولانا روم زرکوب کی صحبت میں بیٹھ کر ہوگئے اور پھر مثنوی لکھ دی ۔ جس میں کوئی شور نہیں ۔ میں نے میر تقی میر کو از اول تا آخر اب سے ساٹھ برس پہلے پڑھا تھا ۔ اور جو شعر دل پر نقش ہوئے وہ سارے کے سارے حرفِ زیرِ لب کی سطحِ عظمت پر مقام تھے ۔

ہوگا کسی دیوار کے سایے کے تلے میر / حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
فقیرانہ آئے صدا کر چلے / عشق بن یہ ادب نہیں آتا

نسبتاً بڑا شعر ہے ۔ مگر دیکھیے لہجہ کتنا نرم ہے : بشر گل تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا
اوڑ الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

یہ صرف چند مثالیں ہیں ۔ ان کے سینکڑوں اشعار عظیم عالمی شاعری میں ہمیشہ شامل رہیں گے ۔ وہ سب کے سب شور انگیزی سے بہت دور ہیں ۔ شمس الرحمان فاروقی نے ایک نظریہ اچھوتا نظر آنے کے لیے قائم کیا اور بعد میں پھر ادھر ادھر سے اس کی تائید کے لیے کچے پکے استدلال لاتے رہے ۔ میر کے جتنے اشعار انھوں نے منتخب کیے اپنے دعوے کے ثبوت کے طور پر پیش کرنے کے لیے ۔ وہ سب میر کے ان اشعار میں سے ہیں جن کے بارے میں ایک مستند بزرگ کہہ گئے تھے کہ پستش بسیار پست است ۔ مجھے میر سے آگے بڑھنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی ۔ بے چارہ میر تقی میر کیسا عظیم شاعر اور کیسے سخن ناشناس لوگوں کا مسلسل تختۂ مشق

بنا ہوا ہے ۔ میں نے یہاں کے دو ایک اپنے حال آشنا دوستوں سے اپنے تاسف کا اظہار کیا کہ دیکھو بچارے فاروقی صاحب نے کتنی محنت کی جو ساری کی ساری ایک کم مقدور مفروضے کی وجہ سے ضائع ہوگئی ۔ اب آپ کے نقشِ اول میں ان کے "فقدانِ ذوقِ سلیم کی مثالیں دیکھیں تو مجھے خیال آیا کہ میں بھی اپنے Anguish کا ذکر کردوں ۔ اعجاز حسین بٹالوی ہمارے بڑے وکیل ہیں ۔ تاریخِ وکالت میں ان کا نام ہمیشہ عزت سے لیا جائے گا ۔ وہ اردو نثر میں بھی صاحبِ طرز ہیں ۔ بہت دل نشیں اسلوب رکھتے ہیں ۔ ان کا ذوقِ شعر بھی ہر کس و ناکس سے داد وصول کرچکا ہے انھیں ایک سے ایک بڑا شعر بھی یاد ہے اور وہ اکثر کم مقدور ادیبوں کو برے شعر سناتے ہیں ، بڑے بڑے کلاسیکی شاعروں سے منسوب کرکے ۔ جو کام اعجاز حسین بٹالوی ازرہِ تفنن کرتے ہیں مرحوم کلیم الدین صاحب کے جونیر ہم مزاج نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نہایت متانت سے کرتے ہیں ۔ مجال ہے ایک اچھا شعر میر تقی میر کا "شعرِ شور انگیز" میں کہیں سہواً بھی لکھ دیا ہو ۔ میرا دل ان کے لیے واقعی بہت آزردہ ہے ۔ کتنے محنتی کتنے لگن والے آدمی ہیں لیکن قدرت ان پر مہربان نہ تھی کہ ذوقِ سلیم سے انھیں محروم رکھا ۔ آپ نے اشعار کے حواشی میں جو ان کے ستائشی جملے لکھے ہیں اگر وہ اتنے فتنہ انگیز نہ ہوتے تو میں کئی دفعہ رو چکا ہوتا ۔ میرا ایک پیرِ کہن سال کی حیثیت سے انھیں ایک مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ شاعری پر لکھنے کا دھندہ چھوڑدیں اور اصنافِ ادب میں "معنی آفرینیوں" کی گنجائش بہت ہوتی ہے ۔ ان کی طرف اپنی وجود گیر وابستگی سے متوجہ ہوجائیں ۔ اللہ ان کی مدد فرمائے گا اور بہتر نتائج حاصل ہوسکیں گے ۔

"بازگشت" میں بھی شمس الرحمٰن فاروقی کا ایک مکتوب چھپا ہے ۔ جس میں انھوں نے اردو زبان بولنے والوں کی آخرت کے Ethos کے ضمن کے میرے معروضات کو جو میراجی پر میرے مضمون میں شامل تھے ۔ "بے خبرانہ جراءت مندی" کی مثال قرار دیا ہے ۔ اب میں کیا عرض کرسکتا ہوں ۔ وہ اردو کے بڑے محقق ہیں ۔ میں ایک عاجز طالب علم ہوں وہ یقیناً مجھ سے بہت کم عمر ہیں ۔ میں نے بھگت کبیر اور تلسی داس جی کے دوہے ، دکن کے قدیم اردو شاعروں کا جن میں قطب شاہ شامل تھے، کلام اور خان خاناں کی ہندی شاعری ۱۹۳۰ء تک پڑھ لی تھی ۔ دیکھیے میں کبیر جی کے ان دوہوں کو آج بھی اردو سمجھتا ہوں ۔

کبیرا تیری جھونپڑی گل کٹین کے پاس
جو کرن گے سو بھرن گے تم کیوں بھئے اداس

ایک دوہا کچھ یوں تھا ، ساٹھ برس سے اوپر کی بات ہے اب حافظہ اتنا محکم نہیں ۔

پگڑی باندھے پیچ سنوارے عطر لے زلفن میں
کہت کبیر سنو بھئی سادھو وہ گیا لڑے گا رن میں

یہ بھی اردو ہے جس کا بھی ہو :

لکڑی جل کوئلہ بھئی اور کوئلہ جل گئی راکھ
میں پاپن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ

مجھے افسوس ہے کہ فاروقی صاحب میرے مضمون کے Thrust کو بھی ویسے ہی نہیں سمجھے جیسے وہ میر کے اصلی مزاج کو سمجھنے سے قاصر رہے ۔

میں نے میراجی والے مضمون میں صرف یہ کہا تھا کہ قصے ، مقامی دیو مالائی سرداروں کو اردو زبان نے قبول نہیں کیا ۔ کیا رتن ناتھ سرشار ، دیاشنکر نسیم ، رام نرائن موزوں ، آنند نرائن ملا(وید کی شاعری میں ہاتھی کی سونڈ والے دیوتا (گنیش) ہنومان جی کا پورا پربت اٹھا لانے کا واقعہ ، سیتا جی کی بھڑکتی آگ پر سے گزرنے کی آزمائش اور ایسے واقعات اردو شاعری میں نظمائے گئے اور نظمائے گئے تو کیا ہماری اردو والوں کی اکثریت کے شعورِ اجتماعی میں وہ رچ بس گئے اور محمود ایاز صاحب' یہ غالب کی غزلیں کونسی ہیں جو فارسی دیوان میں شامل ہیں یا وہ جو اردو دیوان میں ہیں ۔ ان میں سے دو چار شعر کیا یہ محترم محقق بہ طورِ مثال پیش کرسکتے ہیں ؟ فاروقی صاحب سے میری طرف سے گزارش کردیجیے کہ دوسری اقوام کے تالیفِ قلب کے لیے بھی تھوڑی سی عقل چاہیے ۔ وہ باتیں جو ٹھوس حقائق پر مبنی نہ ہوں اور وہ دعاوی جو بے دلیل ہوں چاپلوسی سمجھے جاتے ہیں ۔ میں بالعموم تیزی اور کھلی طنز سے تحریر و گفتگو ہر دو میں اجتناب کرتا ہوں مگر یہاں یہ لہجہ ایک تو میر کی جو توہین فاروقی صاحب نے نا سمجھی میں کی ہے اس سے میں برگشتہ خاطر ہوا اور پھر بھی اتنے اعتماد سے مجھ پر " بے خبرانہ جراء ت مندی " کا Verdict صادر فرماکر انھوں نے میرے اندر آغازِ جوانی کے زمانے کے مناظرہ باز کو پھر سے بیدار کردیا۔ یہ آخری فقرے انہی کی سطح پر جاکر لکھ دیے تاکہ وہ آئندہ اپنی تحریر میں زیادہ احتیاط کرنا سیکھ جائیں ۔ ان سے کہیے سوغات ۱۱ میں اشرف صاحب کے خط کا جو جواب میں نے لکھا ہے اسے دو چار بار غور سے پڑھ لیں ۔

حمید نسیم ۔ کراچی

کچھ روز ہوئے آپ کا خط ملا اور آج سوغات (۱۱) بھی ۔ دونوں کے لیے شکر گزار ہوں ۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ اسی انہماک سے رسالے کی ترتیب اور اشاعت میں مصروف ہیں جیسے پہلے تھے ۔ اور یہ کہ آپ اب گھر پر ہیں ۔ مگر آپ کے خط سے یہ اندازہ نہیں ہوا کہ افاقہ کس حد تک ہوا ہے ۔ مکمل یا جزوی ۔ آپ نے لکھا ہے کہ کوئی آپریشن نہیں ہوگا مگر Symptomatic علاج ابھی جاری رہے گا ۔ خدا کرے کہ آپ جلد کلی طور پر صحت یاب

ہوجائیں اور بھائی اور بچوں کے ساتھ خوش و خرم رہیں اور آپ جو کام کررہے ہیں اس کو اسی زور و شور سے کرتے رہیں ۔ یہ آپ کے خلیل ماموں صاحب بھی غضب کے آدمی ہیں ۔ ابھی کچھ دن ہوئے ان کا پرچہ " ادب " ملا ۔ حیرت ہوئی ۔ پرچہ ضخامت ہی سے نہیں اور وجوہ سے بھی توجہ کا مستحق ہے ۔ وہ سوغات کے سلسلے میں بھی آپ کا ہاتھ بٹاتے ہیں ۔ سرکاری ملازمت بھی کرتے ہیں اور پھر یہ پرچہ نکالنے میں بھی بہت محنت کرنی پڑی ہوگی ۔ معلوم ہوتا ہے آپ سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا ہے ۔ ان سے ملاقات آپ ہی کی وساطت سے بنگلور میں ہوئی تھی ۔ ان کا تپاک اور خلوص یاد ہے ۔ میری طرف سے انھیں نیک تمنائیں پہنچادیجیے ۔

ضیاء جالندھری ۔ اسلام آباد ۔

آپ کے " سوغات " کا وہ حصہ جو میرے والد مرزا عظیم بیگ چغتائی کی تخلیقات کے بارے میں ہے مجھے ملا ۔ آپ نے اردو پر بہت بڑا احسان کیا ہے جو اس خوب صورتی سے پیش کیا ہے ۔ آپ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے ۔ میں تو یہ کہنے پر بھی مجبور ہوں کہ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جس سے اپنے جذبات کا اظہار کرسکوں مگر اس میں ایک کمی رہ گئی وہ یہ کہ میرا نام غلط لکھ دیا میرا نام " نجیم " ہے " نجم " نہیں ہے اور والد پر جس غنڈے نے حملہ کیا تھا وہ انگریز نہیں رنگریز تھا ۔

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ یہ کام کررہے ہیں تو میں آپ کو پھوپھی جان (عصمت چغتائی) کا وہ خط بھیج دیتا جو انھوں نے میرے مضمون پر لکھا تھا یہ ہی نہیں جو میں نے اس کا جواب دیا تھا وہ بھی بھیج دیتا کیوں کہ پھوپھی جان کو اکثر نوٹ بنا کر خط لکھتا تھا آج کل ان کے خط اور جوابات کو ترتیب دے رہا ہوں اور چھپوانے کا ارادہ رکھتا ہوں ۔ پہلے ہندوستان اور پھر پاکستان سے چھپوانے میں دیکھیے یہ کب تک پورا ہوتا ہے ۔

مرزا نجیم بیگ چغتائی ۔ لندن

" سوغات " ۔ مل گیا ۔ شکریہ ۔ فاروقی کے مضمون پر آپ کا اور مغنی تبسم صاحب کا تبصرہ بہت پسند آیا ۔ معلوم نہیں صنائع بدائع کی بحث میں لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ دیکھنے کی اصل چیز یہ ہوتی ہے کہ شعر بھی ہوا کہ نہیں ۔

آفتاب احمد خاں ۔ اسلام آباد

سوغات بالکل تازہ دم ہے ۔ اس پر آپ کی علالت کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی ۔ ابھی اس کی ورق گردانی جاری ہے عظیم بیگ چغتائی کو پڑھتے ہوئے سارے غم بھول بسر گئے ۔ حسن عسکری کے مضمون کی روشنی میں چغتائی ایک نئی دریافت بن گئے ہیں ۔ اس مضمون نے ان کے افسانوں کی معنویت کو اور اجاگر کردیا ہے ۔ عزیز احمد کے افسانے مثلث میں جو مثالی عورت کی بات سامنے آئی ہے وہ قابلِ توجہ ہے ۔ بے شمار منتشر اجزا کو جوڑ کر مثالی عورت کی وحدت آشکار کرنا ایک دلچسپ مشغلہ ہے ۔ لیکن اس کے مقابلہ میں ایک امکان اور بھی ہے کہ نسوانی چہرے کے پس منظر میں انسانی چہرے کی جھلک تلاش کی جائے ۔ اس امکان کو ہمیشہ نظر انداز کردیا گیا اور نسوانیت کو انسانی موقف کا فریق مخالف تصور کیا گیا ۔ اسے ہمیشہ صنف ہی کی حد میں محدود رکھا گیا ۔ اس کے بر خلاف مردانہ تجمل کو لازماً انسانی کج دھج کا آئینہ دار مانا گیا ۔

شفیق فاطمہ شعریٰ ۔ حیدرآباد۔

میں نے پچھلی مرتبہ بھی عرض کیا تھا حمید نسیم کی تنقید میں شرافت نفس کا بہت دخل ہے حالاں کہ صرف یہی خوبی تنقید کو معتبر نہیں کرتی ۔ ان کا تاثراتی اور تجزیاتی طریقہ کار شانہ بہ شانہ تخلیق کو اپنے جلو میں لے کر آگے بڑھتا ہے اور قاری .. مجھ جیسے قاری کے لیے اس میں مسرت و بصیرت کا خاصا سامان ہوتا ہے لیکن مجید امجد پر اپنے مضمون میں وہ تشریح اور صراحت سے آگے قدم نہیں اٹھاتے ۔ تنقید ، تشریح و صراحت سے مختلف چیز ہے لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ہم تجزیاتی و تاثراتی تحریر کو لا محالہ تنقید ہی سمجھ کر پڑھیں ۔

منٹو کے افسانے دھواں پر اختر احسن نے محنت سے مضمون لکھا ہے اور حق ادا کردیا ہے ۔

باکمال نثر نگار مشتاق یوسفی کی عظیم نثری تحریر آبِ گم پر آفتاب احمد خاں کی تحریر - تقریباتی تنقید - کے ذیل میں آتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس مختصر تحریر سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس عہد کے سب سے زیادہ جینوین مزاح نگار کی تحریر کا مکمل احاطہ کرسکے ۔ دو دو چار چار بے معنی ، لغو ، ان مل بے جوڑ مصرعوں پر صفحات کے صفحات سیاہ کرنے والے تنقید نگار - آبِ گم - جیسی اہم تحریر پر قلم کیوں نہیں اٹھاتے ۔ مشتاق احمد یوسفی پر ہندوستان پاکستان دونوں ملکوں میں جو لکھا گیا ہے اس سے بڑی حد تک واقف ہوں لیکن کمیت کے اعتبار سے وہ اتنا بھی نہیں ہے جتنا دوسرے درجے کے شاعروں پر ہر مہینے لکھاجاتا ہے ۔ یہ رک کر سوچنے کا موقع ہے کہ اردو تنقید نثری تخلیقات پر قلم کے جوہر دکھانے سے کیوں کتراتی رہی

ہے ۔ نثر کی تنقید جس صبر و ضبط ، محنت و مشقت ، افہام و تفہیم اور شفاف بیانی کی طالب ہے ، موجودہ اردو تنقید نگار غالباً اس سے محروم ہیں اِلّا ماشاء اللہ ۔ "آبِ گم" برِ صغیر کی گنگا جمنی تہذیب کا وہ خاموش رزمیہ ہے جس کی مثال سے ماضی کا ادب خالی ہے ۔ کاش کوئی نقاد ایسا اٹھے جو اس اہم نثری کارنامے کے ہر لفظ کے پیچھے چھپی ہوئی دھندلی اور چمک دار تصویروں کو پہچان کر ان کی کم از کم اتنی ہی تشریح و صراحت کرسکے جتنی حمید نسیم صاحب نے مجید امجد کی شاعری کی ہے ۔

ڈاکٹر کیسری کشور ، ظ ۔ انصاری اور چودھری محمد علی ردولوی پر علی الترتیب نیر مسعود ، انور ظہیر خاں اور انیس قدوائی کے خاکے غضب کے ہیں ۔ سب کا اپنا الگ الگ رنگ ہے ۔ انور ظہیر خاں نے خاکے پر بہت محنت کی ہے ایک ایک پیراگراف اس کا ثبوت پیش کرتا ہے ۔ نیر مسعود کی تحریر کچھ اور ہی کیفیت پیدا کرتی ہے ۔ جس طرح وہ اپنی کہانیوں میں الگ تھلگ کھڑے نظر آتے ہیں اسی طرح اس خاکے میں بھی صاحبِ خاکہ سے پرے ہی پرے نظر آتے ہیں ۔ نیر مسعود کی کہانیوں میں موت کا اعلان بہت زور و شور سے نہیں ہوتا ۔ اس خاکے میں بھی ڈاکٹر صاحب کی موت کی اطلاع اتنی خاموشی سے دی گئی ہے کہ دل پریشان ہوگیا ۔ خاکے کے آخری دو سطری پیراگراف میں نیر مسعود نے وہ کمال دکھایا ہے جو نہ دکھاتے تو افسوس بھی ہوتا اور حیرت بھی ۔ وہ اپنے دوست کا بدن چتا میں جلتا ہوا دکھانے سے بچنا چاہتے ہیں تو اس منظر کو یوں باندھتے ہیں ۔

"گھاٹ پر پہنچا تو چتا کو آگ دی جاچکی تھی اور اس کے اوپر شمشان کی چھت کا ٹین شعلوں سے تپ کر سرخ ہونے کے قریب تھا ۔ "سچ ہے کہ "عشق بن یہ ادب نہیں آتا ۔"

اختر الایمان مرحوم کی خود نوشت ہمیشہ کی طرح اچھی لگی بے لاگ ، برجستہ ، صاف و شفاف ۔

نیر مسعود کی کہانی "شیشہ گھاٹ" سے ابھی تک پار نہیں اتر سکا ہوں ۔ پار اترنے کی کوئی زیادہ خواہش بھی نہیں ہے ۔ بیچ دریا میں کھڑے ہو کر موجوں سے خوف زدہ ہونے کا لطف ہی کچھ اور ہے ۔ کئی دوستوں نے ذکر کیا ہے کہ یہ کہانی مکمل طور سے ان کی سمجھ میں نہیں آئی ۔ میں نے اس کہانی کو ایک بار پھر پڑھا ۔ خود کو دو دوستوں کی رائے سے متفق پایا ۔ اس کے باوجود کہانی کا تاثر قائم رہا ۔ میں نے اپنے چھ سالہ بچے نبیل اور ۷ سالہ بچی شفا کو یہ کہانی سنائی ۔ درمیان میں مشکل الفاظ کے معنی بتاتا رہا اور پایا کہ دونوں بچوں نے اسے بہت اشتیاق سے سنا ۔ بچوں کی دل زدگی کے لحاظ سے کہانی کی کردار ، "پریا" کی موت کے ذکر کو گول مول کردیا ۔ بچے دیر تک کہانی کے مختلف کرداروں اور واقعات پر گفتگو کرتے رہے حتیٰ کہ ان کے جواب دیتے دیتے میں بوکھلا گیا ۔ جہاں جہاں مجھے تفہیم میں دقت پیش آئی تھی بچے وہاں نہیں رکے ۔ ان کی دل چسپی کے نکات مختلف تھے ۔ میں نے اندازہ کیا کہ اس کہانی کے ظاہری واقعات کو میرے

بچے بھی تقریبا اتنا ہی کھتے ہیں جتنا ان کا باپ ۔ بس فرق یہ ہے کہ ان کا باپ کہانی کے بہت سے الفاظ و معاملات کی کوئی منطقی توجیہہ چاہتا ہے جب کہ بچے اس سے بے نیاز ہیں ۔ اس دن مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ بچے صرف طویل کہانی میں ہی نہیں ، بے چیدہ کہانی میں بھی دل چسپی لیتے ہیں ۔ ان سے " جہاز " کا ذکر کرتا ہوں تو انھیں تقریبا پوری کہانی یاد آجاتی ہے ۔
گم شدہ تحریریں " نام سے نیر مسعود نے اردو کی قدیم نثری تحریروں کے جو نمونے پیش کیے ہیں وہ بہت خوب ہیں ۔ ہر تحریر سے پہلے مصنف کا تعارف ، تصنیف کی اہمیت اور نثری خوبیوں کا مختصر بیان ان تحریروں سے عقیدت پیدا کردیتا ہے ۔ ان پانچوں تحریروں میں اردو نثر کے کیسے بیش بہا اسالیب در آئے ہیں ۔

آپ اور نیر مسعود صاحب دونوں " کھوئے ہوؤں کی جستجو " میں لگے رہتے ہیں ۔ اس باب کے لیے آپ دونوں کو مبارک باد ۔ سوغات میں عشق نامہ اور " شب خون " میں چھپی اس شاعر کی غزلیں " کینوس " ، " شب درمیاں " اور " سات سماوات " (شاعر کے مجموعوں کے نام) تو شاعری سے آگے کی چیزیں ہیں ۔ غزل میں یہ شائستگی ، سپردگی ، نفاست ، آمد ، روایت کا پاس ادب موجودہ عہد میں اتنی بڑی مقدار میں صرف اسی شاعر کو تقدیر ہوا ۔ ایک اہم بات اور بھی ہے کہ یہ ظاہر تو خوب صورت اور دل نشیں نظر آنے والی یہ شاعری (تینوں مجموعوں میں شامل شاعری) گزری ہوئی نصف صدی کے آشوب کا بہت طاقت ور تخلیقی اظہار بھی ہے پچھلے ۲۵، ۳۰ سال کی غزل میں ایسا کم ہوا ہے ۔ کوئی تخلیق دوست ، درد مند ، سچا ناقد اگر اس شاعری کا اس نہج سے مطالعہ کرے تو کچھ اور بھی ایسے پہلو سامنے آئیں گے جو عموماً اچھی غزل کی تنقید کرتے وقت نظر انداز کردیے جاتے ہیں ۔ آج سے ۲۰ برس پہلے فرحت احساس ، منظور ہاشمی اور ابن فرید نے " کینوس " کی شاعری پر مضمون لکھے تھے ۔ ان بیس برسوں میں غالباً تنقید کی ترجیحات مختلف ہوئی ہیں ۔ آج کل نئی تھیوری ، ساختیات ، پس ساختیات اور ردِ تشکیل جیسے موضوعات کا زور ہے اور تنقید اپنی اصل یعنی تخلیق سے دور تر ہوتی جارہی ہے ۔ تنقید جب تک معاصر ادب سے آنکھیں چراتی رہے گی ایسی ہی بھول بھلیوں میں بھٹکتی رہے گی ۔ انشاء اللہ ۔

آصف فرخی کے افسانوں اور شہرِبتی پر ایک مضمون الگ سے لکھنا چاہیے ۔ ان کے ایک ذاتی خط کا جواب جو ۱۹۸۳ء سے قرض تھا ابھی ۱۹۹۶ء میں دیا ہے ۔ خدا معلوم انھیں موصول ہوا کہ نہیں ۔ اس نا مکمل ، حوصلہ مند ، گلے گلے تک ادب میں ڈوبے شخص کی تحریروں پر میں لکھوں نہ لکھوں ، آنے والا نقاد لکھے گا ۔ فی الحال تو ان افسانوں پر دلی مبارک باد ۔

سید محمد اشرف

اسلم فرخی صاحب کا خاکہ سب سے پہلے پڑھا ۔ ان کے خاکوں میں ایک عمدہ بات یہ ہوتی ہے کہ وہ انھیں شخصیات پر لکھتے ہیں ۔ جن سے ایک طویل عرصے کی ان یاد اللہ ہوتی ہے اور رفاقت کے دل چسپ مثبت و منفی پہلو بھی شستہ اردو میں ۔ ان کا لطف ایک اچھی کہانی سے کم نہیں ہوتا ۔ اور چوں کہ ہمارے اطراف اب محض اسکینڈل ، گھپلے ، سرکار کی خوشامد پسندی اور اعزازات و انعامات کی ہوس پسندی کے قصے ہی رہ گئے ہیں ۔ جی خوش ہوتا ہے کہ اس دنیا میں اچھائیوں کی بھی کمی نہیں ۔ نیر مسعود کا مختصر مضمون بھی اچھا ہے ۔ سلام بن رزاق کی کہانی " چادر " بہت پسند آئی ۔ اس کا اختتام پُر اثر ہے اور افسانوی بھی نہیں ۔ ڈاکٹر خورشید رضوی کے اس تاثر سے میں متفق ہوں کہ مجید امجد کے ساتھ انھوں نے انصاف نہیں کیا ۔ جب کسی کا کلیات شائع ہوتا ہے تو بہت اچھی تحریروں کے ساتھ کم زور تحریریں بھی ہوتی ہیں ۔ جب ناقد اس ادیب کو پسند کرتا ہے تو اچھی تحریروں کا زیادہ ذکر کرتا ہے اور کم زور تحریروں کا سرسری ذکر کر کے آگے بڑھ جاتا ہے اور جب وہ پسند نہیں کرتا تو کم زور تحریروں پر زیادہ وقت صرف کرتا ہے ۔

انور خان ۔ بمبئی

سلام مسنون

" بازیابی ، حصۂ نظم میں خاص چیز لگی ۔ احسن القصص میں ادب و دانش ، بالخصوص شاعری کے لیے عجب وسعتیں ہیں مگر ہماری شاعری تلمیح کے ایک محدود حصار میں قید رہی ہے ۔ بازیابی اس قصے کی ایک نئی جہت روشن کرتی ہے ۔ تخلیق کار کو مبارک باد ۔

مرزا انجم بیگ کا مضمون پڑھ کر آنکھیں نم آلود ہوگئیں اس سادہ اور غیر مرتب سی تحریر کے مقابلے میں شاہد احمد دہلوی کی کچھ ترجمانہ اور عصمت کی (مشہور و معروف) بنا چنا کر اور خاصی چالاکی سے لکھی ہوئی چیزیں پھیکی (اور عصمت کی تحریر تو سچائی سے خاصی دور بھی) لگیں ۔ بہ ہر حال ۔ "

عرفان صدیقی ۔ لکھنؤ

سراپا معذرت ہوں ۔ کوئی عذر پیش نہیں کروں گا بس اتنا ضرور کہوں گا کہ تاخیر ہوئی تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا ۔ بہ ہرحال میں نے مضمون لکھ دیا ہے ۔ کیسا ہے ، یہ فیصلہ آپ کریں گے اور یہ بھی آپ طے کریں گے کہ آپ کے رسالے کے معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں ۔ اس موضوع کے لیے کہیں بہت دیر تو نہیں ہوگئی ؟ اس مضمون سے متعلق دو ایک باتیں عرض

کردوں ۔

۱ ۔ ردولی میں ، اس سلسلے میں کوشش کے باوجود کامیابی نہیں ہوئی ۔

۲ ۔ اتفاق سے چودھری صاحب کے پوتے قیصر محمد علی ، جو دلی سے نکلنے والے انگریزی روزنامے ایشین ایج میں اسپورٹس کرسپانڈنٹ ہیں ، ایک کرکٹ میچ کو Cover کرنے لاہور جارہے تھے ۔ لاہور میں چودھری صاحب کی چھوٹی بیٹی بیگم ہما اخلاق حسین رہتی ہیں ۔ وہ رشتے میں میری خالہ ہوتی ہیں ۔ یہ موقع مجھے مناسب لگا اور میں نے تقریبا چالیس سال بعد ہما خالہ کو علی کے ذریعے ایک تفصیلی خط بھیجا ۔ اس میں میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ چھرونانا (چودھری صاحب) کے بارے میں کچھ بتائیں ۔ خط میں ، میں نے آپ کی خواہش کا بھی تذکرہ کردیا تھا ۔ خط کے ساتھ ہی میں نے دو کاپیاں آپ کے رسالے کی بھی بھیج دی تھیں ۔ (بعد کو انھوں نے ایک کاپی اور منگوائی ۔ وہ بھی بھیج دی ہے ۔)

۳ ۔ یہ سارا مضمون ہما خالہ کی گفتگو پر مبنی ہے انھوں نے ایک ٹیپ پر یہ باتیں ریکارڈ کر کے مجھے بھیجی ہیں ۔ ایک انتہائی محبت بھرا خط اور چودھری صاحب کے دو ایک خطوط کی زیراکس کاپیاں بھی ۔ میں نے " گویا دبستاں کھل گیا " کے خطوط دیکھے ، ایک خط کی کاپی منسلک کررہا ہوں یہ مجموعے میں شامل نہیں ہے ۔ پہلے کبھی " نوائے طلب " میں شائع ہوا ہے ۔ " نوائے طلب " سے میں واقف نہیں ہوں ، آپ ممکن ہے کہ جانتے ہوں ۔ اگر آپ چاہیں تو اسے استعمال کرسکتے ہیں ۔ لاہور میں صرف ایک دن ٹھہرے تھے ۔ یہ ہما خالہ کی محبت ہے کہ انھوں نے اپنی ضعیفی (وہ اب نوے سال کی ہوگئی ہیں) اور ناسازیِ طبیعت کے باوجود یہ سب معلومات فراہم کردیں ۔

۴ ۔ ہم لوگ گھر میں عموماً جو بولی بولتے ہیں وہ پکی بولے کہلاتی ہے ، شہر کی زبان کو ہمارے یہاں پکی بولی کہا جاتا ہے ۔ ہما خالہ نے بھی جگہ جگہ وہی پکی بولی ، کا استعمال کیا ہے ۔ میں نے جان بوجھ کر اس میں تبدیلی نہیں کی ہے ۔ معلوم نہیں کہ آپ کو یہ طریقہ پسند آئے گا یا نہیں ۔ آپ اگر اسے کسی مصلحت کی بنا پر بدلنا چاہیں تو بہت دشواری نہیں ہوگی ۔

۵ ۔ ہاں ایک پوسٹ کارڈ بھی بھیج رہا ہوں یہ ردولی میں چودھری صاحب کے کاغذات میں مل گیا تھا ۔ یہ خط پوسٹ نہیں ہوا اس لیے رہ گیا اور مل گیا ۔ شاید آپ استعمال کرسکیں ۔

والسلام ۔ نیاز مند ۔

مسعود الحق ۔ دلی ۔

۱۲ ۔ ۹ ۔ ۹۶

ایک غیر مطبوعہ خط
(بہ نام ام ۔ انتظار حسین صاحب ۔ لکھنؤ)

میرے کرم فرما ۔ دعا ہائے اشتیاق اور دلی شکریہ ۔ میں ابھی تک زندہ ہوں اور اپنے پرسانِ حال کا مشکور ہوں ۔ امید ہے کہ میرے بعد بھی دلی احباب میرے لیے دعائے مغفرت سے اسی طرح مجھ کو یاد کیا کریں گے جیسا کہ آج خیریت کے خواہاں ہیں ۔

میرے عنایت فرما ۔ آپ کا خط پا کر دل خوش ہو گیا ۔ اس کا صلہ آپ کو خدائے کریم کے یہاں ملے گا ۔ انشاء اللہ تعالی ۔ اب نہیں لکھا جاتا ۔ آنکھ ، ہاتھ ، گردن ، کمر ، پاؤں ، دماغ سب جواب دے رہے ہیں ۔

دعا گو اور دعا خواہ

مجبور و مفلوج محمد علی عفی عنہ ۔ ردولی

۲۶ نومبر ۱۹۵۸ء

(چودھری محمد علی ردولوی)

" سوغات کا گیارھواں شمارہ میں نے خرید لیا ہے ۔ حسبِ سابق یہ شمارہ بھی کافی ضخیم ہے اور اس بار ابھی میرے مطالعے کا سامان موجود ہے ۔ میں نے عظیم بیگ چغتائی کی ایک دو تحریریں ہی پڑھی تھیں ۔ سوغات کے وسیلے سے چغتائی کا بھرپور مطالعہ کروں گا ۔ اس کے لیے سوغات کا شکریہ ۔

" نقشِ اول " میں پروفیسر کلیم الدین احمد کے مضمون کے بارے میں آپ نے لکھا ہے کہ یہ آپ کو مظہر امام صاحب کے ذریعے موصول ہوا ۔ اور اس کی اشاعت " معاصر " پٹنہ کے علاوہ شاید کہیں نہیں ہوئی ۔ اطلاعاً عرض ہے کہ پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے ۱۹۷۳ء میں علی گڑھ میں فکشن سیمی نار منعقد کیا تھا ۔ اس میں پڑھے گئے مقالوں کو انھوں نے ایک کتاب بہ عنوان " اردو فکشن " میں یک جا کر کے شائع کر دیا تھا ۔ کلیم الدین احمد صاحب نے اپنا مضمون " ناول کا فن " فکشن سیمی نار میں پڑھا یا نہیں پڑھا اس کا اندازہ سرور صاحب کے لکھے ہوئے دیباچے سے نہیں ہوتا لیکن مذکورہ مضمون " اردو فکشن " میں فہرست میں دوسرے نمبر پر ہے ۔ پہلا مضمون سرور صاحب کا ہے اور دوسرا کلیم الدین احمد صاحب کا آپ کو یہ کتاب نہیں مل سکی ۔ حیرت ہے ۔

میں نے ابھی شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا مضمون اور اس کے جواب میں مغنی تبسم

صاحب کا لکھا ہوا ردِ عمل پڑھا ہے ۔ آپ نے نقشِ اول کے آخر میں فاروقی صاحب کی تنقید کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے میں متفق ہوں ۔ فاروقی صاحب ہمارے بزرگ نقاد ہیں ۔ میں ان کا بہت احترام کرتا ہوں ۔ مگر ان کی تنقید نے مجھے ادب کے دائرے میں رہ کر ہی سہی اختلاف کرنے کا جواز مہیا کردیا ہے ۔ حوصلہ کروں گا کہ اپنے تنقیدی خیالات کو رقم کروں ۔ جن سے کچھ سیکھا ہے ان سے اختلاف کرنا کچھ اتنا آسان بھی نہیں ۔ مگر آپ نے جو کچھ نقشِ اول میں لکھا ہے حرف بہ حرف درست ہے ۔

اس مرتبہ احمد جاوید صاحب کی غزلوں نے متاثر نہیں کیا ۔

جمال اویسی ۔ دربھنگہ

- عزیز احمد کی مضامین - اصغر وفانی - اور - ادبی شاہکار اور متحرک تصویریں - یہ دونوں مضامین رسالہ - اردو - میں نہیں - مجلہ عثمانیہ - میں شائع ہوئے ہیں ۔ ان دونوں کی عکسی نقل میرے پاس موجود ہے ۔ پتہ نہیں کس دھن میں رسالہ - اردو - لکھ گیا ۔ اگلے شمارے میں اس کی تصحیح ضرور فرما دیں ۔ ممکن ہے اس تعلق سے بہت سے خط آپ کے پاس آئے ہوں ۔ غرض اس تعلق سے عزیز احمد سے، آپ سے اور عزیز احمد کے چاہنے والوں سے معذرت خواہ ہوں ۔

خالد سعید ۔ بیدر ۔

SOUGHAT TEL : 5281986
A Miscellany Of Urdu Literature
Editor : MARIAM AYAZ
84, 3rd Main, 2nd Cross, Defence Colony, Indiranagar, Bangalore - 560 038